کلیاتِ پریم چند

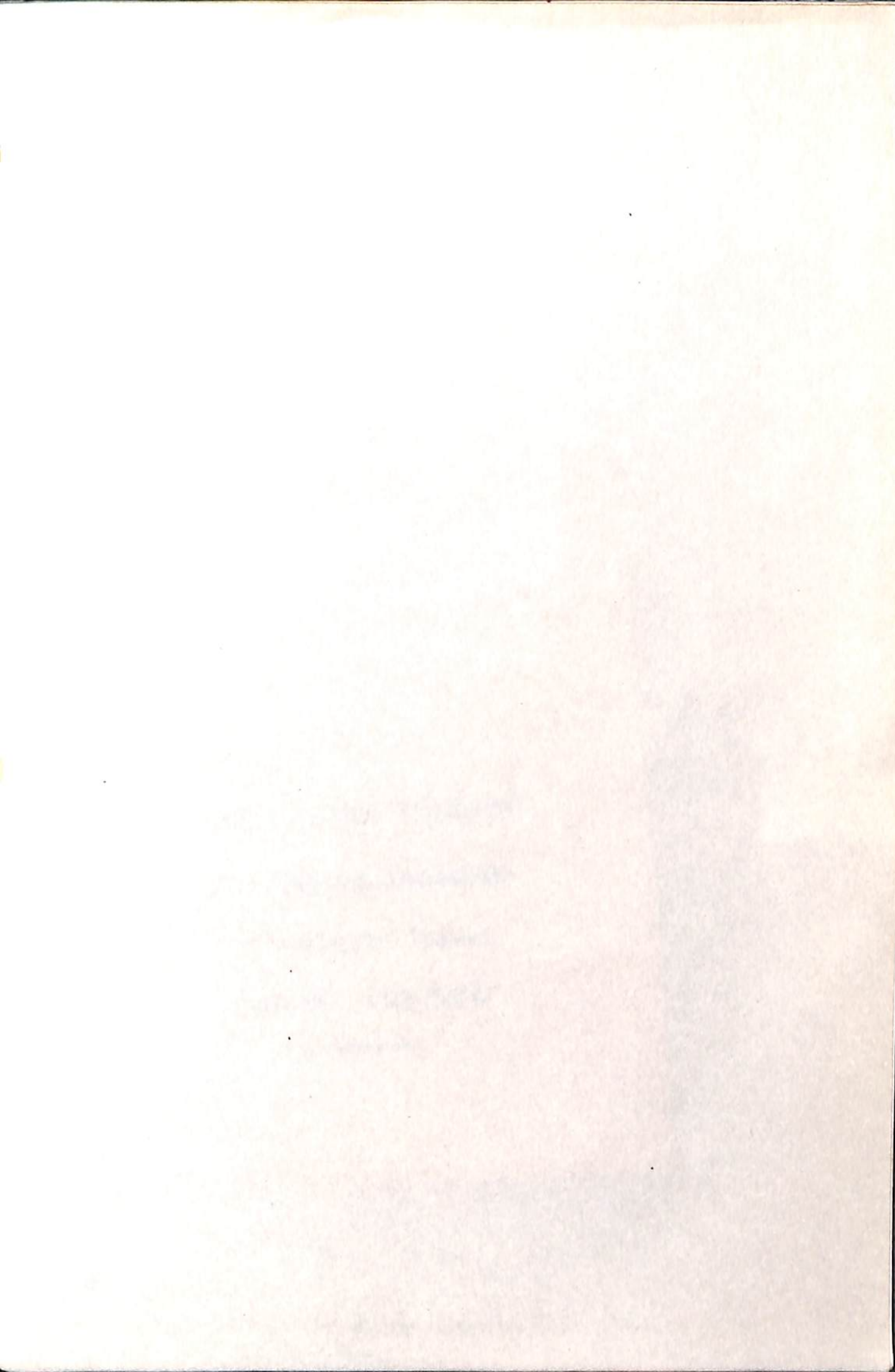
3



مُرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی



کلیاتِ پریم چند

3

گوشۂ عافیت

مرتبہ

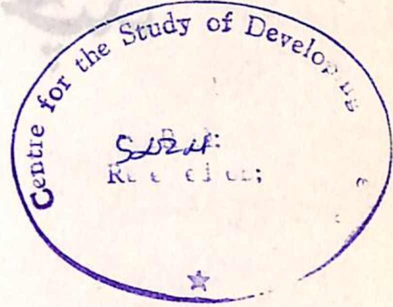
مدن گوپال



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ تعلیم (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک ا، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

Kulliayt-e- Premchand-3

Edited by:
Madan Gopal



سنہ اشاعت : جنوری، مارچ 2000 شک 1921

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/108

سلسلہ مطبوعات : 847



ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، ویسٹ بلاک 1۔ آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع: ویپ انٹر پرائزز گرین پارک، نئی دہلی 110016

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظرعام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیاتِ پریم چند" کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبارِ اصناف یکجا کیے جائیں گے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناول : جلد 1سے 8 تک ، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک، ڈرامے :
جلد15 و جلد 16 ، خطوط : جلد17، متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک،
تراجم : جلد 21 و جلد 22 تک

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزادے پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

"کلیاتِ پریم چند" کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ "کلیاتِ پریم چند" میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

"کلیاتِ پریم چند" کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیّر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ "کلیاتِ پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

دیباچہ

گوشئہ عافیت کا پہلا مسودہ دستیاب ہے جس پر شروع کرنے کی تاریخ 2 مئی 1918 درج ہے اور ناول ختم ہونے کی تاریخ 25 فروری 1920 دی گئی ہے، یعنی اسے لکھنے میں بیس مہینے لگے۔ اس دوران پریم چند دوسرے کام بھی کرتے رہے۔ گوشئہ عافیت دورانِ قیام گورکھپور لکھا گیا اور اس ناول کا نام دیا گیا ناکام، ایک نام اور زیرِ تجویز تھا نیک نام۔ مگر اشاعت کے وقت گوشئہ عافیت نام دیا گیا۔ پریم چند 5 نومبر 1919 کو دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔ ''کچھ دنوں کے لیے چھوٹے قصے لکھنا بند کر کے علمی مضامین لکھنے کی کوشش کروں گا۔ دماغ ایک ساتھ دو مختلف پلاٹ نہیں سنبھال سکتا۔ تجربہ کر رہا ہوں کہ ایک ہی کام ایک وقت ہوسکتا ہے۔ یا تو ناول لکھوں یا کہانیاں۔ ناول کے لیے ایک ہی پلاٹ کافی ہے اور اس کا لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا ہر ماہ دو یا تین کہانیوں کا۔'' کچھ دن بعد 19 جون 1919 کو بازارِ حُسن کے ہندی ترجمے کو کلکتہ کے پبلیشر کو دے کر گورکھپور لوٹے۔

دیانرائن نگم کو (20 فروری 1920) لکھا کہ ''میرا دوسرا ناول ناکام عنقریب اختتام پذیر ہے ...... یہ ناول بھی ہندی میں چھپے گا۔ اردو میں اس کا کیا حشر ہوگا معلوم نہیں۔ بازارِ حُسن البتہ چھپ جائے گا۔ ادھر امتیاز علی تاج کو لکھا کہ ''جب تک بازارِ حُسن نکلے گا دوسرے ناول کے کچھ صفحات شاید بھیج سکوں۔''

دیا نرائن نگم کو (5 ستمبر 1919) لکھا کہ ''نیا ناول ناکام خوب طویل ہو رہا ہے۔ اس کا نام ابھی ناکام رکھا ہے۔ غالبًا دسمبر تک ختم ہوجائے گا ...... نیک نام ہوجائے تو اُسے اُردو میں خود شائع کرنے کا قصد ہے۔ کوئی پبلیشر نہیں ملا۔ 3 جنوری 1919 کے خط میں لکھا اس گوشئہ عافیت کا ہندی ترجمہ کر رہا ہوں۔ ترجمہ پریم آشرم کے نام سے شائع ہوگا۔ اس کی اشاعت کے لیے پبلیشر تو پہلے ہی سے تیار تھا یہ فروری 1922 میں شائع ہوا۔ اس نے

خوب شہرت حاصل کی۔ اردو مسودہ پڑا رہا صاف نہیں کیا جاسکا۔ اسی دوران پریم چند کا تیسرا ضخیم ناول چوگان ہستی لکھا گیا۔ یہ بھی پہلے رنگ بھومی کے نام سے شائع ہوا۔ رنگ بھومی کا ترجمہ اقبال ورما سحرؔ ہنگامی نے کیا۔ اس ترجمے کے لیے پریم چند نے دو سو روپے ورما کو دیے۔ گوشۂ عافیت کو بھی اقبال ورما سحرؔ کو دے کر ترجمہ کرایا اور ایک سو روپیہ عطا فرمایا۔ حالانکہ پریم چند کا دوسرا اردو ناول گوشۂ عافیت تھا۔ چوگانِ ہستی پہلے شائع ہوا اور گوشۂ عافیت بعد میں یعنی اس کے لکھنے کے آٹھ سال بعد۔ ایک جگہ دیا نرائن نگم لکھتے ہیں کہ "پریم آشرم کے تو آٹھ ایڈیشن نکل چکے تھے۔ گوشۂ عافیت کا دوسرا بھی نہیں۔ اردو داں طبقے کی بہترین انشاپردازوں کی جماعت قدردانی کرے یا نہ کرے مگر ہندوستان کی دوسری زبانیں اردو کی مدد سے اپنے سرمایے میں بہت کافی اضافہ کر رہی ہیں۔ اردو میں ابھی تک منشی پریم چند کی مشہور تصنیف پریم پچیسی کا پہلا ایڈیشن ختم نہیں ہوا ہے لیکن ہندی میں ان کی کئی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

"منشی جی نے اردو میں دو ایک بڑے بڑے ناول لکھے تھے مگر ان کی اشاعت کا کوئی انتظام نہ ہوسکا لیکن انھیں ناولوں کو ہندی مطابع نے بڑے شوق کے ساتھ ہندی میں شائع کراکے ہزاروں جلدیں فروخت کر ڈالیں۔ آپ کے متفرق قصوں کا ایک باتصویر ایڈیشن بھی تیار ہو رہا ہے۔ آپ کے ہندی ناول سیوا سدن نام کی جس کی قیمت دو ڈھائی روپیہ ہے، قریب پانچ ہزار جلدیں فروخت ہوچکی ہیں۔ اب گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے اور ایک باتصویر گجراتی رسالہ اس کی بڑے اہتمام کے ساتھ تصویر بنوا رہا ہے۔ بنگال میں منشی پریم چند کے ناولوں اور قصوں کی اتنی قدر ہوئی کہ ان کا ایک ناول بائیسکوب میں منتقل ہو رہا ہے۔ قدردانی بہت حوصلہ افزا ہے اور ہم اپنے قابل دوست کو اس پر تہہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کیسا دلخراش ہے کہ اردوداں جماعت نے عملی حیثیت سے آپ کی کوئی قابلِ لحاظ قدردانی نہیں کی۔" یہ تبصرہ ساٹھ ستر سال پہلے لکھا گیا تھا حالاتِ حاضرہ سے قارئین واقف ہیں۔

مدن گوپال

پہلا حصہ

(۱)

شام ہوگئی ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے بیل کھیتوں سے آگئے ہیں۔ گھروں سے دھوئیں کے کالے بادل اُٹھنے لگے ہیں۔ لکھن پور میں آج حاکم پرگنہ کی پڑتال تھی۔ گاؤں کے معززین دن بھر اُن کے گھوڑے کے پیچھے دوڑتے رہے تھے۔ جاڑا اگرچہ ختم ہوچکا ہے لیکن لوگ اس وقت عادتاً الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے ناریل پی رہے ہیں اور حکّام کے طوروطریق پر اپنے خیالات ظاہر کررہے ہیں۔ لکھن پور بنارس شہر سے ۱۲ میل شمال کی جانب ایک بڑا موضع ہے۔ زیادہ تر کُرمی اور ٹھاکر آباد ہیں۔ دوچار گھر نائیوں اور کہاروں کے بھی ہیں۔

منوہر نے کہا۔ بھائی حاکم تو انگریج۔ وہ نہ ہوتے تو اِس دیس والے حاکم لوگوں کو پیس کر پی جاتے۔

دُکھرن بھگت نے تائید کی۔ جیسا اُن کا اکبال ہے ویساہی نارائن نے سبھاؤ بھی دیا ہے۔ انساپھ کرنا تو یہی جانتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ گھوس گھاس سے کچھ مطلب نہیں۔ آج چھوٹے صاحب کوٗ دیکھا۔ منہ اندھیرے گھوڑے پر سوار ہوگئے اور دن بھر پڑتال کی۔ تحصیل دار۔ پیشکار۔ کانونگو، پٹواری ایک بھی اُن کے ساتھ نہیں پہنچتا تھا۔

سُکھو چودھری بولے۔ یہ لوگ انگریجوں کی کیا برابری کریں گے۔ بس گالی دینا اور اجلاس پرگرجنا جانتے ہیں۔ گھرسے تو نکلتے ہی نہیں۔ گدّی مسند لگائے پان چبایا کرتے ہیں۔ جو کچھ چپراسی یا پٹواری نے کہہ دیا وہی مان گئے۔ دن بھر پڑے پڑے آلسی ہوجاتے ہیں۔ وہ تو کہو ہمارا پٹواری بیچارہ بھلامانس ہے۔ نہیں تو حاکم لوگ ہمیں جیتا نہ چھوڑتے۔

منوہر۔ سنتے ہیں انگریج لوگ گھی نہیں کھاتے۔

سُکھو۔ گھی کیوں نہیں کھاتے۔ بنا گھی دودھ کے اتنا بل بوتا کہاں سے ہوگا۔ وہ مُسکّت کرتے ہیں۔ اسی سے گھی دودھ پچ جاتا ہے۔ ہمارے دیسی حاکم کھاتے تو بہت ہیں پر کھاٹ پر پڑے رہتے ہیں۔ اِسی سے اُن کا پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ دیہہ پھول جاتی ہے۔ کچھ کام نہیں ہوسکتا۔ تحصیلدار کی توند تو اتنی بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ناند ہے۔ چار

کدم چلتے ہیں تو ہانپنے لگتے ہیں۔ پسینے سے تر ہوجاتے ہیں۔

دُکھرن۔ وہ تو ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کولھو۔ لمبائی چوڑائی سب برابر۔ ابھی پہلے آئے تھے تو کیسا چھریرا بدن تھا۔ لیکن دو ہی سال میں نہ جانے کہاں کا موٹاپا چھاگیا۔

سکھو ۔ رِسوت کا پیسہ بدن پھلا دیتا ہے۔

منوہر ۔ یہ کہنے کی بات ہے۔ تحصیل دار صاحب ایک پیسہ بھی نہیں لیتے۔

سکھو۔ بِنا حرام کی کوڑی کھائے دیہہ پھول ہی نہیں سکتی۔ رسوت کے روپئے نہیں لیتے گھی تو لیتے ہیں۔ ڈالی سوگات تو لیتے ہیں۔ مہینوں میں سینکڑوں روپئے لڑکے کی مٹھائی کے بہانے لے لیتے ہیں۔

منوہر نے ہنس کر کہا۔ ہمارے پٹواری کی دیہہ کیوں نہیں پھولتی؟ سوکھے آم بنے ہوئے ہیں۔

سکھو۔ پٹواری سینکڑے ہجار کی رکم تھوڑے ہی اُڑاتا ہے۔ جب بہت داؤں پیچ کھیلے تو دس پانچ روپئے مل گئے۔ یہ چال نہ چلے تو بھوکوں مرجائے۔ اُس کی طلب تو کانونگو، پیسکار، مل کر کھاجاتے ہیں۔ اسی چھین جھپٹ پر گُجر کرتاہے۔ تو دیہہ کہاں سے پھولے گی۔ بڑے حاکم ہیں تو ہجاروں پر ہاتھ مارتے ہیں۔ تکاوی میں دیکھا نہیں ڈپٹی صاحب نے ہجاروں روپے چٹ کرلیے۔

دُکھرن۔ کہتے ہیں بدّیا سے آدمی کی بُدھ سُدھر جاتی ہے۔ لیکن یہاں اُلٹا ہی دیکھنے میں آتاہے۔ یہ حاکم اور عملے تو سب پڑھے لکھے بدّوان ہوتے ہیں لیکن کسی کو دیا دھرم کا بچار نہیں ہوتا۔

سکھو۔ جب دیس کے بُرے دن آتے ہیں تو سبھی باتیں اُلٹی ہوجاتی ہیں۔ جب بیمار کے مرنے کے دن آتے ہیں تو اوکھد بھی اوگن کرنے لگتی ہے۔ اگر یہ لوگ دیادھرم کا بچار کرنے لگتے تو دیس میں رام راج نہ ہوجاتا۔

منوہر۔ ہمیں لوگ تو رسوت دے دے کر اُن کی عادت بگاڑ دیتے ہیں۔ ہم نہ دیں تو وہ کیسے لیں۔ کانون میں تو رسوت دینا نہیں لکھا ہے۔ بلکہ رسوت دینا ثابت ہوجائے تو اُلٹے اور سجا ملے۔ بُرے تو ہم ہیں۔ لینے والا ملتا ہوا دھن تھوڑے ہی چھوڑدے گا۔ لیکن یہاں تو ہم آپس ہی میں ایک دوسرے کو کھاتے جاتے ہیں۔ تم ہمیں لوٹنے کو

تیار ۔ ہم تمھیں لوٹنے کو تیار۔ اس کا پھل اس کے سوا اور کیا ہوگا۔

دُکھرن۔ ارے تو ہم مورکھ، گنوار، اَن پڑھ ہیں۔ وہ لوگ تو بدوان ہیں۔ انھیں نہ سوچنا چاہیے۔ کہ یہ گریب آدمی ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ ہمیں بھگوان نے بِدیا دی ہے تو ان پر دیا کی نگاہ رکھیں۔ اِن بدوانوں سے تو ہم مورکھ ہی اچھے۔ میں تو اپنے لڑکے کو ایسی بِدیا کبھی نہ پڑھاؤں جو اُسے اَدھرمی بنادے۔ جُلم کرنے سے جُلم سہ لینا اچھا ہے۔

ڈپٹ سنگھ ۔ ان لوگوں کی پڑھائی کا کھرچ تو ہمیں سے لیاجاتا ہے۔ ہمارے ہی روپے سے تو یہ سب بڑے بڑے اسکول کھلے ہوئے ہیں۔ مگر جمانے کی کھوبی ہے کہ جو لوگ ہمارا ہی دھن کھاکر اِلم پڑھتے ہیں وہ ہماری ہی گردن کاٹتے ہیں۔

سکھو ۔ یہ دیس کا ابھاگ ہے بِدیا کا دوس نہیں۔

منوہر۔ نہ دیس کا ابھاگ ہے۔ نہ بِدیا کا دوس۔ یہ ہم لوگوں کی آپس کی پھوٹ کا پھل ہے۔ سب اپنا دوس ہے۔ بِدیا سے اور کچھ نہیں ہوتا تو دوسروں کا مال اُڑانا تو آجاتا ہے۔ مورکھ رہنے سے تو اپنا دھن گنوانا پڑتا ہے۔

سکھو ۔ ہاں تم نے یہ ٹھیک کہا کہ بِدیا سے دوسروں کا مال اُڑانا آجاتا ہے۔ ہماری بڑی سرکار جب تک رہے تو دو دو تین تین سال کا لگان باکی پڑ جانے پر بھی ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیتے تھے۔ چھوٹے سرکار جب سے مالک ہوئے ہیں دیکھتے ہو کیسا اُدھم مچا رہے ہیں۔ رات دن جاپھا بے دَکھلی۔ اکھراج کی دُھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک کھیت بھی باکی نہیں رہنے پاتا۔ بدوان نہ ہوتے تو یہ بات کہاں سے آتی۔

دُکھرن ۔ کارِندہ صاحب کل کہتے تھے کہ اب کی اس گاؤں کی باری ہے دیکھو کیا ہوتا ہے؟

منوہر۔ ہوگا کیا۔ تم ہمارے کھیت پر چڑھوگے ہم تمھارے کھیت پر چڑھیں گے۔ چھوٹے سرکار کی چاندی ہوگی۔ اُن کی آنکھیں تو تب کھلتیں جب کوئی کسی کے کھیت پر دانت نہ چڑھاتا۔ سب لوگ آپس میں کول کرار کرلیتے۔ لیکن یہ کہاں ہونے والا ہے۔ سب سے پہلے تو سکھو مہتو دوڑیں گے۔

سکھو۔ سکھو دوڑیں گے تو کون کہیں منوہر نہ دوڑیں گے۔

منوہر ۔ مجھ سے چاہے گنگاجلی اُٹھوا لو۔ میں کسی کے کھیت پر نہ جاؤں گا۔ اور جاؤں گا کیسے کچھ گھر میں پونجی پسار بھی تو ہو۔ ابھی ربیع کھلیان میں نہیں آئی اور گھر میں اناج کا دانہ

نہیں ہے۔ گڑ ایک سو سے کچھ اوپر ہی کا ہوا تھا لیکن ایک بیل بیٹھاؤں ہوگیا ہے۔ ڈیڑھ سو ہوں تو گوش پوری ہو۔

دُکھرن ۔ کیا جانے کیا ہوگیا کہ اب کھیتی میں برکت ہی نہیں رہی۔ پانچ بیگھے ربی ہے لیکن بیس من کی بھی آسا نہیں ہے۔ اور گڑ کا جو حال ہوا تم جانتے ہی ہو۔ بسیسر ساہ نے کولھواڑے ہی میں تولا لیا۔ بال بچوں کے لیے سیر تک نہ بچا۔ دیکھیں بھگوان کیسے پار لگاتے ہیں۔ وہ تو کہو مہنگی پڑگئی ہے جس سے چار پیسے دیکھنے کو مِل جاتے ہیں۔ نہیں تو اِس اُپج میں روٹیاں بھی نہ چلتیں۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ گردھر مہراج آتے ہوئے دکھائی دیے۔ لمبا قد تھا۔ بھرا ہوا بدن۔ تنا ہوا فراخ سینہ۔ سر پر ایک بڑی پگڑی۔ بدن پر ایک چُست مرزائی۔ موٹا سا لٹھ کندھے پر رکھے ہوئے تھے۔ اُنھیں دیکھتے ہی سب لوگ مانچوں سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ حضرت زمیندار کے چپراسی تھے۔ زبان سے سب کے دوست۔ دل سے سب کے دشمن۔ زمیندار کے روبرو زمینداروں کی سی کہتے تھے۔ اسامیوں کے روبرو اسامیوں کی سی۔ اس لیے غیبت میں چاہے لوگ اُن کی کتنی ہی بُرائی کریں۔ مُنہ پر کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔

سکھوؔ نے پوچھا۔ کہو مہراج کدھر سے؟

گردھر مہراج نے اس انداز سے کہا گویا زندگی سے بیزار ہیں۔ کدھر سے بتائیں۔ گیان بابو کے مارے ناک میں دم ہے۔ اب حکم ہوا ہے کہ اسامیوں کو گھی کے لیے روپے دے دو۔ روپے سیر کا بھاؤ کٹے گا۔ دن بھر دوڑتے ہوگیا۔

منوہر۔ کتنے کا گھی ملا؟

گردھر۔ ابھی تو روپے بانٹ رہا ہوں۔ بڑے سرکار کی برسی ہونے والی ہے۔ اُسی کی تیاری ہے۔ آج کوئی پچاس روپے بانٹے ہیں۔

منوہر ۔ لیکن بجار بھاؤ تو دس ہی چھٹانک کا ہے۔

گردھر۔ بھائی ہم تو حکم کے گلام ہیں۔ بجار میں چھٹانک بھر بکے۔ ہم کو تو سیر بھر لینے کا حکم ہے۔ اس گاؤں میں بھی سو روپے دینے ہیں۔ بولو سکھوؔ مہتو کتنا لیتے ہو؟

سکھو نے سر نیچا کر کے کہا۔ جتنا چاہے دے دو۔ تمھاری جمین میں بسے ہوئے ہیں۔ بھاگ کے کہاں جائیں گے؟

گردھر۔ تم بڑے اسامی ہو۔ بھلا دس روپئے تو لو۔ اور دُکھرن بھگت تمھیں کتنا دیں؟

دُکھرن ۔ ہمیں بھی پانچ روپئے دے دو۔

گردھر۔ اور تمھیں ڈپٹ سنگھ؟ کچھ ٹھکرائی کی لاج رکھو گے نا؟

ڈپٹ ۔ پانچ روپئے میں بھی لے لوں گا۔

گردھر۔ اور تمھیں منوہر؟

منوہر۔ میرے گھر تو ایک ہی بھینس لگتی ہے۔ اس کا دودھ بال بچوں میں اُٹھ جاتا ہے۔ گھی ہوتا ہی نہیں۔ اگر گاؤں میں کوئی کہہ دے کہ اِس نے ایک پیسہ کا بھی بیچا ہے تو پچاس روپئے لینے کو تیار ہوں۔

گردھر۔ ارے کیا پانچ روپے بھی نہ لوگے؟ بھلا بھگت کے برابر تو ہوجاؤ۔

منوہر۔ بھگت کے گھر بھینسیں لگتی ہیں۔ گھی بکتا ہے۔ دودھ کا اُٹھان نہیں۔ وہ جتنا چاہیں لے لیں۔ میں روپئے لے لوں تو مجھے بجار سے دس چھٹانک کا مول لے کے دینا پڑے گا۔

گردھر۔ جو چاہے کرو پر سرکار کا حکم تو ماننا ہی پڑے گا۔ سول گنج میں تیس روپے دے آیا ہوں۔ وہاں گاؤں بھر میں ایک بھینس بھی نہیں ہے۔ لوگ بجار سے لے کر دیں گے۔ پڑاؤ میں بیس روپئے دیے ہیں۔ وہاں بھی جانتے ہو ایک بھینس بھی نہیں ہے۔

منوہر۔ بھینسیں نہ ہوں گی تو گانٹھ میں روپئے ہوں گے۔ یہاں تو گانٹھ میں کوڑی بھی نہیں ہے۔

گردھر۔ جب جمیدار کے اسامی ہو تو اس کے حکم سے باہر نہیں جا سکتے۔

منوہر۔ جمین کوئی کھیرات جوتتے ہیں۔ اُن کا لگان نہیں دیتے؟ ایک کھیت باکی پڑجائے تو نالس ہوتی ہے۔

گردھر۔ منوہر گھی تو تم دوگے دوڑتے ہوئے۔ پر چار کھوٹی کھری سُن کر۔ جمیدار کے گاؤں میں رہ کر اُس سے ہیکڑی نہیں چل سکتی۔ ابھی کارِندہ صاحب بلائیں گے تو روپئے بھی دوگے، ہاتھ پیر بھی پڑوگے۔ میں سیدھے سیدھے کہتا ہوں تو تیور بدلتے ہو۔

منوہر نے گرم ہوکر کہا۔ نہ کارِندہ کوئی ہوا ہیں نہ جمیدار کوئی کاٹو ہیں۔ یہاں کوئی دَبَیل نہیں ہے۔ جب کوڑی کوڑی لگان چکاتے ہیں تو دھونس کیوں سہیں؟

گردھر۔ سرکار کو جانتے نہیں ہو۔ بڑے سرکار کا جمانا نہیں ہے۔ ان کے چھنگل میں ایک بار آجاؤگے تو پھر نکلتے نہ بنے گی۔

منوہر کا غصہ اور بھی بڑھا۔ بولا اچھا جاؤ توپ پر اُڑوا دینا۔

گردھر مہراج اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سُکھو اور دُکھرن بھگت نے منوہر کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بھی گردھر کے ساتھ ہولیے۔ منوہر نے ان دونوں آدمیوں کو تیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر ناریل پینے لگا۔

(۲)

لکھن پور کے زمینداروں کا مکان اورنگ آباد محلّے میں تھا۔ مکان کے دو قطعے آمنے سامنے بنے ہوئے تھے۔ ایک زنانہ مکان تھا۔ دوسرا مردانہ نشست گاہ۔ دونوں کے بیچ کی زمین گُل بوٹے سے آراستہ تھی اور اس کے دونوں پہلوؤں کی جانب اونچی دیواریں کھینچی ہوئی تھیں۔ لیکن دونوں قطعے جابجا ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ کہیں کوئی کڑی ٹوٹ گئی تھی اور اُسے تھونیوں سے روکا گیا تھا۔ کہیں دیواریں شق ہوگئی تھیں اور کہیں محرابیں دھنسی پڑتی تھیں۔ ایک بوڑھا مریض تھا جو لاٹھی کے سہارے چلتا ہو۔

کسی زمانے میں یہ خاندان شہر میں بہت ممتاز تھا۔ پر ریاست کی بو اور امارت کے غرور نے رفتہ رفتہ اُسے اس درجہ گرا دیا تھا کہ اب اُس کا شمار شہر کے بگڑے خاندانوں میں ہوتا تھا۔ لالہ جٹا شنکر مرتے مرتے مرگئے پر جب گھر سے نکلتے تو پالکی پر۔ لڑکوں لڑکیوں کی شادیاں کیں تو حوصلے سے۔ کوئی تقریب درپیش ہوتی تو سینہ دریا کی طرح اُمڈ پڑتا تھا۔ مہمانوں کو دیکھ کر باغ باغ ہوجاتے تھے۔ چاہتے تھے کہ اِس کی ایسی کیا خاطرداری کروں کہ یہاں سے جانے کا نام نہ لے۔ کوئی سادھو سنت دروازے پر آجاتا تو اُسے سر اور آنکھوں پر بٹھاتے۔ اسی وضع داری میں جائداد کا بڑا حصّہ کچھ بیع ہوگیا۔ کچھ رہن ہوگیا اور اب لکھن پور کے علاوہ صرف چار اور چھوٹے چھوٹے موضعے رہ گئے تھے جن سے کوئی چار ہزار سالانہ نفع ہوتا تھا۔

لالہ جٹا شنکر کے ایک چھوٹے بھائی تھے۔ لالہ پربھاشنکر۔ وہی گھر کے منتظم ۔ مختار۔ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ بڑے بھائی کو اپنی بھاگوت اور گیتا سے عشق تھا۔ دونوں بھائیوں میں اتنی محبت تھی کہ اُن میں کبھی شکررنجیوں کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ عورتوں میں کبھی کبھی توتو میں میں ہوتی تھی لیکن بھائیوں پر اس کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ بلکہ یہ قضیے دونوں بھائیوں کے لیے مایۂ تفریح ہوتے تھے۔ پربھاشنکر کو اکثر خانہ داری کے انتظام میں تردداد

کا سامنا ہوتا تھا۔ پر خود چاہے کتنی ہی تکلیف اُٹھائیں بڑے بھائی سے بھول کر بھی شکایت نہ کرتے تھے۔ جٹا شنکر بھی اُن کے کسی کام میں دخل نہ دیتے تھے۔

لالہ جٹا شنکر کا ایک سال قبل انتقال ہوچکا تھا۔ اُن کی بیوی اُن کے پہلے ہی رخصت ہوگئی تھی۔ اُن کے دو لڑکے تھے پریم شنکر اور گیان شنکر۔ دونوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ پریم شنکر چار پانچ سال سے مفقود الخبر تھے۔ اُن کی بیوی شردھا گھر میں پڑی اُن کے نام کو رویا کرتی تھی۔ گیان شنکر نے پچھلے سال بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور آج کل اپنا وقت ہارمونیم بجانے میں صرف کرتے تھے۔ اُن کے ایک لڑکا تھا مایا شنکر۔ بیوی کا نام وِدیاوتی تھا۔ لالہ پربھاشنکر کی بیوی ابھی زندہ تھی۔ اُن کے تین بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ بڑے بیٹے بابو دیاشنکر سب انسپکٹر تھے۔ اُن کی شادی بھی ہوچکی تھی۔ باقی دونوں لڑکے پدم شنکر اور تیج شنکر ابھی پڑھتے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی کنواری تھیں۔

پریم شنکر نے بی اے کی ڈگری لینے کے بعد امریکہ جاکر آگے پڑھنے کی خواہش کی تھی پر جب چچا کو اس کی مخالفت کرتے دیکھا تو ایک دن چپکے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر والوں سے خط و کتابت بھی بند کر دی۔ اُن کے بعد گیان شنکر نے باپ اور چچا سے لڑائی ٹھانی۔ اُن کی فضول خرچیوں کی ناہمدردانہ تنقید کیا کرتے۔ کہتے کیا آپ لوگ ہمارے لیے کچھ بھی نہ چھوڑجائیں گے؟ کیا آپ کی یہی مرضی ہے کہ ہم لوگ روٹیوں کو محتاج ہوجائیں۔ لیکن اس کا جواب یہی ملتا۔ بیٹا ہم لوگ تو جس طرح اب تک رہتے آئے ہیں اسی طرح رہیں گے۔ اگر تم اس سے بہتر کوئی انتظام کرسکتے ہو تو کرو۔ ہم بھی دیکھیں۔ گیان شنکر اس وقت کالج میں تھے۔ یہ چیلنج سُن کر خاموش ہوجاتے تھے۔ پر جب سے وہ ڈگری لے کر آئے تھے اور ادھر لالہ جٹا شنکر بھی رحلت کرچکے تھے، اُنھوں نے گھر کے انتظام میں حصّہ لینا شروع کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اُس یگانگت میں بہت کچھ فرق آچکا تھا جو گذشتہ ساٹھ برسوں سے قائم تھی۔ نہ چچا کا انتظام بھتیجے کو پسند تھا۔ نہ بھتیجے کا انتظام چچا کو۔ آئے دن معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ گیان شنکر کہتے آپ نے ساری جائداد چوپٹ کردی۔ ہم لوگوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ ساری زندگی پلنگ پر پڑے پڑے بزرگوں کی کمائی کھانے میں صرف کردی۔ وضعداری کے نباہ کی تعریف تو تب تھی کہ جو کچھ کرتے اپنی قوتِ بازو سے کرتے یا جائداد بچاکر کرتے۔ گھر پھونک کر تماشہ دیکھنا کون سا مشکل کام

ہے۔ لالہ پربھاشنکر اِس پر رو پڑتے اور اپنے مرحوم بھائی کو یاد کرنے لگتے۔ یہ چوٹیں اُن سے نہ سہی جاتی تھیں۔

لالہ جٹا شنکر کی برسی کے متعلق جو تیاریاں ہورہی تھیں وہ گیان شنکر کے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھیں۔ پربھاشنکر نے دوہزار کا تخمینہ کیا تھا۔ ایک ہزار برہمنوں کا بھوج ہونے والا تھا۔ شہر کے معززین کو مدعو کرنے کا قصد تھا۔ اس کے علاوہ چاندی کے برتن۔ قالین۔ پلنگ۔ حقہ۔ سرپوش۔ کپڑے۔ مہاپاتر کو دینے کے لیے بن رہے تھے۔ گیان شنکر کو یہ سب بیجا اور فضول نظر آتا تھا۔ اُن کی رائے تھی کہ اس تقریب میں دو سو سے زیادہ نہ صرف کیا جائے۔ جب گھر کی حالت ایسی پست ہے تو یہ صرفِ کثیر کسی حالت میں بھی مناسب نہیں ہے۔ لیکن لالہ پربھاشنکر کہتے تھے، جب میں مرجاؤں تو تم چاہے اپنے باپ کو ایک بوند پانی کے لیے ترسانا، پرجب تک میرے دم میں دم ہے میں اُن کی آتما کو دُکھی نہیں کرسکتا۔ سارے شہر میں اُن کی وضع داری کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے امیروکبیر اُن کے سامنے سرجھکالیتے تھے۔ ایسے دریا دل بزرگ کی برسی بھی اُسی کے حسبِ شان ہونی چاہئے۔ یہی ہماری محبت، وفا اور احترام کا آخری ثبوت ہے۔ گیان شنکر اس دلیل کے سامنے لاجواب ہوجاتے تھے۔

گیان شنکر کا سینہ بڑے بڑے ارادوں کا خزانہ تھا۔ وہ اپنے خاندان کو پھر تمول اور اعزاز کے عروج پر لے جانا چاہتے تھے۔ گھوڑے اور فٹن کا اُنھیں سودا تھا۔ وہ اس شان سے فٹن پر بیٹھ کر نکلنا چاہتے تھے کہ خواہ مخواہ لوگوں کی آنکھیں اُن کی طرف اُٹھ جائیں۔اور لوگ کہیں یہ لالہ جٹاشنکر کے صاجزادے ہیں۔ وہ اپنے دیوان خانے کو انواع و اقسام کے تکلّفات سے آراستہ کرنا چاہتے تھے، جو بالکل انگریزی ڈرائنگ روم کی نقل ہو۔ مکان میں حسب ضرورت ترمیم ضروری سمجھتے تھے۔ وہ گھنٹوں محویت کے عالم میں بیٹھے انھیں خیالات کی سیر کیا کرتے۔ شان سے زندگی بسر ہو۔ اُنھیں یہی دُھن تھی۔ اور فی الحال کفایت کے سوا اُنھیں اور کوئی دوسری صورت نظر نہ آتی تھی۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرنی وہ اپنے لیے شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور اونچے مناصب کا دروازہ اپنے لیے بند پاتے تھے۔ وکالت کو وہ علانیہ حرام خوری کہا کرتے تھے۔ اُن کا گھرانا شہر میں کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو لیکن اربابِ حل وعقد کی نگاہوں میں اُسے وہ رسوخ نہ حاصل تھا جو اونچے مناصب کا

زینہ ہے۔ لالہ جٹاشنکر تو زاویہ نشین ہی تھے اور پربھاشنکر حکام ضلع کی خوشنودی اور رضا جوئی ہی کو اپنے اغراض کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ اس کا صلہ جو کچھ مل سکتا تھا وہ انھیں مل گیا تھا۔ اُن کے بڑے صاحبزادے دیاشنکر سب انسپکٹر ہوگئے تھے۔ گیان شنکر کبھی کبھی اس نا حکام رسی کے لیے بھی اپنے چچا سے اُلجھا کرتے۔ آپ نے ساری زندگی تلف کردی۔ لاکھوں روپے کی جائداد تن پروری میں اڑا دی۔ ہمیشہ مہمان نوازی اور آن پروری کی رٹ لگایا کیے۔ اگر اس فیاضی کا عشر عشیر بھی حکام جوئی میں صرف کرتے تو آج میں ڈپٹی کلکٹر ہوتا۔ کھانے والے کھاکھاکر چل دیے۔ اب اُنھیں یاد بھی نہیں کہ آپ نے اُنھیں کبھی کھلایا تھا یا نہیں۔ خستہ کچوریاں اور طلائی ورق کے پان کھلانے سے خاندان کا فروغ نہیں ہوتا۔ اِس کے اور ہی راستے ہیں۔ بچارے پربھاشنکر یہ زبان درازیاں سر جھکا کر سُنتے اور کہتے بیٹا ایسی ایسی باتیں کرکے ہماری دلآزاری نہ کرو۔ تم فٹن اور گھوڑے، کُرسی اور میز، آئینہ اور تصویر پر جان دیتے ہو۔ تم چاہتے ہو تمھارے خاندان کے سبھی لوگ اچھے سے اچھا کھائیں۔ اچھے سے اچھا پہنیں۔ لیکن تمھارے کھانے پہننے سے دوسروں کو کیا فیض پہنچے گا۔ تمھاری دولت اور ثروت سے اور لوگ کیا فائدہ اُٹھائیں گے۔ ہم نے تن پروری میں زندگی نہیں صرف کی۔ وہ وضعداری تھی۔ تن پروری یہ ہے جس پر تم لٹو ہو رہے ہو۔ ہم نے جو کچھ کیا عزّت اور نام کے لیے کیا۔ گھر میں فاقے ہوہوگئے ہیں۔ لیکن جب کوئی مہمان یا عزیز آگیا تو اُسے سر اور آنکھوں پر لیتے تھے۔ ہم کو اپنے کھانے کی نہیں، دوسروں کو کھلانے کی فکر رہتی تھی۔ تم کو بس اپنا پیٹ بھرنے کا ،اپنے شوق کا، اپنے تکلفات کا خیال ہے۔ یہ جائداد بنانے کی نہیں بگاڑنے کی صورتیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم نے دوسروں کے لیے بگاڑا۔ تم اپنے لیے بگاڑوگے۔ براہمنوں کو نہ کھلائیں۔ برادری سے آنکھیں چُرائیں۔ عزیزوں سے راہ و رسم نہ رکھیں۔ محض اس لیے کہ تمھارے فٹن اور گھوڑے کے لیے روپے نکل آئے ۔یہ ہم سے نہ ہوگا۔

مصیبت یہ تھی کہ گیان شنکر کی بیوی وِدّیا بھی ان امور میں اپنے شوہر کی ہم خیال نہ تھی۔ اُس کے خیال بہت کچھ لالہ پربھاشنکر سے ملتے تھے۔ اُسے دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر تھی۔ وہ گیان شنکر کو چچا سے حُجت اور تکرار کرتے دیکھتی تو اُسے صدمہ ہوتا تھا۔ اور موقع ملنے پر وہ انھیں سمجھانے کی کوشش کیاکرتی تھی۔ پر گیان شنکر اُسے جھڑک دیتے

تھے۔ وہ مغربی تہذیب کے دلدادہ ہوکر بھی عورت کی عزّت کرنی نہ جانتے تھے۔ نقل کی تو مغرب کی بُرائیوں کی۔ ترک کرنا چاہتے تھے تو مشرق کی خوبیاں۔ دونوں خوبیوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور دونوں برائیاں گرہ باندھ لی تھیں۔

(۳)

منوہر اکھڑپنے کی باتیں تو کربیٹھا لیکن تنہائی میں جب ذرا غصہ دھیما ہوا تو اُسے معلوم ہوا کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ سوچنے لگا اَب کیا کروں؟ گاؤں والے سب کے سب میرے دشمن ہیں۔ اس وقت سب کے سب چوپال میں بیٹھے میری بُرائی کر رہے ہوں گے۔ کارندہ نہ جانے کیا فساد کھڑا کر دے۔ بیچارے دُرجن کو بات کی بات میں ملیامیٹ کردیا تو پھر مجھ سے بگاڑتے کیا دیر لگتی ہے؟ میں اپنی زبان سے لاچار ہوں۔ کتنا ہی اسے قابو میں رکھنا چاہتا ہوں، لیکن بس نہیں چلتا ہے۔ یہی تو ہوتا کہ جہاں اور سب قرض دام سر پر ہے وہاں دس روپے اور ہوجاتے۔ نکو تو نہ بنتا۔

لیکن ان خیالات نے ذرا دیر میں پھر پہلو بدلا۔ انسان جس کام کو طبعاً بُرا نہیں سمجھتا اُس کے بُرے نتائج کا خوف بالآخر ایک خوددارانہ صبر کی پناہ لیا کرتا ہے۔ منوہر اب اس خیال سے تسکین دینے لگا، میں بگڑ جاؤں گا تو بَلا سے۔ کسی کی دھونس تو نہ سہوں گا۔ کسی کے سامنے سر تو نیچا نہیں کرتا۔ زمیندار بھی تو دیکھ لے کہ گاؤں میں سب کے سب بھیڑ ہی نہیں ہیں۔ اگر کوئی معاملہ کھڑا کیا تو عدالت میں حاکم کے سامنے سارا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ ساری قلعی کھول دوں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

اسی اُدھیڑبُن میں پڑا ہوا وہ کھانا کھانے گیا۔ چوکے میں ایک مٹی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ لیکن گھر میں اتنا دھواں بھرا ہوا تھا اور چھت ایسی سیاہ ہوگئی تھی کہ اُس کی روشنی ماند پڑگئی تھی۔ اس کی بیوی بلاسی نے پیتل کی تھالی میں بتھوے کا ساگ اور جو کی موٹی موٹی روٹیاں پروس دیں۔

منوہر اس طرح کھانے لگا گویا کوئی دوا ہے۔ اتنی ہی رغبت سے وہ گھاس بھی کھاتا۔

بلاسی نے پوچھا کیا ساگ اچھا نہیں؟ گڑ دوں؟

منوہر۔ نہیں ساگ تو اچھا ہے۔

بلاسی۔ تو کیا بھوک نہیں ہے؟

منوہر۔ بھوک کیوں نہیں ہے؟ کھا تو رہاہوں۔
بلاسی۔ کھاتے تو نہیں ہو جیسے اونگھ رہے ہو۔ کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوگیا؟
منوہر ۔ نہیں جھگڑا کس سے ہوتا۔

اتنے میں ایک گٹھے ہوئے بدن کے تناور نوجوان نے کوٹھڑی میں جھانکا۔ اس کے گلے میں ایک سونے کی تعویذ تھی۔ سینہ فراخ اور بھرا ہوا۔ آنکھوں سے جیالاپن برس رہا تھا۔ یہ منوہر کا لڑکا بلراج تھا۔

بلاسی نے کہا۔ کہاں گھوم رہے ہو؟ آؤ کھالو۔ تھالی پروسوں؟

بلراج نے دھوئیں کے باعث آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ کیوں دادا آج گردمہراج تم سے کیوں بگڑرہے تھے؟ لوگ کہتے ہیں کہ بہت لال پیلے ہورہے تھے۔

منوہر۔ کچھ نہیں۔ تم سے کون کہتا تھا؟
بلراج ۔ سبھی لوگ تو کہہ رہے ہیں۔ تم سے گھی مانگتے تھے۔ تم نے کہا میرے پاس گھی نہیں ہے۔ بس اِسی پر تن گئے۔
منوہر۔ ارے تو کوئی جھگڑا تھوڑے ہی ہوا۔ گردمہراج نے یہی کہا کہ تمھیں گھی دینا پڑے گا۔ میں نے کہہ دیا جب گھی ہوگا تبْ دے دیں گے۔ ابھی نہیں ہے۔ اس میں لڑائی جھگڑے کی کون بات تھی!
بلراج ۔ جھگڑے کی بات کیوں نہیں ہے۔ کوئی ہم سے کیوں گھی مانگے؟ کسی کا دیا کھاتے ہیں یا کسی کے گھر مانگنے جاتے ہیں۔ اپنا تو ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑتے تو ہم دھونس کیوں سہیں۔ نہ ہوا میں، نہیں تو دکھا دیتا۔ کیا ہم کو بھی دُرجن سمجھ لیا ہے۔

منوہر کا سینہ غرور سے پھولا جاتا تھا۔ پر اس کے ساتھ ہی یہ فکر کہ کہیں یہ کوئی اجڈپن نہ کر بیٹھے اُسے بیٹے کی سرزنش پر مجبور کر رہی تھی۔ بولا آؤ چپکے سے بیٹھ کے کھانا کھالو۔ بہت بہکنا اچھا نہیں ہوتا۔ کوئی سُن لے گا تو جاکر وہ ایک کے چار جڑ آئے گا۔ یہاں کوئی اپنا دوست نہیں ہے۔

بلراج ۔ سُن لے گا تو کیا کسی سے چھپا کے کہتے ہیں۔ جسے بہت گھمنڈ ہو آکے دیکھ لے۔ایک ایک کا سر توڑکے رکھ دوں۔ یہی نہ ہوگا کیا۔ چلا جاؤں گا۔ اِس سے کیا ڈر۔ مہاتما گاندھی بھی تو گیا۔ ہو آئے ہیں۔

بلاسی نے منوہر کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تمھاری کیسی عادت ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک جھگڑا مچائے ہی رہتے ہو۔ جب سارا گاؤں گھی دے رہا ہے تو ہم کیا گاؤں سے باہر ہیں۔ جیسے بن پڑے گا دیں گے۔ اس میں کوئی اپنی بیٹھی تھوڑے ہی ہوئی جاتی ہے۔ بیٹھا تو نارائن ہی نے بنا دیا ہے تو اس طرح اکڑنے سے تھوڑے ہی اونچے ہوجائیں گے۔ تھوڑا سا گھی ہانڈی میں ہے۔ دوچار دن میں اور بٹور لوں گی۔ جاکر تول آنا۔

بلراج۔ کیوں دے آئیں؟ کسی کے دبیل ہیں؟

بلاسی۔ نہیں تم تو لاٹ گورنر ہو۔ گھر میں بھونی بھانگ نہیں اس پر اتنا مجاج۔

بلراج ۔ ہم دَلِدر سہی۔ کسی سے مانگنے تو نہیں جاتے۔

بلاسی۔ ارے جا بیٹھ، آیا ہے بڑا جودھا بن کے۔ اونٹ جب تک پہاڑ نہیں دیکھتا سمجھتا ہے مجھ سے اونچا اور کون ہوگا۔ گاؤں میں رہ کر جمیندار سے بیر کرنا ہنسی نہیں ہے۔ (منوہر سے) سُنتے ہو مہاپُرش۔ کل کارندہ کے پاس جاکے کہہ سُن آنا۔ ایسا نہ ہو کوئی معاملہ کھڑا کردے۔

منوہر۔ میں تو اب نہ جاؤں گا۔

بلاسی۔ کیوں؟

منوہر۔ کیوں کیا اپنی کھوسی ہے۔ جائیں کیا اپنے اوپر تالیاں لگوانے!

بلاسی۔ اچھا مجھے تو جانے دوگے؟

منوہر ۔ تمھیں بھی نہ جانے دوں گا۔ کارندہ ہمارا کرہی کیا سکتا ہے۔ بہت کرے گا اپنے سِکمی کھیت نکال لے گا۔ نہ دو ہل چلیں گے۔ ایک ہی سہی۔

اگرچہ منوہر بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہا تھا مگر فی الواقع اُس کا انکار اب محض ہاری ہوئی دلیل تھی۔ اگر بلا دوسروں کی نگاہوں میں خفیف ہوئے اس غلطی کی اصلاح ممکن ہو تو اُسے اب بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہاں وہ اپنی طرف سے معافی مانگنے میں اپنی تحقیر سمجھتا تھا۔ ایک بار تن کر پھر جھکنا بڑے شرم کی بات تھی۔ بلراج کی شوریدہ سری اُسے رام کرنے میں دیگر نقصانات کے اندیشے سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوئی تھی۔

علی الصّباح بلاسی چوپال جانے پر آمادہ ہوئی پر نہ منوہر ساتھ چلنے پر راضی ہوتا تھا نہ بلراج۔ اکیلے جانے کی اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اسی اثنا میں قادرخاں مکان میں داخل ہوئے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ ٹھگنا قد۔ لمبی داڑھی۔ گھٹنے کے اوپر تک دھوتی۔ ایک گاڑھے کی

مرزائی پہنے ہوئے تھے۔ گاؤں کے ناتے سے وہ منوہر کے بڑے بھائی ہوتے تھے۔ بلاسی نے اُنھیں دیکھنے سے گھونگھٹ نکال لیا۔

قادرخاں نے اندازِ تفکر سے کہا۔ ارے منوہر کل تمھیں کیا سوجھ گئی۔ جلدی سے جاکر لوگوں کو راجی کرلو نہیں تو پھر کچھ کرتے دھرتے نہ بنے گی۔ سُنا ہے کارندہ صاحب تمھاری سکایت کرنے مالکوں کے پاس جارہے ہیں۔ سُکھوٗ بھی ساتھ جانے کو تیار ہے۔ نہیں معلوم دونوں میں کیا سانٹھ گانٹھ ہوئی ہے۔

بلاسی۔ بھائی جی یہ بوڑھے ہوگئے لیکن ان کا لڑکپن ابھی نہیں گیا۔ کتنا سمجھاتی ہوں بس اپنے ہی من کی کرتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ایک لڑکا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ جس سے دیکھو اُسی سے اُلجھ پڑتا ہے۔ بھلا اِن سے پوچھو کہ جب سارے گاؤں نے روپئے لیے تو تمھیں ناہیں کرنے کی کیا پڑی تھی۔

قادر ۔ اِن کی بھول ہے اور کیا۔ دس روپئے ہمیں بھی لینے پڑے۔ کیا کرتے؟ اور یہ کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔ بڑے سرکار تھے تب بھی تو ایک نہ ایک بیگار لگی ہی رہتی تھی۔

منوہر نے سر اُٹھاکر کہا۔ بھیّا تب کی باتیں جانے دو۔ تب سال سال دو دو سال کی دین باکی پڑجاتی تھی۔ مُدا مالک کبھی بے دکھلی، کُڑکی نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی کام کاج پڑتا تب تو ہم لوگوں کو نیوتا ملتا تھا۔ لڑکیوں کے بیاہ کے لیے دربار سے لکڑی چارہ اور پچیس روپئے نکد بندھے ہوئے تھے۔ یہ سب جانتے ہو کہ نہیں۔ جب وہ اپنے لڑکوں کی طرح پالتے تھے تو رعیت بھی ہنسی کھُسی اُن کی بیگار کرتی تھی۔ اب وہ باتیں تو گئیں۔ بس ایک نہ ایک پچڑ لگا رہتا ہے۔ سال نہیں بیتا پر کئی اسامیوں پر بکایا کی نالس ہوگئی۔ جافا کا چٹھا تیار ہورہاہے۔ تو جب اُن کی اور سے یہ کڑائی ہے تو ہم بھی کوئی مٹی کے دیوتا تھوڑے ہی ہیں!

قادر۔ تب کی باتیں چھوڑو اب جو سامنے ہے اُسے دیکھو۔ چلو جلدی کرو۔ میں اسی لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔ میرے بیل کھیت میں کھڑے ہیں۔

منوہر۔ دادا میں تو نہ جاؤں گا۔

بلاسی ۔ اِن کی چوڑیاں میلی ہوجائیں گی۔ چلو میں چلتی ہوں۔

قادر اور بلاسی دونوں چوپال چلے۔ وہاں اس وقت بہت سے آدمی جمع تھے۔ کچھ لوگ لگان کے روپے داخل کرنے آئے تھے۔ کچھ گھی کے روپے لینے کے لیے اور کچھ لوگ

محض تماشا دیکھنے اور درباداری کرنے کے لیے۔ کارندہ صاحب کا نام غلام غوث خاں تھا۔ بھاری بھرکم آدمی تھے۔ سانولا رنگ۔ لمبی داڑھی۔ چہرے سے ہیبت برستی تھی۔ اپنے شباب میں وہ فوج میں ملازم تھے اور حولدار کے رتبے تک پہنچے تھے۔ جب شمالی سرحد پر کچھ آویزش ہوئی تو بیماری کی رخصت لے کر گھر چلے آئے اور یہیں سے استعفیٰ داخل کردیا۔ وہ اب بھی اپنی فوجی زندگی کے واقعات مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ تخت پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ سُکھو اور دُکھرن تخت کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

سُکھو نے کہا ہم مجبور ٹھیرے۔ ہم گھمنڈ کریں توہماری بھول ہے۔ جمیندار کی جمین میں بستے ہیں۔ اُس کا دیا کھاتے ہیں۔ اُس سے بگڑ کر کہاں جائیں گے؟ کیوں دُکھرن؟

دُکھرن۔ ہاں ٹھیک ہی ہے۔

سُکھو۔ نارائن ہمیں چار پیسے دس من اناج دے تو اپنے مالکوں سے اڑیں۔ مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پیر نہ رکھیں!

دُکھرن۔ یہی مد تو آدمی کو کھراب کرتا ہے۔ اسی مد نے راون کو مٹایا۔ اِسی کے کارن جراسندھ اور جرجودھن کا ستیاناس ہوگیا۔ تو بھلا ہماری تمھاری کون بات ہے؟ ہمارا دھرم تو یہ ہے کہ جتنا ہی پرماتما دے اتنا ہی اور جھکیں۔

اِسی اثنا میں قادرخاں چوپال میں آئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے بلاسی بھی تھی۔ سکھو چودھری اِنھیں دیکھتے ہی خاموش ہوگئے۔

قادر نے کہا۔ کھاں صاحب یہ منوہر کی گھروالی آئی ہے۔ جتنے روپے چاہیں گھی کے لیے دے دیں۔ بے چاری ڈر کے مارے آتی نہ تھی۔

غوث خاں نے کرخت لہجے میں کہا۔ وہ کہاں ہے منوہر، کیا اُسے آتے شرم آتی تھی؟

بلاسی نے عاجزی سے کہا۔ سرکار اُن کی باتوں کا کچھ کھیال نہ کریں۔ آپ کی گلامی کرنے کو میں ہاجر ہوں۔

قادر۔ یوں تو گئو ہے پر نہ جانے کیوں کبھی کبھی اُس کے سر بھوت سا سوار ہوجاتا ہے۔ کیوں سُکھو مہتو۔ آج تک کسی سے اُسے گاؤں میں لڑتے دیکھا؟

سُکھو نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔ نہیں بھائی کوئی جھوٹ تھوڑے ہی کہہ دے گا۔

قادر۔ اب گھر میں بیٹھا رو رہا ہے۔ کتنا سمجھایا چل کر کھاں صاحب سے اپنے کھتا کسور کی
ماپھی کرا لے لیکن سرم کے مارے آتا ہی نہیں ہے۔

غوث خاں۔ شرم نہیں شرارت ہے۔ اس کے سر پر جو بھوت چڑھا ہوا ہے اُس کا اُتار
میرے پاس ہے۔ یہ غرور کا بھوت ہے۔

قادر۔ ارے کھاں صاحب۔ بے چارہ مجور کس بات پر گرور کرے گا۔ مورکھ اُجڈ آدمی ہے۔
بات کرنے کا سہور نہیں ہے اور کیا۔

غوث خاں۔ تمھیں وکالت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا کام خوب جانتا ہوں۔ اگر
اِس طرح دبنے لگا تب تو مجھ سے اس علاقے کا اہتمام ہوچکا۔ آج ایک نے سرکشی کی
ہے۔ کل دوسرے تیور بدلنے لگیں گے۔ پھر غریب زمیندار کو کون پوچھتا ہے۔ اگر
پلٹن میں کسی نے ایسی شرارت کی ہوتی تو فوراً ''کورٹ مارشل'' ہوجاتا۔ زمیندار سے
آنکھیں بدلنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔

یہ انقطاعی باتیں کرکے غوث خاں ٹانگھن پر سوار ہونے چلے۔ بلاسی زاروقطار روتی ہوئی اُن کے سامنے بے کسانہ انداز سے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ سرکار کہیں کی نہ رہوں گی۔ جو ڈانڑ چاہے لگا دیجیے۔ جو سجا چاہے دیجیے۔ پر مالکوں کے کان میں یہ بات نہ ڈالیے۔

لیکن خاں صاحب نے سکھوّ چودھری کو ہتھے چڑھا لیا تھا۔ وہ روکھی رحم دلی اور انسانیت کے چکمے میں نہ آنا چاہتے تھے۔ فوراً ٹانگھن پر سوار ہوگئے اور سکھوّ کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ قادر نے گردھر مہراج کے کان میں آہستہ سے کہا۔ کیوں مہراج بچارے گریب کا ستیاناس کرکے تبھی دم لوگے؟

گردھر نے شانِ حکومت سے کہا جب تم ہم کو آنکھیں دکھاؤ گے تب ہم بھی اپنی سی کرکے رہیں گے۔ ہم سے کوئی ایک اُنگل دبے ہم اُس سے ہاتھ بھر دبنے کو تیار ہیں۔ لیکن جو ہم سے جَو بھر تنے گا ہم اُس سے گج بھر تن جائیں گے۔

قادر۔ یہ تو پدّ ہی ہے۔ تم ہم کسانوں سے دبنے لگوگے تو تمھیں کون پوچھے گا؟ مُدا اب
منوہر کے لیے کوئی راہ نکالو۔ اُس کا سبھاؤ تو جانتے ہی ہو۔ گسیل آدمی ہے۔ پہلے
بگڑ جاتا ہے پھر بیٹھ کر روتا ہے۔ بے چارہ مٹی میں مِل جائے گا۔

بلاسی نے منوہر کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تمھاری کیسی عادت ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک جھگڑا مچائے ہی رہتے ہو۔ جب سارا گاؤں گھی دے رہا ہے تو ہم کیا گاؤں سے باہر ہیں۔ جیسے بن پڑے گا دیں گے۔ اس میں کوئی اپنی بیٹھی تھوڑے ہی ہوئی جاتی ہے۔ بیٹھا تو نارائن ہی نے بنا دیا ہے تو اس طرح اکڑنے سے تھوڑے ہی اونچے ہوجائیں گے۔ تھوڑا سا گھی ہانڈی میں ہے۔ دوچار دن میں اور بٹور لوں گی۔ جاکر تول آنا۔

بلراج۔ کیوں دے آئیں؟ کسی کے دبیل ہیں؟

بلاسی۔ نہیں تم تو لاٹ گورنر ہو۔ گھر میں بھونی بھانگ نہیں اس پر اتنا مجاج۔

بلراج ۔ ہم دِلدِر سہی۔ کسی سے مانگنے تو نہیں جاتے۔

بلاسی۔ ارے جا بیٹھ، آیا ہے بڑا جودھا بن کے۔ اونٹ جب تک پہاڑ نہیں دیکھتا سمجھتا ہے مجھ سے اونچا اور کون ہوگا۔ گاؤں میں رہ کر جمیندار سے بیر کرنا ہنسی نہیں ہے۔ (منوہر سے) سُنتے ہو مہاپُرش۔ کل کارندہ کے پاس جاکے کہہ سُن آنا۔ ایسا نہ ہو کوئی معاملہ کھڑا کردے۔

منوہر۔ میں تو اب نہ جاؤں گا۔

بلاسی۔ کیوں؟

منوہر۔ کیوں کیا اپنی کھوسی ہے۔ جائیں کیا اپنے اوپر تالیاں لگوانے!

بلاسی۔ اچھا مجھے تو جانے دوگے؟

منوہر ۔ تمھیں بھی نہ جانے دوں گا۔ کارندہ ہمارا کرہی کیا سکتا ہے۔ بہت کرے گا اپنے سِکمی کھیت نکال لے گا۔ نہ دو ہل چلیں گے۔ ایک ہی سہی۔

اگرچہ منوہر بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہا تھا مگر فی الواقع اُس کا انکار اب محض ہاری ہوئی دلیل تھی۔ اگر بلا دوسروں کی نگاہوں میں خفیف ہوئے اس غلطی کی اصلاح ممکن ہو تو اُسے اب بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہاں وہ اپنی طرف سے معافی مانگنے میں اپنی تحقیر سمجھتا تھا۔ ایک بار تن کر پھر جھکنا بڑے شرم کی بات تھی۔ بلراج کی شوریدہ سری اُسے رام کرنے میں دیگر نقصانات کے اندیشے سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوئی تھی۔

علی الصّباح بلاسی چوپال جانے پر آمادہ ہوئی پر نہ منوہر ساتھ چلنے پر راضی ہوتا تھا نہ بلراج۔ اکیلے جانے کی اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اسی اثنا میں قادرخاں مکان میں داخل ہوئے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ ٹھگنا قد۔ لمبی داڑھی۔ گھٹنے کے اوپر تک دھوتی۔ ایک گاڑھے کی

مرزائی پہنے ہوئے تھے۔ گاؤں کے ناتے سے وہ منوہر کے بڑے بھائی ہوتے تھے۔ بلاسی نے اُنھیں دیکھنے سے گھونگھٹ نکال لیا۔

قادر خاں نے اندازِ تفکر سے کہا۔ ارے منوہر کل تمھیں کیا سوجھ گئی۔ جلدی سے جاکر لوگوں کو راجی کرلو نہیں تو پھر کچھ کرتے دھرتے نہ بنے گی۔ سُنا ہے کارندہ صاحب تمھاری سکایت کرنے مالکوں کے پاس جارہے ہیں۔ سُکھو بھی ساتھ جانے کو تیار ہے۔ نہیں معلوم دونوں میں کیا سانٹھ گانٹھ ہوئی ہے۔

بلاسی۔ بھائی جی یہ بوڑھے ہوگئے لیکن ان کا لڑکپن ابھی نہیں گیا۔ کتنا سمجھاتی ہوں بس اپنے ہی من کی کرتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ایک لڑکا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ جس سے دیکھو اُسی سے اُلجھ پڑتا ہے۔ بھلا اِن سے پوچھو کہ جب سارے گاؤں نے روپے لیے تو تمھیں ناہیں کرنے کی کیا پڑی تھی۔

قادر ۔ اِن کی بھول ہے اور کیا۔ دس روپے ہمیں بھی لینے پڑے۔ کیا کرتے؟ اور یہ کوئی نئ بات تھوڑے ہی ہے۔ بڑے سرکار تھے تب بھی تو ایک نہ ایک بیگار لگی ہی رہتی تھی۔

منوہر نے سر اُٹھاکر کہا۔ بھیّا تب کی باتیں جانے دو۔ تب سال سال دو دو سال کی دین باکی پڑجاتی تھی۔ مُدا مالک کبھی بے دکھلی، ہُرکی نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی کام کاج پڑتا تب تو ہم لوگوں کو نیوتا ملتا تھا۔ لڑکیوں کے بیاہ کے لیے دربار سے لکڑی چارہ اور پچیس روپے نکد بندھے ہوئے تھے۔ یہ سب جانتے ہو کہ نہیں۔ جب وہ اپنے لڑکوں کی طرح پالتے تھے تو رعیت بھی ہنسی کھُسی اُن کی بیگار کرتی تھی۔ اب وہ باتیں تو گئیں۔ بس ایک نہ ایک پچڑ لگا رہتا ہے۔ سال نہیں بیتا پر کئی اسامیوں پر بکایا کی نالس ہوگئی۔ جافا کا چٹھا تیار ہورہاہے۔ تو جب اُن کی اورسے یہ کڑائی ہے تو ہم بھی کوئی مٹّی کے دیوتا تھوڑے ہی ہیں!

قادر۔ تب کی باتیں چھوڑو اب جو سامنے ہے اُسے دیکھو۔ چلو جلدی کرو۔ میں اسی لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔ میرے بیل کھیت میں کھڑے ہیں۔

منوہر۔ دادا میں تو نہ جاؤں گا۔

بلاسی ۔ اِن کی چوڑیاں میلی ہوجائیں گی۔ چلو میں چلتی ہوں۔

قادر اور بلاسی دونوں چوپال چلے۔ وہاں اس وقت بہت سے آدمی جمع تھے۔ کچھ لوگ لگان کے روپے داخل کرنے آئے تھے۔ کچھ گھی کے روپے لینے کے لیے اور کچھ لوگ

محض تماشا دیکھنے اور درباداری کرنے کے لیے۔ کارندہ صاحب کا نام غلام غوث خاں تھا۔ بھاری بھرکم آدمی تھے۔ سانولا رنگ۔ لمبی داڑھی۔ چہرے سے ہیبت برستی تھی۔ اپنے شباب میں وہ فوج میں ملازم تھے اور حولدار کے رتبے تک پہنچے تھے۔ جب شمالی سرحد پر کچھ آویزش ہوئی تو بیماری کی رخصت لے کر گھر چلے آئے اور یہیں سے استعفیٰ داخل کردیا۔ وہ اب بھی اپنی فوجی زندگی کے واقعات مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ تخت پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ سکھو اور دُکھرن تخت کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

سکھو نے کہا ہم مجور ٹھیرے۔ ہم گھمنڈ کریں توہماری بھول ہے۔ جمیندار کی جمین میں بستے ہیں۔ اُس کا دیا کھاتے ہیں۔ اُس سے بگڑکر کہاں جائیں گے؟ کیوں دُکھرن؟

دُکھرن۔ ہاں ٹھیک ہی ہے۔

سکھو۔ نارائن ہمیں چار پیسے دس من اناج دے تو اپنے مالکوں سے اڑیں۔ مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پیر نہ رکھیں!

دُکھرن۔ یہی مد تو آدمی کو کھراب کرتا ہے۔ اسی مد نے راون کو مٹایا۔ اِسی کے کارن جراسندھ اور جرجودھن کا ستیاناس ہوگیا۔ تو بھلا ہماری تمھاری کون بات ہے؟ ہمارا دھرم تو یہ ہے کہ جتنا ہی پرماتما دے اتنا ہی اور جھکیں۔

اِسی اثنا میں قادرخاں چوپال میں آئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے بلاسی بھی تھی۔ سکھو چودھری اِنھیں دیکھتے ہی خاموش ہوگئے۔

قادر نے کہا۔ کھاں صاحب یہ منوہر کی گھروالی آئی ہے۔ جتنے روپے چاہیں گھی کے لیے دے دیں۔ بے چاری ڈر کے مارے آتی نہ تھی۔

غوث خاں نے کرخت لہجے میں کہا۔ وہ کہاں ہے منوہر، کیا اُسے آتے شرم آتی تھی؟

بلاسی نے عاجزی سے کہا۔ سرکار اُن کی باتوں کا کچھ کھیال نہ کریں۔ آپ کی گلامی کرنے کو میں ہاجر ہوں۔

قادر۔ یوں تو گئو ہے پر نہ جانے کیوں کبھی کبھی اُس کے سر بھوت سا سوار ہوجاتا ہے۔ کیوں سکھو مہتو۔ آج تک کسی سے اُسے گاؤں میں لڑتے دیکھا؟

سکھو نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔ نہیں بھائی کوئی جھوٹ تھوڑے ہی کہہ دے گا۔

قادر۔ اب گھر میں بیٹھا رو رہا ہے۔ کتنا سمجھایا۔ چل کر کھاں صاحب سے اپنے کھتا کسور کی
ماپھی کرالے لیکن سرم کے مارے آتا ہی نہیں ہے۔

غوث خاں۔ شرم نہیں شرارت ہے۔ اس کے سر پر جو بھوت چڑھا ہوا ہے اُس کا اُتار
میرے پاس ہے۔ یہ غرور کا بھوت ہے۔

قادر۔ ارے کھاں صاحب۔ بے چارہ مجور کس بات پر گرور کرے گا۔ مورکھ اُجڈ آدمی ہے۔
بات کرنے کا سہور نہیں ہے اور کیا۔

غوث خاں۔ تمھیں وکالت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا کام خوب جانتا ہوں۔ اگر
اِس طرح دبنے لگا تب تو مجھ سے اس علاقے کا اہتمام ہوچکا۔ آج ایک نے سرکشی کی
ہے۔ کل دوسرے تیور بدلنے لگیں گے۔ پھر غریب زمیندار کو کون پوچھتا ہے۔ اگر
پلٹن میں کسی نے ایسی شرارت کی ہوتی تو فوراً ''کورٹ مارشل'' ہوجاتا۔ زمیندار سے
آنکھیں بدلنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔

یہ انتقامی باتیں کرکے غوث خاں ٹانگھن پر سوار ہونے چلے۔ بلاسی زاروقطار روتی
ہوئی اُن کے سامنے بے کسانہ انداز سے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ سرکار کہیں کی
نہ رہوں گی۔ جو ڈانڑ چاہے لگا دیجیے۔ جو سجا چاہے دیجیے۔ پر مالکوں کے کان میں یہ بات نہ
ڈالیے۔

لیکن خاں صاحب نے سکھوّ چودھری کو ہتھے چڑھا لیا تھا۔ وہ روکھی رحم دلی اور
انسانیت کے چکمے میں نہ آنا چاہتے تھے۔ فوراً ٹانگھن پر سوار ہوگئے اور سکھوّ کو آگے چلنے کا
اشارہ کیا۔ قادر نے گردھر مہراج کے کان میں آہستہ سے کہا۔ کیوں مہراج بچارے گریب کا
ستیاناس کرکے تبھی دم لوگے؟

گردھر نے شانِ حکومت سے کہا جب تم ہم کو آنکھیں دکھاؤ گے تب ہم بھی اپنی سی
کرکے رہیں گے۔ ہم سے کوئی ایک اُنگل دبے ہم اُس سے ہاتھ بھر دبنے کو تیار ہیں۔ لیکن
جو ہم سے جَو بھر تنے گا ہم اُس سے گج بھر تن جائیں گے۔

قادر۔ یہ تو پدّ ہی ہے۔ تم ہم کسانوں سے دبنے لگوگے تو تمھیں کون پوچھے گا؟ مُدا اب
منوہر کے لیے کوئی راہ نکالو۔ اُس کا سبھاؤ تو جانتے ہی ہو۔ گسیل آدمی ہے۔ پہلے
بگڑجاتا ہے پھر بیٹھ کر روتا ہے۔ بے چارہ مٹی میں مِل جائے گا۔

گردھر۔ بھائی اب تو تیر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ سکھوٗ سے سانٹھ گانٹھ ہوگئی۔ منوہر کے کھیت نکال کر سکھوٗ کو دیں گے۔

قادر۔ اُس کی ہتیا تمھارے ہی اوپر ہوگی۔

گردھر۔ منوہر سے کہہ دو اسی دم وہ بھی مالکوں کے پاس چلا جائے۔ اور ہاتھ پیر پڑے۔ میں بھی کچھ کہہ سُن دوں گا۔ تم لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے کا جی تو نہیں چاہتا۔ کام پڑنے پر گھگھیاتے ہو۔ کام نکل گیا تو سیدھے مُنہ بات نہیں کرتے۔ لیکن اپنی کرنی اپنے ساتھ ہے۔ جاکر اُسے بھیج دو۔

قادر اور بلاسی منوہر کے پاس گئے۔ وہ امیدوبیم کی تصویر بنا ہوا راستے کی طرف تاک رہا تھا۔ قادر نے جاتے ہی یہاں کی ساری کیفیت بیان کی اور گردھرمہراج کا پیغام بھی سُنا دیا۔ منوہر دیر تک سوچتا رہا۔ تب بولا۔ وہاں میری اور دُرگت ہوگی۔ اب تو سرپر پڑی ہی ہے جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔

قادر۔ نہیں تمھارا جانا جروری ہے۔ چلو میں بھی چلا چلتا ہوں۔

منوہر۔ میرے پیچھے تمھاری بھی لے دے ہوگی۔

بلاسی نے قادر کی طرف نہایت منت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ بھائی جی یہ نہ جائیں گے۔ میں ہی تمھارے ساتھ چلی چلوں گی۔

قادر۔ تم کیا چلوگی۔ وہاں بڑے آدمیوں کے سامنے مُنہ نہ کھلے گا۔

بلاسی۔ کچھ کہتے نہ بنے گا تو رو تو لوں گی۔

قادر۔ یہ جانے دیں گے؟

بلاسی۔ جانے کیوں نہ دیں گے۔ میں اِن سے کچھ مانگتی ہوں۔ اِنھیں اپنا بھلا بُرا نہ سوجھتا ہو پر مجھے تو سُوجھتا ہے۔

قادر۔ تو پھر دیر نہ کرنی چاہیے نہیں تو وہ لوگ پہلے ہی سے پہنچ کر مالکوں کے کان بھر دیں گے۔

منوہر بے حس و حرکت اپنے خیالوں میں محو بیٹھا رہا۔ بلاسی گھر میں گئی۔ اپنے گہنے نکال کر پہنے۔ چادر اوڑھی اور باہر نکل کر کھڑی ہوگئی۔ قادر خاں دُبدھے میں پڑے ہوئے تھے۔ اُنھیں امید تھی کہ شاید اب منوہر بھی اُٹھے لیکن جب وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا

تو وہ آہستہ آہستہ آگے چلے۔ بلاسی بھی پیچھے پیچھے چلی۔ پر رہ رہ کر مُتردّد نگاہوں سے منوہر کی طرف تاکتی جاتی تھی۔ جب وہ دونوں گاؤں کے باہر نکل گئے تو منوہر بھی کچھ سوچ کر اُٹھا اور لپکا ہوا قادرخاں کے قریب آکر بلاسی سے بولا جا گھر بیٹھ۔ میں جاتا ہوں۔

(۴)

سہ پہر کا وقت تھا۔ بابوگیان شنکر دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ کہار نے آکر کہا بابوصاحب پوچھتے ہیں کیا وقت ہے۔ گیان شنکر نے ترش ہوکر کہا، جا کہہ دے آپ کو نیچے بلاتے ہیں۔ کیاسارے دن سوتے ہی رہیں گے کیا؟

اِن بابوصاحب کا نام جوالا سنگھ تھا۔ گیان شنکر کے ہم جماعت تھے اور آج ہی اِس ضلع میں ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوکر آئے تھے۔ دوپہر تک دونوں دوستوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ جوالا سنگھ رات بھرکے جاگے تھے۔ ٹرین میں سونے کا موقع نہ ملاتھا۔ کھانا کھاکر سوگئے۔ لیکن گیان شنکر کو نیند نہ آئی۔ اُن کی چھاتی پر اس وقت سانپ سا لوٹ رہا تھا۔ ادنیٰ لوگ بازی لیے جاتے ہیں اور میں کہیں کا نہ ہوا۔ کبھی اپنے اوپر غصہ آتا۔ کبھی اپنے والد مرحوم اور چچا کی ناحُکام رسی پر۔ وہ ہمسرانہ رقابت جو اب تک حسد سے پاک تھی بدخواہی کی صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ اگر اس وقت کسی وجہ سے جوالاسنگھ کی تقرّری کا حکم منسوخ ہوجاتا تو شاید گیان شنکر کو راحتِ قلب حاصل ہوتی۔ وہ اس سفلہ خیال کو دل سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اپنے تئیں سمجھاتے تھے کہ اپنی اپنی تقدیر ہے۔ اگر ہمارا دوست کسی اونچے منصب پر مامور ہوتا ہے تو ہمیں خوش ہونا چاہیے۔ لیکن اپنی نارسائی کا زخم اِن مرہموں سے کسی طرح نہ بھرتا تھا۔ اور بہت احتیاط کرنے پر بھی دورانِ گفتگو میں اُن کی یہ کم ظرفی ظاہر ہوجاتی تھی۔ جوالا سنگھ کو معلوم ہو رہاتھا کہ میری کامیابی انھیں جلائے ڈالتی ہے۔ لیکن اس میں سراسر گیان شنکر ہی کی سفلہ طبعی کی خطا نہ تھی۔ جوالاسنگھ کی باتوں میں، برتاو بات میں اب پہلے کی سی دوستانہ بے تکلفی نہ تھی۔ اُن میں اب ایک شانِ فضیلت، ایک احساس تفوق، ایک مربّیانہ رواداری پائی جاتی تھی، جو گیان شنکر کے زخم پر نمک کا کام کررہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جوالاسنگھ کے مزاج میں یہ تغیر بالقصد نہ تھا۔ وہ اتنے فرومایہ نہ تھے کہ اپنے ایک پُرانے دوست کی ناکامی پر طنز کرتے۔ مگر اپنی کامیابی کے زعم میں وہ اپنے دوست کے جذبات کی طرف سے بے خبر ہوگئے تھے۔ اُن کی

بے تکلفی کی کوششیں اب مصنوعی ارادی معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کا بے ساختہ پن غائب ہوگیاتھا۔ اور گیان شنکر اتنے عالی ظرف نہ تھے کہ اُسے ایک انسانی خاصہ یا کمزوری سمجھتے یا انسانی خصلت کے مطالعہ کا فلسفیانہ لطف اُٹھاتے۔

کہار کے جانے کے ایک لمحے بعد بابو جوالا سنگھ اوپر سے اُتر پڑے اور بولے یار بتاؤ کیا وقت ہے؟ ذرا صاحب سے ملنا ہے۔

گیان شنکر نے کہا۔ اجی ابھی آرام سے سوؤ۔ مِل لینا۔ کیا جلدی ہے۔

جوالا سنگھ۔ نہیں یار ایک بار مِل لینا ضروری ہے۔ ذرا معلوم تو ہوجائے کس قماش کا آدمی ہے۔ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ جب اُس کی ماتحتی کرنی ہے تو اس کے مزاج سے واقف ہونا ضروری ہے۔

گیان شنکر۔ وہ خوش تو اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ دن میں تین بار اُس کے آستانِ پاک پر سجدے کیا کیجیے۔

جوالا سنگھ۔ (ہنس کر) یہ تو مشکل امر نہیں۔ میں پانچوں وقت کی نماز بجا لاؤں گا۔

گیان شنکر۔ اور وہ اس بات سے خوش ہوتاہے کہ آپ قاعدے قانون کو بالائے طاق رکھیے۔ اُس کی مرضی کو قانون سمجھیے۔

جوالا سنگھ۔ ازیں چہ بہتر۔

گیان شنکر۔ انکم ٹیکس میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ اگر کسی ملزم کو بھول کر بھی رہا کیا تو بُری طرح خبر لی جائے گی۔

جوالا سنگھ۔ بھئی تم مذاق کررہے ہو۔ ایسا کیا ہوگا۔

گیان شنکر۔ نہیں واقعی اُس کی یہی حالت ہے۔ عجیب الخلقت آدمی ہے بڑے بڑے غوّاص آئے پر کوئی اُس کے مزاج کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔

جوالا سنگھ۔ تب تو اُس کے ساتھ میرا نباہ مشکل ہے۔

گیان شنکر۔ ذرا بھی نہیں۔ آج آپ ایسی باتیں کررہے ہیں۔ کل اُس کے اشاروں پر ناچیں گے۔ اس خیال میں نہ رہیے کہ آپ کو حاکمانہ منصب عطا ہوا ہے۔ فی الاصل آپ نے غلامی لکھائی ہے۔ یہاں آپ کو اپنے ضمیر کی آزادی کا خون کرنا، حق اور انصاف کا گلا گھونٹنا پڑے گا۔ یہی آپ کی ترقی مدارج کے زینے ہیں۔ میں تو ایسے

منصب پر لات مارتا ہوں جس کی بدولت غریبوں پر ظلم کرنا پڑے۔ یہاں تو اگر اللہ تعالیٰ بھی آسمان سے اُتر آئیں اور انصاف کا خون کرنے کو کہیں تو میں اُن کے حکم کی تعمیل نہ کروں۔

جوالا سنگھ سمجھ گئے کہ یہ جلے ہوئے دل کے پھپھولے ہیں۔ بولے یار ابھی ایسی دون کی لے رہے ہو۔ کل کو نامزد ہوجاؤ تو پھر ان باتوں کو زبان پر بھی نہ لاؤ۔

گیان شنکر۔ ہاں بہت ممکن ہے۔ کیونکہ میں بھی انسان ضعیف البنیان ہوں۔ لیکن شکر ہے کہ مجھے اس امتحان میں پڑنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی تو میں آزادی اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دوں۔

جوالا سنگھ گرم ہوکر بولے۔ آپ کو یہ خیال کرنے کا کیا مجاز ہے کہ اور لوگ اپنے ضمیر کی آپ سے کم قدر کرتے ہیں۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ ہمارا منصب ہمارے ضمیروں کی آزادی میں حارج ہوہی نہیں سکتا۔ اگر آپ سمجھتے ہوں کہ وکالت اور ڈاکٹری بہت آزاد پیشے ہیں تو آپ کی غلطی ہے۔ میرے چچا صاحب خود وکیل ہیں۔ بڑے بھائی صاحب ڈاکٹری کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے علم ہے وہ محض روپیہ کمانے کی مشین ہیں۔ کانشینس یا انصاف یا آزادی کا دعویٰ کرتے ہوئے میں نے انھیں کبھی نہیں پایا۔

گیان شنکر۔ اگر وہ چاہیں تو مکروہات سے پاک رہ سکتے ہیں۔

جوالا سنگھ۔ بس اتنا ہی جتنا ایک ملازمِ سرکار رہ سکتا ہے۔ وکیل ہی کو لیجیے۔ اگر وہ ضمیر کا پابند رہے تو روٹیاں چاہے بھلے کما کھائے سرسبز کبھی نہیں ہوسکتا۔ اپنے پیشے میں عروج حاصل کرنے کے لیے اسے حکّام کے رسوخ کی ضرورت ہے۔ اور جہاں یہ رسوخ کا سوال آیا، ضمیر اور آزادی غائب ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب کی تو حکّام اور رؤسا کی نظرِ عنایت پر ہستی ہی قائم ہے۔ غربا سے اُنھیں کیا ملے گا۔ دروازے پر صدہا غریب مریضوں کا ہجوم لگا رہتا ہے لیکن جہاں کسی رئیس یا امیر کا بُلاوا گیا، سبھوں کو چھوڑکر اپنی بائیسکل یا رئیس کی فٹن پر سوار ہوجاتے ہیں۔ یہ کانشنیس کی آزادی ہے۔ چچا صاحب سرکاری ملازموں کو سرٹیفکٹ بھی دیا کرتے ہیں۔ اس سے اُنھیں ہزاروں روپے سال کی آمدنی ہوتی ہے۔ رسوخ کے بغیر یہ استحقاق نہیں مل سکتا۔ بیمار کو بیمار اور تندرست کو تندرست کہنے کے لیے وہ اپنی فیس لیتے ہیں اور اگر بیمار کو تندرست

یا تندرست کو بیمار لکھنے کا کوئی موقع ہاتھ آگیا تب تو اُن کے پوبارہ ہیں۔ سینکڑوں کی رقمیں ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ یہ نہ انصاف ہے نہ ضمیر کی آزادی۔ اس سے میں اپنی حالت کو پھر بھی غنیمت سمجھتا ہوں۔ اگر آپ کو خالص آزادی سے اُلفت ہے تو آپ کے لیے گوشۂ قناعت کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔

گیان شنکر۔ آپ ناراض ہوئے جاتے ہیں اس لیے میں اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا ہوں۔ میں نہ ڈاکٹر کا وکیل ہوں نہ وکیل کا وکیل۔ میں انصاف، حق، ضمیر، اور ہمدردی کا وکیل ہوں۔ آپ کسی صیغے میں ہوں اگر ان وصولوں کو نبھاسکتے ہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اُن کا خون کرکے مجھے بادشاہی کرنی بھی منظور نہیں۔

اسی اثنا میں منشی غوث خاں گردھر مہراج اور سکھو کمرے میں داخل ہوئے۔ غوث خاں تو آداب بجالاکر فرش کا کونا دباکر بیٹھ گئے۔ باقی دونوں آدمی کھڑے رہے۔ لالہ پربھا شنکر برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پوچھا۔ اسامیوں کو گھی کے روپے تقسیم کردیے؟

غوث خاں۔ جی ہاں حضور کے اقبال سے سب روپے تقسیم ہوگئے۔ پر علاقہ میں کئی آدمی اتنے سرکش ہوگئے ہیں کہ معاذ اللہ! اگر حضور غلام سے خدمت لینا چاہتے ہیں تو اُن آدمیوں کو تنبیہ کی جائے۔ ورنہ ایک دن میری عزت میں فرق آجائے گا اور کیا عجب ہے جان سے بھی ہاتھ دھوؤں۔

گیان شنکر۔ (تعجب سے) اچھا دیہات میں بھی یہ ہوا چلی؟

غوث خاں۔ حضور کچھ نہ پوچھیے۔ گردھر مہراج اور حضور کا معتبر اسامی سکھو چودھری دونوں کھڑے ہیں۔ ان سے دریافت فرما لیاجائے۔ گردھر مہراج بھاگ نہ کھڑے ہوں تو ان کی جان کی خیرت نہیں تھی۔

گیان شنکر۔ اُن مفسدوں کو پکڑکر خوب پٹوایا کیوں نہیں!

غوث خاں ۔ حضور ایسا کرتا تو علی الصباح تھانیدار صاحب کے لیے تھیلی کہاں سے لاتا۔

گیان شنکر۔ اجی آپ کو تو سینکڑوں ہتھکنڈے معلوم ہیں۔ کسی شکنجے میں کس لیجیے۔ بے دخل کیوں نہ کردیجیے۔

غوث خاں۔ حضور موروثی اسامی ہے۔ بلا عدالتی چارہ جوئی کے بے دخل بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ سب زمیندار کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام منوہر ہے۔ ۲۰ بیگہ

اس کی جوت ہے۔ اور کل پچاس روپۓ لگان دیتا ہے۔ آج اسی اراضی کا کسی دوسرے اسامی سے بندوبست ہوسکے تو سو روپۓ کہیں نہیں گئے ہیں۔

گیان شنکر نے اپنے چچا صاحب کی طرف معترضانہ نگاہ سے دیکھ کر پوچھا آپ کے بیشتر اسامی دخیل کار کیوں کر ہوگئے؟

پربھاشنکر۔ جو کچھ کیا ہوگا کارندوں ہی نے کیا ہوگا؟ مجھے کیا خبر؟

گیان شنکر۔ (طنز سے) خوب۔ آپ کو اتنی بھی خبر نہیں۔ جبھی تو علاقہ چوپٹ ہوگیا۔

پربھاشنکر۔ (جھنجلاکر) اب تو ایشور کے فضل سے تم نے بھی ہاتھ پیر سنبھالے، علاقے کا بندوبست کیوں نہیں کرتے؟

گیان شنکر۔ آپ کے مارے جب میری کچھ چلے تب تو؟

پربھاشنکر۔ مجھ سے قسم لے لو جو میں ذرا بھی دخل دوں۔ اس کا لطف اُٹھاتے ہوئے زمانہ گزر گیا۔ طبیعت سیر ہوگئی۔ اب مطلق ہَوس نہیں ہے۔

گیان شنکر۔ تو پھر میں یہ ثابت کردوں گا کہ حُسنِ انتظام سے کیا کچھ ہوسکتا ہے۔

اتنے میں قادر خاں اور منوہر آکر دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ غوث خاں نے کہا حضور یہ وہی اسامی ہے جس کا میں ابھی حضور سے ذکر کررہا تھا۔

گیان شنکر نے منوہر کو پُرغضب نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کیوں بے جس پتیل میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے؟ سو روپے کی زمین پچاس میں جوتتا ہے اس پر جو ذرا بل کھانے کا موقع آیا تو جامے سے باہر ہوگیا۔

منوہر کی زبان بند ہوگئ۔ راستے میں قادرخاں نے جتنی باتیں سکھائی تھیں وہ سب ذہن سے اُتر گئیں۔

گیان شنکر اسی تند لہجے میں پھر بولے۔ ناشکرا کہیں کا۔ تو سمجھتا ہوگا میں تو دخیل کار ہوں۔ زمیندار میرا کرہی کیا سکتا ہے۔ لیکن میں تجھے دکھا دوں گا کہ زمیندار کیا کچھ کرسکتا ہے۔ تیری اتنی جرأت کہ تو میرے آدمیوں پر حملہ کرنے پر آمادہ ہو۔ بدمعاش!

منوہر غصۂ ضعیف سے کانپ رہا تھا اور سوچ رہا تھا میں نے گھی کے روپۓ نہیں لیے یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ مجھے لینا چاہیے تھے۔ دباؤ سے نہیں۔ خوف سے نہیں۔ صرف اس لیے کہ بڑے سرکار ہمارے اوپر پرورش کی نگاہ رکھتے تھے۔ اُسے ندامت ہوئی کہ میں نے

ایسے غریب دوست، رعایا پرور آقا کی روح کو ناشکری سے صدمہ پہنچایا۔ لیکن اس کی سزا اُسے تیز نگاہ سے میٹھے طعنوں سے دل دوز کنایوں سے ملنی چاہیے تھی۔ گالیوں سے نہیں۔ اس کا دلِ مجروح جواب دینے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔ لیکن قادر خاں نے اُسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔ ہجور ہم لوگوں کی مجال ہی کیا ہے کہ سرکار کے آدمیوں کے سامنے سر اُٹھا سکیں۔ ہاں اَن پڑھ گنوار ٹھہرے۔ بات چیت کرنے کا سہور سلیکا نہیں ہے۔ اُجڈپن کی باتیں مُنہ سے نکل آتی ہیں۔ سرکار کا دیا کھاتے ہیں۔ کیا اتنی بات نہیں جانتے کہ سرکار کی نگاہ پھر جائے تو آج ہمارا کہیں ٹھکانا نہ لگے۔ اب تو سرکار سے یہی بنتی ہے کہ جو کھتا ہوئی اُس کی ماپھی دی جائے۔

لالہ پربھاشنکر کو منوہر پر رحم آیا۔ نرم دل آدمی تھے۔ بولے۔ تم لوگ ہمارے پُرانے کاشت کار ہو۔ کیا نہیں جانتے کہ اسامیوں پر سختی کرنا ہمارے یہاں کا دستور نہیں ہے۔ ایسی ہی کوئی خاص ضرورت آپڑتی تو تم سے بیگار لی جاتی ہے اور تم ہمیشہ خوشی سے دیتے رہے ہو۔ اب بھی اسی طرح سے نبھاتے چلو۔ نہیں تو بھئی اب زمانہ نازک ہے۔ ہم نے تو بُری بھلی طرح نبھادیا۔ لیکن اس طرح لڑکوں سے نہ نبھے گی۔ اُن کا خون گرم ٹھہرا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے تمھارے برتاؤ میں فرق آجائے۔ اس لیے اب سنبھل کر رہو۔ جاؤ۔ اب پھر ایسی گستاخی نہ کرنا۔ گھر سے کچھ کھاکر تو چلے نہ ہوگے؟ دن بھی چڑھ آیا۔ یہیں کھاپی کر آرام کرو۔ دن ڈھلے چلے جانا۔

اگرچہ لالہ پربھاشنکر نے ابھی ذرا دیر پہلے ان معاملات سے استعفیٰ دے دینے کا ذکر کیا تھا، لیکن جن معاملات کے انصرام میں عمر گزر گئی اُن میں دخل نہ دینا اُن کے لیے محال تھا۔ انھوں نے حسب عادت اس قضیے کو ٹالنا چاہا۔ پر گیان شنکر کا غصہّ اتنی آسانی سے فرو نہ ہوسکتا تھا۔ اُنھوں نے اپنے چچا کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ آپ سے تو اس معاملے میں میں رائے نہیں پوچھتا۔ آپ کیوں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں؟ اِسی ملائمت نے تو اِن آدمیوں کو شیر بنادیا ہے۔ اگر آپ اس طرح میرے انتظامات میں رخنے ڈالتے ہو تو میں علاقے کا انتظام کرچکا۔ جب آپ ایک بار استعفیٰ دے چکے تو آپ کو بولنے کا منصب نہیں ہے۔

پربھاشنکر نے گرم ہوکر کہا منصب کیوں نہیں ہے۔ میں مر نہیں گیا ہوں۔

گیان شنکر۔ نہیں آپ کو کوئی منصب نہیں ہے۔ آپ نے سارا علاقہ تباہ کردیا۔ اب کیا

مرضی ہے کہ جو کچھ بچا کھُچا ہے اُسے بھی خاک میں ملادیں!

پربھاشنکر کے جگر میں چوٹ لگ گئی۔ آنکھیں بھرآئیں۔ بولے۔"بیٹا ایسی باتیں کرکے کیوں دل دکھاتے ہو۔ پرماتما بھائی صاحب کو غریق رحمت کرے۔ وہ مرگئے لیکن کبھی میری بات نہیں پلٹی۔ اب تم میری زبان بند کردینی چاہتے ہو۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ اپنی آنکھوں سے انصاف کو پامال ہوتے دیکھوں اور زبان نہ کھولوں۔ جب تک زندہ ہوں تم مجھے اس حق سے محروم نہیں کرسکتے۔"

جوالا سنگھ نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ نہیں جناب۔ آپ گھر کے مالک و مختار ہیں۔ یہ آپ کی گود کے پلے ہوئے لڑکے ہیں۔ اِن کی طفلانہ زبان درازیوں کا خیال نہ کیجیے۔ اِن کی غلطی ہے جو کہتے ہیں آپ کو کوئی منصب نہیں ہے۔ آپ کا منصب سب کچھ ہے۔ آپ اس خاندان کے واحد مختار ہیں۔

غوث خاں بولے۔ حضور بہت درست فرماتے ہیں۔ جب تک آپ بقیدِ حیات ہیں آپ خاندان کے سرپرست اور مُربیّ ہیں۔ خاندان کی ہستی ہی آپ کی ذات سے قائم ہے۔ آپ کے منصب سے کسے اِنکار ہوسکتا ہے؟

گیان شنکر سمجھ گئے کہ جوالا سنگھ نے مجھ سے بدلہ لے لیا۔ اُنھیں اس کا مطلق افسوس نہ ہوا کہ میری زبان سے ایسی دلآزار باتیں کیوں نکلیں۔ افسوس صرف یہ تھا کہ جوالاسنگھ وہاں بیٹھے تھے اور اُن کی نظروں میں وہ حقیر نہ بننا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دل میں کسی آئندہ موقع پر اس کا دندان شکن جواب دینے کا تہیّہ کرکے بولے۔ منصب سے میرا منشا وہ نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ چونکہ آپ نے علاقے کا انتظام میرے سپرد کردیا ہے اس لیے اب مجھی کو کرنے دیجیے۔ یہ لفظ سہواً میری زبان سے نکل گیا۔ میں اُس کے لیے سخت نادم ہوں۔ بھائی صاحب میں اپنے چچاصاحب کا جتنا احترام کرتاہوں اتنا میں نے والد مرحوم کا بھی نہیں کیا۔ مجھے خود غریب اسامیوں پر سختی کرنا پسند نہیں ہے۔ اس مسئلے کے متعلق میرے خیالات سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اس کا منشا یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ غرباپروری کی دُھن میں ہم علاقے سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ پُرانے زمانے کی بات اور تھی۔ اُس وقت کی زندگی میں یہ کشمکش نہ تھی۔ ضرورتیں محدود تھیں۔ نہ تہذیب کا معیار اتنا اونچا تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اُس وقت زمین کی یہ قیمت نہ تھی۔ یقین مانیے میرے کئی موضعے جو دو دو ہزار پر بیع ہوگئے تھے ان کی قیمت آج

کل بیس بیں ہزار سے متجاوز ہوگئی ہے۔ اُن دِنوں اسامی مشکل سے ملتی تھی۔ اراضی کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ اب ایک ایک ٹکڑے کے لیے سوسو آدمی مُنہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اِن اقتصادی حالات کا اثر زمیندار پر نہ پڑے۔

لالہ پربھاشنکر کو اپنی ناتحمل مزاجی پر سچی ندامت ہوئی۔ جس بھائی کو وہ دیوتا سمجھتے تھے اس کے گوشۂ جگر کو سخت و سُست کہنے پر اُنھیں بہت ملال ہوا۔ بولے۔ بیٹا اِن مسئلوں کو جتنا تم سمجھوگے اتنا میں تھوڑے ہی سمجھ سکتا ہوں۔ تم گھر کے مالک ہو۔ مجھے اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہوسکتی ہے کہ تم اپنے گھر کا انتظام اپنی مرضی کے مطابق کرو۔ میری غلطی تھی کہ ناحق بیچ میں کود پڑا۔ میرے لیے اب ایک ٹکڑے روٹی اور گوشۂ قناعت کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جیسے چاہو گھر کو سنبھالو۔

تھوڑی دیر تک لوگ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر غوث خاں نے پوچھا حضور منوہر کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟

گیان شنکر۔ اس پر اضافہ لگان کا دعویٰ کیجیے۔

قادر۔ سرکار بڑا گریب آدمی ہے۔ مرجائے گا۔

گیان شنکر۔ اگر اس کے تصرف میں سکمی زمین ہو تو اس سے بے دخل کردیجیے۔

قادر۔ ہجور تباہ ہوجائے گا۔

گیان شنکر۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اسامیوں کی کمی نہیں ہے۔

قادر۔ ہجور.........

گیان شنکر۔ چپ رہو۔ میں تم سے حجت نہیں کرنا چاہتا۔

قادر۔ سرکار ذرا ......

گیان شنکر۔ بس کہہ دیا زبان مت کھولو۔

منوہر اب تک تصویر کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ لالہ پربھاشنکر کی باتیں سُن کر اُسے کچھ امید ہوئی تھی کہ یہاں آنا بالکل بے فائدہ نہیں ہوا۔ اُن کی شفقت آمیز گفتگو نے اس کے دل کے بخارات کو نکال دیا تھا۔ گیان شنکر کی سخت گیری کے مقابلے میں پربھاشنکر کی ملائمیت اس کے دل پر مبالغہ آمیز اثر پیدا کررہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی ساری جمع جتھا لاکر ان کے سامنے رکھ دوں اور کہہ دوں کہ یہ میری طرف سے بڑے سرکار کی بھینٹ

ہے۔ لیکن گیان شنکر کے ناملائم برتاؤ نے اس جذبے کو پامال کردیا۔ خاص کر قادر میاں کی یہ توہین اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ وہ خود اس موقع پر شاید اس سے بھی درشت کلامی کا متحمل ہوجاتا۔ لیکن اُس کے پیچھے قادرخاں جیسے نیک منش آدمی کی تحقیر ہو یہ اُس کی قوتِ تحمل سے باہر تھا۔ تیور بدل کر بولا دادا۔ اس دربار سے اب دیادھرم اُٹھ گیا۔ چلو بھگوان کی جو مرضی ہوگی وہ ہوگا۔ جس نے منہ چیرا ہے وہ چارہ بھی دے گا۔ نہیں تو بھیک پردیس تو کہیں نہیں گیا ہے۔

یہ کہہ کر اُس نے قادرخاں کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بزور کھینچتا ہوا دیوان خانے سے باہر نکل گیا۔ گیان شنکر کو اس وقت اتنا غصہ تھا کہ اگر قانون کا خوف نہ ہوتا تو اُسے زندہ چُنوا دیتے۔ اگر اس غضب کا کچھ حصہ منوہر کو تنبیہ و سرزنش میں صرف ہوجاتا تو شاید اس کی سوزش کچھ کم ہوجاتی۔ لیکن اب اُسے دل میں کھولنے کے سوا نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ان کی حالت اُس لڑکے کی سی ہورہی تھی جس کا ہمجولی اُسے دانت کاٹ کر بھاگ گیا ہو۔ اِس یقین سے اُنھیں تشفی نہ ہوتی تھی کہ اس شخص کی تقدیر میرے ہاتھ میں ہے۔ آج اِسے خاک میں مِلا سکتا ہوں۔ انتقام کو لفظی اظہار سے خاص مناسبت ہے۔

جوالا سنگھ خیالات میں محو تھے۔ اس شخص میں اس قدر بے رحمانہ خود غرضی کہاں سے آگئی؟ ابھی ایک لمحے قبل یہ حضرت انصاف اور خدمت اور حق کی وکالت کتنی زوروں سے کررہے تھے۔ اتنی ہی دیر میں یہ کایا پلٹ۔ اصول اور عمل میں کتنی تفاوت ہے۔ منوہر چلاگیا تو گیان شنکر سے بولے۔ اضافہ لگان کا دعویٰ کیجیے گا تو اس کی طرف سے عُذرداری نہ ہوگی؟

گیان شنکر۔ ہاں آپ کا خیال بہت درست ہے۔ خاں صاحب آپ اُن اسامیوں کی ایک فہرست مرتب کیجیے جن پر حسبِ قواعد اضافہ ہوسکتا ہے۔ کیا ہرج ہے لگے ہاتھ سالم موضع پر دعویٰ ہوجائیں۔

جوالاسنگھ نے منوہر کی حمایت کے خیال سے یہ اعتراض کیا تھا۔ اُس کا یہ اُلٹا نتیجہ دیکھ کر اُنھیں پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُٹھ کر اوپر چلے گئے۔

(۵)

ایک مہینہ گزرگیا لیکن غوث خاں نے ابھی تک اسامیوں کی فہرست نہ تیار کی اور نہ

گیان شنکر نے دوبارہ تقاضا ہی کیا۔ غوث خاں کی خودپرستی اور آقاپرستی میں نزاع ہورہا تھا اور گیان شنکر اس حیص بیص میں تھے کہ جب اضافے سے سارے خاندان کو نفع ہوگا تو مجھی کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ دردسر مول لوں۔ غریبوں کا گلا دباؤں، خون کروں، مقدمات کی پیروی کروں اور فائدے میں سب شریک! وہ ان ساری بے انصافیوں کا بار اپنے ہی سر لینا چاہتے تھے۔ دوسروں کو شریک کرنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ شراکت خودغرضی سے ملوث ہوکر جو روش اختیار کرتی ہے وہی گیان شنکر نے بھی اختیار کی۔ اب انھیں شب و روز یہی فکر تھی کہ کسی نوع سے چچا صاحب سے الگ ہوجاؤں۔ اُن کے سارے منصوبے اسی وقت کے لیے ملتوی ہوگئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علاحدگی میں سراسر اُن کا فائدہ تھا۔ اُن کے سر صرف تین جانوں کی کفالت کا بار تھا۔ خود، بیوی اور بھاوج۔ لڑکا ابھی شیرخوار تھا۔ علاقے کی آمدنی کا بڑا حصہ لالہ پربھاشنکر کے صرف میں آتا تھا جن کے تین لڑکے تھے، دو لڑکیاں، ایک بہو اور میاں بیوی خود۔ گیان شنکر اکثر اپنے والد مرحوم کی کنبہ پروری پر جھنجلایا کرتے۔ کاش وہ آج سے تیس سال قبل الگ ہوگئے ہوتے تو آج ہماری حالت ایسی خراب نہ ہوتی۔ چچا صاحب کے سر جو پڑتی اُسے جھیلتے۔ آرام کرتے چاہے فاقے کرتے ہم سے تو کوئی مطلب نہ رہتا۔ بلکہ اس وقت اگر ہم اُن کی کچھ امداد کرتے تو وہ مشکور ہوتے۔ ورنہ اتنے دنوں بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا کرنے کے سوا اور کیا ملا۔ پربھاشنکر جہاں دیدہ آدمی تھے۔ بھتیجے کا یہ رخ دیکھ کر کچھ دبتے تھے۔ ناگوار باتیں سُن کر ضبط کرجاتے۔ دیاشنکر کی جائز اور ناجائز آمدنی معقول تھی۔ لیکن وہ اُن کی کچھ مدد کرنے کے بدلے اُلٹے اُنھیں کے سامنے ہاتھ پھیلائے رہتے تھے۔ اس لیے دب کر رہنے ہی میں اُن کی بھلائی تھی۔

الغرض گیان شنکر کم ظرفانہ کدورت کی رَو میں بہنے لگے۔ اگر ایک نوکر چچاصاحب کا کام کرتا ہو تو دوسرے کو خواہ مخواہ اپنے کسی نہ کسی کام میں اُلجھائے رکھتے۔ اسی سعئ باطل میں رہتے کہ چچا صاحب کے آٹھ آدمیوں پر جتنا صرف ہوتا ہے اتنا میرے تین آدمیوں پر ہو۔ کھانا کھانے جاتے تو ضداً بہت سا کھانا جھوٹا کرکے چھوڑ دیتے۔ اتنے پر بھی تسکین نہ ہوئی تو دو کتے پالے۔ اُنھیں ساتھ بٹھاکر کھلاتے۔ یہاں تک کہ اگر لالہ پربھاشنکر ڈاکٹر کے یہاں سے کوئی دوا لاتے تو آپ بھی اسی قیمت کی کوئی نہ کوئی دوا ضرور لاتے۔ چاہے

اُسے پھینک ہی دیں۔ اتنی بدعتوں پر بھی طبیعت آسودہ نہ ہوئی تھی۔ چاہتے تھے کہ مستورات میں بھی بم چخ مچے۔ وِدّیاوتی کا تحمل اُنھیں بہت گراں گزرتا تھا۔ اُسے سمجھاتے تمھیں اپنے نفع نقصان کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ مردوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھیں۔ یہ خاص عورتوں کا کام ہے۔ دنیا میں عورتیں گھر میں آگ لگانے والی مشہور ہیں۔ لیکن تمھیں کسی بات کی حس ہی نہیں۔ آنکھوں سے دیکھتی ہو کہ گھی کا گھڑا لُڑھکا جاتا ہے پر زبان نہیں ہلاتیں۔ وِدّیاوتی پر اس تلقین کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔

اسی اثنا میں ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے چچا بھتیجے کی درمیانی خلیج کو وسیع ترکردیا۔ دیاشنکر اسی ضلع کے ایک تھانے میں مامور تھے۔ یوں تو وہ پہلے بھی بااصول آدمی نہیں تھے۔ لیکن جب سے بابو جوالاسنگھ اُن کے علاقے کے مجسٹریٹ ہوگئے تھے تب سے تو وہ پورے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ ڈپٹی صاحب اور گیان شنکر ساتھ کے پڑھے ہوئے دوست ہیں۔ اتنا سہارا ربط ضبط پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ جوالاسنگھ کے یہاں آمدورفت شروع کی۔ کبھی چڑیاں بھیجتے۔ کبھی لکھنؤ کے خربوزے۔ کبھی دودھ کبھی گھی۔ اور سبزی تو ہفتے میں ایک بار ضرور ہی نذر کرتے۔ ملاقات میں بھی دوستانہ مراسم کا برتاؤ کرتے۔ رسوخ کے ساتھ ہمتیں بڑھیں۔ علاقے کو پامال کرنے لگے۔ جوالاسنگھ کے پاس شکایتیں پہنچیں لیکن وہ لحاظ کے مارے نہ تو دیاشنکر سے اور نہ اُن کے گھروالوں ہی سے اس کا کچھ ذکر کر سکے۔ فریادیوں نے جب دیکھا کہ ڈپٹی صاحب بھی فریاد نہیں سُنتے تو قہرِدَرویش بر جان دَرویش چپکے ہورہے۔ دیاشنکر اور بھی شیر ہوئے۔ تھانے میں بیٹھے دون کی لیاکرتے۔ پہلے موقع و محل کی احتیاط کیا کرتے تھے۔ داؤں گھات دیکھ کر ہاتھ چلاتے تھے۔ مِل کر کھاتے تھے۔ نفاق و نزاع سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اب بالکل فرعون ہوگئے۔ یہاں تک کہ پیالہ لبریز ہوگیا۔ علاقے میں ایک ڈاکا پڑگیا تھا۔ وہ اس کی تحقیقات کرنے گئے۔ ایک زمیندار پر شُبہ ہوا۔ فوراً اس کی خانہ تلاشی لی۔ کچھ مسروقہ مال برآمد ہوگیا۔ پھرکیا تھا اُسی وقت اُسے حراست میں لے لیا۔ زمیندار نے کچھ نذر و نیاز دے کر بلا ٹالی۔ مگر غیرت مند آدمی تھا۔ یہ سبکی نہ برداشت ہوئی۔ دوسرے ہی دن آکر بابو جوالاسنگھ کے اجلاس میں استغاثہ دائر کردیا۔ علاقے میں آگ سُلگ رہی تھی۔ ہوا پاتے ہی بھڑک اُٹھی۔ چاروں طرف سے داروغہ جی پر جھوٹے سچے استغاثے ہونے لگے۔ آخر جوالاسنگھ کو طوعاً و کرہاً ان معاملات کی

تفتیش کرنی پڑی۔ ساری حقیقت روشن ہوگئی۔ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کے یہاں رپورٹ کی۔ دیاشنکر کے نام معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ رشوت ستانی کے مقدمے چلنے لگے۔ پانسا پلٹ گیا۔ انھوں نے زمیندار کو حراست میں لیا تھا۔ اب خود حراست میں آگئے۔ لالہ پربھاشنکر کے حسنِ سعی سے ضمانت تو منظور ہوگئی۔ لیکن شہادتیں اتنی مضبوط تھیں کہ داروغہ جی کا بچنا مشکل نظر آتا تھا۔ وہ خود مایوس تھے۔ سٹی پٹی بھول گئی۔ جیسے کسی نے منتر سے عقل مار دی ہو۔ جو زبان تھانے کی دیواروں کو ہلادیا کرتی تھی وہ اب ہلتی بھی نہ تھی۔ جو عقل ہوا میں قلعے بناتی رہتی تھی، عدم میں وجود کا جلوہ پیدا کرتی تھی وہ اب اس عقدے کو نہ سلجھا سکتی تھی۔ کوئی کچھ پوچھتا تو بے معنی نگاہوں سے دیوار کی طرف تاکنے لگتے۔ اُنھیں افسوس نہ تھا۔ شرم کا احساس نہ تھا۔ صرف حیرت تھی کی میں اس دَلدل میں کیوں کر پھنس گیا۔ وہ عالمِ سکوت میں بیٹھے ہوئے سوچا کرتے مجھ سے یہ غلطی ہوگئی۔ وہ پہلو نظر انداز ہوگیا۔ نہیں تو میں ہرگز نہ پھنستا۔ گیان شنکر ایسے نازک موقع پر اپنے عزیزوں کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے پر اُن کی سمجھ میں نہ آتا کیا کروں۔ اُن کی کتابی واقفیت کتنی ہی وسیع ہو، لیکن معاملاتِ دنیا کا وہ تجربہ نہ تھا جو ہم میں عمل کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اگر چچا کے کہنے سے کسی وکیل کے پاس جاتے تو بجائے اُس کے کہ اپنے معاملے کو ایک روشن صورت میں پیش کرسکیں، اُلٹے اُن کے اعتراضوں سے متفق ہوجاتے تھے۔

لیکن لالہ پربھاشنکر کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ شب و روز اُسی فکر میں غرق رہتے۔ محبت پدری تو تھی ہی پر شاید اُس سے زیادہ غم خاندان کی توہین اور رُسوائی کا تھا۔ آخر جب وہ چاروں طرف سے مایوس ہوگئے تو ایک دن گیان شنکر سے بولے۔ آج ذرا بابو جوالا سنگھ کے پاس چلے جاتے۔ تمھارے ہم جماعت رہے ہیں۔ شاید کچھ رعایت کریں۔ اس بے اعتنائی سے ممکن ہے اور بھی برہم ہوجائیں۔ گیان شنکر نے اندازِ حیرت سے چچا کی طرف دیکھ کر کہا میرا اس وقت اُن کے پاس جانا سراسر ذلت ہے۔

پربھاشنکر۔ یہ تو مجھے معلوم ہے اور اسی لیے اب تک تم سے ذکر نہیں کیا۔ لیکن معاملہ ایسا بے ڈھب آپڑا ہے کہ اس ذلّت کو برداشت ہی کرنا پڑے گا۔ ڈپٹی صاحب اپنے اجلاس سے بری کردیں۔ آگے ہم دیکھ لیں گے۔ ثبوتوں کو کمزور بنا دینا اُن کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔

گیان شنکر۔ پر آپ یہ کیوں کر باور کرسکتے ہیں کہ ایک شریف اور اصول پسند آدمی محض میری سفارش پر اپنے ضمیر کا خون کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ اور میرے لیے بھی یہ حد درجہ شرمناک ہے کہ اُسے اس فعل پر مائل کروں۔ وہ اگر دوستی کا کچھ حق سمجھتے ہیں تو میری سفارش کے بغیر بھی اس کا اظہار کرسکتے ہیں۔ بلکہ عجب نہیں کہ میری سفارش کا اُلٹا اثر ہو اور وہ اپنی اصول پسندی کا وقار قائم رکھنے کے لیے اور بھی سخت ہوجائیں۔

پربھاشنکر نے چڑھ کر کہا۔ تم ان کی جگہ پر ہوتے تو شاید ایسا ہی کرتے۔ پر عام طور پر لوگ دوستوں کے کہنے سُننے کا ضرور لحاظ کرتے ہیں۔

گیان شنکر اس طنز سے تنک کر بولے۔ ہاں اگر آپ صاف صاف سُننا چاہتے ہیں تو اُن کی جگہ پر میں ایسا ہی کرتا۔ میں اس کام کے لیے ان کے پاس جانا اپنی شان اور شرافت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ میں خود ماخوذ ہوتا تو بھی نہ جاتا۔ پُرانی تہذیب اِن باتوں کو جائز سمجھتی ہو پر موجودہ معاشرت کے اصول ان باتوں کو سراسر ممنوع قرار دیتے ہیں۔

پربھاشنکر نے پوچھا۔ کیا اپنے بھائی کی سفارش کرنا توہین کی بات ہے؟

گیان شنکر بے رحمانہ انداز سے بولے۔ سفارش چاہے کسی کام کے لیے ہو شرمناک فعل ہے۔ خاص کر ایسے معاملے میں۔

پربھاشنکر۔ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ مصیبت میں بھائی سے بھی مدد کی اُمید نہ رکھنی چاہیے۔

"جان بوجھ کر آگ میں کودنا مصیبت نہیں ہے؟"

"لیکن جو شخص جان بوجھ کر آگ میں کودے کیا اس کی جان نہ بچانی چاہیے؟"

اسی اثنا میں بڑی بہو دروازے پر آکر بولیں چل کر للّو (دیاشنکر) کو ذرا سمجھا کیوں نہیں دیتے۔ رات بھی کھانا نہیں کھایا اور اس وقت بھی اب تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔ پربھاشنکر نے جھنجلاکر کہا کہاں تک سمجھاؤں؟ سمجھاتے سمجھاتے تو میں عاجز آگیا۔ (گیان شنکر سے) بیٹا۔ میرے دل کی اس وقت جو حالت ہے وہ بیان نہیں کرسکتا۔ تم نے جو باتیں کہی ہیں وہ نہایت معقول ہیں۔ لیکن مجھ پر اتنا رحم کرو۔ آج اُن کے پاس ذرا کی ذرا چلے جاؤ۔ میرا دل کہتا ہے کہ تمھارے جانے کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔

گیان شنکر بغلیں جھانک رہے تھے کہ بڑی بہو بول اُٹھیں۔ یہ جاچکے۔ للّو کہتے تھے کہ بھیا جھوٹوں جاکر کچھ کہہ دیں تو سارا کام بن جائے۔ لیکن اِنھیں کیا پرواہ ہے، چاہے کوئی چولھے بھاڑ میں جائے۔ پھنسانا ہوتا تو چاہے دوڑدھوپ کرتے۔ بچانے کیسے جائیں۔ بیٹھی نہ ہوجائے گی۔

پربھاشنکر نے ملامت کے انداز سے کہا کیا فضول باتیں کرتی ہو۔ اندر جاکر بیٹھتی کیوں نہیں؟

بڑی بہو نے گیان شنکر کی طرف دیکھ کر کہا میں تو بے لاگ بات کہتی ہوں کسی کو بھلا لگے یا بُرا۔ جو بات ان کے دل میں ہے وہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

گیان شنکر نے چچا کی طرف نگاہِ فریاد سے دیکھ کر کہا۔ آپ چچی صاحبہ کی باتیں سُنتے ہیں؟ یہ مجھے اس درجہ کمینہ سمجھتی ہیں۔

بڑی بہو نے منہ بناکر کہا۔ یہ کیا سُنیں گے کان بھی ہوں۔ ساری عمر غلامی کرتے کٹی اب بھی وہی عادت پڑی ہوئی ہے۔ تمھارا گُن تو میں جانتی ہوں۔

پربھا شنکر آشفتہ خاطر ہوکر بولے ایشور کے لیے خاموش ہوجاؤ۔

بڑی بہو تیوریاں چڑھاکر بولیں۔ خاموش کیوں رہوں کسی کا ڈر ہے! یہاں تو جان پر بنی ہوئی ہے اور یہ اپنے دُھن میں مست ہیں۔ ایسے آدمی کا تو مُنہ دیکھنا پاپ ہے۔

پربھاشنکر نے بھتیجے کی طرف التجاآمیز نظروں سے دیکھا اور بولے۔ بیٹا اس وقت ان کے اوسان خطا ہورہے ہیں۔ اِن کی باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ لیکن گیان شنکر نے یہ باتیں نہ سُنیں۔ چچی کی دلآویز باتیں دل میں شورش پیدا کررہی تھیں۔ بولے۔ تو میں آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر کون سا سکھ بھوگ رہا ہوں۔

بڑی بہو۔ دل میں جو ارمان ہو نکال ڈالو۔ جب دل میں محبت ہی نہیں ہے تو ایک گھر میں رہنے سے تھوڑے ہی ایک ہوجائیں گے۔

گیان شنکر۔ آپ لوگوں کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی مجھے نکال دیجیے۔

بڑی بہو۔ ہماری مرضی ہے؟ آج مہینوں سے تمھارا رنگ ڈھنگ دیکھ رہی ہوں۔ ایشور نے آنکھیں دی ہیں۔ دھوپ میں بال نہیں سفید کیے ہیں۔ ہم لوگ تمھاری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہیں۔ تم سمجھتے ہو یہ لوگ ہمارا سب کچھ کھائے جاتے ہیں۔

تمھیں رات دن یہی جلن رہتی ہے۔جب تمھارے دل میں اتنی غیریت آگئی تو پھر......

پربھاشنکر نے آہ سرد بھر کر کہا۔ یا ایشور مجھے موت کیوں نہیں آتی۔

بڑی بہو نے شوہر کو قہر کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تمھیں ان سے بہت پیار ہے تو جاکر اِن کی جوتیاں سیدھی کرو۔ جو آدمی مصیبت میں ساتھ نہ دے وہ دشمن ہے۔ اُس سے دور ہی رہنا اچھا ہے۔

گیان شنکر۔ (غصہّ سے) تو یہ دھمکی کسے دیتی ہو؟ کل کے بدلے آج ہی حصہّ بانٹ کرلو۔ دل کا ملال نکل جائے۔

بڑی بہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تمھارا دیا کھاتے ہیں؟

گیان شنکر۔ ان باتوں سے کیا مطلب؟

بڑی بہو۔ یہی تمھیں بھی گھمنڈ ہے۔

گیان شنکر۔ اگر یہی گھمنڈ ہے تو کیا بیجا ہے! جتنا آپ کا خرچ ہے اتنا میرا ہرگز نہیں ہے۔

بڑی بہو نے شوہر کی طرف طنزاً دیکھ کر کہا کچھ سُن رہے ہو سپوت کی باتیں؟ بولتے کیوں نہیں؟ مُنہ میں دہی لگا ہوا ہے؟ باپ ہزاروں روپے سال سادھو بھکھاریوں کو کھلا دیا کرتے تھے۔ مرتے دم تک پالکی کے بارہ کہار دروازے سے نہیں ٹلے۔ انھیں آج ہماری روٹیاں اکھر رہی ہیں۔ لالہ ہمارا جس گاؤ کہ آج رئیسوں کی طرح چین کررہے ہو۔ نہیں تو منہ میں مکھیاں آتیں جاتیں۔

پربھاشنکر یہ باتیں نہ سُن سکے۔ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ بڑی بہو تنہا مورچہ نہ تھام سکیں۔ اندر چلی گئیں۔ لیکن گیان شنکر وہیں بیٹھے رہے۔ گویا اعضا مفلوج ہوگئے ہوں۔ اُف! یہ احسان فراموشی یہ ہٹ دھرمی۔ یہ توتا چشمی۔ میں کمینہ ہوں، اُن لوگوں کا دشمن ہوں۔ میری صورت دیکھنی پاپ ہے۔ زندگی بھر ہمیں نوچا کھسوٹا اور آج یہ باتیں۔ یہ غرور! دیکھتا ہوں۔ یہ غرور کب تک قائم رہتا ہے۔ لوگ سوچتے ہوں گے مالک تو ہم ہیں۔ کنجیاں تو ہمارے پاس ہیں، اِسے کیا، جو دیں گے اُس پر قناعت کرے گا۔ ایک ایک چیز کے نصف کرالوں گا۔ بڑھیا کے پاس ضرور روپئے ہیں۔ والد نے سب کچھ انھیں لوگوں پر چھوڑدیا تھا۔ اِس نے کترببونت کرکے بیس پچیس ہزار روپے جمع کرلیے ہیں۔ یہ سب اُسی کا کرشمہ ہے اور کوئی بات نہیں۔ حسد میں دوسروں کو مالدار سمجھنے کی خاص صفت ہوتی ہے۔

گیان شنکر اِن تفکرات سے بھرے ہوئے باہر آئے تو چچا کو دیوان خانے میں منشی ایجاد حسین سے باتیں کرتے ہوئے پایا۔ یہ حضرت بابو جوالا سنگھ کے اجلاس کے اہلمد تھے۔ ایک ہی متفنی ایک ہی لباڑیے، وہ کہہ رہے تھے۔آپ گھبرائیں نہیں خدا نے چاہا تو بابو دیاشنکر بے داغ بری ہوجائیں گے۔ میں نے مہری کی معرفت ڈپٹی صاحب کی اہلیہ کو ایسا پھنگ پر چڑھایا ہے کہ وہ داروغہ صاحب کو بلا بری کرائے اُن کا دامن نہ چھوڑیں گی۔ سو دوسو روپے خرچ ہوجاویں گے مگر کیا مضائقہ؟ آبرو تو بچ جائے گی۔ یکایک گیان شنکر کو دیکھ کر وہ کچھ خفیف ہوگئے۔

لالہ پربھاشنکر بولے، روپے جتنے درکار ہوں بلا تکلف لے جائیے آپ کی کوشش سے اگر مطلب براری ہوجاوے تو ہمیشہ اُن کا منت گزار ہوں گا۔

ایجاد حسین نے گیان شنکر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بابو جوالا سنگھ دوستی کا کچھ حق تو ضرورہی ادا کریں گے۔ زبان سے چاہے کتنے ہی بے نیاز ہیں لیکن دل میں آپ کا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ میں بھی اِس پر روغن چڑھاتا رہتا ہوں۔ کل آپ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ وہ تو دوتین دن سے دانا پانی ترک کیے ہوئے ہیں۔ یہ سُن کر کچھ غور کرنے لگے۔ بعدازاں اُٹھ کر اندر چلے گئے۔

پربھاشنکر نے منشی جی کو عقیدت آمیز نظروں سے دیکھا۔ پر گیان شنکر نے اُنھیں حقارت سے دیکھا اور اوپر چلے گئے۔

وِدّیاوتی اُن کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بولی آج دیر کیوں کررہے ہو؟ کھانا تو کبھی سے تیار ہے۔

گیان شنکر نے متفکرانہ انداز سے کہا، کیا کھاؤں کچھ ملے بھی۔ مالک اور مالکن دونوں نے آج میرا نپٹارا کردیا۔ اُنھیں میری صورت سے نفرت ہے۔ ایسوں کے ساتھ رہنے سے تو مرجانا اچھا ہے۔

وِدّیاوتی نے خائف ہوکر پوچھا کیا بات ہوئی؟

گیان شنکر نے اس سوال کا جواب بہت تفصیل کے ساتھ دیا۔ اُنھیں اُمید تھی کہ اِن باتوں سے وِدّیا کی عاقبت پسندی کو ٹھیس لگے گی۔ لیکن اُن کو کتنی مایوسی ہوئی جب اُس نے ساری داستان سُننے کے بعد کہا تو تمھیں جوالاسنگھ کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔ چچا جی

کی بات رہ جاتی۔ ایسے ہی موقعوں پر تو اپنے پرائے دیکھے جاتے ہیں۔ تمھاری طرف سے ٹال مٹول دیکھ کر اُنھیں غصہ آگیا ہوگا۔ غصّے میں آدمی حق کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ محض دوسروں کا دل دُکھانا جانتا ہے۔ گیان شنکر طیش میں آکر بولے، تمھاری باتیں سُن کر ایسا جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمھارا دونوں ہی کا سر پھوڑ لوں۔ اُن لوگوں کی دل خراش باتوں کو تو پھول پان سمجھ لیا۔ اُلٹے مجھی کو نصیحت دینے لگیں۔ مجھے تو یہ شرم آرہی ہے کہ اِس گرگے ایجاد حسین نے میری طرف سے نہ جانیں کیاکیا ردّے جمائے ہوں گے اور تم مجھ کو سفارش کرنے کا سبق دیتی ہو۔ میں جوالاسنگھ کو جتا دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں بندۂ غرض بن کر اُن کی نظروں میں ذلیل بننا نہیں چاہتا۔

ودّیاوتی نے تعجب سے پوچھا، کیا یہ کہنے اُن کے پاس جاؤ گے؟

گیان شنکر۔ ضرور جاؤں گا۔ دوسروں کی آبرو کے لیے اپنا وقار کیوں کھوؤں؟

ودّیاوتی۔ بھلا وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔ کیا اس سے تمھارا حسد نہ ظاہر ہوگا؟

گیان شنکر۔ تم مجھے جتنا احمق سمجھتی ہو اتنا احمق نہیں ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کون بات کس ڈھنگ سے کہنی چاہیے۔

ودّیاوتی مایوسانہ انداز سے زمین کی طرف تاکنے لگی۔ اُسے اپنے شوہر کی کم ظرفی پر افسوس ہورہاتھا۔ لیکن کچھ اور کہتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں اور ضد نہ پکڑ لیں۔ اسی اثنا میں دیاشنکر کی بیوی اُنھیں کھانا کھانے کے لیے بلانے آئی۔ اُدھر شردھا نے بڑی بہو کو منانا شروع کیا۔ ودّیاوتی نے پربھاشنکر کو منانے کے لیے تیج شنکر کو بھیجا۔ پر ان میں کوئی بھی کھانا کھانے نہ اُٹھا۔ پربھاشنکر کو یہ ملال تھا کہ میری بیوی نے گیان شنکر کو دل آزار باتیں سُنائیں۔ بڑی بہو کو یہ قلق تھا کہ مصیبت میں کوئی بھی ہمارا ساتھی نہیں۔ اور گیان شنکر کو یہ جلن تھی کہ یہ لوگ میرا کھاکر مجھی کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔ بھوک کی آگ غصّے کی آگ کو مشتعل کرتی جاتی تھی۔

حجت و تکرار میں ہم انتہا درجہ کے اصول پسند بن جایا کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اپنے حریف کی زبان بند کردیں۔ اِن چند گھنٹوں میں ہی گیان شنکر کی اصول پروری رخصت ہوچکی تھی۔ جس شخص کی شفاعت کے لیے جوالا سنگھ سے کچھ کہنا اُنھیں غیرمناسب نظر آتا تھا اُسی کے مُضرت کے لیے وہ وہاں جانے کو تیار

ہوگئے۔ اُنھوں نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ وہاں کیا باتیں کروں گا۔ اُن کا کیا پیرایہ ہوگا۔ مسئلے کو اس خوب صورتی سے چھیڑنا چاہتے تھے کہ نیت کا پردہ نہ کھُلنے پاوے۔

دوسرے دن علی الصباح گیان شنکر نے بائیسکل سنبھالی اور گھر سے نکلے۔ دروازے پر لالہ پربھاشنکر اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ چہل قدمی کررہے تھے۔ گیان شنکر نے دل میں کہا بڈھا ساٹھ برس کا ہوگیا ہے پر ابھی تک جوانی کا وہی دم خم ہے، کیسا اکڑکر چلتا ہے ۔ اب دیکھتا ہوں مصری اور مکھن کہاں سے آتا ہے۔ دونوں لونڈے ذرا ذرا سے ہیں لیکن میری طرف یوں تاک رہے ہیں گویا نگل جائیں گے۔ساون بھادوں کے دن تھے۔ گھٹا اُمڈی ہوئی تھی گویا سمندر آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ سڑکوں پر اس قدر کیچڑ تھا کہ گیان شنکر کی پیرگاڑی مشکل سے نکل سکی اور چھینٹوں سے کپڑے خراب ہوگئے۔ باربار میونسپلٹی کے ممبروں پر غصہ آتا تھا۔ یہ سب کے سب خودغرض خوشامدی اور خائین ہیں۔ انتخاب کے وقت فقیروں کی طرح دربدر پھرتے ہیں گویا میونسپل ہال میں بیٹھتے ہی شہر کو پیرس کا ثانی بنادیں گے۔ مگر جوں ہی انتخاب ہوگیا گویا بہشت میں پہنچ گئے، نروان کا درجہ حاصل ہوگیا۔ میرے خیال میں ممبری کو میعاد کا تعین نہایت مُضر ہے اور بڑوں کو اختیار ہونا چاہیے کہ جس وقت ممبروں کو کام سے جی چُراتے دیکھیں، اُنھیں معذور کردیں۔ یہ غلط ہے کہ ایسی حالت میں کوئی ذمّے دار آدمی ممبری کے لیے کھڑا ہوگا۔ جنھیں ملک کی فلاح و ترقی کی دُھن ہے وہ ہر ایک حالت میں قوم کی خدمت کے لیے تیار رہیں گے۔ میرے خیال میں جو لوگ صدق دل سے کام کرنا چاہتے ہیں وہ اس قید سے اور بھی خوش ہوں گے۔ اس سے اُنھیں اپنی سہل انکاریوں سے بچنے کا ایک آلہ ہاتھ آجائے گا اور اگر ہمیں خدمت کی دُھن نہیں تو ممبری کی ہوس کیوں ہو، کیا عزت کے لیے؟ اگر سپاہی بن کر لڑنے سے جی چھپائے تو یہ اُس کی عزت کا نہیں بلکہ بے عزتی کا باعث ہوگا۔

اس طرح دل میں باتیں کرتے ہوئے وہ جوالا سنگھ کے بنگلے پر جا پہنچے۔ بابو جوالاسنگھ گھوڑے پر ہوا کھانے جارہے تھے۔ سائیس گھوڑا کھینچے ہوئے کھڑا تھا۔ گیان شنکر کو دیکھتے ہی بڑے تپاک سے ملے۔ ہاتھ ملایا۔ اور اِدھراُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ یہ حضرت اتنے تڑکے بے غرض نہیں آئے ہیں۔ اپنے بھائی کی سفارش کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس لیے اُن کو اس طرح باتوں میں لگانا چاہتے تھے کہ اُس مقدمے کا ذکر ہی نہ آنے پائے۔ اُنھیں اب تک دیاشنکر کے خلاف کوئی مضبوط اور قابلِ وثوق شہادت نہ ملی

تھی۔ یہ اُنھیں معلوم تھا کہ دیاشنکر بے لوث آدمی نہیں ہیں مگر یہ الزامات پایہ ثبوت نہیں پہنچے تھے۔ اُنھیں اپنی تجویز میں بری کردیا تھا۔ ایسی حالت میں وہ کسی کو یہ خیال کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ میں نے جانب داری سے کام لیا ہے۔ وہ انصاف کو خارجی اثرات سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ گیان شنکر کی اِس بے موقع آمد سے پبلک کے شبہے کی تائید ہونی یقینی تھی۔ عوام کو ایسی خبریں بہت آسانی سے مل جایا کرتی ہیں۔ حکام کے اردلی اور چپڑاسی اپنا رسوخ جمانے کے لیے اِن خبروں کے ظاہر کرنے میں تحریک کے منتظر نہیں رہتے۔ بولے ۔کہیے کیا خبریں ہیں؟ آپ کی آسامی راہِ راست پر آگئی؟

گیان شنکر۔ جی نہیں اُنھیں قابو میں کرنا آسان نہیں ہے۔ چچاصاحب نے سر چڑھا دیا ہے۔
ان کی جب تک ایک بار گوشمالی نہ کی جائے گی قابو میں نہ آئیں گے۔ میں اس طرف ایسی تردّدات میں پڑا رہا کہ کوئی کارروائی کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

جوالاسنگھ ڈرے کہ کہیں تردّدات کا ذکر اصل مطلب کی تمہید تو نہیں ہے۔ فوراً پہلو بدل کر بولے۔"یار میں نے یہ ملازمت کیا کرلی ایک جنجال سرلے لیا۔ صبح سے شام تک سر اُٹھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ اکثر رات کو دس گیارہ بجے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ اور اتنا ہی ہوتا تو برداشت بھی کرلیتا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے کہ حُکّام خوش رہیں۔ اپنی قسمت اپنی کارگزاری اور جفاکشی پر نہیں بلکہ حُکّام کی نظرعنایت پر منحصر ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں اَب کی بارش کتنی شدّت سے ہوئی ہے۔ میرے علاقے میں صدہا مواضعات میں سیلاب آگیا۔ کھیتوں کا ذکر ہی کیا۔ کسانوں کی جھونپڑیاں تک دریا بُرد ہوگئیں۔ زمینداروں نے نصف لگان کی معافی کی درخواست کی ہے اور یہ مطالبہ جائز ہے۔ مگر حُکّام کی منشا یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان درخواستوں کو داخلِ دفتر کردیا جائے۔ یہ ضرورہے کہ وہ صریحاً ایسا نہیں کہتے پر نقصانات کی تحقیق میں اتنی قیدیں لگاتے ہیں کہ تحقیقات کروں تو یقیناً معتوب ہوجاوں گا۔ مجھ پر شُبہے کی نگاہیں پڑنے لگیں گی۔ یہاں کی ہوا ہی کچھ ایسی بگڑی ہوئی ہے کہ انسان اس سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ میرے اور جتنے منصبی برادران ہیں اُن کی حالت دیکھ کر یہی جی چاہتا ہے کہ استعفیٰ دے کر الگ ہوجاؤں۔ انسان کتنا خود غرض زمانہ ساز اور خوشامدی بن سکتا ہے اس کی زندہ مثالیں درکار ہوں تو یہاں سے بہتر کہیں نہ ملیں گی۔ صاحب نے کسی بات کا ذرا سا اشارہ کیا اور اُس کی تعمیل شروع ہوجاتی ہے۔ اگر وہ کنایتاً کہہ دیں کہ اِنکم ٹیکس کی جانچ اچھی طرح کی جائے تو

یقین مانو ہمارے یہ احباب دوسرے ہی دن ٹیکس کو بڑھاکر دوچند کردیں گے۔ اگر اشارہ ہوجائے کہ تقاوی احتیاط سے دی جائے تو بس سمجھ لیجیے کہ اس کا دروازہ بند ہوا۔ ان لوگوں کی باتیں سُن کر ایسی نفرت ہوتی ہے کہ اُن کی صورت نہ دیکھوں۔ نہ کوئی عملی تذکرہ نہ کوئی ملکی یا مالی بحث نہ حُسن مذاق کا چرچا۔ بس میں نے یہ کیا۔ میں نے وہ کیا۔ صاحب نے یہ کہا تو میں نے یوں جواب دیا۔ سچ کہتا ہوں چھٹا ہوا شُہدا بھی اپنی حرفتوں اور فتنہ سازیوں کی اتنی بے حیائی سے ڈینگ نہ مارے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ مرض محض پُرانے خیال کے دقیانوسی حضرات کا گلوگیر نہیں ہے۔ ہمارے نئے تعلیم یافتہ لوگ اس میدان میں اُن سے منزلوں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ مارؔلی اور مِلؔ، پنسرؔاور میجوکؔ۔ سب اس فلسفۂ غرض کے سامنے بالائے طاق رہ جاتے ہیں۔ جناب یہاں ایسے ایسے حضرات پڑے ہوئے ہیں جو خانساموں اور اردلیوں کے ناز اُٹھاتے ہیں۔ اُنھیں نذرانے دیتے ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ صاحب کے مقابل اُن کے لیے دوچار کلمۂ خیر کہہ دیں۔ جو کسی عہدے پر مامور ہوگیا وہ سمجھنے لگتا ہے اب میں حاکم ہوں۔ اب میرا اہلِ وطن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا ہے تو محض حاکم و محکوم کا۔ انگریز حُکام کے روبرو جائیں گے تو انکسار اور تعظیم کے پُتلے بن جائیں گے گویا خدا کے دربار میں جارہے ہیں۔ مگر جب دورے پر نکلیں گے تو رعایا اور زمینداروں کے سامنے فرعون بے سامان بن جائیں گے۔

جوالاسنگھ نے صورتِ حال کسی قدر مبالغہ کے ساتھ بیان کی تھی۔ کیونکہ اس معاملے میں وہ گیان شنکر کے خیالات سے واقف تھے۔ اُن کا منشا صرف اتنا تھا کہ اس وقت اِس مقدمے کا ذکر نہ آنے پائے۔

گیان شنکر نے خوش ہوکر کہا۔ میں نے تو آپ سے پہلے ہی دن کہا تھا۔ لیکن آپ کو یقین ہی نہ آتا تھا۔ آمادۂ جنگ ہوگئے۔ ابھی تو آپ کو محض اپنے برادرافسران کی سفلہ کاریوں کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ اور دن رہیے تو اپنے ماتحت ملازمین کی دست درازیاں دیکھ کر آپ اور بھی دنگ ہوجائیں گے۔ یہ سب آپ کو کٹھ پتلی بناکر نچائیں گے۔ بدنامی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر ہی نہیں ہے کہ اُنھیں منہ نہ لگایا جائے۔ اُن سے کوئی ذاتی کام نہ لیجیے اور نہ کبھی اپنا ہم راز بنائیے۔ آپ کا اہل مد ایجاد حسین ایک ہی گھاگ ہے۔ اس سے ہوشیار رہیے گا۔ وہ آپ کو اپنے پنجے میں لانے کے لیے خوب داؤں کھیلے گا۔ آج ہی میں نے اُس کے مُنہ سے ایسی باتیں سُنی ہیں جن سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ آپ کو

سبز باغ دکھانے میں کامیاب ہورہا ہے۔ اُس نے شاید آپ سے میرے بہانے دیاشنکر کی سفارش کی ہے۔ اگرچہ مجھے دیاشنکر سے اتنی ہی ہمدردی ہے جتنی بھائی کو بھائی سے ہوسکتی ہے، لیکن میں اتنا کج فہم نہیں ہوں کہ دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر انصاف کا خون کردوں۔ میں انصاف سے بو بھر بھی انحراف نہیں کرسکتا خواہ میرے اپنے لڑکے ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو۔ میں انصاف کو برادرانہ محبت سے کہیں اعلیٰ سمجھتا ہوں۔ میں اُن آدمیوں میں ہوں کہ ایسی حالت میں اگر آپ کو رحم اور رعایت کی طرف مائل دیکھوں تو اُس سے باز رکھوں۔

جوالاسنگھ فطرت شناس آدمی تھے۔ سمجھ گئے کہ یہ حضرت اپنے چچا سے برہم ہورہے ہیں۔ یہ حق اور انصاف کی پُکار، اُسی کا بخار ہے۔ کینہ اور بُغض کس حدتک جاسکتا ہے اس کا اندازہ ہوگیا۔ گیان شنکر کی اُن کی نگاہ میں جو عزت تھی وہ غائب ہوگئی۔ بھائی کا اپنے بھائی کی سفارش کرنا ایک انسانی اور قدرتی فعل ہے اور اسے وہ معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن بھائی کو آزار پہنچانے کے لیے اخلاقی اصولوں کی آڑ لینی ایک سفاکانہ، انسانیت سے بعید حرکت تھی۔ حد درجہ شرمناک۔ ایسے ظاہر پرست شخص کو جو انسانیت، انصاف اور ہمدردی کا وکیل بنا پھرتا ہے، ذلیل کرنے کی خواہ مخواہ تحریک ہوئی۔ بولے۔ آپ کی بدگمانی بالکل بے بنیاد ہے۔ ایجاد حسین نے اس امر کے متعلق مجھ سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ اور نہ اُس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ میں اپنے فیصلے میں پہلے ہی دیاشنکر کو بری کرچکا ہوں۔ یہاں بچہ بچہ جانتا ہے کہ میرے اجلاس میں سعی اور سفارش کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے کامل آزادی سے یہ فیصلہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے۔

گیان شنکر سے اگر اس وقت کوئی کہتا کہ تمھارے گھرمیں آگ لگی ہوئی ہے تو بھی غالبًا اُن کے چہرے کا رنگ اِس قدر فق نہ ہوتا۔ جگر میں ایک تیرسا چُبھ گیا۔ سکتہ ہوگیا۔

جوالاسنگھ۔ شہادتیں کمزور ہیں۔ مقدمہ سراسر بافتہ تھا۔

گیان شنکر۔ یہ توآپ نے بڑی خوش خبری سُنائی۔ چچاصاحب تو جامہ میں نہ سمائیں گے۔ عجب نہیں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئیں۔

جوالاسنگھ۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ میں اس انصاف کا قائل نہیں جو دوست کے ساتھ بے انصافی کرنے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ محض اس خوف سے کہ لوگ بدنام

نہ کریں۔

گیان شنکر۔ آپ جو چاہیں کہیں پر میں تو اِسے احسان ہی کہوں گا۔ دوستی قانون کی حدود کو نادانستہ طور پر وسیع کر دیتی ہے۔ اس کے سوا آپ لوگوں کو بھی تو پولیس کا دباؤ ماننا پڑتا ہے۔ اُس سے پُرخاش کر کے کیسی کیسی دقتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس کا خیال بھی تو رکھنا ضروری ہے۔

جوالاسنگھ اس طنز سے تلملا اُٹھے۔ انداز تکبّر سے بولے۔ یہاں جو کچھ کرتے ہیں انصاف کے دعویٰ پر کرتے ہیں۔ پولیس کیا چیز ہے۔ ایشور کا بھی ناجائز دباؤ نہیں مان سکتے۔ آپ کی ان باتوں میں مجھے کدورت کی بُو آتی ہے۔ شاید دیاشنکر کا بری ہونا آپ کو اچھا نہیں معلوم ہوا۔

گیان شنکر نے تنک کر کہا اگر آپ کو یہ گمان ہے تو مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کیجیے گا کہ برسوں کی یکجائی اور ہم صحبتی کے بعد بھی آپ مجھ سے بیگانہ ہیں۔ مگر آپ سے اس کی شکایت کرنی فضول ہے۔ یہ آپ کی خطا نہیں ہے بلکہ ہمارا اخلاقی معیار بھی اتنا گر گیا ہے کہ ہم کسی شخص کو رسمی دائرے سے باہر نکلتے دیکھ کر فوراً اُس کی نیت پر شُبہ کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت خودغرضی وبائے عام ہے۔ اس لیے ہم کو کسی کے ایثار پر یقین نہیں آتا۔ ہم کو فوراً شُبہ ہوجاتا ہے کہ ضرور اس ایثار کے پردے میں کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ آپ نے لٹریچر پڑھا ہے۔ فلسفۂ اخلاق پڑھا ہے۔ لیکن جب میں ایک اخلاقی اصول کو کتابی گوشے سے نکال کر دائرۂ عمل میں لاتا ہوں تو آپ کو کینہ و عناد کی بو آنے لگتی ہے۔ انسانی مساوات کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جب ہم ایک فرد سے صدہا ذاتوں کو نقصان پہنچتے دیکھیں تو بہ حیثیت ایک انسان کے ہمارا فرض ہے کہ اس فرد کو راہِ راست پر لائیں۔ یا اُسے ایذا رسانی کے قابل نہ رکھیں، خواہ وہ فرد اتفاق سے ہمارا قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ آپ اس اصول سے انکار نہیں کرسکتے۔ دُنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں معدوم نہیں ہیں جب کہ جذبۂ انسانیت نے نسبی تعلقات پر فتح پائی ہے۔ ایسی حالت میں آپ کینہ و عناد کا الزام لگاتے ہیں تو میں بجز اُس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ فلسفۂ اخلاق کے مطالعے نے آپ کو کوئی فیض نہیں پہنچایا۔ دیاشنکر کے اور میرے درمیان اختلاف ہو لیکن وہ میرے بھائی ہیں۔ میں محض ذاتی بخار نکالنے کے لیے قانون کی آڑ نہیں

لے سکتا۔ آپ مجھے کتنا ہی فرومایہ سمجھیں مگر میں اپنے کو اتنا فرومایہ نہیں خیال کرتا۔ اس بدنیتی کے الزام کا امکان میرے ذہن سے دُور نہیں تھا۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے یہ رویّہ اختیار کیا تو یہ وہ حُسنِ ظن ہے جو آپ کی جانب سے میرے دل میں تھا اور وہ فرض انسانیت جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ میں کسی فعل کے صواب و خطا کا فیصلہ دوسروں کی زبان پر نہیں اپنے ضمیر پر چھوڑتا ہوں۔

یہ کہہ کر گیان شنکر باہر نکل آئے۔ جس مقصد سے وہ اتنے سویرے یہاں آئے تھے اُس میں ناکام رہ جانے کے باعث وہ بہت برگشتہ خاطر ہورہے تھے۔ ہاں یہ تسکین ضرور تھی کہ میں نے اِن حضرات کے دانت کھٹے کردیے۔ اب انھیں پھر مجھ سے ایسی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ جوالا سنگھ نے بھی اُن سے بیٹھنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس شخص میں ذہانت اور ریاکاری کا کیسا نادر اجتماع ہوگیا ہے۔ ان دونوں کا میل شراب دوآتشہ ہے۔ مگر میری پھٹکار سے کچھ تو آنکھیں کُھلی ہوں گی۔ سمجھ گئے ہوں گے کہ نیت کے پرکھنے والے ابھی دنیا سے معدوم نہیں ہوئے۔

گیان شنکر یہاں سے چلے تو اُن کی حالت اُس جُواری کی سی تھی جو جُوئے میں ہارگیا ہو اور سوچ رہا ہو ایسی کون سی چیز داؤں پر لگاؤں کہ ہار کی جیت ہوجائے۔ دل میں ایک شورش ہورہی تھی۔ اگرچہ جوالا سنگھ کو اُنھوں نے دنداں شکن جواب دیا تھا، پھر بھی انھیں محسوس ہورہا تھا کہ میں کوئی گہری چوٹ نہ کرسکا۔ اب ایسی کتنی ہی باتیں یاد آرہی تھیں جن سے جوالا سنگھ کے دل پر وار کیا جاسکتا تھا۔ اور نہیں تو رشوت ستانی ہی کا الزام لگادیتا۔ خیر پھر دیکھی جائے گی۔ اب اُنھیں قومیت اور انسانیت کا وہ اعلیٰ معیار بھی قابلِ خندہ زنی معلوم ہوتا تھا جس کی نیابت سے اُنھوں نے جوالا سنگھ کو شرمندہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن اُن کے خیال میں جوالا سنگھ کو اُنھیں نشانۂ ملامت بنانے کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ وہ جواہر سنگھ کے اس طرزِ عمل کو انصاف اور اصول پر نہیں خودپروری اور دعویٰ فضیلت پر مبنی سمجھتے تھے۔ ورنہ کیا ممکن نہ تھا کہ وہ اُن سے زیادہ اخلاق سے پیش آتے۔ انصاف پروری کے یہ معنیٰ نہیں کہ خواہ مخواہ دوسروں کو لاٹھی ماری جائے۔ اگر میری نیتِ فاسد کا راز اُن پر عیاں ہوگیا تھا تو انسانیت اور مروّت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ میری دلجوئی کرتے۔ کینہ بھی تو ایک عام انسانی جذبہ ہے۔ خواہ وہ کتناہی قابل نفرین کیوں نہ ہو، اگر کوئی شخص اس کے لیے میری تحقیر

کرے تو یقیناً اس کے اس فعل کو اعلیٰ اخلاقی احساس کا نہیں زعمِ باطل کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ جوالا سنگھ کوئی ولی نہیں۔ فرشتہ نہیں۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ اس عام انسانی کمزوری سے بیگانہ محض ہوں۔ بلکہ اُن کی یہ متکبرانہ اصول پروری اس بغض کا نتیجہ ہے جو انھیں میری علمی فضیلت سے ہے۔ ایسے شخص کو کوئی مجاز نہیں کہ وہ میری تذلیل کرے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ گھر پہنچے تو اپنے دونوں چھوٹے چچیرے بھائیوں کو اپنے کمرے میں کتابیں اُلٹتے پلٹتے دیکھا۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ لیکن گیان شنکر اس وقت طیش میں تھے۔ اس مداخلت بیجا پر آگ ہوگئے۔ ان لوگوں نے مجھے چھیڑنے اور جلانے کے لیے ان شیطانوں کو یہاں بھیج دیا ہے۔ نیچے اتنا بڑا دیوان خانہ ہے۔ دوکمرے ہیں۔ کیا ان کے لیے اتنا کافی نہیں کہ میرا ایک کمرہ بھی آنکھوں میں خار ہورہا ہے۔ شاید اس پر بھی دانت ہو۔ مجھے گھر سے نکالنے ہی کی ٹھانی ہے کیا؟ اس معاملے کو ابھی سے صاف کرلینا چاہیے۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ یہ لوگ مجھے دباتے جائیں اور میں چوں تک نہ کروں۔ دل میں یہ فیصلہ کرکے اُنھوں نے لالہ پربھاشنکر کو یہ رقعہ لکھا:۔

چچا صاحب قبلہ! یہ امر میری قوتِ برداشت سے باہر ہے کہ آپ کے صاحبزادے بلا ضرورت میری غیر حاضری میں میرے کمرے کا جائزہ لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مکان کی تقسیم آج ہی فرمادیجیے۔ اور لڑکوں کو سخت تاکید فرما دیجیے کہ وہ کبھی میرے حدود میں قدم نہ رکھیں۔ ورنہ میں نے کسی کی گوش مالی کی تو آپ کو مجھ سے شکایت کا کوئی موقع نہ رہے گا۔ اس کا لحاظ رکھیے گا کہ میرا حصہ ہرایک ضرورت کے لیے کافی ہو۔ اور سب سے مقدم یہ ہے کہ الگ ہو۔ تاکہ میں اُسے اپنا سمجھ سکوں۔ اور آتے جاتے اُٹھتے بیٹھتے آتشیں نگاہوں اور زبانوں کا نشانہ نہ بنوں۔

یہ رقعہ کہار کو دے کر وہ جواب کا انتظار کرنے لگے۔ دیکھیں بڈّھا اَب کی کیا چال چلتا ہے۔ ایک لمحے میں خدمت گار نے جواب لاکر اُن کے ہاتھ میں رکھ دیا:۔

بیٹا۔ میرے لڑکے تمھارے لڑکے ہیں۔ اُنھیں تنبیہ کرنے کا تمھیں کامل اختیار ہے۔ اس کی شکایت مجھے نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہوگی۔ بلکہ مجھ پر تمھارا بے حد احسان ہوگا اگر کبھی کبھی اِن کی خبر لیتے رہو۔ رہی مکان کی تقسیم۔ اُسے میں تمھارے ہی اوپر چھوڑتا ہوں۔ مکان تمھارا ہے۔ میں بھی تمھارا ہوں۔ جو ٹکڑا چاہو مجھے دے دو۔ مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔

ہاں چونکہ میں باہر بیٹھنے کا عادی ہوں اس لیے دیوان خانے کے برآمدے میں میرے لیے ایک تخت کی جگہ ضروری ہے۔ بس۔ میری دلی تمنا تھی کہ میرے دورانِ حیات میں یہ تفریق نہ ہوتی۔ مگر چونکہ تمھاری یہی خواہش ہے اور تم اسی میں خوش ہو تو میرا کیا چارہ!

گیان شنکر نے پُرزے کو جیب میں رکھ لیا اور مُسکرائے۔ بڈّھا کیسا گھاگ ہے! اُنھیں تملق سازیوں سے تو اُس نے والد کو اُلّو بنا لیا تھا۔ مجھ سے بھی وہی داؤں کھیل رہا ہے۔ مگر میں ایسا گوکھا نہیں ہوں۔ سمجھتے ہوں گے کہ ذرا دب جاؤں گا تو وہ آپ ہی دب جائے گا۔ یہاں اِس جانب ایسی احمقانہ انسانیت کا سبق نہیں پڑھے۔ بزور دبنا تو سمجھ میں آتا ہے۔ وہ ایک امر مجبوری ہے۔ لیکن کسی کی خاطر سے یا مروّت سے دبنا یہ ابلہانہ جذباتیت ہے۔

گیان شنکر بیٹھ کر سوچنے لگے کیوں کر یہ مرحلہ طے کروں۔ محض یہ کمرہ نیچے کے وسیع دیوان خانے اور اُس کے بغل کے دو کمروں کا بدل نہیں ہوسکتا۔ اوپر کے باقی دونوں کمرے دیاشنکر کے قبضے میں ہیں۔ بس اوپر کے تینوں کمرے میرے۔ نیچے کے تینوں کمرے اُن کے۔ یہاں تو یہ تقسیم آسانی سے ہوگئی۔ پر زنانے مکان میں یہ یکجائیت مشکل سے ہاتھ آئے گی۔ پردہ کی کم سے کم دو دیواریں کھینچنی پڑیں گی۔ پورب کی طرف نکاس کے لیے ایک دروازہ کھولنا پڑے گا۔ اور یہ طول عمل ہے۔ کیا ہرج ہے اگر اسی دیوان خانے کے دونوں حصوں پر قانع ہوجاؤں گا۔ زنانہ مکان مُسلّم اُنھیں کے حصّے میں ڈال دوں۔ اوپر عورتیں رہ سکتی ہیں، نیچے میری نشست ہوجائے گی۔ زنانہ مکان اس سے کہیں وسیع ہے مگر جانے کب کا بنا ہوا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے ازسرنو بنوانا پڑے گا۔ بس یہی مصلحت ہے۔ چچا صاحب کا دیوان خانے میں کسی طرح گزر نہیں ہوسکتا۔ اُنھیں مجبوراً زنانہ مکان لینا پڑے گا۔ اِس میں میری فیاضی کی شان بھی بنی رہ سکتی ہے۔ سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

دل میں یوں فیصلہ کرکے وہ مستورات سے صلاح کرنے کے لیے اندر گئے۔ وہ رِواجی تہذیب کے مطابق ہرایک معاملے میں عورتوں سے رائے لیاکرتے تھے۔ مگر اس کے مسترد کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ اور تقریباً ہرایک موقع پر اُس کا استعمال کرکے آزادیٔ رائے کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ وہ اندر گئے تو دردناک منظر دکھائی دیا۔
دیا شنکر کچہری جارہے تھے اور بڑی بہو باچشم تر اُنھیں رخصت کررہی تھیں۔ دونوں

بہنیں اُن کے پیروں سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ اُن کی بیوی اپنے کمرے کے دروازے پر گھونگھٹ نکالے اُداس کھڑی تھی۔ لحاظ کے مارے شوہر کے پاس نہ آسکتی تھی۔ شردھا بھی کھڑی رو رہی تھی۔ آج مقدمے کا فیصلہ سُنایا جانے والا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہو؟ گھر لوٹ کر آنا لکھا ہے یا گھر کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ دیا شنکر بہت ہی مایوس اور شکستہ خاطر نظر آتے تھے۔ گیان شنکر کو دیکھتے ہی اُن کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ قریب آکر بولے بھیا میرا دل آج کانپ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر آپ لوگوں کے درشن نہ ہوں گے۔ میری خطائیں معاف کیجیے گا۔ کون جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ گھر اب آپ کے سپُرد ہے۔ دادا کا کیا بھروسا!

گیان شنکر ان کی یہ دردناک باتیں سُن کر پگھل گئے۔ اپنی تنگ ظرفی اور کج خلقی پر افسوس ہوا۔ تسکین دیتے ہوئے بولے۔ ایسی باتیں مُنہ سے نہ نکالو۔ تمھارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ جوالا سنگھ کتنے ہی اصول پرور بنیں پر میرے احسانات نہیں بھول سکتے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں ابھی تمھارا ہی ذکر کرکے ان کے پاس سے آرہا ہوں۔ تم ضرور بری ہوجاؤ گے۔ اُنھوں نے مجھے بہت وثوق کے ساتھ اطمینان دلایا ہے۔ چلتا تو میں بھی تمھارے ساتھ۔ لیکن میرے جانے سے شاید کام بگڑ جائے۔

دیا شنکر نے اشتباہ آمیز انداز سے کہا۔ حُکّام کی باتوں کا کیا اعتبار۔

گیان شنکر۔ جوالا سنگھ ان حُکّام میں نہیں ہیں۔

دیا شنکر۔ یہ نہ کہیے۔ بڑا بے مروّت آدمی ہے۔

گیان شنکر۔ کسی پر بلاوجہ بدگمانی نہ کرنی چاہیے۔

دیا شنکر نادم ہوکر وہاں سے چلے گئے۔ گیان شنکر وِدّیاوتی کے پاس گئے۔ اُس نے پوچھا آج سویرے کہاں گئے تھے؟

گیان شنکر۔ ذرا جوالا سنگھ سے ملنے چلا گیا تھا۔

وِدّیاوتی۔ تمھاری یہ باتیں مجھے اچھّی نہیں لگتیں۔

گیان شنکر۔ کون باتیں؟

وِدّیاوتی۔ یہی، اپنے گھر والوں کی دوسروں سے شکایت کرنا۔ بھائیوں میں کھٹ پٹ سبھی جگہ ہوتی ہے مگر کوئی یوں بھائی کی جڑ نہیں کاٹتا۔

گیان شنکر نے ہونٹ چباکر کہا۔ تم نے مجھے اتنا کمینہ اور کینہ پرور سمجھ لیا ہے!
وِدّیاوتی نے اُسی بدگمانی کے انداز سے کہا اچھا میری قسم کھاؤ کہ تم اسی لیے جوالا سنگھ کے پاس نہیں گئے تھے۔

گیان شنکر طیش میں آکر بولے میں تمھارے سامنے اپنی صفائی دینی ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ کہہ کر گیان شنکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وِدّیاوتی نے پتے کی بات کہی تھی اور یہ الفاظ ان کے جگر میں چبھ گئے تھے۔ اُن پر اس وقت روشن ہوا کہ سارے گھر کے لوگ یہاں تک کہ میری بیوی بھی مجھے کتنا سیاہ باطن سمجھتی ہیں۔

وِدّیاوتی نے پھر کہا۔ ارے تو یہاں کوئی غیر تھوڑے ہی بیٹھا ہوا ہے۔

گیان شنکر۔ چُپ بھی رہو۔ تمھاری ایسی احمقانہ باتوں سے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ معلوم نہیں تمھیں کب بات کرنے کی تمیز آئے گی۔ کیاہوا آج کھانا نہ ملے گا کیا؟ دوپہر تو ہونے آئی۔

وِدّیاوتی۔ آج تو کھانا بناہی نہیں۔ تمھیں نے مکان تقسیم کرنے کے لیے چچا جی کے پاس کوئی رقعہ لکھا تھا۔ تب سے وہ بیٹھے رورہے ہیں۔

گیان شنکر۔ اُن کا رونے کو جی چاہتا ہے تو شوق سے روئیں۔ پرہم لوگوں کو بھوکوں کیوں مارتے ہیں۔

وِدّیاوتی نے انھیں ملامت کی نظروں سے دیکھ کرکہا گھر میں جب یہ راڑ مچا ہوتو دانے کی طرف تاکنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ چچاجی کو اس حالت میں دیکھ کر کس کے حلق کے نیچے لقمہ اُترے گا۔ ایک تو لڑکے پر یہ مصیبت۔ دوسرے گھرمیں یہ آپادھاپی۔ جب سے تمھاری چٹھی پائی ہے سر نہیں اُٹھایا۔ تمھیں الگ ہونے کی یہ دُھن کیوں سمائی ہے؟

گیان شنکر ۔ اسی لیے کہ جو تھوڑی بہت جائداد بچ رہی ہے وہ بھی اسی بھاڑ میں نہ جل جائے۔ پہلے گھر میں چھ ہزار سالانہ نفع کی جائداد تھی۔ اب مشکل سے دو ہزار کی رہ گئی ہے۔ ان لوگوں نے سب کا صفایا کردیا۔

وِدّیاوتی۔ تو یہ لوگ کوئی غیر تو نہیں ہیں؟

گیان شنکر۔ تم جب ایسی بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتی ہو تو معلوم ہوتا ہے کسی مہاتما رشی کی بیٹی ہو۔ تمھارے باپ کے پاس تو لاکھوں کی جائداد ہے۔ کیوں نہیں اس میں سے

تھوڑی سی ہم کو دے دیتے۔ وہ تو کبھی بات بھی نہیں پوچھتے۔ اور تمھارے پیروں تلے گنگا بہتی ہے۔

وِدّیاوتی۔ خوددار آدمی دوسروں کا مُنہ نہیں تاکتا۔ اپنے قوتِ بازو کا بھروسا رکھتا ہے۔

گیان شنکر۔ ''شرم نہیں آتی۔ اوپر سے دون کی لیتی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ گھر کی جائداد جان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ نہیں تو جس کے گھر میں دوڈھائی لاکھ سالانہ آتا ہو اُس کے لیے بیٹی داماد پر دوچار ہزار ماہوار خرچ کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ تمھارے پدربزرگوار تو پیسے کو یوں دانتوں سے پکڑتے ہیں اور تم اتنی سخی بنتی ہو گویا جائداد کوئی چیز ہی نہیں۔''

اتنے میں شردھا آگئی اور گیان شنکر مکان کی تقسیم کے بارے میں اس سے باتیں کرنے لگے۔

(۶)

لالہ پربھاشنکر کا غصہ جونہی فرو ہوا وہ اپنی سخت کلامیوں پر نادم ہوئے۔ بڑی بہو کی تیکھی باتیں یاد کرکے وہ اور بھی آزردہ خاطر ہونے لگے۔ جس بھائی کی محبت اور احترام سے ان کا سینہ لبریز تھا۔ جس کی دائمی مفارقت کا زخم ابھی مُرجھانے نہ پایا تھا۔ جس کی یاد آتے ہی آنکھوں سے بُوئے اشک جاری ہوجاتی تھی اس کے لختِ جگر کے ساتھ اپنا یہ ناملائم برتاؤ اُنھیں انسانیت سے بعید معلوم ہوتا تھا۔ یہ سفلہ ناشناسی کی۔ کفرانِ نعمت کی انتہا تھی۔ سردرد کا بہانہ کرکے لیٹ رہے۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی جو تصورات کو پیشِ نظر کردیتی ہے۔ انھیں ایسا معلوم ہوا کہ لالہ جٹا شنکر دروازے پر کھڑے اُن کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ گھبراکر اُٹھ بیٹھے۔ دل میں ایک ہیجان سا ہونے لگا۔ بے اختیار جی چاہا کہ چل کر گیان شنکر سے معافی مانگوں۔ لیکن رات زیادہ گزر گئی تھی۔ بے چارے آہ سرد بھرکر پھر لیٹ رہے۔ ہا! جس بھائی نے میری طرف کبھی نگاہ تیز سے نہیں دیکھا۔ اُس کی روح کو میری ذات سے ایسا ملال ہو۔ میں کتنا احسان فراموش، کتنا تنگ دل، کتنا کم ظرف ہوں۔

علی الصباح اُنھوں نے بڑی بہو سے پوچھا۔ رات گیان نے کچھ کھایا تھا یا نہیں؟

بڑی بہو۔ رات چولھا ہی نہیں جلا۔ کسی نے بھی نہیں کھایا۔

پربھاشنکر۔ تم کھاؤ یا نہ کھاؤ لیکن سارے گھر کو کیوں بھوکوں مارتی ہو۔ بھلا گیانو نے اپنے
دل میں کیا کہا ہوگا۔ مجھے کتنا کمینہ، مطلبی، بے مروّت سمجھا ہوگا۔

بڑی بہو۔ نہیں اب تک تو وہ تمھیں دیوتا سمجھتا تھا۔ تمھاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوگا۔ میں
اِس لونڈے کا رُخ سال بھر سے دیکھ رہی ہوں۔ تعجب یہی ہے کہ وہ اب تک کیسے
خاموش بیٹھا رہا۔ آخر وہ کیا سمجھ کر الگ ہورہا ہے۔ یہی نہ کہ ہم لوگ پرائے ہیں۔
اور اس کا حصہ ہضم کیے جاتے ہیں۔ اُسے اِس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کہ اِن لوگوں کا
کیوں کر گزر بسر ہوگا۔ اُسے تو بس روپیہ کی ہائے ہائے پڑی ہوئی ہے۔ چاہے چچا،
بھائی، بھتیجے جئیں یا مریں۔ ایسے آدمی کا مُنہ دیکھنا پاپ ہے۔

پربھاشنکر۔ پھر وہی بات منہ سے نکالتی ہو۔ اگر وہ اپنا آدھا حصہ مانگتا ہے تو کیا بُرا کرتا ہے۔
دُنیا کا یہی دستور ہورہا ہے۔

بڑی بہو۔ بُرا نہیں بڑا دھرم کررہا ہے۔ تم تو صرف پچھتا رہے ہو۔ اُس کی آنکھوں سے تو
آنسو کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ شاید ابھی تمھارے پیروں پڑنے آتا ہوگا۔

پربھاشنکر۔ زیادتی میری تھی۔ اُس کی کوئی خطا نہیں۔

بڑی بہو۔ تم تو جیسے سٹھیا گئے ہو۔ کہاں تک کوئی سمجھائے۔ تمھیں جو کچھ اب بھی نہیں
سوجھتا وہ مجھے اُسی دن سوجھ گیاتھا جب اُس نے کھیل میں دیا شنکر کو کوٹھے پر سے
دھکیل دیاتھا۔ ہمارے لڑکے کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ ہمارا گھر تباہ ہوا جاتا ہے۔ دانہ
پانی حرام ہورہا ہے۔ وہاں آدھی رات تک ہارمونیم بجتا ہے۔ یار دوستوں کے ساتھ
قہقہے اُڑائے جاتے ہیں۔ میں تو اُسے کالا ناگ سمجھتی ہوں جس کے زہر کا اُتار نہیں۔
اگر کوئی ہماری گردن پر چھری بھی چلادے تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ تم
یہاں بیٹھے پچھتا رہے ہو اور وہ ٹولے محلّے میں گھوم گھوم کر تمھیں بدنام کررہاہے۔
سب تمھیں کو بُرا کہیں گے۔

پربھاشنکر۔ کیوں خواہ مخواہ ایسے شبہے کرتی ہو۔ یہ باتیں اس کی ذات سے بعید ہیں۔

بڑی بہو۔ تم اسی طرح بیٹھے بیٹھے سپنے دیکھتے رہوگے اور وہ ایک دن سب عزیزوں کو بٹور کر
بانٹ بخرے کا مسئلہ پیش کردے گا۔ پر تمھارا کیا کچھ نہ ہوگا۔ رائے کملا نند سے بھی
خط و کتابت کر رہا ہے ۔ میری بات مانو۔ اپنے عزیزوں کو بھی آگاہ کردو ۔ پہلے سے

ہوشیار رہنا اچھا ہے۔

پربھاشنکر نے پُر غرور انداز سے کہا۔ یہ مجھ سے مرتے دم تک نہ ہوگا۔ میں ایسا بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنے گھر کی ناچاقیوں کا ڈھنڈورا پیٹتا پھروں۔ گیان شنکر مجھے جو چاہے سمجھیں لیکن میں اُنھیں اپنا لڑکا ہی سمجھتا ہوں۔ ہم دونوں بھائی عمر بھر یک جان و دو قالب رہے۔ آج بھیا کے پیچھے میں اتنا بے شرم ہوجاؤں کہ دوسروں سے رونا روتا پھروں۔ مجھے گیان شنکر کی ذات سے ایسی اُمید نہیں ہے ۔لیکن اُن کے ہاتھوں میرا نقصان بھی ہوجائے تو مجھے مطلق ملال نہ ہوگا۔ اگر بھائی صاحب پر ہمارا بار نہ ہوتا تو اُن کی زندگی بڑے عیش سے بسر ہوتی۔ گیانو انھیں کا لڑکا ہے۔ اگر ہماری تکلیف سے اُسے آرام اور اطمینان حاصل ہوتو ہمیں شکایت کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ہمارے سر اُس کے احسان کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ یہ انسانیت اور شرافت سے بعید ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے اُن سے راڑ کریں۔

بڑی بہو نے اس کا جواب دینا فضول سمجھا۔ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئیں۔ پربھاشنکر اُنھیں ابھی اور خفیف کرنا چاہتے تھے وہ کچھ دیر تک انتظار میں بیٹھے رہے کہ آجائیں تو دل کا بخار نکالوں۔ لیکن جب دیر ہوئی تو اکتاکر باہر چلے آئے۔ وہ پہلے کتنی ہی بار بڑی بہو سے گیان شنکر کی شکایت کرچکے تھے۔ اُن کے فیشن اور ٹھاٹ شوق و نمود کے لیے وہ کبھی خوشی سے روپے نہ دیتے تھے۔ لیکن جب بڑی بہو یا گھر کے کسی دوسرے آدمی کو گیان شنکر کی بدخواہی پر آمادہ دیکھتے تو ان کا حُسنِ انصاف متحرک ہوجاتا تھا اور وہ جوش میں آکر شرافت اور وضعداری کی ایسی ڈینگ مارنے لگتے تھے جس پر عمل کرنے کا شاید اُنھیں کبھی حوصلہ نہ ہوتا۔

باہر آکر وہ آنگن میں ٹہلنے لگے۔ اور تیج شنکر کو یہ دیکھنے کو بھیجا کہ گیان شنکر کیا کررہے ہیں۔ وہ اُن سے معذرت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اُنھیں پیرگاڑی پر سوار دیکھا تو کچھ نہ کہہ سکے۔ گیان شنکر کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔ گیان شنکر نے سوچا اتنے سویرے یہ کہاں جارہے ہیں۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ اُنھوں نے اپنے پہاڑی مینے کا پنجرا اُتارلیا اور اُسے بیسن چُگانے لگے۔ پھراشنان کیا اور رامائن کا پاٹھ کرنے لگے۔ اتنے میں دس بج گئے اور خدمت گار نے گیان شنکر کا خط لاکر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ اِسے پڑھ کر اُن کے بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک ایک حرف چنگاری کی طرح دل

پر لگتا تھا۔ گیان شنکر کتنے کینہ پرور کتنے خودغرض ہیں، اس کا کچھ اندازہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ بڑی بہو نے اُن کی طینت کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ اُف! یہ کدورت! یہ کورباطنی۔ یہ خط کیوں کر اُن کے قلم سے نکلا۔ میری گردن پر تو اُنھوں نے تلوار بھی چلا دی ہوتی تو بھی میں اتنا دلآزارانہ پہلو نہ اختیار کرسکتا۔ اتنا لائق و فائق ہونے پر بھی دل کا اتنا تنگ۔ علم کے معنی تو یہ ہیں کہ انسان کی نگاہ وسیع ہو۔ انانیت کا خیال مٹے۔ مزاج میں ضبط اور تحمل کی شمع روشن ہو۔ نہ کہ خودپروری، مغائرت اور کج اندیشی کا بھوت سر چڑھ جائے۔ لڑکوں نے شرارت کی تھی۔ اُن کو تنبیہ کردیتے۔ قصہ تمام ہوجاتا۔ نہیں تو ذرا سی بات کا اتنا طومار باندھا۔ اب صاف ظاہر ہورہا ہے کہ ایک ساتھ نباہ نہ ہوگا۔ میں کہاں تک درگزر کروں گا، کہاں تک دبوں گا۔ خیر اُن کی جیسی مرضی۔ میں اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا جس سے میری گرفت ہو۔ مکان تقسیم کرنے کو کہتے ہیں اس سے زیادہ مغائرت اور کیا ہوگی۔ گھر کا پردہ فاش ہوجائے گا۔ عزیزوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔ وائے قسمت! گھر میں دو چولھے جلیں گے۔ جو بات کبھی نہ ہوئی تھی وہ اب ہوگی۔ میرے اور بھیا کے بیٹے کے درمیان صرف پڑوسی کا ناتا رہ جائے گا۔ وہ جو ساری عمر ساتھ رہے، ساتھ کھیلے، ساتھ ہنسے، ساتھ روئے اب الگ ہوجائیں گے۔ مگر علاج ہی کیا ہے۔ کہہ دوں تمھاری جیسی مرضی ہو اس طرح تقسیم کرلو۔ کیوں کہوں کہ میں یہ کمرہ لوں گا۔ وہ بالاخانہ لوں گا۔ وہ صحن لوں گا۔ جب الگ ہی ہوتے ہیں تو حتی الامکان آپس میں بدمزگی نہ پیدا ہونے دیں۔ یہی مضمون لالہ پربھاشنکر نے رقعے کے جواب میں لکھ دیا۔ اُنھیں اب بھی اُمید تھی کہ میری رواداری اور بے عذری کا گیان شنکر پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ کیا عجب ہے کہ علاحدگی کا خیال ہی ان کے دل سے دور ہوجائے۔ وہ جواب کا انتظار کرنے لگے۔

گیارہ بجے تک کوئی جواب نہ آیا۔ دیاشنکر کچہری جانے لگے۔ بڑی بہو آکر بولیں للّو کے ساتھ تم بھی چلے جاؤ۔ آج تجویز سُنائی جائے گی۔ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ پربھاشنکر نے اپنی زندگی میں کبھی کچہری میں قدم نہیں رکھاتھا۔ دونوں بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ چاہے کچھ ہی افتاد کیوں نہ پڑے کچہری کا مُنہ نہ دیکھیں گے۔ اس عہد کے باعث اُنھیں بارہا نقصان اُٹھانے پڑے تھے۔ کتنی ہی بار ندامت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مخالفوں کے سامنے سرجھکانے کی نوبت آگئی تھی۔ پر اب تک اُنھوں نے اسے نباہا تھا۔ بڑی بہو کی

بات سُن کر پربھاشنکر بڑی تشویش میں پڑے۔ نہ جاتے ہی بنتا تھا نہ انکار ہی کرتے بنتا تھا۔ بغلیں جھانکنے لگے۔ دیاشنکر نے اُنھیں پریشان دیکھ کر کسی قدر بے اعتنائی سے کہا۔ آپ کے ناگوار خاطر ہو تو نہ چلیے۔ کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سر جو گزرے گی وہ دیکھ لوں گا۔

بڑی بہو۔ نہیں چلے جائیں گے۔ ہرج ہی کیا ہے۔

دیاشنکر۔ جب آج تک کبھی کچہری میں قدم نہیں رکھا تو اب اس عہد کو کیسے توڑیں گے؟

بڑی بہو۔ میں ایسے قول قرار بہت دیکھ چکی ہوں۔ لاؤں کپڑے؟

دیاشنکر۔ نہیں کیا ضرورت ہے۔ میں تنہا ہی چلا جاؤں گا۔

یہ کہہ کر دیاشنکر چلے گئے۔ بڑی بہو بھی شوہر کو ناہمدردانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی گھر میں چلی گئیں۔

پربھاشنکر دل میں بڑی بہو پر جھنجھلا رہے تھے کہ اُس نے میرے کچہری جانے کا چرچا ہی کیوں کیا۔ میں وہاں جاکر کیا بنا لیتا۔ حاکم کی قلم تو پکڑ نہ لیتا۔ نہ اِس سے کچھ عرض معروض ہی کرسکتا تھا۔ اور پھر جو کام ساری عمر نہیں کیا وہ آج کیوں کروں؟ جس نے کانٹے بوئے ہیں وہ اُن کے پھل کھائے گا۔ اس فکر میں کہاں تک مروں؟

وہ اسی خلجان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ گیان شنکر کا دوسرا رقعہ آ پہنچا۔ اُنھوں نے پورا دیوان خانہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ پربھاشنکر نے سوچا تھا میری رواداری ان کی آتشِ غضب کو فرو کردے گی۔ اس امید کے خلاف جب یہ جواب آیا تو اُن کے جگر کے ٹکڑے ہوگئے۔ گیان شنکر کے انتقامی طرزِ عمل نے اُنھیں مغلوب کردیا۔ بوکھلا دیا۔ غصّے کی جگہ دل میں ایک بیکسانہ ضعف پیدا ہوا۔ غصہ مدافعانہ قوت کا اظہار ہے۔ اُن میں یہ قوت سلب ہوگئی۔ اس علاحدگی کی ہیبتناک مکروہ صورت نے مقابلے کا خیال ہی مٹا دیا۔ اُس بچّے کی سی حالت ہوگئی جو ہاتھی کو سامنے آتے دیکھ کر مارے خوف کے رونے لگے۔ بھاگنے کا خیال ہی نہ رہے۔ اُن کی ساری زندگی برادرانہ الفت کے سایے میں گزری تھی۔ منافرت کی یہ تیز اور جاں سوز دھوپ برداشت نہ ہوسکی۔ ایک فریادی کی صورت بنائے ہوئے گیان شنکر کے پاس آئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔ گیانو۔ ایشور کے لیے اتنی بے مروّتی نہ کرو۔ میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ میرے سینے پر اتنا بڑا داغ نہ دو۔ تم سارا مکان لے لو۔ میرے

بال بچوں کے لیے جہاں چاہو ایک گوشہ دے دو۔ میں اسی میں گزر کرلوں گا۔ میری زندگی میں یہی صورت قائم رکھو۔ جب میں مرجاؤں تو جو جی چاہے کرنا۔ ایک تھالی میں نہ کھاؤ۔ ایک مکان میں تو رہو۔ اتنا رشتہ تو قائم رکھو۔ مجھے دیوان خانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھلا سوچو تو تم دیوان خانے میں آکر رہوگے تو دنیا کیا کہے گی۔ شہر والے کیا کہیں گے۔ سب کچھ ہوگیا ہے پھر بھی تمھارے خاندان کا وقار باقی ہے۔ ہم دونوں بھائی شہر میں رام لکھن کی جوڑی کہلاتے تھے۔ ہماری محبت اور یگانگت کی نظیر دی جاتی تھی۔ میری زندگی میں کسی کو یہ کہنے کا موقع مت دو کہ ایک بھائی کی آنکھیں بند ہوتے ہی آپس میں ایسی اَن بَن ہوگئی کہ ایک گھر میں بھی نہیں رہ سکتے۔ میری اتنی عرض قبول کرو۔

گیان شنکر پر اس منّت سماجت کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اُن کے خیال میں یہ بُزدلانہ حیثیت تھی۔ جو ضعف دماغ کی علامت ہے۔ ہاں اُن پر ظاہرداری یا تصنّع کا گمان نہ ہوسکتا تھا۔ اُنھیں یقین آگیا کہ اس وقت چچا صاحب کو فی الواقع ملال ہورہا ہے۔ بُڈھے آدمی کچھ نرم دل ہوتے ہی ہیں۔ اُس پر اُنھوں نے زندگی بھر شرافت اور وقار اور نمود کے دیوتا کی پرستش کی ہے۔ بدنامی کا خیال دل کو کچلے ڈالتا ہے۔ بولے مجھے آپ کے ارشاد کی تعمیل سے بالکل انکار نہیں ہے۔ لیکن یہ تو دیکھیے کہ پُرانے مکان میں دو خاندانوں کا گزر ہو بھی سکتا ہے۔ رسوئی کا مکان صرف ایک ہے۔ اوپر سونے کے لیے صرف تین کمرے ہیں۔ آنگن کہنے کو دو ہیں۔ مگر ہوا اور روشنی کا گزر ایک ہی میں ہوتا ہے۔ غسل خانہ بھی ایک ہی ہے۔ ان تکلیفوں کو ہمیشہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری زندگی اتنی طولانی نہیں ہوتی کہ اس کا ایک حصہ تکلیفوں ہی کی نذر کیاجائے۔ آپ کے نازک جذبات کو صدمہ ضرور ہوگا اور مجھے آپ سے کمالِ ہمدردی ہے۔ لیکن ایک موہوم جذبے کے لیے جسمانی آسایش اور روحانی اطمینان کو قربان کرنا مجھے پسند نہیں۔ اور اگر آپ بھی اس مسئلے پر غور کریں گے تو مجھ سے متفق ہوجائیں گے۔

پربھاشنکر۔ مجھے تو اس بدنامی کے مقابلے میں یہ تکلیفیں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ جیسے اب تک کام چلتا رہا ہے اُسی طرح اب بھی چل سکتاہے۔

گیان شنکر۔ میرے اور آپ کے اصولِ زندگی میں بہت بڑا فرق ہے۔ آپ دل کی پرستش کرتے ہیں۔ میں دماغ کا مرید ہوں۔ آپ بدنامی کے خوف سے ہرایک تکلیف برداشت

کرلیں گے۔ میں اپنے ضمیر کے سامنے زبانِ خلق کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ زندگی آرام سے گزرے یہ مقصود ہے۔ دنیا اسے خودغرضی کہہ کر ہنسے اور بدنام کرے تو میں اُس کی رائے کو پیروں تلے کُچل ڈالوں گا۔ آپ کی تہذیب کی بنیاد ہی خودکشی ہے۔ آپ کے گھر میں فاقہ ہوتا ہو لیکن کوئی مہمان آجائے تو آپ قرض لے کر اس کی مہمان داری کریں گے۔ میں اُسے دور ہی سے سلام کروں گا۔ آپ کے یہاں جاڑوں میں اکثر مہمان لوگ لحاف یا بستر کے بغیر آتے ہیں۔ آپ خود سردی کھاتے ہیں مگر اُن کے اوڑھنے بچھانے کا انتظام ضرور کرتے ہیں۔ میں اِس نفس کشی کو ہرگز روا نہ رکھوں گا۔ کسی کو مجاز نہیں ہے کہ مجھے یوں آکر پریشان کرے۔ میں خود اپنے کسی عزیز سے اس قسم کی تکلیف برداشت کرنے کی اُمید نہیں رکھتا۔ میں تو اسے بھی سراسر ناروا سمجھتا ہوں کہ کوئی بلا اجازت اور نا وقت میرے گھر آئے خواہ وہ میرا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کے یہاں ہمیشہ دوچار مفت خورے رشتے دار پڑے کھاٹ توڑا کیے۔ آپ کی جائداد پر زوال آگیا۔ گھرتباہ ہوگیا۔ آپ نے کبھی کنایتاً بھی اُن پر اپنی معذوری نہیں ظاہر کی۔ میں ایسے خس و خاشاک کو جمنے ہی نہ دوں گا جس سے اصل پودے کو نقصان پہنچے۔ آپ کے اصول اب بوسیدہ ہوگئے۔ یہ کشمکش کا زمانہ اُن کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ خودکشی کا دور تھا۔ یہ خودپروری کا دور ہے۔ اور اگر ہم کو دنیا میں زندہ رہنا ہے تو مجبوراً ان نئے مردانہ اصولوں سے موافقت کرنی پڑے گی۔

گیان شنکر نے نئی تہذیب کی جو خصوصیات بیان کیں اُن پر وہ خود عمل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ محض ذہنی طور پر اُن کے مداح تھے۔ سلف سے قطع کرنا دشوار تھا۔ تضحیک اور بدنامی سے اصولاً وہ خائف نہ ہوں لیکن عملاً ضرور ڈرتے تھے۔ مہمان نوازی اور کنبہ پروری کو دل میں صرف بیجا سمجھتے ہوں پر اُن کے عزیزوں اور دوستوں کو کبھی ان کی کج خلقی کی شکایت نہیں ہوئی۔ ہاں چونکہ اُن کی گفتگو بحث کی صورت اختیار کرلیا کرتی تھی۔ وہ جوش میں آکر ایسے اصولوں کا اعلان کردیا کرتے تھے جن پر عمل کرنے کا اُنھیں کبھی خیال یا جرأت نہ ہوتی۔ لالہ پربھاشنکر سمجھ گئے کہ اس سے میں پیش نہیں پاسکتا۔ اس کے دل میں جو ٹھن گئی ہے اُسے پورا کرکے چھوڑے گا۔ جسے خاندانی وقار کی پرواہ نہیں اُس سے رواداری اور آشتی کی امید رکھنی فضول ہے۔ رنجیدہ ہوکر بولے۔ بھیا۔ میں پُرانے

زمانے کا آدمی ہوں۔ تمھارے ان اصولوں کو نہیں سمجھتا۔ ہم تو عزّت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ گھر میں چاہے ایک دوسرے کے سر کاٹ لیتے، پرالگ ہونے کا نام نہ لیتے۔ لیکن تمھیں وہ باتیں نہیں جچتیں تو جو جی چاہے وہ کرو۔ ہاں اتنا پھر بھی کہوں گا کہ ابھی دوچار روز تامل کرجاؤ۔ جہاں اتنے دنوں تکلیف اُٹھائی ہے دو چار دن اور اُٹھالو۔ آج للّو کے مقدمے کا فیصلہ سُنایا جائے گا۔ ہم لوگوں کے حواس درست نہیں ہیں۔ دانہ پانی حرام ہورہا ہے۔ ذرا اس طوفان کو دب جانے دو۔

گیان شنکر میں انانیت کا عنصر غالب تھا۔ انھیں فطرتاً خفیف حرکات سے نفرت تھی۔ پر یہی انانیت اپنا رسوخ اور وقار جمانے کے لیے انھیں بعض اوقات افترا پر مائل کردیتی تھی۔ بالخصوص جب افشائے راز کا کوئی اندیشہ نہ ہوتا تھا۔ ہمدردانہ انداز سے بولے۔ اُس طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیے۔ دیا شنکر رِہا ہی نہیں بری ہوجائیں گے۔ اُدھر کی شہادتیں جیسی ناموافق تھیں وہ آپ کو معلوم ہی ہیں۔ پھر بھی یہ احتمال ضرور تھا کہ کہیں جوالا سنگھ دباؤ میں نہ آجائیں۔ ایسی حالت میں مجھے کیوں کر چین آتا۔ میں آج علی الصباح اُنھیں کے پاس گیا تھا اور پرماتما نے میری آبرو رکھ لی۔ یہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے لیکن میں نے اپنے روبرو فیصلہ لکھواکر پڑھ لیا تب اُن کا دامن چھوڑا۔ پہلے حضرت بہت دیر تک بغلیں جھانکتے رہے۔ سینکڑوں عذر پیش کیے۔ مگر میں نے ایسا پھٹکارا کہ آخر بچہ کو نادم ہوکر لکھنا ہی پڑا۔ میں نے کہا جناب آپ نے میری ہی بدولت بی ۔ اے کی ڈگری پائی ہے۔ اگر آپ میرا اتنا لحاظ بھی نہ کریں گے تو میں سمجھوں گا دنیا میں احسان کا وجود ہی نہیں رہا۔ آخر شرمندہ ہوئے اور اسی وقت تجویز لکھ کر سُنادی۔

لالہ پربھاشنکر نے گیان شنکر کو نگاہِ استحسان سے دیکھا۔ اُنھیں اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم میرے روبرو کھڑے ہیں اور میں اُن کے سایۂ رحمت میں ہوں۔ اگر لحاظ مانع نہ ہوتاتو وہ گیان شنکر کے پیروں کو بوسہ دیتے اور اُنھیں آنسوؤں سے ترکردیتے۔ دل میں اپنی ملامت کرنے لگے کہ میں نے ایسے سعادت مند ایسے حق پرست ایسے فرشتہ صفت شخص کی نسبت دل میں فاسد خیالات کو جگہ دی۔ یہ میری جہالت تھی کہ میں نے اُن سے دیاشنکر کی سفارش کرنے کے لیے اصرار کیا۔ یہ سراسر ناروا تھا۔ آج کل کے تعلیم یافتہ لوگ اپنا فرض خود سمجھتے ہیں اور اُسے اپنی مرضی سے پورا کرتے ہیں۔ غالبًا

اسی وجہ سے اُنھیں کسی کی تحریک ناگوار گزرتی ہے۔ بولے۔ بیٹا یہ خبر سُن کر مجھے جتنی خوشی ہورہی ہے بیان نہیں کرسکتا۔ تم نے مجھے جِلا لیا اور خاندان کی آبرو رکھ لی۔ میرا ایک ایک رویاں تمھارا ممنون ہے۔ مجھے اب یقین ہوگیا کہ بھائی صاحب کا دستِ غیب اب بھی مجھ پر اپنا سایہ کیے ہوئے ہے۔ میں سخت نادم ہوں کہ تم سے ایسی ناگوار باتیں کیں۔ پرماتما مجھے اُس کی سزا دیں۔ میری خطائیں معاف کرو۔ بڈھے آدمی زود رنج ہوا کرتے ہیں۔ ان کی باتوں کا ملال نہ کرنا چاہیے۔ میں نے اب تک تمھاری اصلی صورت نہ دیکھی تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں تمھیں اپنا بدخواہ سمجھنے لگا تھا۔ پر اَب مجھے تمھاری شرافت، تمھاری برادرپروری، تمھاری فیاضی کا اندازہ ہوا۔ مجھے اس بدگمانی کا ہمیشہ ملال رہے گا۔

یہ کہتے کہتے لالہ پربھاشنکر کا گلا بھر آیا۔ دل پر جما ہوا برف پگھل گیا۔ آنکھوں سے قطراتِ اشک گرنے لگے۔ مگر گیان شنکر کی زبان سے حُسنِ تشفّی کا ایک کلمہ بھی نہ نکلا۔ وہ اس فرضی اخلاص اور یگانگت کا رنگ بھی نہ گہرا کرسکے۔ پربھاشنکر کی سادگی خوش اعتباری اور صاف دلی کی روشنی میں اُنھیں اپنی خودپروری، مکّاری، افتراپردازی نہایت مکروہ اور سیاہ نظر آئی۔ وہ خود اپنی نظروں میں گرگئے۔ اس حیلہ سازی کا مزہ نہ اُٹھاسکے۔ تربیّت اس حد تک کورباطن نہیں ہوسکتی۔ اس خلوص نے ان کی سوئی ہوئی آتما کی ایک چٹکی لی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا کہ نفس مجھے کانٹوں میں گھسیٹے لیے چلا جاتا ہے۔ اَڑگئی۔ زمین پر پیر جما دیے۔ اور ارادہ کرلیا کہ اب آگے قدم نہ اُٹھاؤں گی۔

دفعتاً سید ایجاد حسین مسکراتے ہوئے دیوان خانے میں داخل ہوئے۔ پربھاشنکر نے ان کی طرف پُرامید نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ کہیے خیریت تو ہے؟

ایجاد حسین۔ سب خدا کا فضل و کرم ہے۔ لائیے مُنہ میٹھا کرائیے۔ خدا گواہ ہے جو صبح سے اب تک پانی کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے گیا ہو۔ بارے خدا نے آبرو رکھ لی۔ بازی اپنی رہی۔ بے داغ چُھڑا لائے۔ آنچ تک نہ لگی۔ حق یہ ہے کہ جتنی اُمید تھی اُس سے کچھ زیادہ ہی کامیابی ہوئی۔ مجھے جوالا سنگھ سے اتنی امید نہ تھی۔

پربھاشنکر۔ گیانو۔ یہ تمھاری تحریکِ خیر کا نتیجہ ہے۔ پرماتما تمھاری عمر دراز کرے۔

ایجاد حسین۔ بیشک بیشک۔ اس کاربراری کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ میں نے بھی جو کچھ کیا

ہے وہ آپ ہی کا طفیل ہے۔ آپ کا آج صبح کو اُن کے پاس جانا اکسیر ہوگیا۔ کل میں نے انھیں ہاتھوں سے تجویز لکھی تھی۔ آج اُنھوں نے جو تجویز سُنائی وہ کوئی اور ہی چیز ہے۔ آپ نے ان سے جوجو باتیں کیں اور جن جن حکمتوں سے اُنھیں راہِ راست پر لائے۔ اُن کی حرف بحرف اطلاع مجھے ملی ہے۔ اگر آپ نے اتنی صاف گوئی سے کام نہ لیا ہوتا تو وہ حضرت پنجے میں آنے والے نہ تھے۔

پربھاشنکر۔ آج بھیا ہوتے تو تمھاری یہ سعادت مندی دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ تم نے اُن کی روح کو خوش کر دیا۔

گیان شنکر دیکھ رہے تھے کہ ایجاد حسین چچا صاحب کے ساتھ کیسے داؤں کھیل رہے ہیں اور میرا مُنہ بند کرنے کے لیے کیسی رنگ آمیزیوں سے کام لے رہے ہیں۔ مگر کچھ بول نہ سکتے تھے۔ چور چور موسیرے بھائی ہوجاتے ہیں۔ اُنھیں اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ میں ایسے فرومایہ آدمی کو اُلو سیدھا کرنے میں مدد دینے پر مجبور ہورہا ہوں۔ میں نے کیچڑ میں پاؤں رکھا ہے اور ہر لمحہ نیچے کی طرف پھسلتا چلا جاتا ہوں۔

(۷)

جب تک علاقہ لالہ پربھاشنکر کے ہاتھوں میں تھا وہ غلام غوث خاں کو جبر اور تشدد سے روکتے رہتے تھے۔ اب بابو گیان شنکر مالک و مختار تھے۔ اُنھوں نے کارندہ صاحب کو شہ دے دی تھی۔ اس لیے اب خاں صاحب کو اپنے منصوبوں کے پورا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ سال تمام پر اُنھوں نے بڑی سختی سے مال گزاری وصول کی۔ ایک کوڑی بھی بقایا نہ رہی۔ جس نے روپے نہ دیے یا نہ دے سکا اُس پر نالش کی۔ قُرقی کرائی۔ اور ایک کے ڈیڑھ وصول کیے۔ شکمی اسامیوں کو یک قلم بے دخل کردیا۔ اور اُن کی آراضیوں پر لگان بڑھاکر دوسرے اسامیوں کے ساتھ بندوبست کیا۔ موروثی اور دخیل کار کاشتکاروں کے اضافہ لگان کی فہرست بھی تیار کرنے لگے۔ یہ تو اُنھیں معلوم ہی تھا کہ اضافہ لگان زمین کی حیثیت کے مطابق ہوا کرتا ہے اور زمین کی حیثیت کو بہتر یا کمتر بنادینے کے لیے صرف ذراسی حکمت درکار ہے۔ سارے علاقے میں تہلکہ پڑگیا۔ لوگ اضافہ لگان سے بچنے کے لیے اُنھیں نذریں پیش کرنے لگے۔ صبح سے شام تک خاں صاحب کا دربار لگا رہتا تھا۔ وہ خود صدارت پر رونق افروز ہوتے۔ اور پٹواری منشی موجی لال اُن کے دائیں جانب بیٹھتے۔

سکھو چودھری کا کام اسامیوں کی تالیفِ قلب کرنا تھا۔ وہ گاؤں کے مکھیا، سب سے بڑے کاشتکار اور متمول آدمی تھے۔ اسامیوں پر اُن کا بہت دباؤ تھا۔ غلام غوث نے اُنھیں اپنا آلہ بنالیا تھا۔ اور یہ تثلیث شب و روز کون و فساد کا مسئلہ حل کیا کرتی تھی۔ خاں صاحب پہلے فرصت کا وقت شکوۂ تقدیر کی نذر کیا کرتے تھے۔ اب یہ وقت درود اور فاتحہ کے نذر ہوتا تھا۔ جہاں کہیں کوئی فقیر یا سائل دروازے پر کھڑا نہ ہونے پاتا تھا وہاں اب فقرا کی فیاضیانہ خاطر و مدارات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی زکوٰۃ بٹتی۔ دنیاوی فارغ البالی نے جنت کے مزوں کی ہوس پیدا کردی تھی۔

خاں صاحب کو اب معلوم ہواکہ اِس علاقے کو سرکش سمجھنا اُن کی غلطی تھی۔ چارپانچ سو اسامیوں میں ایسا شاذ ہی کوئی ہوگا جس نے اُن کے آستان پر جبین سائی نہ کی ہو۔ گاؤں میں دس بارہ گھر ٹھاکروں کے تھے۔ اُن سے لگان بڑی مشکل سے وصول ہوتا تھا۔ مگر اضافۂ لگان کی تیاریوں نے اُنھیں بھی رام کر دیا۔ ٹھاکر ڈپٹ سنگھ اُن کے سرغنہ تھے۔ وہ دن میں دس پانچ مرتبہ خان صاحب کی سلامی کو حاضر ہوتے۔ دُکھرن بھگت شیوجی کو پانی چڑھانے جاتے تو راستے میں ایک بار چوپال ہولینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پس سارے علاقے میں اب اگر کوئی باغی تھا تو وہ منوہر تھا۔ اور اُس کا کوئی ہمدرد تھا تو قادر۔ وہ کھیت سے آتا تو قادر کے گھر جا بیٹھتا اور اپنی تقدیر کو روتا۔ اِن دونوں کو یکجا بیٹھے دیکھ کر سکھو چودھری کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اِن میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔ ضرور ہی میری شکایت کرتے ہوں گے۔ اُنھیں دیکھتے ہی دونوں کے دونوں خاموش ہوجاتے تھے۔ اِس سے سکھو کے شُبہے کو اور بھی تقویت ہوتی تھی۔ خاں صاحب نے قادر کا نام ابلیس رکھ چھوڑا تھا۔ اور منوہر کو ملعون کہاکرتے تھے۔ ان دونوں آدمیوں پر انتہائی اضافے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ منوہر کا تو انھیں خوف نہ تھا۔ مگر قادر سے ڈرتے تھے۔ قادر نیم حکیم تھا مگر خطرہ ٔجان نہیں تھا۔ اُس جوار میں حکیم ۔ وید ۔ ڈاکٹر۔ جو کچھ تھا یہی قادر تھا۔ اور لوگوں کو اُس پر کامل اعتقاد تھا۔ اُسے جڑی بوٹیوں کے خواص کا بہت اچھا علم تھا۔ اور تشخیصِ امراض میں مہارت حاصل تھی۔ کچھ فقیری نسخے اور چٹکلے بھی معلوم تھے۔ ایک بار جٹاشنکر مرحوم ذیابطیس سے بہت پریشان ہوگئے تھے۔ حکما اور ڈاکٹروں کا ہرچند علاج کیا۔ پر فائدہ نہ ہوا۔ اُنھیں قادر کی جڑی بوٹیوں نے ایک ہی ہفتے میں اس مرض سے نجات دے دی۔

خاں صاحب کو بھی ایک بار قادر ہی کے چٹکلوں نے پلیگ سے بچا لیا تھا۔ خاں صاحب اِس احسان سے تو نہیں مگر قادر کی ہردل عزیزی سے ڈرتے تھے۔ اور اِس سے بھی زیادہ خوف اُس کی عذرداری کا تھا۔ کیونکہ قادر قانونی معاملات میں بھی ماہر تھا۔

لیکن قادر بے فکری اور اطمینان کے ساتھ اپنے کاروبار میں مصروف رہتا تھا۔ اُسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ ہوتا کہ گاؤں کا زمیندار اور مختار میرے دشمن ہیں اور اُن کی دشمنی مجھے تباہ کرسکتی ہے۔ اگر خاں صاحب خدا نخواستہ بیمار پڑجاتے تو اب بھی وہ اُن کے معالجے کے لیے بِلا بُلائے حاضر ہوجاتا اور رات کی رات اُن کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ عداوت اور بُغض کے لیے اُس کے دل میں جگہ نہیں تھی اور نہ اُسے اس بات کی پرواہ تھی کہ میری نسبت کیا کیا بدگمانیاں پھیل رہی ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو گاؤں میں فساد برپا کرسکتا تھا۔ خاں صاحب اور اُن کے چپراسیوں کی خبر لے سکتا تھا۔ گاؤں میں چند ایسے شوریدہ سر نوجوان تھے جو فتنہ انگیزیوں پر آمادہ تھے۔ مگر قادر اُنھیں سنبھالتا رہتا تھا۔ مظلوموں کی حمایت اُس کا خاص جوہر تھا۔ غصہ اور انتقام کو اُبھارکر نہیں بلکہ تشفی اور تالیف سے!

منوہر کی حالت اِس کے برعکس تھی۔ جس دن سے وہ گیان شنکر کی باتیں سُن کر لوٹا تھا اُسی دن سے فاسد مادے اُس کے دل اور جگر میں کھولتے رہتے تھے۔ ایک طائر مجروح تھا جو زخم کھاکر تڑپ رہا ہو۔ وہ سخن ہائے درشت اُسے ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولتے تھے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتا تھا۔ اُسے اتنا معلوم تھا کہ بڑے سے راڑ کرنے میں بالآخر میری ہی بربادی ہوگی۔ مگر اُس کی حالت اس شخص کی سی ہو رہی تھی جس کے جھونپڑے میں آگ لگی ہو۔ اور وہ اُس کو بجھانے کی کوشش بے سود سمجھ کر اِدھراُدھر بھی آگ لگادے کہ کسی طرح یہ قصہ جلد تمام ہوجائے۔ انجام بد کا یقین انسان کو ہرچہ باداباد کے لیے تیار کردیتا ہے۔ منوہر چوپال کے سامنے سے گزرتا تو خواہ مخواہ اکڑکر چلتا۔ اپنی چارپائی پر بیٹھے ہوئے کبھی خاں صاحب یا گردھر مہاراج کو دیکھتا تو چارپائی سے اُٹھ کر سلام کرنے کے بدلے لیٹ جاتا۔ ساون میں آم پکے۔ وہ اپنے سب آم توڑ لایا۔ خاں صاحب کو مقررہ چہارم نہ دیا۔ اور جب گھردھر مہاراج تقاضا کرنے آئے تو انھیں دُور ہی سے ڈانٹ بتائی۔ وہ یہ اعلان کرنا چاہتا ہے کہ مجھے تم لوگوں کی دھمکیوں کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی رات کو تو دس بجے تک اس کے دروازے پر گانا ہوتا جس سے مقصود

سکھو اور خاں صاحب کو جلانا تھا۔ بلراج کو اب وہ آزادیاں حاصل ہوگئی تھیں جن کے لیے پہلے اُس کو جھڑکیاں کھانی پڑتی تھیں۔ اس کے ساتھیوں کی اب یہاں خوب آؤبھگت ہوتی۔ بھنگ چھنتی۔ لکڑی کا کھیل ہوتا۔ لاونی اور خیال کی تانیں اُڑتیں۔ ڈفلیاں بجتیں۔ منوہر شباب کے ساتھ ان دلچسپیوں میں شریک ہوتا۔ یہی مجمع اُس کے اور خاں صاحب کے درمیان تبادلۂ خیالات کا وسیلہ تھا۔ خاں صاحب کی ایک ایک بات کی خبر یہاں ہوجاتی تھی۔ علیٰ ہذا یہاں کی باتیں حرف بحرف وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ یہ مخبریاں آگ پر تیل چھڑکتی رہتی تھیں۔ ایک دن خاں صاحب نے کہا آج کل تو اُدھر خوب گل چھرّے اڑ رہے ہیں۔ بے دخلی کا سمن پہنچے گا تو حواس درست ہوجائیں گے۔ منوہر نے اُس کا جواب بہ آوازِ بلند دیا۔ بے دخلی کی دھمکی دوسروں کو دیں۔ یہاں ہمارے کھیتوں کے کنارے جو آئے گا اس کے بال بچےّ اس کے نام کو روئیں گے۔ منوہر اس وقت مرنے مارنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اگر کوئی خیال مانع تھا تو وہ بلراج کی تندمزاجی تھی۔ اس لیے وہ حتی الامکان بہت ضبط سے کام لیتا تھا، کہ ایسا نہ ہو نوجوان بیٹے کو طیش آجائے اور اس سے کوئی مجنونانہ فعل سرزد ہوجائے۔

ایک روز منوہر دروازے پر بیٹھا ہوا بیلوں کے لیے کڑبی کاٹ رہا تھا۔ اور بلراج اپنی لاٹھی میں تیل لگا رہا تھا کہ ڈپٹ سنگھ آکر مانچے پر بیٹھ گئے۔ اور بولے۔ سُنتے ہیں نئے حاکم پرگنہ بابوجوالاسنگھ جو آئے ہیں وہ ہمارے بابو صاحب کے بڑے دوست ہیں۔ بڑے سرکار کے بیٹے جو تھانیدار تھے، ان کا معاملہ اُنھیں کے اجلاس میں پیش تھا۔ وہ بری ہوگئے۔

منوہر۔ رشوت تو ثابت ہوگئی تھی نا؟

ڈپٹ ۔ ہاں ثابت ہوگئی تھی۔ کسی کو اُن کے بری ہونے کی آشا نہ تھی۔ پر بابو گیان شنکر کی ایسی سپارش پہنچی کہ ڈپٹی صاحب کو مکدما کھارج کرنا پڑا۔ اجافے کا معاملہ اُنھیں کے اجلاس میں جائے گا اور گیان بابو اپنا پورا جور لگائیں گے۔

منوہر۔ تب کیا کرنا ہوگا؟

ڈپٹ ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

منوہر۔ ایسا کوئی کانون نہیں بن جاتا کہ اجافے کا معاملہ اِن حاکموں کے اجلاس میں نہ ہوا کرے۔ حاکم لوگ آپ بھی تو جمیدار ہوتے ہیں اس لیے وہ جمیداروں کا پچھ کرتے ہیں۔ سُنتے ہیں لاٹ صاحب کے دربار میں کوئی پنچایت ہوا کرتی ہے۔ یہ باتیں اس

پنچایت میں کوئی نہیں کہتا۔

ڈپٹ ۔ وہاں بھی تو سب جمیدار ہی ہوتے ہیں۔ کاشت کاروں کی پھریاد کون کرے گا؟

منوہر۔ ہم نے تو ٹھان لیا ہے کہ اِجاپھا لگان ہوا تو ایک کوڑی بھی بیسی نہ دیں گے۔

بلراج نے لاٹھی کندھے پر رکھ کر کہا۔ کون اِجاپھا کرے گا۔ ہڈی توڑ کے رکھ دوں گا۔

منوہر۔ تو کیوں بیچ میں بولتا ہے۔ تجھ سے تو ہم نہیں پوچھتے۔ یہ تو نہ ہوگا کہ سانجھ ہوئی ہے لاؤ بھینس دوہ لوں۔ بیلوں کے ناند میں پانی ڈال دوں۔ بے بات کی بات بکتا ہے۔ (ٹھاکر سے) یہ لونڈا گھر کا تنکے بھر بھی کام نہیں کرتا۔ بس کھائے گا۔ اور مٹرگس کرے گا۔ گھر سے کھانے بھر کا ناتا ہے۔

ڈپٹ ۔ مجھ سے کیا کہتے ہو۔ میرے بھی دوتین موسل چند ہیں۔

منوہر۔ میں تو ایک کوڑی بیسی نہ دوں گا اور نہ کھیت ہی چھوڑوں گا۔ کھیتوں کے ساتھ جان بھی جائے گی اور دوچار کو ساتھ لے کر جائے گی۔

بلراج ۔ کھیت جان کے پیچھے ہیں۔ لہو کی ندی بہہ جائے گی۔

منوہر۔ تو پھر بیچ میں بولا۔

بلراج ۔ (گرم ہوکر) کیوں نہ بولوں۔ جمیدار کیا بادشاہ ہے کہ ہمارے اوپر چاہے جتنا جُلم اور جبرجستی کرے اور ہم منہ نہ کھولیں۔ ہماری کچہری دربار کہیں سُنائی نہیں ہے تو بھگوان کے دربار میں تو ہوگی۔

منوہر۔ سُنتے ہو ٹھاکر اس کی باتیں؟ کہیں کھاں صاحب سُن لیں تو گجب ہوجائے۔

بلراج۔ تو تم کھاں صاحب سے ڈرو۔ یہاں اُن کے دبیل نہیں ہیں۔ کھیت میں چاہے کچھ اُپج ہو چاہے نہ ہو لیکن بیسی ہوتی چلی جائے۔ ایسا کیا اندھیر ہے۔

ڈپٹ ۔ اناج کا بھاؤ جو چڑھ گیا ہے۔

بلراج۔ بھاؤ چڑھ گیا تو مجوروں کی مجوری نہیں چڑھ گئی ہے۔ بیلوں کا دام نہیں چڑھ گیا ہے۔ ایک موٹ پانچ روپے سے نیچے نہیں ملتی۔ یہ کس کے گھر سے آئے گا؟

اتنے میں قادر میاں سر پر گھاس کا گٹھا رکھے ہوئے آکر کھڑے ہوگئے۔ بلراج کی باتیں سُنیں تو مُسکرا کر بولے۔ بھانگ کا دام بھی تو چڑھ گیا ہے۔ چرس بھی تو مہنگی ہوگئی

ہے۔ کتھا سُپاری بھی تو مہنگی ہوگئی ہے۔ اِسے کیوں چھوڑے جاتے ہو۔

منوہر۔ ہاں کادر بھائی۔ تم نے ہمارے من کی بات کہی۔

بلراج۔ تو کیا تم لوگوں نے جوانی میں بوٹی بھنگ نہ پی ہوگی۔ یا سدا سے اسی طرح ایک بیلا چبینا اور دوسری بیلاساگ اور روٹی کھاکر دن کاٹے ہیں۔ اور پھر تم جمیدار کے گلام بنے رہے۔ اُس کے کارندوں کی کھدمت کھوسامد کیا کیجیے۔ تو اس جمانے میں اور کرہی کیا سکتے تھے۔ کنھیں مجوری ملتی تھی۔ اب تو مجوروں کو بارہ آنے روج ملتے ہیں۔ اب ہم جمیداروں کی دھونس .کیوں سہیں؟ کیوں اُس کی کھوسامد کریں؟ کیوں پیٹ بھر کھانے کو ترسیں؟

قادر۔ کیوں منوہر۔ اِسے کھانے کو نہیں دیتے؟

بلراج۔ یہ کوئی کھانا ہے کہ ایک آدمی کھائے اور گھر کے سب لوگ مُنہ تاکیں۔ گاؤں میں سُکھو چودھری کو چھوڑکر کس کے گھر دونوں جون چولھا جلتاہے؟ کسی کو ایک جون چبینا ملتا ہے۔ کوئی چٹکی بھر ستو پھاک کر رہ جاتا ہے۔ دوسرے جون بھی پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی۔ ایک میں بے حیائی کرکے دونوں جون کھا لیتا ہوں۔ لیکن جیسا کھاتا ہوں میرا دل جانتا ہے۔

قادر ۔ بھائی بلراج بات تو سچّی کہتا ہے۔ اس کھیتی میں کچھ رہ نہیں گیا۔ مجوری بھی نہیں پڑتی۔ اب میرے ہی گھر میں دیکھو۔ کل چھوٹے بڑے ملاکر دس آدمی ہیں۔ پانچ پانچ روپے بھی کماتے تو چھ سو روپے سال ہوتے۔ لیکن اس کھیتی میں رات دن لگے رہتے پھر بھی کسی کو پیٹ بھر دانہ نہیں ملتا۔ یہی سب کا حال ہے۔ بس لاج ڈھوتے ہیں اور کیا۔

ڈپٹ۔ بس یہی ایک مرجاؤ رہ گئی ہے۔ دوسرے کی مجوری نہیں کرتے بنتی۔ اِس حیلہ سے کسی طرح دن کٹ جاتے ہیں۔ نہیں تو بلراج کی عمر میں ہم لوگ کھیت کے ڈانڈ پر نہ جاتے تھے۔ نہ جانے کیا ہوا کہ جمین کی برکت ہی اُٹھ گئی۔ جمین وہی ہے لیکن جہاں بیگہ میں بیس بیس من ہوتا تھا وہاں اب چار پانچ من سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ تو کہو مہنگی نے ہمیں سنبھال لیا ہے نہیں تو کہیں پتہ نہ لگتا۔

منوہر۔ سرکار کو یہ حال معلوم ہوتا تو جرور کاسکاروں پر کچھ نگاہ کرتی۔

قادر۔ سرکار کو سب مالوم ہے۔ مُدا اُسے کیا پڑی ہے کہ کاسکاروں پر نگاہ کرے۔ کسان مرے یا جیے لگان تو دے ہی جاتا ہے۔ اُس کا راج ہے چاہے ایک لے چاہے سو لے۔ کوئی بھاگ کر کہاں جائے گا۔

ڈپٹ۔ (بلراج سے) تم لاٹ صاحب سے دربار میں ہم لوگوں کے طرپھ سے پھریاد کیوں نہیں کرتے؟ (ہنستا ہے)

بلراج ۔ تم لوگ تو ایسی ہنسی اُڑاتے ہو جانوں کاسکار کوئی چیج ہی نہیں ہوتا۔ وہ جمیدار کی گلامی ہی کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ لیکن ٹھاکر چچا کے گھر جو اکبار آتا ہے، اُس میں لکھا ہے کہ روس دیس میں کاسکاروں ہی کا راج ہے۔ وہی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اُسی کے پاس کوئی اور دیس ہے۔ وہاں تھوڑے ہی دن ہوئے کاسکاروں نے راجا کو گدی سے اتار دیا ہے اور اب کاسکاروں کی ایک پنچایت راج کر رہی ہے۔

قادر۔ (بے اعتبارانہ انداز سے) منوہر آؤ اُسی دیس میں چلیں۔ وہاں مال گجاری نہ دینی پڑے گی۔

ڈپٹ۔ ہوگا بھائی۔ وہاں کے کاسکار بڑے لایک ہوں گے۔

قادر۔ کیا جانے مجھے تو بسواس نہیں آتا۔

ڈپٹ۔ نہیں ہمارے اخبار میں جھوٹی باتیں نہیں ہوتیں۔

بلراج۔ سمپادک لوگ جھوٹ لکھیں تو سجا ہوجائے۔

قادر۔ تو جب اس دیس کے کاسکار راج کرسکتے ہیں تو کیا ہم اپنی پھریاد بھی نہیں کرسکتے؟

ڈپٹ ۔ تحصیلدار صاحب کے سامنے تو مُنہ کھلتا نہیں لاٹ صاحب سے کون پھریاد کرے گا۔

بلراج۔ تمھارا مُنہ نہ کُھلے۔ میری تو لاٹ صاحب سے بھینٹ ہوجائے تو سب کچھ کہہ سُناؤں۔ کوکو کاٹو تھوڑے ہی ہیں۔

قادر۔ اچھا اب کی حاکم لوگ دورے پر آویں گے تو ہم تمھیں کو اُن کے سامنے کھڑا کردیں گے۔ اب چلتا ہوں۔ گورو آگئے ہوں گے۔

قادر میاں گھر کی طرف چلے۔ بلراج بھی اُن کے پیچھے چلا۔ جب دونوں تھوڑی دور نکل گئے تو بلراج نے کہا چچا۔ کہو تو کھاں صاحب کی (گھونسے سے اشارہ کرکے) کردی جائے۔

قادر۔ کیا گاؤں بھر کو بندھوانے پر لگے ہو؟ بھول کر بھی ایسا نہ کرنا۔

بلراج۔ تمھارے ہی حکم کی دیر ہے۔

قادر۔ (اپنے کان پکڑکر) نہ۔ میں تم لوگوں کو آگ میں کودنے کی صلاح نہ دوں گا۔ جب اللہ کو منظور ہوگا تو وہ آپ ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔
بلراج۔ اچھا بتاؤ تم بیچ میں تو نہ پڑوگے؟ ہم لوگوں کو تمھارا ہی لحاج ہے نہیں تو اب تک وہ اور سکھو دونوں ہلدی پیتے ہوتے۔
قادر۔ مجھ سے یہ نہ ہوسکے گا کہ تم لوگ گاؤں میں آگ لگاؤ اور میں سب کچھ جانتے ہوئے منہ نہ کھولوں۔ اگر تم لوگ میری بات نہ مانوگے تو میں تھانے میں اطلاع کردوں گا۔
بلراج۔ یہ جبر جستی اب نہیں سہی جاتی۔
قادر۔ جب اللہ کو منظور ہوگا تو آپ ہی آپ سب باتیں ٹھیک ہوجائیں گی۔

(۸)

جس طرح آفتاب غروب ہوتے ہی ایک خاص قسم کے مخلوق جو نہ چرند ہیں نہ پرند ہیں، آزوقہ کی تلاش میں اپنے گوشوں سے نکل پڑتے ہیں اور اپنی لمبی لمبی قطاروں سے آسمان کو سیاہ کردیتے ہیں۔ اُسی طرح اکتوبر کا مہینہ ختم ہوتے ہی ایک خاص قسم کے مخلوق جن کا ظاہر رُعب ہوتا ہے، اور باطن حرص۔ دیہات میں نکل پڑتے ہیں اور اپنی چھولداریوں اور خیموں سے منظر کو سفید کردیتے ہیں۔ بارش کا آغاز حشرات الارض کے خروج کے دن ہیں۔ اس کا انجام حشرات نخوت و خودسری۔ کہ اُن میں کوئی ٹرانے والا مینڈک ہے۔ کوئی زہریلا سانپ۔ کوئی نیشدار عقرب۔ کوئی بے ضرر گوبریلا ہے اور کوئی پُرشور جھینگر۔ ان کا ظہور ہوتے ہی دیہات میں تہلکہ پڑجاتا ہے۔ لوگ خوف سے جان چھپانے لگتے ہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ حکام ضلع کے دورے نیک ارادوں پر مبنی ہیں۔ ان کا منشا ہے رعایا کی حقیقی حالت کا مطالعہ کرنا۔ انصاف کو طالبِ انصاف کے دروازے تک پہنچانا۔ باہمی نزاع کے موقع و محل کا معائنہ کرنا۔ عوام کی شکایتوں کو سُننا۔ اُن کی تکلیفوں کو دور کرنا۔ ماتحت ملازمین کی بدعنوانیوں کا ازالہ کرنا اور رعایا کے محسوسات و خیالات کی تہہ تک پہنچنا۔ ایک لفظ میں رعایا کی خدمت کرنا۔ کاش دوروں سے یہ منشا پوری ہوتی تو وہ تو دورِ بہار سے بھی زیادہ جان پرور ہوتے۔ لوگ سرود وستار سے ان کا خیرمقدم کرتے۔ مگر جس طرح روشنی کی شعاعیں کسی کثیف شے سے گزرکر منقلب ہوجاتی ہیں۔ اُسی طرح یہ نیک ارادے غیرقومی حکومت کی سخت گیری اور حُکّام کی خودپروری سے مس ہوکر منقلب

ہوجاتے ہیں۔ انصاف اور حق پیروں تلے آجاتا ہے۔ حرص اور زعمِ حکومت سر پر جا پہنچتا ہے۔ بس حکام کی ساری حکومت رعایا کے سر ناخواندہ مہمان بننے میں صرف ہوجاتی ہے۔

غریب دیہاتوں کے لیے یہ موسم ہیضہ اور پلیگ سے کم جاں گسل نہیں ہوتا۔ کبھی بڑے صاحب آتے ہیں۔ کبھی جھوٹے صاحب۔ کبھی تحصیلدار۔ کبھی پیشکار۔ کبھی سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ کبھی انسپکٹر پولیس۔ کبھی کمشنر۔ کبھی اسسٹنٹ کمشنر۔ یہاں تک کہ حفظانِ صحت، آبکاری اور تعلیمات کے افسر بھی اپنا پورا خراج وصول کرتے ہیں۔ دیہاتی بینکوں کے رجسٹرار۔ اور محکمہ زراعت کے منصب دار۔ محکمۂ افیون کا ٹڈی دل۔ صیغۂ جنگلات کا غول اور خدا جانے کتنے ہی عہدے دار جن کی تعداد مورو مگس سے کم نہیں دیہات پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ رعایا کی حالت کا مطالعہ کون کرتا ہے۔ سیر و شکار کا جنون سر پر سوار ہوجاتا ہے۔ ایسا خوش نصیب کون مُلک ہوگا جہاں ملازمان سرکار کو سیر و شکار کے لیے مشاہرہ اور سفر خرچ اور بھتہ ملے۔ اوپر سے مہمان نوازی کا سارا بار رعایا کے سر۔ کھائیے اور چین کی بنسی بجائیے۔ رعایا دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ یہ عیش اور کہاں؟ شاید بہشت والے بھی اس کے لیے ترستے ہوں۔ دورے شروع ہوئے اور دیہاتوں پر قیامت آئی۔ ایندھن اور پوال کی لوٹ پڑجاتی ہے۔ سڑک پر جانے والی گاڑیوں پر چھاپے پڑنے لگتے ہیں۔ بے زبان مزدوروں کی شامت آجاتی ہے۔ ناکردہ گناہ پکڑے جاتے ہیں۔ حکام کے ماتحت ملازمین اس موسمِ غنیمت کے انتظار میں بے تاب رہتے ہیں۔ شہروں میں اُن کی دال نہیں گلتی۔ یا گلتی ہے تو بہت کم۔ وہاں ہر ایک چیز کے لیے جیب میں ہاتھ لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر دیہات میں جیب کے بجائے اُن کا ہاتھ اپنے سوٹے پر ہوتا ہے۔ یا کسی غریب کی گردن پر۔ یہاں یہی سکہ رائج ہے۔ بلکہ سکہ رائج سے بدرجہا بہتر۔ جس گھی دودھ، سبزی اور ترکاری گوشت اور مچھلی کے لیے شہر میں ترستے تھے، ان نعمتوں کی یہاں دست و زبان کے زور سے ریل پیل ہوجاتی ہے۔ جتنا کھاسکتے ہیں کھاتے ہیں اور جو نہیں کھاسکتے وہ گھر بھیجتے ہیں۔ گھی سے بھرے ہوئے کنستر۔ دودھ سے بھرے ہوئے مٹکے۔ اُپلے اور لکڑی گھاس اور چارے سے لدی ہوئی گاڑیاں شہروں میں آنے لگتی ہیں۔ گھر والے خوش ہوہوکر بغلیں بجاتے ہیں اور اپنی تقدیر کو سراہتے ہیں۔ کیونکہ اب خشکی کے دن گئے۔ تری کے دن آئے۔ اُن کی تری برسات کے بعد آتی ہے۔ خشکی میں تری کا مزہ اُٹھاتے ہیں۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ شام کا وقت۔ قادرخاں کے دروازے پر کئی آدمی الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ قادرخاں نے پہلے خانہ ساز تمباکو کی تعریف کی۔ کتنی تیز ہوتی ہے۔ کتنی میٹھی۔ حلق میں ذرا بھی خراش نہیں ہوتی۔ ڈکھرن بھگت نے اُس کی تائید کی۔ اس کے بعد ڈیپٹ سنگھ نے لوہے اور پتھر کے کولھوؤں کے حُسن و قبح کی تنقیح کرنی شروع کی۔ فیصلہ ہوا لوہا لوہا ہی ہے۔ پتھر پتھر۔ تب منوہر بولے۔ آج کل رات کو مٹر میں سیار اور ہرن بڑا اُپدرو مچاتے ہیں مگر جاڑے کے مارے اُٹھا نہیں جاتا۔

ڈکھرن۔ اب کی سردی بہت پڑے گی۔ دن کو ہوا چلنے لگی۔ میرے پاس تو کوئی کمبل بھی نہیں۔ یہی ایک دوہر لپیٹے پڑا رہتا ہوں۔ پوال نہ ہوتا تو رات کو اکڑ جاتا۔

ڈیپٹ ۔ یہاں کس کے پاس کمبل ہے۔ اِسی ایک پُرانے دُھسّے کی بھگت ہے۔ لکڑی بھی نہیں کہ رات تاپ ہی کر کاٹیں۔

منوہر۔ اب کی لڑکی کے بیاہ میں اِملی کا پیڑ کٹوایا تھا۔ کیا سب جلا ڈالی؟

ڈیپٹ ۔ نہیں۔ بچی تو بہت تھی پر کل ہی تو وہ ڈپٹی جوالا سنگھ کے لشکر میں چلی گئی۔ کھاں صاحب سے کتنا کہا کہ اِسے رہنے دیجیے مگر اُن کی بلا سنتی ہے۔ چپراسیوں کو سارا ڈھیر دکھا دیا۔ بات کی بات میں ساری لکڑی اُٹھ گئی۔

منوہر۔ تم نے چپراسیوں کو لے کیوں جانے دیا!

ڈیپٹ۔ کیسی لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تمھارے درواجے سے پوال اور لکڑی نہیں اُٹھ گئی ہے؟ تم بھی تیوریاں بدل کر رہ گئے۔ اور کرتے ہی کیا؟ دس بیس من لکڑی کے لیے اپنی جان کو سانست میں ڈالے۔ گالیاں کھاتا۔ لشکر میں پکڑا جاتا۔ مار پڑتی اوپر سے۔ تب تم بھی پاس نہ پھٹکتے۔ دونوں لڑکے تو گرم ہو پڑے تھے۔ لیکن میں نے ڈانٹ دیا۔ جبردست کا ٹھینگا سرپر۔

قادر خاں۔ حاکموں کا دورہ کیا ہے، ہماری مرن ہے۔ بکراعید کے لیے جو بکرا پال رکھا تھا، کل لسکر میں چلا گیا۔ ربی بوچڑ پانچ روپے دیتا تھا۔ میں نے نہ لیے تھے۔ اِس بکھت آٹھ سے کم کا مال نہ تھا۔

منوہر۔ یہ حاکم لوگ بڑا اندھیر مچاتے ہیں۔ آتے ہیں انتجام کرنے۔ اِنساپھ کرنے۔ مگر ہمارے گلے پر چُھری پھیرتے ہیں۔ اِس سے تو کہیں اچھا تھا کہ دورے بند ہوجاتے۔

یہی نہ ہوتا مکدمے والوں کو سہر جانا پڑتا۔ اس سانست سے وہ دوڑ کہیں اچھّی تھی۔

قادر۔ اس میں حاکموں کا کوئی کسور نہیں۔ سب لسکر والوں کی دھاندلی ہے۔ وہی لوگ حاکم کو بھی بدنام کردیتے ہیں۔

منوہر۔ کیسی باتیں کرتے ہو بھیا۔ سب ملی بھگت ہے۔ حاکم کی مرجی نہ ہو تو مجال ہے کہ کوئی ماتحت کسی پرائی چیج کی طرپھ آنکھ اُٹھا سکے۔ سب اُن کے اسارے سے ہوتا ہے۔ اور اُن کا اِسارہ کیوں نہ ہوگا۔ سینت کا مال کس کو بُرا لگتا ہے۔

ڈپٹ ۔ جتنا اعلیٰ حاکم ہوتا ہے اتنا ہی مُنہ پھیلاتا ہے۔ بڑے حاکم نام کے ہیں۔ ہیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔

دُکھرن۔ بھگوان یہ اندھیر دیکھتے ہیں اور اُس کا کچھ اُپائے نہیں کرتے۔ دیکھیں اب کی بسیسر ساہ کو کتنا گھاٹا ہوتا ہے۔

ڈپٹ ۔ پارسال تو پورے تین سو روپے دینے پڑے تھے نا۔ وہی اب کی بھی سمجھو۔ اگر جنس ہی تک رہے تو اتنا گھاٹا نہ پڑے۔ مگر وہاں تو الائچی سُپاری اور کتھا، مصری اور میوے سبھی کچھ چاہیے۔ اور سب ٹکے سیر۔ کھانے کے ایسے سوکین بنتے ہیں مگر یہ نہیں ہوتا کہ یہ سب چیجیں اپنے ساتھ رکھیں۔

منوہر۔ سہر میں کھرے دام نہیں لگتے! یہاں کون۔ جی میں آیا دیا نہ دیا مانگنے کی ہمّت کس کی ہے!

قادر۔ کل لسکر کا ایک چپڑاسی بسیسر کے یہاں صابودانہ مانگ رہاتھا۔ ساہ جی کتنا ہی ہاتھ پیر پڑتے تھے مگر چپڑاسی ایک نہ سنتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا۔ ڈنڈا دکھاتاتھا۔ بارے بلراج پہنچ گیا۔ جب وہ گرم ہوپڑا تو چپراسی میاں نرم پڑے اور بک بک کرتے ہوئے چلے گئے۔

دُکھرن۔ بسیسر کی تو ایک بار اچھّی طرح مرمت ہوجاتی تو اچھّا ہوتا۔ سب کی گردن مروڑتا ہے۔ اُسی کی یہ سزا ملتی ہے۔

ڈپٹ۔ اور ہم تم کس کی گردن مروڑتے ہیں؟

منوہر۔ (تفکرانہ اندازسے) بلراج اب سرکاری آدمیوں کے مُنہ آنے لگا۔ کہیں پھنس نہ جائے۔

قادر۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔

یہی باتیں ہورہی تھیں کہ ایک جوان آدمی جو صورت اور لباس سے کوئی بنیا معلوم ہوتا تھا آکر الاؤ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک بُڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی اور الاؤ سے ذرا دور سر جھکاکر بیٹھ گئی۔

قادر نے پوچھا۔ کہو بھائی کہاں مکان ہے؟

اس آدمی نے جواب دیا۔ مکان تو ہے دیوی پار مگر اس بکھت اپنی بُڑھیا ماں کو لیے ہسپتال جاتا تھا۔ وہ جو سڑک کے کنارے بگیچہ میں ڈپٹی صاحب کا لسکر اُترا ہے، وہاں پہنچا تو چپڑاسیوں نے گاڑی روک لی۔ اور ہمارا اسباب اُس پر سے پھینک پھانک کر لکڑی لادنے لگے۔ کتنی آرجو بنتی کی کہ بُڑھیا بیمار ہے۔ پہر رات کا چلا ہوں۔ آج ہسپتال نہ پہنچا تو کل نہیں معلوم بُڑھیا کی کیا گت ہو۔ مگر میں روتا ہی رہا۔ اُدھر گاڑی لد گئی۔ تب مجھ سے کہنے لگے بیلوں کو ہانک۔ گاڑی پر بُڑھیا کے بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ اچھّی ہوتی تو کسی نہ کسی طرح بیٹھ جاتی۔ پر مہینہ بھر سے تاپ آرہا ہے۔ اُس سے لکڑی پر کیسے بیٹھا جائے گا۔ آکھر بہت کہہ سُن کے یہاں تک آیا ہوں کہ کہیں ماتا کو آرام سے سُلا دوں۔ جب لکڑی پہنچا کے لوٹوں گا تو ہسپتال لے جاؤں گا۔ تم سے بن پڑے تو ایک کھاٹ دے دو۔ اور کوئی ایسی جگہ بتادو جہاں بہت ہوا نہ آوے۔ اتنا دھرم کرو۔ بڑی مصیبت میں ہوں۔

دُکھرن۔ یہ بڑا اندھیر ہے۔ یہ لسکر والے آدمی کاہے کو ہیں، راچھس ہیں جنھیں دیا دھرم کا بچار نہیں۔

قادر۔ اندھیرسا اندھیر ہے۔ سانجھ ہوگئی ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے بیل۔ نہ معلوم کہاں گاڑی جائے گی۔ اور کب لوٹے گی؟ تب تک بچاری بُڑھیا اکیلی پڑی رہے گی۔ گھر کے آدمی کی اور بات ہے۔ہم لوگ کتنے ہی ہیں تو پرائے ہی ہیں۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔

منوہر۔ میرا تو اس گھڑی ایسا جی جلتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کے پاس چلا جاؤں اور ایسی کھری کھری سناؤں کہ وہ بھی یاد کریں۔ انصاپھ تو کیا کریں گے۔ اور گریبوں کو پیستے ہیں۔ کھاٹ کی تو کوئی بات نہیں اور جگہ بھی مل جائے گی۔ لیکن یہ اکیلے رہیں گی کیسے؟

مسافر۔ کیسے بتاؤں۔ نصیب میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہوگا۔

منوہر۔ یہاں سے کوئی آدمی تمھاری گاڑی ہانک لے جائے تو کوئی ہرج ہے؟

مسافر۔ ایسا ہو جائے تو کیا پوچھنا! ہے کوئی آدمی؟

منوہر۔ آدمی بہت ہیں۔ کوئی نہ کوئی چلا جائے گا۔

قادر۔ تمھارا ہلواہا تو کھالی ہے۔ اُسے بھیج دو۔

منوہر۔ ہلواہے سے بیل سدھیں نہ سدھیں۔ میں ہی چلا جاؤں گا۔

قادر۔ تمھارے اوپر مجھے بھروسہ نہیں ہے۔ کہیں جھگڑا کر بیٹھو تو اور بن جائے۔ دُکھرن بھگت تم چلے جاؤ تو اچھا ہو۔

دُکھرن نے ناک سکوڑ کر کہا۔ مجھے تو جانتے ہو رات کو کہیں نہیں جاتا۔ یہ میرے بھجن بھاؤ کی بیلا ہے۔

قادر۔ چلا تو میں ہی جاتا لیکن میرا من کہتا ہے کہ بوڑھا کو اچھا کرنے کا سباب مجھی کو ملے گا۔ کون جانے اللہ کو یہی منجور ہو۔ میں بوڑھا کو اپنے گھر لیے جاتا ہوں۔ جو کچھ دوا دریَن کرتے بنے گا کروں گا۔ گاڑی حسنو (قادر کا بڑا لڑکا) سے ہکوائے دیتا ہوں۔ بیلوں کو چارہ پانی دینا ہے۔ بلراج کو چھن بھر کے لیے بھیج دینا۔

قادر خاں کے بروٹھے میں بُڑھیا کی چارپائی پڑگئی۔ حسنو گاڑی ہانکنے کے لیے پڑاؤ کی طرف چلا۔ اتنے میں سُکھو چودھری اور غوث خاں دو چپراسیوں کے ساتھ آتے دکھائی دیے۔ دوسری طرف سے بلراج بھی آکر کھڑا ہوگیا۔

غوث خاں بولے تم لوگ یہاں بیٹھے گپ لڑا رہے ہو۔ کچھ لشکر کی بھی خبر ہے؟ دیکھو یہ چپراسی لوگ دودھ کے لیے آئے ہیں۔ اُس کا بندوبست کرو۔ مالکوں کا حکم ہے کہ ڈپٹی صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

قادر۔ کتنا دودھ چاہیے؟

ایک چپراسی۔ کم سے کم دس سیر۔

قادر۔ دس سیر! اتنا دودھ تو چاہے گاؤں بھر میں نہ نکلے۔ دو ہی چار آدمیوں کے پاس تو بھینسیں ہیں اور وہ بھی دودھار نہیں ہیں۔ میرے یہاں سیر بھر سے کچھ کم ہی ہوتا ہے۔

چپراسی۔ بھینسیں ہمارے سامنے لاؤ۔ دودھ تو ہمارا چپراسی نکالتا ہے۔ ہم تو پتھر سے دودھ نکال لیں۔ بھینسوں کی کون کہے۔ اس چپراس میں وہ جادو ہے کہ چاہیں تو جنگل میں منگل کردیں۔ لاؤ اپنی اپنی بھینسیں میرے سامنے۔

غوث خاں۔ اتنا طول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دودھ کا انتظام ہوجائے گا۔ دو سیر سکھو دینے کو کہتے ہیں۔ قادرمیاں کے یہاں بھی دوسیر مل ہی جائے گا۔ دُکھرن بھگت دوسیر دے دیں گے۔ منوہر سے بھی دو سیر ملا سمجھو۔ دوسیر ڈپٹ سنگھ کے یہاں ہوجائے گا۔ بس ہوگئے دس سیر۔

قادر۔ میں دوسیر چارسیر کا بیمہ نہیں لیتا۔ وہ دونوں بھینسیں کھڑی ہیں جتنا دودھ دے دیں اتنا لے جایئے۔

دُکھرن۔ میری تو دونوں بھینسیں گابھن ہیں۔ بہت دیں گی تو آدھ سیر دے دیں گی۔ پوال تو کھانے کو پاتی ہیں اور وہ بھی آدھے پیٹ۔ دودھ کہاں سے آئے؟ گاؤں میں کہیں اُنگل بھر بھی تو چرائی نہیں ہے۔

ڈپٹ ۔ سکھو چودھری جتنا دیں گے اُس کا آدھا میں بھی دے دوں گا۔ حیثیت کے حساب سے لیجیے۔

غوث خاں۔ تم لوگوں کی نہایت بیہودہ عادت ہے کہ ہرایک بات میں لاگ ڈاٹ کرنے لگتے ہو۔ شرافت اور ملائمت سے آدھا بھی نہ دوگے۔ لیکن سختی اور تشدّد سے پورا دوگے اور سلام کروگے۔ میں نے تم سے دوسیر کہہ دیا ہے۔ اتنا تمھیں دینا ہوگا۔

ڈپٹ ۔ اس طرح آپ مالک ہیں چاہے بھینسیں کھول لے جائیں۔ لیکن دوسیر دودھ میرے مان کا نہیں۔ ایک دن کی بات تو ہے نہیں۔ یہاں تو اب جاڑے بھر یہی نوچ گھسوٹ لگی رہے گی۔ ایک جائے گا دوسرا آئیگا۔

غوث خاں ۔ منوہر تمھاری بھینسیں تو دودھار ہیں۔ کیا دو سیر بھی نہ دیں گی؟

منوہر نے ابھی جواب نہ دیاتھا کہ بلراج بول اُٹھا۔ میری بھینسیں بہت دودھار ہیں۔ من من بھر دودھ دیتی ہیں۔ لیکن بیگار کے نام سے چھٹانک بھر بھی نہ دیں گی۔

منوہر۔ تو چپ چاپ کیوں نہیں رہتا۔ تجھے کون بُلاتا ہے۔ ہم سے جتنا ہوسکے گا دیں گے۔ تجھ سے مطلب۔

ایک چپراسی نے بلراج کی طرف حقارت آمیز غصےّ سے دیکھ کر کہا۔ مہتو ابھی ہم لوگوں کے پنجے میں نہیں پڑے ہو۔ ایک بار پڑ جاؤگے تو چوکڑی بھول جائے گی۔ مُنہ سے بات نہ نکلے گی۔

دوسرا چپراسی بولا۔ معلوم ہوتا ہے سر پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ تبھی اتنا اینٹھ رہا ہے۔ اسے لشکر میں لے چلو تو گرمی اُتر جائے۔

بلراج نے حقارت سے ہنس کر کہا۔ میاں ہماری گرمی پانچ پانچ روپلّی کے گلاموں کے بس کی نہیں ہے۔ جاؤ اپنے صاحب بہادر کے جوتے سیدھے کرو جو تمھارا کام ہے۔ ہماری گرمی کے پھیر میں پڑوگے تو ہاتھ جل جائیں گے۔ اُس جنم کے پاپوں کی سجا بھوگ رہے ہو۔ لیکن اب بھی تمھاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔

بلراج نے یہ باتیں اتنی متانت آمیز بیباکی سے کہیں کہ دونوں چپراسی کھسیانے سے ہوگئے۔ اس تذلیل کا کوئی دندان شکن جواب دینا غیر ممکن تھا۔ یہ گویا معاملے کو قول کے دائرہ سے نکال کر عمل کے میدان میں لے جانے کا اعلان تھا۔ تحقیر لفظی تکرار کی انتہائی حد ہے۔ اس کا جواب زبان سے نہیں ہاتھوں سے دیا جاتا ہے۔ مگر بلراج کا فراخ سینہ اور تناور جسم دیکھ کر چپراسیوں کو ہاتھا پائی کی جرأت نہ ہوسکی۔ (غوث خاں کی طرف مخاطب ہوکر۔) خاں صاحب آپ اس لونڈے کو دیکھتے ہیں کیسا بڑھا جا رہاہے۔ اِسے سمجھا دیجیے ہمارے منہ نہ لگے۔ شامت نہ آئے ورنہ چھ مہینہ تک چکّی پیسنی پڑے گی۔ ہم آپ کا ملاحظہ کرتے ہیں نہیں تو اس ہیکڑی کا مزہ چکھا دیتے۔

غوث خاں ۔ منوہر سنتے ہو اپنے سعادت مند بیٹے کی باتیں؟ بھلا سوچو تو ڈپٹی صاحب کے کان میں یہ باتیں پڑجائیں تو تمھارا کیا حال ہو؟ کہیں ایک پتّی کا سایہ بھی نہ ملے۔

منوہر نے چشمِ فریاد سے خاں صاحب کی طرف دیکھ کر کہا، کھاں صاحب میں تو اسے ہر طرح سمجھا بُجھاکر ہار گیا۔ نہیں معلوم کیا کرنے پر آیا ہوا ہے۔ (بلراج سے) ارے تو یہاں سے جائے گا کہ نہیں؟

بلراج۔ کیوں جاؤں؟ کسی کا ڈر پڑا ہوا ہے! یہ لوگ ڈپٹی صاحب سے میری سکایت کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ میں آپ ہی اُن کے پاس جاتا ہوں۔ اِن کو اُنھوں نے کبھی ایسا نادرساہی حکم نہ دیا ہوگا کہ جاکر گاؤں میں آگ لگا دو۔ اور مان لیں کہ وہ ایسا کڑا حکم دے بھی دیں تو اِن لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ یہ گریب کسان ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ اُنھیں اُجاڑنا نہ چاہیے۔ مگر ان لوگوں کو تو پیسے کے لوبھ اور چپراس کے گھمنڈ نے ایسا اندھا کردیا ہے کہ کسی کی پیر جان ہی نہیں پڑتی۔ آج اُس بیچارے بنیے کی

گاڑی روک لی۔ اور اُس پر لکڑی لاد کر سہر بھیج دی۔ اِنھیں جرا بھی دیا نہ آئی کہ بُڑھیا کا کیا حال ہوگا؟ مرے گی جیے گی۔ نوکری تو کی ہے پانچ روپیہ کی۔ کام ہے بستے ڈھونا۔ میج پوچھنا۔ صاحب کے پیچھے پیچھے کھدمتگاری کی طرح چلنا اور بنتے ہیں رئیس۔ اگر اچھا کھانا چاہتے ہیں۔ اچھا پہننا چاہتے ہیں۔ ٹھاٹھ سے رہنا چاہتے ہیں تو کوئی دوسرا کام کریں۔ یہ نہیں کہ دوسروں کا گلا دباکر موج اُڑائیں۔

منوہر۔ تو چُپ رہے گا کہ نہیں؟

ایک چپراسی۔ نہیں اسے خوب گالیاں دے لینے دو۔ جس میں اُس کے دل کی ہوس نکل جائے۔ اس کا مزہ کل ملے گا۔ خاں صاحب آپ نے بھی سُنا ہے۔ آپ کی شہادت ہوگی۔ آپ کا اتنا ملاحظہ بہت کیا۔ لائیے دودھ دیتے ہیں کہ جائیں؟

غوث خاں۔ نہیں جی دودھ لو۔ یہی لوگ جھک ماریں گے اور دیں گے۔ کیا بتائیں آج اِس چھوکرے کی بدولت مجھے تم سے اتنا شرمندہ ہونا پڑا۔ اس موضع کی کچھ ہوا ہی بگڑ گئی ہے۔ میں سب کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ جو بھیگی بلّی بنے بیٹھے ہیں اُنھیں کے اشتعالک سے اس چھوکرے کی اتنی جرأت ہوئی ہے۔ ورنہ اُس کی مجال تھی کہ یوں درازی کرتا۔ بچھڑا کھونٹے ہی کے بل کودتا ہے۔ خیر۔ اگر میرا نام غوث خاں ہے تو ایک ایک کو واصل جہنم کردوں گا۔

اس تحکمانہ تقریر نے خاطر خواہ اثر پیدا کیا۔ سبھوں کے سینے دہل اُٹھے۔ وہ خرمستی اور سرکشی جو پہلے سب کے چہروں سے جھلک رہی تھی غائب ہوگئی۔ منوہر تو ایسا سٹ پٹا گیا گویا سینکڑوں جوتے پڑگئے ہوں۔ اِس ترشی نے سب کے نشے اُتار دیے۔

قادر خاں بولے۔ منوہر! جاؤ۔ جتنا دودھ ہو سب بھیج دو۔ ٹھاکر! تم بھی جاؤ۔ دیکھو دودھ اُٹھ نہ جائے۔

غوث خاں۔ نہیں۔ ہم منوہر سے دودھ نہ لیں گے۔

بلراج۔ یہاں دیتا ہی کون ہے؟

منوہر سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ اچھا لے اب توہی بول۔ تیرے جی میں جو آئے کر۔ اپنا گھردوار سنبھال۔ میرا نباہ تیرے ساتھ نہ ہوگا۔ چاہے رکھ چاہے آگ لگا دے۔

یہ کہہ کر وہ وہاں سے غصّے میں بھرا ہوا چل دیا۔ بلراج بھی دھیرے دھیرے اپنے اکھاڑے کی طرف چلا۔ وہاں اس وقت اور کوئی نہ تھا۔ مگدر کی جوڑی رکھی ہوئی تھی۔ ایک پتھر کی نال زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ لیزم آم کی ایک شاخ سے لٹک رہاتھا۔ بلراج نے کپڑے اُتارے اور لنگوٹ کھینچ کر اکھاڑے میں اُترا۔ مگر ورزش میں آج اُسے مطلق لطف نہ آیا۔ بے دلی سے دس پانچ ہاتھ مگدر کے ہلائے اور اکھاڑے سے نکل آیا۔ اپنی خفت ایک پھوڑے کی طرح اُس کے دل میں ٹیس پیدا کررہی تھی۔ اگرچہ اُس نے چپراسیوں سے دلیرانہ گفتگو کی تھی۔ لیکن اُسے اِس میں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ گاؤں کے اور آدمیوں کو یہاں تک کہ میرے باپ کو بھی میری باتیں ناگوار معلوم ہوئیں۔ سب کے سب کیسا سناٹا کھینچے بیٹھے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کسی کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ جبھی تو یہ دُرگت ہورہی ہے۔ اگر مُنہ میں زبان ہوتی تو آج اتنے پسے کُچلے کیوں جاتے۔ اور تو اور دادا نے بھی مجھی کو ڈانٹا۔ معلوم نہیں ان کے دل میں اتنا ڈر کیوں سما گیا ہے؟ پہلے تو یہ اتنے دبیل نہ تھے۔ شاید اب میری فکر اُنھیں ستا رہی ہے۔ لیکن موقع ملا تو میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ تم میری طرف سے بالکل بے فکر ہوجاؤ۔ بھگوان نے مجھے ہاتھ پیر دیے ہیں۔ محنت کرسکتا ہوں اور دو کو کھلا کر کھاسکتا ہوں۔ تمھیں اپنے کھیت اگر اتنے پیارے ہیں کہ ان کے لیے اپنی عزّت تک بیچ دینے کو تیار ہو تو تمھیں مبارک رہیں۔ میں ایسی جائداد پر لات مارتا ہوں۔ اپنی محنت کی روٹی کھاؤں گا اور اکڑ کر چلوں گا۔ یہ بڈھا غوث خاں کیسی آنکھیں لال پیلی کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اِن کی موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔ حضرات دو وار کرچکے ہیں۔ اب دیکھوں کون ہاتھ نکالتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کا وار مجھی پر ہوگا۔ کچھ پرواہ نہیں۔ دیکھی جائے گی۔ دونوں چپراسی دل میں پھولے نہ سماتے ہوں گے۔ سمجھتے ہوں گے کیسا سارا گاؤں رُعب میں آ گیا۔ پانی بھرنے کو تیار ہے۔ سبھوں نے ڈپٹی صاحب سے میری شکایت ضرور کی ہوگی۔ کیا مضائقہ۔ میرا کوئی کرہی کیا سکتاہے۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ ہاں جھوٹا الزام لگاکر چاہے پھنسادیں۔ اُنھیں کے دھرم کا ستیاناس ہوگا۔ میں تو انصاف پر ہوں۔ میرا کیا بگڑے گا۔ مگر مصلحت یہی ہے کہ کل میں بھی ڈپٹی صاحب کے پاس جاؤں اور اُن سے سب حال کہہ دوں۔ پڑھے لکھے سمجھدار آدمی ہیں۔ غریبوں پر اُنھیں ضرور ترس آئے گا۔ اگر وہ گاڑیوں کی بیگار بند کر دیں تو کیا کہنا۔ وہ اتنا

ظلم کبھی پسند نہ کرتے ہوں گے۔ یہ چپراسی اور اردلی اُن سے چھپا کر یہ دھاندلی کرتے ہیں۔ لیکن کہیں اُنھوں نے مجھے جھڑک کر نکلوا دیا تو! اونچے رُتبہ پر پہنچ کر سب کو گھمنڈ ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا کیا تو میں بھی جان پر کھیل جاؤں گا۔ مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ سڑک پر جا کر کھڑا ہو ...... جاؤں گا اور جسے گاڑیاں پکڑتے دیکھوں گا اُسی کی مرمت کروں گا۔ یا تو دو چار کا سر توڑ کے رکھ دوں گا یا خود وہیں ڈھیر ہو جاؤں گا۔ وہ دادا مجھے بلانے آرہے ہیں۔

بلراج اپنے باپ کے پیچھے پیچھے گھر پہنچا۔ راستے میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ بلاسی بلراج کو دیکھ کر بولی۔ کہاں جاکے بیٹھ رہے بیٹا؟ تمھارے دادا سارے گاؤں میں ڈھونڈتے پھرے۔ کھانا کب سے تیار ہے۔

بلراج ۔ اکھاڑے کی طرپھ چلا گیا تھا۔

بلاسی ۔ تم اکھاڑے مت جایا کرو۔

بلراج ۔ کیوں؟

بلاسی ۔ کیوں۔ کیا دیکھتے نہیں ہو سب کی آنکھوں میں کیسے کھب رہے ہو۔ جنھیں تم اپنا سمجھتے ہو وہ سب تمھارا گلا کاٹنے کو تیار ہیں، تمھیں آگ میں ڈھکیل کر آپ تماشا دیکھیں گے۔ آج ہی تمھیں سرکاری آدمیوں سے لڑاکر کیسے دُبک گئے۔

بلراج نے اس فہمایش کا کچھ جواب نہ دیا۔ چوکے پر جا بیٹھا۔ بغل میں منوہر تھا۔ اُن سے تھوڑی دور پر آنگن میں تھکا ہرواہا رنگی چمار بیٹھا ہوا تھا۔ بلاسی نے جَو کی موٹی موٹی روٹیاں۔ بتھوے کی بھاجی اور ارہر کی دال تین تھالیوں میں رکھ دی۔ اس کے بعد ایک پھول کے کٹورے میں دودھ لاکر بلراج کے سامنے رکھ دیا۔

بلراج۔ کیا اور دودھ نہیں ہے کیا؟

بلاسی ۔ دودھ کہاں ہے۔ بیگار میں چلا گیا۔

بلراج ۔ اچھا یہ کٹورا رنگی کے سامنے رکھ دو۔

بلاسی ۔ تم کھالو۔ رنگی ایک دن دودھ نہ کھائے گا تو دُبلا ہو جائے گا۔

بلراج نے کٹورا اُٹھا کر آنگن کی طرف زور سے پھینکا۔ وہ تُلسی کے چبوترے سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو گیا۔

بلاسی۔ کچھ سنک تو نہیں گئے؟

بلراج ۔ ہاں سنک ہی گیا ہوں۔

بلاسی ۔ یہ کس بات پر کٹورا پھینک دیا؟
بلراج ۔ اِس لیے کہ جو ہم سے جیادہ کام کرتا ہے اُسے ہم سے جیادہ کھانا چاہیے۔ ہم نے تم سے باربار کہہ دیا کہ رسوئیں میں جو کچھ ہو وہ سب کے سامنے آئے۔ اچھا کھائیں تو سب کھائیں۔ بُرا کھائیں تو سب کھائیں۔ لیکن تمھیں نہ معلوم کیوں یہ بات باربار بھول جاتی ہے۔ اب یاد رکھوگی۔ رنگی کوئی بیگار کا آدمی نہیں ہے۔ گھرکا آدمی ہے۔ مُنہ سے چاہے نہ کہے پر دل میں جرور سمجھتا ہوگا کہ چھاتی پھاڑکر کام میں کروں اور مونچھوں پر تاؤ دے کر کھائیں یہ لوگ۔ ایسا دودھ گھی کھانے پر لانت ہے۔
رنّگی نے کہا بھیا۔ نِت تو دودھ کھاتا ہوں۔ ایک دن نہ سہی۔ تم بِن ناہک اتنے رِسیا گئے۔

اِس کے بعد کسی نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ چُپ چاپ کھا پی کر چلے گئے۔ بلراج اور رنگی دونوں اوکھ کی رکھوالی کرنے منڈیا کی طرف چلے۔ وہاں بلراج نے چرس نکالی۔ دونوں نے خوب دم لگائے۔ جب دونوں اوکھ کے چھلکے کے بچھاؤں پر کمبل اوڑھ کر لیٹے تو رنگی بولا۔ کیوں بھیا۔ آج تم سے لسکر کے چپراسیوں سے کچھ کہا سُنی ہوگئی تھی کیا؟
بلراج۔ ہاں ہوگئی تھی۔ دادا نے منع نہ کیا ہوتا تو میں دونوں کو مارتا۔
رنگی۔ جبھی دونوں تمھیں بُرا بھلا کہتے چلے جاتے تھے۔ میں اُدھر سے کیاری میں پانی کھول کرآتاتھا۔ دونوں چپ ہوگئے۔ بس میں نے اتنا سُناکہ اگر یہ لونڈا کل سڑک پر گاڑیاں پکڑنے میں کچھ حجت کرے۔ تو بس چوری کا اِلجام لگاکر گرپھتار کرلو۔ ایک پچاس بیت پڑجائیں تو اس کی سیکھی اُترجائے۔
بلراج۔ اچھا یہ سب یہاں تک میرے پیچھے پڑے ہیں۔ تم نے اچھا کیا۔ مجھے ہوسیار کردیا۔ میں کل ڈپٹی صاحب کے پاس جاؤں گا۔
رنگی ۔ کیا کرنے جاؤگے بھیا؟ سنتے ہیں اچھا آدمی نہیں ہے۔ بڑی کڑی سجا دیتا ہے۔ کسی کو چھوڑنا تو جانتا ہی نہیں۔ تمھیں کیا کرنا ہے؟ جس کی گاڑی پکڑی جائے گی وہ آپ ہی نبٹ لے گا۔
بلراج ۔ لوگوں میں اتنی جُریت ہوتی تو کسی کی گاڑی پکڑی ہی نہ جاتی۔ سیدھے کا مُنہ کُتے چاٹتے ہیں۔

رنگی۔ توتم کاہے کو دوسروں کے بیچ میں پڑتے ہو؟ تمھارے دادا آج بہت اُداس تھے اور
اماں دیر تک روتی رہیں۔

بلراج۔ کیا جانے کیوں رنگی! جب سے دنیا کا حال دیکھنے لگا ہوں کسی جبردست کو گریب کا گلا
دباتے دیکھتا ہوں تو میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ چپ نہیں رہا جاتا۔ یہی جی
چاہتا ہے کہ اپنی جان رہے یا جائے اس جبردست کا سر نیچا کردوں۔ میرے سر پر ایک
بھوت سا چڑھ جاتا ہے۔ جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑسکتا پر طبیعت کابو سے
باہر ہوجاتی ہے۔

یہ باتیں کرتے کرتے دونوں سوگئے۔ علی الصباح بلراج گھر گیا۔ کسرت کی۔ دودھ پیا
اور اپنا ڈھیلا کُرتہ پہن پگڑی باندھ ڈپٹی صاحب کے فرودگاہ کی طرف چلا۔ منوہر اب تک
اُس سے نہ بولے تھے۔ اب ضبط نہ کرسکے۔ پوچھا کہاں جاتے ہو؟

بلراج۔ جاتا ہوں ڈپٹی صاحب کے پاس۔

منوہر ۔ کیا سرپر بھوت سوار ہے؟ اپنا کام کیوں نہیں دیکھتے؟

بلراج۔ دیکھوں گا کہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجاج کیسا ہوتا ہے؟

منوہر۔ دھکّے کھاؤگے۔

بلراج۔ دھکّے تو چپراسیوں کے کھاتے ہیں۔ کُتّے کی جات تو پہچانی جائے گی۔

منوہر نے اُس کی طرف دُو بار نگاہوں سے دیکھا اور کُدال کندھے پر رکھ کر ہار کی
طرف چلاگیا۔ بلراج کو معلوم ہوگیا کہ اب یہ مجھے چھوڑا ہوا سانڈ سمجھ رہے ہیں اور
ناراضگی کے اس بے تعلقانہ اظہار سے مجھے روکنا چاہتے ہیں۔ منوہر کو یقین تھا کہ اس وقت
فہمائش کا اتنا اثر نہ ہوگا جتنا بے اعتنائی کا۔ مگر بلراج اپنی دُھن میں مست تھا۔ منوہر جوں ہی
اُدھر گیا بلراج نے بھی لٹھ کندھے پر رکھا اور پڑاؤ کی طرف چلا۔ کسی حاکم کے روبرو جانے
کا اُس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے تھے۔ معلوم نہیں ملیں یا
نہ ملیں۔ کہیں میری باتیں سُن کر بگڑ نہ جائیں۔ مجھے دیکھتے ہی سامنے سے نکلوا نہ دیں۔
چپراسیوں نے میری شکایت جرورہی کی ہوگی۔ کرودھ میں بھرے بیٹھے ہوں گے۔ بابوگیان
شنکر سے اِن کی دوستی بھی ہے۔ انھوں نے ہم لوگوں کی طرپھ سے اِن کے کان کھوب
بھرے ہوں گے۔ میری صورت دیکھتے ہی جل جائیں گے۔ اونھ۔ ایک پُن تو ہوجائے گا۔
یہی لوگ تو ہیں جو سبھاؤں اور لاٹ صاحب کے درباروں میں ہم لوگوں کی بھلائی کی رٹ

لگایا کرتے ہیں۔ ہمارے مُکھیا بننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اب دیکھوں گا کہ یہ لوگ باتوں کے کتنے دھنی ہیں۔

بلراج پڑاؤ پر پہنچا تو دیکھا جابجا لکڑیوں کے الاؤ جل رہے ہیں۔ کہیں پانی گرم ہو رہا تھا۔ کہیں لوگ تاپ رہے تھے۔ ایک طرف ایک قصاب بکرے کی تکّی بوٹیاں کر رہا تھا۔ دوسری طرف بسیسر ساہ بیٹھے سامان تول رہے تھے۔ جابجا گھڑے اور ہانڈیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ اُسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں دونوں چپراسیوں کی نگاہ مجھ پر نہ پڑجائے۔ وہ درختوں کی آڑ میں ہوتا ہوا جوالا سنگھ کے خیمہ کے پاس جا پہنچا۔ اور سوچنے لگا کیوں کر جاؤں؟ اُس کے دل پر اس وقت ایک رُعب چھایا ہوا تھا۔ خیمے کے سامنے جاتے ہوئے پیر کانپتے تھے۔ یکایک اُس کی نگاہ غوث خاں اور سُکھو چودھری پر پڑی جو ایک درخت کے نیچے بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ اب وہ خیمے کے پیچھے کھڑا نہ رہ سکا۔ اُن کے سامنے دھکّے کھانا یا گھڑکیاں سُننا مرجانے سے بدتر تھا۔ کلیجہ مضبوط کرکے وہ خیمے کے سامنے چلا گیا۔ اور جوالا سنگھ کو کُرسی پر بیٹھے دیکھ کر سلام کیا۔

بابو جوالا سنگھ منصف مزاج غریب دوست آدمی ضرور تھے مگر اس دو تین ماہ کے دوروں میں اُنھیں تجربہ ہوگیا تھا کہ سختی کے بغیر میں اپنے منصبی فرائض پورے نہیں کرسکتا۔ اپنے ذاتی معاملات میں ہمدردی اور اخلاق چاہے کتنے ہی مستحسن ہوں لیکن امورسیاست میں یہ خوبیاں کمزوری کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ لوگ اُن سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اُنھیں اپنی کاربرآری کا حیلہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ ہمدردی اور انصاف ازلی مناسبت کے درجے سے گرکر باہم متضاد ہوجاتے ہیں۔ رسد اور بیگار کے معاملے میں یہی ماتحتوں کی تملق سازیاں اُن کے احساسِ حق پر غالب آگئی تھیں۔ اور وہ نادانستہ حکام کے رائج الوقت سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ اُنھیں اپنی قوتِ فیصلہ پر پہلے ہی سے ناز تھا۔ اب اُس نے خودپروری کا رنگ پکڑ لیا تھا۔ وہ جو کچھ کہتے تھے یا کرتے تھے اُس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُننا چاہتے تھے۔ اس سے اُن کے فیصلے پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ ان کی طبعیت اب پیشتر سے کہیں زیادہ ذکی الحس ہوگئی تھی۔ چونکہ وہ بے لوث آدمی تھے اور دائرہ انصاف سے ایک قدم بھی باہر نہیں جاتے تھے۔ اُنھیں قدرتاً یہ خیال ہوتا تھا کہ کسی فردبشر کو مجھ سے شکایت نہ ہونی چاہیے۔ عرض اور التجا کی آواز بھی اُن کے کانوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اپنی صحت و صواب کا یقین اور اپنی بے نیاز طبیعت اُنھیں غرض مند سائلوں

سے تند لہجہ اختیار کرنے پر مائل کرتی تھی۔ بلراج کو سامنے کھڑا دیکھ کر بولے، کون ہے؟ یہاں کیوں کھڑا ہے؟

بلراج نے جھک کر سلام کیا۔ وہ مرعوب ہوگیا تھا۔ ڈرتا ہوا بولا۔ ہجور سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرا گھر اسی گاؤں میں ہے۔

جوالاسنگھ۔ کیا کہتا ہے؟

بلراج۔ کچھ نہیں اتنا ہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہجور کو آج کتنی گاڑیاں درکار ہوں گی؟

جوالاسنگھ۔ کیا تم گاڑیوں کے چودھری ہو؟

بلراج۔ جی نہیں۔ چپراسی لوگ سڑک پر جاکر مسافروں کی گاڑیاں روکتے ہیں۔ اور اُنھیں دِک کرتے ہیں۔ ابھی کل ایک گاڑی روک لی۔ اِس میں ایک بیمار بُڑھیا بیٹھ کر اسپتال جارہی تھی۔ بُڑھیا بیچاری میرے گاؤں میں پڑی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہجور کو جتنی گاڑیاں چاہتی ہوں اتنی آس پاس کے گاؤں سے ڈھونڈ لاؤں اور اُن کا سرکار سے جو کرایہ ملتا ہو وہ دے دیا جائے تو مسافروں کو روکنا نہ پڑے۔

جوالاسنگھ نے اپنی باربرداری کے لیے اونٹ رکھ لیے تھے۔ مگر یہ جانتے تھے کہ ماتحتوں اور چپراسیوں کو اپنے اسباب لادنے کے لیے گاڑیاں ضروری ہیں۔ اُنھیں سرکار سے اتنا بھتہ نہیں ملتا کہ گاڑیوں کا کرایہ دے سکیں۔ اس لیے وہ لوگ گاڑیاں روکنے میں حق بجانب نہیں تو قابلِ معافی ضرور ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ کوئی ایسی زیادتی نہ تھی۔ ممکن تھا اُن کے کسی دوست نے یہی تجویز کی ہوتی تو وہ اس پر غور کرتے۔ لیکن ایک اکھڑ کندۂ ناتراش دہقانی کو اُن سے یہ شکایت کرنے کی جرأت ہو۔ وہ انھیں انصاف کا سبق پڑھانے کا دعویٰ کرے۔ یہ اُن کی خوددار طبیعت کے لیے لقمۂ تلخ تھا۔ چین بہ جبین ہوکر بولے۔ جاکر سررشتہ دار سے پوچھو۔

بلراج ۔ ہجور ہی اُن سے پوچھ لیں۔ مجھے وہ نہ بتائیں گے۔

جوالاسنگھ۔ مجھے اِس دردِسر کی فرصت نہیں ہے۔

بلراج کے تیوروں پر بل پڑگئے۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کے حُسنِ اخلاق، انسانیت اور دردمندی کا جو معیار اُس کے دل میں قائم تھا حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ ان اوصاف کے بجائے اُسے حکومت اور خودپروری کا غرور اکڑتا ہوا نظر آیا۔ اور غرور کے سامنے جُھکنا اُس نے نہ سیکھا تھا۔ اُس نے دل میں فیصلہ کیا کہ جو شخص اتنا مغرور ہو اور مجھے اتنا حقیر

سمجھے۔ وہ ہرگز عزّت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اِن میں اور غوث خاں یا کسی معمولی چپراسی میں فرق ہی کیا رہا۔ انھیں کی طرح یہ حضرت بھی اختیار کے نشے میں انسانیت کو بھُول گئے ہیں۔ علم اور تہذیب کا جوہر کہاں گیا۔ بیباک ہوکر بولا سرکار اِسے سردرد سمجھتے ہیں اور یہاں ہم لوگوں کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ آپ یہاں دھرم کے آسن پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور آپ کے چپراسی رعایا کو لوٹتے پھرتے ہیں۔ مجھے آپ سے جو یہ عرض کرنے کا حوصلہ ہوا تو اس لیے کہ میں سمجھتا تھا کہ آپ وِدْوان ہیں اور رعایا پرور ہیں۔ اب معلوم ہوگیا کہ ہم ابھاگوں کا مددگار بھگوان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

یہ کہہ کر وہ بغیر سلام کئے ہی وہاں سے چل دیا۔ باتیں گستاخانہ تھیں پر ان میں خودداری اور حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جوالاسنگھ میں انسانیت کا وجود ابھی باقی تھا۔ غصہ کے بجائے اُن کے دل میں ندامت کا احساس ہوا۔ اب تک اُن کے یہاں بیشتر غرض مند خوشامدیوں ہی کا مجمع رہتا تھا جو ہر ایک بات میں آمنا و صدقنا کہنے پر آمادہ رہتے تھے۔ ایک بھی حق گو آدمی سے اُن کا سابقہ نہ پڑا تھا۔ جس طرح لقمۂ شیریں کھانے سے ہم سیر ہوجاتے ہیں تو طبیعت کڑوی چیزوں کی جانب راغب ہوتی ہے۔ اُسی طرح جوالاسنگھ کو یہ تلخ باتیں میٹھی معلوم ہوئیں۔ نگاہِ باطن کے سامنے سے رتبے اور وقار کا پردہ ہٹ گیا۔ جی میں تو آیا کہ اِس نوجوان کو بُلاکر اُس سے خوب باتیں کروں پر حالاتِ گردوپیش کا خیال کرکے رُک گئے۔ وہ بہت دیر تک بیٹھے ہوئے اِن باتوں پر غور کرتے رہے۔ آخری لفظوں نے ان کے حِسِ شرافت کو ایک ٹھوکا دیا تھا اور وہ بیدار ہوگیا تھا۔ دل میں اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنے کے بعد انھوں نے اہلمد صاحب کو بُلایا۔ سید ایجاد حسین نے بلراج کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ کل کا سارا واقعہ انھیں معلوم تھا۔ تاڑ گئے کہ یہ لونڈا ڈپٹی صاحب کے پاس فریاد کرنے آیا ہوگا۔ پہلے تو اندیشہ ہوا ڈپٹی صاحب کہیں اس کی باتوں میں نہ آگئے ہوں لیکن جب بلراج نے خود ہی اپنی خفت اور ڈپٹی صاحب کی بے التفاتی کا ذکر کردیا تو اُس کی مذمّت کرنے لگے۔ وہ افسروں کے اشاروں کے غلام تھے۔ افسر کی منشا کو وحی سمجھتے تھے۔

بلراج اس وقت ایسا بے دل ہورہا تھا کہ پہلے تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا ایجاد حسین کی بدزبانیاں سُنتا رہا۔ آخر تنگ آکر متین انداز سے بولا۔ آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہمارے اوپر

جُلم بھی ہو اور ہم پھریاد بھی نہ کریں؟

ایجاد حسین۔ فریاد کا مزہ تو چکھ لیا۔ اب چالان ہوتا ہے تو دیکھوں کہاں جاتے ہو۔ سرکاری ملازموں سے مزاحم ہونا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ ڈپٹی صاحب کو تم لوگوں کی مفسدہ پردازیوں کی ساری حقیقت معلوم ہے۔ بابوگیان شنکر نے پہلے ہی اُنھیں آگاہ کردیا ہے۔ وہ تو خود ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ آج شام تک سارا گاؤں بندھا جاتا ہے۔ غوث خاں کو سیدھا پالیا ہے۔ اسی لیے شیر ہوگئے ہو۔ اب اُس کی کسر نکل جائے گی۔ اتنے بینت پڑیں گے کہ دھجیاں اُڑجائیں گی۔

بلراج۔ ایسا کوئی اندھیر ہے کہ حاکم لوگ بے کسور کسی کو سجا کر دیں۔

ایجاد حسین۔ ہاں ایسا ہی اندھیر ہے۔ سرکاری ملازموں کو ہمیشہ بیگار ملتی ہے اور ہمیشہ ملے گی۔ تم گاڑیاں نہ دوگے تو کیا وہ اپنے سر پر اسباب لادیں گے؟ ہمیں جن جن چیزوں کی ضرورت ہوگی وہ تمھیں سے لی جائیں گی۔ ہنس کردو یا روکردو۔ سمجھ گئے......

اتنے میں ایک چپراسی نے آکر کہا چلیے آپ کو سرکار یاد کرتے ہیں۔ ایجاد حسین پان کھائے ہوئے تھے۔ فوراً کُلّی کی۔ پگڑی باندھی اور جوالاسنگھ کے سامنے جاکر سلام کیا۔

جوالاسنگھ نے کہا میرصاحب چپراسیوں کو تاکید کردیجیے کہ اب سے کیمپ کے لیے بیگار گاڑیاں نہ پکڑا کریں۔ آپ لوگ اپنا سامان میرے اونٹوں پر رکھ لیاکریں۔ اس سے آپ لوگوں کو چاہے تھوڑی سی تکلیف ہو لیکن یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اپنی آسائش کے لیے دوسروں پر جبر کیا جائے۔

ایجاد حسین۔ حضور بہت بجا فرماتے ہیں۔ آج سے چپراسیوں کو سخت ممانعت کردی جائے گی۔ بیشک یہ سراسر ظلم ہے۔

جوالاسنگھ۔ چپراسیوں سے کہہ دیجیے رات کو میرے اجلاس کے خیمے میں سورہا کریں۔ بیگار میں پیال لینے کی ضرورت نہیں۔ غریب کسان یہی پیال کاٹ کرجانوروں کو کھلاتے ہیں۔

ایجاد حسین۔ حضور کا فرمانا بجا ہے۔ حکّام کو ایسا ہی غریب پرور ہونا چاہیے۔ لوگ زمینداروں کی سختیوں سے یوں ہی پریشان رہتے ہیں۔اُس پر حکّام کی بیگار تو اور بھی ستم ہوجاتی ہے۔

جوالاسنگھ کے دل میں گیان شنکر کی طعن آمیز باتیں ابھی تک کھٹک رہی تھیں۔ سوچا موقع تو اچھا ہے۔ اگر تھوڑی سی تکلیف سے اُن پر چھینٹے اُڑانے کے سامان مہیا

ہوجائیں تو کیا پوچھنا۔ وہ اس انتقام کے جوش کو نہ روک سکے۔ ایک بار گاؤں میں جاکر اُس کی حالت کو ملاحظہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

آٹھ بج چکے تھے۔ لیکن ابھی تک چاروں طرف کُہرا چھایا ہواتھا۔ لکھن پور والے آج تعطیل سی منا رہے تھے۔ جگہ جگہ لوگ الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے کل کے وقوعہ پر رائے زنی کررہے تھے۔ بلراج کی زبان درازیوں کی سخت تنقید کی جا رہی تھی۔ دفعتاً جوالا سنگھ چپراسیوں اور کئی عملوں کے ساتھ گاؤں میں آپہنچے۔ غوث خاں اور اُن کے دونوں سپاہی بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ اُنھیں دیکھتے ہی عورتیں اپنے ادھ منجے برتن چھوڑکر گھروں میں جاگھسیں۔ لڑکے مارے خوف کے اِدھراُدھر دبک گئے۔ کوئی آدمی دروازے کا کوڑا کرکٹ اُٹھانے لگا۔ کوئی راستے میں پڑی ہوئی کھاٹ ہٹانے لگا۔ جوالا سنگھ گاؤں کا ملاحظہ کرتے ہوئے آکر سُکھو چودھری کے کولھواڑ میں کھڑے ہوگئے۔ سُکھو چارپائی لینے دوڑے۔ غوث خاں نے ایک آدمی کو کُرسی لانے کے لیے چوپال دوڑایا۔ لوگوں نے چاروں طرف سے آکر ڈپٹی صاحب کو گھیر لیا۔

جوالا سنگھ نے پوچھا۔ امسال فصل کیسی ہونے کی امید ہے؟

سُکھو چودھری گاؤں کے وکیل تھے۔ ایسے موقعوں پر وہی پیشرو کا فرض ادا کرتے تھے۔ پر وہ ابھی تک گھر سے چارپائی نکالنے میں مصروف تھے۔ اس لیے یہ رُتبۂ نیابت قادرخاں کے حصّے پڑا۔ بولے۔ ہجور ابھی تک تو اچھّی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔

جوالا سنگھ۔ یہاں مجھے آب پاشی کے کنوئیں بہت کم نظر آتے ہیں۔ کیا زمیندار کی طرف سے اس کا کوئی انتظام نہیں؟

قادر۔ ہمارے جمین دار تو ہجور ہم لوگوں کی بڑی پرورش کرتے ہیں۔ اللہ اُنھیں سلامت رکھے۔ ہم لوگ کُھد ہی بدنصیب ہیں۔

جوالا سنگھ۔ منشی غوث خاں تم لوگوں کی سرکشی کی بہت شکایت کرتے ہیں۔ بابوگیان شنکر بھی تم لوگوں سے خوش نہیں ہیں۔ یہ کیا بات ہے۔ تم لوگ وقت پر لگان نہیں دیتے اور جب تقاضا کیا جاتا ہے تو فساد پر آمادہ ہوجاتے ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ زمیندار چاہے تو تم سے ایک کے دو وصول کرسکتا ہے۔

گجادھراہیر نے دبی زبان سے کہا تو کون کہیں کہ چھوڑ دیتے ہیں۔

جوالاسنگھ۔ کیا کہتے ہو؟ سامنے آکر کہو۔

قادر۔ کچھ نہیں ہجور یہی کہتا ہے کہ ہماری کیا مجال ہے جو اپنے مالکوں کے سامنے سر اُٹھائیں۔ہم تو اُن کے تابعدار ہیں۔ اُن کا دیا کھاتے ہیں۔ اُن کی جمین میں بستے ہیں۔ بھلا اُن سے سرکشی کرکے اللہ کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔ رہا لگان۔ سو ہجور جہاں تک ہوتا ہے سال تمام تک کوڑی کوڑی چکا دیتے ہیں۔ ہاں جب کوئی کابو نہیں چلتا تو تھوڑی بہت بکایا رہ بھی جاتی ہے۔

جوالاسنگھ نے اسی طرح کے اور بھی کئی سوالات کئے پر اُن کا منشا پورا نہ ہوسکا۔ کسی کی زبان سے غوث خاں یا گیان شنکر کے خلاف ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آخر ہار کر وہ پڑاؤ کی طرف چلے آئے۔

(۹)

اپنی سعادت مندی کا ایسا پختہ ثبوت دینے کے بعد گیان شنکر کو تقسیم کے معاملے میں اب کوئی تردّد نہ رہا۔ پربھاشنکر نے ہرایک امر میں اُنھیں کی مرضی مقدم رکھی۔ دیوان خانہ اُن کے لیے خالی کر دیا۔ منقولہ اشیاء کی تقسیم اُن کے حسبِ خواہش کردی ۔ اور لکھن پور کا مسلّم موضع اُن کے حصّے میں دے دیا۔ بڑی بہو کی جانب سے اختلاف کا اندیشہ تھا۔ مگر اِس ثبوت نے اُن کی زبان ہی نہیں بند کردی بلکہ گیان شنکر کے خلاف سوئے ظن بھی رفع کردیا۔ لالہ پربھاشنکر بڑی بہو سے، نوکروں سے، ملاقاتیوں سے، عزیزوں سے گیان شنکر کی تعریف کیا کرتے اور روزانہ اس حسنِ ظن کا کوئی نہ کوئی ثبوت دیتے۔ ایک دوشالہ، ایک چاندی کا شمع دان، چند اچھی تصویریں، ایک بہت عمدہ اونی قالین اور دوسری متفرق چیزیں اُن کی نذر کیں۔ وہ خوش خور آدمی تھے۔ انواع و اقسام کے مُربے، چٹنیاں، لوازمات بنایا کرتے تھے۔ اس فن میں اُنھیں کمال تھا۔ خود بھی شوق سے کھاتے تھے اور دوسروں کو کھلاکر خوش ہوتے تھے۔ گیان شنکر کے لیے روز کوئی نہ کوئی لذیذ چیز بناکر بھیجتے۔ یہاں تک کہ گیان شنکر اِن مدارات سے تنگ آگئے۔ اُن کے ضمیر نے ابھی تک اُنھیں اِس افترا کے لیے معاف نہیں کیاتھا۔ یہ خاطرداریاں روز اُنھیں اُس کی یاد دلاتی رہتی تھیں جس سے اُن کی طبیعت متاثر ہوتی تھی۔ اپنے چچا کی خوش اعتقادی کے سامنے اپنی ابلہ فریبی اور روباہ بازی بہت مکروہ نظر آتی تھی۔

لکھن پور گیان شنکر کی دیرینہ تمناؤں کی معراج تھا۔ خاندان کی ساری ملکیت میں ایسا زرخیز، ایسا آسودہ حال اور کوئی موضع نہ تھا۔ شہر کے قریب پختہ سڑک کے کنارے باغات سے پُر۔ سیر کی کافی گنجائش تھی۔ ایک کچا لیکن آرام دہ مکان بھی تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اضافے کی امید تھی۔ تھوڑی سی کوشش سے نفع دوچند ہوسکتا تھا۔ جابجا دوچار کنوئیں کھدواکر اضافے کی قانونی شرط پوری کی جاسکتی تھی۔ تفریح کے لیے سال میں مہینہ دو مہینہ کا لطف ۔ باغوں میں چڑیوں کا شکار۔ کسی درخت کے سایے میں بیٹھ کر دلفریب ہریالی کا نظارہ۔ یہ سب شوق پورے ہونے کے سامان پیدا ہوگئے۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ گیان شنکر نے غوث خاں کو طلب کیا۔ جمع بندی کی جانچ کی۔ اضافہ لگان کے فرد کی ترمیم کی اور استغاثے دائر کرنے کا حکم دے دیا۔ اب تک سیر بالکل نہ ہوتی تھی۔ اُس کا بھی انتظام کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے بیل ہلواہے رکھے جائیں اور باقاعدہ کھیتی کی جائے۔ لیکن غوث خاں نے کہا اتنے خلجان کی کیا ضرورت ہے۔ بیگار میں بڑی آسانی سے کاشت ہوسکتی ہے۔ خود کاشت کے لیے بیگار لینا زمیندار کا حق ہے۔ اُسے کیوں چھوڑیے۔

مگر معاملات کی اِن ہمسازیوں میں ایک بے سُرا راگ بھی تھا۔ یہ وڈیاوتی کی صدائے پُرخاش تھی۔ اُسے اپنے شوہر کی نفسانیت ایک آنکھ نہ بھاتی ۔ کبھی کبھی یہ اختلاف مجادلہ اور شکررنجیوں کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ لالہ پربھاشنکر بڑی فراخ دلی سے ہولی کا جشن مناتے تھے۔ اپنے گھروالوں کے لیے نئے کپڑے لائے تو گیان شنکر کے کنبے کے لیے بھی لیتے آئے۔ تقریباً پچاس برسوں سے وہ سارے خاندان کے لیے اس تقریب پر کپڑے لانے کے عادی ہوگئے تھے۔ اب علاحدہ ہوجانے پر بھی وہ اُس رسمِ قدیم کو نبھاتے رہنا چاہتے تھے۔ ایسے خوشی کے موقع پر کسی کی کدورت کو دل میں جگہ دینا اُنھیں شاق گزرتا تھا۔ وڈیاوتی نے یہ کپڑے تو رکھ لیے پر اُن کے بدلے میں پربھاشنکر کے لڑکوں لڑکیوں اور بہو کے لیے ایک ایک جوڑا دھوتی کی تجویز کی۔ گیان شنکر نے یہ تجویز سُنی تو چڑھ کر بولے۔ یہی کرنا ہے تو اُن کے کپڑے لوٹا کیوں نہیں دیتیں؟

وڈیاوتی ۔ بھلا کپڑے لوٹا دوگے تو وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔ وہ بے چارے تو تم سے ملنے کو دوڑتے ہیں اور تم بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ اگر تمھیں روپیوں کا خیال ہو تو تم

کچھ مت دینا۔ میں اپنے پاس سے دے دوں گی۔

گیان شنکر۔ جب تم دھنا سیٹھوں کی طرح باتیں کرنے لگتی ہو تو بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ اُنھوں نے یہ کپڑے بھیج دیے تو کوئی احسان نہیں کیا۔ دکانوں کا سال بھر کا پیشگی کرایہ لے کر ہڑپ کر چکے ہیں۔ یہ چال اس لیے چل رہے ہیں کہ میں منہ بھی نہ کھول سکوں اور اُن کی بزرگی کی شان بھی قائم رہے۔ اپنی گرہ سے خرچ کرتے تو معلوم ہوتا۔

وِدّیاوتی۔ تم دوسروں کی نیک نیتی پر بعض اوقات ایسی خاک ڈالنے لگتے ہو کہ مجھے تمھاری تنگ ظرفی پر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ اُنھوں نے تو اپنا عزیز سمجھ کر یہ مدارات کی اور تمھیں اس میں بھی اُن کی چال سوجھ گئی۔

گیان شنکر۔ مجھے بھی گھر میں بیٹھے عیش کے سامان مل جاتے تو میں تم سے بھی فیاض ہوجاتا۔ تمھیں کیا خبر ہے کہ میں آج کل کتنی مشکلوں سے خانہ داری کا انتظام کررہا ہوں۔ لکھن پور سے جو روپے ہاتھ آئے تھے اُنھیں پر بسر کررہا ہوں۔ کفایت پر نگاہ نہ رکھتا تو اب تک ہزاروں کا مقروض ہوگیا ہوتا۔ محض عدالتی مصارف کے لیے سینکڑوں روپے کی ضرورت ہے۔ بے دخلی اور اضافے کے کاغذات تیار ہیں۔ پر استغاثے دائر کرنے کے لیے روپیہ میسّر نہیں۔ اُدھر گاؤں والے الگ بگڑے ہوئے ہیں۔ جوالا سنگھ نے اب کی دورے میں اُنھیں ایسا سر چڑھا دیا کہ مجھے کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ میں تو ان تردّدات میں غوطے کھارہا ہوں اور تمھیں ایک نہ ایک خرافات سوجھا کرتی ہے۔

وِدّیاوتی۔ میں تم سے روپے تو نہیں مانگتی۔

گیان شنکر۔ میں اپنے اور تمھارے روپیوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ ہاں جب رائے صاحب تمھارے نام کوئی علاحدہ جائداد لکھ دیں تو سمجھنے لگوں گا۔

وِدّیاوتی۔ میں تم سے کبھی ایک پیسہ کی بھی روادار نہیں ہوئی!

گیان شنکر۔ مانا۔ لیکن میکے سے بھی تم کوئی روکڑ نہیں لاتی ہو۔ سال میں سو دوسو روپے مل جاتے ہوں گے۔ اتنے ہی پر تمھارے پیر زمین پر نہیں پڑتے۔ اُتھلے تالاب کی طرح اُبلنے لگتی ہو۔

وڈیاوتی۔ تو کیا چاہتے ہو کہ وہ لوگ تمھیں اپنا گھر اُٹھاکر دے دیں؟

گیان شنکر۔ وہ بے چارے آپ تو اپنا پیٹ بھرلیں۔ مجھے کیا دیں گے۔ میں تو ایسے آدمی کو چوپایا سے بھی گیا گزرا سمجھتا ہوں جو آپ تو لاکھوں اُڑائے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کی بات بھی نہ پوچھے۔ وہ تو اگر مر بھی جائیں تو میری آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔

وڈیاوتی۔ تمھارا دل اتنا تنگ ہے۔ یہ آج مجھے معلوم ہوا۔

گیان شنکر۔ ایشور کا شکر کرو کہ مجھ سے شادی ہوگئی۔ نہیں تو کوئی بات بھی نہ پوچھتا۔ لالہ برسوں تک دہی دہی کی ہانک لگاتے رہے پر کسی نے سنیت ہی نہ پوچھا۔

وڈیاوتی یہ جگردوز طنز نہ برداشت کر سکی۔ غصّے سے چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہ جھمک کر وہاں سے چلے جانے کو اُٹھی کہ دفعتاً مہری نے ایک تار کا لفافہ لاکر گیان شنکر کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ لکھا تھا:

رامانند داغ دے گئے۔ جلد آو۔

گیان شنکر نے تار کا کاغذ زمین پر پھینک دیا۔ اور لمبی سانس لے کر بولے۔ ہائے افسوس! ایشور یہ تم نے کیا کیا؟

وڈیاوتی ٹھٹک گئی۔

گیان شنکر بولے۔ وڈیا۔ ہم لوگوں پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ ہمارا ......

وڈیاوتی نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ میرے گھر پر تو خیرت ہے؟

گیان شنکر۔ آہ پیاری! کس مُنہ سے کہوں کہ خیریت ہے۔ وہ گھر ویران ہوگیا۔ اس گھر کا چراغ بُجھ گیا۔ بابورامانند نے اس دار فانی سے رحلت کی۔ ہائے! ایشور!

وڈیاوتی کے منہ سے معاً ایک چیخ نکل گئی۔ طائرِ بسمل کی طرح زمین پر گری۔ اور پچھاڑیں کھانے لگی۔ شردھا دوڑی ہوئی آئی۔ مہریاں جمع ہوگئیں۔ بڑی بہو نے رونا سُنا تو وہ بھی اپنی بہو اور بیٹیوں کے ساتھ آپہنچیں۔ کمرے میں عورتوں کی بھیڑ ہوگئی۔ مایاشنکر ماں کو روتے دیکھ کر چیخنے لگا۔ سبھی عورتوں کے چہروں پر غم کی جھلک تھی۔ اور آنکھوں میں اشکِ درد۔ کوئی ایشور کو کوستی تھی، کوئی نیر نگیٔ زمانہ کو۔ مرگ بے ہنگام شاید ہماری نگاہوں میں ایشور کی سب سے بڑی بے رحمی ہے۔ یہ مصیبت ہمارے اعتقاد کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے۔ ہم کو منکر اور ملحد بنا دیتی ہے۔ دنیا میں ہم مصیبت کے نظارے آئے دن دیکھا کرتے

ہیں۔ ہم اُن کے عادی ہوگئے ہیں۔ لیکن ہماری غم نصیب آنکھیں بھی اس سانحے کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ ناگہانی موت ہمارے دلوں پر مشیتِ الٰہی کا سب سے قاتل وار ہے۔ ہماری خدا ترسی پر سب سے بڑا ستم ہے!

نفس پروری تیرا بُرا ہوا۔ گیان شنکر کو اس سانحے سے ایک لمحے کے لیے صدمہ ضرور ہوا۔ مگر ذرا دیر کے بعد اُن کے سینے میں نئ نئ تمنائیں لہرانے لگیں۔ اب تک اُن کی زندگی کی کوئی منزل مقصود نہ تھی۔ اب اُس منزل کا سُنہرا مینار صاف نظر آنے لگا۔ اوسر زمین میں سبزہ موجیں مارنے لگا۔ رائے کملا نند کا کوئی وارث نہ تھا۔ دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں ایک بیوہ اور بے اولاد تھی۔ ودّیاوتی ہی کو ایشور نے اولاد عطا کی تھی اور اب مایا شنکر رائے صاحب کا وارث کُل تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ گیان شنکر کو یہ حادثہ اپنی خوش نصیبی کی غیبی تائید نظر آتا تھا۔ وہ مایا شنکر کو گود میں لے کر نیچے دیوان خانے میں چلے آئے اور وراثت کے متعلق دھرم شاستروں کے احکام کا مطالعہ کرنے لگے۔ وہ اپنی تمناؤں کی تقویت اور شکوک کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دنوں تک قانون پڑھا تھا۔ قانونی کُتب کا اُن کے پاس اچھا ذخیرہ تھا۔ پہلے منوسمرتی کھولی۔ کچھ اطمینان نہ ہوا۔ متاکشرا کے فتاوے دیکھے۔ شکوک اور بھی زیادہ ہوئے۔ یاگیہ ولک نے بھی اس معاملے کی واضح طور پر کوئی تفسیر نہ کی۔ کسی وکیل سے مشورہ کرنا ضروری معلوم ہوا۔ وہ اتنے بے قرار ہورہے تھے کہ فوراً کپڑے پہن کر چلنے کو تیار ہوگئے۔ کہار سے کہا مایا کو لے جاکر بازار کی سیر کرا لا۔ کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ یاد آیا ابھی تار کا جواب تو دیا ہی نہیں۔ پھر کمرے میں گئے۔ تعزیت کا تار لکھا۔ اسی اثنا میں لالہ پربھا شنکر اور دیا شنکر آپہنچے۔ گیان شنکر کو اس وقت اُن کا آنا زہر سا لگا۔

پربھا شنکر نے کہا۔ میں نے تو ابھی سُنا۔ ہوش اُڑگئے۔ بے چارے رائے صاحب کو ضعیفی میں یہ بُرا صدمہ پہنچا۔ گھر ہی تباہ ہوگیا۔

گیان شنکر۔ کچھ نہ کہیے۔ کوئی نام لیوا بھی نہ رہا۔

پربھاشنکر ۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ بالکل بچہّ تھا۔ تمھاری شادی میں دیکھا تھا۔ چہرے سے نور برستا تھا۔ ایسا خوش رُو لڑکا میری نظر سے نہیں گزرا۔

گیان شنکر۔ انھیں وجوہ سے انسان کا ایشور پر اعتقاد نہیں رہتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ دُنیا ایک شیطانی کرشمہ ہے۔

دیاشنکر۔ اُن کی بڑی لڑکی کے تو کوئی لڑکا نہیں ہے نا؟
گیان شنکر نے لاپروائی سے کہا۔ نہیں۔
دیاشنکر۔ تب تو چاہیے مایاشنکر ہی وارث ہو۔

گیان شنکر نے اندازِ ملامت سے کہا۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ کہاں کون بات۔ کہاں کون بات۔ ایسی باتوں کا کیا موقع ہے؟

دیاشنکر بہت نادم ہوئے۔ گیان شنکر کو اب یہ توقف ناگوار گزرنے لگا۔ بائیسکل اُٹھائی اور دونوں آدمیوں کو برآمدے ہی میں چھوڑکر ڈاکٹر خان علی کے بنگلے کی طرف چلے جو نامی وکیل تھے۔ بیرسٹر صاحب کا بنگلہ خوب آراستہ تھا۔ وہ ہوا کھانے جارہے تھے۔ موٹر تیار تھا۔ لیکن موکل گلا نہ چھوڑتے تھے۔ وہ اپنے دفتر کے کمرے میں آرام کُرسی پر لیٹے ہوئے سگار پی رہے تھے۔اور اپنے ٹیریر کو گود میں لیے اُس کے سر پر تھپکیاں دیتے جاتے تھے۔ موکل دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باری باری سے ڈاکٹر صاحب کے روبرو آتے اور اپنی روٗداد بیان کرتے تھے۔ گیان شنکر کو بیٹھے بیٹھے آٹھ بج گئے۔ تب اُن کی باری آئی۔ اُنھوں نے اپنے معاملے کی حقیقت بیان کی۔ محرّر نے کُل واقعات درج کرلیے۔ اِس کی فیس پانچ روپۓ ہوئی۔ ڈاکٹرصاحب کے مشورے کی فیس پانچ سو روپے ہوئی۔ اُس پر شکوک رفع کرنے کے لیے دوسو روپے الگ مقرر تھے۔ محرّر نے اُنھیں کل بلایا۔ گیان شنکر کو کیا معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا وقت اتنا بیش قیمت ہے۔ دل میں پچھتاۓ کہ ناحق اس مخمصے میں پھنسا۔ محرّرصاحب کی فیس تو اسی وقت اداکردی اور گھرسے روپۓ لانے کا حیلہ کرکے وہاں سے نکل آئے۔ لیکن راستے میں سوچنے لگے اِن کی رائے ضرور صائب ہوتی ہوگی ورنہ اُس کی اتنی زیادہ قیمت کیوں ہوتی۔ شاید اِسی لیے کل بلایا ہے کہ خوب غور کرکے رائے دیں۔ اٹکل پچّو بات کہنی ہوتی تو اِسی وقت نہ کہہ دیتے۔ انگریزی تہذیب میں یہی تو صفت ہے کہ دام زیادہ لگتے ہیں پر چیز اچھی ملتی ہے۔ سینکڑوں نظیریں تلاش کرنی پڑیں گی۔ ہندو دھرم شاستروں کے بحرِ عمیق میں غوطے لگانے پڑیں گے۔ تب کہیں موتی ہاتھ آئے گا۔ روپۓ کا کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ اُس کا مُنہ دیکھنے سے کام نہ چلے گا۔ ایک بات تحقیق تو ہوجائے گی۔ یہ نہیں کہ میں تو مطمئن بیٹھا رہوں اور وہاں کوئی دوسرا ہی گُل کھِل جائے۔ مگر یہ پیشہ ہے بے نظیر۔ انسان چاہے تو سونے کا محل کھڑا کرلے۔ مجھے شامت سوار ہوئی کہ اس سے

متنفر ہو گیا۔ نہیں تو آج میری آمدنی کیا دو ہزار روپے ماہوار سے کم ہوتی۔ جب بڑے کاٹھ کے اُلو ہزاروں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں تو کیا میری ہی نہ چلتی۔ اس زمینداری کا بُرا ہو۔ اِس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

وہ گھر پر پہنچے تو نو بج چکے تھے۔ ودّیا اپنے کمرے میں تنہا اُداس پڑی ہوئی تھی۔ مہریاں اپنے کام دھندے میں مصروف تھیں۔ اور پڑوس کی عورتیں رخصت ہو گئی تھیں۔ گیان شنکر نے ودّیا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور رقت آمیز لہجے میں بولے۔ منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا!

ودّیاوتی نے روتے ہوئے کہا ان کی صورت ایک چھن کے لیے بھی آنکھوں سے نہیں اُترتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

گیان شنکر۔ میرا تو اب دنیا پر عقیدہ ہی نہیں رہا۔ عقلمندوں نے اُسے نقش برآب کہا ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ یہی جی میں آتا ہے کہ اس سے ترکِ تعلق کر کے کہیں نکل جاؤں۔

ودّیاوتی۔ کل شام کی گاڑی سے چلو۔ کچھ روپے لے چلنے ہوں گے۔ وہاں سولھویں کو دان کرنا ہوگا۔

گیان شنکر۔ ہاں ہاں ضرور۔ اب اُن کی روح کو تسکین دینے کا ہمارے پاس یہی تو ایک ذریعہ ہے۔

ودّیاوتی۔ اُنھیں گھوڑے کی سواری کا شوق تھا۔ میں اُن کے نام پر ایک گھوڑا دینا چاہتی ہوں۔

گیان شنکر۔ بہت اچھی بات ہے۔ دوڈھائی سو روپے میں گھوڑا مل جائے گا۔

ودّیاوتی نے ڈرتے ڈرتے یہ تجویزیں پیش کی تھیں۔ گیان شنکر نے اُنھیں بخوشی منظور کر کے اُسے چلا دیا۔

گیان شنکر اس اسراف کی تخفیف اس وقت بے موقع سمجھتے تھے۔ اب وہ ودّیاوتی سے بے اعتنائی اور بے رُخی نہ کر سکتے تھے۔

(۱۰)

رائے کملانند بہادر لکھنؤ کے ایک ممتاز رئیس اور تعلقہ دار تھے۔ سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے زائد تھی۔ امین آباد میں اُن کا عالی شان محل تھا۔ شہر میں اُن کی اور بھی کئی کوٹھیاں تھیں۔ پر وہ بیشتر نینی تال یا مسوری میں رہا کرتے تھے۔ اگرچہ اُن کی اہلیہ نے ان

کے ایام شباب ہی میں دائمی مفارقت اختیار کی تھی۔ پر اُنھوں نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ اعزہ اور احباب نے بہتیرا اصرار کیا پر وہ عقد ثانی کی اُلجھن میں نہ پڑے۔ وہ یہی جواب دیتے تھے کہ شادی کا مقصد اولاد ہے اور جب پرماتما نے مجھے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں عطا فرمائی ہیں تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں محض نفس پرستی کے لیے شادی کرنا انتہا درجے کی شرمناک بات سمجھتا ہوں۔ اُنھوں نے اپنی بڑی لڑکی گائتری کی شادی گورکھپور کے ایک بڑے رئیس سے کی۔ اُس تقریبِ سعید میں لاکھوں روپے صرف کیے۔ لیکن جب شادی کے دو ہی سال بعد گائتری بیوہ ہوگئی،(اُس کے شوہر کو خاندان ہی کے کسی آدمی نے اغواء نفس سے زہر دے دیا) تو رائے صاحب نے عہد کیا کہ وِدّیاوتی کی شادی کسی متوسط خاندان میں کروں گا۔ جہاں زندگی میں اتنے زہریلے کانٹے نہ ہوں۔ یہی باعث تھا کہ گیان شنکر کو یہ عزّت حاصل ہوئی۔ رامانند مرحوم ابھی تک کنوارے ہی تھے۔ اُن کا سن بیس سال سے متجاوز ہوگیا تھا۔ پر رائے صاحب کو اب تک اُن کی شادی کی فکر نہ تھی۔ وہ اُن کے ذہنی اور جسمانی نشوونما کو مانع اسباب سے بے اثر رکھنا چاہتے تھے۔ پر افسوس! رامانند گھوڑدوڑ میں شریک ہونے کے لیے پونا گئے ہوئے تھے۔ وہاں گھوڑے سے گر پڑے۔ اعضائے رئیسہ کو صدمہ پہنچا۔ لکھنؤ آنے کے دو ہی دن بعد رحلت کی۔ رائے صاحب کی ساری تمنائیں خاک میں مل گئیں۔ اُمیدوں کا چراغ گل ہوگیا۔

مگر رائے صاحب اُن نفوس میں نہ تھے جنھیں سانحات اور آلامِ روزگار زندگی سے بیزار کردیتے ہیں۔ اِسے چاہے تسلیم کہیے یا توکّل۔ صبر کہیے یا استقلال۔ اُن کا غم دو ہی چار دنوں میں مشاغلِ زندگی کی مسلسل روانی میں فنا ہوگیا۔

رائے صاحب ہمہ گیر مذاق کے آدمی تھے۔ گھوڑدوڑ اور شکار، سرود اور ستار، ادبیات اور سیاسیات سے اُنھیں یکساں دلچسپی تھی۔ سن ساٹھ سے متجاوز تھا لیکن اِن مشغلوں میں اُنھیں شباب کا سا اِنہماک تھا۔ اصطبل میں دس بارہ چُنے ہوئے گھوڑے تھے۔ کئی مختلف فیشن کی سواریاں، ایک موٹرکار دو ہاتھی اور مختلف قسموں کے درجنوں کُتّے تھے۔ ان کے علاوہ باز۔ شکرے۔ جُرّے۔ شاہین وغیرہ کا ایک ہوائی دستہ بھی تھا۔ ان کے کمرے میں مختلف قسم کی تمنچوں، نیزوں اور بندوقوں کو دیکھ کر اسلحہ خانے کا گمان ہوتا تھا۔ گھوڑدوڑ میں وہ اچھے اچھے شہسواروں سے پالا مارتے تھے۔ شکار میں اُن کا نشانہ بے خطا پڑتا تھا۔ پولو اور ٹینس کے میدان میں اُن کی تیزی اور چابکدستی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اور ان مشاغل میں اُنھیں

جتنی مہارت تھی اتنی ہی فنونِ لطیفہ میں بھی تھی۔ شام کے وقت جب وہ ستار لے کر بیٹھتے تو اُن کا کمال دیکھ کر اُستادوں کے چھکّے چھوٹتے تھے۔ گلا بھی نورانی تھا۔ نغمے کے رموز و نکات کے ماہر تھے۔ اُن کے دُھرپد کی الاپ سُن کر اچھے اچھے کلاونت سر دُھنتے تھے۔ شعر و سخن میں اُن کی بلند پروازیاں شعرائے باکمال سے ٹکر کھاتی تھیں۔ ہندی، اُردو، فارسی، سنسکرت، انگریزی، فرنچ سبھی زبانوں کے عالم تھے۔ اور ہر ایک زبان میں بلاتکلف اظہارِ خیال کرسکتے تھے۔ حافظہ غضب کا تھا۔ اساتذۂ سلف کے ہزاروں اشعار دوہے، کبت، پد حفظ تھے۔ اور تقریروں میں اُن کا نہایت برجستہ استعمال کرتے تھے۔ بلا کے حاضرجواب اور ظریف۔ ادھر دس بارہ سال سے سیاسیات میں بھی دخیل ہوگئے تھے۔ صوبے کے کونسل ہال میں اُن کی جگہ صفِ اوّل میں تھی۔ اور ان کی رائے ہمیشہ صائب ہوتی تھی۔ وہ موقع پرست یا زمانہ ساز نہ تھے۔ قوم یا گورنمنٹ کے غلام نہ بن کر ہمیشہ اپنی قوتِ فیصلہ سے کام لیتے تھے۔ اور اسی لیے کونسل میں اُن کی خاص عزّت تھی۔ اگرچہ وہ تقریریں بہت کم کرتے تھے اور دارالشعرا کے باہر اُن کی آواز بہت کم سُنائی دیتی تھی، مگر جب بولتے تھے تو اچھا ہی بولتے تھے۔ الفاظ چاہے رنگین نہ ہوں، مگر خیال سے پُر ہوتے تھے۔ گیان شنکر کو اُن کے ذہن و ادراک پر حیرت ہوتی تھی۔ اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو کسی ایک شخص میں اتنے کمالات کا ذکر سُن کر وہ کبھی باور نہ کرتے۔ وہ اُس کے قبل بھی دوبار رائے صاحب سے مِل چکے تھے۔ مگر ان موقعوں پر مراسم اور ظاہرداریوں میں اُنھیں اُن کے جوہر نہ نظر آئے تھے۔ اب کی ان کی صحبت کا موقع ملا تو آنکھیں کُھل گئیں۔ وہ خودپروری اور خودنمائی جو اُن میں راسخ ہوگئی تھی۔ ان کمالات کے مقابلے میں حقیر اور ناچیز معلوم ہونے لگی۔ پہلے دو ہفتوں تک تو ان پر عقیدت کا نشہ سا رہا۔ رائے صاحب کا ہر ایک قول اور فعل انھیں میں صواب معلوم ہوتا تھا۔ کلب میں، پولو کے میدان میں، مجلس احباب میں، سیاسیات میں۔ قدم قدم پر اُنھیں اپنی خامی نظر آتی تھی۔ اور ہر موقع پر اُنھیں ندامت اُٹھانی پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ ادبیات اور فلسفے میں بھی جس پر اُنھیں ناز تھا رائے صاحب کے خیالات پر غور کرنے کے لیے اُنھیں کافی سامان مل جاتا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ رائے صاحب اتنے جانکاہ اور تازہ بارِ غم کے نیچے کیوں کر سیدھے کھڑے رہ سکتے تھے۔ اُن کے مشاغلِ تفریح پر ان صدمات کا مطلق اثر نہ نظر آتا تھا۔

مگر رفتہ رفتہ گیان شنکر کو رائے صاحب کی زندہ دلی ناگوار معلوم ہونے لگی۔ اُن کے خیال میں رائے صاحب کو اب مکروہات دنیا سے کنارہ کش ہوجانا چاہیے تھا۔ ساری عمر اِن دلچسپیوں میں غرق رہنے کے بعد اب اُن سے طبیعت کو سیر ہوجانا چاہیے۔ اس بوالہوسی کی کوئی انتہا ہے! یہ استقلال ہرگز نہیں ہے۔ استقلال کبھی زندہ دلی کی صورت نہیں اختیار کرتا۔ وہ دل پر ایک مایوسانہ بیزاری کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سوزِدل ہے جس سے آنسو تک خشک ہوجاتے ہیں۔ وہ غم کی انتہا ہے۔ کوئی بندۂ رضا بھی جوان بیٹے کا داغ دل پر رکھتے ہوئے اتنا وارفتہ نہیں ہوسکتا۔ یوں زندگی کا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ صریح تن پروری ہے۔ یہ جذبات کا فقدان ہے اور دل کی موت۔ خودنمائی کے ولولے نے حسیات اور جذباتِ لطیف کو فنا کردیا ہے۔ گیان شنکر کو اب رائے صاحب کی ایک ایک بات سے رعونت کی جھلک نظر آتی۔ وہ اُن کے ہرایک فعل کو حاسدانہ تنقید کی نگاہ سے دیکھتے۔

مگر ایک مہینہ گزرجانے پر بھی گیان شنکر نے کبھی بنارس جانے کا ذکر نہیں کیا۔ اگرچہ وِدّیاوتی کا اُن کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہونا اُن کے یہاں پڑے رہنے کا اچھا بہانہ تھا۔ پر فی الواقع اس کا ایک دوسرا ہی سبب تھا جسے شاید دل میں بھی تسلیم کرنے کی اُنھیں جُرأت نہ ہوتی تھی۔ گائتری کی شیریں اداؤں اور لطف انگیز باتوں نے اُن کے دل پر اثر کرنا شروع کردیا تھا۔ اُس کا بشاش، شگفتہ حُسن، چُپکے چُپکے ان کے دل پر حاوی ہوتا جاتا تھا۔ اور وہ نتائج سے بے خبر، پروانہ صفت، اس شمع کے قریب بڑھتے چلے آتے تھے۔ اُنھیں گائتری مجسم دعوت اور التجا معلوم ہوتی تھی اور وہ خیال اُن کی شیفتگی کو اور بھی مشتعل کرتا رہتا تھا۔ گھر میں کسی بڑی بوڑھی عورت کے نہ ہونے کے باعث اُن کی مہمان نوازی کا فرض گائتری ہی ادا کرتی تھی اور ایسے خلوص و محبت کے ساتھ کہ گیان شنکر کو اُس میں پیغام کی لذّت اور شیرینی محسوس ہوتی تھی۔ اُنھیں اب خیال میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ پُرمزہ تخیلات دلآویز صورتوں میں نگاہ کے سامنے رقص کیا کرتے تھے۔ آنے والی بہاروں کا خواب شیریں دل کو مسرور کردیتا تھا۔ انھیں زندگی کبھی اتنی پُرلطف نہ معلوم ہوئی تھی۔ اُن کے جذبات میں کبھی ایسا تموجِ شیریں نہ ہوا تھا۔ اور وہ عالمِ خیال میں محض اس صحبت کا لطف نہیں اُس ثروت کا بھی لطف اُٹھاتے تھے، جو اس صحبت کا ملزوم تھی۔ کاش وہ مینارِ عروج جس کی دو منزلیں تیار ہوچکی تھیں اس کنگرہ سے آراستہ ہوجائے تو اُس کی رفعت

آنکھوں کے سامنے کیسا وسیع منظر پیش کرے گی ۔ کتنا دل فریب اور خوش نما!

گیان شنکر ضبطِ نفس کے قائل نہ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ضبط اور احتیاط انسان کے خلقی نشوونما کا مانع ہے۔ وہی پودا تناور درخت ہو سکتا ہے۔ جو صبا اور سموم، مینہ اور اولے، خشکی اور تری میں یکساں کھڑا رہے۔ اس کے لیے سموم اتنی ہی ضروری ہے جتنی صبا۔ خشکی اتنی ہی حیات پرور ہے جتنی تری۔ اسی طرح تکمیلِ نفس کے لیے بھی نیرنگیٔ تجربات لازمی ہے۔ افلاس کو مارِ سیاہ کیوں سمجھیں۔ تکمیل نفس کے لیے یہ تمول سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ یہ انسان میں ارادۂ مضبوط اور عزمِ کامل، ہمدردی اور دل سوزی پیدا کرتا ہے۔ مختلف تجربات سے سیرت کے مختلف پہلوؤں کی تربیت اور تکمیل ہوتی ہے۔ یہ قانون فطرت ہے۔ اس میں مصنوعی بندشوں سے رخنہ ڈالنا سیرت کو ناہموار بناتا ہے۔ یہاں تک کہ غصہ اور حسد، کذب و دغا میں بھی بیش بہا تعلیمی اثرات پوشیدہ رہتے ہیں۔ وہ انسان جس نے ہمیشہ باغ و چمن کا لطف اُٹھایا ہو۔ اور کبھی تنگ و تاریک کوچوں کی سیر نہ کی ہو، جس نے ہمیشہ نغمات شیریں سُنے ہوں پر صدائے بیکس اور گریہ معذور سے نا آشنا ہو، ادھورا، ناقص اور جاہل ہے۔ جب تک ستار کے سبھی تار چوٹ نہ کھائیں سُریلی آواز نہیں نکل سکتی ۔ اخلاقی بندشوں کے دن اب نہیں رہے۔ یہ آزاد تعلیم کا دور ہے۔ ترک اور توکل اس زمانے کے لیے موزوں تھا جب لوگ دنیا کو بے ثبات، چندروزہ۔ فانی سمجھتے تھے، یہ ترقی کا دور ہے۔ ان خیالات نے گیان شنکر کے دل سے نیک و بد کا امتیاز اُٹھا دیا تھا۔ ہاں حالات گردوپیش اور خاندانی وجاہت کا اتنا اثر باقی تھا کہ وہ رسوائی اور خفت سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ یہ بھی اُن کے خیال میں اخلاقی کمزوری تھی۔

گائتری ان عورتوں میں نہ تھی جن کے لیے مردوں کا دل کھلا ہوا ورق ہوتا ہے۔ اس کا شوہر ایک وارفتہ رئیس تھا۔ مگر گائتری کو اُس پر کبھی شبہ نہیں ہوا۔ اس کے نمائشی جذبات کی تہ تک کبھی نہیں پہنچی۔ اور حالانکہ اُسے مرے ہوئے تین سال گزر چکے تھے پر وہ ابھی تک روحانی عقیدت سے اس کی یاد کی پرستش کرتی تھی۔ اُس کا بے لوث دل محبت کی گھاتوں سے بیگانہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی خودنمائی اُس کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو تھی۔ وہ اپنے تئیں اس سے کہیں زیادہ نکتہ فہم سمجھتی تھی جتنی وہ فی الواقع تھی۔ اُس کے جذبات اور خیالات تہ میں بیٹھنے والے سنگریزے نہیں، بلکہ سطح پر تیرنے والے بلبلے

تھے۔ گیان شنکر ایک خوش رُو، خوش قامت، خوش بیان آدمی تھے۔ گائتری ان اوصاف کی بے تکلفانہ قدر کرتی تھی۔ وہ اُن سے مُسکراکر کہتی تمھاری زبان میں جادو ہے۔ تمھاری باتوں سے کبھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ وہ گیان شنکر کے روبرو وِدّیاوتی سے مسکراکر کہتی ایسا دولھا پاکر بھی تو اپنے بھاگ کو نہیں سراہتی؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ تو سچے دل سے ان کی سردمہری کی شکایت کرتی ہے۔ اگرچہ گیان شنکر سے اُس کی عمر دوہی چار مہینے زیادہ تھی پر چونکہ وہ اُس کی چھوٹی بہن کے شوہر تھے، اس لیے وہ رشتے میں اس کے چھوٹے بھائی ہوتے تھے اور وہ اُنھیں چھوٹے بھائی ہی کی طرح پیار کرتی تھی۔ وہ اُن کے لیے روزانہ خود پُر تکلف کھانے بناتی۔ اور دن میں کئی بار ناشتہ کرنے کے لیے گھر میں بُلاتی۔ اُسے علمی اور مذہبی اذکار سے شوق تھا۔ گیان شنکر سے اس قسم کے تذکرے کرنے اور سُننے میں اُسے دلی مُسرّت ہوتی تھی۔ وہ رشتے کے رواجی اعتبار سے اُن سے مذاق بھی کرتی تھی۔ لطیف کنایات میں اُن پر چوٹیں کرتی اور ہنستی۔ مُنہ لٹکاکر اُداس اور مغموم بیٹھنا اُس کی عادت نہ تھی۔ وہ ہنس مکھ، خلیق، مہرپرور، بذلہ سنج نازنین تھی جس کے دل میں راز اور رموز کی مطلق گنجائش نہ تھی۔

مگر اُس کی یہ سادہ بے تکلفیاں اور خاطرداریاں گیان شنکر کی کثیف نگاہوں میں منحرف ہوجاتی تھیں۔ سادگی میں رنگ اور راستی میں کجی نظر آنے لگتی تھی۔ اُنھیں گائتری کنایوں میں کہتی ہوئی معلوم ہوتی، آؤ اور اس گوشۂ محزوں کو آباد کرو۔ اگرچہ اس نذر کو قبول کرنے کے لیے وہ بے تاب ہوجاتے تھے مگر خود اُن کے دل نے کبھی گائتری کو یہ دعوت نہیں دی۔ کبھی یہ نذر اُس کے سامنے نہیں پیش کی۔ اُنھیں کلب میں کبھی کبھی دیر ہوجاتی۔ وہ تاش کی ادھوری بازی نہ چھوڑ سکتے تھے۔ مگر گھر چلتے تو یہ فکر ہوتی کہ گائتری ضرور بے چین ہورہی ہوگی۔ انھیں خود کوئی اضطراب نہ ہوتا تھا۔ آگ گائتری کے سینے میں جلتی تھی۔ اُنھیں صرف اُس میں ہاتھ سینکنا تھا۔ محبت کو شعرا اور صوفیوں نے چاہے جو کچھ سمجھا ہو مگر گیان شنکر کے دل میں وہ محض ایک ولولہ تھی۔ محض ایک پُرزور خواہش۔ وہ خواہش جو کسی بچے کو پھول توڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ جو کسی شکاری کو شکار میں، کسی کھلاڑی کو بازی کی جیت میں اُکساتی اور گرماتی ہے۔ خواہش اپنی طرف کھینچتی ہے محبت خود کھنچ جاتی ہے۔ خواہش خودپروری ہے۔ محبت خود فراموشی۔ خواہش میں عمل ہے۔ محبت

میں انتظار۔ گیان شنکر کے دل میں یہی جذبۂ تسخیر ایک شعلے کی طرح دہک رہا تھا۔

یہی بھولاپن گائتری کے حق میں روزبروز زہر قاتل ثابت ہورہاتھا۔ کوئی بھول کر زہر کھالے تو اُس کا اثر کچھ کم نہ ہوگا۔ گیان شنکر کو باہر سے آنے میں دیر ہوتی تو وہ بے چین ہونے لگتی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا۔ بالاخانے پر جاکر اُن کی راہ دیکھنے لگتی۔ وہ پہلے وِدیاوتی کے سامنے ہنس ہنس کر اُن سے باتیں کرتی تھی۔ کبھی تنہا ملنے کا اتفاق ہوجاتا تو اُسے کوئی بات ہی نہ سُوجھتی۔ اب معاملہ دگرگوں تھا۔ اُس کی باتیں اب خلوت کی تلاش کیا کرتیں۔ وِدیاوتی کی موجودگی دونوں کی زبان پر مہر لگا دیتی تھی۔ اُنھیں اب محض مذہبی اور مُلکی مذاکرے سے آسودگی نہ ہوتی تھی۔ ان کی گفتگو کا رُخ گھوم گھام کر زندگی کے نازک مسائل کی طرف ہوجاتا تھا۔ مرد و زن کے تعلقات پر بحث کرتے کرتے وہ کبھی کبھی ایسے پیچیدہ مقامات پر آجاتے جہاں ایک ماہ قبل آنے کی اُنھیں کبھی جرأت نہ ہوتی۔ گائتری شرم سے سر جھکا لیتی۔

ایک روز شام کے وقت گائتری پائیں باغ میں آرام کُرسی پر لیٹی ہوئی ایک خط پڑھ رہی تھی جو اسی ڈاک سے آیاتھا۔ لو کا چلنا بند ہوگیا تھا مگر ہوا میں حرارت باقی تھی۔ ہر ایک چیز سے شعلے سے نکلتے معلوم ہوتے تھے۔ وہ خط کو اُٹھاتی تھی اور پھر گرمی سے بے چین ہوکر رکھ دیتی تھی۔ آخر اُس نے ایک کہاری کو پنکھا جھلنے کے لیے بلایا اور تب خط کو پڑھنے لگی۔ اس کے مختارِ عام نے گورکھپور سے لکھا تھا۔ حضور جلد تشریف لائیں۔ یہاں کئی ایسے معاملات درپیش ہیں جو حضور سے مشورہ کیے بغیر طے نہیں ہوسکتے۔ ہری پور کے علاقے میں بالکل بارش نہیں ہوئی۔ یہ آپ کو معلوم ہے وہاں کے اسامیوں سے لگان کی وصولی میں سخت دقتیں پیش آرہی ہیں۔ وہ سب کے سب معافی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ میں نے حاکم ضلع کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیاتھا پر اُس کا کچھ نتیجہ ظہور میں نہیں آیا۔ حضور آئیں اور ممکن ہو تو جناب رائے صاحب بہادر کو بھی تکلیف دیں۔ یقین ہے کہ جناب ممدوح کا رسوخ اور وقار محال کو ممکن بنا دے گا۔ اگر معافی نہ ہوئی تو فساد کا اندیشہ ہے۔ اس لیے حضور کا حاکم ضلع سے ملنا نہایت ضروری ہے۔

گائتری نے خط زمین پر رکھ دیا اور سوچنے لگی۔ یہ زمینداری کیا ہے بلائے جان ہے۔ مہینے دو مہینے کے لیے بھی کہیں چلی جاؤں تو ہائے وائے مچنے لگتی ہے۔ اسامیوں میں سرکشی

کا زور ہے۔ پہلے یہ کیفیت نہ تھی۔ سرکار کو اُن پر سخت نگاہ رکھنی چاہیے۔ ذرا بھی شہ ملی اور یہ قابو سے باہر ہوئے۔ اگر اس علاقے میں معافی کا اعلان ہوگیا تو میرا کئی ہزار کا نقصان ہوجائے گا۔ مانا مجھے اُس علاقے کی مالگزاری نہ دینی پڑے گی مگر اور بھی تو کتنے ہی روپئے جُدے جُدے ناموں سے دینے پڑتے ہیں۔ وہ کس کے گھرسے آئیں گے؟

لیکن میرا جی وہاں کیسے لگے گا؟ یہ باتیں وہاں کہاں سُننے کو ملیں گی؟ اکیلے پڑے پڑے جی اکتایا کرے گا۔ جب تک گیان شنکر یہاں رہیں گے تب تک تو میں گورکھپور جاتی نہیں۔ ہاں جب وہ چلے جائیں گے تو مجبوری ہے۔ کچھ نقصان ہی تو ہوگا۔ بلا سے ۔ زندگی کے دن تو لطف سے کٹ رہے ہیں۔ دھرم اور گیان کے چرچے تو سننے میں آتے ہیں۔ کل وہ مجھ سے چڑھ گئے ہوں گے۔ لیکن میرا دل تو یہ کسی طرح قبول نہیں کرتا کہ شادی محض جسمانی تعلق اور مجلسی ضرورت ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ انسان کا جسم کئی سالوں میں بالکل تبدیل ہوجاتا ہے۔ شاید آٹھ سال کہتے تھے۔ اگر شادی محض جسمانی تعلق ہوتو کوئی شادی اس سے زیادہ مدت تک قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ آٹھ سال کے بعد میاں بیوی کا تعلق غائب ہوجاتا ہے۔ ایک کو دوسرے پر کوئی استحقاق نہیں رہتا۔ آج پھر یہی مسئلہ چھیڑوں گی۔ اس عقدے کو حل کرنا چاہیے۔ لو وہ خود ہی آگئے۔ کہیے بابوجی۔ کہیں جانے کا قصد ہے کیا؟

گیان شنکر۔ آج یہاں اِمپریل تھیٹریکل کمپنی کا تماشہ ہونے والا ہے۔ آپ سے پوچھنے آیاہوں کہ آپ کے لئے بھی جگہ رِزرو کراتا آؤں۔ آج بڑا ہجوم ہوگا۔ پہلا دن ہے۔ ممکن ہے جگہ نہ مل سکے۔

گائتری ۔ ودّیا سے پوچھا؟ جائے گی؟

گیان شنکر۔ وہ تو کہتی ہے۔ بچّے کو لے کر جانے میں تکلیف ہوگی۔ میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

گائتری۔ تو اکیلے تو مجھے بھی لطف نہ آئے گا۔

گیان شنکر ۔ آپ نہ جائیں گی تو میں بھی نہ جاؤں گا۔

گائتری ۔ تب تو میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ مجھے آپ کی باتوں میں تھیٹر سے زیادہ لطف آتا ہے۔ آیئے بیٹھیے۔ کل کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ آپ کہہ رہے تھے کہ عورتوں

میں برقی کشش مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ پر آپ نے اس کا کوئی سبب نہ بتلایا تھا۔
گیان شنکر۔ اس کا سبب یہی ہے کہ عورتوں کے مشاغلِ زندگی محدود ہوتے ہیں اور وہ ایک خیال پر اپنی ساری برقی قوت جمع کرسکتی ہیں۔ اِس کے برعکس مَردوں کا دائرۂ زندگی وسیع ہوتا ہے اور اُن کی قوت منتشر ہوجاتی ہے۔
گائتری ۔ لیکن ایسا ہوتا تو مردوں کو عورتوں کا مطیع رہنا چاہیے تھا۔ وہ ان پر حکومت کیونکر کرتے؟
گیان شنکر۔ تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مرد عورتوں پر حکومت کرتے ہیں؟ حقیقت کچھ اور ہے۔ مرد ہمیشہ عورتوں کے مطیع ہوتے ہیں۔ عورتیں اُن کی قسمت کی مالک ہوتی ہیں۔ جسم پر اُن کی حکومت ہو۔ مگر قلب پر اِنھیں کا راج ہوتا ہے۔
گائتری۔ تو پھر مرد اتنے بے وفا کیوں ہوجاتے ہیں؟
گیان شنکر۔ مردوں پر بے وفائی کا الزام رکھنا بے انصافی ہے۔ وہ اُس وقت تک مُنہ نہیں پھیرسکتے جب تک یا تو خود عورت اُن پر سے اپنی حکومت نہ اُٹھا لے اور یا اُن پر کسی دوسری عورت کی زیادہ پُرزور کشش اپنا عمل نہ کرے۔
گائتری ۔ (ہنس کر) آپ نے تو سارا الزام عورتوں ہی کے سر رکھ دیا۔
گیان شنکر نے دلیرانہ انداز سے جواب دیا ظلم تو وہ کرتی ہیں۔ فریاد کون سُنے گا؟
اسی اثنا میں وِدّیاوتی مایا کو گود میں لیے آکر کھڑی ہوگئی۔ مایا چار برس کا ہوچکا تھا۔ پر ابھی تک کوئی دوسرا بچہّ نہ ہونے کے باعث شیر خوار بنا ہواتھا۔
گائتری نے پوچھا۔ کیوں وِدّیا آج تھیٹر دیکھنے چلتی ہو؟
وِدّیا۔ (مسکراکر) کوئی مجبور کرے گا تو چلی چلوں گی۔ ورنہ میرا جی نہیں چاہتا۔
گیان۔ میں جبر نہیں کرتا۔
وِدّیا۔ تو میں بھی نہیں جاتی۔
گائتری ۔ میں مجبور کرتی ہوں تمھیں چلنا پڑے گا۔ بابوجی آپ جاکے جگہیں رِزرو کرا آئیے۔
نو بجے رات کو تینوں آدمی فٹن پر بیٹھ کر تھیٹر چلے۔ مایا بھی ساتھ تھا۔ فٹن کچھ دور چلی تو وہ پانی پانی چلاّنے لگا۔ گیان شنکر نے وِدّیا سے کہا۔ لڑکے کو لے کر چلی تھیں تو

پانی کی ایک صراحی کیوں نہ رکھ لی؟

وِدّیا۔ کیا جانتی تھی کہ گھر سے نکلتے ہی اِسے پانی کی چاٹ لگ جائے گی۔

گیان۔ پاندان رکھنا تو نہ بھول گئیں؟

وِدّیا۔ اسی سے تو کہتی تھی کہ میں نہ چلوں گی۔ بہن نے نہ مانا۔

گائتری ۔ تھیٹر کے احاطے میں برف پانی سب کچھ مل جائے گا۔

مایا یہ سُن کر اور بھی بے قرار ہوا۔ رورو کر دنیا سر پر اُٹھالی۔ گیان شنکر نے اُسے شہ دی۔ اور بھی گلہ پھاڑ کر چلّانے لگا۔

گیان ۔ جب ابھی سے یہ حال ہے تو دو بجے رات تک نہ جانے کیا ہوگا۔

گائتری ۔ جاگتا تھوڑے ہی رہے گا۔

گیان ۔ گود میں آرام سے تو سوسکے گا نہیں۔ رہ رہ کر چونکے گا اور روئے گا۔ سارے تماشائی پریشان ہوں گے۔لوگ کہیں گے یہ پُچھلّا اچھا ساتھ میں لائے۔

وِدّیا ۔ کوچ بان سے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ گاڑی لوٹا دے۔ میں نہ جاؤں گی۔

گیان۔ یہ سب باتیں پہلے ہی سوچ لینی چاہیے تھیں۔ گاڑی یہاں سے لوٹے گی تو پھر آتے آتے دس بج جائیں گے۔ آدھا تماشہ ہی غائب ہو جائے گا۔ وہاں پہنچ کر جی چاہے تو تماشے کا لطف اُٹھانا۔ مایا اِسی گاڑی میں پڑا رہے گا۔ یا مناسب سمجھنا تو لوٹ آنا۔

گائتری۔ وہاں تک جاکر پھر کیا لوٹے گی۔

گیان۔ میں نے تو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

گائتری۔ کیا وہاں کوئی آرام کرسی نہ مل جائے گی؟

وِدّیا۔ اس دردِ سر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں لوٹ آؤں گی۔ میرا دل تھیٹر دیکھنے کے لیے بے قرار نہیں تھا۔ میں تو صرف تمھاری خاطر سے چلی آئی تھی۔

تھیٹر کا پنڈال آگیا۔ خوب ہجوم تھا۔ گیان شنکر اُتر پڑے۔ گائتری نے وِدّیا سے اُترنے کو کہا پھر وہ بہت اصرار کرنے پر بھی گاڑی سے نہ اُتری۔ کوچ بان کو پانی لانے بھیجا۔ اتنے میں گیان شنکر لپکے ہوئے آئے اور بولے بھابی جلدی کیجیے۔ گھنٹی ہوگئی۔ تماشا شروع ہونے والا ہے۔ جب تک مایا پانی پیتا ہے آپ چل کر بیٹھ جائیں۔ ایسا نہ ہو آپ کی جگہ پر کوئی اور صاحب تصرف کرلیں۔

یہ کہہ کر وہ گائتری کو لیے ہوئے پنڈال میں گھس گئے۔ درجہ اوّل کے مردانے اور زنانے حصّوں کے درمیان صرف ایک چق کا پردہ تھا۔ چق کے باہر کی طرف گیان شنکر بیٹھے۔ اندر کی طرف گائتری۔ یہی دونوں جگہیں اُنھوں نے رِزرو کروا رکھی تھیں۔

گائتری فٹن سے اُتر کر عجلت میں گیان شنکر کے ساتھ چلی آئی تھی۔ اُسے یقین تھا وِدّیا آتی ہوگی۔ لیکن جب اُسے بیٹھے کئی منٹ ہوگئے۔ وِدّیا نہ نظر آئی اور بالآخر گیان شنکر نے آکر کہا وہ چلی گئی تو اُسے بہت افسوس ہوا۔ سمجھ گئی کہ وِدّیا روٹھ کر چلی گئی۔ اپنے دل میں مجھے بے مروّت، خود غرض، کم ظرف سمجھ رہی ہوگی۔ مجھے بھی اُسی کے ساتھ لوٹ جانا چاہیے تھا۔ اُس کے ساتھ تماشا دیکھنے میں چنداں ہرج نہیں تھا۔ لوگوں کو خیال ہوتا کہ میں اُسی کی خاطر سے چلی آئی ہوں۔ مگر اُس کے لوٹ جانے پر میرا تماشا دیکھنا بے موقع ہے۔ گھر کی لونڈیاں اور مہریاں تک ہنسیں گی اور اُن کا ہنسنا جائز ہے۔ میرے لیے اب تیرتھ جاترا، گنگا اشنان، پوجا پاٹ، دان اور برت ہے۔ یہ سیر تماشے سہاگنوں کے لیے ہیں۔ مجھے ضرور واپس ہونا چاہیے۔ لیکن بابوجی سے اتنی جلد چلنے کو کہوں گی۔ تو وہ مجھ پر ضرور جھنجھلائیں گے اور پچھتائیں گے کہ ایسی متلون مزاج عورت کے ساتھ ناحق آئے۔ بُری پھنسی۔ مجھے کچھ دیر تک یہاں ضرور بیٹھنا پڑے گا۔

یہ فیصلہ کرکے وہ کُرسی پر بیٹھی مگر جب گردوپیش نگاہ گئی تو اُسے وہاں پل بھر بیٹھنا بھی دشوار ہوگیا۔ اُس کے آگے پیچھے اغل بغل ماہرویان دریچہ و بام کا جمگھٹ تھا۔ ایک سے ایک حسین، ایک سے ایک رنگین۔ چاروں طرف سے خس و حنا کی خوشبو آرہی تھی۔ اُن کی آرائش اور نفاست، اُن کا غرور اور تمکنت، اُن کی خوش ادائیاں، اُن کی شوخ نگاہیاں، سب گائتری کو مکروہ اور گھنونی معلوم ہوتی تھیں۔ اُسے اپنے حُسن و ادا پر ناز تھا۔ پر اس بحرِ حُسن میں اُس کی ہستی ایک ناچیز قطرے سے زیادہ نہ تھی۔ اپنی سبکی کا احساس اُس کے غرور کو اور بھی مشتعل کرنے لگا۔ یہ عورتیں کتنی ڈھیٹھ، کتنی بے غیرت ہیں۔ اِس کی شکایت نہیں کہ اُنھوں نے کیوں اتنا ذلیل شیوہ اختیار کیا۔ اتفاقاتِ روزگار سے انسان کو مفر نہیں۔ مگر یہ غرور کیوں؟ یہ اٹھلاتی کس بوتے پر ہیں؟ معلوم ہوتا ہے سب کی سب نواب زادیاں ہیں۔ اِنھیں تو شرم سے سر جھکائے رہنا چاہیے تھا۔ اُن کی ایک ایک حرکت سے خفت اور ندامت ٹپکنی چاہیے تھی۔ مگر یہ ایسی مگن ہیں گویا دُنیا میں اِن سے زیادہ خوش

نصیب اور کوئی نہیں۔ گناہ ایک قابلِ رحم چیز ہے۔ انسانی معذوری کا مظہر۔ اُس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ لیکن گناہ کے ساتھ بے حیائی اور خرمستی ایک شیطانی انحراف ہے۔ انسانی ہمدردی کے دائرے سے خارج۔ قابلِ نفرت۔

گائتری اب وہاں ایک لمحہ بھی نہ بیٹھ سکی۔ گیان شنکر سے بولی۔ میں باہر جاتی ہوں۔ یہاں نہیں بیٹھا جاتا۔ مجھے گھر پہنچا دیجیے۔ اُسے اندیشہ تھا کہ گیان شنکر وہاں ٹھہرنے کے لیے اصرار کریں گے اور چلیں گے بھی تو ترش ہوکر۔ پر یہ اندیشہ غلط نکلا۔

گیان شنکر بڑی خوشی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک بگھی کرایہ کی اور گھر چلے۔

گائتری نے اتنی جلد لوٹ آنے کے لیے معذرت کی۔ پھر حسینانِ عصمت فروش کی بے شرمی کا ذکر کیا۔ پر گیان شنکر نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُنھوں نے آج دل میں سفاکانہ مباذرت کا عزم کرلیا تھا۔ اور اِس وقت اُسے عمل میں لانے کے لیے اپنی طاقتوں کو اس طرح مجتمع کررہے تھے گویا کسی غار میں کودنے جارہے ہوں۔ اُن کی فضائے دل جذبات کی کالی گھٹاؤں سے سیاہ ہورہی تھی، جو ادھر مہینوں سے رفتہ رفتہ جمع ہورہی تھیں۔ ان کی خموشی آغازِ طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ اُنھیں اِسی موقع کی تلاش تھی۔ پہلے ہی سے اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب تک اُن کی پیش بندیاں حسب خواہش پوری ہوتی جاتی تھیں۔ علامتوں سے گائتری بھی ان تجویزوں میں اُن کی شریک معلوم ہوتی تھی۔ اس کا تھیٹر دیکھنے پر راضی ہوجانا، وِدّیاوتی کے ساتھ گھر نہ لوٹنا، اُن کے ساتھ اکیلے بگھی میں بیٹھنا، پری کے شیشے میں اُتر آنے کا صاف ثبوت تھا۔ گیان شنکر کو یہ باتیں پیغامِ رضا معلوم ہوئیں۔ شاید اُنھیں موقع دینے ہی کے لیے گائتری اتنی جلدی لوٹی تھی۔ کیونکہ گھر کی فٹن پر لوٹنے سے کام میں خلل پڑنے کا خوف تھا۔ ایسے موافق حالات میں تامل و توقف کرنا ان کے خیال میں کمزوری رہتی۔ وہ کمزوری جو حصولِ مراد کی دشمن ہے۔ اُنھوں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ مردانہ پیش قدمی تسخیر کا اسمِ اعظم ہے۔ فوراً ان کی خواہشات شعلہ بن گئیں۔ آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ جسم میں رعشہ سا آ گیا۔ تنفس تیز ہوگیا۔ انھوں نے اپنے گھٹنوں سے گائتری کے زانوں میں ایک ٹھونکا دیا۔ گائتری نے فوراً پیر سمیٹ لیے۔ اُسے کسی نیتِ فاسد کا مطلق گمان نہ ہوا۔ مگر ایک ہی لمحہ بعد گیان شنکر نے اپنے جلتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کی کلائی پکڑی اور آہستہ سے دبادی۔ گائتری نے فوراً ہاتھ کھینچ

لیا گویا کسی زہریلے جانور نے ڈنک مار دیا ہو۔ اور مخوف نگاہوں سے گیان شنکر کو دیکھا۔ سڑک پر برقی روشنی تھی۔ گیان شنکر کے چہرے پر ایک قاتلانہ سرگرمی، ایک آتشیں استحکام، ایک مجنونانہ عزم نظر آیا۔ ہیبت سے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا۔ سارا جسم پسینہ پسینہ ہوگیا۔ اُس نے بیکسانہ نگاہوں سے باہر کی طرف جھانکا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہاں ہوں۔ کب گھر پہنچوں گی۔ غصۂ نحیف کی ایک رَو رگوں میں دوڑگئ اور آنکھوں سے بہہ نکلی۔ اُسے پھر گیان شنکر کی طرف تاکنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُن سے کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ غصہ بھی فرو ہوگیا۔ اس حملۂ دلفگار نے احساسِ درد کے سوا اور کوئی حِس ہی نہ باقی رکھی۔ اس کی وہ چیز لُٹ گئی تھی جو اس کے وقار کی محافظ، اس کے غرور کی پاسبان، اس کے صبر کا سہارا اور اس کی محبت کی پناہ تھی۔ اُسے معلوم ہوا کہ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اب میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی۔ اب تک اُس کی نگاہ اپنی ذلت کے اس پہلو پر نہ گئ تھی۔ اب اسے نظر آیا کہ یہ محض میری اخلاقی غرقابی نہیں ہے، اِس نے محض میری روح کو نہیں ڈبویا، اُس نے میرے ظاہری وقار کو اور ناموس کو بھی فنا کردیا۔ اس انکشاف نے اس کے بیٹھتے ہوئے دل کو تھام لیا۔ گولی کھاکر دم توڑتا ہوا طائر بھی چھری دیکھ کر تڑپ جاتا ہے۔ گائتری ذرا سنبھل گئی۔ اس نے گیان شنکر کی طرف با چشم پُرنم دیکھا۔ کہنا چاہتی تھی جو کچھ تم نے کیا اُس کی سزا تمھیں ایشور دیں گے۔ لیکن اگر تم میں شرافت ذرا بھی باقی ہے تو اس راز کو لب پر نہ آنے دینا۔ لیکن الفاظ نہ ملے اور وفور اشک نے بولنے کی اجازت نہ دی۔

گیان شنکرکو بھی معلوم ہوگیا کہ مجھ سے حماقت ہوگئی۔ میری عجلت نے کام خراب کردیا۔ میری ضمیرشناسی نے دھوکا کیا۔ ندامت سے گردن جُھک گئی اور گائتری کی سسکیاں سُنیں تو دل پر چوٹ سی لگی۔ سویا ہوا انسان جاگ اُٹھا۔ نفسانیت کا نشہ ہرن ہوگیا۔ اپنے فعل کی خباثت کا اندازہ ہوا۔ معذرت اور شرمساری کے الفاظ ذہن میں آئے مگر زبان سے ادا نہ ہوسکے۔ گائتری کی طرف تاکنے کا بھی حوصلہ نہ ہوا۔ اپنی کورباطنی اور ہوس ناکی اپنی ہی نظروں میں مکروہ معلوم ہونے لگی۔ آہ! اغوائے نفس! میں کتنا سیہ باطن ہوں! میری تہذیب اور تربیت اور علمی باخبری نے یوں نفس کے سامنے سرجھکا دیا۔ اپنے اخلاقی خوف کے احساس نے جذبۂ درد کو ہلا دیا۔ اُن کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے۔

دونوں آدمی کھڑکیوں سے باہر سر نکالے روتے رہے۔ یہاں تک کہ گاڑی مکان پر پہنچ گئی۔ طوفان کا ابتدائی دور جب ختم ہوجاتا ہے تو ہوا کے تند جھونکے، بجلی کی کڑک اور چمک بھی بند ہوجاتی ہے۔ موسلادھار مینہ برسنے لگتا ہے۔ گائتری کے طوفانِ دل کا پہلا دور ختم ہوچکا تھا۔ اب غصہ اور غم اور خفت۔ ان سب خلشوں نے آنسوؤں کی صورت اختیار کرلی تھی۔ روتی تھی اور سسکیاں بھرتی تھی۔ دل سے آنکھوں تک ایک نہر سی جاری ہوگئی تھی۔ خانہ ہائے دل میں خون کی جگہ آنسو بھرگئے تھے۔

آدھی رات گزرگئی مگر اُس کے آنسو نہ تھمے۔ اُس کا غرورِ عصمت آج خاک میں مل گیا۔ اپنے پیارے شوہر کی دائمی مفارقت کے بعد اُس کی یادِ نیک ہی گائتری کی زندگی کی مسرّتوں کا جزوِ اعظم تھی۔ وہی محبتِ مُردہ اُس کی عقیدت کا معبود تھی۔ وہ اس دل کو جہاں یہ انمول ہیرا دفن تھا نفس بدسگال کی نگاہ سے بھی بچاتی رہتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اچھے کپڑے پہنتی تھی۔ اچھے کھانے کھاتی تھی۔ اور ہمیشہ بشاش رہتی تھی۔ وہ تھیٹر بھی دیکھتی تھی۔ خوشی کی تقریبوں میں بھی شریک ہوتی تھی۔ شوقِ آرائش، حُسنِ مذاق، اور لطفِ تفریح سے اجتناب کرنے کی اس کے خیال میں ضرورت نہ تھی۔ اُسے نفس کُشی کے سوانگ بھرنے سے نفرت تھی۔ کیونکہ اُسے اپنی طبیعت پر قابو تھا۔ وہ یکسوئی کے ساتھ ریاست کے انصرام و انتظام میں مصروف رہتی تھی۔

جب اُس کے آنسو تھمے۔ طوفان کا زور کم ہوا۔ تو وہ اس سانحے کے علت و اسباب پر غور کرنے لگی اور رفتہ رفتہ اُس پر یہ روشن ہونے لگا کہ میں اس امر میں بالکل بے خطا نہیں ہوں۔ گیان شنکر کو اس پیش دستی کی ہرگز جرأت نہ ہوتی اگر اُنھیں میری بدمذاقی کا یقین نہ ہوتا۔ اِنھیں کیوں کر یہ یقین ہوا؟ میں اِن دنوں اُن سے بہت بے تکلف ہوگئی تھی۔ شاید حدِ مناسب سے زیادہ۔ غالبًا اُنھیں صحبتوں نے اُنھیں یہ خیال کرنے کا موقع دیا۔ تب اُسے وہ باتیں یاد آئیں، جو ان صحبتوں میں ہوا کرتی تھیں اُن کا میلان ہمیشہ اُن مسائل کی طرف ہوتا تھا جنھیں خلوت اور حجاب کی ضرورت ہے۔ اُس وقت وہ باتیں بالکل معصوم نظر آتی تھیں۔ پر اس وقت گائتری کو اُن کے خیال سے شرم آتی تھی۔ اُسے اب محسوس ہوا کہ میں رفتہ رفتہ نادانستہ پستی کی طرف چلی جاتی تھی۔ اور اگر یہ غارِ عمیق ناگہانی طور پر سامنے نہ آجاتا تو غالبًا مجھے اس اِنحطاط کی خبر بھی نہ ہوتی۔ وہ یکایک ایک وحشت کے عالم

میں اُٹھی اور اپنے شوہر کی تصویر کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے خائف نگاہوں سے تصویر کو دیکھا۔ اور تب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے طاق سے اُتار کر سینے سے لگا لیا اور دیر تک کھڑی روتی رہی۔ اُس روحانی ارتباط سے اُسے عجیب تقویت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کے تڑپتے ہوئے جگر پر کوئی مرہم رکھ رہا ہے۔ اور کتنی ملائمت کے ساتھ! وہ اس تصویر کو اپنے سینہ سے جدا نہ کرسکی۔ اُسے لیے ہوئے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا دل اس وقت نورِ وفا سے روشن تھا۔ اس پر ایک اغراق کی کیفیت طاری تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گو میرے شوہر یہاں نظر نہیں آتے پر وہ کمرے میں ضرور آئے ہوئے ہیں۔ اُس کا دل اِس ہستیِ غیب کی جانب کھنچا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کا تخیل کافور ہوگیا۔ وہ بھول گئی کہ میرے شوہر کو مرے ہوئے تین سال گزر گئے۔ وہ گھبرا کر بستر سے اُٹھی۔ اُسے معلوم ہوا کہ اُن کے سینے سے خون کا فوّارہ نکل رہا ہے، اور وہ کہہ رہے ہیں یہ تمھاری بے وفائی کا زخم ہے۔ تمھاری پاکیزگی میرے سینے کا سپر تھی۔ وہ سپر آج ٹوٹ گئی اور بے وفائی کا خنجر سینے میں چُبھ گیا۔ مجھے تمھاری وفا پر غرور تھا۔ وہ غرور تم نے خاک میں ملا دیا۔ افسوس! میں اِنھیں ہاتھوں سے قتل ہوا جنھیں کبھی میں نے پیار کیا تھا۔ آج سے تم سے ناتا ٹوٹتا ہے۔ بھول جاؤ کہ میں کبھی تھا“۔ گائتری اس عالمِ بے خودی میں اس خیالی وجود کی طرف دستِ التجا پھیلائے ہوئے چلی۔ مگر اس کا کہیں نشان نہ تھا۔ خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ زبان سے ایک چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر پڑی۔ کئی منٹ کے بعد جب آنکھیں کھلیں تو اُس نے دیکھا کہ وِدّیاوتی، لونڈیاں، مہریاں سب جمع ہیں اور ڈاکٹر کو بلانے کے لیے آدمی دوڑایا جا رہا ہے۔

وِدّیاوتی اُسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بے اختیار اُس کے گلے لپٹ گئی اور بولی۔ بہن تمھیں کیا ہوگیا؟ آگے تو کبھی ایسا نہ ہوتا تھا۔

گائتری۔ کچھ نہیں۔ ایک بہت بُرا خواب دیکھ رہی تھی۔ لاؤ تھوڑا سا پانی پیؤں گی۔ گلا سوکھ رہا ہے۔

وِدّیاوتی۔ تھیٹر میں کوئی خوفناک سین دیکھا ہوگا؟

گائتری۔ تھیٹر میں میں ٹھہری کہاں۔ تمھارے آنے کے ذرا دیر بعد چلی آئی۔ جی نہ لگا۔ کیا ابھی تھوڑی ہی رات گئی ہے کیا؟ بابوجی دُھرپد الاپ رہے ہیں۔

ودیاوتی۔ بارہ تو کب کے بج چکے۔ پر اُنھیں کسی کے مرنے جینے کی کیا فکر۔ اپنے راگ رنگ سے مطلب ہے۔ مہری نے جاکر تمھارا حال کہا تو ایک آدمی کو سِول سرجن کے یہاں دوڑا دیا اور پھر گانے میں مصروف ہوگئے۔

گائتری۔ ان کی تو یہ ہمیشہ کی عادت ہے۔ کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔ بھیا کا یہاں بُرا حال ہو رہا تھا اور وہ ڈِنر میں گئے ہوئے تھے۔ جب دوسرے دن میں نے باتوں باتوں میں پوچھا تو بولے میں وعدہ کرچکا تھا اور پارٹی میں شریک ہونا لازم تھا۔ ذاتی معاملات کو میں اپنی پبلک لائف سے الگ رکھنا چاہتا ہوں۔

ودیاوتی۔ ایک سال جب تم گورکھپور تھیں تو قحط پڑا تھا۔ یہاں پلیگ زوروں سے پھیلا تو ہم لوگ علاقہ پر گئے۔ اس وقت بابوجی کی بے رحمی دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ اسامیوں سے روپے نہ وصول ہوتے تو وہ سو دوسو آدمیوں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے ہنٹر سے مارنا شروع کرتے۔ بے چارے تڑپ تڑپ کر رہ جاتے۔ منتیں کرتے۔ پیروں پر گرتے۔ لیکن بابوجی کو مطلق درد نہ آتا۔ اِنھیں بے رحمیوں نے اِنھیں سنگدل بنا دیا ہے۔ زندگی موت تو پرماتما کے ہاتھ ہے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی کہ بھیا کی جوان موت اُنھیں غریبوں کی آہ کا نتیجہ ہے۔

گائتری ۔ مگر اس میں بابوجی کا کوئی قصور نہیں۔ آخر روپے کیسے وصول ہوتے۔ بے رحمی بُری بات ہے لیکن جب بے رحمی کے بغیر کام ہی نہ چلے تو کیا کیاجائے۔ تمھارے چچا کیسے نیک آدمی تھے۔ دروازے پر سے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔ سارے ضلع میں اُن کی فیاضی کی دھوم تھی۔ کارِخیر میں بے دریغ روپے خرچ کرتے۔ کوئی ایسا سال نہ جاتا کہ دس بیس ہزار چندے میں نہ دیتے ہوں۔ لیکن انھیں بھی اسامیوں پر سختی کرنی پڑتی تھی۔ میں نے انھیں خود اسامیوں کو اپنے سامنے مشکیں کسواکر پٹواتے دیکھا ہے۔ اس وقت میں سمجھتی تھی کہ یہ اُن کی زیادتی ہے۔ انھیں سمجھایا کرتی تھی۔ پرجب اپنے ماتھے پڑگئی تو اب معلوم ہورہا ہے کہ بلا مار دھاڑ کے کسانوں سے روپے نہیں وصول ہوتے۔ کمر میں روپے رکھے رہتے ہیں۔ پرجب تک دوچار لات گھونسے نہ کھالیں یا کم سے کم دوچار سخت سُست نہ سُن لیں دینے کا نام نہیں لیتے۔ یہ اُن کی عادت ہے۔

وِدّیاوتی۔ یہ میں نہ مانوں گی۔ کسی کو خواہ مخواہ مار کھانے کا شوق نہیں ہوتا۔

اتنے میں باہر سے خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب شکار کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ حکم ہو تو چھوٹے ڈاکٹر کو بلایا جائے۔ گائتری نے کہلا دیا میری طبیعت بالکل اچھی ہے۔ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔

گائتری۔ تم کہتی ہو کسی کو مار کھانے کا شوق نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں کسی کو مارنے کا شوق بھی نہیں ہوتا۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ ایک طرف تو رعایا میں خوف، بدگمانی اور بے شرمی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور دوسری طرف غرور، بے رحمی اور زبردست آزادی۔

آج گائتری اور وِدّیا ایک ہی پلنگ پر لیٹیں۔ گائتری کا جی بار بار چاہتا تھا کہ آج کے واقعے کو وِدّیا سے بیان کردوں۔ اس کے سینے پر ایک بوجھ سا رکھا ہوا تھا۔ علاوہ بریں وہ گیان شنکر کو وِدّیا کی نظروں میں ذلیل بھی کرنا چاہتی تھی۔ اس افشائے راز سے اگرچہ اسے بھی شرمندگی ہوتی لیکن گیان شنکر کی تذلیل اور تحقیر کے لیے وہ اتنی قیمت دینے پر تیار تھی۔ مگر بات لبوں تک آکر لوٹ گئی۔ غیرت نے اُسے نکلنے نہ دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش پڑی رہیں۔ وِدّیا کی آنکھیں تو نیند سے جھپکی جاتی تھیں۔ اور گائتری کو کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ دفعتاً اُس نے وِدّیا کو ہلاکر کہا۔ وِدّیا کیا سونے لگی؟ میرا جی چاہتا ہے کہ کل پرسوں تک یہاں سے چلی جاؤں۔ وِدّیا نے چونک کر کہا۔ اتنی جلدی؟ بھلا جب تک میں رہوں تب تک تو رہو۔

گائتری۔ نہیں اب یہاں طبیعت نہیں لگتی۔ وہاں کا کاروبار بھی تو دیکھنا ہے۔

وِدّیا۔ تم چلی جاؤگی تو دوچار دن میں میں بھی اپنی راہ لوں گی۔ مگر تم نے ابھی بابوجی سے تو پوچھا ہی نہیں۔

گائتری۔ اُن سے کیا کہنا ہے۔

وِدّیا۔ تو پھر ہم دونوں ساتھ چلیں گے۔

گائتری۔ تم اب کہیں جانے کا نام نہ لو۔ گیان بابو کو بھی یہیں رکھو۔ اب تو تمھیں یہاں کی رانی ہو۔ مجھے بھی کبھی کبھی بلالیا کرنا۔

وِدّیا۔ سمجھتی تو میں بھی یہی تھی لیکن تقدیر کچھ اور ہی کہتی معلوم ہوتی ہے۔

گائتری۔ اب کیا اس میں بھی شک ہے!

وڈیا۔ تم یہاں رہتیں تو شاید تقدیر کچھ مدد کرتی۔ تمھارا چلا جانا پریمو کے حق میں زہر ہوجائے گا۔ تم تو گھر کے اندر پڑی رہتی ہو لیکن میں کبھی کبھی باہر کی خبر بھی لیتی رہتی ہوں۔ کئی دن سے برابر دیکھ رہی ہوں کہ پنڈت پرمانند بابوجی کے پاس روز آتے ہیں۔ پنڈت چنتا رام بھی اکثر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی آمدورفت خالی ازعلت نہیں۔

گائتری۔ (حیرت سے) کیا بابوجی کو پھر شادی کرنے کی سوجھی ہے کیا؟

وڈیا۔ مجھے تو ایسا خوف ہے۔

گائتری۔ تو اگر اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہے تو وہ کسی کے روکے نہ رُکیں گے۔ بلکہ مخالفت کا گمان ہوگا تو اور بھی ضد پکڑلیں گے۔ اُنھیں خوب معلوم ہے کہ میں اُنھیں کیا رائے دوں گی۔ یہاں رہ کر نہ یہیں کچھ کر سکتی ہوں نہ اورہی کی کچھ کھوج خبر ملتی ہے۔ وہاں رہوں گی تو کم ازکم وہاں کا کام تو سنبھالتی رہوں گی۔ چھ مہینے آئے ہوگئے۔ معلوم نہیں لوگوں نے کیا کیا طوفان کھڑے کئے ہوں گے۔ یہ زمینداری کیا ہے، جنجال ہے۔ ہمیشہ ایک درجن مہمان دروازے پر ڈٹے رہتے ہیں۔ کوئی ماموں ہے کوئی بھانجا۔ کوئی کچھ کوئی کچھ۔ پڑے پڑے کھاتے ہیں اور تاش کھیلتے ہیں ۔ مفت خوری نے اُنھیں اتنا بے غیرت بنا دیا ہے کہ چاہے کتنی رُکھائی سے پیش آؤ ٹلنے کا نام نہ لیں گے۔ زیادہ نہیں تو دس خاندان ایسے ہوں گے جو محض میرے مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مجھے زہر دے دیں۔ کسی کے یہاں سے کوئی سوغات آئے میں اُسے ہاتھ نہیں لگاتی۔ ان کا کام بس یہی ہے کہ میرے کاموں میں رخنہ اندازی کیا کریں۔ کوئی اسامیوں کو پھوڑتا ہے۔ کوئی میرے ملازموں کو ملانے کی کوشش کرتاہے۔ کوئی مجھے بدنام کرنے پر آمادہ ہے۔ کوئی کام کرتے ہیں نہ دھندھا۔ شب و روز خاندانی شجرے کا مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ تمھیں سُن کر ہنسی آئے گی۔ کئی حضرات تو وراثت کی امید میں ڈیوڑھے دوگنے سود پر قرض لے کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ کچھ نہیں بن پڑتی تو فاقے کرتے ہیں۔ مگر وراثت کا غرور معاش کی کوئی فکر نہیں کرنے دیتا۔ میری عدم موجودگی میں نہ جانے کیا کیا گل کھلائے

ہوں گے۔ وہ تو کہو میرا مختارِ عام دیانت دار آدمی ہے ورنہ میری نہ جانے کیا حالت ہوتی۔ اس کے علاوہ آج کل کئی کئی بڑے بڑے معاملات درپیش ہیں۔ مختار صاحب کے خطوط تو میں نے تمھیں دکھائے تھے۔ میرے بغیر سب کام بگڑ جائے گا۔ ابھی مجھے جانے دو۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو مجھے خط لکھنا فوراً چلی آؤں گی۔ کم سے کم چار مہینے تو یہاں کچھ ہوتا نہیں۔ اگلے مہینے سے بابوجی نینی تال چلے جائیں گے۔ ساون بھادوں تک لوٹیں گے۔ اس وقت تک بن پڑے گا تو میں ایک بار ضرور آؤں گی۔

وِدّیا۔ خیر جاؤ۔ مقدر میں جو کچھ ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔

اس کے تیسرے دن گائتری یہاں سے بِدا ہوئی۔ رائے صاحب نے خوشی سے اجازت دے دی۔ اُسے اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے۔ وِدّیا اور گیان شنکر بھی ساتھ تھے۔ سیکنڈ کلاس کا ایک کمرہ مخصوص کرا لیا گیا تھا۔ گائتری اندر بیٹھی۔ رائے صاحب کھڑکی پر جُھکے ہوئے آم اور خربوزے، لیچیاں اور سنترے لے لے کر گائتری کو دیتے جاتے تھے۔ وہ منع کر رہی تھی کہ اتنے پھل کیا ہوں گے۔ میں کہاں تک کھاؤں گی۔ مگر وہ اس کی ایک نہ سنتے تھے۔ جب تک میوہ فروشوں کے پھل صاف نہ ہوگئے انھوں نے ہاتھ نہ روکے۔ اس میں بھی نمودِ شان تھی۔ وِدّیا باربار گائتری کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ اس وقت اچھا موقع ہے۔ شادی کے متعلق ان کا عندیہ لو۔ مگر گائتری اس وقت یہ تذکرہ انتہا درجہ بے موقع سمجھتی تھی۔ وہ رائے صاحب کے ہاتھوں سے پھلوں کے ٹوکرے لے لے کر رکھتی جاتی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں گیان شنکر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ان تین دنوں سے اس نے ایک بار بھی انھیں نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک بنچ پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ زرد اور اُداس تھا۔ گائتری کو اُن پر رحم آ گیا۔ الوداعی ملاقاتیں کدورت سے خالی ہوتی ہیں۔ اس وقت ہمارے دل کچھ زیادہ فراخ، کچھ زیادہ روادار، کچھ زیادہ نرم ہوجاتے ہیں۔ چلتے چلاتے ہم کسی پر اپنا قرض چاہے چھوڑ جائیں، دوسروں کا قرض لے کر جانا نہیں چاہتے۔ گائتری نے پریم شنکر کو گلے سے لگایا اور رودی۔ اسی اثنا میں گاڑی نے سیٹی دی۔ وِدّیا گائتری سے گلے مل کر روتی ہوئی نیچے اُتر پڑی۔ گیان شنکر بھی چونک کر بنچ پر سے اُٹھے اور گائتری کے روبرو آکر منفعل اور پُر تقصیر نگاہوں سے دیکھا۔ گائتری کھڑکی کے سامنے آکر اُن سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ پر گاڑی روانہ ہوگئی۔ مگر گیان شنکر کی وہ صورتِ التجا راستے بھر اس کی نگاہوں سے نہ اُتری۔

(۱۱)

گائتری کے جانے کے بعد گیان شنکر کو بھی وہاں رہنا دشوار ہوگیا۔ مقدر اُنھیں ہوا کے گھوڑے پر بٹھائے ہوئے عروج اور ثروت کے آسمان پر لیے جاتا تھا مگر ایک ہی ٹھوکر میں وہ درخشاں ستارے اُن کی نظروں سے چھپ گئے۔ وہ روح پرور ہوائیں وہ فضائے وسیع اور وہ لطیف مسرتیں غائب ہوگئیں۔ اور اب وہ ناشاد نامراد پھر اُسی گوشۂ تاریک میں پڑے ہوئے تھے۔ اُنھیں روزبروز قرائن سے یقین ہوتا جاتا تھا کہ رائے صاحب شادی کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی ثبوت مل جاتا تھا اور ان کا غصۂ مایوس روزبروز تحمل کے قابو سے باہر ہوتا جاتا تھا۔ وہ رائے صاحب کی اس بوالہوسی، اس فتورِ عقل پر جھلّا جھلّا کر رہ جاتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے تئیں سمجھاتے کہ مجھے بُرا ماننے کا کوئی موقع نہیں۔ وہ اپنی جائداد کے مالک ہیں۔ اُنھیں شادی کرنے کی کامل آزادی ہے۔ وہ ابھی تندرست و توانا ہیں۔ عمر بھی زیادہ نہیں۔ اُنھیں ایسی کیا مجبوری ہے کہ میرے لیے وہ اتنی نفس کشی گوارا کریں۔ میرے لیے یہ کتنا شرمناک ہے کہ اپنے اقتدار اور وقار کے لیے اُن کا بُرا چیتوں۔ اُن کے خاندان کے مٹنے کی تمنا رکھوں۔ یہ میری انتہائی رذالت ہے۔ لیکن تمناؤں کی وہ آتش جحیم جو ان کے سینے میں مشتعل تھی۔ ان وضاحتی چھینٹوں سے اور بھی بھڑک اُٹھتی تھی۔ خیالات کو مقصود کی طرف سے ہٹانے کی کوشش ایک عملِ معکوس پیدا کردیتی تھی جو اپنی جولانی میں قناعت کی ٹٹیوں کو پامال کردیتا تھا۔ اور دل اُس روزِ سعید کے لیے بے قرار ہوجاتا تھا جب یہ وسیع علاقے، یہ عالی شان مکانات، یہ خدم و حشم، یہ ساز وسامان سب اپنے ہاتھوں میں آجائیں گے۔ جب یہاں وہ مہمان کی عارضی حیثیت سے نہیں، مالک کی دائمی حیثیت سے بود و باش اختیار کریں گے۔ وہ شب و روز اس گلزار کی خیالی سیر میں محو رہتے۔ اکثر رات رات بھر نیند نہ آتی۔ بیداری میں مسرت کے خواب دیکھا کرتے۔ ترمیم اور ترقی، تغیّر اور تجدید کی تجویزیں ہمیشہ ان کے دماغ میں چکر لگایا کرتیں۔ سیر و تفریح سے اب انھیں مطلق دلچسپی نہ تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔ مگر رائے صاحب کی شادی کا خیال اس طلسم کو چھومنتر سے فنا کردیتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ امید وبیم کی حالت اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔

اِس طرح تین مہینے گزرگئے۔ جون کا مہینہ آ گیا۔ رائے صاحب حسبِ معمول نینی

تال کی تیاریاں کرنے لگے۔ گیان شنکر سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ اُنھوں نے سوچا کون جانے نینی تال میں کسی نئے خیال کی لیڈی سے بیاہ رچا دیں۔ یہاں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ اس لیے اُنھوں نے اس دُبدھے کا خاتمہ کرنے کی ٹھان لی۔

شام ہوگئی تھی۔ وہ دل کو مضبوط کیے ہوئے رائے صاحب کے کمرے میں گئے۔ مگر دیکھا تو وہاں ایک صاحب اور جلوہ افروز تھے۔ یہ ایک نئ کپڑے کی کمپنی کے ایجنٹ تھے۔ اور رائے صاحب کے پاس حصّوں کی خریداری کی تحریک کرنے کے لیے آئے تھے۔ مگر رائے صاحب کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ حصّے خریدنے پر تیار نہیں ہیں۔ آخر ایجنٹ نے پوچھا آخر آپ کو اس قدر تامل کیوں ہے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ کمپنی کی بنیاد مضبوط نہیں؟

رائے صاحب ۔ جس کام میں سیٹھ جگت رام اور مسٹر منوچہر جی شریک ہوں اس کے استحکام میں کس کو شک ہوسکتا ہے۔

ایجنٹ۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کمپنی معقول نفع نہ دے سکے گی؟

رائے صاحب ۔ ہرگز نہیں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ کمپنی پہلے ہی سال معقول منافع تقسیم کرے گی۔

ایجنٹ ۔ تو پھر آپ کو اس کی شرکت میں کیوں توقف ہے؟ میں آپ کی خدمت میں کم سے کم ایک لاکھ کا ارادہ کرکے آیا تھا۔ جب آپ جیسے دوراندیش اور ذی اثر اصحاب صنعتی تحریکوں سے یوں کنارہ کش رہیں گے تو اس بدقسمت ملک کی خوش حالی ہمیشہ ایک دلآویز خواب ہی رہے گی۔

رائے صاحب ۔ میں اس قسم کی صنعتی تحریکوں کو ملک کی خوش حالی کا ضامن نہیں سمجھتا۔

ایجنٹ۔ (تعجب سے) کیوں؟

رائے صاحب ۔ اس لیے کہ لالہ جگت رام اور منوچہر جی کی خوش حالی ملک کی خوش حالی نہیں ہے۔ آپ کی یہ کمپنی بھی خوش حالوں ہی کو خوش حال بنائے گی۔ بدحالوں پر اس کا اثر بہت کم پڑے گا۔ بیشک آپ چند ہزار مزدوروں کا وسیلۂ معاش پیدا کردیں گے۔ مگر یہ مزدور زیادہ تر کاشتکار ہی ہوں گے اور میں کاشتکاروں کو مزدور بنانے کے سخت خلاف ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ چند روپیوں کے فائدے کے لیے اپنے

بال بچوں کو چھوڑکر کمپنی کے جھونپڑوں میں جا بسیں اور شراب خوری اور حرام کاری کا سبق سیکھیں۔ اپنے موضع میں ان کی ایک خاص حیثیت ہوتی ہے۔ اُن میں خودداری کا احساس ہوتا ہے۔ برادری کا پاس و لحاظ اُنھیں شر سے بچاتا ہے۔ کمپنی کے سایے میں آکر وہ اپنے گھر کے مالک نہیں، دوسروں کے غلام ہوجاتے ہیں۔ اور برادری کی بندشوں سے آزاد ہوکر طرح طرح کی بُرائیاں کرنے لگتے ہیں۔ کم سے کم میں اپنے کاشتکاروں کو اس امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

ایجنٹ۔ معاف کیجیے گا۔ آپ نے مِل کے مزدوروں کی یک طرفی تصویر کھینچی ہے۔ آپ نے اس پہلو کو نظرانداز کر دیا کہ ہم مزدوروں کو بہتر مکانات، بہتر غذا اور آسائشِ زندگی کے بہتر وسایل مہیا کرتے ہیں۔ اُن کے علاج معالجہ کے لیے، اُن کے بچوں کی تعلیم کے لیے، اُنھیں ایامِ پیری کی دست گیری سے بچانے کے لیے، اُن کی تفریح کے لیے خاص انتظامات کردیے گئے ہیں۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے کوئی مزدور ہماری بارکوں میں رہنے کے بعد پھر کاشتکاری کی طرف راغب نہ ہوگا۔ اس کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ وہ خود اپنی حالت کو سابق سے بہتر سمجھتے ہیں۔

رائے صاحب ۔ نہ! میں اسے ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔ کاشتکار قُلی بن کر ہرگز اپنے مقدر کا مشکور نہیں ہوتا۔ اُسی طرح جیسے کوئی شخص تجارت کی آزادی کا لطف اُٹھانے کے بعد ملازمت کی بندشوں کو پسند نہیں کرتا۔ ممکن ہے اپنی بیکسی اور ناداری اُسے قُلی بنے رہنے پر مجبور کرے۔ پر مجھے یقین ہے کہ وہ اس غلامی سے آزاد ہونے کا موقع پاتے ہی فوراً گھر کی راہ لے گا اور پھر اسی شکستہ حال جھونپڑے میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہ کر اور اپنے چند موروثی قطعات زمین کو جوت کر صبراور شکر کے ساتھ زندگی بسر کرے گا۔ آپ کو میری باتوں کا یقین نہ آئے تو آپ چند کاشتکار قلیوں سے علاحدگی میں استفسارِ حال کرکے اپنا اطمینان کرسکتے ہیں۔ میں یہ اپنے تجربے کی بناپر کہتا ہوں۔ آپ لوگ اس معاملے میں یوروپ کی نقل کرکے ہمارے قومی تمدن کی خصوصیتوں اور خوبیوں کو پامال کر رہے ہیں۔ یوروپ میں جو انڈسٹریلزم کو اس قدر فروغ ہوا اُس کے خاص اسباب تھے۔ وہاں کے کاشتکاروں کی حالت اس زمانہ میں غلامی کے درجہ سے بھی گری ہوئی تھی۔ وہ اپنے زمیندار کے قیدی ہوتے تھے۔ اس قید سخت

کے مقابلے میں انھیں اہل سرمایہ کی قید محض ہزار غنیمت تھی۔ وہ زمیندار کی بیگار اور تازیانے اور دستبرد سے محفوظ ہوجاتے۔ ہمارے ملک کے کاشتکاروں کی مالی حالت چاہے کتنی ہی خراب ہو پر وہ کسی کے غلام نہیں ہیں۔ اگر اُن کے ساتھ بیجا سختی یا ظلم ہو تو وہ اس کی قانونی چارہ جوئی کرسکتے ہیں۔ قانون کی نگاہ میں زمیندار اور کسان سب مساوی ہیں۔

ایجنٹ۔ میں جناب سے بحث کرنے کی جرأت تو نہیں کرسکتا پر میں خود چھوٹا موٹا کاشتکار رہا ہوں اور مجھے کاشتکاروں کی حالت کا ذاتی تجربہ ہے۔ آپ یوروپ کی زرغلامی کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہاں کے اسامیوں کی حالت اُن سے بہتر نہیں ہے۔ قانونی بندشوں کے باوجود زمیندار کاشتکاروں پر بے انتہا مظالم اور تشدّد کرتے ہیں۔ اور کاشتکاری کے علاوہ معاش کے اور سبھی دروازے بند نہ ہوں تو وہ اس سختی کے ہرگز متحمل نہ ہوں۔

رائے صاحب ۔ جب قانونی بندشیں موجود ہیں تو ظاہر ہے کہ اُن سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کاشتکاروں کو صرف مناسب تعلیم کی ضرورت ہے اور تعلیمی وسائل روزبروز روبہ ترقی ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کی زمینداروں کی جانب سے اکثر کاشتکاروں پر سختیاں ہوتی ہیں۔ میں خود اس معاملے میں بے خطا بننے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میں کاشتکاروں سے بیگار لیتا ہوں۔ لگان کی وصولی میں کبھی کبھی ڈانٹ پھٹکار بھی کرتا ہوں۔ بے دخلی اور اضافۂ لگان کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا بلکہ اکثر صیغۂ مال کے عمال کی تحریص اور ترغیب سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مگر اس کا باعث کیا ہے؟ رواجِ قدیم۔ کاشتکاروں کی جہالت اور قانون سے بے خبری۔ اور مناسب تعلیم کے ساتھ یقیناً زمینداروں کے ہاتھ سے یہ سب موقعے نکل جائیں گے۔ انسان خودغرض ہوتا ہے اور یہ دشوار ہے کہ جب تک اُسے دھینگا دھینگی کے یہ موقعے ملتے رہیں وہ اُن سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ آپ کا فرمانا بالکل بجاہے کہ کاشتکاروں کو یہ بے عنوانیاں اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہیں کہ ان کے لیے گزران کی اور سبھی صورتیں مفقود ہیں۔ بیشک اس کے لیے معاش کی دوسری صورتیں پیدا کرنی چاہئیں۔ ورنہ ان کی باہمی رقابت اُنھیں ہمیشہ زمینداروں کا غلام بنائے رہے گی۔ خواہ قانون اُن کی کتنی حمایت اور حفاظت کیوں نہ

کرے۔ مگر یہ صورتیں ایسی ہونی چاہئیں جو ان کے اخلاق اور اطوار کو تباہ نہ کریں۔ انھیں آوارۂ وطن، خانماں برباد بناکر ترغیبات کا شکار نہ بنائیں۔ ان کی خودداری اور وقار کو نہ مٹائیں۔ اور اس کے لیے لازم ہے کہ خانگی مصنوعات کی تحریک کی جائے تاکہ وہ اپنے گھر اور گاؤں میں خاندان اور برادری کی نگاہِ تادیب کے زیرِ اثر اپنا اپنا کام کرتے رہیں۔

ایجنٹ۔ آپ کی مراد کاٹیج انڈسٹری سے ہے۔ میں نے اخباروں میں کہیں کہیں اس کا ذکر دیکھا ہے۔ لیکن کاٹیج انڈسٹری کا سب سے بڑا حمایتی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اُس سے بڑے بڑے کارخانوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں جس قدر ارزاں اور افراط سے چیزیں بن سکتی ہیں اس قدر انفرادی کوششوں سے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں آپ ممالکِ غیر کے مصنوعات کے سیلاب کا کیوں کر مقابلہ کرسکتے ہیں۔

رائے صاحب ۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ بیرونی مصنوعات پر داخلے کا ٹیکس لگایا جاسکتا ہے۔ اور غالبًا ایک خفیف ٹیکس کی ضرورت ہوگی۔ انگلینڈ اور جرمنی میں مزدوری کا نرخ بہت زیادہ ہے۔ انھیں خام جنس دوسرے ملکوں سے لے جانی پڑتی ہے۔ باربرداری کے مصارف ادا کرنے پڑتے ہیں اور چیزوں کو دوبارہ یہاں بھیجنا پڑتا ہے۔ ہماری خانگی حرفتیں ان تمام زیرباریوں سے آزاد ہوں گی اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ غیر ملکی اشیاء کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ ہم نے اب تک اس معاملے کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا سرمایہ دار طبقہ اس مسئلے کے قریب آتے ہوئے ڈرتا ہے۔ حرصِ دولت نے اُسے اتنا کورباطن بنا دیا ہے کہ وہ انسان کی وقعت مشینوں سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کے خون سے اپنے تمول اور ثروت کے باغ کو سیراب کرنا چاہتا ہے۔ اور اس حرص کو صنعتی مقابلہ اور ایسے ہی دوسرے اقتصادی گورکھ دھندوں کی آڑمیں چھپاتا ہے۔

گیان شنکر اقتصادی اصولوں کے قائل تھے اور رائے صاحب کی دلیلیں انھیں مہمل معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اس وقت وہ اپنے خیال میں اتنے منہمک تھے کہ اس مباحثہ میں شریک نہ ہوئے۔ آخر ایجنٹ صاحب خفیف ہوکر چلے گئے۔ رائے صاحب نے گیان شنکر کو

دیکھا تو بشرے سے تاڑ گئے کہ یہ کچھ نہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن لحاظ مانع ہے۔ بولے۔ کہیے آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ مجھے فرصت ہے۔

گیان شنکر کی زبان نہ کھل سکی۔ غیر معمولی ارادے فوراً عمل کے سانچے میں نہ ڈال دیے جائیں تو پگھلی ہوئی دھات کی طرح منجمد ہوجاتے ہیں۔ گیان شنکر کو اب معلوم ہو رہا تھا کہ میں جو تذکرہ کرنے آیا ہوں وہ سراسر بے موقع ہے۔ وضعداری کے بالکل خلاف۔ رائے صاحب کی سخت دل شکنی ہوگی اور وہ مجھے دل میں کتنا حریص اور سفلہ خیال کریں گے۔ بولے جی کچھ نہیں۔ یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ آپ نینی تال کا کب تک قصد کرتے ہیں؟

رائے صاحب۔ (مسکراکر) آپ مجھ سے اُڑنے لگے۔ آپ کی نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ آپ اُن پر بیجا پردہ داری کا دباؤ ڈال رہے ہیں۔ صاف کہیے۔ میں آپس میں کامل خلوص اور صفائی چاہتا ہوں۔

گیان شنکر بڑے شش و پنج میں پڑے۔ سمجھ گئے کہ ایسے دورشناس آدمی کے سامنے میری حیلہ بازیاں ایک نہ چلیں گی۔ شرماتے ہوئے بولے یہی خیال کرکے تو میں آپ کی خدمت میں آیا تھا۔ پر وہ بات ایسی بھدی ہے کہ آپ سے عرض کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے۔ مجھے اندیشہ تو نہیں کہ آپ مجھے خودغرض سمجھیں گے۔ کیونکہ غرض سے بالاتر بننے کا مجھے دعویٰ نہیں۔ خیال یہ ہے کہ آپ کو شاید میری بدگمانی ناگوار گزرے۔

رائے صاحب۔ اس کا آپ بالکل اندیشہ نہ کیجیے۔ میری ساری عمر بدگمانیوں کی ہوا میں گزری ہے۔ میں اُن بدنصیب آدمیوں میں ہوں جن کے قول و فعل، خیالات اور ارادے ہمیشہ متضاد اور معکوس نظر آتے ہیں۔ بدگمانیوں کا عادی ہوگیا ہوں۔ میں ایک زمانے میں عیسائی سمجھا جاتا تھا۔ پھر ملحد سمجھا جانے لگا۔ بعدازاں اگھوری مشہور ہوا۔ کبھی سرکار کا ہوا خواہ کہا جاتا ہوں۔ کبھی رعایا کا دشمن۔

گیان شنکر۔ کم سے کم مجھے تو آپ سے غلط فہمی کا کوئی موقع نہیں ملا اور یہی باعث ہے کہ میرا دل ان افواہوں کو باور نہیں کرتا جو یہاں آپ کے ایک خاص ارادے کے متعلق اُڑ رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ایک ایسے مسئلے کا فیصلہ کرنے کے قبل جس کا مجھ سے بہت قریبی تعلق ہے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ضرور دیں گے۔

رائے صاحب نے متین انداز سے کہا۔ اگر میں آپ کا مطلب سمجھنے میں سہو نہیں کرتا تو مجھے اس بات سے بڑا اطمینان ہوا کہ آپ نے اُن افواہوں پر یقین نہ کرکے مجھ سے اُن کی تصدیق ضروری سمجھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ افواہیں بالکل بے بنیاد ہیں۔ میں صاف گو ضرور ہوں لیکن اپنے مصنوعی ہوا خواہوں کا کچھ نہ کچھ لحاظ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری یہی کمزوری غالباً اُن افواہوں کی محرک ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں پنڈے اور پانی کا قائل نہیں۔ اور نہ اپنے بقائے نسل پر نظامِ عالم کا مدار سمجھتا ہوں۔ رہا حظِ نفس۔ اس کے لیے میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں اپنے پیروں میں پتھر کی بیڑیاں ڈالے بغیر اُس کا لطف اُٹھا سکتا ہوں۔ حالانکہ میرا جیسا کثیر المشاغل، سیر وشکار اور دیگر تفریحوں پر جان دینے والا شخص احظاظِ نفس کی ایک خاص صورت پر وارفتہ نہیں ہوسکتا۔ میں کبھی ہوائے نفسانی کا غلام نہیں رہا ورنہ ساٹھ سے متجاوز ہونے پر بھی آپ مجھے اتنا چاق و چست نہ پاتے۔ دنیا مجھے کتنا ہی متہم کرے لیکن حق یہ ہے کہ میں نے اوائلِ عمر سے اب تک نہایت محتاط زندگی بسر کی ہے اور خلوت کی نسبت جلوت میرے لیے بدرجہا زیادہ نشاط انگیز ثابت ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں سے آپ کو تشفی ہوگئی ہوگی۔ لیکن بُرا نہ مانیے گا۔ ان افواہوں سے اس حدتک متاثر ہوجانا میری نگاہوں میں آپ کی وقعت نہیں بڑھاتا۔ بالفرض میں نے شادی کرنے کا ارادہ ہی کیا ہوتو یہ لازمی نہیں کہ اُس سے اولاد بھی ہو اور ہو بھی تو وہ لڑکا ہو اور لڑکا بھی ہو تو وہ زندہ رہے۔ پھر مایاشنکر بھی ابھی شیر خوار بچہّ ہے۔ غیب نے اسؔ کے مقدر میں کیا لکھ دیا ہے، اس کا ہمیں یا آپ کو مطلق علم نہیں۔ اور بالفرض وہ بالغ ہوکر میرا جانشیں بھی ہو تو ضروری نہیں کہ وہ سعادت مند بھی ہو۔ جتنی آپ امید یا خواہش کرتے ہیں، اگر وہ سمجھدار ہوتا اور اس کے دل میں یہ توہمات پیدا ہوتے تو میں اُنھیں حق بجانب سمجھتا۔ لیکن آپ ایک موہوم بعید اتفاق کے لیے اپنا خواب و خور حرام کرلیں یہ کسی طرح آپ جیسے فہمیدہ شخص کے شایانِ شان نہیں۔ اتنا انہاک اگر آپ کو کسب کمال میں ہوتا تو آپ کو اپنی آسائش اور عروج کے لیے ورثے کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔

گیان شنکر پر اس گفتگو کے پہلے حصہّ کا جو امید افزا اثر ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ حوصلہ شکن ان آخری کلمات تلخ سے ہوا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ تذکرہ ناگوار گزرا اور یہ

لطائف الحیل سے کام لے رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ شاید انھیں ہمارا رہنا بھی ناگوار گزر رہا ہے اور اس بزرگانہ فہمائش کے پردے میں وہ اپنی سرد مہری کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے گیان شنکر کو افسوس ہوا کہ اگر یہ مجھے اپنا دستِ نگر نہ سمجھتے تو انھیں میری سرزنش کرنے کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔ ان کی مغرور طبیعت تبادلۂ سخن کے لیے تلملا اُٹھی مگر اُنھوں نے ضبط کیا اور اس داروئے تلخ کو نوش کرجانا ہی قرینِ مصلحت سمجھا۔ دل میں کہا آپ میرے ساتھ دو رنگی چال چل رہے ہیں۔ میں ثابت کردوں گا کہ کم ازکم اس معاملے میں مَیں آپ کا مدّ مقابل ہوں۔

انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ رائے صاحب کو بھی ان دلآزار باتوں کے کہنے پر افسوس ہوا۔ گیان شنکر کی دلجوئی کے لیے اِدھراُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ نینی تال کا بھی ذکر آگیا۔ انھیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ گیان شنکر راضی ہوگئے۔ اس میں دو فائدے تھے۔ ایک تو وہ رائے صاحب کو نظربند رکھ سکیں گے۔ دوسرے حکام سے ربط ضبط پیدا کرسکیں گے۔ ممکن ہے رائے صاحب کی سفارش انھیں کسی منصب پر پہنچا دے۔ یہاں سے اُٹھنے لگے تو رائے صاحب نے فرمایا۔ یہ چک لے جائیے اور اپنے سفر کے ضروری سامان مہیا کرلیجیے۔ نینی تال میں وضع وقطع پر خاص نگاہ پڑتی ہے۔ افسوس کہ آپ کو پولو اور گولف کی مہارت نہیں ورنہ آپ کی منزل بڑی حدتک آسان ہوجاتی۔ کم ازکم اتنا ضرور کیجیے کہ میری لائبریری سے انگریزی آداب معاشرت کی کتابیں نکال کر اُن کا غور سے مطالعہ کرلیجیے۔ اُس بازار میں اِن جلسوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ وہاں ثقہ بننے سے کام نہ چلے گا۔ اگر آپ کتب خانے میں بیٹھے اخبار اور کتابیں پڑھتے رہے تو جانا بے سود ہوجائے گا۔ وہاں کی تفریحات اور مردانہ مشاغل میں شریک ہونا ضروری ہے۔ گیان شنکر نے شرماتے ہوئے چک لیا اور سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔

(۱۲)

اگرچہ گاؤں والوں نے غوث خاں پر ذرا بھی آنچ نہ آنے دی تھی۔ لیکن مسٹر جوالا سنگھ کا گاؤں کے ملاحظے کے لیے جانا ہی خاں صاحب کے اطمینان میں خلل ڈالنے کے لیے کافی تھا، چپراسی، ناظر، منشی سبھی حیران تھے کہ اس کندۂ ناتراش لونڈے نے ڈپٹی صاحب پر نہ جانے کیا جادو کردیا کہ اُن کی کایا ہی پلٹ ہوگئی۔ ایندھن پوال، ہانڈی برتن،

دودھ، دہی، گوشت مچھلی، ساگ سبزی، سبھی چیزوں کو بیگار میں لینے کی ممانعت کرتے ہیں۔ تب تو ہمارا گزر ہوچکا۔ ایسا بھتہ ہی کون بہت ملتا ہے۔ یہ لونڈا ایک ہی پاجی نکلا۔ ایک تو ہمیں پھٹکاریں سنائیں۔ اس پر یہ شگوفہ چھوڑا گیا۔ چل کر صاحب سے ساری حقیقت بیان کردینی چاہیے۔ آج یہ ذلت ہوئی ہے۔ دوسرے گاؤں میں اس سے بھی بُرا حال ہوگا۔ ہم لوگ پانی کو ترس جائیں گے۔ چنانچہ جونہی جوالا سنگھ لوٹ کر آئے سب اُن کے روبرو جاکر کھڑے ہوگئے۔ ایجاد حسین پر پھر ان کی امامت کا بار پڑا۔

جوالا سنگھ نے چیں بہ جبیں ہوکر پوچھا۔ کہیے آپ لوگ کیسے چلے؟ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ میر صاحب آپ نے ان لوگوں کو میرا حکم سُنا دیا یا نا؟

ایجاد حسین۔ جی ہاں وہی حکم سُن کر تو یہ لوگ گھبرائے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ کل اس موضع میں ایک سخت واردات ہوگئی۔ گاؤں کے باشندے چپراسیوں سے لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ یہ لوگ جان بچا کر چلے نہ آتے تو فوجداری ہوجاتی۔ اُنھوں نے اس کی اطلاع کرکے آپ کے آرام میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر آج کی ممانعت سُن کر ان کے ہوش خطا ہوگئے ہیں۔ پہلے ہی بیگار آسانی سے نہ ملتی تھی۔ اب جو لوگ اس حکم کی خبر پائیں گے تو اور بھی شیر ہو جائیں گے۔ کل جو ہنگامہ ہوا اس کا بانی مبانی وہی نوجوان تھا جو صبح حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس کو کچھ تنبیہ ہونی نہایت ضروری ہے۔

جوالا سنگھ۔ اُس کی باتوں سے تو ثابت ہوتا تھا کہ چپراسیوں ہی نے گاؤں والوں کے ساتھ سختی کی۔

ایک چپراسی۔ وہ تو کہے گا ہی۔ لیکن خدا گواہ ہے۔ ہم لوگ بھاگ نہ آتے تو جان کی خیریت نہ تھی۔ ایسی ذلت آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہم لوگ چار چار پیسے کے ملازم ہیں پر حاکموں کے اقبال سے بڑے بڑوں کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔

غوث خاں۔ حضور یہ لونڈا انتہا درجے کا مفسد ہے۔ اُس کے مارے ہمارا گاؤں میں رہنا دشوار ہوگیا ہے۔ روز ایک نہ ایک طوفان کھڑا کیا کرتا ہے۔

دوسرا چپراسی۔ حضور ہی لوگوں کی غلامی میں عمر گزری مگر کبھی یہ نوبت نہ آئی تھی۔

ایجاد حسین۔ حضور کی رعایا پروری میں شک نہیں۔ حکام کو رحم دل ہونا ہی چاہیے لیکن حق تو

یہ ہے کہ بیگار بند ہوگئی تو ان ٹکے کے آدمیوں کا کسی طرح گزر ہی نہ ہوگا۔
جوالا سنگھ۔ نہیں میں ان لوگوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ رعایا پر بے جا سختی نہ ہو۔ میں نے ان لوگوں کو جو حکم دیا ہے اُس میں اِن کی ضرورتوں کا کافی لحاظ رکھا ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ صدر میں یہ لوگ جن چیزوں کے بغیر گزر کرسکتے ہیں اُن کی دیہات میں آکر کیوں ضرورت پڑتی ہے۔
چپراسی۔ حضور ہم تو غلام ہیں جیسے چاہیں رکھیں، پراس میں آپ ہی کی بدرُعبی ہوتی ہے۔
غوث خاں۔ یہ دیہاتی لوگ اُسے حاکم ہی نہیں سمجھتے جو اُن کے ساتھ سختی سے پیش نہ آئے۔ حضور کو ہندوستانی سمجھ کر ہی یہ لوگ ایسی گستاخی کرتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے ہوئے ہیں پادرن صاحب تشریف لائے تھے اور ہفتہ بھر مقیم رہے۔ لیکن سارا موضع ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔
ایجاد حسین۔ آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔ ہندوستانی حکام کو یہ لوگ حاکم ہی نہیں سمجھتے۔ جب تک وہ اِن کے ساتھ سختی نہ کرے۔

جوالا سنگھ نے اپنی شان افزائی کے لیے انگریزی وضع و قطع اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اپنے تئیں کسی انگریز سے کم نہ سمجھتے تھے۔ انگریزوں سے ملنے جاتے تو صرف ٹوپ ہاتھ میں لے لیتے۔ جوتے اُتارنے کی ذلت سے بچ جاتے تھے۔ ریل گاڑی میں انگریزوں ہی کے لیے مخصوص کمروں میں بیٹھتے۔ لوگ اپنی بول چال میں اُنھیں صاحب کہا کرتے تھے۔ ہندوستانی سمجھنا اُنھیں گالی دینا تھا۔ غوث خاں کے یہ الفاظ تیر بہدف ہوگئے۔ تن کر بولے۔ اچھا! یہ بات ہے! تو میں بھی دکھا دیتا ہوں کہ میں کسی انگریز سے کم نہیں ہوں۔ یہ لوگ بھی کیا سمجھیں گے کہ کسی ہندوستانی حاکم سے سابقہ پڑا تھا۔ اب تک تو میں یہی سمجھتا تھا کہ ساری خطا ہمیں لوگوں کی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ دیہاتیوں کی شرارت ہے۔ اہلمد صاحب، آپ حلقے کے سب انسپکٹر کو ایک روبکار لکھیے کہ وہ فوراً اس معاملے کی تحقیقات کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔
چپراسی۔ زیادہ نہیں حضور ان لوگوں سے مچلکہ تو ضرور ہی لے لیا جائے۔
غوث خاں۔ اس لونڈے کی گوشمالی کی سخت ضرورت ہے۔
جوالا سنگھ۔ جب تک رپورٹ نہ آجائے میں کچھ نہیں کرسکتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شام کے وقت داروغہ دیاشنکر جو پھر بحال ہوکر اسی حلقے میں تعینات ہو آئے تھے لکھن پور آپہنچے۔ کئی کانسٹبل ہمراہ تھے۔ چوپال میں اُن کا آسن جما۔ گاؤں کے سب آدمی جمع کیے گئے۔ مگر بلراج کا پتہ نہ تھا۔ وہ اور رنگی دونوں نیل گایوں کو بھگانے گئے ہوئے تھے۔ داروغہ جی نے بگڑکر منوہر سے کہا تیرا بیٹا کہاں ہے؟ سارے فساد کی جڑ تو وہی ہے۔ تونے کہیں بھگا تو نہیں دیا؟ اُسے جلد حاضر کر۔ ورنہ میں وارنٹ جاری کردوں گا۔

منوہر نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ کسی نے کہا وہ بلراج آگیا۔ سب کی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ دو کانسٹیبلوں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ بلراج نے بیکسانہ انداز سے منوہر کی طرف دیکھا۔ اُن نگاہوں میں مہلک ارادہ تڑپ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے یہ ذلّت نہیں برداشت ہوسکتی۔ میں اب جان پر کھیلتا ہوں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ منوہر نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو خون نے جوش مارا اور باولا سا ہوگیا۔ مصلحت کی بندش پارہ پارہ ہوگئی۔ کچھ نہ سوجھا کہ میں کیا کررہا ہوں۔ باز کی طرح لپک کر بلراج کے پاس پہنچا اور دونوں کانسٹیبلوں کو زور سے دھکّا دے کر بولا چھوڑ دو نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔

اتنا کہتے کہتے اس کی زبان بند ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ سکھو چودھری جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ اُنھیں وہ دن قریب نظر آرہا تھا جب منوہر کے دسوں بیگھے زمین پر اُن کے ہل چلیں گے۔ دُکھرن بھگت کانپ رہے تھے کہ معلوم نہیں کیا آفت آنے والی ہے۔ کہیں میں بھی گواہی میں نہ پکڑا جاؤں۔ ڈپٹ سنگھ سوچ رہے تھے کہ بھگوان کرے مارپیٹ ہوجائے تو اِن لوگوں کی خوب خبر لی جائے۔ بشیشر ساہ تھر تھر کانپ رہے تھے کہ کسی طرح گھر تک خیریت سے پہنچ جائیں۔ صرف قادرخاں کو منوہر سے سچی ہمدردی تھی۔ منوہر کی نا انجام اندیشی سے اُن کے دردمند دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اب ایک پل بھر تاخیر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مار پیٹ ہوگئی تو پھر کچھ بنائے نہ بنے گی۔ فوراً جاکر داروغہ جی کے کان میں جاکر کہا۔ ہجور سپاہیوں کو منا کر دیجیے۔ نہیں تو کھون ہوجائے گا۔ ہجور ہمارے مالک ہیں۔ ہم لوگ آپ ہی کی رعایا ہیں آپ جو کچھ حکم دیں گے اس کے باہر نہ ہوں گا۔ اتنی مہربانی کیجیے۔

دیاشنکر اُن آدمیوں میں نہ تھے جو کھوکر بھی کچھ نہیں سیکھتے۔ اُنھیں اپنے مواخذے نے ایک بہت مفید سبق دیا تھا۔ پہلے وہ رشوت کی ساری رقم حتی الامکان اکیلے ہی ہضم

کرجاتے تھے۔ اس سے تھانے کے دیگر عمال ان سے کینہ رکھتے تھے۔ اب انھوں نے بانٹ کر کھانا سیکھا تھا۔ اس سے سارا تھانہ اُن پر جان دیتا تھا۔ اس کے علاوہ پہلے کی طرح اب وہ گالیوں سے باتیں نہ کرتے تھے۔ انھیں اب تجربہ ہو رہا تھا کہ شرافت محض اخلاقی وقعت کی شے نہیں۔ اس میں مادی فوائد بھی مضمر ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اُن کے طور و طریق میں اب سوقیانہ پن کی جگہ متانت آگئی تھی۔ وہ اس سودے میں سارے گاؤں کو سمیٹ کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے تھے۔ کانسٹیبلوں کا طرزِ عمل اس منشا کے پورے ہونے میں مانع ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے سپاہیوں کو سمجھاکر ٹھنڈا کیا۔ اور ملزموں کے بیان لکھنے لگے۔ پہلے چپراسیوں کے بیان ہوئے۔ انھوں نے سارا وبال بلراج کے سر ڈالا۔ غوث خاں اور اُن کے دونوں شحنوں نے بھی اسی سے ملتے جلتے بیانات دیے۔ صرف بندا مہراج کا بیان کچھ کمزور تھا۔ اب گاؤں والوں کے اظہار کی باری آئی۔ پہلے اِن لوگوں کا خیال تھا کہ سارے گاؤں پر آفت آنے والی ہے۔ لیکن فریق ثانی کے بیانات سے واضح ہوا کہ یہ ساری کوشش صرف بلراج کو شکنجے میں لانے کے لیے کی جارہی ہے۔ بلراج اپنی ہمدردی کے باعث سارے گاؤں کا منظور نظر تھا۔ برادرانہ خلوص اور محبت بھی دیہاتی زندگی کا ایک روشن پہلو ہے۔ اس موقع پر تو محض اظہارِ حقیقت سے بلراج کی جان بچ جاتی تھی۔ کچھ اضافہ یا ترمیم کی ضرورت نہ تھی۔ لوگوں نے ہمّت سے کام لیا اور سارا واقعہ بے کم و کاست بیان کردیا۔ صرف بلراج کے کلماتِ ثقیل پر پردہ ڈال دیا۔ استغاثہ نے مداخلت کرکے ان میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی مگر قادرخاں کی معاملے فہمی نے کسی کو پھوٹنے نہ دیا۔

آٹھ بجتے بجتے تفتیش ختم ہوگئی۔ بلراج کو حراست میں لینے کے لیے کافی ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔ غوث خاں دانت پیس کر رہ گئے۔ داروغہ جی چوپال سے اُٹھ کر اندر کے کمرے میں جا بیٹھے۔ گاؤں کے لوگ ایک ایک کرکے کھسکنے لگے۔ ڈپٹ سنگھ نے اکڑکر کہا گاؤں میں پھوٹ نہ ہو تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ داروغہ جی کیسی جرح کر رہے تھے کہ کوئی پھوٹ جائے۔

دُکھرن۔ بھگوان چاہیں گے تو اب کچھ نہ ہوگا۔ میل بڑی چیز ہے۔

منوہر۔ بھائی تم لوگوں نے میری آبرو رکھ لی تھی نہیں تو کہیں کا نہ رہتا۔

ڈپٹ سنگھ۔ لسکر والوں نے سمجھا تھا جیسے دوسرے گاؤں والوں کو دبا لیتے ہیں ویسے اس گاؤں

کو بھی دبا لیں گے۔

دُکھرن۔ اس گاؤں پر مہابیر جی کا سایہ ہے۔ اِسے کوئی کیا کھاکے دبائے گا۔ ٹھٹھا نہیں ہے۔

منوہر۔ کادر بھیا۔ دونوں سپاہیوں نے جب بلراج کی بانہہ پکڑی تو میرے بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ اگر وہ چھوڑ نہ دیں تو چاہے جان سے جاتا پر ایک کی جان لے کر چھوڑتا۔

ڈپٹ سنگھ۔ اچرج تو یہ ہے کہ بلراج سے کیسے جبط ہوا۔

بلراج۔ میری تو جیسے سٹی سی بھول گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ہاتھوں میں دم ہی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ دونوں دادا سے ہاتھا پائی کرنے لگے تب مجھے گُسا آیا۔

دُکھرن ۔ چلو جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ اب کچھ چِنتا نہیں ہے۔

یہی باتیں کرتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ منوہر ابھی کھانا کھاکر چلم ہی پی رہا تھا کہ بندا مہراج آکر بیٹھ گئے۔ یہ بڑا نیک آدمی تھا۔ تھا تو زمیندار کا ملازم مگر اس کی ہمدردی ہمیشہ اسامیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ منوہر اُسے دیکھتے ہی کھاٹ سے اُٹھ بیٹھا۔ بلاسی گھر سے نکل آئی۔ اور بلراج جو کولھو کے لیے اوکھ کی گنڈیریاں کاٹ رہاتھا آکر کھڑا ہوگیا۔ آج کل اوکھ پیلی جاتی تھی۔ پہر رات رہے کولھو کھڑے ہوجاتے تھے۔

منوہرنے پوچھا۔ کہو مہراج کیسے چلے؟ چوپال میں کیا ہو رہا ہے؟

بندا۔ تمھارا گلا دبانے کی تیاریاں ہورہی ہیں اور کیا۔ دروگاجی نے مکھیا لوگوں کو بلایا ہے اور سب سے اپنا بیان بدلنے کو کہہ رہے ہیں۔ دھمکا رہے ہیں۔ بیان نہ بدلوگے تو سب سے مچلکہ لے لوں گا۔ اُس پر سو روپے کی تھیلی الگ مانگتے ہیں۔ ڈر کے مارے سب کی نانی مررہی ہے۔ بیان بدلنے پر تیار ہیں۔ میں نے سوچا چل کر تمھیں کھبر تو دے دوں۔ جمیندار کے چاکر ہیں تو کیا پر ہیں تو ہم اور تم ایک۔

منوہر کے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ بلاسی سناٹے میں آگئی۔ بلراج کے ہوش اُڑگئے۔ غریبوں نے سمجھا تھا بلا ٹل گئی۔ اپنے کام دھندے میں لگے ہوئے تھے۔ اس خبر نے آندھی کے جھونکے کی طرح آکر کشتی کو زیر و زبر کردیا۔ کسی کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

بندا مہراج نے پھر کہا۔ سبھوں نے کیسا اچھا بیان دیا تھا۔ میں نے سمجھا تھا اپنی بات پر اَڑیں گے۔ پرسب کے سب کائر نکلے۔ ایک ہی دھمکی میں پانی ہوگئے۔

منوہر۔ میرے اوپر کوئی گرہ دسا آئی ہوئی ہے۔ دیکھیں اس لونڈے کے پیچھے کیا کیا دُرگت ہوتی ہے۔

بندا۔ رات تو بہت ہوگئی ہے پر بن پڑے تو لوگوں کے پاس جاؤ۔ آرجو بنتی کرو۔ کون جانے مان ہی جائیں۔

بلراج نے تن کر کہا نہ! کسی بھکوے کے پاس جانے کی جرورت نہیں۔ یہی نہ ہوگا میری سجا ہوجائے گی۔ ایسے نامردوں سے بھگوان بچائیں۔ مچلکے کے نام سے جن کی جان سوکھی جاتی ہے۔ اُن کا کوئی بھروسا نہیں۔ یہاں مرد ہیں۔ سجا سے نہیں ڈرتے۔ کوئی چوری نہیں کی ہے۔ ڈاکا نہیں مارا ہے۔ سچی بات کے پیچھے سجا نہیں گلا بھی کٹ جائے تو ڈرنے والے نہیں ہیں۔

منوہر۔ ارے بابا چپ بھی رہ۔ آیا ہے بڑا مرد بن کے۔ جب تیری عمر تھی تو ہم بھی آکاس پر دیا جلاتے تھے۔ پر اب وہ کلیجہ کہاں سے لائیں۔

بندا۔ ان لڑکوں کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ کیا جانیں کہ ماں باپ کے دل پر کیا جانے کیا گُجرتی ہے۔ جاؤ۔ کہو سُنو۔ دھگارو۔ آنکھیں چار ہونے سے کچھ نہ کچھ مروّت آہی جاتی ہے۔

بلاسی۔ ہاں اپنی والی کرو۔ جو بھاگ میں لکھا ہے وہ تو ہوہی گا۔

نو بج چکے تھے۔ سارا منظر کُہرے کے غلاف میں ڈھکا ہوا تھا۔ گھروں کے دروازے بند ہوچکے تھے۔ الاؤ بھی ٹھنڈے ہوگئے تھے۔ مگر سکھو چودھری کے کولھواڑے میں گڑ پک رہاتھا اور کئی آدمی بھٹّے کے سامنے آگ تاپ رہے تھے۔ گاؤں کی غریب عورتیں اپنے اپنے گھڑے لیے گرم رس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہ اتنے میں منوہر آکر سکھو کے پاس بیٹھ گیا۔ سکھو ابھی چوپال سے لوٹے تھے اور اپنے حوالیوں سے داروغہ جی کے اخلاق کی تعریف کر رہے تھے۔ منوہر کو دیکھتے ہی گفتگو کا پہلو بدل دیا اور بولے۔ آؤ منوہر بیٹھو۔ میں تو آپ ہی تمھارے پاس آنے والا تھا۔ کڑھاؤ کی چاسنی دیکھنے لگا۔ ان لوگوں کو چاسنی کی پہچان نہیں ہے۔ کل ایک پورا تاؤ بگڑ گیا۔ داروگا جی تو بہت منہ پھیلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں سب سے مچلکہ لیں گے۔ ان حاکموں کے بیچ میں بولنا اپنی جان جوکھم میں ڈالنا ہے۔ نہ کوئی بات نہ چیت، اُس کا یہ ٹُھان کھڑا ہوگیا۔ مچلکہ کا نام سُنتے ہی سب کے سب تھرا اُٹھے

ہیں۔ اب اپنا اپنا بیان بدلنے پر تیار ہیں۔

منوہر۔ تب تو بلو کے پھنسنے میں کوئی کسر ہی نہیں رہی۔

سکھو۔ ہاں بیان بدل جائے گا تو اس کا بچنا مسکل ہے۔ اسی مارے میں نے اپنا بیان نہ دیا تھا۔ کھاں ساہب مجھے بہت دم جھانسہ دیتے رہے۔ پر میں نے کہا میں نہ اِدھر ہوں نہ اُدھر ہوں۔ نہ آپ سے بگاڑ کروں گا۔ نہ گاؤں سے بُرا بنوں گا۔ اس پر بُرا مان گئے۔ سارا گاؤں سمجھتا ہے کہ میں کھاں صاحب سے ملا ہوا ہوں۔ پر کوئی بتا دے کہ میں نے اُن سے مل کر کسی کی بُرائی کی۔ ہاں اُن کے پاس آتا جاتا ہوں۔ اُٹھتا بیٹھتا ہوں۔ اتنا کرنے میں جب میرے بہت سے کام نکلتے ہیں تو بیوہار کیوں توڑوں۔ میل سے جو کام نکلتا ہے وہ بگاڑ سے نہیں نکلتا۔ ہمارا سر ہمیشہ جمیندار کے پیروں تلے رہتا ہے۔ وہ جب چاہے ہمیں کُچل سکتا ہے۔ ایسے دیوتا کو راجی رکھنے ہی میں اپنی بھلائی ہے۔

منوہر۔ تو اب میرے لیے کون سی راہ نکالتے ہو؟

سکھو ۔ میں کیا کہوں۔ گاؤں کا حال تو تم جانتے ہی ہو۔ بنا کچھ دیے دلائے کام نہ چلے گا۔ تم یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ بلراج کے لیے سب لوگ مچلکہ دے دیں۔ نہ کوئی مانے گا نہ کہنا ہی اچت ہے۔ بس اب یا تو بھگوان کا بھروسہ ہے یا اپنی گانٹھ کا۔

منوہر نے سکھو سے اور زیادہ بات چیت نہیں کی۔ سمجھ گیا کہ یہ مجھے مونڈوانا چاہتے ہیں۔ کچھ تھانیدار کو دیں گے۔ کچھ گوٹ کھاں کے ساتھ مِل کر آپ کھا جائیں گے۔ وہ اس وقت بالکل تہی دست ہورہا تھا۔ نئ گوئیں لینی پڑی سب روپے ہاتھ سے نکل گئے۔ سکمی اراضی کے نکل جانے سے آئندہ فصل کی بھی زیادہ امید نہ تھی۔ صرف اوکھ کا بھروسا تھا۔ لیکن بشیشر ساہ کے کچھ روپے دینے تھے۔ لگان بیباق کرنا تھا۔ گُڑ میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے گلوخلاصی کی کوئی ایسی تدبیر جس سے قرض لینے کی ضرورت پڑے اسے منظور نہ ہوسکتی تھی۔ تاہم اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دوسری اور کوئی تدبیر ہو ہی کیا سکتی ہے۔ بلراج پر کوئی آنچ نہ آئے۔ یہ اُس کا مقصود تھا۔ مگر یہ مقصود حاصل کیوں کر ہو۔ اس کی اُسے خبر نہ تھی۔ وہ سکھو کے پاس سے اُٹھ کر ڈپٹ سنگھ کے گھر چلا۔ پراس کا دل ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کرسکا تھا کہ اُن سے کسی قسم کی امداد کی استدعا کروں گا۔ وہ گم گشتہ مسافر کی طرح ایک پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ بالکل بے خبر کہ یہ راستہ مجھے کہاں لیے جاتا

ہے۔ محض اس لیے کہ ایک جگہ کھڑے رہنے سے چلتے رہنا زیادہ تشفی انگیز تھا۔ اسے یہ خیال ہی نہ ہوتا تھا کہ کیا ہرج ہے اگر بلراج کی خاطر لوگ مچلکہ دینے پر راضی ہوجائیں۔ یہ صورتِ نجات اتنی بعید از قیاس تھی کہ شاید اس کے ذہن میں آتی بھی تو اُسے ٹھہرنے نہ دیتا۔ ڈپٹ سنگھ کے دالان میں ایک مٹی کے تیل کی کپّی جل رہی تھی۔ زمین پر پیال بچھا ہوا تھا اور کئی مرد اور لڑکے ایک موٹے ٹاٹ کا ٹکڑا اوڑھے سورہے تھے۔ ایک گوشے میں ایک کُتیا آرام سے بیٹھی ہوئی اپنے پلّوں کو دودھ پلارہی تھی۔ دوسرے گوشے میں ایک گائے کھڑی جگالی کررہی تھی۔ ڈپٹ سنگھ ابھی سوئے نہ تھے۔ وہ اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ سکھوّ کے کولھواڑے سے گرم رس آجائے تو پی کر سوئیں۔ منوہر کو دیکھ کر چونک پڑے۔ بولے آؤ مہتو تم تو بڑے جھمیلے میں پڑگئے۔

منوہر نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ کچھ نہ پوچھو۔ تمھیں لوگ بچاؤ تو بچیں۔

ڈپٹ سنگھ۔ تمھیں بچانے کے لیے ہم لوگوں نے کون سی بات اُٹھا رکھی۔ ایسا بیان دیا کہ بلراج پر کوئی داگ ہی نہیں آسکتا تھا۔ پر بھائی اب مچلکہ تو نہیں دیا جاتا۔ آج مچلکہ دے دیں۔ کل کوئی جھوٹوں سوال دے دے تو سچا ہوجائے۔

منوہر۔ نہیں میں مچلکہ دینے کو آپ سے نہ کہوں گا۔ نہ میرے پاس اس گھڑی روپے ہیں کہ دروگاجی کے بھینٹ کروں۔ کوئی دوسرا اُپائے سوچو۔ اگر بلراج گیا تو میں بھی منہ میں کالکھ لگاکے کہیں نکل جاؤں گا۔

ڈپٹ سنگھ کو منوہر کے ساتھ ہمدردی تھی۔ لیکن مچلکے کا خوف مانعِ اظہار تھا۔ کوئی مطلب کی بات نہ سوجھی۔ دنیا اور زمانے کے دستور کے موافق شکوۂ روزگار کرنے لگے۔ بولے پرماتما چاہے سنتان نہ دے لیکن کپوت لڑکا نہ دے۔ اِس لونڈے نے اُس دن جھوٹ موٹ بت بڑھاؤ نہ کیا ہوتا تو آج تمھیں کاہے کو اس طرح مارے مارے پھرنا پڑتا۔

یکایک قادر کی آواز یہ کہتی ہوئی سُنائی دی۔ بڑا نیاؤ کرتے ہو ٹھاکُر۔ اِس لونڈے نے اس دن جھوٹ موٹ بت بڑھاؤ کیا تھا تو ڈانٹ کیوں نہیں دیا؟ تب تو تم بھی بیٹھے مسکراتے رہے اور آنکھوں سے اسٹالک دیتے رہے۔ آج جب معاملے بگڑگیا ہے تو کہتے ہو اس نے جھوٹ موٹ بت بڑھاؤ کیا تھا۔ اُس دن پہلے تمھیں نے اپنی لکڑیوں کا دُکھڑا رویا تھا۔ میں نے بھی اپنی رام کہانی کہی تھی۔ یہی باتیں سُن کر بلراج بھرا بیٹھا تھا۔ ہم نے اور تم نے

رورو کر بیگار دی پر ڈر کے مارے مُنہ نہ کھول سکے۔ وہ ہمّت کا جوان ہے۔ اس سے برداشت نہ ہوئی۔ جب وہ ہم سب آدمیوں کی کھاتر بدّو بنا تو یہ کہاں کا نیاؤ ہے کہ ہم لوگ مچلکہ کے ڈر سے اُسے آگ میں جھونک دیں۔

ڈپٹ سنگھ نے آنکھیں پھاڑکر کہا تو کیا مچلکہ دے دیں؟

قادر۔ نہیں یہ میری صلاح نہیں ہے۔ میری صلاح یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے بیان پر اڑے رہیں۔ ابھی کون جانے کہ مچلکہ دینا ہی پڑے گا۔ حاکموں کے من کی بات کون جانتا ہے ۔ لیکن اگر مچلکہ ہی دینا پڑے تو مُنہ نہ چھپانا چاہیے۔ بھلا سوچو کتنا بڑا اندھیر ہے کہ ہم لوگ مچلکہ کے ڈرسے اپنا بیان بدل دیں اور اس طرح خیال کرکے اپنے ہی لڑکے کو کنوئیں میں ڈھکیل دیں۔

منوہر نے قادر خاں کو پُرحیرت استحسان کی نگاہ سے دیکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ یہ کوئی دیوتا ہے۔ قادر کی صلاح جو معمولی انصاف پرستی تھی اُسے مافوق البشر نظر آئی۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال کبھی پیدا ہی نہ ہوسکتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرآئے۔ قادر کی طرف خاموش عقیدت کی نگاہ سے تکنے لگا۔ ڈپٹ سنگھ کو بھی یہ صلاح کچھ جچتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مچلکہ کا خوف کچھ کم ہوا۔ دل میں اپنی خودغرضی پر نادم ہوئے۔ ندامت نے زبان درازی کی اجازت نہ دی۔ تاہم یہ خیال دل سے نہ نکل سکا کہ اس معاملے کی ساری ذمّے داری بلراج کے سر ہے۔ بولے کادر بھائی۔ یہ تو تم ناہک کہتے ہو کہ میں نے بلراج کو استالک دیا۔ میں نے اتنا جرور کہا تھا کہ لسکر والے میری لکڑی اُٹھا لے گئے۔ لیکن یہ میں نے کب کہا تھا کہ تو چپراسیوں سے طول کلام کر بیٹھنا۔ اُس کا سبھاؤ ایسا کڑا ٹھہرا۔ آج تو سپاہیوں سے راڑ مچایا ہے۔ کل کو کسی پر ہاتھ ہی چلا دے تو ہم لوگ کہاں کہاں اس کی حمایت کرتے رہیں گے!

قادر۔ تو میں تم سے یہ کب کہتا ہوں کہ اس کی حمایت کرو۔ وہ بُری راہ جائے گا تو آپ ٹھوکر کھائے گا۔ میرا کہنا یہی ہے کہ ہم لوگ اپنے آنکھوں کی دیکھی اور کانوں کی سُنی بات میں اُلٹ پھیر نہ کریں۔ سچائی پررہیں۔ اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ، فریب، جال نہ کریں۔ مچلکہ کی بات ہی کیا اگر سچ کہنے کے لیے جیل بھی جانا پڑے تو ہمارا یہی دھرم ہے کہ سچ سے مُنہ نہ موڑیں۔

ڈپٹ سنگھ کو اب نکل بھاگنے کا کوئی رستہ نہ ملا۔ انصاف کا احساس خود جوئی پر غالب آگیا۔ مگر پھر بھی امید تھی کہ ممکن ہے اس فیصلے کے عملی پہلو میں کوئی راہِ فرار نکل آئے۔ بولے۔ اچھا مان لو ہم اور تم اپنے بیان پر ڈٹے رہے لیکن بشیسر ساہ اور دُکھرن بھگت کو کیا کروگے؟ وہ کسی طرح نہ مانیں گے۔

قادر۔ اُن کو بھی اسی دم کھینچے لاتا ہوں۔ مانیں گے کیسے نہیں۔ اگر دل میں اللہ کا ڈر ہے تو بھاگ کر کہاں جائیں گے۔

یہ کہہ کر قادرخاں چلے گئے اور ایک پندرہ منٹ کے اندر دونوں آدمیوں کو ساتھ لیے ہوئے آپہنچے۔ بشیسر ساہ نے ڈپٹ سنگھ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ گویا پوچھنا چاہتے تھے تم کدھر ہو؟ اور جنھیں رام چرچا سے کبھی آسودگی نہ ہوتی تھی، اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے گویا سر پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا ہے یا قادرمیاں اُنھیں کسی گہرے غار میں گرا رہے ہیں۔ ان لوگوں کو بٹھاکر قادر میاں نے اپنی پگڑی سے تمباکو نکالا۔ چلم رکھی اور دوتین دم لگاکر چلم کو ڈپٹ سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ کہو بھگت کل داروگا جی کے پاس چل کر کیا کہنا ہوگا؟

دُکھرن۔ کہنے کو جو تم لوگ کہوگے وہی میں بھی کہوں گا۔ ہاں مچلکہ نہ دینا پڑے۔

قادرخاں نے پھر اُسی استدلال سے کام لیا جو ڈپٹ سنگھ کی تالیف میں کارگر ثابت ہوئی تھی۔ سیدھے سادے کسان فلسفیانہ سینہ زوری کیا جانیں۔ اصل میں اُن لوگوں کے ذہن میں یہ بات ہی نہ آتی تھی کہ بیان کا تبدیل کرنا صریح جعل سازی ہے۔ قادرخاں نے اُنھیں یہ پہلو سُجھایا تو ان کی سادہ حق پرستی بیدار ہوگئی۔ قادر کے انداز میں ایسی بیباک سرگرمی تھی کہ اس کا ان سادہ نفسوں پر اثر ہونا یقینی تھا۔ دُکھرن بھی ان کے ہم خیال ہوگئے۔ لیکن بشیسر ساہ پر اُن کی تقریر کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ان کے یہاں شکر کا کاروبار ہوتا تھا۔ غلّے کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ ڈیوڑھی سوائی چلتی تھی۔ لین دین کرتے تھے۔ دو ہلوں کی کاشتکاری ہوتی تھی۔ گانجہ، بھنگ، چرس کا ٹھیکہ بھی لے رکھا تھا۔ پر اُن کی وضع وقطع اُنھیں ٹیکس تجویز کرنے والے افسروں کی گرفت سے ہمیشہ بچاتی رہتی تھی۔ بولے۔ بھائی تم لوگوں کا ساتھ دینے میں مَیں کہیں کا نہ رہوں گا۔ چار پیسے کا لین دین ہے۔ نرمی گرمی ڈاٹ ڈپٹ کیے بنا کام نہیں چل سکتا۔ روپے لیتے بکھت تو لوگ سگے سالے بن جاتے

ہیں۔ پر دینے کی باری آتی ہے تو کوئی سیدھے مُنہ بات نہیں کرتا۔ یہ روج گار ہی ایسا ہے کہ اپنی جمع دے کر لوگوں سے بیر مول لینا پڑتا ہے۔ آج مچلکہ دے دوں۔ کل کو کوئی جھوٹوں جاکر ایک سوال دے دے تو مجھے سچھائی کے گواہ تک نہ ملیں۔ اور پھر دُنیا میں رہ کر بُرائی بدی سے کہاں تک بچیں گے۔ یہ تو کپٹ لوک ہے۔ اپنے مطلب کے لیے دگا پھریب سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آج دھرم دیکھنے لگوں تو کل چالیس پچاس روپے ٹکس بندھ جائیں۔ اسامیوں سے کوڑی وصول نہ ہو اورسارا کاروبار مٹی میں مل جائے۔ اب تو جو روجگار رہ گیا ہے وہ اسی بے ایمانی کا روجگار ہے۔ کیا ہم ہوئے۔ کیا تم ہوئے۔ سب کا ایک ہی حال ہے۔ ہم لوگ سبھی سن کے گانٹھوں میں مٹی اور لکڑی بھردیتے ہیں۔ تیلہن اور اناج میں مٹی اور کنکر ملادیتے ہیں۔ کیا یہ سب بے ایمانی نہیں ہے۔ بے اُچت بات کہتا ہوں تو میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ تم لوگوں کو جیسا جان پڑے۔ میں مچلکہ دینے پر کسی طرح راجی نہیں ہوسکتا۔

دنیادارانہ صاف گوئی کمزور دلوں پر ہمیشہ ایک معکوس اثر پیدا کرتی ہے۔ وہ خود پڑوہیاں جو ذرا دیر کے لیے بے نفسی کی راکھ میں چھپ گئی تھیں ہوا کا جھونکا پاتے ہی پھر دہک اُٹھیں۔ دُکھرن بھگت اور ڈپٹ سنگھ کو یہ باتیں انتہا درجے کی معقول اور منصفانہ معلوم ہوئیں۔ یہی خیالات اُن کے دلوں میں بھی جاگزیں تھے مگر کسی وجہ سے ظاہر نہ ہوسکتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پُرمعنی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ سنگھ بولے۔ ساہ جی بات تو سچی کہتے ہو۔ سنسار میں رہ کر سیدھی راہ پر کوئی نہیں چل سکتا۔ بدی سے بچنا چاہے تو کسی جنگل پہاڑ میں جا بیٹھے۔ یہاں نباہ نہیں۔ بولو کادر میاں اب کیا صلاح دیتے ہو؟

قادر سمجھ گیا کہ بشیر پر دھرم اور ایمان کی تحریک کارگر نہ ہوسکے گی۔ یہ اُس وقت تک قابو میں نہ آئیں گے جب تک اِنھیں تبدیلِ بیان کے عملی نقصانات نہ دکھائے جائیں۔ بولے۔ میں کیا صلاح دوں۔ تم لوگوں کو جیسا مناسب جان پڑے۔ کرو۔ ساہ جی نے باتیں تو سب سچی کہی ہیں۔ رات دن تو ہم لوگ بے ایمانی کرتے ہیں۔ جہاں اتنے گناہوں کا اجاب نہیں ہے۔ وہاں ایک اور سہی۔ لیکن ڈر یہی ہے کہ بیان بدل کر ہم لوگ اور بھی مسکل میں نہ پڑجائیں۔ پولیس والے کسی کے نہیں ہوتے۔ یہ جانتے ہی ہو۔ پہلا بیان دروگا جی کے پاس موجود ہے۔ اُس پر ہمارے دسکھت اور انگوٹھے کے نسان ہیں۔ اب جو دوسرا بیان پاکر

وہ ہم لوگوں کو جال ساجی کے جرم میں پکڑلیں اور چالان کردیں تو سوچو کیا ہو۔ سات سال سے کم کی سجا نہ ہوگی۔ جال کی یہی سجا ہے۔ تب تو دروگا.جی ایک ایک ہجار سے کم پر بات نہ کریں گے۔ نہ بھیا۔ اس سے تو مچلکہ ہی اچھا۔

بشیر ساہ کی آنکھیں کھلیں ۔ دُکھرن اور ڈپٹ سنگھ بھی چکرائے۔ قادر کی یہ دلیل قولِ فیصل ثابت ہوئی۔ لوگ سمجھ گئے کہ ہم لوگ بُرے پھنس گئے اور اب کسی طرح نکل نہیں سکتے۔ دو برائیوں میں سے ایک کو چُن لینے کا سوال ہے۔ ساہ جی کا مُنہ تو ایسا لٹک گیا گویا روپیوں کی تھیلی گرگئی ہو۔ بولے۔ دروگا.جی ایسے تو نہیں معلوم ہوتے۔ کہنا ہی ہے تو ہمارے مالک ہی ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو ملاہجا کریں گے ہی۔ لیکن کسی کے من کا حال پرماتما ہی جان سکتا ہے۔ کیا جانے ان کے من میں کپٹ ہی ساجائے۔ تو پھر یہی صلاح پکّی کرلو کہ بیان نہ بدلیں گے نہ دروگا.جی کے پاس جائیں گے۔ جال میں تو پھنس ہی گئے ہیں۔ پھڑپھڑانے سے پھندے اور بھی کڑے بیٹھ جائیں گے۔ چپ چاپ رام آسرے گھر بیٹھے رہنا ہی اچھا ہے۔

داروغہ دیاشنکر آٹھ بجے سوکر اُٹھے اور صبوحی کے بعد ان لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن جب نو بجے تک کسی کی صورت نہ نظر آئی۔ تو غوث خاں سے بولے۔ کہیے خاں صاحب! یہ سب نہ آئیں گے کیا دیر بہت ہوئی۔

غوث خاں۔ کیا جانے کل سبھوں میں کیا مسکوٹ ہوئی۔ کیوں سکھوٗ تمھارے پاس کل منوہر آیا تھا؟

سکھوٗ ۔ ہاں آیا تو تھا لیکن ہتھے چڑھتا ہوا نہ معلوم ہوتا تھا۔ کادرمیاں نے سبھوں کو منتر دیا ہوگا۔

غوث خاں۔ ہاں یہ شرارت اُسی کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ملعون اپنی حرکت سے کسی طرح باز نہیں آتا۔ کتنا سمجھایا کہ تو کیوں ہم لوگوں کے معاملوں میں بھانجی مارتا ہے مگر سنتا ہی نہیں۔ اُس نے سبھوں کو پٹّی پڑھائی ہوگی۔ ورنہ دُکھرن اور ڈپٹ تو ایسے آدمی ہیں کہ گھڑی رات ہی سے یہاں آبیٹھتے اور بشیر تو ساری رات آپ کے دروازے سے نہ ہٹتا۔ جانتا کہ یہ گل کھلے گا تو رات بھر سبھوں کو یہیں سُلا رکھتا۔

دیاشنکر۔ اچھی بات ہے تو اب بندہ بھی اپنی رپورٹ میں یہی لکھتا ہے کہ گاؤں والوں کی

جانب سے مارپیٹ یا کسی دوسری قسم کی مزاحمت کا ثبوت نہیں ملتا۔

غوث خاں۔ للہ ایسی رپورٹ نہ لکھیے گا ورنہ گاؤں والے اور بھی شیر ہوجائیں گے۔

دیاشنکر۔ آپ کا فرمانا بجا ہے۔ پر میں اس وقت نہ آپ کا حمایتی بن کر آیاہوں اور نہ میرا کام حکام کے لیے بیگار پہنچانا ہے۔ میں تفتیش کرنے آیاہوں اور کسی کے ساتھ رورعایت نہیں کرسکتا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے مفت میں قلم اُٹھانے کا سبق نہیں پڑھا۔ کسی پر جبر نہیں کرتا۔ سختی نہیں کرتا۔ صرف اپنی محنت کا صلہ چاہتا ہوں اور مجھے محض اپنی ہی فکر تو نہیں ہے۔ میرے ماتحت اور بھی تو کتنے ہی چھوٹی چھوٹی تنخواہوں کے لوگ ہیں۔ اُن کا گزر کیسے ہو؟ گاؤں میں آپ کی دھاک بندھ جائے گی۔ اس سے میرا فائدہ؟ آپ اسامیوں کو لوٹیں گے میری غرض؟ گاؤں والوں سے میری دشمنی نہیں بلکہ وہ غریب تو میرے پُرانے وفادار اسامی ہیں۔ مچھر ہوں کی ڈنک مارتا پھروں۔ قسم کھاچکا ہوں کہ ایک سوسے نیچے کسی رقم کی طرف آنکھ نہ اُٹھاؤں گا۔ یہ رقم مجھے آپ دیں خواہ کالاچور دے۔ میرے سامنے رقم آنی چاہیے۔ گناہ بے لذّت کیوں کروں؟

غوث خاں نے بہت منت سماجت کی۔ اپنی بے کسی کا رونا رویا۔ اپنے افلاس کا پچڑا لگایا پر داروغہ جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر سوچے جب میری دھاک بندھ جائے گی تو ایسی ایسی کتنی ہی رقموں کا وارا نیارا کردوں گا۔ کچھ روپۓ اپنے صندوق سے نکالے۔ کچھ سکھوٓ چودھری سے لیے اور داروغہ جی کی خدمت میں پیش کئے۔ یہ روپۓ اُنھوں نے اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوانے کے لیے جمع کررکھے تھے۔ نکالتے ہوئے دلی صدمہ ہوا۔ پر حالات نے مجبور کردیاتھا۔ دیاشنکر نے کالے کالے روپیوں کا ڈھیر دیکھا تو چہرے شگفتہ ہوگیا۔ بولے۔ اب آپ کی فتح ہے۔ وہ رپورٹ لکھتا ہوں کہ مسٹرجوالاسنگھ بھی پھڑک جائیں۔ مگر کیا آپ نے یہ روپے زمین میں دفن کررکھے تھے کیا؟

غوث خاں۔ اب حضور کچھ نہ پوچھیں۔ برسوں کی کمائی ہے۔ یہ پسینے کا داغ ہے۔

دیاشنکر۔ آپ کے پسینے کے داغ تو نہ ہوں گے۔ ہاں اسامیوں کے خونِ جگر کے داغ ہیں۔

دس بجے رپورٹ تیار ہوگئی۔ دو دن تک سارے گاؤں میں کہرام مچا رہا۔ لوگ طلب ہوئے۔ پھر سب کے بیان ہوئے۔ آخر ہرایک سے سوسو روپے کے مچلکے لیے گئے۔

قادر خاں کو گھر سے باہر نکلنا مشکل ہوگیا۔ لوگ ساری ذمّے داری اُنھیں کے سر رکھتے تھے۔

شام ہو گئی تھی۔ بابو جوالا سنگھ شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ فیصلہ کل سُنایا جانے والا تھا۔
غوث خاں، ایجاد حسین کے پاس آکر بیٹھ گئے اور بولے۔ کیا ڈپٹی صاحب ابھی شکار سے واپس نہیں آئے؟

ایجاد حسین۔ کہیں پہر رات تک لوٹیں گے۔ حکومت کا مزہ تو دورے ہی میں ملتا ہے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کچہری کی۔ باقی سارے دن مٹر گشت کیا کیے۔ روزنامچہ بھرنے کے لیے لکھ دیا پڑتال کرتے رہے۔

غوث خاں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوا ہوگا داروغہ جی نے خوب نچوڑا۔

ایجاد حسین۔ ان ہندوؤں سے خدا سمجھے۔ یہ بلا کے متعصب ہوتے ہیں۔ ہمارے صاحب بہادر بھی بڑے منصف مزاج بنتے ہیں۔ پر کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو وہ ہندو ہی کو دی جاتی ہے۔ اردلی کے چپراسی مجید کو آپ جانتے ہوں گے۔ ابھی حال میں اُس نے جلد سازی کی دکان کھول لی۔ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی جگہ آپ نے ایک گنوار اہیر کو رکھ لیا ہے۔ تو اردلی کا چپراسی پر اس کا کام ہے گائیں دوہنا۔ اُنھیں چارہ پانی دینا۔ دورہ کے چوکیداروں میں دو کہار رکھ لیے ہیں۔ ان سے خدمت گاری کا کام لیتے ہیں۔ جس کا کام ان ہتھکنڈوں سے چلے اُسے بیگار کی ضرورت ہی کیا؟ ہم لوگوں کو البتہ حکم ملا ہے کہ بیگار نہ لی جائے۔

آفتاب غروب ہوا۔ خاں صاحب کو یاد آگیا نماز مغرب کا وقت گزرا جاتا ہے۔ وضو کیا اور ایک درخت کے نیچے نماز پڑھنے لگے۔

اتنے میں بشیر ساہ نے رَوٹی کے دروازے پر آکر اہلمد صاحب کو مؤدّبانہ سلام کیا۔ موٹا بدن۔ گاڑھے کی مرزائی۔ اُس پر گاڑھے کی چادر جس پر دھوبی کا کبھی سایہ نہیں پڑا۔ سر پر ایک میلی سی پگڑی۔ ننگے پاؤں۔ چہرے سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ خود غرضانہ انکسار کی مجسم تصویر بنے ہوئے تھے۔ ایک چپراسی نے تند لہجے میں کہا یہاں کہاں گھسے چلے آتے ہو۔ کچھ افسروں کا ادب لحاظ بھی ہے یا نہیں؟

بشیر ساہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی، ہجور ایک آرج ہے۔ حکم ہو تو کہوں؟

ایجاد حسین۔ کیا کہتے ہو کہو۔ تم لوگوں کے مارے تو مرنے کی بھی فرصت نہیں۔ جب دیکھو ایک نہ ایک آدمی شیطان کی طرح سر پر سوار رہتا ہے۔

بشیسر ساہ۔ ہجور بڑی دیر سے کھڑا ہوں۔ ادھر آنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

ایجاد حسین۔ اچھا خیر اپنا مطلب کہو۔

بشیسر ساہ۔ یہی آرج ہے کہ ہجور مجھ سے مچلکہ نہ لیاجائے۔ بڑا گریب ہوں سرکار۔ مٹی میں مل جاؤں گا۔

ایجاد حسین کے یہاں ایسے غرض کے باولے آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے ہمیشہ آیاکرتے تھے۔ وہ اُن کی کل پرزے سے خوب واقف تھے۔ پہلے بے رُخی کی۔ بعدازاں اپنی معذوری جتائی۔ پھر خطرے کا اظہار کیا۔ لیکن اوّل ہی سے تالیف کا انداز اس خوبی سے قائم رکھا کہ شکار ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔ بالآخر معاملے پر آئے۔ روپے جیب میں رکھتے ہوئے ایسی صورت بنالی گویا اپنی گرہ سے کچھ دے رہے ہیں۔ شاہ جی کو تشفی دے کر رخصت کیا۔

چپراسی نے پوچھا کیا اس سے مچلکہ نہ لیا جائے گا؟

ایجاد حسین۔ لیاکیوں نہ جائے گا۔ فیصلہ لکھا ہوا تیار ہے۔ معقول آدمی ہے۔ اس کے لیے جیسے سو۔ ویسے ایک سوبیس۔ میں نے اُس سے یہ ہرگز نہیں کہاکہ تمھیں مچلکہ سے نجات دلا دوں گا۔ محض اتنا کہاکہ تمھارے لیے اپنے امکان بھر کوشش کروں گا۔ اس کی تسکین کے لیے اتناہی کافی ہوگیا تو مجھے زیادہ دردِسر کی کیا ضرورت تھی۔ رشوت کو لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ اس وقت میں اس سے یہ روپے نہ لے لیتا تو اس کے دل کی نہ جانے کیا کیفیت ہوتی۔ معلوم نہیں کہاں کہاں دوڑتا۔ کیا کیا کرتا۔ روپے دینے سے اس کے سر کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اور دل سے بھی بوجھ اُترگیا۔ اس وقت پیٹ بھر کھائے گا اور میٹھی نیند سوئے گا۔ کل کہہ دوں گا۔ بھائی کیا کروں۔ بہت زور مارا پر ڈپٹی صاحب راضی ہی نہ ہوئے۔ موقع دیکھوں گا تو ایک چال اور چلوں گا۔ کہوں گا ڈپٹی صاحب کو کچھ نذر دیے بغیر کام نہ چلے گا۔ سوروپے پیش کرو تو تمھارا مچلکہ منسوخ کرا دوں۔ یہ چال سیدھی پڑی تو پوبارہ ہیں۔ اسی کا نام ہے ہم خُرما وہم ثواب۔ میں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ کسی پر جبر نہیں کیا۔ یہ غیبی امداد ہے اِسی سے میں ہندوؤں کے مسئلۂ تناسخ کا قائل ہوں۔ ضرور یہ شخص سابق کی زندگی میں میرا مقروض ہوگا۔ خدا

نے اس کی ادائیگی کی یہ صورت پیدا کردی۔ مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال ہے۔ نقد بے منّت سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ دیکھتے تو ہو۔ یہاں آئے دن ایسے ہی شکار پھنسا کرتے ہیں۔ گویا انھیں روپیوں سے کوئی چڑھ ہے۔ بالکل بے واسطہ بے غرض روپے پھینک جاتے ہیں۔ دل میں ان کی حماقت پر ہنستا ہوں اور خدا کا شکر کرتا ہوں کہ ایسے بندے نہ پیدا کرتا تو ہم جیسوں کا گزر کیوں کر ہوتا۔

(۱۳)

رائے صاحب کو نینی تال آئے ہوئے ایک مہینہ گزرگیا۔ ان کا بنگلہ ایک پُر فضا تال کے کنارے ہرے بھرے اشجار کے کنج میں واقع ہے جس کا کرایہ ایک ہزار روپیہ ماہوار دینا پڑتا ہے۔ کئی گھوڑے ہیں۔ متعدد نوکر۔ کئی موٹر گاڑیاں۔ یہاں وہ راجاؤں کی طرح شان سے رہتے ہیں۔ کبھی سفید پوش کُہسار کی سیر۔ کبھی شکار کے ولولے۔ کبھی آب بلوریں پر بجرے کی بہار۔ کبھی پولو اور گولف کی مَردانہ دلچسپیاں۔ کبھی نغمہ و ستار کے نشاط انگیز مشغلے۔ کبھی پکنک اور ڈِنر کی پُرلطف اور مرغوب کشش۔ نت نئے جلسے۔ نئی کیفیتیں۔ نئی سرگرمیاں اُن کے دل پُرذوق کو گُدگُداتی رہتی ہیں۔ ان مسرتوں میں وہ شباب کی امنگ کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اُن کے باغِ حیات میں بہار کا دور ہے۔ تازہ شگفتہ متبسم۔ متحرک اور ترنم ریز۔ نسیم کے جھونکوں نے پژمردگی اور غبار کی یاد بھی نہیں باقی رکھی۔ اُن کے بغیر محفلیں سونی۔ پارٹیاں بے لطف۔ جلسے پھیکے۔ سیریں بے رنگ ہوتی ہیں۔ وہ ہرایک بارات کے دولھے ہیں۔ کاؤنسل کے جلسے بلاشک معین اوقات پر ہوتے ہیں۔ لیکن اراکین کی نشاط انگیزیوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی نگاہ میں مشاغلِ تفریح کی زیادہ وقعت ہے یا مشورے کی۔

مگر گیان شنکر کا غنچۂ دل یہاں بھی شگفتہ نہیں ہوا۔ رائے صاحب نے انھیں سوسائٹی سے روشناس کرادیا۔ اُنھیں مجلسوں اور دعوتوں میں اپنے ساتھ لے گئے۔ حکام والا قدر سے اُن کے اوصاف کی تعریف کی۔ لیڈیوں سے اُنھیں انٹروڈیوس کرایا۔ اس سے زیادہ کرنا ان کے امکان میں نہ تھا۔ اِس زمین پر رنگ جمانا گیان شنکر کا کام تھا۔ اور قدرت سے انھیں اس کے وسائل بھی عطا ہوئے تھے۔ وہ بہت ہی خوش رُو خوش قامت۔ خوش زبان۔ خوش خلق واقع ہوئے تھے۔ رائے صاحب کی بے دریغ فیاضی نے انھیں احتیاط اور جُزرسی

کی قید سے بھی آزاد کردیا تھا۔ ان اوصاف اور وسائل کے ساتھ وہ ہرایک سوسائٹی میں امتیاز اور وقار حاصل کرسکتے تھے۔ پر وہ اس پودے کی طرح تھے جو ناموافق آب و ہوا میں جاکر باغبان کی کاوش کے باوجود روزبروز زرد اور خشک ہوتا جاتا ہے۔ انھیں یہاں کی ہرایک چیز بیگانہ معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی وادیٔ تاریک میں راستہ بھول گئے ہیں۔ مرصّع لیڈیوں کے روبرو کتابی واقفیت آداب کے باوجود وہ پیکرِ بے جان بن جاتے تھے۔ رائے صاحب روز انھیں تخلیے میں آداب کا سبق دیتے۔ خود نمونہ بن کر انھیں دکھاتے۔ شرفا سے کیوں کر خواہ مخواہ مسکرانا چاہیے۔ لیڈیوں کے حُسن و جمال کی کیوں کر داد دینی چاہیے۔ ان سے کس پیرایے میں گفتگو کرنی چاہیے۔ پر گیان شنکر موقع پڑنے پر بالکل بے دست و زبان بن جاتے ۔ اپنی خامیوں کا احساس اُنھیں اور بھی خفیف کردیتا تھا۔ اُنھیں حیرت ہوتی تھی کہ رائے صاحب بہ ایں پیرانہ سالی، کمسن لیڈیوں کے ساتھ کیوں کر شیروشکر ہوجاتے ہیں۔ کس بے تکلفی سے بولتے ہیں۔ کس انداز سے ملتے ہیں کہ تصنع یا آورد کا مطلق خیال نہیں ہوتا۔ گویا اُنھوں نے اِسی آب و ہوا میں تربیت پائی ہے۔

ایک دن گیان شنکر ساگر کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے چند لیڈیاں ایک بجرے پر محوِسیر تھیں۔ انھیں پہچان کر اُنھوں نے اشارے سے بلایا اور سیر کی دعوت دی۔ گیان شنکر کی صورت اِس موقع پر قابلِ دید تھی۔ اُنھیں انکار کرنے کو الفاظ نہ مل سکے۔ اندیشہ ہوا کہ یہ کج خلقی نہ سمجھی جائے۔ شرماتے ہوئے بجرے میں جا بیٹھے۔ پرصورت بگڑی ہوئی حماقت اور خفت کی تصویر۔ لیڈیوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اتنی پھبتیاں اُڑائیں کہ اگر کوئی اُنھیں دیکھتا تو پہچان نہ سکتا۔ معلوم ہوتا تھا صورت ہی مسخ ہوگئی ہے۔ گویا کوئی بندر کا بچّہ شریر لونڈوں کے ہاتھوں میں پڑگیا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ خاموش۔ قہر درویش برجان درویش۔ ہرچہ آید برسرِ فرزند آدم بگزرد کی زندہ مثال۔ ایک کونے میں دبکے سمٹے بیٹھے ہوئے اپنی تقدیر کو رو رہے تھے۔ بارے کسی طرح سیر تمام ہوئی۔ اُن کی جان میں جان آئی۔ پھر لیڈیوں کے قریب پھٹکنے کی اُن میں جرأت نہ ہوئی۔

رفتہ رفتہ گیان شنکر ان دلچسپیوں سے کنارہ کش ہونے لگے۔ حیرت ناکام نے گلوۂ تلخ سے تسکین پائی۔ رشک جو اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے دل کا کانٹا بن گیا اور شب و روز اُس

کی خلش رہنے لگی۔ ارادۂ بلند دامنِ کوہ تک لے گیا، مگر جب اُس کے نشیب و فراز، خار اور غار دیکھے تو ہمت ہار کر بیٹھ گئے اور اُن ارادے کے مضبوط، دُھن کے پورے جانبازوں کی مذمت شروع کی جو اُفتاں وخیزاں اوپر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیا شوریدہ سری ہے؟ لوگ خوامخواہ انگریزیت کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ تھوڑے سے رسوخ اور نمود کے لیے کس قدر جانکاہیاں اور اتنے رنگ و روغن پر اصلیت کا پتہ نہیں۔ کسی کے طرز و انداز میں خلقی مناسبت نہیں۔ سب کے سب نقال، بھروے، شعبدہ باز معلوم ہوتے ہیں۔ یوروپین لوگ منہ پر چاہے نہ ہنسیں لیکن اپنے مجمعِ احباب میں اُن حضرات پر خوب تالیاں بجاتے ہوں گے۔ اُنھیں نخوت اور حمق اور ہوسناکیوں کے پُتلے سمجھتے ہوں گے۔ ایسے رسوخ پر پھٹکار ہو۔ اس قدر ملمع کاریوں کا طالب ہو۔ اور تو اور لوگ لیڈیوں کے سامنے ناچنے پر بھی مرتے ہیں۔ کیسی بے شرمی ہے۔ کیسی بے حیائی۔ قوم کے نام پرداغ لگانے والی۔ رائے صاحب کو بھی اس عمر میں ناچنے کی دُھن ہے گویا مجسم حماقت دوسروں کا منہ چڑا رہی ہے۔ ڈاکٹر چندر شیکھر کہنے کو تو فلسفہ کے ماہر ہیں۔ پرش اور پرکرتی پر تقریریں کرتے ہیں۔ لیکن ناچنے لگتے ہیں تو سارا فلسفہ ہوا میں اُڑجاتا ہے۔ وہ جو راجا صاحب ہیں اندرکمار سنگھ۔ مٹکے کی طرح توند لٹکی ہوئی ہے مگر آپ کو بھی ناچنے کی ہوس۔ اُن کے شترغمزوں پر طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ سب کے سب قوم پرست اور فدائی وطن بنتے ہیں۔ جسے دیکھیے ہندوستان کے افلاس پرآنسو بہاتا نظر آتا ہے!

اسی طرح گیان شنکر کا رشک قومی ہمدردی کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ ناکام مصنف نقاد بن بیٹھا۔ ثروت کی جلوہ آرائیاں، دولت کے چونچلے، حشمت کی خودنمائیاں ناسورِ جگر بن گئیں۔ سب کے سب رنگے ہوئے سیار ہیں۔ لٹیروں کا جتھا ہے۔ قوم فروشوں کی فوج۔ کسی کو خبر نہیں غریبوں پر کیا گزررہی ہے۔ کسی کے دل میں درد کا نام نہیں۔ کوئی راجا ہے۔ کوئی تعلقہ دار کوئی بیرسٹر۔ کوئی بینکر۔ سب کے سب غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ غنیمت یہی ہے کہ اربابِ اقتدار ان حضرات کو مُنہ نہیں لگاتے۔ کہیں وہ اُن کی باتوں میں آجائیں اور قوم کی تقدیر اُن کے ہاتھوں میں دے دیں تو قوم کا کہیں نام و نشان نہ رہے۔ یہ سب دن دہاڑے اُسے لوٹ کھائیں۔ کوئی ان شعبدہ بازوں سے پوچھے کہ آپ جو یہاں نفس پرستیوں میں لاکھوں کا وارا نیارا کررہے ہیں اس سے قوم کو کیا فائدہ ہورہا ہے؟ یہی روپے

اگر رفاہِ عام میں صرف کیے جاتے تو قوم تمھیں دعائیں دیتی اور تم پر نثار ہوتی۔ ورنہ اُسے خبر بھی نہیں کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو۔ اس کے نزدیک تمھارے وجود سے تمھارا عدم بدرجہا قابلِ ترجیح ہے۔ سائل کو اس سے تسکین نہیں ہوتی کہ تم دوسروں سے سفارش کرکے کچھ دلادو۔ بلکہ جب تم اپنے انبار سے ایک مُٹھی نکال کر اُسے دے دو۔

یہ منافقانہ جذبات گیان شنکر کے دل میں سودا کی حد تک پہنچ گئے۔ زبان ان کے اظہار کے لیے تڑپنے لگی۔ ایک دن وہ ڈاکٹر چندر شیکھر سے اُلجھ پڑے اور اُنھیں خوب خفیف کیا۔ اسی طرح دوسرے دن راجا اندر کمار سے بحث کر بیٹھے اور بے لاگ باتیں کیں۔ مسٹر ہری داس بیرسٹر سے تو ایک دن ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ بالآخر لوگ گیان شنکر سے محترز رہنے لگے۔ اُن کی آمدورفت قطعی مسدود ہوگئی۔ گیان شنکر کو مذاقاً مسٹر دلفگار کہتے اور کچھ دنوں کے بعد تو لوگوں کو اُن کی صحت حواس پر بھی اعتبار نہ رہا۔ جہاں لوگ ان سے کترا کر نکل جاتے تھے، وہاں اب راہ چلتے چھیڑنے لگے۔ ان کی شعلہ زبانیوں میں دشنام مجذوب کا مزہ آنے لگا۔ مگر جب گیان شنکر نے اپنے جذبات کو ایک کثیر الاشاعت انگریزی رسالے میں شائع کیا تو سارے نینی تال میں ہل چل پڑگئی۔ جس کے قلم سے یہ مضمون نکل سکتا تھا اسے دیوانہ سمجھنا اور نشانۂ مزاح بنانا غیر ممکن تھا۔ اندازِ بیان ایسا چست۔ چٹکیاں ایسی شوخ۔ طنز ایسی ملیح۔ کنائے ایسے برجستہ تھے کہ لوگوں کو اس کی تلخی میں بھی لطف آتا تھا۔ نینی تال کی زندگی کا ایک مرقع تھا جس میں ہر ایک تصویر کسی نہ کسی اصل سے مشابہ تھی۔ مصوّر نے اصلیت کو قائم رکھتے ہوئے ہر ایک تصویر پر اس کی شخصیت ایسے کمال سے نمایاں کردی تھی کہ لوگ کٹ کٹ کر دل میں رہ جاتے تھے۔ تحریر میں ایسی لطافت تھی کہ اُس کے کتنے ہی فقرے لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔

گیان شنکر کو اندیشہ تھا کہ یہ مضمون جونہی شائع ہوا سارا نینی تال اُن کے سر ہوجائے گا۔ مگر یہ اندیشہ باطل نکلا۔ جہاں ان کی تحقیر اور تضحیک ہوتی تھی وہاں اب ان کی عزت اور توقیر ہونے لگی۔ ایک ایک کرکے لوگ آئے اور خراجِ تحسین ادا کرگئے۔ سب کے سب ایک دوسرے پر کی ہوئی چوٹوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر چندر شیکھر اور راجا اندر کمار میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ لیکن راجا صاحب پر دو رُخے سانپ کی پھبتی ڈاکٹر صاحب کو کٹا دیتی تھی۔ علیٰ ہٰذا راجا صاحب بھی ڈاکٹر سے زن پارسا کی تشبیہ پر قہقہہ دیوار

بن جاتے تھے۔ ان کی باہمی یگانگت اس حاسدانہ احتظاظ میں مانع نہ ہوتی تھی۔ یہ چوٹیں اور چٹکیاں بالکل بے کار نہ ہوئیں۔ سیر و تفریح کا انہاک کچھ کم ہوگیا۔ اگر دل سے نہیں تو محض گیان شنکر کو خوش کرنے کے لیے لوگ عام فائدے کی تجاویز میں گیان شنکر سے مشورہ کرنے لگے۔ گیان شنکر کا حوصلہ اور بھی بڑھا۔ علانیہ لوگوں کو پھٹکاریں سُنانے لگے۔ مزاج میں تمرد کی شان پیدا ہوگئی۔ تجربہ ہوا کہ اہلِ اقتدار پر کتنی آسانی سے دھاک جمائی جاسکتی ہے۔ ایک مضمون لکھ کر اُنھوں نے درجۂ شہادت حاصل کرلیا تھا۔ وہ اب محض رسوخ اور وقار کے نازبردار اور زلّہ خوار نہ تھے۔ بلکہ بیکسوں کے وکیل اور پامالوں کے رفیق تھے۔ مگر افسوس یہ حالت بہت دن نہ رہنے پائی۔ اکتوبر میں گورنمنٹ نے نینی تال کو خیرباد کہا۔ لواحقین بھی ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگے۔ مہینہ ختم ہوتے ہوتے وہ بستی ویران ہوگئی۔ چڑیاں اُڑ گئیں۔ صرف اُن کے آشیانے اپنی ویرانی کا رونا رونے کے لیے باقی رہ گئے۔ گیان شنکر پھر اُنھیں کمینہ خودغرضیوں کی آماجگاہ بنے۔ نینی تال میں بھی وہ دل میں رائے صاحب کی فضول خرچیوں پر جھنجھلایا کرتے تھے۔ لکھنؤ آکر یہ شعلہ اور بھی تیز ہوا۔ جلاہے کا غصہ داڑھی پر اُترتا۔ کبھی مختار سے کبھی محرر سے کبھی نوکروں سے اُلجھ پڑتے۔ تم لوگ ریاست کو تباہ کرنے پر آمادہ ہو۔ جیسے مالک ویسے نوکر۔ سبھی کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوئی ہے۔ مفت کا مال اُڑاتے کیا قلق ہو۔ جب پسینہ مار کرکے کماتے تو خرچ کرتے بھی قلق ہوتا۔ رائے صاحب رام لیلا کمیٹی کے صدر تھے۔ اس تقریب میں ہزاروں روپے خرچ کرتے نوکروں کو نئی نئی وردیاں ملتیں۔ رؤسا کی دعوت ہوتی۔ راج گدی کے دن برہم بھوج ہوتا۔ گیان شنکر اس صرف بیجا پر جلتے رہتے تھے۔ دیوالی کی تیاریاں دیکھ کر تو وہ اس قدر متوحش ہوئے کہ ایک ہفتے کے لیے علاقے کی سیر کرنے چلے گئے۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور کرسمس کے دن۔ رائے صاحب حکام کو ڈالیاں دینے کی تیاریوں میں منہمک تھے۔ گیان شنکر اُنھیں ڈالیاں سجاتے دیکھ کر اس طرح مُنہ بناتے گویا وہ کوئی شرمناک فعل کررہے ہیں۔ کبھی کبھی دبی زبان سے اُن کے چٹکیاں بھی لے لیتے۔ مگر رائے صاحب پر اُن کی نااہلیوں کا مطلق اثر نہ ہوتا۔ وہ گیان شنکر کے خیالات سے واقف معلوم ہوتے تھے۔ گویا محض انھیں جلانے کے لیے وہ اتنے مصروف کار تھے۔ یہ فکر گیان شنکر کی نیند حرام کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس پر جب انھیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ

رائے صاحب پر کئی لاکھ کا بارِ قرض ہے تو وہ طیش کی حالت میں وِدّیاوتی کے پاس آکر بولے۔ معلوم ہوتا ہے یہ حضرت مرتے دم تک کوڑی کفن کو نہ چھوڑیں گے۔ میں آج ہی اُن سے اس امر کے متعلق صاف صاف گفتگو کروں گا اور کہہ دوں گا کہ اگر آپ زیادہ احتیاط سے کام نہ لیں گے تو میں بھی بحدِ امکان اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کوئی بات اُٹھا نہ رکھوں گا۔

وِدّیا۔ اُن کی جائداد ہے۔ جس طرح چاہیں صرف کریں۔ تمھیں مزاحمت کرنے کا کیا حق ہے؟ کتنا ہی اُڑائیں گے تب بھی ہمارے لیے بہت کچھ بچ رہے گا۔ چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہو کہ تقدیر کدھر لے جاتی ہے۔

گیان شنکر۔ تقدیر کے بھروسے بیٹھ کر اپنی تباہی نہیں دیکھی جاتی۔

وِدّیا۔ بھیا زندہ ہوتے تب؟

گیان شنکر۔ تب دوسری بات تھی۔ میرا اس جائداد سے کوئی تعلق نہ رہتا۔ مجھے اُس کے بننے بگڑنے کی کیا فکر ہوتی۔ کسی چیز پر اپنی کا اطلاق ہوتے ہی ہمیں اُس سے روحانی اُلفت ہو جاتی ہے۔

مگر وائے نصیب۔ گیان شنکر کے تفکرات کا یہیں خاتمہ نہ ہوا۔ ابھی تک ان کی حالت ایک حملہ آور فوج کی سی تھی۔ اپنے گھر کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اَب شومئ طالع نے اُن کے گھر پر چھاپا مارا۔ اُن کی حالت دفاعی فوج کی سی ہوگئی۔ اُن کے بڑے بھائی لالہ پریم شنکر کئی سال سے مفقود الخبر تھے۔ گیان شنکر کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دفعتاً پریم شنکر کا ایک خط امریکہ سے وارد ہوا کہ میں پہلی اپریل کو بنارس میں پہنچ جاؤں گا۔ خط پڑھ کر پہلے تو گیان شنکر کا چہرے شگفتہ ہوگیا۔ اتنے دنوں کے بعد بھائی سے ملنے کی خوشی نے دل میں گدگدی پیدا کردی۔ خط لیے ہوئے وِدّیا کے پاس آئے اور یہ مژدہ سُنایا۔ وِدّیا بولی۔ دھنیہ بھاگ! بھابھی جی کی مُراد ایشور نے پوری کردی۔ اتنے دنوں کہاں تھے؟

گیان۔ وہیں امریکہ میں علمِ زراعت کا مطالعہ کرتے رہے۔ دو سال تک کسی زراعتی کارخانے میں ملازمت بھی کی ہے۔

وِدّیا۔ تو آج ابھی ۲۵ تاریخ ہے۔ ہم لوگ کل پرسوں تک یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

گیان شنکر نے آہستہ سے کہا ہاں اور کیا۔ اور باہر چلے گئے۔ اُن کی زندہ دلی ایک ہی لمحے میں غائب ہوگئی تھی۔ اُنھوں نے اب تک زندگی کے لیے جو منصوبے باندھے تھے، ان میں اپنے سوا کسی غیر شخص کے لیے گنجائش نہ رکھی تھی۔ وہ سب کچھ اپنے لیے چاہتے تھے۔ اب اُن تمام تجویزوں میں ترمیم کی ضرورت لاحق ہوگئی۔ ممکن ہے جائداد کی دوبارہ تقسیم کرنی پڑے۔ دیوان خانے میں دو خاندانوں کا گزر ہونا مشکل تھا۔ لکھن پور کے بھی دوحصے کرنے پڑیں گے۔ جوں جوں وہ ان معاملات پر غور کرتے تھے پیچیدگی بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے انھیں اپنی حالت قابلِ رحم معلوم ہونے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں مغموم بیٹھے ہوئے تھے کہ رائے صاحب آکر بولے۔ واہ! تم نے ابھی کپڑے بھی نہیں پہنے۔ کیا سیر کرنے نہ چلوگے؟

گیان شنکر۔ جی نہیں آج جی نہیں چاہتا۔

رائے صاحب۔ قیصرباغ میں آج بینڈ ہوگا۔ ہوا کتنی پیاری ہے!

گیان شنکر۔ مجھے آج معاف کیجیے۔

رائے صاحب ۔ اچھی بات ہے۔ آج میں بھی نہ جاؤں گا۔ آج کل کوئی مضمون لکھ رہے ہو یا نہیں؟

گیان شنکر۔ جی نہیں اِدھر تو کچھ نہیں لکھا۔

رائے صاحب ۔ تو اب کچھ لکھو۔ سپاہی کی تلوار میں زنگ نہ لگنا چاہیے۔ مضمون میں دیتا ہوں۔ پہلا عنوان تو ہو "امسال کا بجٹ" اور دوسرا "گائتری دیوی"۔

گیان شنکر نے کسی قدر بے اعتنائی سے کہا۔ میں نے تو آج تک کوئی بجٹ کی تقریر اول سے آخر تک پڑھی بھی نہیں۔ اس پر قلم اُٹھانے کی جرأت کیوں کر کروں؟

رائے صاحب ۔ اجی تو اُس میں کرنا ہی کیا ہے۔ بجٹ کی تقریروں کو کون پڑھتا ہے اور کون سمجھتا ہے۔ آپ تعلیم کی مد میں اضافہ کرنے کی سفارش کیجیے۔ اور تعلیم کے فوائد پر بحث کیجیے۔ علیٰ ہذا حفظانِ صحت کی مد میں بھی کمی کی شکایت کیجیے۔ اور صحتِ عامہ کی اہمیت پر دوچار موٹی موٹی باتیں لکھ دیجیے۔ پولیس کی مد میں اضافہ ضرور ہوا ہوگا۔ مسلمہ امر ہے۔ آپ اس میں تخفیف پر زور دیجیے۔ نہروں کی توسیع اور صنعت و حرفت کی ترقی کی سفارش کرکے تقریر ختم کردیجیے۔ بس اچھی خاصی بجٹ کی تنقید

ہوگئی۔ مگر یہ باتیں ایسے ملائم الفاظ میں لکھیے اور ممبر مال کی وضاحت، بیان اور حساب دانی کی ایسی تعریف کیجیے کہ وہ چیر غٹو ہوجائے، اور سمجھے کہ میں نے اُس کی تجویزوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اندازِ بیان تو آپ کا شستہ ہے ہی۔ اتنی کوشش اور کیجیے گا کہ تقریر کے ہر ایک لفظ سے منکسرانہ ہمہ دانی اور معاملے فہمی ٹپکے۔ اتنا بہت ہے۔ کون خواہ مخواہ سر مغزن کرے۔ ہماری کوئی بات مانی تو جائے گی نہیں۔ پھر بجٹ کے مسودے کو پڑھنا سمجھنا اور اس پر غور کرنا بے سوز ہے۔ ممبرمال جانتا ہے کہ ممبر صاحبان کن مدوں میں اضافہ کی سفارش کریں گے۔ اس لیے وہ پہلے ہی سے دس بیس ہزار کی تقلیل کر دیتا ہے۔ علیٰ ہٰذا جن مدوں میں ممبروں کی جانب سے تخفیف کی سفارش ہونی یقینی ہے، ان میں پہلے ہی سے دوچار لاکھ کا اضافے کر دیتا ہے۔ بعد کو ممبروں کی سفارشوں کو تسلیم کرکے ان رقموں کو حسبِ دل خواہ معین کر دیتا ہے۔ کرتا ہے وہی جو اُسے منظور ہے۔ مگرایک شانِ دلجوئی سے۔

گیان شنکر۔ اور گائتری دیوی کے متعلق کیا لکھنا ہوگا؟

رائے صاحب۔ اس کے لیے میرے پاس کافی سے زیادہ مسالا ہے۔ کچھ میرے خاندان کا حال۔ کچھ اس کے خاندان کا حال۔ کچھ اس کی تعلیم کا ذکر۔ شوہر کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد اس کے حُسنِ انتظام اور رعایا پروری کی ذرا مبالغہ کے ساتھ تفصیل کیجیے۔ ان تین سالوں میں اُس نے مختلف کاموں میں جتنے روپے دیے ہیں اور اپنے اسامیوں کے فائدے کے لیے جو انتظامات کیے ہیں ان کی تفصیل میرے پاس موجود ہے۔ اس سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔ اس خاکے میں رنگ بھرنا اور جان ڈالنا آپ کا کام ہے۔خاتمہ ان الفاظ پر کیجیے گا کہ ممدوحہ ہندوستان کی مایۂ ناز خاتونوں میں ہیں اور قدردانی اس کی مقتضی ہے کہ گورنمنٹ انھیں کوئی شایانِ شان خطاب عطا کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ لیکن جو کچھ لکھیے جلد لکھیے۔ پہلو تہی سے موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

گیان شنکر۔ بجٹ کی تقریر تو میں دوتین دن میں تیار کردوں گا لیکن دوسرے مضمون کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ میں اس اثنا میں آپ سے مکان جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میرے بڑے بھائی صاحب جو عرصے سے لاپتہ تھے پہلی تاریخ کو مکان

آرہے ہیں۔ مجھے اس کے قبل وہاں پہنچ جانا چاہیے۔

رائے صاحب ۔ وہ تو امریکہ چلے گئے تھے؟

گیان شنکر۔ جی ہاں وہیں سے خط لکھا ہے۔

رائے صاحب۔ کیسے آدمی ہیں؟

گیان شنکر۔ اس کی بابت میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔ آنے پر معلوم ہوگا کہ ان کے خیالات میں کیا تغیّر ہوا ہے۔ یوں تو بہت نیک اور صلح پسند آدمی تھے۔

رائے صاحب۔ بھائی کو قوّتِ بازو کہتے ہیں اور بھائی سے زیادہ عزیز کوئی نہیں ہوتا۔ مگر معاف کیجیے گا امریکہ کی آب و ہوا برادرانہ اخلاص و محبت کے لیے موافق نہیں ہے۔ وہاں کی تہذیب کا مدار ہی خودغرضی پر ہے۔ اور یہ غیر ممکن ہے کہ آپ کے بھائی صاحب پر اس کا اثر نہ پڑا ہو۔

گیان شنکر۔ دیکھنا چاہیے۔ میں اپنی طرف سے اُنھیں شکایت کا کوئی موقع نہ دوں گا۔

رائے صاحب ۔ آپ دیں یا نہ دیں وہ خود ڈھونڈھ نکالیں گے۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ غلط ہو۔ لیکن تجربہ یہ ہے کہ بہت دنوں تک علاحدہ رہنے سے خاندانی تعلقات کمزور ہوجاتے ہیں۔

گیان شنکر اب اپنے ضبط کو قائم نہ رکھ سکے۔ بولے۔ مجھے بھی یہی اندیشہ ہے۔ جب چھ سالوں میں اُنھوں نے ایک خط بھی نہیں لکھا تو ظاہر ہے کہ وہ برادرانہ الفت سے بے قرار نہیں ہیں۔ آپ میرے بزرگ اور مربیّ ہیں۔ آپ سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ اُن کے آنے سے میرے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ میں نے سمجھا تھا کہ چچا صاحب سے علاحدہ ہوکر سال دوسال میں میری حالت سنبھل جائے گی۔ میں نے ایک طرح سے چچا صاحب کو علاحدہ ہونے پر مجبور کیا۔ جائداد کی تقسیم بھی خاطرخواہ کرائی۔ جس کے لیے چچا صاحب کا خاندان مجھے ہمیشہ بددعائیں دے گا۔ مگر سب کیا دھرا اکارت ہوا۔ دوبارہ تقسیم ہوئی تو میں برباد ہوجاؤں گا۔

رائے صاحب ۔ کہیں انھوں نے گزشتہ سالوں کے منافعے کا دعویٰ کیا تو آپ واقعی بڑی زحمت میں مبتلا ہوجائیں گے۔ اس امر میں وکیلوں کے مشورے کے بغیر آپ کوئی کارروائی نہ کیجیے گا۔

اس طرح گیان شنکر کے توہمات کو برانگیختہ کرنے سے رائے صاحب کا منشا کیا تھا، اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ شاید وہ اُن کے دل کی تھاہ لے رہے تھے۔ یا اُن کی خود غرضی اور ہوس پروری کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ تو یہ شوشہ چھوڑکر ہوا کھانے چل دیے اور بے چارے گیان شنکر کے دل میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ جب برقی بتیاں روشن ہوگئیں تو وہ رائے صاحب کے دیوان خانے میں گئے اور الماری سے ایک قانون کی کتاب نکال کر دیکھنے لگے۔ اُن کے دل میں کئی قانونی مسائل پیدا ہورہے تھے۔ انھیں وہ اسی وقت حل کر کے اپنی تشفی کرنی چاہتے تھے۔ کیا بھائی صاحب مجھ پر گزشتہ سالوں کے منافع کا دعویٰ کرسکتے ہیں؟ اگر اُن کا یہ دعویٰ ہوتو میرے لیے بھی گریز اور عذر کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟ کیا رائے صاحب کو مجاز ہے کہ وہ ریاست کو جس قدر چاہیں زیر بار کردیں؟ اُن کے اسراف کو روکنے کی کوئی قانونی تدبیر ہوسکتی ہے؟ کیا میری طرف سے جائداد کو کورٹ آف وارڈس کے سپرد کرنے کی تحریک ہوسکتی ہے؟ اُنھوں نے پہلے ایک کتاب دیکھی۔ کچھ عقدہ نہ کھلا۔ پھردوسری کتاب نکالی۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں میز پر کتابوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ کبھی اِس کتاب کے ورق اُلٹتے کبھی اُس کتاب کے۔ مگر اس وادیٔ قانون میں جوں جوں آگے قدم بڑھاتے تھے تاریکی بڑھتی جاتی تھی۔ کسی ایک سوال کا بھی اُنھیں شافی جواب نہ مل سکا۔ سب کچھ ہوسکتا تھا اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ مایوس ہوکر بیٹھ گئے۔ دفعتاً گھڑی پر نگاہ پڑی۔ دس بجا چاہتے تھے۔ کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔ کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔

مگر جس دل میں فکروں کا طوفان اُٹھا ہوا ہو وہاں سکونِ خواب کہاں؟ ایک ہیجان کی حالت میں کروٹیں بدلتے رہے۔ اب تک وہ خود اپنے بحرِ حیات کے ساحل تھے۔ ان کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں اسی ساحل پر لنگر انداز ہوتی تھیں۔ پر آج پریم شنکر نے ایک دیو کی طرح آکر اِس ساحل کو مسمار کردیا تھا اور اُن کشتیوں کو زیرو زبر۔ اس دیو پر کیوں کر قابو پاؤں؟ زمانہ سازی سے مشکل ہے۔ وہ خود جہاں دیدہ ہے۔ ہمارے خلوص اور مروت سے؟ غیر ممکن۔ مروت کا جواب رعایت ہے۔ خودکشی نہیں۔ پھرکیا فتنہ و فسادسے؟ نہ۔ اس سے میرا پہلو اور بھی کمزور ہوجائے گا۔ اس طرح بھٹکتے ٹٹولتے گیان شنکر کو ایک راستہ نظر آگیا اور وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے۔ واہ! میں بھی کتنا کوتاہ فہم ہوں! برادری اُن حضرت کو گھر میں قدم رکھنے تو دے گی نہیں۔ وہ مجھ سے اُلجھیں گے کیا۔ اب تک یہ موٹی

سی بات بھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی۔ بنارس آتے ہی حضرت پر چاروں طرف سے بوچھاڑیں پڑنے لگیں گی۔ اُن کا وہاں قدم جمنا مشکل ہوجائے گا۔ میں اُن سے تو ظاہرداری کروں گا۔ برادری کو تنگ خیال، کم ظرف، بے انصاف کہوں گا۔ لیکن درپردہ اس کی کیل گھماتا رہوں گا۔ دس پانچ روز میں آپ ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔ شاید شردھا بھی اُن سے احتراز کرے۔ بس ذرا اُسے اشتعال دینے کی ضرورت ہوگی۔ ضعیف الاعتقاد عورت ہے۔ عام رائے کا اُس پر اثر پڑنا یقینی ہے۔ میرا میدان صاف ہے۔ ان حضرت سے خائف ہونے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔

گیان شنکر اس خیال سے اتنے خوش ہوئے کہ جی چاہا چل کر وِدّیاوتی کو جگاؤں، پر ضبط سے کام لیا۔ اس مشکل کو آسان کرکے اب انھیں شبہ ہونے لگا کہ گائتری کی ناراضگی بھی غالباً میرا وہم ہی ہے۔ میں نسوانی جذبات کے کرشموں سے بالکل ناواقف ہوں۔ میری پیش قدمی پر ناراض ہونا اس کے لیے ایک فطری امر تھا۔ کوئی مغرور عورت اتنی آسانی سے دام میں آسکتی تھی؟ حفظِ عصمت کا خیال قدرتاً اس کے جذبۂ محبت پر غالب آتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو بھی وہ اپنی بے التفاتی اور خودداری کے اظہار کے لیے عقاب کا سوانگ بھرنا ضروری سمجھتی ہے۔ بے نیازی، تغافل، سردمہری، یہ معشوقانہ ادائیں ہیں۔ غالباً اس سے مقصود امتحانِ صبر و وفا ہوتا ہے۔ وہ ایک بیش بہاجنس ہے اور اپنا نرخ ارزاں نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنی خام کاری سے ایسا دباکہ پھر سراُٹھانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ خود معصوم بننا چاہتی تھی۔ اور اس جنون کا سارا الزام میرے سر رکھنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ سرزنش برداشت کرنی چاہیے تھی۔ مگر میں خود معشوق بن بیٹھا۔ خود اس کی صورت سے گریز کرنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں مجھے بالکل بودا، کم ہمت، کرشمۂ الفت سے نا آشنا سمجھا ہوگا۔ خیر اب اُن غلطیوں کو دور کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ گویا امدادِ غیب ہے۔ اس مضمون کے نکلتے ہی اس کی ساری بے نیازی کافور ہوجائے گی۔ نمائش اور نمود پر جان دیتی ہے۔ وہ خود رائے صاحب ہیں۔ عورت کی بھیس میں۔ کہیں میری تحریک سے اُسے رانی کا خطاب مل گیا تو مجھ سا خوش نصیب دنیا میں اور کون ہوگا۔ بھائی صاحب کے جھمیلے سے ذرا فرصت پاؤں تو یہ مضمون لکھنا شروع کروں۔ معلوم نہیں اپنے خطوط میں کبھی میرا ذکر بھی کرتی ہے یا نہیں؟ چلوں وِدّیا سے پوچھوں۔ اب کی بار اُن سے ضبط نہ ہوسکا۔ وِدّیاوتی بغل کے کمرے

میں سوتی تھی۔ جاکر اُسے جگایا۔ وہ بولی کیا ہے؟ ابھی تک سوئے نہیں؟

گیان شنکر۔ آج نیند ہی نہیں آتی۔ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ رائے صاحب شاید ابھی تک نہیں لوٹے۔

وِدّیا۔ وہ بارہ بجے سے پہلے کبھی آتے ہیں کہ آج آئیں گے۔ کبھی کبھی ایک دو بج جاتے ہیں۔

گیان۔ مجھے ذراسی جھپکی آگئی تھی تو کیا خواب دیکھتا ہوں کہ گائتری سامنے کھڑی زاروقطار رو رہی ہیں۔ آنکھیں کھل گئیں۔ تب سے ہرچند چاہتا ہوں کہ نیند آجائے پر نہیں آتی۔ گائتری کے خطوط تمھارے پاس آتے ہیں نا؟

وِدّیا۔ ہاں ہفتہ میں ایک خط ضرور آجاتا ہے۔

گیان۔ کبھی میرا بھی ذکرکرتی ہیں؟

وِدّیا۔ واہ ایسا کوئی خط نہیں ہوتا جس میں تمھاری خیروعافیت نہ پوچھتی ہوں۔

گیان۔ ایک بار اُن سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔

وِدّیا۔ جاؤ تو وہ تمھاری پوجا کریں۔ تم سے اُنھیں بڑی محبت ہے۔

گیان شنکر کو اب بھی نیند نہیں آئی۔ مگر آرزوؤں کے خواب دیکھ رہے تھے۔

(۱۴)

صبح کا وقت تھا۔ گیان شنکر کاشی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے گاڑی کا انتظار کررہے تھے۔ جونہی گاڑی اسٹیشن پر آکر رُکی وہ اوّل اور دوئم درجے کے کمروں کی طرف لپکے۔ مگر وہاں پریم شنکر کا پتہ نہ تھا۔ وہ ابھی اُن کمروں میں جھانک جھانک کردیکھ ہی رہے تھے کہ دیکھا ایک تیسرے درجے سے پریم شنکر اپنا بقچہ لیے اُتررہے ہیں۔ اُنھیں دیکھتے ہی گیان شنکر سچے برادرانہ خلوص اور جوشِ محبت سے دوڑے اور اُن کے گلے سے لپٹ گئے۔ دونوں بھائی رونے لگے۔ گیان شنکر نے سوچا تھا بھائی صاحب بڑے ٹھاٹھ سے آتے ہوں گے مگر دیکھا تو ایک بقچے کے سوا اور کوئی سامان اُن کے پاس نہ تھا۔ اگرچہ وہ گیان شنکر سے پانچ سال بڑے تھے۔ مگر دیکھنے میں اتنے ہی چھوٹے نظر آتے تھے۔ چہرے پر صحت کی سُرخی جھلک رہی تھی۔

گیان شنکر ابھی قُلیوں کو پُکار ہی رہے تھے کہ پریم شنکر نے اپنا بقچہ سنبھالا اور باہر

چلے۔ گیان شنکر شرم سے پیچھے ہٹ گئے کہ کسی جان پہچان کے آدمیوں سے ملاقات نہ ہوجائے تو خفیف ہونا پڑے۔

جب دونوں آدمی تانگے پر بیٹھے تو پریم شنکر بولے۔ چھ سال کے بعد آرہا ہوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے گئے تھوڑے ہی دن ہوئے۔ گھر پر تو سب خیریت ہے؟

گیان شنکر۔ جی ہاں سب خیریت ہے۔ آپ نے تو اتنے دنوں ایک خط بھی نہ بھیجا۔ بالکل بھول ہی گئے۔ آپ کے غم میں بابوجی نے انتقال کیا۔

پریم شنکر۔ اس سانحے کی خبر تو یہاں کے اخباروں سے مجھے معلوم ہوگئی تھی۔ پر کچھ ایسے ہی وجوہ تھے کہ آ نہ سکا۔ ''ہندوستان ریویو'' میں تم نے نینی تال پر جو مضمون لکھاتھا؟ اُسے پڑھ کر میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔ تمھارے ان پاکیزہ خیالات نے مجھے کھینچ لیا۔ ورنہ شاید ابھی کچھ دن اور رہتا۔ ملکی معاملات میں شریک ہوتے ہو نا؟ یہی زندگی ہے۔

گیان شنکر نے شرمندہ ہوکر کہا ابھی تک تو اِس کا موقع نہیں ملا۔ ہاں ملکی حالات کا مطالعہ کررہاہوں۔

پریم شنکر۔ کام کیا شروع کیا؟

گیان شنکر۔ ابھی تک تو گھر کے معاملات ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ زمینداری کا انتظام کرنے کے لیے میرا گھر رہنا ضروری تھا۔ آپ جانتے ہیں یہ جنجال ہے۔ آئے دن ایک نہ ایک جھگڑا لگا ہی رہتا ہے۔

پریم شنکر۔ تو تم بھی ملکیت کے جال میں پھنس گئے اور اپنی خدا داد قابلیت کا بیجا استعمال کر رہے ہو۔ ابھی ملکیت کا خاتمہ ہونے میں کتنی کسر ہے؟

گیان شنکر۔ چچا صاحب کا بس چلتا تو اب تک خاتمہ ہوگیا ہوتا پر اب شاید اتنی جلد نہ ہو۔ میں اُن سے علاحدہ ہوگیا ہوں۔

پریم شنکر۔ یہ تم نے بُرا کیا۔ اب تو اُن کی بڑی مشکل سے بسر ہوتی ہوگی۔

گیان شنکر۔ جہاں تک میں دیکھتا ہوں کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔ دیاشنکر پولیس میں ہیں اور جائداد سے بھی دوہزار مل جاتے ہیں۔

پریم شنکر۔ چچا صاحب کو بڑا صدمہ ہوا ہوگا۔ اصل میں اِنھیں کی محبت مجھے یہاں سے

بھگالے گئی۔ تم تو ان دنوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ میں کالج سے نکلتے ہی ملکی معاملات میں بڑے جوش سے شریک ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس میرے پیچھے پڑگئی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ مجھے پھانسنے کی فکریں کررہے ہیں تو بھاگ جانے میں ہی خیریت سمجھی۔ بابوجی تو چاہے میری گرفتاری سے زیادہ متاثر نہ ہوتے۔ مگر چچا صاحب کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا۔

گیان شنکر۔ اچھا تو آپ کے امریکہ جانے کا یہ سبب تھا؟ یہ راز آج کھلا۔

پریم شنکر۔ عجیب ملک ہے۔ دیکھنے کے قابل۔ میں بڑے آرام سے تھا۔ پر یہ خیال ہمیشہ ستایا کرتا تھا کہ میں تو یہاں آرام سے پڑا ہوا ہوں اور وطن میں کام کرنے والوں کا قحط ہے۔ آخر وہ تن پروری اجیرن ہوگئی۔ تمھارا مضمون دیکھ کر یہ بھی معلوم ہوا کہ اب زبان اور قلم کو کس قدر زیادہ آزادی حاصل ہے۔ میں نے وہاں زراعت کا مطالعہ کیا ہے اور ارادہ کررہاہوں کہ ایک مزرعہ قائم کروں۔

دونوں آدمی جوں ہی گھر پہنچے۔ لالہ پربھاشنکر آکر اُن کے گلے سے لپٹ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ محلّے کے اور لوگ بھی ملنے آگئے۔ پریم شنکر دوتین گھنٹے تک انھیں امریکہ کے حالات سُناتے رہے۔ کوئی وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتا تھا۔ کسی کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ بے چارے سفرسے آرہے ہیں۔ ان کے نہانے کھانے کا وقت آگیا۔ آخر گیان شنکر کو صاف صاف کہنا پڑا آپ لوگ اب بھائی صاحب کو اجازت دے دیں کھانا تیار ہے۔

پریم شنکر کپڑے بدل کر اوپر کھانا کھانے گئے۔ اُنھیں امید تھی کہ شردھا وہاں کھڑی ہوگی۔ وہی کھانا پروسے گی۔ اس سے خوب باتیں کروں گا۔ پر یہ امید پوری نہ ہوئی۔ ایک چوکی پر قالین بچھا ہوا تھا۔ تھالی اور گلاس اس پر رکھے ہوئے تھے۔ پر شردھا کا پتہ نہ تھا۔ پریم شنکر کو اس کی بے اعتنائی سے بڑا رنج ہوا۔ شردھا کی محبت اُن کی واپسی کا خاص سبب تھی۔ اس کی یاد اُنھیں ہمیشہ تڑپایا کرتی تھی۔ ظاہرداریوں سے انھیں نفرت تھی۔ شردھا کو نیچے سب آدمیوں کے روبرو دیکھ کر اُنھیں خوشی نہ ہوتی۔ پر یہاں اُسے نہ دیکھ کر انھیں بے حد شاق گزرا۔ اِسے وہ شرم نہیں، حجاب نہیں، سردمہری سمجھتے تھے۔ اتنا رنج ہوا کہ جی چاہا اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں اور پھر کبھی آنے کا نام نہ لوں۔ پر ضبط سے کام لیا۔ کھانا

کھانے بیٹھے۔ گیان شنکر سامنے کھڑے تھے۔ اُن سے بولے آؤ بھائی بیٹھو۔ مایا کہاں ہے؟ اُسے بھی لاؤ۔ آج ایک مدّت کے بعد یہ مبارک موقع نصیب ہوا ہے۔ گیان شنکر نے سر نیچا کرکے جواب دیا۔ آپ کھائیں میں پھر کھالوں گا۔

پریم شنکر۔ گیارہ تو بج رہے ہیں۔ اب اور کتنی دیر کروگے؟ آؤ بیٹھ جاؤ۔ اتنی چیزیں میں تنہا کہاں تک کھاؤں گا۔ مجھے اب صبر نہیں ہے۔ بہت دنوں کے بعد آج چپاتیوں کے درشن ہوئے۔ کھیر، حلوہ، سموسے وغیرہ کا تو مجھے ذایقہ بھی یاد نہیں رہا۔ اکیلے کھانے میں لطف نہ آئے گا۔ یہ کیسی مہمان نوازی ہے کہ میں پہلے کھاؤں اور تم پیچھے۔

گیان شنکر۔ مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ میرا ہاضمہ کمزور ہے۔ بہت پرہیز سے رہتا ہوں۔

جب کئی بار اصرار کرنے پر بھی گیان شنکر چوکی پر نہ بیٹھے تو پریم شنکر کو وہ بات یاد آگئی جو وہ امریکہ میں بھول گئے تھے۔ سامنے کے برتنوں نے اس خیال کی تصدیق کردی۔ پھول یا پیتل کا کوئی برتن نہ تھا۔ سب چینی کے تھے۔ بولے آخر یہ بات کیا ہے کہ تمھیں میرے ساتھ بیٹھنے میں اتنا اعتراض ہے؟ کچھ چھوت چھات کا خیال تو نہیں ہے؟

گیان شنکر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ اب میں آپ سے کیا عرض کروں۔ ہندوؤں کو آپ جانتے ہی ہیں کتنے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ آپ کی واپسی کی خبر جب سے ملی ہے، ساری برادری میں طوفان سا اُٹھا ہوا ہے۔ مجھے خود تو دوسرے ملکوں کے سفر سے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تعلیم کی تکمیل اور تجربے کی توسیع کے لیے سفر کو لازمی سمجھتا ہوں۔ مگر برادری کے خلاف کوئی کام کرنے کی اخلاقی جُرأت مجھ میں نہیں ہے۔

پریم شنکر۔ اچھا! یہ بات ہے! تعجب ہے کہ اب تک کیوں میری آنکھوں پر پردہ پڑا رہا۔ اب میں زیادہ تقاضا نہ کروں گا۔ مگر افسوس یہی ہے کہ تم اتنے ذی فہم ہوکر بھی برادری کے غلام بنے ہوئے ہو۔ اگر تم دل سے سفر کو ممنوع سمجھتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا کیونکہ تمھارے خیال اور عمل میں یکسانیت ہوتی۔ لیکن دل سے کسی بات کو مان کر محض دوسروں کے خوف سے اُس پر عمل نہ کرنا تم جیسے تعلیم یافتہ آدمی کے لیے شایاں نہیں۔ میں اپنے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنے دھرم پر جتنا اعتقاد پہلے تھا اس سے کہیں زیادہ اب ہے۔ اس سے زیادہ صفائی میں نہیں دے سکتا۔

یہ کہہ کر پریم شنکر نے دوچار لقمے اور کھائے اور اُٹھ آئے۔ ایک دوسرا ہی خیال

اُنھیں بے چین کرنے لگا تھا۔ کہیں شردھا پر بھی تو گیان شنکر کے خیالات کا اثر نہیں پڑا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر میری زندگی ہی خراب ہوجائے گی۔ اس خیال نے اُنھیں اتنا پریشان کیا کہ ان کا دل قابو میں نہ رہا۔ تیسرے پہر مایاشنکر سے شردھا کا کمرہ پوچھ کر وہ اوپر چڑھ گئے۔

شردھا اس وقت اپنے کمرے کے دروازے پر اس طرح کھڑی تھی جیسے کوئی مسافر راستہ بھول گیا ہو۔ اس کا دل خوشی سے نہیں، ایک نامعلوم خوف سے کانپ رہا تھا۔ یہ مبارک دن دیکھنے کے لیے اُس نے کتنی تپسیا کی تھی۔ یہی تمنا اس کی اندھیری زندگی کا چراغ ۔اُس کی ڈگمگاتی ہوئی ناؤ کا لنگر تھی۔ مہینے کے تیسوں دن اور دن کے چوبیسوں گھنٹے اُسے یہی دلفریب خواب دیکھتے کٹتے تھے۔ مگر جس خواب میں اس کی زندگی کا راز چھُپا ہواتھا، اُسی خواب کی حقیقت سے وہ خائف ہو رہی تھی۔ وہ خواب اس کے نازک ترین جذبات کو تقویت دیتا تھا۔ اس کی حقیقت اُن جذبات کا خون کر رہی تھی۔ خواب کی پرستش کرنے میں مذہب یا برادری مزاحم نہ تھی۔ حقیقت سے ہم کلام ہونا بھی مذہبی جذبات پر بارِگراں تھا۔ شردھا میں وہ آزادیٔ خیال نہ تھی جو مذہبی یا مجلسی قیود کی پرواہ نہیں کرتی۔ وہ ایک معمولی ہندو عورت تھی۔ پریم شنکر اس لیے اُس کے شوہر تھے کہ برادری نے اُنھیں اُس کا شوہر بنایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اُس نے اُن کا انتخاب کیا تھا۔ پریم شنکر کی جگہ اگر برادری نے کسی دوسرے آدمی کو اُس کا شوہر بنایا ہوتا تب بھی وہ اسی طرح اُس کی پرستش کرتی۔ شوہر کے لیے وہ ہرطرح کی مصیبتیں برداشت کرسکتی تھی لیکن دھرم کو نہ توڑسکتی تھی۔ اُسے خوف تھا کہ دھرم کی خلاف ورزی اس کی تباہی کا باعث ہوگی۔ شاید اُس کے شوہر کے لیے مہلک ثابت ہو۔ رسوائی اور بدنامی کا خوف بھی کچھ کم نہ تھا۔ جب سے اُس نے سُنا کہ پریم شنکر گھر آرہے ہیں اس کی حالت اس مجرم کی سی ہو رہی تھی جس کے سر پر تلوار لٹک رہی ہو۔ آج جب سے وہ نیچے آکر بیٹھے تھے اُس کے آنسو ایک منٹ کے لیے بھی نہ تھمتے تھے۔ اُس کا دل کانپ رہا تھا کہ کہیں وہ اِدھر نہ آتے ہوں۔ کہیں آکر میرے سامنے کھڑے نہ ہوجائیں۔ کہیں میرا ہاتھ نہ پکڑلیں۔ وہ اُن کے سامنے کیسے کھڑی ہوگی۔ اُس کی آنکھیں کیوں کر اُن سے ملیں گی۔ اُن کی باتوں کا وہ کیسے جواب دے گی۔ وہ اُنھیں فکروں میں غرق تھی کہ یکایک پریم شنکر سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ شردھا پر اگر بجلی گرپڑتی، زمین

نیچے سے سرک جاتی یا کوئی شیر سامنے آکر کھڑا ہوجاتا تب بھی وہ اتنی سراسیمہ ہوکر اپنے کمرے میں نہ بھاگتی۔ کمرے میں جاکر وہ ایک کونے میں چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ خوف سے اُس کا ایک ایک رویاں کانپ رہا تھا۔ پریم شنکر اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر سناٹے میں آگئے۔ شاید آسمان نظروں سے غائب ہوجاتا تب بھی انھیں اتنی حیرت نہ ہوتی۔ وہ ایک لمحہ تصویر بنے کھڑے رہے۔ تب ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر نیچے کی طرف چلے۔ شردھا کے کمرے میں جانے، اس سے کچھ پوچھنے یا کہنے کی ہمّت نہ پڑی۔ اس سردمہری نے اُن کا سارا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ ان سنہرے خوابوں کو پریشان کر دیا جو برسوں سے اُن کے رفیق اور مونس بنے ہوئے تھے۔ شردھا نے کیواڑوں کی آڑ سے اُنھیں زینے کی طرف جاتے دیکھا۔ ہاں! اس وقت اس کے دل کی حالت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ جس شوہر کے فراق میں اس نے سات سال رورو کر کاٹے تھے وہ اُس وقت اُس کے سامنے مایوس، دل شکستہ، محزوں چلا جارہا تھا اور وہ اس طرح خاموش بے حس کھڑی تھی گویا بیچ میں اتھاہ ندی حائل ہے۔ دھرم پیروں میں آہنی زنجیر ڈالے ہوئے تھا۔ پریم شنکر متلاطم امواج کی طرح بار بار اُمڈتا تھا پر دھرم کی چٹانوں سے ٹکراکر گر پڑتا تھا۔ ایک بار وہ بے تاب ہوکر چلی کہ پریم شنکر کو پھیر لائے۔ دروازے تک آئی۔ پر آگے نہ بڑھ سکی۔ دھرم نے للکارا! پریم شنکر فانی ہے۔ سراب ہے۔ حُباب ہے۔ کون کس کا شوہر ہے اور کون کس کی بیوی۔ یہ سب دھوکا ہے۔ مایا ہے۔ میں قائم ہوں۔ دائم ہوں۔ حقیقی ہوں۔ میرا دامن پکڑ۔ شردھا کھڑی تاکتی رہ گئی۔ دل نے فیصلہ کیا جو آدمی سات سمندر پار گیا وہاں نہ جانے کیا کھایا کیا پیا۔ نہ جانے کس کے ساتھ رہا۔ اس سے اب میرا کیا ناتا۔ لیکن جب پریم شنکر زینے سے نیچے اُترگئے تو شردھا غش کھاکر گرپڑی۔ اُٹھتی ہوئی لہریں ٹیلے کو نہ توڑ سکیں پر کناروں کو پامال کرگئیں۔

(۱۵)

پریم شنکر یہاں دو ہفتے رہے مگر جیسے کوئی جلد چھوٹنے والا قیدی۔ ذرا بھی جی نہ لگتا۔ شردھا کی بے اعتنائی اور دنیا پرستی نے دل کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ بار بار ارادہ کرتے کہ پھر امریکہ چلا جاؤں اور آنے کا نام نہ لوں۔ دن کے دن دیوان خانے میں پڑے رہتے۔ نہ کسی سے ملتے نہ جُلتے۔ زرعی اصلاح کے سارے ارادے فسخ ہوگئے۔ اُس پر مصیبت یہ تھی کہ گیان شنکر اہلِ برادری کی مخالفتوں کا ذکر کرکے اُنھیں اور بھی پریشان کرتے رہتے تھے۔

ایک دن خبر لائے کہ لوگوں نے عام جلسے کرکے آپ کو برادری سے خارج کر دینے کا فیصلہ کر دیا۔ دوسرے دن برہمنوں کے ایک جلسہ کی خبر لائے جس میں اُنھوں نے یہ قرارداد پاس کی تھی کہ کوئی پریم شنکر کے گھر پوجا پاٹ کرانے نہ جائے۔ دوسرے دن شردھا کے پجاری نے آنا چھوڑ دیا۔ گیان شنکر باتوں باتوں میں یہ بھی جتا دیا کرتے تھے کہ آپ کے باعث میں بھی بدنام ہو رہا ہوں۔ اور خوف ہے کہ مجھے بھی لوگ نہ خارج کر دیں۔ بھائی کے ساتھ تو ان کا یہ روّیہ تھا۔ اُدھر برادری کے معززین کے سامنے جاکر پریم شنکر پر طرح طرح کے اتہام لگاتے۔ وہ تو دیوتاؤں کو گالیاں دیتے ہیں۔ کہتے ہیں گوشت سب ایک ہے چاہے کسی کا ہو۔ کھانا کھاکر کبھی ہاتھ مُنہ نہیں دھوتے۔ کہتے ہیں چمار بھی اچھے کام کرے تو برہمن ہوسکتا ہے۔ ایسی باتیں سُن سُن کر برادری والوں کا غصہ اور بھی بڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ دوچار منچلے تو اس بات پر بھی آمادہ تھے کہ پریم شنکر کو کہیں اکیلے پاجائیں تو اچھی طرح مرمّت کریں۔ "تلک" ایک مقامی اخبار تھا۔ اس میں اس مسئلے پر خوب زہر اُگلا جاتا تھا۔ گیان شنکر روزانہ یہ اخبار لاکر پریم شنکر کو سُناتے اور کُڑھاتے۔ اور یہ سب محض اس لیے کہ وہ مایوس متنفراور برگشتہ ہوکر یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں۔ مجھے جائداد میں کوئی حصہ نہ دینا پڑے۔ پریم شنکر ہمّت اور استقلال کے آدمی تھے۔ برادری کے غم و غصّے کی انھیں پرواہ نہ تھی۔ مگر انھیں یہ منظور نہ تھا کہ ان کے کارن گیان شنکر پر آنچ آئے۔ شردھا کی طرف سے بھی ان کا دل پھٹا جاتا تھا۔ مگر جائیں کہاں؟ گیان شنکر سے ایک بار لکھن پور میں جاکر رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی پر اُنھوں نے اتنے مین میکھ نکالے، مشکلات اور تردّدات کا ایسا طومار کھڑا کیا کہ وہ ان کی نیت تاڑ گئے۔ وہ شہر کے قریب تھوڑی سی ایسی زمین چاہتے تھے جہاں وہ ایک مزرعہ بناسکیں۔ اِسی دُھن میں اِدھراُدھر چکر لگایا کرتے۔ مزاج میں استغنا اتنا تھا کہ کسی سے اپنے ارادے ظاہر نہ کرتے۔ ہاں لالہ پربھاشنکر کی بزرگانہ محبت انھیں اظہارِ حال پر مجبور کر دیتی تھی۔ لالہ پربھاشنکر کو جب فرصت ملتی وہ پریم شنکر کے پاس آبیٹھتے اور امریکہ کے حالات بڑے شوق سے سُنتے۔

ایک دن پریم شنکر کو متفکر دیکھ کر لالہ جی نے کہا۔ کیا یہاں جی نہیں لگتا؟

پریم شنکر۔ میرا ارادہ ہے کہ کہیں الگ مکان لے کر رہوں۔ میرے یہاں رہنے سے سب

کو تکلیف ہوتی ہے۔
پربھا شنکر۔ آخر تمھیں ملازمت سے کیوں اتنی نفرت ہے؟ کیا یہ کوئی بُری چیز ہے؟
پریم شنکر۔ جی نہیں میں اُسے بُرا نہیں کہتا۔ مگر میرا دل اُسے قبول نہیں کرتا۔
پربھاشنکر۔ تو دل کو سمجھانا چاہیے نا۔ آج سرکاری ملازمت کی جو قدرومنزلت ہے وہ اور کہاں نصیب ہے۔ آمدنی اچھی، کام کم، تعطیلیں زیادہ۔ مگر روزگار میں ہمیشہ نقصان کا خوف۔ زمینداری میں حکام کی خوشامد اور اسامیوں کے بگڑ کھڑے ہونے کا اندیشہ۔ ملازمت ان سب سے اچھی۔ اور ملکوں کا حال تو نہیں جانتا پر یہاں کسی رئیس کو کاشتکاری کرتے نہیں دیکھا۔ مجھے تو مرجانا قبول ہے۔ مگر کاشتکاری یا دوکانداری کرنا قبول نہیں۔ تمھاری طبیعت اگر نہیں مانتی ایک بار کاشتکاری کرکے بھی دیکھ لو۔ افسوس یہی ہے کہ شہر کے قریب ہمارے پاس زمین نہیں ہے۔ ورنہ تمھیں یہ حیرانی نہ ہوتی۔ میرے گاؤں میں کرنا چاہو تو جتنی زمین چاہو دے سکتا ہوں۔ ہاں دور ہے۔

اسی حیص بیص میں چیت کا مہینہ گزرگیا۔ پریم شنکر نے زرعی مسائل پر کئی مضمون لکھے۔ اخباروں نے اُن کی بڑی تعریف کی۔ مضمون کو نقل بھی کیا۔ مگر اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ نکلا کہ تعلقہ دار ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ میں پریم شنکر کو ایک زراعتی مضمون پڑھنے کے لیے دعوت دی گئی۔ پریم شنکر پھولے نہ سمائے۔ بڑی تحقیق اور تلاش سے ایک مضمون تیار کیا اور لکھنؤ آپہنچے۔ قیصرباغ میں ایک شاندار پنڈال بنایا گیا تھا۔ رائے کملانند اس ایسوسی ایشن کے سیکرٹری تھے۔ پریم شنکر ان کے مکان پر پہنچے تو رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ مئی کا مہینہ شروع ہوگیا تھا۔ رائے صاحب اس وقت اپنے باغ میں نہ تھے۔ بلکہ اس گرمی میں اپنے دیوان خانے کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پریم شنکر کے آنے کی خبر پاتے ہی اُنھیں وہیں بلا بھیجا۔ ایک طاق پر دھندلا سا چراغ جل رہا تھا۔ گرمی ایسی تھی گویا اگن کنڈ ہے۔ پر اس آگ کی بھٹی میں رائے صاحب ایک موٹا سا کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک نور برس رہا تھا۔ ہیبت اور جلال کے پُتلے معلوم ہوتے تھے۔ جسم اتنا گٹھیلا تھا کہ ایک اچھے پہلوان کا بھی نہ ہوگا۔ اُن کے گلے میں ایک رُودراکچھ کی مالا تھی۔ سامنے ایک چھوٹی سی چوکی پر چاندی کا ایک پیالہ اور ایک صراحی رکھی ہوئی تھی۔ تخت کے ایک طرف دو موٹے تازے جوان بیٹھے پنجہ لڑا رہے

تھے۔ اور دوسری طرف تین نازک بدن و وضع پریاں رونق افروز تھیں۔ اِندر کا اکھاڑا تھا جس میں اِندر کالے دیو اور پریاں سبھی اپنا اپنا پارٹ کھیل رہے تھے۔

پریم شنکر کو دیکھتے ہی رائے صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ بیٹھنے کو ایک کرسی منگوائی اور بولے۔ معاف کیجیے گا میں اس وقت دھیان میں تھا۔ پر آپ سے ملنے کا اتنا اشتیاق ہوا کہ ضبط نہ کرسکا۔ آپ کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں۔ دنیا اس ذاتِ باری کی مجازی صورت ہے۔ جس نے دنیا دیکھ لی اس نے ذات باری کے درشن کرلیے۔ سفر ہی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہے۔ آرام سے بیٹھیے۔ کچھ جل پان منگواؤں؟

پریم شنکر۔ جی نہیں۔ ابھی جل پان کرچکا ہوں۔ اس وقت اشتہا نہیں ہے۔

رائے صاحب۔ سمجھ گیا۔ آپ بھی جوانی میں بوڑھے ہوگئے۔ کھانے پینے میں پرہیز اور احتیاط ہی بڑھاپا ہے۔ جوان وہ ہے جو کھانے کے بعد پھر کھائے۔ اینٹ پتھر تک ہضم کرجائے۔ جو ایک بار ناشتہ کرکے پھر نہیں کھاسکتا، جس کے لیے کدو بادی ہے، کریلا گرم، کٹہل ثقیل، اُسے میں بوڑھا ہی سمجھتا ہوں۔ میں سب کچھ کھاتا ہوں۔ مطلق پرہیز نہیں کرتا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ۶۰ سال کی عمر میں بھی جوان ہوں۔

یہ کہہ کر رائے صاحب نے صراحی مُنہ سے لگائی اور کئی گھونٹ غٹ غٹ پی گئے۔ پھر پیالے میں سے کئی چمچے نکال کر کھائے اور زبان چٹخارتے ہوئے بولے۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں ذایقے کا غلام ہوں۔ میں خواہشات کا غلام بن کر نہیں، اُن کا آقا بن کر رہتا ہوں۔ تیراک وہ ہے جو پانی میں غوطے لگائے۔ سورما وہ ہے جو میدان میں اُترے۔ وبا سے بھاگنا مرنے سے مصئون رہنے کی سند نہیں۔ حقیقی صیانت وہ طبعی حرارت، وہ اندرونی شعلہ ہے جو مرض کے جراثیم کو جلاکر خاک سیاہ کر دے۔ اس آفتابے میں مئے سہ آتشہ ہے۔ مگر میرے لیے آبِ سرد سے زیادہ نہیں۔ پیالے میں بیضۂ مرغ کا حلوہ ہے۔ مشک اور زعفران اور مقویات سے پُر۔ اس کا ایک چمچ کسی زاہد کو مست کر دینے کے لیے کافی ہے۔ پر میرے لیے سوکھے ساگ سے زیادہ نہیں۔ یہی میری نذر ہے۔ میں شیوکا اُپاسک ہوں۔ زہر سے بھاگتا نہیں اُسے شربت کی طرح پیتا ہوں۔ آپ اس تثلیث حُسن کو دیکھ کر چونکتے ہوں گے۔ ظاہربیں آنکھیں ان کے خدوخال اور ناز و ادا پر مٹتی ہیں۔ میرے لیے یہ مٹی کے کھلونے ہیں۔ میں اس جلوے کو دیکھتا ہوں جو اس صورت کے پردے میں پوشیدہ ہے۔ خاکی

پیرہن کتنا ہی خوش بنا ہو۔ میری نگاہ کو مائل نہیں کرسکتا۔ وہ بھکوے ہیں جو غاروں میں بیٹھ کر اشراق اور حبسِ دم کے سوانگ بھرتے ہیں۔ وہ بزدل ہیں۔ ترغیبات سے مُنہ چھپانے والے، لغزشوں سے دور بھاگنے والے۔ وہ کیا جانیں کہ روحانی آزادی کیسی نعمت ہے۔ وہ خشک پتے ہیں جنھیں ہوا کا ایک جھونکا زمین پر گراسکتا ہے۔ ترک کوئی مجازی فعل نہیں ہے۔ ضبط اور عزم ہی حقیقی زہد، حقیقی ادراک ہے۔ لطیف غذائیں کھائیے، لطیف نغمے سُنیے، لطافتِ حُسن کی بہار لوٹیے۔ مگر ان خواہشات کے غلام نہ بنیے اور آپ سچّے زاہد عابد اولیا ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ روحانی معراج پرماتما کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ میں سعی اور عمل کا قائل نہیں۔ انسان کی حقیقت اور ہستی کیا کہ اُسے اختیار کا درجے عطا ہو۔ تدبیر گورکھ دھندھا ہے۔ محض سراب۔ میں اُن رفارمروں پر ہنستا ہوں جو دینا کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔ جو دل سے رنج اور تکلیف، افلاس اور خودغرضی کو کھودکر پھینک دینا چاہتے ہیں۔ زعمِ باطل۔ یہ نخوت کے بندے اور تکبیر کے متوالے پرماتما کے کارخانے میں دخل دینا چاہتے ہیں۔ پرماتما اُن کی حماقت اور جہالت پر ہنستا ہے۔ جب سے دنیا قائم ہوئی شاید انسان نے اپنی بہترین طاقت اپنی حالت کے سنوارنے اور سُدھارنے میں صرف کی ہے۔ کیا نتیجہ ہوا؟ دنیا آج بھی ویسی ہی خودغرض، ویسی ہی بے رحم، ویسی ہی نفس پرور بنی ہوئی ہے۔اس خودسری کی کوئی انتہا ہے کہ آپ ذرہ بھر عقل پر پھولے نہ سمائیں اور آفتاب کو مشعل دکھانے پر آمادہ ہوجائیں۔ کاش دنیا کی اصلاح کا بیڑا اُٹھانے کے بجائے انسان نے اپنی اصلاح کی ہوتی تو شاید آج دنیا اس سے کہیں بہتر ہوتی۔ میرا فلسفۂ زندگی تو یہی ہے کہ آزاد رہو۔ بے لوث رہو۔ بے خوف رہو۔ چین سے زندگی کے مزے اُٹھاؤ۔ دنیا کی بہاریں لوٹو اور پرماتما کا کام پرماتما کے لیے چھوڑ دو۔ ارے پنڈاجی تم بالکل گوکھے ہی رہے۔ ہمارے بابوصاحب امریکہ سے آئے ہیں۔ ہمارے داماد ہیں۔ کچھ ان کی خاطرمدارات ہونی چاہیے یا نہیں؟ دوچار کبت سناؤ۔ ایسا پھڑکتا ہوا کلام ہوکہ بابوصاحب کی طبیعت شگفتہ ہوجائے۔

دونوں قوی ہیکل پنڈے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم آواز ہوکر ایک کبت پڑھنے لگے۔ آواز بہت رسیلی تھی۔ لب و لہجہ خاطرنشین۔ مگر کبت کیا تھا مغلظات کا افسانہ اور نجاست کا پوتھا تھا۔ ایک ایک لفظ بے حیائی اور بے شرمی میں ڈوبا ہوا۔ معلوم نہیں کس خر دماغ شاعر

کی فکرِ متعفن کی طرح آزمائی تھی کہ سارا کبت اول سے آخر تک شرمناک اعضا کی تکرار سے پُر تھا۔ وہ الفاظ جنھیں سُن کر مذاق سلیم استکراہ سے استفراغ کرنے لگے، ایسی بے تکلفی سے اور صفائی سے نکل رہے تھے گویا منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ رائے صاحب صورتِ تصویر بیٹھے رہے۔ ہنسی کا تو ذکر ہی کیا، ہونٹوں پر تبسّم کا بھی نشان نہ تھا۔ مگر تینوں حسینوں نے شرم سے زمین میں سر گڑا لیا اور پریم شنکر باوجود انتہائی ضبط کے ہنسی کو نہ روک سکے۔ پھر تو انھوں نے قہقہے لگانا شروع کیے۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے ان کے پیٹ میں بل پڑگئے۔ اور اب بھی کبتوں کا وہ سلسلۂ لاانتہاہی ختم نہ ہوا۔ دریدہ دہنی کے موردِ الزام بھانڈ بھی اس حد تک فحش سرائی نہ کرتے ہوں گے۔ کبت کیا ہے سارے ہندوستان کے ابیر اور پھاگ کا عطر۔ سارے لالاؤں کی مجلسی غزل خوانی اور ہرزہ سرائی کا خلاصہ۔ سارے ہندوستانی اناث کی رسمی اور رواجی گالیوں کا نچوڑ۔ اور سارے پولیس کے عمال کی بدزبانیوں کا لب لباب۔

آخر رائے صاحب نے پنڈوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور طوائفوں کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھا۔ وہ سنبھل بیٹھیں۔ سازندے جو دیوان خانے میں منتظر بیٹھے تھے اپنے اپنے ساز لے کر آگئے۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ زیروبم کی گونج اُٹھی۔ سارنگی نے سُر ملایا اور تینوں مہ جبینوں نے ہم آہنگ ہوکر ایک دُھرپد الاپنا شروع کیا۔ پریم شنکر کو نغمے کا ذوق نہ تھا۔ مگر رائے صاحب مست ہو ہو کر جھومتے تھے اور کبھی کبھی خود گانے لگتے تھے۔

رائے صاحب نے پوچھا۔ آپ کو کیا چیز پسند ہے؟ جے دیو کے پد سنواؤں؟

پریم شنکر نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے تو جے دیو کا نام بھی نہیں سُنا۔ کیا کوئی بڑا شاعر گزرا ہے؟

رائے صاحب۔ اس فن میں یگانۂ روزگار تھا صاحبِ شرنگار رس کا ایسا شریں بیان شاعر پیدا نہیں ہوا۔ آپ کو کون سا رس پسند ہے؟ کہیے کرونا رس کی کوئی چیز چھیڑنے کو کہوں۔

پریم شنکر۔ جناب میں اس فن سے بالکل کورا ہوں۔ میں نے کچھ غزلیں اور تھیئٹر کے گانے سُنے ہیں۔ اور وہی سمجھتا ہوں۔ راگ اور رس کا مجھے مطلق علم نہیں ہے۔

رائے صاحب ۔ تب تو معاف کیجیے گا میں یہی کہوں گا کہ آپ زندگی کی بہترین نعمت سے محروم ہیں۔ ہندوستانی سنگیت اپنا جواب نہیں رکھتا۔

پریم شنکر۔ جی ہاں میں نے بھی انگریزی رسالوں میں اس کی تعریف سُنی ہے۔ مگر کبھی اس کے مطالعے کرنے کا موقع نہیں ملا۔

رائے صاحب۔ اچھی بات ہے تو تھیئٹر کی چیزیں سُنیے۔ استاد محمد حسین یا پیارے صاحب یا ماسٹر مدن کی کوئی چیز ہو؟

دس بجے رات تک شیریں نوائیوں کے دور چلتے رہے۔ پریم شنکر کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ شخص کتنا طبّاع، کتنا بیدار مغز، کتنا جامع انسان ہے۔ کتنا رنگین مزاج، کتنا باذاق۔ اس کا فلسفۂ زندگی کتنا انوکھا ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو اِس کا ضبط اور قابوئے نفس ہے۔ لوگ کہتے ہیں ایسی کرامات جوگیوں میں ہوتی ہے۔ ضرور یہ شخص بھی یوگ کرتا ہوگا۔ ورنہ اس، سِن و سال میں یہ دم خم۔ معلوم ہوتا ہے ابھی عنفوانِ شباب ہے۔

دوسرے دن پریم شنکر سوکر اُٹھے تو آٹھ بج گئے تھے۔ کچھ ترشح ہو رہا تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلنے لگے کہ سامنے سے رائے کملانند ایک مشکی گھوڑے پر سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ خاکی برجیس اور شکاری کوٹ ان کے جسم پر خوب کھِلتے تھے۔ بالکل یوروپین معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے کندھے پر بندوق تھی۔ پیچھے پیچھے شکاری کتّوں کا ایک غول چلا آرہا تھا۔ پریم شنکر کو دیکھتے ہی بولے۔ مسٹر شنکر آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ آج کوئی وار خالی نہیں گیا۔ دو خرگوش دو ہرن اور کئی چڑیاں ہاتھ لگیں۔ آپ جانتے ہیں کتنی دور نکل گیا تھا۔ تیس میل سے چلا آرہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کر لوگ آٹھ آٹھ نو نو گھنٹے سویا کرتے ہیں۔ میں تین گھنٹے سے زیادہ کبھی نہیں سویا۔ تین بجے اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ اسی وقت کچھ ورزش کرلیتا ہوں۔ یہ دونوں پٹھے اسی لیے رکھ چھوڑے ہیں۔ باقی سارا دن زندگی کا لطف اُٹھانے میں صرف کرتا ہوں۔ معلوم ہے نا، آج تین بجے جلسہ شروع ہوگا؟

پریم شنکر۔ آپ نے افتتاحی تقریر تو لکھ لی ہوگی؟

رائے صاحب۔ (ہنس کر) ایک حرف نہیں۔ مجھے مطلق خبر نہیں کہ وہاں کیا کہوں گا۔ بس عین موقع پر جو کچھ منہ میں آئے گا بک ڈالوں گا۔

پریم شنکر۔ آپ کی طبیعت بہت حاضر ہوگی؟

رائے صاحب۔ جی ہاں میرے ایسوسی ایشن میں ایسا کوئی نہیں جس کی طبیعت حاضر نہ ہو۔ اس صفت میں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ خزانچی صاحب کو آمدو خرچ کا پتہ نہیں مگر

عین موقع پر حساب کی فرد پیش کردیں گے۔ سکریٹری صاحب کو مطلق علم نہیں کہ دوران سال میں ایسوسی ایشن پر کیا گزری پر عین موقع پر وہ ایک دلچسپ اور مفصل داستان سُنا دیں گے۔ زندگی اتنی مختصر ہے کہ انسان کو اپنی ہی ڈھول پیٹنے سے فرصت نہیں ملتی۔ قوم کا مجیرا کون بجائے۔ یہاں قوم کا کام اسی طریق سے ہوتا ہے۔

پریم شنکر۔ تو ایسی قومی تحریکوں سے فائدہ کیا؟

رائے صاحب۔ فائدہ کیوں نہیں۔ کیا آپ کے خیال میں قوم کی پیشوائی فائدہ سے خالی ہے؟ آج کل یہ سنہرے خطابات کا صدر دروازہ ہورہی ہے۔ خوش اعتقادوں کی نگاہ میں دیوتا بن جانا کیا کوئی معمولی بات ہے؟ بے چارے قوم کے نام پر مٹنے والے سیدھے سادے لوگ دور دور سے ہمارے درشنوں کو آتے ہیں۔ ہمیں دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔ ہماری گاڑیاں کھینچتے ہیں۔ ہمارے پیروں کی خاک ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ہم کامل فوق الفطرت انسان ہیں۔ صوری و معنوی محاسن سے بھرے ہوئے۔ہم میں کتنے ہی قومی فدائی ایسے ہیں جو اُس کا حساب دل ہی میں رکھتے ہیں۔ اُن سے حساب پوچھیے تو وہ اِسے اپنی توہین سمجھیں گے اور فوراً استعفیٰ پیش کردیں گے۔ ہمارے سکریٹری صاحب کی وکالت بالکل نہیں چلتی اور جائداد بھی وافر نہیں۔ مگر ابھی اُنھوں نے پچاس ہزار کا ایک بنگلہ مول لیا ہے۔ اور اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ قوم سے یوں بھی لینا ہے ووں بھی لینا ہے۔ چاہے اِس بہانے سے لیجیے چاہے اُس بہانے سے لیجیے۔

پریم شنکر۔ میں نے تو اپنا مضمون بہت محنت اور تلاش سے لکھا تھا۔

رائے صاحب۔ تو اُس کی آپ کو کافی داد ملے گی۔ جلسے میں تو اسے پڑھنے کا موقع نہ ملے گا۔ ہاں اخباروں میں اس کی اشاعت ہوجائے گی۔ ساری دنیا پڑھے گی اور اس سے فائدہ اُٹھائے گی۔ آج تو میری تقریر اور سالانہ رپورٹ پیش ہوگی۔ کل گارڈن پارٹی ہے۔ ہنراکسیلنسی اور سارے حکّام مدعو ہیں۔ سارا دن دعوت کی تیاریوں میں صرف ہوجائے گا۔ پرسوں سب چڑیاں اُڑجائیں گی تب آپ اطمینان سے اپنا مضمون پڑھیے گا۔

یہی باتیں ہورہی تھیں کہ راجا اِندرکمار سنگھ تشریف لائے۔ رائے صاحب نے ہاتھ ملاکر پوچھا نینی تال کا کب تک قصد ہے؟

راجا۔ میں تو سب تیاریاں کرچکا ہوں۔ یہاں سے ہنرا کسیلنسی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ یہ مسٹر پریم شنکر ہیں؟ آپ خوب آئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ میں آپ کے کئی مضامین اخباروں میں دیکھ چکا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ فنِ زراعت کے ماہر ہیں۔ مگر آپ جو تجویز کر رہے ہیں اس کے لیے اس ملک کی آب و ہوا کچھ موافق نہیں معلوم ہوتی۔ ہماری سرکار نے زراعت کی ترقی کے لیے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ جگہ جگہ تجربہ گاہیں قائم کیں۔ وہاں سستے داموں اچھے بیج بکتے ہیں۔ زراعتی ایجادوں کے متعلق ایک اخبار شائع کرتی ہے۔ زراعتی کالج کھول رکھے ہیں۔ پر اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ جب وہ کروڑوں روپے خرچ کرکے کامیاب نہ ہوسکی تو آپ دوچار لاکھ کے سرمایہ سے کیا کرلیں گے؟ آپ کے بنائے ہوئے اوزار کوئی مفت بھی نہ لے گا اور آپ کی کیمیائی کھادیں پڑی پڑی سڑجائیں گی۔ بہت ہوا تو آپ سرمایہ پر ۵ ۔۷ سینکڑہ منافع تقسیم کر دیں گے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب ہم دوچار کنوئیں کھدواکر، پٹواری سے مل کر، حکام کی ناز برداری کرکے اپنے محاصل میں خاطرخواہ اضافہ کرسکتے ہیں تو یہ جھنجھٹ کون کرے!

پریم شنکر۔ میں کوئی کاروبار نہیں کھولنا چاہتا۔ ممکن ہے آئندہ کچھ فائدہ ہوسکے۔ پر ابھی تو منافع کی کوئی امید نہیں۔

راجا ۔ سمجھ گیا۔ یہ خالص قومی کام ہے۔ مگر آپ نے بسم اللہ غلط کی ہے۔ آپ کو اس معاملے میں پہلے لاٹ صاحب کی ہمدردی حاصل کرنی چاہیے تھی۔ تب دولاکھ کی جگہ آپ کو بات کی بات میں دس لاکھ مل جاتے۔ سرکاری دلچسپی کے بغیر یہاں ایسے کاموں کو فروغ نہیں ہوتا۔ اس ملک میں آپ جتنی قومی تحریکیں دیکھ رہے ہیں سبھی سرکار کی شرمندۂ احسان ہیں۔ رائے صاحب اگر آپ کی ہنرا کسیلنسی سے ملاقات کروا دیں اور اُن کی آپ کے اوپر نظرِ عنایت ہوجائے تو کل ہی روپیوں کا ڈھیر لگ جائے۔

رائے صاحب ۔ میں بڑی خوشی سے حاضر ہوں۔

پریم شنکر۔ میں اس تحریک کو سرکاری مداخلت سے پاک رکھنا چاہتا ہوں۔

راجا ۔ تو ایسی حالت میں آپ اس ایسوسی ایشن سے امداد کی توقع نہ رکھیں۔

پریم شنکر۔ تو پھر میرا یہاں رہنا بے کار ہے۔

اسی دن پریم شنکر بنارس لوٹ آئے۔

دو تین دن تک تو پریم شنکر بہت متفکر رہے۔ مگر اس لیے نہیں کہ انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ بلکہ اس لیے کہ اُنھوں نے روٗسا کے سامنے امداد کے لیے ہاتھ پھیلاکر اپنا بھرم کھویا۔ یہ تنہائی صبر آزما ہونے پر بھی تہذیبِ نفس کے لیے بہت معاون تھی۔ انھیں اب معلوم ہوا کہ تجربہ گاہوں کی تجویز میں میری نام و نمود کی غرض بھی شامل تھی۔ اس حقیقت کی طرف سے وہ آنکھیں نہ بند کرسکتے تھے۔ اِس ناکامی کو اُنھوں نے اُس خودغرضی کی سزا سمجھ کر اپنے دل کو تسکین دی۔ اور ایسا طریق کار سوچنے لگے جس میں کسی کا دستِ نگر بننے کی ضرورت نہ ہو۔ تجربہ گاہیں قومی خدمت کا واحد ذریعہ تو نہیں ہیں۔ خدمت کی اُتنی ہی مفید اور بھی صورتیں ہیں۔ انھیں اب معلوم ہوا کہ سب سے پہلے دیہات میں اعتماد اور اعتبار پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر فلاح کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے رفتہ رفتہ یہ معمول کرلیا کہ سویرے گھر سے نکل جاتے اور قرب و جوار کے مواضعات میں جاکر کسانوں سے کھیتی باڑی کے متعلق بات چیت کرتے۔ ان پر اب روشن ہوا کہ کسانوں کو جاہل سمجھنا ان کی غلطی تھی۔ کسانوں سے اُنھیں کتنی ہی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ پھر وہ دن دن بھر گھر سے باہر رہنے لگے۔ کبھی کبھی دور کے دیہات میں چلے جاتے تو دو دو تین تین دن میں واپس آتے۔

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ آسمان سے آگ برستی تھی۔ حکّام پہاڑیوں پر تھے۔ عمال خس کے کمروں میں۔ شہر کے لوگ پٹے ہوئے گھروں میں دوپہری کاٹتے تھے۔ لیکن پریم شنکر کو اکثر درختوں کے نیچے لوٗ کے جھونکے کھانے پڑتے۔ کبھی کبھی کھانا نہ میسّر ہوتا۔ خدمت کی دُھن نے اُنھیں جسمانی آسائش سے بے نیاز کردیا تھا۔ کبھی کسی گاؤں میں ہیضہ پھیلنے کی خبر ملتی۔ کہیں دیمک اور کیڑے اوکھ کی کھیتی کا صفایا کئے ڈالتے تھے۔ کبھی کسی موضع سے مارپیٹ کی خبر آتی۔ پریم شنکر ڈاکیے کی طرح اِن سبھی موقعوں پر پہنچتے اور بہ حد امکان دافع ضرر کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھی لکھن پور تک کا دھاوا مارتے۔ جب اساڑھ میں مینہ برسا تو پریم شنکر کو اپنے کام میں دشواریاں پیش آنے لگیں۔ روز شہر جانا اور روز آنا مشکل تھا۔ اس لیے انھوں نے شہر سے پانچ چھ میل دور برنا ندی کے کنارے حاجی گنج میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ گاؤں کے باہر ایک پھوس کا جھونپڑا پڑگیا۔ دو تین کھاٹیں آگئیں۔ کھانے پینے کے برتن جمع

ہوگئے۔ گاؤں والوں کو اُن سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے قیام کو لوگوں نے غنیمت سمجھا۔ سبھی انھیں اپنا مددگار، اپنا سچا مشیر اور ہوا خواہ سمجھتے تھے اور ان کے اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔

اگرچہ پریم شنکر کو اس گوشۂ عافیت میں ہر قسم کا سکون اور اطمینان تھا، پر شردھا کی یاد کبھی کبھی بے قرار کر دیتی تھی۔ وہ سوچتے، کاش وہ میرے ساتھ ہوتی تو کتنے آرام سے زندگی بسر ہوتی۔ ان پر اب یہ راز مخفی نہ تھا کہ گیان شنکر ہی نے اُن کے خلاف اُس کے کان بھرے ہیں۔ اس لیے انھیں اَب اس پر غصہ کے بجائے رحم آتا تھا۔ اُن کے دل میں ایک بار اس سے ملنے کے لیے بار بار تحریک ہوتی تھی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اسے ایک خط لکھیں۔ مگر یہ سوچ کر کہ شاید جواب نہ دے ٹال جاتے تھے۔ یہ فکر تو تھی ہی۔ اُس پر تہی دستی اور بھی سوہانِ روح تھی۔ امریکہ سے جتنے روپے لائے تھے وہ سب ان چار مہینوں میں خرچ ہوچکے تھے۔ روپے کی ضرورت ہمیشہ ستاتی رہتی تھی۔ کسانوں سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُنھیں شرم آتی تھی۔ وہ اُن پر اپنی خوراک کا بار ڈالنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اور شہر کے رئیسوں سے مدد مانگنا تو ان کے لیے بعید از قیاس تھا۔ آخرکار اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ گیان شنکر ہی سے اپنے حصے کا نفع مانگنا چاہیے۔ اُنھیں میرے حصے کی پوری رقم ہضم کرجانے کا کیا حق ہے؟ شردھا کی کفالت کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ میرا آدھا حصہ لے سکتے ہیں۔ پھر بھی مجھے ایک ہزار کے قریب مل جائیں گے۔ فی الحال اس سے کام چل جائے گا۔ آیندہ کے لیے کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ اس آمدنی پر اُصولاً میرا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ میری کمائی نہیں ہے۔ لیکن میں اُسے اپنی ذاتی ضروریات کے لیے تو نہیں چاہتا۔ اُسے رفاہِ خلق میں صرف کردینا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ پہلے پریم شنکر کی نگاہ اس طرف کبھی نہ گئی تھی۔ وہ اِن روپیوں کو اپنے تصرف میں لانا شرمناک ہی نہیں۔ جُرم سمجھتے تھے۔ حد درجہ ناجائز۔ مگر افلاس اکثر اصولوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ سوچا تو تھا کہ خط میں سب کچھ صاف صاف لکھ دوں گا۔ مگر لکھنے بیٹھے تو صرف یہ لکھا کہ مجھے روپیوں کی اشد ضرورت ہے۔ امید ہے تم میری کچھ مدد کروگے۔ گیان شنکر کو یہ خط ملا تو جامے سے باہر ہوگئے۔ شردھا کو سُناکر بولے۔ آپ سے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ کوئی کام کریں۔ بس بیٹھے بیٹھے شہرت اور نیکنامی حاصل کرنی چاہتے ہیں۔ جانتے

ہوں گے کہ یہاں روپے برستے ہیں۔ بنا ہاتھ پیر ہلائے روپے مل جاتے ہیں اور یہاں عدالت کے مصارف مارے ڈالتے ہیں۔ ایک ہزار قرض لے کر خرچ کرچکا اور ابھی پورا سال پڑا ہے۔ ایک بار حساب کتاب دیکھ لیں تو آنکھیں کھل جائیں۔ عیاں ہوجائے کہ زمینداری پروسی ہوئی تھالی نہیں ہے۔ سینکڑوں روپے سالانہ تو عمال کے نذرانوں میں اُڑجاتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے وہ اُسی غصّے میں خط کا جواب لکھنے نیچے چلے گئے۔ انھیں اپنی معذوری اور بدنصیبی پر سخت غصہ آرہاتھا۔ رائے کملانند کی باتیں باربار یاد آجاتی تھیں۔ وہی ہوا جس کا اُنھیں اندیشہ تھا۔

شام ہوگئی تھی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ پریم شنکر سوچ رہے تھے بڑی دیر ہوگئی۔ ابھی تک آدمی جواب لے کر نہیں آیا۔ کہیں پانی نہ برسنے لگے۔ نہیں تو اس وقت آ بھی نہ سکے گا۔ دیکھوں کیا جواب دیتے ہیں۔ سوکھا جواب تو کیا دیں گے، ہاں دل میں جھنجھلائیں گے ضرور۔ وہ اُنھیں خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے کہ سامنے سے ایک یکہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ پہلے تو کئی آدمیوں نے یکہ بان کو للکارا، کیوں کھیت میں یکہ لاتا ہے! آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں؟ دیکھتا نہیں کھیت بوئے ہوئے ہیں۔ پر جب یکہ پریم شنکر کے جھونپڑے کی طرف مڑا تو لوگ خاموش ہوگئے۔ اس پر لالہ پربھاشنکر اور ان کے دونوں لڑکے تیج شنکر اور پدم شنکر بیٹھے ہوئے تھے۔ پریم شنکر نے آگے بڑھ کر انھیں نمسکار کیا۔ پربھاشنکر نے سینے سے لگاکر پوچھا۔ ابھی تمھارا آدمی گیا تو تھا جواب لے کر تو نہیں آیا؟

پریم شنکر۔ جی نہیں۔ ابھی تو نہیں آیا۔ گئے بہت دیر ہوئی۔

پربھاشنکر۔ میرے ہی ہاتھ بازی رہی۔ یہ لو بڑی بھونے یہ صندوقچہ اور یہ خط تمھارے پاس بھیجا ہے۔ مگر یہ تو بتلاؤ یہ جلاوطنی کیوں اختیار کررکھی ہے؟ تمھارے ایک چھوڑ دو دو گھر ہیں۔ اُن میں نہ رہنا چاہو تو تمھارے کئی دُکانیں کرائے پر اُٹھی ہوئی ہیں۔ اُن میں سے جسے کہو خالی کرا دوں۔ آرام سے شہر میں رہو۔ تمھاری یہ حالت دیکھ کر جگر پاش پاش ہوجاتا ہے۔ یہ پھوس کا جھونپڑا، بیہڑ مقام، نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ مجھ سے تو یہاں ایک منٹ بھی نہ رہا جائے۔ ہفتوں گھر کی خبر نہیں لیتے۔ میں اب تمھیں یہاں نہ رہنے دوں گا۔ ہم تو وہاں محل میں رہیں اور تم یہاں دھونی رماکر بیٹھو۔ یہ

سب میری بدنصیبی ہے۔ اور کیا کہوں۔ بھائی صاحب جب تک زندہ رہے میں اپنے اوپر غرور کرتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ میری ہی بدولت خاندان کی آبرو قائم ہے۔ لیکن اُن کے اُٹھتے ہی برکت اُٹھ گئی۔ میں دو چار سال بھی اس اتفاق اور اتحاد کو قائم نہ رکھ سکا۔ وہ خوش نصیب تھے میں ننگ خاندان ہوں اس کے سوا اور کیا کہوں۔

پریم شنکر نے بڑی بے صبری سے لفافہ کھولا اور خط پڑھنے لگے۔ لالہ جی کی طرف اُن کا دھیان نہ تھا۔

میرے پیارے سوامی۔ یہ پریم کی بھینٹ قبول کیجیے۔ میں آپ سے نہیں بولتی۔ آپ کے پاس نہیں آتی۔ اس لیے کہ سنسار ہنسے گا۔ کیا آپ کو بھی سنسار کی ہنسی کا ڈر ہے؟ آپ اِدھر کیوں نہیں آتے؟ میری خبر کیوں نہیں لیتے؟ کیا آپ نے ہمیشہ سب سے الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟ یہاں آپ کے پرائشچت کی چرچا ہورہی ہے۔ کہتے ہیں پرائشچت کرنے سے سارے دوش مٹ جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کو برادری کا خوف نہیں ہے۔ پر یہ بھی جانتی ہوں آپ مجھ پر دیا اور پریم رکھتے ہیں۔ کیا میری خاطر سے اتنا نہ کیجیے گا؟ میرے دھرم کو نہ نبھایئے گا؟ اس صندوقچے میں میرے کچھ زیور اور روپے ہیں۔ زیور اب کس کے لیے پہنوں؟ کون دیکھ کر خوش ہوگا؟ روپے وہ ہیں جو مجھے لالہ جی وقتاً فوقتاً خرچ کے لیے دیا کرتے تھے۔ انھیں اب میری ناچیز نذر سمجھ کر قبول کیجیے۔ اگر آپ نے لینے سے انکار کیا تو سمجھوں گی آپ نے مجھ سے بالکل ناتا توڑ لیا۔ قبول کیجیے گا اپنا دھنیہ بھاگ سمجھوں گی۔

آپ کی ابھاگنی

شردھا

پریم شنکر نے خط پڑھ کر پھر لفافے میں رکھ دیا۔ سب سے پہلے ان کا ارادہ ہوا کہ خط کو مع صندوقچے کے واپس کر دوں اور لکھ دوں کہ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں۔ کیا میں اتنا بے غیرت ہوں کہ جو عورت مجھ سے اس قدر تغافل اور بے وفائی کرے اسی کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلاؤں۔ لیکن ایک لمحے میں یہ ارادہ تبدیل ہوگیا۔ اور اس کی جگہ اندیشہ پیدا ہوا۔ یہ خط کسی خوفناک ارادے کا پیش خیمہ تو نہیں ہے؟ وہ اتنے سراسیمہ ہوئے کہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ شردھا سے ان کی محبت تازہ ہوگئی۔ گھبرا کر پربھاشنکر

سے بولے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا گیان شنکر کا برتاؤ اُس کے ساتھ کیسا ہے؟

پربھاشنکر۔ بیٹا یہ سوال مجھ سے مت پوچھو۔ ہاں اتنا کہوں گا کہ تمھارے یہاں رہنے کا اُسے بڑا قلق ہے۔ آخر وہ تمھاری بیوی ہے۔ تمھارے لیے اُس نے نہ جانے کتنے جپ تپ کیے ہیں۔ اس سے تمھاری یہ بے رُخی زیبا نہیں۔

پریم شنکر۔ مجھے وہاں رہنے میں کوئی عذر نہیں۔ ہاں گیان شنکر کے سفلہ پن سے رنج ہوتا ہے۔ اور پھر وہاں بیٹھ کر یہ کام نہ ہوگا۔ کسانوں کے ساتھ رہ کر میں ان کی جتنی خدمت کرسکتا ہوں، اُن سے الگ رہ کر ہرگز نہیں کرسکتا۔ آپ سے صرف اتنی عرض ہے کہ آپ اس غریب کو بلاکر اُس کی تسکین اور تشفی کردیجیے گا اور کہہ دیجیے گا کہ اُن کا دل تمھاری طرف سے بالکل صاف ہے۔ ان کا تغافل میرے نقطۂ خیال سے مہمل ہو لیکن میں اُنھیں خطاوار نہیں سمجھتا۔ یہ دوسروں کے اغوا کا نتیجہ ہے۔ مجھے ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں جان پر نہ کھیل جائیں۔

پربھاشنکر۔ مگر تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار وہاں ضرور جایا کروگے۔

پریم شنکر۔ اس کا پکّا وعدہ کرتا ہوں۔

پربھاشنکر لوٹنا چاہتے تھے مگر پریم شنکر نے ضدکرکے روک لیا۔ حاجی گنج میں ایک ٹھاکر بھوانی سنگھ رہتے تھے۔ اُن کے یہاں کھانے کا انتظام کیاگیا۔ پوریاں موٹی تھیں۔ بھاجی بھی لذیذ نہ تھی۔ مگر دودھ مزیدار تھا۔ پربھاشنکر نے مسکراکر کہا۔ یہ پوریاں ہیں یا بٹ۔ مجھے تو دوچار دن بھی ایسی پوریاں کھانے کا اتفاق پڑے تو کام تمام ہوجائے۔

پریم شنکر۔ میں تو اپنے ہاتھ سے روٹیاں بنالیتا ہوں۔ دوپہر کو دودھ پی لیا کرتا ہوں۔

پربھاشنکر۔ تو یہ کہو کہ یہاں تپیا کر رہے ہو۔ جب کھانا ہی مرضی کے موافق نہ ملے تو زندگی کا لطف کیا!

پریم شنکر۔ کیا جانوں۔ مجھے تو روکھی روٹیوں میں جو مزہ آتا ہے وہ اور کسی چیز میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی میں دال سبزی کچھ نہیں بناتا۔ روٹیاں ہی کھا لیتا ہوں۔ صحت کے خیال سے بھی سادہ کھانا مفید ہے۔

پربھاشنکر۔ یہ سب نئے زمانے کے ڈھکوسلے ہیں۔ لوگوں کا ہاضمہ کمزور ہوگیا ہے۔ بس اسی خیال سے دل کو تسکین دے لیا کرتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ مرغن اور لذیذ غذا کھائی

اور کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔

کھانا کھانے کے بعد کچھ اِدھراُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لالہ جی تھکے ہوئے تھے۔ سوگئے۔ مگر دونوں لڑکوں کو نیند نہ آتی تھی۔

پریم شنکر بولے۔ کیوں تیجو۔ کیا نیند نہیں آتی؟ میٹرک میں ہونا؟ اس کے بعد کیا کرنے کا قصد ہے؟

تیج شنکر۔ مجھے کیا خبر۔ داداجی کی جو صلاح ہوگی وہ کروں گا۔

پریم شنکر۔ اور تم پدم شنکر۔ تم کیا کروگے؟

پدم شنکر۔ میرا تو پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔ جی چاہتا ہے سادھو ہوجاؤں۔

پریم شنکر۔ (مسکراکر) ابھی سے سادھو ہوجاؤگے؟

پدم شنکر۔ جی ہاں خوب پہاڑوں کی سیر کروں گا۔ بھیا بھی تو سادھو ہوجانے کو کہتے ہیں۔

پریم شنکر۔ تو تم دونوں کے دونوں سادھو ہوجاؤگے اور چچاصاحب کے سر گھرکا سارا بار ڈال دوگے؟

تیج شنکر۔ میں نے سادھو ہونے کو کب کہا ہے پدمو؟

پدم شنکر۔ روز تو کہتے ہو۔ اس وقت شرما رہے ہو؟

تیج شنکر۔ جھوٹا کہیں کا۔

پدم شنکر۔ ابھی تو کل ہی کہہ رہے تھے کہ ہم پہاڑوں پر جاکر منتر جگانا سیکھیں گے۔

پریم شنکر۔ منتر جگانے سے کیا ہوگا؟

پدم شنکر۔ واہ! منتر میں ایسی طاقت ہے کہ ہم چاہیں تو ابھی غائب ہوجائیں۔ زمین میں گڑے ہوئے روپے دیکھ لیں۔ ایک منتر تو ایسا ہے کہ چاہیں تو مردوں کو جِلا دیں۔

پریم شنکر۔ تم سے یہ باتیں کس نے کہیں؟

پدم شنکر۔ دادا کے پاس ایک کتاب ہے۔ اسی میں یہ ساری باتیں لکھی ہیں۔ منتر جگانے میں بڑا مزہ رہے گا۔ برسوں پڑھیں گے تب کہیں جاکر نوکر ہوں گے۔ تِس پر بھی تنخواہ تھوڑی ملے گی۔ ایک منتر بھی جگالیں گے تو آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ اُس میں تو ایسا ایک منتر لکھا ہے کہ جو کوئی اُسے جگا لے وہ کبھی نہ مرے۔

پریم شنکر۔ کیوں جی تیج شنکر۔ تم بھی اُنھیں توہمات میں گرفتار ہو؟

تیج شنکر۔ جی نہیں۔ یہ پدمو یونہی واہی تباہی بکتا پھرتا ہے۔ مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ منتر جگانے سے انسان بڑے بڑے کام کرسکتا ہے۔ صرف ڈرنا نہ چاہیے ورنہ زندگی کا خطرہ رہتا ہے۔

پریم شنکر۔ یہ سب خیالات لغو ہیں۔ انھیں سائنس نے باطل ثابت کردیا ہے۔ تعجب ہے کہ تم سائنس پڑھ کر بھی ان باتوں کو مانتے ہو۔ دنیا میں سب سے بڑا منتر اپنی محبت، جاں فشانی اور استقلال ہے۔ اس کے سوا اور سب منتر جھوٹے ہیں۔

دونوں لڑکوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ منتر کا خیال ان کے دل میں مرتسم ہوگیا تھا۔ اور دلیلوں سے اُنھیں قائل کرنا مشکل تھا۔

ان کے سوجانے کے بعد پریم شنکر نے صندوقچہ کھول کر دیکھا۔ گہنے سبھی سونے کے تھے۔ روپے گنے تو پورے ایک ہزار تھے۔ اس وقت پریم شنکر کی نظروں میں شردھا ایک دیوی سی معلوم ہوتی تھی۔ جس کی آنکھوں سے ایثار اور وفا کی کرنیں نکل رہی تھیں۔ انھیں اپنی سردمہری پر بڑا افسوس ہوا۔ شردھا کی اُلفت اور عصمت کے مقابلے میں اُنھیں اپنی بے اعتنائی اور تنگ ظرفی نہایت مکروہ معلوم ہوئی۔ اُنھوں نے صندوقچہ بند کرکے کھاٹ کے نیچے رکھ دیا اور لیٹے تو سوچنے لگے کہ ان گہنوں کو کیا کروں؟ پانچ ہزار سے کم کا اثاثہ نہیں ہے۔ مگر میں اسے لے لوں تو شردھا کے پاس کیا رہ جائے گا۔ اس کی دولت، ملکیت، جو کچھ ہے وہ یہی گہنے ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اُنھیں قرض سمجھ کر لے لوں اور جونہی ہاتھ میں روپے آجائیں مع سود کے واپس کردوں۔ پچیس بیگھے شاید دوڈھائی ہزار میں طے ہوجائیں۔ ایک ہزار کھاد ڈالنے اور ریہہ نکالنے میں صرف ہوجائیں گے۔ ایک ہزار میں دو بیلوں کی دو گوئیاں اور دوسرے اوزار آجائیں گے۔ دس بیگھے میں ایک چھوٹا سا باغ لگادوں۔ پندرہ بیگھے میں کھیتی کروں۔ دو سال تو یقیناً پیدوار بہت کم ہوگی لیکن آگے چل کر دوڈھائی ہزار کی بچت ہونے لگے گی۔

پریم شنکر اسی اُدھیڑبُن میں پڑے ہوئے تھے۔ موسلادھار بارش ہورہی تھی۔ یکایک اُن کے کانوں میں بادلوں کے گرجنے کی سی آوازیں آنے لگیں۔ گویا کسی بڑے پُل پر سے ریل گاڑی گزر رہی ہو۔ ذرا دیر میں گاؤں سے آدمیوں کے رونے اور چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کبھی کبھی روشنی نظر آجاتی تھی۔ پریم شنکر گھبراکر اُٹھے اور گاؤں کی طرف نظر

دوڑائی۔ گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ ہاتھوں میں سَن اور روہر کے ڈنٹھلوں کی مشعلیں لیے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ کچھ لوگ مشعلیں لیے ندی کی طرف دوڑے جاتے تھے ایک لمحے میں مشعلوں کا عکس نظر آنے لگا۔ جیسے گاؤں میں پانی لہریں مار رہا ہو۔ پریم شنکر سمجھ گئے کہ باڑھ آگئی۔

اب دیر کرنے کا موقع نہ تھا۔ وہ فوراً گاؤں کی طرف چلے۔ لیکن تھوڑی ہی دور پر انھیں گھٹنوں تک پانی مل گیا۔ بہاؤ میں اتنی تیزی تھی کہ اُن کے پاؤں مشکل سے سنبھل سکتے تھے۔ وہ کئی بار گڈھے میں گرتے گرتے بچے۔ جلدی میں پانی کی تھاہ لینے کے لیے کوئی لکڑی بھی نہ لے سکے تھے۔ یہی جی چاہتا تھا کہ گاؤں میں اُڑکر جا پہنچوں اور حتی الامکان سیلاب زدوں کی مدد کروں۔ لیکن یہاں ایک ایک قدم رکھنا مشکل تھا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا اور موسلادھار بارش۔ نیچے تیز لہروں کا مقابلہ۔ راہ باٹ کا کہیں پتہ نہیں۔ صرف مشعلوں کو دیکھتے چلے جاتے تھے۔ کئی بار گھروں کے گرنے کا دھماکا سُنائی دیا۔ گاؤں کے قریب پہنچے تو قیامت برپا تھی۔ گاؤں کے سبھی آدمی، بوڑھے جوان بچے۔ عورت۔ مرد۔ مندر کے اونچے چبوترے پر کھڑے سیلاب کی ان جفاکاریوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ پریم شنکر کو دیکھتے ہی لوگوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیرلیا۔ عورتیں رونے لگیں۔

پریم شنکر نے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ باڑھ اب کی ہی آئی ہے یا اور بھی کبھی آئی تھی؟

بھوانی سنگھ۔ نہیں مالک۔ ہردوسرے تیسرے سال آجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو سال میں دوبار آجاتی ہے۔

پریم شنکر۔ تم لوگ اس کے روکنے کی کوئی فکر نہیں کرتے؟

بھوانی سنگھ۔ کیا فکر کریں مالک؟ اپنے بوتے کی بات ہو تب نا۔ ندی کے کنارے ایک باندھ کھڑی کردی جائے تو کبھی باڑھ نہ آئے۔ مُدا کم سے کم تین ہجار کا کھرچ ہے۔ وہ ہمارے کیے نہیں ہوسکتا۔ کبھی باڑھ آتی ہے، کبھی سوکھا پڑتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے تماشا دیکھا کرتے ہیں۔ جمیدار صاحب کے کبھی درسن ہی نہیں ہوتے۔ کس کے پاس جاکر روئیں، کس سے فریاد کریں؟ سیٹھ جی نے یہ گاؤں اُنھیں دان دیا تھا۔ آپ تو "گیا" میں بیٹھے براجتے ہیں۔ سال میں دوبار ان کا منسی آکر تحصیل وصول کرلے جاتا ہے۔ اُس سے

کچھ کہو تو کہتا ہے ہم کچھ نہیں جانتے پنڈا جی جانیں۔ پنڈا جی کے درسن ہی نہیں ہوتے۔ ہمارے اوپر چاہے جو بپت پڑے اُنھیں اپنے پیسے سے کام ہے۔

پریم شنکر۔ اچھا اس وقت کیا اُپائے کرنا چاہیے جو کچھ بچایا سب ڈوب گیا؟

بھوانی سنگھ۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔ لیکن اٹکل سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر ایک بھی نہیں بچا۔ برتن بھانڈے۔ کپڑے لتے۔ کھاٹ کھٹولے سب بہہ گئے۔ اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ اپنے ساتھ کچھ لاتے۔ جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی اُٹھ بھاگے۔ ایسی باڑھ کبھی نہ آئی تھی۔ بس ایسا جان پڑا جیسے آندھی آجائے۔ بلکہ آندھی بھی کچھ پہلے سے معلوم ہوجاتی ہے۔ یہاں تو کچھ کھبر ہی نہ ہوئی۔

پریم شنکر۔ مویشی بھی بہہ گئے ہوں گے؟

بھوانی سنگھ رام جانے۔ کچھ تڑا کر بھاگے ہوں گے۔ کچھ گردن تک پانی میں کھڑے ہوں گے۔ کچھ بہہ گئے ہوں گے۔ پانی دس پانچ اُنگل اور چڑھا تو اُن کا پتہ بھی نہ لگے گا۔

پریم شنکر۔ انھیں تو کم سے کم بچانا چاہیے جو گردن تک پانی میں کھڑے ہیں۔

بھوانی سنگھ۔ کیسے بچاویں مالک؟ اپنی ہی جان آپھت میں پڑی ہوئی ہے۔

پریم شنکر۔ نہیں نہیں ہمت نہ ہارو۔ بھلا یہاں کل کتنے مرد ہونگے؟

بھوانی سنگھ۔ یہی کوئی چالیس -پچاس۔

پریم شنکر۔ تو پانچ پانچ آدمیوں کی ایک ایک ٹولی بنالو۔ جتنے جانور ملیں اُنھیں جمع کرلو اور میرے جھونپڑے کے سامنے لے چلو۔ وہاں زمین اونچی ہے۔ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔ جو لوگ اس کام کے لیے تیار ہوں سامنے نکل آئیں۔ پریم شنکر کی ہمت نے اوروں میں بھی ہمت پیدا کی۔ فوراً پچاس -ساٹھ آدمی نکل آئے۔ سبھوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ پریم شنکر کو لوگوں نے روکنا چاہا مگر وہ نہ مانے۔ ایک لاٹھی ہاتھ میں لے لی اور سب کے آگے آگے چلے۔ قدم قدم پر بہتے ہوئے جھونپڑوں، گرے ہوئے درختوں اور بہتی ہوئی چارپائیوں سے ٹکرانا پڑتا تھا۔ گاؤں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ گاؤں والوں کو اپنے اپنے گھروں کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ ہاں کہیں کہیں بھینسوں اور بیلوں کے ڈکارنے کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ خدام کی یہ جماعت ساری رات مویشیوں کے تحفظ میں سرگرم رہی،

پریم شنکر اپنی ٹولی کے ساتھ باری باری سے دوسری جماعتوں کی مدد کرتے تھے۔ ان کا استقلال اور جوش دیکھ کر پست ہمتوں کے خون میں بھی حرارت پیدا ہوجاتی تھی۔ جب دن نکل آیا اور پریم شنکر اپنے جھونپڑے میں پہنچے تو دوسوسے زاید مویشی آرام سے بیٹھے جگالی کررہے تھے۔ لیکن اتنی محنتِ شاقہ کے عادی تو تھے ہی نہیں۔ ایسے تھک گئے تھے کہ کھڑا ہونا مشکل تھا۔ آٹھ بجتے بجتے انھیں بخار ہوآیا۔ لالہ پربھا شنکر چڑھ کر بولے۔ بھیا دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنی بہت اچھی بات ہے۔ مگر جان دے کر نہیں۔ شردھا سُنے گی تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔

تین دن تک پریم شنکر نے سر نہ اُٹھایا اور نہ لالہ پربھاشنکر ان کے پاس سے اُٹھے۔ ان کے سرہانے بیٹھے ہوئے کبھی ہنومان چالیسا پڑھتے۔ کبھی وِنے پترکا کے پد گاتے۔ حاجی پور میں دو براہمن بھی تھے۔ وہ دونوں بیٹھے دُرگا پاٹھ کیا کرتے۔ اور لوگ طرح طرح کی جڑی بوٹیاں لاتے۔ آس پاس کے دیہات میں بھی یہ خبر پھیلی۔ لوگ جوق کے جوق اُن کی عیادت کو آنے لگے۔ چوتھے دن پریم شنکر کا بخار اُترگیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی باڑھ بھی اُتر گئی۔ مطلع صاف ہوگیا۔

صبح کا وقت تھا۔ لالہ پربھاشنکر براہمنوں کو زکوٰۃ دے کر گھر چلے گئے تھے۔ پریم شنکر چارپائی پر تکیے کے سہارے لیٹے ہوئے حاجی پور کی طرف متفکر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ چاردن پہلے جہاں ایک ہرابھرا لہلہاتا ہوا گاؤں تھا۔ جہاں میلوں تک کھیتوں میں دل فریب ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ جہاں صبح کو گائے بھینسوں کے ریوڑ چرتے دکھائی دیتے تھے۔ جہاں جھونپڑوں سے چکّیوں کی سہانی صدا آتی رہتی تھی اور بچّے میدانوں میں کلیلیں کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں اب ایک چٹیل کفِ دست میدان تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر باشندے دوسرے موضعوں میں بھاگ گئے تھے۔ کچھ لوگ پریم شنکر کے جھونپڑے کے سامنے سرکیاں ڈالے پڑے تھے۔ بڑا حسرت ناک نظارہ تھا۔ پریم شنکر سوچ رہے تھے کتنی دردناک حالت ہے۔ اِن غریبوں کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ آئے دن ان غریبوں پر یہی مصیبتیں پڑتی رہتی ہیں۔ اور یہ بے چارے اپنی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں۔ سال دو سال میں تن پیٹ کاٹ کر جو کچھ پس انداز کرتے ہیں وہ اس طرح جل کے دیوتا کی نذر کر دیتے ہیں۔ کتنی جانیں اس بھنور میں سماجاتی ہیں۔ کتنی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ کتنے گھر

مٹ جاتے ہیں۔ کتنے خاندانوں کا صفایا ہوجاتا ہے۔ اور یہ سب محض اس لیے کہ ان کو گاؤں کے کنارے ایک مضبوط باندھ بنوانے کی توفیق نہیں ہے۔ نہ اتنی دولت ہے نہ وہ اتفاق اور حُسنِ انتظام جو افلاس میں بھی بڑے بڑے کام کر دکھاتا ہے۔ ایسا باندھ اگر بن جائے تو اس سے اسی گاؤں کا نہیں، آس پاس کے کئی موضعوں کا بھلا ہوسکتا ہے۔ میرے پاس اس وقت چار پانچ ہزار روپے کا اثاثہ ہے۔ کیوں نہ اس باندھ میں ہاتھ لگا دوں۔ گاؤں کے لوگ روپے نہ دے سکیں محنت تو کرسکتے ہیں۔ صرف تنظیم کی ضرورت ہے۔ دوسرے گاؤں والے بھی مدد کریں گے ہی۔ کہیں یہ باندھ بن جائے تو اِن غریبوں کی قسمت جاگ اُٹھے۔

ان منصوبوں نے پریم شنکر کو اتنا اُکسایا کہ اگرچہ وہ اب بھی بہت کمزور تھے۔ پر اُس وقت لوگوں کے منع کرنے پر بھی ندی کے کنارے باندھ کے موقع کا معائنہ کرنے چل کھڑے ہوئے۔ جیب میں کاغذ اور پنسل بھی رکھ لیا۔ کئی آدمی ساتھ ہولیے۔ ندی کے کنارے کھڑے بہت دیر تک وہ رسّی سے ناپ ناپ کر کاغذ پر باندھ کا نقشہ کھینچتے اور اس کے طول و عرض آثار وغیرہ کا تخمینہ کرتے رہے۔ اس انہماک میں اُنھیں یہ کام بالکل سہل معلوم ہوتا تھا۔ صرف کام چھیڑ دینے کی ضرورت تھی۔ اُنھوں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کیا کہ برسات ختم ہوتے ہی کام شروع کردوں گا اور ایشور نے چاہا تو جاڑوں ہی میں باندھ تیار ہوجائے گا۔

بھوانی سنگھ بولا۔ مالک یہ کام ہمارے بوتے کا نہیں ہے۔

پریم شنکر۔ ہے کیوں نہیں۔ میں تمھیں لوگوں سے یہ کام کراؤں گا۔ تم نے اِسے محال سمجھ لیا ہے اسی لیے اتنی مصیبتیں جھیلتے ہو۔

بھوانی سنگھ۔ ارے سرکار۔ گاؤں میں آدمی ہی کتنے ہیں۔

پریم شنکر۔ تمھارے گاؤں میں نہ سہی۔ دوسرے گاؤں میں تو ہیں۔ سب تمھاری مدد کریں گے۔ کام تو شروع ہونے دو۔

بھوانی سنگھ۔ حجور روپیا کہاں سے آئے گا؟ آپ جیسا باندھ سوچ رہے ہیں پانچ چھ ہجار سے کم میں نہیں بنا جاتا۔ ایسا نہ ہوکہ ایک مہینہ کچھ کام چلے اور پھر ڈھیل پڑجائے۔ کہ دوسری برسات میں وہ مٹی بھی بہہ جائے۔

پریم شنکر۔ روپیوں کی تم کچھ فکر مت کرو۔ کاتک آرہا ہے۔ بس ہمت باندھ کر کام شروع کردو۔ روپیوں کی فکر جہاں تک مجھ سے ہوسکے گا میں کروں گا۔

بھوانی سنگھ۔ آپ ہی کا تو بھروسا ہے مالک۔

پریم شنکر۔ ایشور پر بھروسا رکھو۔ بلکہ اپنے اوپر۔

(۱۷)

گائتری اُن عورتوں میں تھی جن میں زنانہ نزاکت و نفاست کے ساتھ مردانہ ہمت و استقلال کا شائبہ بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ آئینے اور شانے پر فدا تھی تو خام سڑکوں کی گرد و غبار سے بھی نہ گھبراتی تھی۔ اگر وہ پیانو پر جان دیتی تھی تو دیہاتیوں کے بے سُرے الاپ کا مزہ بھی اُٹھا سکتی تھی۔ اگر وہ عشقیہ کتب کی دلدادہ تھی تو خسرہ اور کھتونی سے بھی جی نہیں چُراتی تھی۔ لکھنؤ سے آئے ہوئے اُسے دو سال ہوگئے مگر وہ ایک دن بھی اپنے عالی شان محل میں آرام سے نہ بیٹھی۔ کبھی اِس گاؤں میں جاتی، کبھی اُس چھاؤنی میں قیام کرتی، کبھی تحصیل جانا پڑتا۔ کبھی ضلع کا سفر درپیش ہوتا۔ حُکّام سے باربار ملنے کی ضرورت بھی پڑتی۔ اُسے محسوس ہورہا تھا کہ دوسروں پر حکومت کرنے کے لیے اپنے آپ کو کس قدر جھُکانا پڑتا ہے۔ اُس کے علاقے میں چاروں طرف لوٹ مچی ہوئی تھی۔ کارندے اسامیوں کو نوچ کھاتے تھے۔ وہ سوچتی کہ کیا میں ان سب مختاروں اور کارندوں کو یک دم برخاست کردوں۔ مگر پھر کام کون کرے گا؟ اور یہی کیا معلوم ہے کہ ان کی جگہوں پر جو نئے آدمی مقرر کیے جائیں گے وہ اِن سے زیادہ نیک نیت ثابت ہوں گے۔ ستم تو یہ ہے کہ رعایا کو ان مظالم سے اُتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی جتنی کہ مجھے ہوتی ہے۔ نہ کوئی شکایت کرتا ہے نہ فریاد۔ وہ سختیوں کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ اُنھیں بھی اپنی زندگی کا معمول خیال کرتے ہیں۔ اُن سے نجات پانے کے لیے بھی کوئی تدبیر ہوسکتی ہے، اس کا خیال تو اُنھیں بھول کر بھی نہیں آتا۔

اتنا ہی نہ تھا بلکہ رعایا گائتری کی مصلحانہ کوششوں کو بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اُسے یقین ہی نہ ہوتا تھا کہ رعایا کی بہتری کے لیے کوئی زمیندار اپنے ملازموں کو سزادے سکتا ہے۔ موجودہ مظالم سے وہ لوگ آشنا تھے پس اُن سے ذرا بھی خائف نہ ہوتے تھے۔ البتہ اصلاح کی کوششوں سے وہ خوف زدہ ہوتے تھے اس لیے کہ ایسی کوشش اُن کے

لیے ایک نہ جانی ہوئی چیز تھی۔ اُنھیں شک ہوتا تھا کہ شاید ظلم کا یہ کوئی نیا طریقہ ہے۔ تجربہ بھی اس شک کو حدِ یقین تک پہنچا دیتا تھا۔ گائتری کا حکم تھا کہ کسانوں کو برائے نام سود پر قرض دیا جائے۔ مگر کارندے عام مہاجنوں سے بھی زیادہ سود لیتے تھے۔ اس نے تاکید کردی تھی کہ غلّہ خانوں سے اسامیوں کو غلّہ کا آٹھواں حصہ بطور سود لے کر غلّے دیاجائے مگر یہاں آٹھواں حصہ دینا قبول نہ کرکے لوگ دوسروں سے سوائی اور ڈیوڑھے پر غلّہ لاتے تھے۔ گائتری اپنے علاقے بھر میں صفائی اور صحت کی تجاویز کو بھی عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔ گوبر جمع کرنے کے لیے گاؤں سے باہر گڈھے بنوا دیئے گئے تھے۔ موریوں کو صاف کرنے کے لیے مہتر بھی مقرر کردیے گئے تھے۔ مگر رعایا ان سب کاموں کو مداخلتِ بیجا سمجھتی تھی کہ کہیں رانی صاحب ہمارے گھوروں اور کھتّوں پر تو ہاتھ نہیں بڑھا رہی ہیں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ گائتری راپتی ندی کے کنارے کے گاؤں میں دورہ کر رہی تھی۔ اَب کے سیلاب میں کئی گاؤں ڈوب گئے تھے۔ کاشتکاروں نے معافی لگان کے لیے درخواستیں گزرانی تھیں اور عمّال سرکاری نے اِدھراُدھر دیکھ کرلکھ دیاتھا کہ معافی کی ضرورت نہیں ہے۔ گائتری بچشمِ خود اِن مواضعات کی حالت دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ کتنی معافی یا التواء کی ضرورت ہے۔ شام ہوگئی تھی۔ وہ دن بھرکی تھکی ماندی بندا پور کی چھاؤنی میں اُداس پڑی ہوئی تھی۔ سارا مکان کھنڈر ہوگیا تھا۔ اس کی مرمت کے لیے گائتری نے کارندے کو سینکڑوں روپئے دیے تھے۔ لیکن دیکھنے سے معلوم ہوتاتھا کہ برسوں سے کھپریل تک نہیں بدلا گیا۔ دیواریں گر گئی تھیں۔ اور کڑیوں کے ٹوٹ جانے سے جابجا چھت بھی بیٹھ گئی تھی۔ صحن میں کوڑے کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ اس موضع کے کارندے کو وہ بہت دیانتدار سمجھتی تھی۔ اُس کی اس شرارت پر گائتری بہت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔ سامنے چوکی پر پوجا کے لیے آسن بچھا ہوا تھا لیکن اس کا جی آسن پرجانے کو نہ چاہتا تھا۔ اتنے ہی میں چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ قانون گو صاحب آئے ہیں۔

گائتری اُٹھ کر آسن پر جا بیٹھی اور اس نے اس خوف سے کہ مبادا قانون گو صاحب واپس جائیں اپنی سندھیا جلدہی ختم کی۔ پھر اُس نے پردہ کراکے قانون گو صاحب کو طلب کیا۔

گائتری۔ کہیے خاں صاحب۔ مزاج تو اچھا ہے؟ کیا آج کل پڑتال ہو رہی ہے؟
قانون گو۔ جی ہاں۔ آج کل حضور ہی کے علاقے کا دورہ کر رہا ہوں۔
گائتری۔ آپ کے خیال میں باڑھ سے کھیتی کو کتنا نقصان پہنچا؟
قانون گو۔ اگر سرکاری طور پر دریافت کرتی ہیں تو روپے میں صرف ایک آنہ اور اگر خانگی طور پر پوچھتی ہیں تو فی روپے بارہ آنے۔
گائتری۔ آپ لوگ یہ دورنگی چال کیوں چلتے ہو؟ آپ جانتے نہیں ہیں کہ اس سے رعایا کا کتنا نقصان ہوتا ہے؟
قانون گو۔ حضور یہ نہ پوچھیں۔ دو رنگی چال نہ چلیں اور اصلی بات لکھ دیں تو ایک دن میں نالائق بنا کر نکال دیئے جائیں۔ ہم لوگوں سے واقعی حالات جاننے کے لیے جانچ نہیں کرائی جاتی بلکہ اُن کو چھپانے کے لیے، اور پیٹ کے لیے سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔
گائتری۔ پیٹ کو غریبوں کی آہوں سے بھرنا تو اچھا نہیں۔ اگر اپنی طرف سے رعایا کی کچھ بھلائی نہ کر سکیں تو کم از کم اپنے ہاتھوں اُسے نقصان تو نہ پہنچانا چاہیے۔ علاقے کا اور کیا حال ہے؟
قانون گو۔ آپ کو سُن کر رنج ہوگا۔ سارن میں حضور کے کئی بیگھے جاگیر اسامیوں نے جوت لی ہے۔ جگراؤں کے ٹھاکروں نے حضور کے نئے باغ کو جوت کر کھیت بنالیا ہے اور مینڈیں کھود ڈالی ہیں۔ جب تک دوبارہ پیمائش نہ ہو کچھ پتہ نہیں چل سکتا کہ انھوں نے آپ کی کس قدر زمین دبالی ہے۔
گائتری۔ کیا وہاں کا کارندہ سو رہا ہے؟ میرا تو اِن جھگڑوں سے ناک میں دَم ہے۔
قانون گو۔ حضور کی جانب سے پیمائش کی ایک درخواست پیش ہو جائے بس باقی سب کام میں کرلوں گا۔ البتہ صدر قانون گو صاحب کی کچھ خاطر کرنی پڑے گی۔ میں تو حضور کا خادم ہوں۔ ایسی صلاح ہرگز نہ دوں گا جس میں حضور کا کچھ نقصان ہو۔ اتنا اور عرض کروں گا کہ حضور ایک منیجر رکھ لیں۔ گستاخی معاف۔ اتنے بڑے علاقے کا انتظام کرنا حضور کا کام نہیں ہے۔
گائتری۔ منیجر رکھنے کی تو مجھے خود فکر ہے مگر لاؤں کہاں سے؟ کہیں منیجر صاحب بھی کارندوں سے مِل گئے تو رہی سہی بات بھی بگڑ جائے گی۔ اُن (شوہر مرحوم) کی یہ

آخری وصیت تھی کہ میری رعایا کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اُنھیں کے حکم کی تعمیل میں میں یوں اپنی جان کھپا رہی ہوں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی ایسا دیانتدار اور تجربہ کار آدمی ہو جو مجھے اس کام سے سبکدوش کر سکے تو بتلایئے۔

قانون گو۔ بہت اچھا۔ میں خیال رکھوں گا۔ میرے ایک دوست ہیں۔ گریجویٹ لایق تجربہ کار۔ خاندانی شخص ہیں۔ میں اُن سے تذکرہ کروں گا۔ اگر وہ راضی ہوگئے تو پھر حضور کو کسی قسم کا تردّد نہ رہے گا۔ تو مجھے کیا ارشاد ہوتا ہے؟ صدر قانون گو صاحب سے بات چیت کروں؟

گائتری۔ جی ہاں۔ کہہ تو رہی ہوں۔ وہی لالہ صاحب ہیں نا؟ لیکن وہ تو بری طرح منہ پھیلاتے ہیں۔

قانون گو۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔ مَیں اُنھیں سیدھا کرلوں گا۔ اوروں کے سامنے وہ چاہے جتنا منہ پھیلائیں مگر یہاں اُن کی دال نہ گلنے پائے گی۔ بس حضور کے پانچ سو روپے خرچ ہوں گے۔ اتنے ہی میں دونوں گاؤں کی پیائش کرا دوں گا۔

گائتری۔ (مسکراکر) اس میں کم از کم نصف تو آپ کے ہاتھ ضرور ہی لگے گا۔

قانون گو۔ معاذ اللہ۔ جناب یہ کیا فرماتی ہیں۔ مَیں مرتے دم تک حضور کو مغالطہ نہ دوں گا۔ ہاں۔ کام پورا ہوجانے پر حضور جو کچھ اپنی خوشی سے عطا فرمائیں گی اُسے بسروچشم قبول کرلوں گا۔

گائتری۔ تو یہ کہیے کہ مجھے اس پانچ سو کے علاوہ کچھ اور بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنا ہوگا۔ میں اتنا گراں سودا نہیں کرتی۔

یہی باتیں ہورہی تھیں کہ پنڈت لیکھ راج جی تشریف لائے۔ ریشمی اچکن ریشمی پگڑی۔ ریشمی چادر۔ ریشمی دھوتی۔ پاؤں میں دلّی کا سلیم شاہی کامدار جوتہ۔ پیشانی پر صندل کا ٹیکہ۔ لبوں پر پان کی سرخی۔ آنکھوں پر سنہری عینک۔ سرتاپا کیوڑے میں بسے ہوئے۔ آکر کُرسی پر رونق افروز ہوگئے۔

گائتری۔ شری پنڈت جی مہاراج کو پالاگن کرتی ہوں۔

لیکھ راج۔ آشیرواد۔ آج تو سرکار کو بڑی تکلیف ہوئی۔

گائتری۔ کیا کروں؟ میرے بزرگوں نے بھی بلا کھیت کے کھیتی۔ بلا زمین کے زمینداری۔ بلا

روپے کے مہاجنی کی سبیل پیدا کی ہوتی تو میں بھی آپ کی طرح چین کرتی۔
لیکھ راج۔ (ہنس کر) قانون گو صاحب۔ آپ سُنتے ہیں سرکار کی باتیں؟ ایسا چُن کر کہہ دیتی ہیں کہ اس کا جواب ہی نہ بن پڑے۔ سرکار کو پرماتما نے رانی بنایا ہے۔ ہم تو سرکار کے دوار کے بھکشک ہیں۔ سرکار نے دھرم شالا کے نیو رکھنے کی شُبھ مہورت پُوچھی تھی وہ میں نے بیچار لی ہے۔ اسی پاکھ کی یکادشی کو سویرے ہی سرکار کے ہاتھوں سے اُس کی نیو پڑجانی چاہیے۔
گائتری۔ یہ جَس میرے بھاگ میں نہیں ہے۔ آپ نے کسی رئیس کو اپنے ہاتھوں کسی ایسی عمارت کی نیو قائم کرتے دیکھا ہے؟ لوگ اپنے رہایشی مکانوں کی نیو تک بھی حُکام کے ہاتھوں قائم کراتے ہیں۔ میں اس رواج کے خلاف کیوں کر چل سکتی ہوں۔ نیو ڈالنے کے لیے حاکم ضلع کو مدعو کروں گی اور اُنھیں کے نام پر دھرم شالا کا نام ہوگا۔ کسی ٹھیکے دار سے بھی آپ نے کچھ بات چیت کی؟
لیکھ راج ۔ جی ہاں۔ میں نے ایک ٹھیکہ دار سے سب ٹھیک کرلیا ہے۔ بڑا بھلا مانس ہے۔ اس سُبھ کاج کو بِنا لابھ کے کردینا چاہتا ہے۔ صرف لاگت بھر لے گا۔
گائتری۔ آپ نے اُسے نقشہ دکھا دیا ہے نا؟ اس کام کا ٹھیکہ کتنے پر لینا چاہتا ہے؟
لیکھراج۔ وہ کہتا ہے کہ دوسرا ٹھیکہ دار جتنا مانگے اُس سے مجھے سو روپے کم دیے جائیں۔
گائتری۔ تو اب ایک دوسرا ٹھیکہ دار تلاش کرنا پڑا۔ آخر وہ کتنا تخمینہ کرتا ہے؟
لیکھ راج۔ اس کے حساب سے کُل ساٹھ ہزار پڑیں گے۔ مال مسالہ سب اول درجے کا لگائے گا۔ چھ مہینے میں کام پورا کردے گا۔
گائتری نے اس عمارت کا نقشہ لکھنؤ میں بنوایا تھا۔ وہاں اس کا تخمینہ چالیس ہزار کیا گیا تھا۔ اس نے جواب میں طنز سے کہا ...... تب تو آپ کا ٹھیکے دار واقعی بڑا بھلامانس ہے۔ اِس میں سے تھوڑا بہت تو آپ کے ٹھاکرجی پر ضرور ہی چڑھے گا۔
لیکھ راج۔ سرکار تو دل لگی کرتی ہیں۔ مجھے سرکار سے یونہی کیا کم ملتا ہے کہ ٹھیکے دار سے کمیشن ٹھہراتا۔ کچھ اِچھا ہوگی تو مانگ کرلے لوں گا۔ اپنی نیت کیوں بگاڑوں گا؟
گائتری۔ میں اِس کا جواب ایک ہفتے میں دوں گی۔
قانون گو۔ اور مجھے کیا ارشاد ہوتا ہے؟ پنڈت جی ۔ آپ نے بھی تو دیکھا ہوگا سارن اور

جگراؤں میں حضور کی کتنی زمین دب گئی ہے۔

لیکھ راج۔ ہاں دیکھا کیوں نہیں۔ سو بیگھے سے کم نہ ہوگی۔

گائتری۔ میں خود زمین دیکھ کر آپ کو اطلاع دوں گی۔ اگر باہمی سمجھوتے سے کام چل جائے تو جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں۔

دونوں حضرات مایوس ہوکر رخصت ہوئے۔ دونوں دل ہی دل میں گائتری کو کوس رہے تھے۔ قانون گو نے کہا۔ چالاک عورت ہے۔ بڑی مشکل سے ہتھے چڑھتی ہے۔ لیکھ راج بولے۔ ایک ایک پیسہ دانت سے پکڑتی ہے۔ نہ معلوم جمع کرکر کے کیا کرے گی۔ کوئی آگے پیچھے بھی تو نہیں ہے۔

اندھیرا ہوچلا تھا۔ گائتری سوچ رہی تھی کہ ان لٹیروں سے کیوں کر بچوں۔ اِن کا بس چلے تو دن دہاڑے لوٹ لیں۔ کہنے کو اتنے ملازم ہیں مگر ایسا کوئی نہیں جسے علاقے کی بہتری کا خیال ہو۔ ایسا لائق شخص کہاں ملے گا؟ میں تنہا کہاں کہاں دوڑ سکتی ہوں؟ ٹھیکے پر اُٹھادوں تو اُسے زیادہ نفع ہوسکتا ہے۔ سب جھنجھٹوں سے نجات ہوجائے گی۔ لیکن بے چارے اسامی تو مر مٹیں گے۔ ٹھیکے دار اُنھیں پیس ڈالے گا۔ وقف کردوں تو بھی یہی حال ہوگا۔ کاش گیان شنکر راضی ہوجائیں تو علاقے کے نصیب جاگ اُٹھیں۔ کتنا تجربہ کار شخص ہے۔ کتنا وسیع النظر اور کتنا معاملہ فہم۔ وہ آجائیں تو ان لُٹیروں سے میری گلوخلاصی ہوجائے۔ سارا علاقے نہال ہوجائے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اُن کی باتیں سُن کر میرا اعتقاد وایمان دونوں ڈانوا ڈول ہوجاتے ہیں اگر مجھے ان کے ساتھ لکھنؤ میں دوچار ماہ اور رہنے کا اتفاق ہوتا تو غالباً اب تک میں ایک فیشن پسند لیڈی بن گئی ہوتی۔ اُن کی تقریر میں عجیب اثر ہے۔ میں تو اُن کے سامنے باؤلی سی ہوجاتی ہوں۔ وہ میرا کتنا ادب کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں قدرے وار فتگی ضرور ہے لیکن میں بھی تو سایہ کی طرح ان کے ساتھ ہی لگی رہتی تھی۔ چھیڑ چھاڑ کیا کرتی تھی۔ نہ جانے اُن کے دل میں میری طرف سے کیا کیا خیالات پیدا ہوئے ہوں گے۔ مردوں میں یہ بڑا عیب ہے کہ وہ لطفِ صحبت کو تحریکِ نفس سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ ایسی حالت میں پاکیزہ مسرت سے لطف اندوز ہونا اُن کے لیے عموماً غیر ممکن ہے۔ عورت ذرا ہنس کر بولی اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ یہ مجھ پر فدا ہے۔ اُنھیں ذرا سی اُنگلی پکڑنے کو مل جائے پھر تو پہونچا پکڑتے دیر ہی نہیں لگتی۔ اگر گیان شنکر یہاں آنے پر

راضی ہوگئے تو اُنھیں یہیں رکھوں گی۔ یہیں سے وہ علاقے کا انتظام کریں گے۔ جب کوئی خاص کام ہوگا اُس وقت شہر جائیں گے۔ وہاں بھی میں اُن سے دور ہی دور رہوں گی۔ اُنھیں کبھی گھر میں نہ بلاؤں گی۔ بلکہ اب اُنھیں ایسی گستاخی کرنے کا حوصلہ بھی نہ ہوسکے گا۔ وہ خود کتنا نادم تھا۔ مجھ سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ اسٹیشن پر مجھے رخصت کرنے آیا تھا مگر دور ہی بیٹھا رہا اور یکدم خاموش۔

گائتری یہی سوچ رہی تھی کہ ایک چپراسی نے آکر آج کی ڈاک اُس کے سامنے رکھ دی۔ ڈاک خانہ یہاں سے تین کوس پر تھا۔ ایک آدمی روزمرّہ ڈاک لینے جایا کرتا تھا۔

گائتری نے پوچھا۔ وہ آدمی کہاں ہیں؟ کیوں رے! اپنی مزدوری پاگیا؟

آدمی۔ ہاں سرکار پاگیا۔

گائتری۔ کم تو نہیں ہے؟

آدمی۔ نہیں سرکار۔ کھوب کھانے بھر مل گیا ہے۔

گائتری۔ کل تم جاؤگے کہ کوئی دُوسرا آدمی بلایا جائے؟

آدمی۔ سرکار میں تو حاجر ہی ہوں۔ دوسرا کیوں جائے گا۔

گائتری خطوط کھولنے لگی۔ زیادہ تر خطوط خوشبودار تیلوں اور دوائیوں کے اشتہارات تھے۔ گائتری نے اُنھیں اُٹھاکر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ البتہ ایک خط رائے کملانند کا تھا۔ گائتری نے اسے شوق سے کھولا۔ پڑھتے ہی اُس کی آنکھیں غرور سے چمک اُٹھیں اور چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہوگیا۔ اُس نے وہ پیکٹ کھولا جسے وہ اب تک کسی دواخانے کی فہرست سمجھ رہی تھی۔ اوّل ہی صفحہ کھولنے پر اُسے اپنی تصویر دکھائی دی۔ پہلے مضمون کا عنوان تھا ''گائتری دیوی''۔ اُس کے نیچے مضمون نگار کا نام تھا ''گیان شنکر بی اے''۔ گائتری انگریزی کم جانتی تھی لیکن طبعی ذہانت سے وہ معمولی کتابوں کا مفہوم سمجھ لیا کرتی تھی۔ اُس نے نہایت شوق سے مضمون کو پڑھنا شروع کیا اور اگرچہ کُل مضمون بیس صفحوں سے کم میں نہ تھا لیکن اُس نے سارا مضمون نصف گھنٹے میں ہی پڑھ ڈالا۔ پھر پُرغرور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ ایسی نشہ خیز مسرّت اُسے اپنی تمام عمر میں شاید ہی کبھی نصیب ہوئی ہو۔ اُس کی غرور پسندی کبھی اس قدر مطمئن نہ ہوئی تھی۔ گیان شنکر نے گائتری کے اخلاق و عادات اور اس کے حُسنِ انتظام کا اس خوبی سے ذکر کیا

تھا کہ مضمون میں ستائش کے بجائے مؤرخانہ تحقیق کا رنگ پیدا ہوگیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ایک لفظ سے حُسنِ عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن پڑھنے والوں کو مجنونانہ ستائش کا نہیں بلکہ مورخانہ فیاضی کا احساس ہوتا تھا۔ عبارت آرائی کا یہ طریقہ سونے پر سہاگہ بنا ہوا تھا۔ گائتری باربار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی تھی۔ اُس کے دل میں خوشی کا ایک دریا سا اُمنڈ رہا تھا گویا وہ کسی آسمانی تخت پر بیٹھی ہوئی بہشت کو جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی رگ رگ میں خون کے بجائے جذباتِ بلند کی گردش تھی۔ اس وقت اُس کے دروازے پر بھیک مانگنے والوں کی ایک فوج بھی ہوتی تو نہال ہوجاتی۔ اگر اس وقت قانون گو صاحب آجاتے تو پانچ سو کی جگہ پانچ ہزار لے جاتے اور پنڈت لیکھ راج کا تخمینہ پہلے سے دوگنا بھی ہوتا تو بخوشی منظور کرلیا جاتا۔ اُس نے کئی روز اس موضع کے کارندے سے کوئی بات چیت نہ کی تھی۔ اِس وجہ سے کہ وہ ناخوش تھی۔ اُس وقت اُسے گناہگاروں کی طرح کھڑا دیکھا تو خوش ہوکر بولی "کہیے منشی جی۔ آج کل تو کچّے گھڑے کی خوب اُڑتی ہوگی۔" اس پر منشی جی آہستہ آہستہ سامنے آکر بولے۔"حضور۔ جنیؤ کی قسم ہے جب سے حضور نے منع کردیا اس وقت سے میں نے اُس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے اپنے ادبی شوق کو ظاہر کرنے کی غرض سے وہ پرچہ اُٹھا لیا اور ورق گردانی کرنے لگے۔ یکایک گائتری کی تصویر دیکھ کر اُچھل پڑے اور بولے ...... سرکار۔ یہ تو آپ کی تصویر ہے۔ کیسا بنایا ہے گویا اب بولی اور اب بولی۔ کیا کچھ سرکار کا حال بھی لکھا ہے؟

گائتری نے بے پروائی سے کہا کہ ہاں تصویر ہے تو حال کیوں نہ ہوگا۔ اُسی وقت کارندہ دوڑا ہوا باہر گیا اور یہ خبر سُنائی۔ کئی کارندے اور چپراسی کھانا پکارہے تھے۔ کوئی بھنگ پیس رہا تھا اور کوئی گا رہا تھا۔ خبر سُنتے ہی سب کے سب آکر تصویر پر ٹوٹ پڑے۔ چھین جھپٹ میں رسالے کے کئی ورق پھٹ گئے۔ یوں تو گائتری کسی کو بھی اپنی کتابیں چھونے نہ دیتی تھی مگر اُس وقت ذرا بھی نہ بولی۔

ایک مُنہ لگے چپراسی نے کہا۔ سرکار۔ کچھ ہم لوگوں کو بھی سُنادیں۔

گائتری۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ دفتر کا دفتر تو رنگا ہوا ہے میں کہاں تک سُناتی رہوں گی؟ دوچار روز میں اُس کا ترجمہ کسی ہندی اخبار میں چھپ جائے گا اُس وقت پڑھ لینا۔

لیکن جب سب لوگوں نے ایک ساتھ اصرار کرنا شروع کیا تو گائتری مجبور ہو گئی۔ اِدھر اُدھر سے کچھ ترجمہ کر کے سُنایا۔ اگر اُسے انگریزی میں کافی ملکہ ہوتا تو پھر وہ شاید حرف بحرف ہی سُناتی۔

ایک کارندے نے کہا۔ اخبار والوں کو نہ جانے یہ سب حال کیسے مل جاتا ہے؟

دوسرے کارندے نے کہا۔ اُن کے گوئیندے ہر جگہ گھومتے پھرتے ہیں۔ کہیں کوئی بات ہو تو فوراً اُن کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

گائتری کو اس چرچا سے بے انتہا مسرّت ہو رہی تھی۔ علی الصباح اُس نے گیان شنکر کو ایک انکسار آمیز خط لکھا۔ اِس مضمون کا کچھ تذکرہ نہ کرتے ہوئے صرف اپنی تکالیف و پریشانیوں کی داستان لکھی اور اصرار کے ساتھ استدعا کی کہ آپ آکر میرے علاقے کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیں اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگائیں۔ گائتری کے دل میں اب کدورت یا بدگمانی باقی نہ تھی۔ خوشامد غرور کی مصلح ہے۔ گائتری غرور کی پُتلی تھی۔ گیان شنکر نے اظہار عقیدت کے ذریعے اُسے مسخر کرلیا۔

(۱۸)

گیان شنکر کو گائتری کا خط ملا تو خوشی سے جامے میں پھولے نہ سمائے۔ دل میں طرح طرح کے مسرت خیز خیالات پیدا ہونے لگے۔ خوش قسمتی کی دیوی اپنا حیات آفریں تحفہ لیے ہوئے اُن کا خیر مقدم کرنے کو تیار کھڑی تھی۔ اُنھیں اپنے منصوبوں میں اس قدر جلد کامیاب ہو جانے کی اُمید نہ تھی۔ قسمت نے اُنھیں ایک بڑے علاقے کا مالک بن جانے کا موقع دے دیا تھا۔ اگر وہ اب بھی اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں تو اُن کی بدنصیبی ہی تھی۔

لیکن گورکھ پور جانے کے قبل وہ لکھن پور کی جانب سے بے فکر ہو جانا چاہتے تھے۔ جب سے پریم شنکر نے اُن سے اپنے حصّے کا منافع طلب کیا تھا، اُس وقت ہی سے اُن کے دل میں انواع و اقسام کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ لالہ پربھا شنکر کا وہاں آنا جانا اُنھیں اور بھی کھٹکتا تھا۔ اُنھیں شبہ تھا کہ یہ بُڈّھا کُرانٹ ضرور کوئی نہ کوئی داؤں کھیل رہا ہے۔ اس شفقتِ بزرگانہ کا اظہار خالی از علت نہیں۔ پریم شنکر لاکھ ہوشیار ہوں تو کیا۔ وہ اِس گُرگِ باراں دیدہ کے سامنے ابھی محض طفل مکتب ہیں۔ اُس کی خواہش درپردہ یہی ہو گی کہ

اُنھیں مِلا کر لکھن پور کا نصف حصہ اپنے لڑکوں کے نام ہبہ کرائے یا کسی دوسرے مہاجن کے یہاں بیع کرا کے درمیان میں دس پانچ ہزار کی رقم خود اُڑائے۔ ضرور یہی بات ہے۔ ورنہ جب اپنی ہی روٹیوں کے لالے پڑے ہیں تو یہ لذیذ کھانے بن بن کر نہ جاتے۔ اب تو شردھا بھی میری ہاری ہوئی بازی کی فرد میں ہے۔ اب میں اُسے یہ پڑھاؤں کہ تم اپنے گزارے کے لیے لکھن پور کا نصف حصہ اپنے نام ہبہ کرا لو۔ ان کی کون چلائے اکیلے ہی تو ہیں۔ نہ جانے کب کہیں چل دیں کہ تم کہیں بھی نہ رہو۔ اگر میری یہ چال چل جائے تو اب بھی لکھن پور میرا ہو سکتا ہے۔ شردھا کو تیرتھ جاترا کرنے کے لیے بھیج دوں گا۔ ایک نہ ایک روز مر ہی جائے گی۔ اگر جیتی بھی رہی تو ہردوار میں بیٹھی گنگا اشنان کرتی رہے گی۔ لکھن پور کی طرف سے مجھے کوئی فکر باقی نہ رہ جائے گی۔

اپنے دل میں یہ فیصلہ کر کے گیان شنکر اندر گئے۔ حُسنِ اتفاق سے اُن کی مرضی کے مطابق شردھا اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی مِل گئی۔ مایا کو کئی دن سے بخار آرہا تھا۔ وِدّیا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی اُسے پنکھا جھل رہی تھی۔

گیان شنکر پلنگ پر بیٹھ کر شردھا سے بولے۔ دیکھی چچا صاحب کی شرارت۔ وہ تو میں پہلے ہی تاڑ گیا تھا کہ حضرت کوئی نہ کوئی سوانگ رَچ رہے ہیں۔ سُنا ہے لکھن پور کے بیع کی گفتگو ہو رہی ہے۔

شردھا۔(حیرت سے) تم سے کِس نے کہا؟ چچا صاحب کو میں اتنا کمینہ نہیں خیال کرتی۔ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ صرف محبت کی وجہ سے وہاں آتے جاتے ہیں۔

گیان شنکر۔ یہ تمھارا خیال ہی خیال ہے۔ یہ لوگ ایسی بے غرضانہ محبت کرنے والے آدمی نہیں ہیں۔ جس نے تمام عمر دوسروں کو مُونڈا ہے وہ اب اپنا گنوا کر بھلا کیا محبت کرے گا۔ مطلب کچھ اور ہی ہے۔ بھیّا کا مال ہے۔ بیچیں یا رکھیں۔ چاہے چچا صاحب کو دے دیں۔ چاہے لٹا دیں۔ اُس کا اُنھیں پورا اختیار ہے۔ میں درمیان میں دخل دینے والا کون ہوتا ہوں؟ ہاں اتنا ضرور ہے کہ تم پھر کہیں کی نہ رہوگی۔

شردھا۔ اگر تمھارا ہی کہنا ٹھیک ہو تو میرا اِس میں کیا بَس ہے؟

گیان شنکر۔ بَس کیوں نہیں ہے۔ آخر تمھارے گزارہ کا بار تو اُنھیں پر ہے۔ تم آدھا لکھن پور اپنے نام لکھا سکتی ہو۔ بھیّا کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ تمھیں تامل ہو تو میں خود

جاکر اُن سے اس معاملے کو طے کرسکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ بھیا انکار نہ کریں گے اور کریں بھی تو میں اُنھیں قائل کرسکتا ہوں۔ جب موضع تمھارے نام ہوجائے گا تو پھر اُنھیں بیچ کرنے کا اختیار نہ رہ جائے گا۔ اس وقت چچا صاحب کی دال بھی نہ گل سکے گی۔

شردھا سوچ میں پڑگئی۔ جب اُس نے کئی منٹ تک سر نہ اُٹھایا تو گیان شنکر نے پوچھا...... کیا سوچتی ہو؟ اس میں کوئی حرج ہے؟ جائداد تلف ہوجائے وہ اچھا ہے یا گھر میں رہے وہ اچھا؟

اب شردھا نے سر اُٹھایا اور فاخرانہ انداز سے کہا۔ میں ایسا نہیں کرسکتی۔ ان کی جو مرضی ہو وہ کریں۔ چاہے اپنا حصہ بیچ ڈالیں یا رکھیں۔ وہ خود عقل مند ہیں۔ جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔ میں اُن کے پیروں میں بیڑیاں کیوں ڈالوں؟

گیان شنکر نے ترشی سے جواب دیا۔ لیکن یہ بھی سوچا ہے کہ جائداد نکل گئی تو تمھارا گزر کیوں کر ہوگا۔ وہ کل ہی پھر امریکہ کی راہ لیں تو؟

شردھا۔ میری کچھ فکر نہ کرو۔ وہ میرے پتی ہیں۔ وہ جو کچھ کریں گے اُس میں میری بھلائی ہے۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ وہ مجھے بالکل بلا سہارے کے چھوڑ جائیں گے۔

گیان شنکر۔ تمھاری جیسی مرضی۔ میں نے نیک و بد سمجھا دیا۔ اگر پیچھے کوئی بات بنے بگڑے تو مجھے دوش نہ دینا۔

گیان شنکر باہر آئے تو اُن کی طبیعت پریشان ہو رہی تھی۔ شردھا کی قناعت اور شوہر پرستی نے اُنھیں ایک نئی اُلجھن میں ڈال دیا۔ یہ تو وہ جانتے تھے کہ شردھا میری تجویز کو آسانی سے منظور نہ کرے گی لیکن اس میں اتنا زبردست ایثار ہے، اس کا اُنھیں پتہ نہیں تھا۔ اُنھیں انسانی فطرت کو سمجھ لینے کا غرور تھا۔ شردھا کے ایثار نے اُسے مٹا دیا۔ آہ! عورتیں بھی کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ میں نے اس کو مہینوں توتے کی طرح پڑھایا اور اُس کا یہ نتیجہ۔ وہ اپنے کمرہ میں دیر تک بیٹھے ہوئے سوچتے رہے کہ یہ عقدہ کیوں کر حل ہو۔ وہ آج ہی تذبذب کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے۔ اگر وہ شردھا کے گزارے کا بار مجھ پر ڈالنا چاہتے ہیں تو اُنھیں لکھن پور اُس کے نام لکھنا ہی پڑے گا۔ میں اُنھیں مجبور کروں گا۔ خوب صاف صاف باتیں ہوں گی۔ یہ سوچ کر وہ گھر سے نکلے اور حاجی پور کی طرف چلے۔ راستے

بھر تردد میں رہے۔ یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد ملنے بھی چلا تو خودغرضی کے ساتھ۔ پریم شنکر جب سے حاجی پور میں رہنے لگے تھے۔ گیان شنکر نے ایک مرتبہ بھی وہاں جانے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی۔ کبھی کبھی اپنے مکان ہی پر اُن سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ مگر اس طرف تین چار ماہ سے دونوں بھائیوں میں ملاقات نہ ہوئی تھی۔

گیان شنکر حاجی پور پہنچے تو شام ہوگئی تھی۔ پُوس کا مہینہ تھا۔ کھیتوں میں چاروں طرف سبزی پھیل رہی تھی۔ سرسوں۔ مٹر۔ کُسم۔ اَلسی کے نیلے پیلے اُودے رنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ کہیں شریر توتوں کے جُھنڈ تھے۔ کہیں اُچکّے کوؤں کے غول۔ جابجا سارس کے جوڑے اُنھیں کے خیالات میں محو ہوکر کھڑے ہوئے تھے۔ نوجوان عورتیں اپنے سروں پر گھڑے رکھے ندی سے پانی لا رہی تھیں۔ کوئی کھیت میں بتھوے کا ساگ توڑ رہی تھی۔ کوئی بیلوں کو کھلانے کے لیے ہریالی کا گٹھا سرپر رکھے چلی آتی تھی۔ سادہ اور مطمئن زندگی کا پاک نظارہ بے حد مسرت بخش تھا۔

گیان شنکر ایک شخص کے ساتھ پریم شنکر کے جھونپڑے پر گئے۔ تو وہاں کا دلِ فریب منظر دیکھ کر متحیر ہوگئے۔ ندی کے کنارے ایک بلند اور وسیع ٹیلے پر وہ جھونپڑا انواع و اقسام کی بیلوں سے سجا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی مہاتما کا قناعت پسند دل ہو۔ جھونپڑے کے سامنے جہاں تک نگاہ جاتی تھی قدرت کا پھولوں اور پتّیوں سے سجا ہوا منظر دکھائی دیتا تھا۔ پریم شنکر جھونپڑے کے سامنے کھڑے ہوئے بیلوں کو چارہ دے رہے تھے۔ گیان شنکر کو دیکھتے ہی بڑی محبت کے ساتھ گلے ملے اور پھر گھر کی خیر وعافیت کا حال دریافت کرکے بولے۔ تم تو گویا مجھے بھول ہی گئے ادھر آنے کی قسم کھالی۔

گیان شنکر نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ یہاں آنے کا ارادہ تو کئی روز سے تھا مگر فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ اسے اپنی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہوں۔ آپ میرے اتنے قریب ہیں پھر بھی درمیان میں گویا کوسوں کا فاصلہ ہے۔ اس کا سبب میری اخلاقی کمزوری اور برادری کا لحاظ ہے۔ مجھے برادری کے ہاتھوں جتنی مصیبتیں جھیلنی پڑیں وہ میرا دل جانتا ہے۔ یہ مقام تو نہایت پُرفضا ہے۔ یہ کھیت کس کے ہیں؟

پریم شنکر۔ اسی گاؤں کے اسامیوں کے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ ساون میں یہاں باڑھ آگئی تھی۔ سارا گاؤں غرقاب ہوگیا تھا۔ کتنے ہی مویشی بہہ گئے۔ یہاں تک کہ

جھونپڑوں کا تو پتہ بھی نہ چلا۔ جبھی سے لوگوں کو باہمی امداد کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ سب اسامیوں نے مل کر یہ بندھ تعمیر کرلیا ہے۔ اس طرح یہ ساٹھ بیگھے کا چک نکل آیا۔ اس کے چاروں طرف اونچی مینڈیں بنا دی گئی ہیں۔ جس کے جتنے بیگھے کھیت ہیں اُس سے اُسی پرتہ سے بیج اور مزدوری لی جائے گی۔ پیداوار بھی اُسی پرتہ سے تقسیم کر دی جائے گی۔ اس کا انتظام لوگوں نے میرے ہی سپرد کررکھا ہے۔ اس طرح کام کرنے سے بڑی کفایت ہوتی ہے۔ جو کام دس مزدور کرتے تھے۔ وہی کام چھ۔سات مزدوروں سے پورا ہوجاتا ہے۔ کاشت اور آبپاشی بھی عمدہ طریقہ پر ہوسکتی ہے۔ تم نے گائتری دیوی کا حال خوب لکھا۔ میں تو پڑھ کر خوش ہوگیا۔

گیان شنکر۔ اُنھوں نے مجھے اپنی ریاست کا انتظام کرنے کے لیے بُلایا ہے۔ یہ میرے لیے بڑا نادر موقع ہے۔ مگر جاؤں کیسے؟ مایا اور اُس کی ماں کو تو ساتھ لے جاسکتا ہوں۔ مگر بھاوج تو کسی طرح جانے پر رضامند نہیں ہوسکتیں۔ شکایت نہیں کرتا۔ لیکن چچی سے آج کل اُن کا بڑا یارانہ ہے۔ چچی اور ماں کی بہو دونوں ہی اُن کے کان بھرتی رہتی ہیں۔ وہ سیدھے سادے مزاج کی ہیں۔ دوسروں کی باتوں میں جلدی آجاتی ہیں۔ آج کل وہ دونوں عورتیں اُنھیں پڑھا رہی ہیں کہ لکھن پور کا نصف حصہ اپنے نام کرا لو کون جانے تمھارے پتی (شوہر) جی پھربدیس کی راہ لیں تو پھر تم کہیں کی نہ رہو۔ چچا صاحب بھی اسی جماعت میں ہیں۔ آج ہی کل میں وہ لوگ اِس تجویز کو آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ اس لیے آپ سے میری مؤدّبانہ عرض ہے کہ اس بارے میں آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہوں اُس سے مجھے مطلع کر دیں، آپ ہی کے فیصلہ پر میری زندگی کی تمام آرزوؤں کا انحصار ہے۔ اگر آپ نے اپنے حصہ کو بیچ کرنے کا تہیہ کرلیا ہو تو میں اپنے لیے کوئی اور سبیل نکالوں۔

پریم شنکر۔ چچاصاحب کے متعلق تمھارا جو شک ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اُنھوں نے آج تک کبھی مجھ سے تمھاری شکایت نہیں کی۔ وہ قانع طبیعت کے آدمی ہیں اور خواہ اُن کی مالی حالت اچھّی نہ ہو پھربھی وہ اُس سے غیر مطمئن نہیں معلوم ہوتے۔ رہا لکھن پور کے بارے میں میرا ارادہ۔ سو میں یہ سُننا ہی نہیں چاہتا کہ میں اُس گاؤں کا زمیندار ہوں۔ تم میری جانب سے بالکل بے فکر رہو۔ یہی سمجھو کہ میرا وجود ہی

نہیں ہے۔ میں اپنی محنت کی روٹی کھانا چاہتا ہوں۔ درمیان میں دلال نہیں بننا چاہتا۔ اگر سرکاری کاغذات میں میرا نام درج ہوگیا ہو تو میں یک قلم مستعفی ہوجانے کو تیار ہوں۔ ہاں تمھاری بھاوج کے نان نفقہ کا بار تمھارے ہی سر ہوگا۔ میں بھی اپنے حتی الامکان تمھاری مدد کرتا رہوں گا۔

گیان شنکر۔ بھائی کی یہ باتیں سُن کر متحیر ہوگئے۔ اگرچہ اُن کے اِن خیالات میں کوئی جدّت نہ تھی۔ اُنھوں نے سوشلزم کی کتب میں اِن باتوں کا مطالعہ کیا تھا مگر اُن کی سمجھ میں یہ صرف انسانی زندگی کا معیار تھا۔ اب اِس معیار کو عملی صورت میں دیکھ کر اُنھیں حیرت ہوئی۔ وہ اگر اِس مسئلے پر بحث کرنا چاہتے، تو اپنے پُرزور دلائل کے ذریعے پریم شنکر کو لاجواب کردیتے۔ لیکن اس موقع پر اُن خیالات کی تائید کرنا مناسب تھا نہ کہ اپنی جادو بیانی دکھانے کا۔ بولے۔ بھائی صاحب۔ یہ انسانی جماعت کا ایک اونچا معیار ہے اور مجھے فخر ہے کہ آپ صرف قول سے نہیں بلکہ فعل سے بھی اُس کے معین ہیں۔ امریکہ کی آزاد سرزمین میں اِن خیالات کا نمو پذیر ہونا بالکل قدرتی ہے۔ یہاں تو گھر سے باہر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ روحانی طاقت اور دماغی قوت سے بھی محروم ہوں۔ ایسی حالت میں میرے خیالات اتنے پاکیزہ اور مہذّبانہ ہوسکتے ہیں؟ میری تنگ نگاہ میں تو وہی زمینداری جسے آپ (مسکراکر) دلالی سمجھتے ہیں زندگی کا بہترین مقصود ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ آئندہ آپ کے فیضِ صحبت سے میرے خیالات بھی ترقی پا جائیں۔

پریم شنکر۔ تم اپنے ہی دل میں سوچو کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ محنت تو کوئی کرے، اُس کی حفاظت کا انتظام کسی دوسرے کے ذمّے ہو اور ہماری زندگی صرف روپیوں کے وصول تحصیل کے لیے وقف ہوجائے۔

گیان شنکر۔ آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن مدّتوں سے یہ سلسلہ کچھ اسی طریقہ پر قائم ہے کہ اس میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کرنے کا خیال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

پریم شنکر۔ تو تمھارا گورکھپور جانے کا کب تک ارادہ ہے؟

گیان شنکر۔ پہلے مجھے آپ اس بات کا پورا اطمینان دلائیں کہ لکھن پور کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔

پریم شنکر۔ اُسے تم اٹل سمجھو۔ میں نے تم سے ایک بار اپنے حصہ کا منافع طلب کیا تھا اُس وقت میرے خیالات اس قدر پختہ نہ تھے۔ میں زیادہ تنگ دست بھی تھا۔ اب میں اپنے اس فعل پر بہت نادم ہوں۔ ایشور نے چاہا تو اب میرا یہ عہد استوار ثابت ہوگا۔

گیان شنکر۔ تو میں ہولی تک گورکھپور چلا جاؤں گا۔ کوئی ہرج نہ ہو تو آج آپ بھی مکان تشریف لے چلیں۔ مایا آپ کو بہت یاد کیا کرتا ہے۔

پریم شنکر۔ آج تو فرصت نہیں ہے پھر کبھی آؤں گا۔

گیان شنکر یہاں سے چلے تو ان کا دل بہت خوش تھا۔ بہت دنوں کے بعد میری دلی خواہش پوری ہوئی۔ اب سولہ آنے لکھن پور کا مالک ہوں۔ یہاں اب کوئی میرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اب میں جو چاہوں بلاکسی رکاوٹ کے کرسکتا ہوں۔ بھائی صاحب بات کے دھنی ہیں۔ وہ اب یقیناً اُس کے خلاف عمل نہ کریں گے۔ اگر وہ استعفیٰ لکھ دیتے تو بات اور بھی پکّی ہوجاتی۔ لیکن اس پر زیادہ زور دینے سے میرا اوچھاپن ظاہر ہوگا۔ ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ پھر آئندہ دیکھا جائے گا۔

(۱۹)

گیان شنکر تقریباً دوسال سے لکھن پور کے اضافۂ لگان کا ارادہ کررہے تھے مگر ہمیشہ اُن کے سامنے ایک نہ ایک رکاوٹ آموجود ہوتی تھی۔ کچھ دن تو اُنھیں اپنے چچا سے علاحدہ ہونے میں لگے۔ اُدھر سے بے فکر ہونے پر لکھنؤ جانا پڑا۔ پھر اِدھر پریم شنکر کے آجانے سے ایک نئی بات پیدا ہوگئی۔ اتنے دنوں بعد اب اُن کو مقصد براری کا موقع ہاتھ آیا۔ کاغذات پہلے ہی سے تیار تھے۔ نالشوں کے دائر ہوجانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔

لکھن پور کے لوگ مچلکے کے سبب برہم تھے ہی۔ یہ نئی مصیبت سرپر پڑی تو اور بھی بگڑ اُٹھے۔ مچلکے کی میعاد اسی ماہ میں ختم ہونے والی تھی۔ وہ آزادی سے جواب دہی کرسکتے تھے۔ کُل گاؤں میں میل ہوگیا۔ آگ سی لگ گئی۔ بُڈھے قادرخاں بھی جو اپنے تحمل کے لیے بدنام تھے اب ضبط سے کام نہ لے سکے۔ بھری ہوئی پنچایت میں جو زمیندار کی مخالفت میں مجتمع ہوئی تھی بولے۔ اسی دھرتی میں سب کچھ ہوتا ہے اور سب کچھ اسی میں سماجاتا ہے۔ ہم بھی اسی دھرتی سے پیدا ہوئے ہیں اور ایک روز اسی میں سما جائیں گے۔ پھر یہ چوٹ کیوں سہیں؟ دھرتی ہی کے لیے بادشاہوں کے سر گرجاتے ہیں۔ اسی کے لیے ہم

بھی اپنے سروں کو گرا دیں گے۔ اس کام میں مدد کرنا گاؤں والوں کا فرض ہے۔ جس سے جو کچھ ہوسکے دے۔ سب لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا......''ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔ جس راستہ کہوگے چلیں گے اور اِس دھرتی پر اپنا سب کچھ نچھاور کردیں گے۔''

بلاشک گاؤں والوں کو معلوم تھا کہ زمیندار کو اضافہ کرنے کا پورا اختیار ہے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اختیار اُسی وقت حاصل ہوتا ہے جب زمیندار اپنی کوششوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے میں مد ہو۔ اس بے بنیاد اضافے کو سبھی لوگ ظلم خیال کرتے تھے۔

گیان شنکر نے گاؤں والوں میں یہ میل دیکھا تو چونکے۔ لیکن کچھ تو اپنے اثر و اقتدار اور کچھ حاکم پرگنہ مسٹر جوالاسنگھ سے میل ہونے کے سبب اُنھیں اپنی کامیابی میں ذرا بھی شک نہ تھا۔ لیکن جب دعویٰ کی سماعت ختم ہوجانے پر جواب دہی شروع ہوئی تو گیان شنکر کو معلوم ہوا کہ میں اپنی کامیابی کو جتنا آسان سمجھتا تھا اس سے وہ کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جوالاسنگھ کبھی کبھی ایسے سوالات کرتے اور اسامیوں سے ایسی ہمدردی ظاہر کرتے کہ اُن کے میلانِ خاطر کا صاف پتہ چل جاتا تھا۔ مقدمے کی حالت روزبروز گیان شنکر کے خلاف ہوتی جاتی تھی۔ وہ خود تو کچہری نہ جاتے تھے لیکن ہرروز کے حالات کو دھیان سے سُنتے تھے۔ جوالاسنگھ پر دانت پیس کر رہ جاتے تھے۔ یہ حضرت ہمارے ساتھ کے پڑھنے والوں میں ہیں۔ ہم اور وہ برسوں تک ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ ہنسی مذاق۔ ڈھول دھپا سبھی کچھ ہوتا تھا۔ آج جو اُنھیں ذرا اختیار مل گیا تو ایسی توتا چشمی سے کام لے رہے ہیں۔ گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہ ہو۔

آخرکار جب اُنھوں نے محسوس کیا کہ اب بلا کسی تدبیر کے کام بگڑ جائے گا تو انھوں نے ایک روز جوالا سنگھ سے ملنے کا قصد کرلیا۔ کون جانے مجھ پر رعب جمانے ہی کے لیے وہ ایسا کررہے ہوں۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ جوالاسنگھ کسی مقدمے کے دورانِ سماعت میں فریقین سے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ پھر بھی اپنی خودغرضی کی دُھن میں انھیں اس بات کا مطلق خیال نہ رہا۔ شام کے وقت اُن کے بنگلے پر جا پہنچے۔

جوالا سنگھ کو ان دنوں سِتار کا شوق ہوا تھا۔ اُنھیں اب اپنی تعلیم میں یہ ایک خاص خامی نظر آرہی تھی۔ ایک گت بجانے کی باربار کوشش کرتے مگر تاروں کا سُر نہ ملتا تھا۔ کبھی یہ کیل گھماتے۔ کبھی وہ کیل ڈھیلی کرتے کہ اتنے ہی میں گیان شنکر کمرے میں داخل

ہوئے۔ جوالا سنگھ نے ستار رکھ دیا اور اُن سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے ...... آیئے بھائی جان آیئے۔ کئی روز سے آپ کو یاد کررہا تھا۔ آج کل تو آپ کا علمی شوق زوروں پر ہے۔ میں نے گائتری دیوی پر آپ کا مضمون دیکھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ آپ کا قلم چوم لوں۔ یہاں ساری کچہری میں اُسی کا چرچا ہے۔ ایسا زورِ تحریر، ایسی دلکشی، ایسی بلند پروازی، ایسی روانی، بہت ہی کم مضامین میں نظر آتی ہے۔ کل میں صاحب بہادر سے ملنے گیا تھا۔ اُن کی میز پر وہی رسالہ پڑا ہوا تھا۔ میرے جاتے ہی جاتے اُنھوں نے اُسی مضمون کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ یہ لوگ بڑے قدردان ہوتے ہیں۔ کہاں سے ایسے چیدہ الفاظ اور محاورے لاکر رکھ دیے ہیں گویا کسی نے خوش نما پھولوں کا گلدستہ سجا دیا ہو۔

جوالا سنگھ کی مدح سرائی اُس رئیس کی مدح سرائی تھی جو اپنے گویّے کی خوش الحانی پر مست ہوگیا ہو۔

گیان شنکر نے شرماتے ہوئے پوچھا ...... صاحب کیا کہتے تھے؟

جوالا سنگھ۔ پہلے تو پوچھنے لگے یہ کون شخص ہیں؟ جب میں نے کہا کہ یہ میرے ساتھ کے پڑھنے اور کھیلنے والے ہیں تو اُنھیں اور دلچسپی ہوئی۔ پوچھا۔ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ میری سمجھ میں دیہاتی بینکوں کے متعلق جو آپ نے نوٹ لکھے ہیں اُن کا صاحب پر بڑا اثر ہوا ہے۔

گیان شنکر۔ (مسکراکر) بھائی جان۔ آپ سے کیا چھپائیں۔ وہ ٹکڑا میں نے ایک انگریزی رسالے سے کچھ ردوبدل کرکے نقل کرلیا تھا۔ (کچھ سوچ کر) کم سے کم وہ خیالات میرے نہ تھے۔

جوالا سنگھ۔ آپ کو حوالہ دینا چاہیے تھا۔

گیان شنکر۔ خیالات کسی کی ملکیت نہیں۔ الفاظ تو زیادہ تر میرے ہی تھے۔

جوالا سنگھ۔ گائتری دیوی تو بہت خوش ہوئی ہوں گی۔ آپ کو کچھ اس کا صلہ بھی دیں گی یا نہیں؟

گیان شنکر۔ ان کا ایک خط آیا ہے۔ اپنے علاقے کا انتظام میرے ہاتھوں میں دینا چاہتی ہیں۔

جوالا سنگھ۔ واہ کیا کہنا۔ مشاہرہ بھی پانچ سو روپیوں سے کم نہ ہوگا۔

گیان شنکر۔ مشاہرہ کا تو ذکر نہ تھا۔ شاید اتنا نہ دے سکیں۔

جوالاسنگھ۔ بھائی۔ اگر وہاں تین سو بھی ملے تو آپ لوگوں سے اچھے رہیں گے۔ خوب سیر تفریح کیجیے۔ موٹر دوڑاتے پھریے۔ اور وہاں کام ہی کیا ہے۔ ہم لوگوں کی طرح کاغذات کا ایک بنڈل تو سر پر لاد کر گھر نہ لانا پڑے گا۔ کب تک جانے کا قصد ہے؟

گیان شنکر۔ جانے کو تو میں تیار بیٹھا ہوں مگر جب آپ سے گلا چھوٹے ...... جوالاسنگھ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ گھروالوں کو بھی ساتھ لے جایئے گا نا؟ ضرور لے جایئے۔ میں نے بھی ایک ہفتہ ہوا کہ اپنے بال بچوں کو بلا لیا ہے۔ اس ویرانہ میں بھوت کی طرح تنہا پڑا رہتا تھا۔

گیان شنکر۔ اچھا تو بھابھی بھی آ گئیں۔ بڑا لطف آئے گا۔ کالج میں تو آپ پردہ کے سخت خلاف تھے۔

جوالاسنگھ۔ اب بھی ہوں مگر مصیبت تو یہ ہے کہ کسی غیر مرد کے سامنے جاتے ہوئے اُن کی تو روح فنا ہونے لگتی ہے۔ اردلی کے چپراسیوں اور دیگر ملازموں سے بے تکلف باتیں کرتی ہیں۔ لیکن میرے دوستوں کے تو سایہ سے بھی بھاگتی ہیں۔ کسی طرح کھینچ کر لاؤں بھی تو سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑی رہیں گی۔

گیان شنکر۔ ارے تو کیا میرا شمار بھی اُنھیں دوستوں میں ہے؟

جوالاسنگھ۔ ابھی تو آپ سے بھی جھجھکیں گی۔ ہاں آپ سے دوچار دفعہ ملاقات ہو اور آپ کے گھر کی عورتیں بھی آنے جانے لگیں تو ممکن ہے کہ آپ سے تکلف نہ برتیں۔ کیوں۔ مسز گیان شنکر کو کل یہاں بھیج دیجیے۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔ مسز صاحبہ کو تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

گیان شنکر۔ جی نہیں۔ وہ بڑے شوق سے آئیں گی۔

گیان شنکر کو اپنے مقدمے کے بارے میں اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا لیکن وہاں سے چلے تو بہت خوش تھے۔ عورتوں کے میل جول سے ان حضرت کی نکیل میرے ہاتھ میں آجائے گی۔ جس طرف چاہوں گھما سکوں گا۔ اُنھیں اب اپنی کامیابی میں ذرا بھی شک نہ رہا۔ لیکن جب گھر پر آکر اُنھوں نے وِدّیا سے یہ حال کہا تو وہ بولی...... مجھے تو وہاں جاتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ نہ کبھی کی جان نہ پہچان۔ نہ راہ و رسم۔ میں وہاں جاکر کیا باتیں کروں گی؟ البتہ گونگی بنی بیٹھی رہوں گی۔ تم مجھ سے پوچھے بغیر ہی وعدہ کر آئے۔

گیان شنکر۔ مسز جوالا سنگھ بڑی ملنسار ہیں۔ اُن سے مل کر تمھاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔
وِدّیا۔ اچھا اور مُنّی (چھوٹی لڑکی کا نام) کو کیا کروں گی؟ یہ وہاں روئے چلّائے اور اُنھیں بُرا معلوم ہو تو؟
گیان شنکر۔ مہری کو ساتھ لیتے جانا۔ وہاں باہر باغیچہ میں لڑکی کو بہلاتی رہے گی۔
وِدّیا طوعاً و کرہاً جانے پر رضامند ہوگئی۔ علی الصباح جوالا سنگھ کی گاڑی آگئی۔ وِدّیا بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ اُن کے گھر گئی اور دس بجتے بجتے واپس آئی۔ گیان شنکر نے بڑی بیتابی سے پوچھا۔ کیسے ملیں؟
وِدّیا۔ بہت اچھّی طرح۔ عورت نہیں ۔ دیوی ہے۔ ایسی ہنس مکھ اور ملنسار عورت تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔ مجھے کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھیں۔ بہت ضد کرنے پر آنے دیا۔ مجھے رخصت کرتے وقت اُن کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں بھی رو پڑی۔ اُردو۔ انگیزی۔ سب پڑھی ہیں۔ مزاج بہت سادہ ہے۔ مہریوں تک کو "تو" نہیں کہتیں۔ شِیل منی نام ہے۔
گیان شنکر۔ کچھ میرا تذکرہ بھی ہوا؟
وِدّیا۔ ہوا کیوں نہیں؟ کہتی تھیں کہ میرے بابو جی کے پُرانے دوست ہیں۔ تمھیں اُس روز چق کے اندر سے دیکھا تھا۔ تمھاری اچکن اُنھیں پسند نہیں۔ ہنس کر بولیں۔ اچکن کیا پہنتے ہیں۔ مسلمانوں کا پہناوا ہے۔ کوٹ کیوں نہیں پہنتے؟
گیان شنکر کو اپنی کامیابی کا اور بھی یقین ہوگیا۔ لیکن جب مقدمہ پھر تاریخ پر پیش ہوا تو جوالا سنگھ کے انداز میں بالکل تغیّر نہ تھا۔ باربار مدعی کے گواہوں سے جرح کرتے اور اُس کے وکیل کے سوالات پر اعتراض۔ گیان شنکر نے شام کو یہ کیفیت سُنی تو متحیّر ہوئے۔ یہ تو عجیب آدمی ہے اِدھر بھی چلتا ہے۔ اور اُدھر بھی۔ مجھے احمق بنانا چاہتا ہے۔ یہ عہدہ پاکر دورنگی چال چلنا سیکھ گیاہے۔ جی میں آیا جاکر صاف صاف کہہ دوں کہ دوستوں سے یہ دغابازی اچھّی نہیں۔ یا دوست بن جاؤ یا دشمن بنے رہو۔ یہ کیا کہ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور۔ اِسی حیص بیص میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسری تاریخ قریب آتی جاتی تھی۔ گیان شنکر بہت پریشان تھے۔ انھوں نے تہیّہ کرلیا تھا کہ اگر انھوں نے پھر وہی دورنگی چال چلی تو اپنا مقدمہ کسی دوسرے اجلاس میں اُٹھا لے جانے کی کوشش کروں گا۔

دَبوں کیوں؟

لیکن جب دوسری تاریخ پر جوالا سنگھ نے لکھن پور جاکر موقع دیکھنے کے لیے پھر تاریخ بڑھا دی تو گیان شنکر جھنجھلا اُٹھے۔ غصّے میں بھرے ہوئے وِدّیا سے بولے۔ دیکھی تم نے ان کی شرارت؟ اب موقع کی جانچ کرنے جارہے ہیں۔ اب نہیں رہا جاتا۔ جاتا ہوں۔ ذرا دو دو باتیں کر آؤں۔

وِدّیا۔ تم اتنے بے صبر کیوں ہوئے جاتے ہو؟ کیا جانے، وہ دوسروں کو دکھانے کے لیے یہ سوانگ بھر رہے ہوں۔ اپنی بدنامی سے سبھی ڈرتے ہیں۔

گیان شنکر۔ تو آخر کب تک میں فیصلہ کا انتظار کرتا رہوں؟ یہاں بیٹھے بیٹھے میرا کئی سو روپے ماہوار کا نقصان ہورہا ہے۔

گیان شنکر نے وِدّیا سے ابھی تک گائتری کے خط کا مطلق ذکر نہ کیا تھا۔ اِس وقت سہواً منہ سے بات نکل گئی۔ وِدّیا نے چونک کر دریافت کیا...... نقصان کیسا ہو رہا ہے؟

گیان شنکر نے دیکھا کہ اب باتیں بنانے سے کام نہ چلے گا۔ بولے ...... مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے تم سے گائتری کے خط کا تذکرہ کیا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنی ریاست کا مینجر مقرر کرنا تجویز کیا ہے اور جلد بُلایا ہے۔

وِدّیا۔ تم نے منظور بھی کرلیا؟

گیان شنکر۔ کیوں نہ کرتا؟ کیا کوئی نقصان تھا؟

وِدّیا۔ جب تمھیں خود ہی اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سوجھتی تو میں اور کیا کہوں؟ بھلا سوچو تو۔ دُنیا کیا کہے گی؟ لوگ یہی کہیں گے کہ غریب بیوہ ہے۔ رشتے دار لوگ جمع ہوکر اُسے نوچے کھاتے ہیں۔ تم خواہ کتنی ہی بے لوثی سے کام کرو پھر بھی بدنامی سے نہ بچ سکوگے۔ ابھی وہ تمھاری بڑی سالی ہے تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔ تمھاری کتنی آؤ بھگت کرتی ہے۔ اُس نے کتنی ہی بار تمھارا پلنگ تک بچھا دیا ہے۔ اب تم اس اونچے درجہ سے گِر کر اُن کے نوکر ہوجاؤگے اور مجھے بھی بہن کے درجہ سے گِرا کر نوکرانی بنا دوگے۔ مان لیا کہ وہ اب بھی تمھاری خاطرومدارات کریں گی مگر وہ خلوص کہاں؟ لوگ اُن سے تمھاری جا بیجا شکایت کریں گے۔ مروّت کی وجہ سے وہ تم سے کچھ نہ کہہ سکیں گی۔ مگر دل ہی دل میں کُڑھیں گی۔ میں تمھیں نوکری کے ارادہ سے وہاں

جانے کی صلاح کبھی نہ دوں گی۔
گیان شنکر۔ کہہ چکی یا کچھ اور کہنا ہے؟
وِدّیا۔ کہنے سُننے کی بات نہیں مجھے تمھارا وہاں جانا بالکل غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔
گیان شنکر۔ اچھا تو اب میری سنو۔ مجھے موجودہ اور آئندہ حالت کا خیال کرکے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ جب میں تندہی سے اُن کا کام کروں گا، دو کی جگہ ایک ہی خرچ کروں گا، ایک کی جگہ دو جمع کرکے دکھاؤں گا تو گائتری ایسی بیوقوف نہیں ہے کہ بلا وجہ مجھ پر شک کرنے لگے۔ اور پھر میں صرف نوکری کے ارادہ سے نہیں جاتا۔ میں کچھ اور بھی خیال کرتا ہوں۔
وِدّیا نے مشتبہ نگاہوں سے گیان شنکر کو دیکھتے ہوئے پوچھا ...... اور کون سا خیال ہے؟
گیان شنکر۔ مَیں ایسی بڑھیا ریاست کو دوسروں کے ہاتھوں میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ گائتری کے بعد جب اُس پر دوسروں ہی کا قبضہ ہوگا تو پھر میرا ہی قبضہ کیوں نہ ہو؟
وِدّیا نے متعجب ہوکر کہا۔ تمھارا کیا حق ہے؟
گیان شنکر۔ میں اپنا حق قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اب جاتا ہوں۔ ذرا ڈپٹی صاحب بہادر سے نپٹتا آؤں۔
وِدّیا۔ اُن سے کیا نپٹوگے؟ اُنھوں نے تم سے کوئی رشوت لی ہے؟
گیان شنکر۔ تو وہ دوستی کا اظہار کیوں اس قدر کرتے ہیں؟
وِدّیا۔ یہ اُن کی شرافت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر وہ آپ کے دوست ہوں تو آپ کے لیے دوسرے کے ساتھ ناانصافی کریں۔
گیان شنکر۔ یہی تو میں اُن کی زبان سے سُننا چاہتا ہوں۔ اس کا دندان شکن جواب میرے پاس ہے۔
وِدّیا۔ اچھا تو جاؤ۔ جو جی میں آئے سو کرو۔ پھر مجھ سے کیوں صلاح لیتے ہو؟
گیان شنکر۔ تم سے صلاح نہیں لیتا۔ تم میں اتنی ہی عقل ہوتی تو پھر رونا کاہے کا تھا۔ عورتیں بڑے بڑے کام کر دکھاتی ہیں۔ تم سے تو اتنا بھی نہ ہوسکا کہ شیل منی سے اس مقدمہ کے متعلق کچھ کہتیں۔ تمھاری تو ذرا ذرا سی بات میں ہتک ہونے لگتی ہے۔

وِدّیا۔ ہاں مجھ سے یہ سب نہیں ہوسکتا۔ اپنا مزاج ہی ایسا نہیں ہے۔

گیان شنکر۔ کیوں۔ اس میں کیا ہرج تھا اگر تم ایک بار ہنسی ہنسی میں کہہ دیتیں کہ تمھارے بابو جی ہمارا ہزاروں روپئے سالانہ کا نقصان کرائے دیتے ہیں۔ ذرا اُن کو سمجھا کیوں نہیں دیتیں۔

وِدّیا۔ مجھے یہ باتیں بنانی نہیں آتیں۔ کیا کروں؟ میں اس بارے میں شیل منی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔

گیان شنکر۔ چاہے دعویٰ خارج ہوجائے؟

وِدّیا۔ چاہے جو کچھ ہو۔

گیان شنکر باہر آئے تو ایک نیا مسئلہ درپیش ہوگیا۔ وِدّیا کو کیسے راضی کروں؟ یہ مانتا ہوں کہ رشتے داروں کی ملازمت سے کچھ سُبکی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اتنی نہیں کہ کوئی اس کے لیے اپنے تمام منصوبوں کو غارت کردے۔ وِدّیا کی یہ بُری عادت کہ جو ضد پکڑلیتی ہے اُسے کسی طرح نہیں چھوڑتی۔ میں اُدھر چلا جاؤں اور اِدھر یہ رائے صاحب سے میری شکایت کردے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اب اُس میں پہلے کی سی سادگی نہیں ہے۔ اُس میں روزبروز خودداری کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اُسے ناراض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

وہ اسی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شیل منی کی سواری آپہنچی۔ گیان شنکر نے قصد کرلیا کہ خود چل کر اُس سے اپنا ماجرا بیان کروں۔ ابھی تینوں عورتیں ایک دوسرے سے خیروعافیت کا حال ہی دریافت کررہی تھیں کہ وہ کچھ جھجھکتے ہوئے اوپر آئے اور کمرے کے دروازے پر چلمن کے سامنے کھڑے ہوکر شیل منی سے بولے۔ بھابی صاحبہ کو سلام کرتا ہوں۔

وِدّیا اُن کا مطلب سمجھ گئی۔ ندامت سے اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر گیان شنکر کو نفرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ شردھا ترجمانی کے لیے وہاں رہ گئی۔

گیان شنکر بولے۔ بھائی صاحب تو پردے کے قائل نہیں اور اب جبکہ ہم لوگوں میں اتنا زیادہ ربط و ضبط ہوگیا ہے، یہ پردہ اُٹھ ہی جانا چاہیے۔ مجھے آپ سے کتنی ہی باتیں

کہنی ہیں۔ ایشور نے آپ کو مُروّت و اخلاق والے اعلیٰ اوصاف سے مزین کیا ہے۔ اس لیے مجھے آپ کے روبرو ایک خانگی معاملے کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرأت ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بے اعتنائی نہ کریں گی۔ میرا ایک اضافہ لگان کا مقدمہ بھائی صاحب کے اجلاس میں ایک دو مہینے سے پیش ہے۔ میں اُن کا اتنا ادب کرتا ہوں کہ مجھے اس بارے میں اُن سے کچھ کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ مجھے بھائی سمجھتے ہیں مگر قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں میرے دعویٰ کے سچا ہونے میں شک ہے۔ پس مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اُسے خارج نہ کردیں۔ اس میں شک نہیں کہ دعویٰ کو خارج کرنے کا اُنھیں بھی افسوس ہوگا لیکن شاید اُنھیں اب تک میرے واقعی حالات سے واقفیت نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اس سے میری کتنی سُبکی اور تباہی ہوگی۔ فی زمانہ زمینداری ایک بلا ہے۔ ضروریاتِ زندگی روزبروز گراں ہوتی جاتی ہیں اور میری آمدنی آج بھی وہی ہے جو تین سال پہلے تھی۔ ایسی حالت میں میری نجات کا اس کے سوا اور کیا وسیلہ ہے کہ اسامیوں پر اضافہ لگان کروں؟ غلّہ موتیوں کے مول بک رہا ہے۔ کسانوں کی آمدنی دوچند بلکہ سہ چند ہوگئی ہے۔ بس اگر میں اُن کی اس بڑھتی ہوئی آمدنی سے ایک حصہّ مانگتا ہوں تو کون سی بے انصافی کرتا ہوں؟ اگر میری جیت ہوئی تو میری آمدنی میں ایک ہزار کا اضافہ نہایت آسانی سے ہوجائے گا۔ اگر میری ہار ہوئی تو اسامیوں کی نگاہ میں گر جاؤں گا۔ وہ شیر ہوجائیں گے اور ذرا ذرا سی بات پر مجھ سے اُلجھ پڑیں گے۔ پھر میرے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ رہے گا کہ زمینداری سے مستعفی ہوجاؤں اور دوستوں کا سہارا تلاش کروں۔ (مسکراکر) آپ ہی کے دروازے پر جا پڑوں گا اور چاہے آپ مارمار کر ہٹائیں، پھر بھی ہٹنے کا نام نہ لوں گا۔

شیل منی نے اِن باتوں کو بڑے دھیان سے سُنا اور شردھا سے بولی۔ آپ بابوجی سے کہہ دیں کہ مجھے یہ سُن کر بڑا رنج ہوا۔ آپ نے پہلے اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟ وِدّیا نے بھی کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا ورنہ اب تک آپ مقدمہ جیت گئے ہوتے۔ لیکن آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اپنی طرف سے آپ کی سفارش کرنے میں کوئی کسر نہ رکھوں گی۔

گیان شنکر۔ مجھے آپ سے ایسی ہی اُمید تھی۔ دوچار روز میں بھائی صاحب موقع دیکھنے

جائیں گے اِس لیے اُن سے جلد ہی اس کا ذکر کر دیں۔

شیل منی۔ میں آج جاتے ہی جاتے کہوں گی۔ آپ مطمئن رہیں۔

(۲۰)

چیت کا مہینہ تھا اور صبح کا وقت۔ ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ بابو جوالاسنگھ برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے گھوڑے کا انتظار کر رہے تھے۔ اُنھیں آج موقع دیکھنے کے لیے لکھن پور جانا تھا۔ لیکن اس راستے میں ایک بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ کل شام کو شیل منی نے اُن سے گیان شنکر کے مقدمے کی بابت کہا تھا اور جبھی سے وہ بڑے پس و پیش میں پڑگئے تھے۔ سامنے ایک مشکل عقدہ تھا۔ انصاف یا محبت؟ فرض یا عورت کی دلجوئی؟ وہ سوچتے تھے کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی کہ مقدمے کو اپنے اجلاس میں رکھا۔ لیکن میں یہ کیا جانتا تھا کہ گیان شنکر اِس قسم کی ریشہ دوانیاں کریں گے۔ بڑا خودغرض آدمی ہے۔ اسی اپنی غرض کی خاطر اُس نے مستورات میں اتنا میل جول قائم کردیا۔

شیل منی یہ چالیں کیا جانیں۔ مُروّت میں پڑکر وعدہ کر آئی۔ اب اگر میں اس کی بات نہیں مانتا تو پھر وہ رورو کر جان ہی تو دے دے گی۔ اُسے کیا معلوم کہ اِس بے انصافی سے میرے دل کو کس قدر صدمہ ہوگا۔ ابھی تک جتنی شہادتیں گزری ہیں اُن سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ گیان شنکر نے اسامیوں کو دبانے ہی کے لیے یہ مقدمہ دائر کیا ہے اور غالبًا درست بھی یہی ہے۔ بڑا ہی بنا ہوا آدمی ہے ۔ مضامین تو ایسے لکھتا ہے گویا غربا کی ہمدردی سے اُس کا دل بالکل بھرا ہوا ہے مگر اصل میں ہے پکّا خودغرض۔ گائتری کی ریاست کا منیجر ہوجائے گا تو اندھیر مچا دے گا۔ نہیں۔ مجھ سے یہ بے انصافی نہ ہوسکے گی۔ دیکھ کر مکھّی نہ نِگلی جائے گی۔ شیل منی روٹھے گی تو روٹھے۔ اُسے خود سمجھنا چاہیے تھا کہ مجھے اِس قسم کا وعدہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ وہ صرف رودھوکر ہی بس نہ کرے گی۔ بات بات پر طعنے دے گی۔ شاید اپنے میکے کی تیاری بھی کرنے لگے۔ یہی تو اُس کی عادت بُری ہے کہ یا تو محبت اور دلجوئی کی دیوی بن جائے گی یا بگڑے گی تو بھالوں سے چھیدنے لگے گی۔ گیان شنکر نے مجھے ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے کہ نجات کی کوئی صورت ہی نہیں دکھائی دیتی۔

جوالاسنگھ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ یکایک گیان شنکر اپنی پیرگاڑی پر

آتے ہوئے نظر آئے۔ جوالا سنگھ فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سائیس کو زور سے آواز دی کہ گھوڑا جلد لائے۔ سائیس گھوڑے کو تیار کیے ہوئے کھڑا تھا۔ حکم پاتے ہی گھوڑا سامنے لایا۔ جوالا سنگھ اُس پر فوراً سوار ہوگئے۔ گیان شنکر نے سامنے آکر کہا۔ کہیے بھائی صاحب۔ آج سویرے ہی کہاں کا قصد کیا؟

جوالا سنگھ۔ ذرا لکھن پور جارہا ہوں۔ موقع دیکھنا ہے۔

گیان شنکر۔ دُھوپ ہوجائے گی۔

جوالا سنگھ۔ کوئی پرواہ نہیں۔

گیان شنکر۔ میں بھی ہمراہ چلوں؟

جوالا سنگھ۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔

یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا ہوگئے۔ گیان شنکر سمجھ گئے کہ میرا نسخہ اپنا عمل کر رہا ہے۔ یہ بے رُخی اُسی کی علامت ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آج بھی وہی میٹھی میٹھی باتیں ہوتیں۔ چلوں ذرا شیل منی کو اور پختہ کرآؤں۔ یہ ارادہ کرکے وہ جوالا سنگھ کے کمرے میں جا بیٹھے۔ اردلی نے کہا سرکار باہر گئے ہوئے ہیں۔

گیان شنکر۔ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے ملاقات ہوگئی ہے۔ ذرا گھر میں میری اطلاع کر دو۔

اردلی۔ سرکار کا حکم نہیں ہے۔

گیان شنکر۔ مجھے پہچانتے ہو یا نہیں؟

اردلی۔ پہچانتا کیوں نہیں۔

گیان شنکر۔ تو دروازے پر جاکر اطلاع کیوں نہیں کرتے؟

اردلی۔ سرکار نے منع کر دیا ہے۔

گیان شنکر کو اب یقین ہوگیا کہ میری چال ٹھیک پڑی۔ جوالا سنگھ نے اپنے آپ کو غیر جانبدار ثابت کرنے ہی کے لیے یہ بات کی ہے۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ شیل منی سے کیوں کر ملوں کہ مہری کسی کام سے باہر آئی اور گیان شنکر کو دیکھتے ہی جاکر شیل منی سے کہا۔ شیل منی نے فوراً اُن کے لیے پان بھیجا اور اُنھیں دیوان خانے میں بٹھلایا۔ ذرا دیر بعد وہ خود آکر پردے کی آڑ میں کھڑی ہوگئی اور مہری سے کہلایا۔ میں نے بابوجی سے آپ کی سفارش کردی ہے۔

گیان شنکر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اب آپ ہی کا بھروسا ہے۔
شیل منی بولی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں اُنھیں دم بھر کو بھی چین نہ لینے دوں گی۔
گیان شنکر نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ خوش خوش رخصت ہوئے۔

اُدھر بابو جوالا سنگھ نے گھوڑا دوڑایا تو چار میل پر جاکر دم لیا۔ اُنھوں نے سِگار پینا چاہا۔ جیب سے سِگار کا بکس نکال کر دیکھا تو دیاسلائی نہ تھی۔ اُنھیں سگار پینے کا بڑا شوق تھا۔ اب کیا ہو؟ اِدھراُدھر دیکھا تو سامنے کچھ دور پر ایک بہلی جاتی ہوئی نظر آئی۔ گھوڑے کو بڑھاکر بہلی کے پاس جا پہنچے۔ دیکھا تو اُس پر پریم شنکر بیٹھے ہوئے تھے۔ جوالاسنگھ کا اُن سے تعارف تھا۔ کئی بار تفریحاً اُن کے مزرعہ کو دیکھنے گئے تھے۔ ان کی سادہ اور قناعت پسند زندگی کی عزّت کرتے تھے۔ پوچھا۔ کہیے جناب! آج اس طرف کہاں جارہے ہیں؟

پریم شنکر۔ ذرا لکھن پور جارہا ہوں۔ اور آپ؟

جوالاسنگھ۔ میں بھی وہیں جاتا ہوں۔

پریم شنکر۔ اچھا ساتھ ہوا۔ کیا کوئی مقدمہ ہے؟

جوالاسنگھ نے سگار جلایا اور مقدمے کا سارا حال کہہ سُنایا۔

پریم شنکر بغور سنتے رہے۔ پھر بولے۔ آپ نے اُنھیں سمجھایا نہیں کہ غریبوں کو کیوں دق کرتے ہو؟

جوالاسنگھ۔ میں اِس بارے میں اُن سے کیوں کر کہتا۔ ہاں عورتوں میں جو باتیں ہوئیں. اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے مجبور ہیں۔ اُن کا خرچ پورا نہیں پڑتا۔

پریم شنکر۔ دوہزار سالانہ آمدنی تین چار آدمیوں کے لیے تو کسی طرح کم نہیں۔

جوالا سنگھ۔ لیکن اس میں نصف تو آپ کا ہے۔

پریم شنکر۔ جی نہیں۔ میرا کچھ نہیں۔ میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں اس جائداد میں حصہ نہیں لینا چاہتا۔

جوالاسنگھ۔ (تعجب سے) کیا آپ نے اُن کے نام ہبہ کر دیا ہے۔

پریم شنکر۔ جی نہیں۔ مگر ہبہ ہی سمجھیے۔ میرا اصول ہے کہ انسان کو اپنی محنت سے کماکر کھانا چاہیے۔ قدرت کا بھی یہی اصول ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی کمائی کو اپنے معاش کا ذریعہ بنائے۔

جوالاسنگھ۔ تو یہ کہیے کہ آپ زمینداری کے پیشے کو ہی بُرا سمجھتے ہیں۔
پریم شنکر۔ ہاں۔ میرا ایسا ہی خیال ہے۔ زمین اُس کی ہے جو اُسے کاشت کرے۔ گورنمنٹ کو اُس کی پیداوار سے حصہ لینے کا حق اس لیے ہے کہ وہ مُلک میں امن و امان قائم رکھنے کا انتظام کرتی ہے جس کے بغیر کاشت ہو نہیں سکتی۔ اس میں کسی تیسرے فریق کے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اور نہ اُس کی گنجائش ہے۔
جوالاسنگھ۔ جناب! آپ تو اپنے اِن خیالات کی اشاعت سے مُلک میں ایک انقلاب برپا کردیں گے۔ آپ کے اصول کے مطابق ہمارے بڑے بڑے زمینداروں، تعلقہ داروں اور رئیسوں کا انسانی سوسائٹی میں کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔ سب کے سب ڈاکو ہیں۔
پریم شنکر۔ اِس میں اُن کا کوئی قصور نہیں۔ نظام کا قصور ہے۔ اس کے سبب ملک کا کتنا روحانی اور اخلاقی زوال ہو رہا ہے، اِس زوال کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہماری جماعت کا وہ طبقہ جو طاقت، عقل اور علم میں اعلیٰ ترین کہا جاسکتا ہے۔ جو دل و دماغ کے اوصاف سے مملو ہے۔ وہ صرف اسی نظام کے سبب کاہلی۔ عیش پرستی اور ہرزہ کاری کا دلدادہ بنا ہوا ہے۔
جوالاسنگھ۔ (مسکراکر) کہیں آپ انھیں خیالات کی اشاعت کرنے کی غرض سے تو لکھن پور نہیں جارہے ہیں کہ مجھے پولیس سے مدد لینی پڑے؟
پریم شنکر۔ ہاں۔ نقضِ امن کا الزام مجھ پر عائد کرنا ہو تو ضرور پولیس سے مدد لیجیے۔
جوالاسنگھ۔ مجھے اب آپ پر تیز نگاہ رکھنی پڑے گی کیونکہ میں چھوٹا موٹا زمیندار ہوں۔ آپ سے ڈرنا چاہیے۔ اس وقت لکھن پور ہی جائیے گا یا آگے بھی جانے کا ارادہ ہے؟
پریم شنکر۔ ارادہ تو یہیں سے واپس آنے کا ہے۔ پھر جیسی ضرورت ہو۔ اِدھر قریب کے دیہات میں ایک ماہ سے طاعون کا زور ہو رہا ہے۔ کچھ دوائیں ساتھ لیتا آیا ہوں۔ ضرورت ہوگی تو تقسیم کروں گا۔ شاید میرے ہی ہاتھوں دو چار جانیں بچ جائیں۔
اسی طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی لکھن پور پہنچے۔ گاؤں خالی پڑا تھا۔ لوگ باغوں میں چھونپڑیاں ڈالے ہوئے پڑے تھے۔ اِس چھوٹی سی بستی میں خوب چہل پہل تھی۔ اُن پیہم سانحات کا کہیں نشان تک نہ دکھائی دیتا تھا جن سے لوگوں کے دل فگار ہو رہے تھے۔ چھپّروں کے سامنے مہوے خشک کیے جارہے تھے۔ چکیوں کی گھرگھراہٹ، چھاج کی

پھٹک، موسل کی دھمک اس ہنگامۂ ہستی کا پتہ دے رہی تھی جو طاعون کے مہلک حملوں کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتا تھا۔ لڑکے آموں پر کنکر ڈھیلے پھینک رہے تھے۔ کوئی عورت برتن مانجتی تھی۔ کوئی اُپلے تھاپتی تھی۔ کوئی پڑوسی کے گھر سے آگ لیے چلی آ رہی تھی۔ کوئی شخص بیکار بیٹھا ہوا نظر نہ آتا تھا۔

پریم شنکر بستی میں پہنچتے ہی اپنی بہلی سے اُتر پڑے اور ایک جھونپڑے کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جوالا سنگھ گھوڑے سے نہ اُترے۔ اُن کے لیے چارپائی پر بیٹھنا بے عزتی کی بات تھی۔ زور سے بولے...... کہاں ہے مکھیا؟ جاکر پٹواری کو بُلا لائے۔ ہم موقعے کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ حکم سنتے ہی کئی آدمی جھونپڑوں سے مریضوں کو چھوڑ چھوڑکر باہر نکل آئے۔ چاروں طرف دوڑدھوپ شروع ہوگئی۔ دوتین آدمی چوپال کی طرف کرسی لینے دوڑے۔ دوتین آدمی پٹواری کی تلاش میں بھاگے۔ گاؤں کے خاص خاص لوگ جوالا سنگھ کے گرد کھڑے ہوگئے۔ پریم شنکر کی طرف کسی نے مطلق توجہ نہ کی۔ اتنے میں قادرخاں اپنے جھونپڑے سے نکلے اور سکھو کے کان میں کچھ کہا۔ سکھو نے دُکھرن بھگت سے کچھ سرگوشی کی۔ پھر بشیشر ساہ سے کاناپھوسی ہونے لگی۔ گویا یہ لوگ کسی اہم مسئلے پر مشورہ کررہے تھے۔ دس منٹ بعد سکھو چودھری ایک تھال لیے ہوئے آئے۔ اُس میں دہی چاول اور کچھ روپے رکھے ہوئے تھے۔ گاؤں کے پروہت جی نے پریم شنکر کے ماتھے پر دہی چاول کا ٹیکہ لگایا اور تھال ان کے سامنے رکھ دیا۔

جوالا سنگھ کرسی پر بیٹھے ہوئے بولے۔ لیجیے۔ آپ کی تو بوہنی ہوگئی۔ گھاٹے میں ہمیں رہے۔ اس پر آپ زمینداری کے پیشے کی مذمت کرتے ہیں۔

پریم شنکر نے کہا۔ دیوی کے نام سے اینٹ پتھر بھی تو پج جاتے ہیں۔

قادرخاں۔ ہم لوگوں کے بڑے بھاگ تھے کہ دونوں مالکوں کے ایک ساتھ درشن ہوگئے۔

پریم شنکر۔ یہاں بیماری کچھ کم ہوئی یا ابھی وہی حال ہے؟

قادرخاں۔ سرکار کچھ نہ پوچھیے۔ کم تو نہیں ہوئی اور بڑھتی جاتی ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ایک نہ ایک گھر پر بجلی نہ گرتی ہو۔ ندی یہاں سے چھ کوس ہے۔ کبھی تو دن میں دو دو تین تین بار جانا پڑتا ہے۔ اُس پر کبھی آندھی۔ کبھی پانی۔ کبھی آگ۔ کھیتوں میں

اناج سڑا جاتا ہے۔ کیسے کاٹیں کہاں رکھیں؟ بس سیرے ایک بار چولھا جلتا ہے۔ پھر دن بھر کہیں آگ نہیں جلتی۔ چلم پینے کو ترس جاتے ہیں۔ ہجور روتے نہیں بنتا۔ بڑی دُردسا ہو رہی ہے۔اس پر مالکوں کی نگاہ بھی ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ سَو کام چھوڑ کے کچہری دوڑنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو گھر میں لاش چھوڑکر جانا پڑتا ہے۔ کیا کریں۔ جو سر پر پڑی ہے اُسے جھیلتے ہیں۔ ہجور کا ایک گُلام تھا۔ اچھا پٹھا تھا۔ ساری گرہستی تھامے ہوئے تھا۔ وہ تین گھڑی میں چل بسا۔ منہ سے بول تک نہ نکلا۔ سُکھو چودھری کا تو گھر ہی ستیاناس ہوگیا۔ بس اب اکیلے اُنھیں کا ڈیل رہ گیا ہے۔ بے چارے ڈپٹ سنگھ کا چھوٹا لڑکا کل مَرا ہے۔ آج بڑا لڑکا بیمار ہے۔ اللہ ہی بچائے تو بچے۔ بول بند ہوگیا ہے۔ لال لال آنکھیں نکالے کھاٹ پر پڑا ہاتھ پاؤں پٹک رہا ہے۔ کہاں تک گِنائیں۔ خدا رسول۔ دیبی۔ دیوتا۔ سبھی کی منتیں مانتے ہیں پر کوئی نہیں سُنتا۔ اب تک تو جیسے بن پڑا مقدمہ میں جوابدہی کی۔ اب وہ ہمت بھی نہیں رہی۔ کس کے لیے یہ سب کریں۔ اتنے پر بھی مالکوں کو دیا نہیں آتی۔

پریم شنکر۔ ذرا میں ڈپٹ سنگھ کے لڑکے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

قادرخاں۔ ہاں۔ ہجور۔ چلیے۔ میں چلتا ہوں۔

جوالاسنگھ۔ ذرا احتیاط رکھیے گا یہ مرض متعدی ہوتا ہے۔

پریم شنکر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ دواؤں کا بیگ ہاتھ میں لیا اور قادرخاں کے پیچھے پیچھے چلے۔ ڈپٹ سنگھ کے جھونپڑے پر پہنچے تو وہاں آدمیوں کی بڑی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک آم کے درخت کے نیچے مریض کی چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ ڈپٹ سنگھ اور اُن کے چھوٹے بھائی جھپٹ سنگھ سرہانے کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ دو عورتیں پائنتی کی جانب کھڑی رو رہی تھیں۔ پریم شنکر کو دیکھتے ہی دونوں اندر چلی گئیں۔ دونوں بھائیوں نے اُن کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا اور الگ ہٹ گئے۔ اُنھوں نے تھرمامیٹر سے دیکھا تو مریض کا بخار ایک سو سات درجے پر تھا۔ خرابی کے آثار نمایاں تھے۔ سمجھ گئے کہ اب یہ کوئی دم کا مہمان ہے۔ ابھی وہ بیگ سے دوا نکال ہی رہے تھے کہ مریض ایک بار زور سے چیخ مار کر اُٹھا اور پھر چارپائی پر گر پڑا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ ڈپٹ سنگھ دیوانہ وار لاش سے لپٹ گیا اور روکر بولا۔ بیٹا ہائے بیٹا۔

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ جنون سا طاری ہوگیا۔ گیلی لکڑی پہلی آنچ میں کرستی ہے۔ دوسری آنچ میں جل کر راکھ ہوجاتی ہے۔ ڈپٹ سنگھ فرطِ غم سے بے قرار ہوگیا۔ کھڑا ہوکر بولا۔ کوئی اس گھر میں آگ کیوں نہیں لگا دیتا؟ اب اِس میں کیا رکھا ہے؟ کیسی دل لگی ہے کہ باپ بیٹھا رہے اور بیٹا اُٹھ جائے۔ اُنھیں ہاتھوں سے میں نے اُسے گود کھلایا تھا۔ اب اُنھیں ہاتھوں سے چتا کی گود میں کیسے بٹھا دوں۔ کیسا روٹھ کر چل دیا۔ جیسے ہم سے کوئی ناتا ہی نہیں ہے۔ کہاکرتا تھا کہ دادا تم بوڑھے ہوئے۔ اب بیٹھے بیٹھے رام رام کرو۔ ہم تمھاری پروستی (پرورش) کریں گے۔ مگر دونوں کے دونوں چل دیے۔ کسی کو مجھ پر دیا نہ آئی۔ لو رام رام کرتا ہوں۔ اب پروستی کرو کہ باتیں بنانا ہی جانتے تھے۔

یہ کہتے ہوئے وہ لاش کے پاس سے ہٹ کر دوسرے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ ایک لمحے بعد پھر بولے۔ اب اس مایا جال کو توڑ دوں گا۔ بہت دن اس نے مجھے انگلیوں پر نچایا۔ اب میں اُسے نچاؤں گا۔ تم دونوں چل دیے بہت اچھا ہوا۔ مجھے مایا جال سے چُھڑا دیا۔ اس مایا کے کارن کتنے پاپ کیے کتنے جھوٹ بولے۔ کتنوں کا گلا دبایا۔ کتنوں کے کھیت کاٹے۔ اب سب پاپ دُکھ کا کارن مٹ گیا۔ وہ مری ہوئی مایا سامنے پڑی ہے۔ کون کہتا ہے میرا بیٹا تھا؟ نہیں۔ میرا دشمن تھا! میرے گلے کا پھندا تھا۔ میرے پیر کی بیڑی تھا! پھندا چُھوٹ گیا۔ بیڑی کٹ گئی۔ لاؤ اس گھر میں آگ لگادو۔ سب کچھ بھسم کردو۔ بلراج کھڑا آنسو کیا بہاتا ہے؟ کہیں آگ نہیں ہے؟ لاکر لگا دے۔

سب لوگ کھڑے رو رہے تھے۔ پریم شنکر بھی آب دیدہ ہوگئے۔ ڈپٹ سنگھ کے پاس جاکر بولے۔ ٹھاکر صبر وکرو۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔ تمھاری یہ حالت دیکھ کر بیچاری عورتیں اور بھائی رورہے ہیں۔ اُنھیں سمجھاؤ۔

ڈپٹ سنگھ نے پریم شنکر کو وحشیانہ نگاہوں سے دیکھا اور طنز سے بولے۔ اوہو۔ آپ تو ہمارے مالک ہیں۔ کیا جافا (اضافہ) وصول کرنے آئے ہیں؟ اُسی سے لیجیے جو وہاں دھرتی پر پڑا ہوا ہے۔ وہ آپ کو کوڑی کوڑی چُکا دے گا۔ گوس کھاں سے کہہ دیجیے، اُسے پکڑ لے جائیں۔ باندھیں ماریں میں نہ بولوں گا۔ میرا کھیت باڑی سے، گھردوار سے اِستیھا ہے۔

قادرخاں نے کہا۔ بھیا ڈپٹ ۔ دل مُجبوت (مضبوط) کرو۔ دیکھتے ہو گھر گھر تو یہی آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے سر پر بھی تو وہی بپت پڑی ہے۔ اس طرح دل چھوٹا کرنے سے

کام نہ چلے گا۔ اُٹھو کچھ کپھن وپھن کا پھکر کرو۔ دوپہری ہوئی جاتی ہے۔
ڈپٹ سنگھ کو ہوش آ گیا۔ ہوش کے ساتھ آنسو بھی آئے۔ رو کر بولا۔دادا۔ تمھارا سا کلیجہ کہاں سے لاویں۔ کسی طرح دھیرج نہیں ہوتا۔ ہائے دو کے دونوں چل دیے۔ ایک بھی بڑھاپے کا سہارا نہ رہا۔ سامنے وہ لاش دیکھ کر ایسا جی چاہتا ہے۔ کہ گلے پر گنڈاسہ مارلوں۔ دادا۔ تم تو جانتے ہو کہ کتنا سوشیل لڑکا تھا۔ ابھی اس دن مگدر کی جوڑی کے لیے ہٹ کر رہا تھا۔ میں نے سینکڑوں گالیاں دیں۔ مارنے اُٹھا۔ پر بے چارے نے جبان تک نہ ہلائی۔ ہائے کھانے پہننے کو ترستا رہ گیا۔ اُس کی کوئی مُراد پوری نہ ہوئی۔ نہ پیٹ بھر کھاسکا نہ تن بھر پہن سکا۔ دِھکار ہے میری جندگانی پر۔ اب یہ گھر نہیں دیکھا جاتا۔ جھپٹ اپنا گھر دوار سنبھالو۔ میرے بھاگ میں ٹھوکر کھانا بدا ہے۔ بھائی لوگوں ۔ رام رام۔ مالک کو رام رام۔ سرکار کو رام رام۔ اب یہ ابھاگا دیس سے جاتا ہے کہی سُنی ماپھ کرنا۔
یہ کہہ کر ڈپٹ سنگھ اُٹھ کر قدم بڑھاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ جب کئی آدمیوں نے اُسے پکڑنا چاہا تو وہ بھاگا۔ لوگوں نے اس کا پیچھا کیا پر کوئی اُس کی گرد کو بھی نہ پہنچا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں اُڑا جا رہا ہے۔ لوگوں کے دم پھول گئے۔ کوئی یہاں رہا کوئی وہاں گرا۔ صرف بلراج نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ ڈپٹ سنگھ بے دم ہوکر زمین پر گر پڑے۔ بلراج دوڑ کر اُس کے سینے سے لپٹ گیا اور اپنے انگوچھے سے ہَوا کرنے لگا۔ جب اُسے ہوش آیا تو ہاتھ پکڑ کر گھر لایا۔
جوالا سنگھ پر بھی رقّت طاری ہوگئی۔ پریم شنکر سے بولے۔ بابو صاحب بڑا دردناک نظارہ ہے۔ پریم شنکر نے کہا۔ کچھ نہ پوچھیے۔ کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔
کئی آدمی بانس کاٹنے لگے مگر تیسرے پہر تک لاش نہ اُٹھی۔ پریم شنکر نے قادر خاں سے پوچھا۔ دیر کیوں ہو رہی ہے؟
قادر خاں۔ ہجور کیا کہیں۔ گھر میں روپئے نہیں ہیں۔ بے چارہ جھپٹ اِدھر اُدھر روپے کے لیے دوڑ رہا ہے پر کہیں نہیں ملتے۔ ہماری جو حالت ہے، سرکار اُسے ہمیں جانتے ہیں۔ اجافا لگان کے مکدمے نے پہلے ہی ہانڈی توا گرو رکھوا لیا تھا۔ اِس بیماری نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ اب کسی کے گھر میں بھونی بھانگ تک نہیں ہے۔ پریم شنکر نے آہ سرد بھر کر جوالا سنگھ سے کہا۔ دیکھی آپ نے اُس کی حالت؟ گھر میں کوڑی کفن کو

نہیں ہے!

جوالا سنگھ۔ مجھے افسوس ہے کہ سال گذشتہ میں اِن سے مچلکہ کیوں لیا۔ میں اب تک نہ جانتا تھا کہ ان کی حالت اس قدر تباہ ہے۔

پریم شنکر۔ مجھے افسوس ہے کہ مکان سے کچھ روپے لے کر نہیں چلا۔

جوالاسنگھ۔ روپئے میرے پاس ہیں۔ لیکن مجھے دیتے ہوئے تامل ہوتا ہے مبادا اُنھیں ناگوار ہو۔ آپ لے کر دے دیں تو بہتر۔

پریم شنکر نے بیس روپئے کا نوٹ لے کر قادرخاں کو چپکے سے دے دیا۔ ایک آدمی فوراً کفن لینے دوڑا۔ لاش اُٹھانے کی تیاری ہونے لگی۔ عورتوں میں پھر کہرام مچا۔ جب تک لاش گھر میں رہتی ہے اُس وقت تک گھر والوں کو شاید کچھ امید رہتی ہے۔ لاش کا گھر سے اُٹھ جانا مادی تعلق کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ وہ امید کے آخری رشتے کو منقطع کر دیتا ہے۔

تیسرے پہر لاش اُٹھی۔ سارے گاؤں کے آدمی ساتھ چلے۔ پہلے قادرخاں نے کندھا دیا۔

جوالاسنگھ کو سرکاری کام تھا۔ وہ واپس ہوگئے۔ لیکن پریم شنکر نے دوچار روز وہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔

(۲۱)

تقریباً دو ہفتے گزرگئے۔ شام کا وقت تھا۔ شہروں میں برف کی دوکانوں پر لوگوں کا مجمع ہونے لگا تھا۔ حقہ اور سگریٹ کا شوق کم ہوتا جا رہا تھا۔ جوالاسنگھ لکھن پور میں موقع کا معائنہ کرکے لوٹے تھے۔ اور کرسی پر بیٹھے ٹھنڈا شربت پی رہے تھے۔ اتنے ہی میں شیل منی نے آکر پوچھا دوپہر کو کہاں رہ گئے تھے؟

جوالاسنگھ۔ بابوپریم شنکر کا مہمان رہا۔ وہ ابھی دیہات ہی میں ہیں۔

شیل منی۔ کیا ابھی تک بیماری کا زورکم نہیں ہوا؟

جوالاسنگھ۔ نہیں اب کم ہو رہا ہے۔ وہ پورے پندرہ روز سے دیہات میں دورہ کر رہے ہیں۔ ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھے۔ گاؤں کے لوگ اُن کی پوجا کرتے ہیں۔ بڑے سے بڑے حاکم کی بھی اتنی عزت نہ ہوتی ہوگی۔ نہ جانے اِس تپش میں اُن سے وہاں کیسے رہا جاتا ہے۔ نہ پنکھا نہ ٹٹی نہ شربت نہ برف۔ بس درخت کے نیچے ایک

جھونپڑے میں پڑے رہتے ہیں۔ مجھ سے تو وہاں ایک دن بھی نہ رہا جائے۔

شیل منی۔ پروپکاری شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ہوا تم نے موقع کا معائنہ کیا؟

جوالاسنگھ۔ ہاں خوب معائنہ کیا۔ جس بات کا شک تھا وہی ٹھیک نکلی۔ گیان شنکر کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ اُس کے مختار اور چپراسیوں نے مجھے بہت چکما دینا چاہا پر میں اِن لوگوں کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں۔ بس حکاّم کو دھوکا دے کر اپنا مطلب پورا کرلیتے ہیں۔ ذرا اس انسانیت کو دیکھو کہ اسامیوں کے تو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور اُنھیں اپنے پیالہ بھر خون کی دُھن سوار ہے۔ اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ ذرا گاؤں میں جاکر غریب اسامیوں کی کچھ تشفی تو کرتے۔ اُنھیں کا بھائی ہے کہ زمینداری پر لات مارکر غریبوں کی بے غرضانہ خدمت کر رہا ہے۔ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے اور ایک یہ ذاتِ شریف ہیں کہ غریبوں کا خون بہانے سے بھی نہیں ہچکتے۔ میری نگاہوں میں تو ان کی آدھی عزّت بھی نہیں رہی۔ بس خالی ڈھول ہے۔

شیل منی۔ تم جس کی بُرائی کرنے لگتے ہو اُس کی مٹی پلید کر دیتے ہو۔ میں بھی آدمی پہچانتی ہوں۔ گیان شنکر دیوتا نہ ہوں مگر جیسے اور سب آدمی ہوتے ہیں ویسے ہی وہ بھی ہیں۔ خواہ مخواہ دوسروں سے بُرے نہیں۔

جوالاسنگھ۔ تم اُنھیں جو چاہو سمجھو مگر میں تو اُنھیں پکّا لالچی خودغرض اور بدباطن سمجھتا ہوں۔

شیل منی۔ تب تو تم اُن کا دعویٰ ضرور ہی خارج کردوگے۔

جوالاسنگھ۔ ہرگز نہیں۔ میں یہ سب جانتے ہوئے بھی اُنھیں کی ڈگری کروں گا خواہ میرا فیصلہ اپیل سے منسوخ ہوجائے۔

شیل منی۔ (خوش ہوکر) ہاں بس میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ تم اپنی سی کردو جس میں میری بات بنی رہے۔

جوالاسنگھ۔ پر یہ سوچ لو کہ تم اپنے اوپر کتنا بڑا بوجھ لے رہی ہو۔ لکھن پور میں پلیگ نہایت زوروں پر ہے۔ لوگ تباہ ہوئے جاتے ہیں۔ کھیت کاٹنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں ملتی۔ کوئی گھر ایسا نہیں جہاں سے گریہ و زاری کی دل خراش صدائیں نہ نکل رہی ہوں۔ گھر کے گھر بے چراغ ہوگئے۔ کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔ اُن غریبوں میں اب

اپیل کرنے کی مقدرت نہیں۔ گیان شنکر ڈگری پاتے ہی اُسے جاری کردیں گے۔ کسی کے بیل نیلام ہوں گے۔ کسی کے گھر بکیں گے۔ کسی کی فصل کھیت میں کھڑی کوڑیوں کے مول نیلام ہوجائے گی۔ یہ مظلوموں کا صبر کس پر پڑے گا؟ یہ عذاب کس کی گردن پر ہوگا؟ میں بدنامی سے نہیں ڈرتا مگر بے انصافی اور ظلم سے میری روح کانپتی ہے۔

شیل منی یہ تقریر سُن کر کانپ اُٹھی۔ اُس نے اس معاملے کو اس قدر اہم نہ سمجھا تھا۔ اُس کی خودسری مفقود ہوگئی۔ بولی۔ اگر یہی حال ہے تو پھر آپ وہی کریں جو حق و انصاف کے موافق ہو۔ میں غریبوں کی آہ نہیں لینا چاہتی۔ میں کیا جانتی تھی کہ ذرا سے دعوے کا ایسا زبردست نتیجہ ہوگا۔

جوالا سنگھ کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُٹھ گیا۔ شیل منی کو اب تک وہ نہ سمجھے تھے۔ بولے۔ وِدّیاوتی کے سامنے کون سا مُنہ لے کر جاؤگی؟

شیل منی۔ وِدّیا ایسے اوچھے مزاج کی عورت نہیں ہے۔ اور اگر وہ اس بات پر مجھ سے روٹھ بھی جائے تو مجھے اس کی بالکل پرواہ نہیں۔ دوستی کے لیے کیا غریبوں کا گلا کاٹ لیا جائے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ گیان شنکر سے چڑھتی ہے۔ جب کبھی اُنھوں نے مجھ سے اِس دعوے کا چرچا کیا ہے تو وہ برابر میرے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی ہے۔ اِن کی خود غرضی اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ دعویٰ کے خارج ہونے کی خبر سُن کر وہ دل میں خوش ہوگی۔

جوالا سنگھ۔ اُس پر آپ کا دعویٰ ہے کہ گائتری کے علاقے کا انتظام کریں گے۔ اُس کی اِن سے ایک دن بھی نہ پٹے گی۔ وہ بڑی رحم دل عورت ہے۔

شیل منی۔ تم ان کا دعویٰ خارج کردو اور وہ اپیل کر دیں تو؟

جوالا سنگھ۔ ہاں بہت ممکن ہے ضرور کریں گے۔

شیل منی۔ اور وہاں سے ان کا دعویٰ بحال ہوسکتا ہے؟

جوالا سنگھ۔ ہاں ہوسکتا ہے۔

شیل منی۔ تب تو وہ غریب کسانوں کو اور بھی پیس ڈالیں گے۔

جوالا سنگھ۔ ہاں یہ تو اُن سے کچھ بعید نہیں۔

شیل منی۔ تم کسانوں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے؟

جوالا سنگھ۔ نہ۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔

شیل منی۔ کسانوں کو کہیں سے روپیہ کی مدد مل جائے جب تو وہ نہ ہاریں گے؟

جوالا سنگھ۔ ہارجیت تو حاکم کی رائے پر موقوف ہے۔ ہاں اُنھیں مدد مل جائے تو اپنے مقدمہ کی پیروی اچھی طرح کر سکیں گے۔

شیل منی۔ تو تم کچھ روپے کیوں نہیں دے دیتے؟

جوالا سنگھ۔ واہ جس بے انصافی سے بچنا چاہتا ہوں وہی کروں۔

شیل منی۔ پریم شنکر جی بڑے رحم دل ہیں۔ اُن کے پاس روپے ہوں تو وہ کسانوں کی مدد ضرور کریں گے۔

جوالا سنگھ۔ میرے خیال میں وہ اِس انصاف کے لیے اپنے بھائی سے بیر نہ کریں گے۔

اسی اثنا میں باہر چند احباب آگئے۔ گوالیار کا ایک مشہور جل ترنگیا بھی آیا ہوا تھا۔ کلب میں اُس کا گانا ہونے والا تھا۔ لوگ کلب کو روانہ ہوگئے۔

دوسری تاریخ پر گیان شنکر کا مقدمہ پیش ہوا۔ جوالا سنگھ نے فیصلہ سُنا دیا۔ دعویٰ خارج ہوگیا۔ گیان شنکر اُس روز خود کچہری میں موجود تھے۔ فیصلہ سُنا تو دانت پیس کر رہ گئے۔ غصّے میں بھرے ہوئے گھر آئے اور وِدیا پر جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ آج بہت دنوں کے بعد لالہ پربھاشنکر کے پاس گئے اور ان سے بھی ابنائے روزگار کی اِس بے وفائی کا رونا رو آئے۔ ایک ہفتے تک یہی سلسلہ متواتر جاری رہا۔ شہر میں کوئی ایسا جان پہچان والا نہ تھا جس سے اُنھوں نے جوالا سنگھ کی اس بدسلوکی کی شکایت نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ اُن پر رشوت کا الزام عاید کرنے میں بھی تامل نہ ہوا۔ اور پھر اُنھیں صرف زبانی حملوں ہی سے تسکین نہیں ہوئی۔ قلم کی شمشیر سے بھی زخم لگانے شروع کیے۔ کئی روزانہ اخباروں میں جوالا سنگھ کی خبر لی گئی۔ جس اخبار میں دیکھیے اسی میں اُن کے خلاف کالم کے کالم بھرے رہتے تھے۔ اینگلوانڈین اخبارات کو ہندوستانیوں کی ناقابلیت پر رائے زنی کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ ایک ماہ تک یہی ہنگامہ برپا رہا۔ جوالا سنگھ کی زندگی کا کوئی پہلو بہتان اور افتراء سے نہ بچا۔ ایک اڈیٹر صاحب نے تو یہاں تک لِکھ مارا کہ اُن کا مکان شہر کے عیاش لوگوں کا اکھاڑا ہے۔ گیان شنکر کی منشیانہ قابلیت نے اُن کی سیاہ باطنی کے ساتھ مل کر جوالا سنگھ کو

ظلم اور بدنیتی کا کالا دیو بنا دیا۔ بے چارے اِن مضامین کو پڑھتے تھے اور دل میں پیچ و تاب کھاکر رہ جاتے تھے۔ اپنی صفائی دینے کا اختیار نہ تھا۔ قانون اُن کا منہ بند کیے ہوئے تھا۔ دوستوں میں ایسا کوئی نہ تھا جو اُن کی حمایت پر قلم اُٹھاتا۔ اخبارات کی دروغ بیانیوں پر کُڑھ کُڑھ کر رہ جاتے تھے۔ جو سچ جھوٹ کی جانچ کیے بغیر ہی حُکّام پر طعنہ بازی کرنے ہی میں اپنی عزّت سمجھتے تھے۔ گھر سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ شہر میں جہاں دیکھیے یہی چرچا تھا۔ لوگ اُنھیں آتے جاتے دیکھ کر سرِ بازار اُن کی تضحیک کرتے تھے۔ افسروں کی نگاہ بھی بدل گئی۔ حاکم ضلع سے ملنے گئے تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھے فرصت نہیں ہے۔ کمشنر ایک بنگالی صاحب تھے۔ اُن کے پاس فریاد کرنے گئے۔ اُنھوں نے ساری داستان کو بڑی ہمدردی کے ساتھ سُنا مگر جاتے وقت کہا۔ یہ ناممکن ہے کہ اِس شورش کا آپ پر کچھ اثر نہ ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ مسئلہ کونسل میں نہ پیش ہوجائے۔ میں حتی الامکان آپ پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ مگر آپ کو حق و انصاف کی حمایت کرنے پر کچھ نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کیونکہ حق و انصاف کے راستے میں پھول نہیں بچھے ہوئے ہیں۔

ایک روز جوالاسنگھ اِنھیں تفکرات میں محو بیٹھے ہوئے تھے کہ پریم شنکر آگئے۔ جوالاسنگھ دوڑکر اُن کے گلے سے لپٹ گئے۔ آنکھیں اشک آلود ہوگئیں گویا کسی خاص دوست سے ملاقات ہوئی ہو۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد پوچھا۔ دیہات سے کب لوٹے؟

پریم شنکر۔ آج ہی آیا ہوں۔ پورے ڈیڑھ دو مہینے لگ گئے۔ حاجی گنج والے باربار بلانے نہ جاتے تو میں ابھی جیٹھ بھر وہیں رہتا۔

جوالاسنگھ۔ بیماری کا کیا حال ہے؟

پریم شنکر۔ رفع ہوگئی ہے۔ یہ کہیے کہ آج کل اخباروں نے یہ کیسی ہل چل مچا رکھی ہے؟ میں نے تو آج ہی دیکھا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی مجھے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ یہ غول تو بے طرح آپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

جوالاسنگھ۔ ان کی عنایت ہے اور کیا کہوں۔

پریم شنکر۔ میں تو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ گیان شنکر کے دعویٰ کو خارج کر دینے کا نتیجہ ہے۔

جوالاسنگھ۔ مجھے بابو گیان شنکر سے کبھی ایسی اُمید نہ تھی کہ اپنی فرض ادائی کی مجھے یہ سزا دی جائے گی۔ اگر وہ صرف میرے انصاف و اختیارات کے تعلق سے مجھ پر حملے کرتے تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ مجھے ظالم کہتے۔ راشی کہتے خودسر ثابت کرتے۔ ہم لوگ ایسے حملوں کے عادی ہوتے ہیں۔ مگر افسوس اِس بات کا ہے کہ میری ذات کو مطعون کیا گیا ہے۔ مجھے اگر کسی بات پر فخر ہے تو اپنی سلامت روی پر۔ میرے کتنے ہی عیش پسند احباب مجھے زاہدِ خشک کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میں کبھی تھیئٹر دیکھنے نہیں گیا۔ کبھی میلے تماشے تک نہیں دیکھے۔ بابو گیان شنکر ان باتوں سے خوب واقف ہیں۔ لیکن مجھے سارے شہر کے غنڈوں کا سرغنہ بنانے میں وہ ذرا بھی نہ ہچکے۔ ان باتوں سے مجھے جتنا ملال ہوا ہے اُسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ زہر کھالوں۔ آپ سے میرا تعارف بہت کم ہے لیکن معلوم نہیں کیوں یہی جی چاہتا ہے کہ آپ کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دوں۔ میں نے کئی بار زہر کھانے کا ارادہ کیا لیکن یہ سوچ کر کہ شاید اِس سے اُن الزامات کی تصدیق ہی ہوگی۔ رُک گیا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ شیل منی رورو کر جان نہ دے دے۔ سچ پوچھیے تو اُسی کی عقیدت مندانہ محبت نے اب تک میری جان بچائی ہے۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے بدگمان ہوجاتی تو میں ضرور ہی خودکشی کرلیتا۔ گیان شنکر میرے مزاج سے واقف ہیں۔ میں اور وہ برسوں تک بھائیوں کی طرح رہے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہے کہ میرے دل کا نازک ترین مقام کہاں ہے۔ اسی مقام کو اُنھوں نے اپنے خنجرِ قلم کا نشانہ بنایا اور میری روح کو ہمیشہ کے لیے کمزور کردیا۔

پریم شنکر۔ میں تو آپ کو یہی صلاح دوں گا کہ آپ اِن اخبارات پر ازالۂ حیثیت عُرفی کا استغاثہ دائر کریں۔ اس کے سوا اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کہ گیان شنکر پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اُنھیں اپنی بدکرداریوں کی سزا ملنی چاہیے۔ میں خود تحمل پسند ہوں مگر یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی میری ذات پر لغو الزامات لگائے اور میں خاموش بیٹھا رہوں۔ آپ وکیلوں سے رائے لے کر ضرور مقدمہ دائر کردیجیے۔

جوالاسنگھ۔ کچھ سوچ کر بولے۔ اس سے اور بھی بدنامی ہوگی۔

پریم شنکر۔ ہرگز نہیں۔ آپ کو اِن جھوٹے الزامات کی تردید کا موقع ملے گا اور عوام کے دلوں میں آپ کا وقار قائم ہوجائے گا۔ ایسی حالت میں آپ کا چپ رہ جانا صرف ناقابلِ عفو ہی نہیں بلکہ معیوب ہے۔ یہ نہ خیال کیجیے گا کہ مجھے گیان شنکر سے کوئی کینہ ہے یا میری طبیعت نزاع پسند واقع ہوئی ہے۔ میں اس معاملے کو صرف اصول کے نقطۂ خیال سے دیکھتا ہوں۔ اپنی عزّت بچانا ہمارا فرض ہے۔

جوالاسنگھ۔ میں نتیجہ کو سوچ کر ہچک جاتا ہوں۔ بابو گیان شنکر کا ماخوذ ہوجانا یقینی ہے۔ عجب نہیں کہ قید ہونے کی نوبت آجائے۔ اُس وقت جو روحانی صدمہ مجھے ہوگا وہ اِس سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوگا۔ جس شخص سے برسوں تک برادرانہ محبت رہی اُس سے میں اتنا کینہ جُو نہیں ہوسکتا۔ میں تو اِس کا خیال ہی کرکے کانپ اُٹھتا ہوں۔ اُن الزامات سے میرا صرف اس قدر نقصان ہوگا کہ کسی اور مقام کو تبدیل ہوجاؤں گا یا زیادہ سے زیادہ تنزّل ہوجاؤں گا۔ لیکن دوسری صورت میں گیان شنکر تباہ ہوجائیں گے میں اپنے بُرے ارادوں کو پورا کرنے کے لیے اُن کے خاندان کو برباد نہیں کرنا چاہتا۔

پریم شنکر نے جوالاسنگھ کو عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس ایثار کے سامنے اُن کا سر جُھک گیا۔ اور دل دائمی محبت سے لبریز ہوگیا۔ وہ جوالاسنگھ کے پیروں پر گر پڑے اور آبدیدہ ہوکر بولے۔ بھائی صاحب آپ کو ایشور نے دیوتا بنایا ہے۔ مجھے اب تک نہ معلوم تھا کہ آپ کے دل میں ایسے پاک اور اعلیٰ خیالات ہیں۔

جوالاسنگھ جھجھک کر پیچھے ہٹ گئے اور بولے۔ بھائی صاحب ۔ ایشور کے لیے ایسی زیادتی نہ کیجیے۔ میں تو اپنے کو اِس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ آپ کے پیروں کو اپنے ماتھے سے لگاؤں۔ آپ مجھے خواہ مخواہ کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔

پریم شنکر۔ اگر آپ کی مرضی ہوتو میں اُنھیں اخبارات میں اُن الزامات کی تردید شائع کرادوں۔

جوالاسنگھ واقعی تردید کی اشاعت ضروری سمجھتے تھے۔ مگر اس خوف سے کہ مبادا میری رضامندی مجھے اس معیار سے گرا دے۔ جو میں نے اپنے دل میں ابھی قائم کیا ہے۔ اُنھیں انکار ہی کرنا مناسب معلوم ہوا۔ بولے۔ جی نہیں۔ اس کی بھی ضرورت نہیں۔

پریم شنکر کے چلے جانے کے بعد جوالاسنگھ کو افسوس ہُوا کہ تردید کا ایسا نادر موقع

ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر اُس کے نام سے تردید چھپتی تو ان تمام افتراپردازیوں کا خاتمہ بالخیر ہوجاتا۔ پراب تو جو ہوا سو ہوا۔ ایک مہاتما کے دل میں جگہ تو مِل گئی۔

پریم شنکر گھر تک جانے کا ارادہ کرکے حاجی پور سے چلے تھے۔ مہینوں سے گھر کا کچھ حال نہ ملا تھا۔ مگر یہاں سے اُٹھے۔ تو نو بج گئے تھے۔ جیٹھ کی لوئیں چلنے لگی تھیں۔ گھر سے حاجی پور واپس جانا دشوار تھا۔ پس کسی دوسرے روز آنے کا ارادہ کرکے واپس چلے گئے۔

مگر گیان شنکر کو چین کہاں۔ اُنھیں جیوں ہی معلوم ہوا کہ بھائی صاحب دیہات سے واپس آگئے ہیں وہ اُن سے ملنے کے لیے بے قرار ہوگئے۔ جوالاسنگھ کو اُن کی نگاہوں میں بھی گرانا ضروری تھا۔ شام کا وقت تھا۔ پریم شنکر اپنے جھونپڑے کے سامنے رکھے ہوئے گملوں میں پانی ڈال رہے تھے۔ اتنے ہی میں گیان شنکر آپہنچے اور بولے۔ کیا مزدور کہیں چلاگیا ہے؟

پریم شنکر۔ میں بھی تو مزدور ہی ہوں۔ گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟

گیان شنکر۔ جی ہاں۔ سب آپ کی عنایت ہے۔ آپ کے یہاں تو کئی مزدور ہلواہے ہوں گے۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ اِن گملوں میں پانی دے دیا کریں۔ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔

پریم شنکر۔ مجھے اِن سے کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ میرے ذاتی نوکر نہیں ہیں۔ میں تو صرف یہاں کا منتظم ہوں نہ کہ مالک۔ اور پھر امریکہ میں تو میں نے اپنے ہاتھوں سے برتن دھوئے ہیں۔ ہوٹلوں کی میزیں صاف کی ہیں۔ سڑکوں پر جھاڑو دی ہے۔ یہاں آکر میں کوئی اور تو نہیں ہوگیا ہوں۔ میں نے یہاں کوئی خدمت گار نہیں رکھا ہے۔ اپنا سب کام خود ہی کرلیتا ہوں۔

گیان شنکر۔ تب تو آپ نے حد کر دی۔ کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ کیوں اپنے کو اتنی تکلیف دیتے ہیں؟

پریم شنکر۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں ایسا نہ کرنے میں البتہ تکلیف ہوگی۔ میری عادت ہی ایسی ہوگئی ہے۔

گیان شنکر۔ یہ تو آپ مانتے ہیں کہ روحانی ترقی کے مدارج مختلف ہوتے ہیں؟

پریم شنکر۔ میں نے اس مسئلے پر کبھی غور نہیں کیا اور نہ اس پر اپنا کوئی اصول قائم کر سکا ہوں۔ اس مقدمے کی اپیل ابھی دائر کی یا نہیں؟

گیان شنکر۔ جی ہاں۔ دائر کر دی ۔ آپ نے جوالا سنگھ کی شرافت دیکھی؟ یہ حضرت میرے بنائے ہوئے ہیں۔ میں نے ہی کسی طرح رٹا رٹا کر ان کو بی اے پاس کرایا تھا۔ اپنا ہرج کرتا تھا مگر پہلے اُن کی مشکلات دور کر دیتا تھا۔ اُس نیکی کا اُنھوں نے یہ صلہ دیا۔ ایسا احسان فراموش آدمی میں نے نہیں دیکھا۔

پریم شنکر۔ اخبارات میں جو مضامین اُن کے متعلق شائع ہوئے تھے وہ تمھیں نے لکھے تھے؟

گیان شنکر۔ جی ہاں۔ جب وہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں تو پھر میں کیوں اُن کی رعایت کروں؟

پریم شنکر۔ تمھارا یہ رویّہ سراسر نا منصفانہ تھا۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا، قرینِ انصاف سمجھ کر کیا۔ اُن کا مقصود تمھیں نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ تم نے صرف اُنھیں نقصان پہنچانے کی غرض سے یہ حملے کیے۔

گیان شنکر۔ جب آپس میں عداوت ہوگئی تو جھوٹ سچ کا امتیاز کون کرتا ہے؟ انصاف کی لڑائی لڑنے کا اب زمانہ نہیں رہا۔

پریم شنکر۔ تو تم نے جو حملے کیے وہ محض بے بنیاد ہیں؟

گیان شنکر۔ ہاں آپ کے لیے بالکل بے بُنیاد مگر دوسروں کے لیے ......

پریم شنکر۔ (بات کاٹ کر) وہ ہتک کا مقدمہ دائر کر دیں تو؟

گیان شنکر۔ اس کے لیے بڑی ہمّت چاہیے اور ان میں ہمّت کا نام نہیں۔ یہ سب رُعب داب دکھانے ہی کے لیے ہے۔ اپیل کا فیصلہ میرے موافق ہوا تو ابھی اِن حضرت کی اور خبر لوں گا۔ جاتے کہاں ہیں؟ اور کچھ نہ ہوا تو بدنامی کے ساتھ تبدیل تو ہو ہی جائیں گے۔ اب کے تو آپ نے لکھن پور کی خوب سیر کی۔ اسامیوں نے تو میری خوب ہی شکایت کی ہوگی۔

پریم شنکر۔ ہاں شکایت تو سبھی کر رہے ہیں۔

گیان شنکر۔ جھگڑا فساد کا تو کوئی اندیشہ نہیں ہے؟

پریم شنکر۔ میرے خیال میں تو کوئی اندیشہ نہیں۔

گیان شنکر۔ اگر اُنھیں معلوم ہوجائے کہ اِس بارے میں ہم لوگوں میں اختلاف ہے (ایسا ہونا بہت ممکن ہے۔ کیونکہ آپ اپنے دلی خیالات کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے) تو وہ اور بھی شیر ہوجائیں گے۔

پریم شنکر۔ (ہنس کر) تو اِس سے نقصان کیا ہوگا؟

گیان شنکر۔ آپ کے اصولوں کے مطابق تو کوئی بھی نقصان نہ ہوگا مگر میں تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اس وقت میرے فائدہ کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ وہاں کی آمدورفت کم کردیں۔

پریم شنکر۔ کیا تمھیں شک ہے کہ میں اسامیوں کو اُبھار کر تم سے لڑاتا ہوں؟ مجھے تم سے کوئی عداوت ہے؟ مجھے لکھن پور ہی کے نہیں بلکہ ملک بھر کے کسانوں سے ہمدردی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے زمینداروں سے کوئی رنجش ہے۔ ہاں اگر تمھاری یہی مرضی ہے کہ میں اُدھر نہ جاؤں تو یہی سہی۔ اب سے کبھی نہ جاؤں گا۔

گیان شنکر کو اطمینان تو ہوا مگر وہ اُسے ظاہر نہ کرسکے۔ دل میں بہت نادم ہوئے۔ اپنے بھائی کی شرافت کے مقابلے میں اپنا کمینہ پن مکروہ نظر آتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک کپاس اور مَسکّہ کے کھیتوں کو دیکھتے رہے جو یہاں بہت پہلے ہی سے بو دیے گئے تھے۔ پھر گھر چلے آئے۔ شردھا کے بارے میں نہ پریم شنکر نے کچھ پوچھا اور نہ اُنھوں نے کچھ کہا۔ شردھا اب اُن کی معشوقہ نہیں تھی۔ بلکہ اُن کی نگاہوں میں ایک قابلِ پرستش دیوی تھی۔

دوسرے روز دس بجے چٹھی رساں نے اُنھیں ایک رجسٹری شدہ لفافہ دیا۔ اُنھوں نے حیرت سے لفافے کو دیکھا۔ پتہ صاف لکھا ہوا تھا۔ کھولنے پر اُس میں سے پانچ سو روپیوں کا ایک نوٹ برآمد ہوا۔ ساتھ ہی ایک خط بھی تھا جس میں لکھا ہوا تھا۔ لکھن پور والوں کی مدد کے لیے یہ روپے آپ کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اِسے آپ اپیل کی پیروی کرنے کے لیے اُنھیں دے دیں۔ تکلیف دہی کے لیے معاف فرمایئے گا۔

پریم شنکر سوچنے لگے۔ اس کا بھیجنے والا کون ہے؟ یہاں مجھے کون جانتا ہے؟ کون میرے خیالات سے واقف ہے؟ کسے مجھ پر اتنا اعتماد ہے؟ اِن سارے سوالات کا جواب ملتا تھا۔ ”جوالا سنگھ“۔ لیکن دل اِس جواب کو قبول نہ کرتا۔

اب اُنھیں یہ فکر ہوئی کہ یہ روپے کیوں کر بھیجوں؟ گیان شنکر کو معلوم ہوگیا تو وہ

سمجھیں گے کہ میں نے خود ہی اسامیوں کی مدد کی ہے۔ وہ کبھی یقین نہ کریں گے کہ یہ کسی دوسرے شخص کی امانت ہے۔ اگر اسامیوں کو نہ دُوں یہ بڑی دغابازی کا کام ہوگا۔ اسی سوچ بچار میں شام ہوگئی اور لالہ پربھاشنکر تشریف لائے۔

(۲۲)

گیان شنکر کو اپیل سے کامیاب ہونے کا کامل یقین تھا۔ اُنھیں اس بات کا علم تھا کہ کسانوں میں روپیہ نہ ہونے کے سبب اب بالکل دم نہیں ہے۔ لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ کسانوں کی طرف سے بھی مقدمے کی پیروی عمدہ طریقے پر کی جارہی ہے تو اُنھیں اپنی کامیابی میں کچھ کچھ شبہ ہونے لگا۔ اُنھیں تعجب ہوتا تھا کہ ان سبھوں کے پاس اس قدر روپیہ کہاں سے آگیا؟ غوث خاں تو کہتا تھا کہ بیماری نے سبوں کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔ کوئی اپیل کی پیروی کرنے بھی نہ جائے گا۔ یک طرفہ ڈگری ہوگی۔ یہ کایا پلٹ کیوں کر ہوئی؟ ضرور ہی اِن سبوں کو کہیں نہ کہیں سے مدد ملی ہے۔ کوئی مہاجن کھڑا ہوگیا۔ شہر میں تو کوئی ایسا نہیں نظر آتا۔ کوئی لکھن پور ہی کے قرب و جوار کا ہوگا۔ خیر کبھی تو راز افشاء ہوہی جائے گا۔ جبھی ان حضرت سے سمجھوں گا۔ فیصلے کے روز وہ خود کچہری گئے۔ اپیل خارج ہوگئی۔ سب سے پہلے غوث خاں سامنے آئے۔ اُن سے ڈپٹ کر بولے۔ کیوں جناب! آپ تو فرماتے تھے کہ اِن سبوں کے پاس کوڑی کفن کو نہیں ہے۔ یہ وکیل کیا یونہی آگیا؟

غوث خاں نے بھی گرم ہوکر کہا۔ میں نے حضور سے بالکل صحیح عرض کیا تھا۔ مگر کیا جانتا تھا کہ مالکوں ہی میں اتنا نفاق ہے۔ مجھے پتہ لگا ہے کہ حضور کے بڑے بھائی صاحب نے ایک ہفتہ ہوا کہ قادر کو اپیل کی پیروی کے لیے ایک ہزار روپۓ دیے ہیں۔

گیان شنکر کو سکتہ ہوگیا۔ ایک لمحے بعد بولے۔ بالکل غلط ہے۔

غوث خاں۔ ہرگز نہیں۔ میرے چپراسیوں نے قادرخاں کو اپنی زبان سے کہتے ہوئے سُنا ہے۔ اُس سے پوچھا جائے تو وہ آپ سے بھی صاف صاف کہہ دے گا۔ یا آپ اپنے بھائی صاحب سے خود پوچھ سکتے ہیں۔

گیان شنکر لاجواب ہوگئے۔ اسی وقت پیرگاڑی سنبھالی۔ جھلّائے ہوئے گھر آئے اور شردھا سے تُند لہجے میں بولے۔ بھابھی تم نے دیکھی بھیا کی کرامات؟ آج پتہ چلا ہے کہ حضرت نے لکھن پور والوں کو اپیل کی پیروی کے لیے ایک ہزار روپے دیے ہیں۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ میری اپیل خارج ہوگئی۔ مہینوں کی دوادوش اور ہزاروں روپیوں پر پانی پھر گیا۔ ایک ہزار سالانہ کا نقصان ہوا اور رُعب داب بالکل مٹی میں مِل گیا۔ مجھے اُن سے اس بغلی گھونسا کی اُمید نہ تھی۔ اب تمھیں بتاؤ کہ میں اُنھیں اپنا دوست سمجھوں یا دشمن؟

شردھا نے شُبہے کے ساتھ کہا۔ تمھیں کسی نے بہکا دیا ہوگا۔ بھلا اُن کے پاس اتنے روپئے کہاں ہوں گے؟

گیان شنکر۔ نہیں مجھے معتبر خبر ملی ہے۔ جن لوگوں نے روپئے پائے ہیں۔ وہ خود اپنی زبان سے کہتے ہیں۔

شردھا۔ تم سے تو اُنھوں نے وعدہ کیا تھا نا کہ لکھن پور سے میرا کوئی علاقہ نہیں ہے، میں وہاں کبھی نہ جاؤں گا؟

گیان شنکر۔ ہاں۔ کہاتو تھا اور میں نے یقین بھی کرلیا تھا۔ مگر آج معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ساری دنیا کے دوست ہیں مگر اپنے گھر کے دشمن۔ ضرور اِس میں چچا صاحب کا ہاتھ ہے۔

شردھا۔ پہلے اُن سے دریافت تو کرو۔ مجھے یقین نہیں ہوتا کہ اُن کے پاس اتنے روپے ہوں گے۔

گیان شنکر۔ اُن کی اس حرکت نے میرے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ جب اُنھیں مجھ سے اتنی رنجش ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ میں اُنھیں اپنا بھائی کیسے سمجھوں؟ برادری والوں نے اُن کی جو ہتک کی وہ بیجا نہ تھی۔ غیر مُلکی رہائش سے یگانکیت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

شردھا۔ تمھیں وہم ہوا ہے۔

گیان شنکر۔ پھروہی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تم کیا جانو کہ اُن کے پاس روپئے تھے یا نہیں۔

شردھا۔ تو ذرا وہاں تک چلے ہی کیوں نہیں جاتے؟

گیان شنکر۔ اب نہیں جاسکتا۔ مجھے ان کی صورت سے نفرت ہوگئی ہے۔ اُنھوں نے اسامیوں کی طرفداری کی ہے تو میں بھی دکھا دوں گا کہ میں کیا کچھ کرسکتا ہوں۔ زمیندار کے باون ہاتھ ہوتے ہیں۔ لکھن پور والوں کو ایسا کچلوں گا کہ اُن کی ہڈیوں کا بھی پتہ نہ

لگے گا۔ بھائی صاحب کے دل کی بات میں جانتا ہوں۔ تم سیدھی سادی عورت ہو۔ تم اُن کی تہ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اُن کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مجھے تنگ کرکے اور اسامیوں کو اُبھار کر پورے گاؤں پر اپنا قبضہ کرلیں۔ اور ہم تم کہیں کے نہ رہیں۔ اب میں اُنھیں خوب پہچان گیا۔ رنگے ہوئے سیار ہیں۔ جس نے اپنا دین تک کھودیا ہو وہ جو کچھ نہ کرے تھوڑا ہے۔ ان سے تو بے چارہ جوالاسنگھ پھر بھی غنیمت ہے۔ اُس نے جو کچھ کیا انصاف سمجھ کرکیا۔ وہ خواہ مخواہ میرا نقصان نہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرح سے میں نے اُس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ اُسے تمام ملک میں بدنام کر دیا۔ ان باتوں کو یاد کرنے ہی سے رنج ہوتا ہے۔

شردھا۔ اُن کی تو یہاں سے بدلی ہوگئی۔ شیل منی کی مہری آج آئی تھی۔ کہتی تھی کہ تین چار دن میں چلے جائیں گے۔ اُن کا درجہ بھی گھٹا دیا گیا ہے۔

گیان شنکر نے چونک کر کہا ...... سچ؟

شردھا۔ شیل منی کل آنے والی ہے۔ وِدّیا بڑے سوچ بچار میں پڑی ہوئی ہے۔

گیان شنکر۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اس کا رنج تمام عمر رہے گا۔ مجھے تو اب یقین ہوتا جاتا ہے کہ بھائی صاحب ہی نے ان کے کان بھی بھردیے تھے۔ جس دن وہ موقع دیکھنے گئے تھے۔ اُسی دن بھائی صاحب بھی لکھن پور پہنچے، بس اِدھر تو جوالاسنگھ کو پٹی پڑھائی اور اُدھر گاؤں والوں کو پکّا پوڑھا کردیا۔ میں تو کبھی گمان بھی نہ کرسکتا تھا کہ وہ اتنی دور کی کوڑی لائیں گے۔ ورنہ پہلے ہی سے چوکنا رہتا۔

شردھا نے گیان شنکر کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔

دوسرے روز شیل منی آئی اور تمام دن وہاں رہی۔ رخصت ہوتے وقت وِدّیا اور شردھا سے گلے مل کر خوب روئی۔

جوالاسنگھ پانچ روز اور رہے۔ گیان شنکر ہر روز ان سے ملنے کا ارادہ کرتے۔ لیکن ہمّت نہ پڑتی تھی۔ اندیشہ تھا کہ کہیں اُنھوں نے ان ہتک آمیز مضامین کا تذکرہ چھیڑ دیا تو کیا جواب دوں گا۔ دھاندھلی تو کرسکتا ہوں۔ صاف مکر جاؤں کہ میں نے تو کوئی مضمون ہی نہیں لکھا۔ میرے نام سے تو کوئی مضمون چھپا نہیں۔ مگر شک ہوتا تھا کہ کہیں اس چالبازی

سے جوالا سنگھ کی نگاہوں میں اور بھی ذلیل نہ ہوجاؤں۔

پانچویں روز جوالا سنگھ وہاں سے چلے۔ اسٹیشن پر دوستوں کا اچھا مجمع تھا۔ پریم شنکر بھی موجود تھے۔ جوالا سنگھ دوستوں سے ہاتھ مِلا مِلاکر رخصت ہوتے تھے۔ گاڑی کے چھوٹنے میں ایک ہی دو منٹ باقی تھے کہ اتنے میں گیان شنکر لپکے ہوئے پلیٹ فارم پر آئے اور پیچھے کی قطار میں کھڑے ہوگئے۔ آگے بڑھ کر ملنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جوالا سنگھ نے اُنھیں دیکھا۔ گاڑی سے اُتر کر اُن کے پاس آئے اور گلے سے لپٹ گئے۔ گیان شنکر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جوالا سنگھ اس لیے روتے تھے کہ مدّت کی دوستی کا انجام ایسا افسوس ناک ہوا۔ گیان شنکر روتے تھے کہ میرے ہاتھوں ایسے سچے بے لوث اور نیک نیت دوست کو ناحق تکلیف پہنچی۔

گارڈ نے جھنڈی دکھائی تو گیان شنکر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھائی جان میں سخت نادم ہوں۔

جوالا سنگھ۔ بولے۔ اب اُن باتوں کو بھول جایئے۔

گیان شنکر۔ انشاء اللہ اس کی تلافی کردوں گا۔

جوالا سنگھ۔ کبھی کبھی خط لکھتے رہیے گا۔ بھول نہ جایئے گا۔

حاضرین کو دونوں دوستوں کے مخلصانہ برتاؤ پر تعجب ہوا۔ اُن کے خیال میں اِس زخم کا اندمال غیر ممکن تھا۔ سب سے زیادہ تعجب پریم شنکر کو ہُوا جو گیان شنکر کو اُس سے کہیں زیادہ بدباطن خیال کرتے تھے جتنا کہ وہ فی الواقع تھے۔

(۲۳)

اپیل کے خارج ہوجانے کے بعد گیان شنکر نے گورکھپور کی تیاری کی۔ اُنھوں نے سوچا کہ اس طرح تو لکھن پور سے کبھی گلا نہ چُھوٹے گا۔ ایک نہ ایک جھگڑا لگا ہی رہے گا۔ کہیں گورکھپور میں رنگ جم گیا تو دو ہی تین سال میں ایسے کئی لکھن پور ہاتھ آجائیں گے۔ وِدّیا بھی موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر رضامند ہوگئی۔ اُس نے سوچا کہ اگر دونوں بھائیوں میں یہی مغائرت رہی تو ضرور ہی بٹوارہ ہوجائے گا اور تب ایک ہزار سالانہ آمدنی میں گزر نہ ہوسکے گا۔ اِن سے اور کوئی کام تو ہوسکے گا نہیں۔ بَلا سے۔ جو کام ملتا ہے وہی سہی۔ پس جنم اشٹمی کے جلسے کے بعد گیان شنکر گورکھپور جاپہنچے۔

صبح کا وقت تھا۔ گائتری پوجا پر تھی کہ دربان نے گیان شنکر کے آنے کی اطلاع دی۔ گائتری نے فوراً ہی اُنھیں اندر تو نہ بلایا۔ ہاں جو پوجا نو بجے ختم ہوتی تھی وہ سات ہی بجے ختم کردی۔ پھر اپنے کمرے میں جاکر اُس نے ایک خوش نما ساڑھی پہنی۔ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا اور پھر تمکنت کے ساتھ مسند پر جا بیٹھی۔ خادمہ کو اشارہ کیا کہ گیان شنکر کو بلا لائے۔ وہ اب رانی تھی۔ یہ خطاب اُسے حال ہی میں مِلا تھا۔ وہ گیان شنکر سے اُسی شان سے ملنا چاہتی تھی۔

گیان شنکر طلبی کے منتظر تھے۔ اُنھیں یہاں کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر حیرت ہورہی تھی۔ دروازے پر دربان وردی پہنے ٹہل رہے تھے۔ سامنے کے صحن میں ایک گھنٹہ لٹک رہا تھا۔ ایک طرف اصطبل میں کئی کلال راس کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک ٹین کے سائبان کے نیچے دو موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دالان میں پنجرے لٹکتے تھے۔ کسی میں مَینا تھی۔ کسی میں پہاڑی شیاما۔ کسی میں سفید توتا۔ ولایتی خرگوش الگ کٹہرے میں پلے ہوئے تھے۔ محل کے سامنے ہی ایک بنگلہ تھا۔ فرش ۔ میز۔ کرسیوں سے آراستہ۔ یہی دفتر تھا۔ اگرچہ ابھی بہت سویرا تھا مگر عملے اپنے کام میں مصروف تھے۔ جس کمرے میں وہ خود بیٹھے ہوئے تھے وہ دیوان خانہ تھا۔ اُس کی آرائش نہایت خوش سلیقی سے کی گئی تھی۔اُنھوں نے اب تک ایسے قیمتی قالین اور ایسے بڑے بڑے آئینوں کو نہ دیکھا تھا۔

کئی صحنوں اور دالانوں کے طے کرنے کے بعد جب وہ گائتری کی نشست گاہ میں پہنچے تو اُنھیں اپنے سامنے حُسنِ عیش افزا کا ایک بے مثال مجسمہ نظر آیا۔ جس کے ایک ایک عضو سے غرور اور تمکنت کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ وہ پہلے کی سی ہنس مُکھ۔ سادہ مزاج۔ مسکین گائتری نہ تھی۔

گیان شنکر نے سر جھُکاکر سلام کیا اور کُرسی پر بیٹھ گئے۔ ندامت سے سر نہ اُٹھاسکے۔

گائتری نے کہا۔ آیئے جناب۔ آیئے۔ کیا وِدّیا چھوڑتی ہی نہ تھی؟ اور تو سب خیرت ہے؟

گیان شنکر۔ جی ہاں۔ سب لوگ بخیریت ہیں۔ مایا تو چلتے وقت بہت ضد کر رہا تھا کہ میں بھی موسی کے یہاں چلوں گا۔ پر اُسے ابھی بخار سے اُٹھے ہوئے چند روز ہی ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ساتھ نہ لاسکا۔ آپ کو ہروقت یاد کیا کرتا ہے۔

گائتری ۔ مجھے بھی اُس کی پیاری پیاری بھولی صورت یاد آتی ہے اور کئی بار جی چاہا کہ جاکر

سب سے مل آؤں مگر ریاست کے جھمیلوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہ بوجھ آپ سنبھالیں تو مجھے ذرا دم لینے کی مہلت ملے۔ آپ کے مضمون کی تو خوب تعریف ہوئی (مسکرا کر) خوشامد کرنا کوئی آپ سے سیکھ لے۔

گیان شنکر۔ جو کچھ تھا وہ میری دلی اِرادت کا ایک شمہ تھا۔

گائتری نے قدردانی کے انداز سے کہا۔ جب تھوڑا گناہ بدنام کرنے کے لیے کافی ہو تو زیادہ کیوں کیا جائے؟ اکتوبر میں لاٹ صاحب یہاں آنے والے ہیں۔ اُسی موقع پر میرے اس خطاب پانے کا جلسہ ہونا تجویز کیا گیا ہے۔ ابھی خطاب کی خبر صرف گزٹ میں چھپی ہے۔ اب دربار میں واجبی تزک و احتشام کے ساتھ اس کا باقاعدہ اعلان کیا جائے گا۔

گیان شنکر۔ پھر تو ابھی سے دربار کی تیاری ہونی چاہیے۔

گائتری۔ آپ بہت موقع سے آئے۔ دربار کے پنڈال کی تیاری ابھی شروع ہونی چاہیے۔ مہمانوں کی ایسی خاطر و مدارات کی جائے کہ چاروں طرف دھوم مچ جائے۔ روپے کی ذرا بھی فکر نہ کیجیے۔ آپ ہی اس ناٹک کے بانی ہیں۔ آپ ہی کے ہاتھوں اس کا سارا انتظام ہونا چاہیے۔ ایک روز میں نے حاکم ضلع سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ پوچھنے لگے۔ اُن کے سیاسی خیالات کس قسم کے ہیں؟ میں نے کہا۔ بہت ہی دُوراندیش اور امن پسند شخص ہیں۔ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ وہ آجائیں تو اس جلسے کے بارے میں ایک بار مجھ سے مل لیں۔

زاں بعد گائتری نے علاقے کے انتظامات اور اپنے ارادوں کی بابت گفتگو کرنا شروع کی۔ گیان شنکر کو اس کی واقفیت و قابلیت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اُنھیں خوف ہو رہا تھا کہ شاید میں ان کاموں کو عمدہ طریقے پر انجام نہ دے سکوں۔ ادنیٰ دیہاتی بینکوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ تعمیری کاموں سے واقف نہ تھے۔ زراعت کی جدید اختراعات سے بھی لا علم تھے۔ مگر اس وقت اپنی لاعلمیوں کا اعتراف کرنا بالکل بے موقع تھا۔ وہ گائتری کی باتوں پر ایسے انداز سے سر ہلاتے تھے۔ اور درمیان میں ایسے طریقے پر رائے زنی کرتے تھے، گویا اُنھیں ان تمام امور میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اُنھیں اپنی ذہانت اور ہوشیاری پر پورا بھروسا تھا۔ اسی بھروسے پر وہ کسی کام کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نہ ہچکتے تھے۔

گیان شنکر کو دوچار روز بھی اطمینان سے بیٹھ کر کام سمجھنے کا موقع نہ ملا۔ دوسرے

ہی روز سے دربار کی تیاریوں میں مصروف ہوجانا پڑا۔ صبح سے شام تک سر اُٹھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ بار بار حُکّام سے رائے لینی پڑتی۔ آرائش کا سامان مہیا کرنے کے لیے باربار رئیسوں کے یہاں جانا پڑتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی سرکاری دربار ہے۔ مگر مستعد آدمی تھے۔ کام سے گھبراتے نہ تھے۔ ہرکام کو پوری ذمّے داری سے کرتے تھے۔ وہ شک اور تامل جو پہلے کسی معاملے میں پیش قدمی نہ کرنے دیتا تھا اب دور ہو رہا تھا۔ اُن کی محنت اور مستعدی دیکھ کر لوگ حیران ہوجاتے تھے۔ دو مہینوں کی لگاتار کوشش کے بعد دربار کا انتظام مکمل ہوگیا۔ حاکم ضلع نے خود آکر دیکھا اور گیان شنکر کی مستعدی اور کارکردگی کی بے حد تعریف کی۔ گائتری سے ملاقات کرنے پر اُسے ایسے لائق منیجر کی تقرّری پر مبارک باد دی۔ ایڈریس لکھنے کا کام بھی گیان شنکر ہی کے ذمّے تھا۔ صاحب بہادر نے ایڈریس کا مسودہ دیکھا تو دم بخود ہوگئے اور شہر کے معززین سے کہا کہ میں نے کسی ہندوستانی کے قلم میں یہ جادو نہیں دیکھا۔

ماہ اکتوبر کی ۱۰ر تاریخ دربار کے لیے مقرر تھی۔ لوگوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ بڑے سویرے ہی سے سلامی کی توپیں دغنے لگیں۔ اگر اس روز کی جملہ کارروائیوں کی مختصر روئداد بھی قلمبند کی جائے تو اُس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ایسے موقعوں پر ناولسٹ اپنے تخیل کو اخبارات کے نامہ نگاروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ لیڈیوں کے سِنگار کی بہار، رئیسوں کی شان و شوکت کا جلوہ دیکھنا ہو۔ دعوت کے بڑھیا لذیذ کھانوں کا مزہ چکھنا ہو۔ اور سواری و شکار کے شاندار اہتمام سے لطف اُٹھانا ہو تو اخباروں کے ورق اُلٹیے۔ وہاں آپ کو ساری باتوں کا تذکرہ رنگین اور جاندار الفاظ میں لکھا ہوا ملے گا۔ پریسیڈنٹ روزوِلٹ شکار کھیلنے افریقہ گئے تھے۔ تو نامہ نگاروں کی ایک پوری جماعت اُن کے ہمراہ تھی۔ شہنشاہ جارج پنجم جب ہندوستان تشریف لائے تھے تو نامہ نگاروں کی ایک خاص پلٹن اُن کے جلوس میں تھی۔ اگرچہ یہ دربار اتنا اہم نہ تھا پھر بھی اخباروں میں اس کے چرچے مہینوں تک ہوتے رہے۔ ہم صرف اس قدر کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ دربار بحسن وجوہ ختم ہوا۔ کوئی خامی نہ رہ گئی۔ ہر کام مقرّرہ وقت پر ہوا۔ کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں ہونے پائی۔ اس عجیب کامیابی کا سہرا گیان شنکر کے سر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی پُتلیاں اُنھیں کے اشاروں پر ناچ رہی ہیں۔ گورنر صاحب نے رخصت ہوتے وقت اُن کا شکریہ ادا کیا۔ چاروں

طرف واہ واہ ہوگئی۔

شام کا وقت تھا۔ دربار ختم ہوچکا تھا۔ گیان شنکر معززینِ شہر کے ساتھ گورنر صاحب کو رخصت کرکے واپس آگئے تھے اور ایک کوچ پر آرام سے لیٹے ہوئے سگار پی رہے تھے۔ آج اُنھیں تمام دن دوڑتے ہوئے گزرا تھا۔ ذرا بھی دم لینے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ کچھ کسلمند تھے مگر اس کے ساتھ ہی دل میں وہ سرور بھی تھا جو کسی بہت بڑی کامیابی پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت جب اپنے کیے ہوئے تمام انتظام کا خیال کرتے تھے تو اُنھیں خود اپنی غیر معمولی قابلیت پر حیرت ہوتی تھی۔ ابھی دوڈھائی ماہ قبل میں کیا تھا؟ ایک معمولی آدمی۔ صرف دوہزار سالانہ آمدنی کا زمیندار۔ شہر میں کوئی میری بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے حاکموں سے بھی دبنا پڑتا تھا اور اُن کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ اب یہاں کے حُکّام مجھ سے ملنے کے متمنی رہتے ہیں۔ شہر کے معززین مجھے اپنا پیشوا خیال کرتے ہیں۔ بنارس میں تو تمام عمر ختم ہو جاتی اور یہ رتبہ نہ حاصل ہوتا۔ آج گائتری کا مزاج بھی عرشِ معلیٰ پر ہوگا۔ مجھے ذرا بھی گمان نہ تھا کہ وہ اس طرح بے دھڑک پلیٹ فارم پر چلی آئے گی۔ اُس کے وہاں جاتے ہی سارا دربار جگمگا اُٹھا۔ اُس کے گلابی جسم پر صندلی رنگ کی ساڑی کیسی بہار دکھا رہی تھی۔ اُس کے حُسن کی تجلی نے جواہرات کی چمک کو بھی خیرہ کردیا تھا۔ وِدّیا اس سے کہیں زیادہ حسین ہے مگر اُس میں یہ کشش، یہ جذبہ، یہ تمکنت، یہ شوق کہاں؟ اِس کے سامنے جاکر آنکھوں پر دل پر زبان پر قابو رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ اِس کو خود اپنی طرف مائل کروں۔ میں اُس سے کھنچا ہوا رہوں مگر کوئی طاقت جبراً اُس کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے۔ اب میں رُک نہیں سکتا۔ شاید وہ مجھے اپنے سامنے آتے دیکھ کر پیچھے ہٹتی ہے۔ مجھ سے آقا اور خادم کے تعلق کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ میری قابلیت کی معترف ہے اور مجھے اپنی نمود پرستی کا ایک آلہ بنانا چاہتی ہے۔ اُس کے دل میں اب اگر کوئی تمنا ہے تو نام و نمود کی۔ یہی اب اُس کی زندگی کا مدّعا ہے۔ میں اِسی کا سہارا لے کر یہاں پہنچا ہوں اور اِسی کی بدولت میں ایک روز اُس کے دل میں محبت کا بیج بھی بوسکوں گا۔

گیان شنکر اسی قسم کے خیالات میں محو تھے کہ گائتری نے اندر بُلایا اور مُسکرا کر بولی۔ آج جس خوبی سے ساری باتیں تکمیل پاگئیں وہ سب آپ ہی کے حُسنِ تدبیر کی بدولت

ہوا۔ میں آپ کی تہ دل سے ممنون ہوں۔ صاحب بہادر نے جاتے وقت آپ کی بڑی تعریف کی۔ آپ نے مزدوروں کی اُجرت تو دلادی ہے؟ اِس خوشی کے موقعے پر بیگار لے کر میں کسی کے دل کو دُکھانا نہیں چاہتی۔

گیان شنکر۔ جی ہاں۔ میں نے مختار سے کہہ دیا تھا۔

گائتری۔ میری جانب سے ہر مزدور کو ایک ایک روپیہ انعام دلا دیجیے۔

گیان شنکر۔ پانچ سو مزدوروں سے کم نہ ہوں گے۔

گائتری۔ کچھ مضایقہ نہیں۔ ایسے ایسے موقعے روز روز نہیں آیا کرتے۔ جس اوورسیئر نے پنڈال تعمیر کرایا ہے اُسے سو روپیہ انعام دیجیے۔

گیان شنکر۔ وہ شاید لینا نہ منظور کرے۔

گائتری۔ یہ رشوت نہیں۔ انعام ہے۔ منظور کیوں نہ کرے گا۔ فرآشوں اور آتش بازوں کو بھی کچھ ملنا چاہیے۔

گیان شنکر۔ تو پھر حلوائی اور باورچی۔ خانسامے اور خدمتگار کیوں مستثنٰی کیے جائیں؟

گائتری۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اُنھیں بیس بیس روپے سے کم نہ دیے جائیں۔

گیان شنکر۔ (ہنس کر) میری ساری کفایت شعاری بے سود ہوگئی۔

گائتری۔ واہ۔ اُسی کی بدولت تو مجھے حوصلہ ہوا ہے۔ مزدور کو مزدوری کتنی ہی زیادہ دیجیے خوش نہیں ہوتا مگر انعام پاکر خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ اپنے نوکروں کو جیسا مناسب ہو کچھ نہ کچھ دلوادیجیے۔

گیان شنکر۔ جی ہاں۔ جب باہر والے لوٹ مچائیں تو گھر والے کیوں گیت نہ گائیں؟

گائتری۔ نہیں گھروالوں کا تو پہلا حق ہے جو آٹھوں پہر کے غلام ہیں۔ سب آدمیوں کو یہیں بُلائیے۔ میں اپنے ہاتھ سے اُنھیں انعام دوں گی۔ اِس سے اُنھیں خاص خوشی ہوگی۔

گیان شنکر۔ گھنٹوں کی جھنجھٹ ہے۔ بارہ بج جائیں گے۔

گائتری۔ یہ جھنجھٹ نہیں۔ یہ میری دلی تمنا ہے۔ اب مجھے کئی بڑے بڑے مرحلے طے کرنے ہیں۔ یہ میرا جڑاؤ کنگن ہے۔ یہ وِدّیا کی بھینٹ ہے کل اس کا پارسل بھیج دیجیے اور پانچ سو نقد۔

گیان شنکر۔ (سر جھکاکر) اس کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ موقع۔
گائتری ۔ اور کون سا موقع ہوگا؟ میرے لڑکے لڑکیاں بھی تو نہیں ہیں کہ اُن کے شادی بیاہ میں میں دل کھول کے ارمان نکالوں گی۔ یہ کنگن اُسے پسند بھی تھا۔ پارسال اِٹلی سے منگوایا تھا۔ اب آپ سے بھی میری ایک التجا ہے آپ مجھ سے چھوٹے ہیں۔ آپ بھی اپنا حق وصول کیجیے اور بے رحمی کے ساتھ۔

گیان شنکر نے شرماتے ہوئے کہا۔ میرے لیے آپ کی نظرنوازش کافی ہے۔اس موقع پر مجھے جو نیک نامی ملی ہے وہی میرا انعام ہے۔
گائتری۔ جی نہیں۔ میں نہ مانوں گی۔ اس وقت شرم و لحاظ کو بالائے طاق رکھیے اور سودخواروں کی طرح سنگ دل بن جایئے۔ یہ آپ کا قلم ہے جس نے مجھے اِس اعلیٰ مرتبے پر پہنچایا ہے۔ ورنہ ضلع میں مجھ جیسی کتنی ہی عورتیں ہیں جن کی کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ اِس قلم کی قرار واقعی پرستش کیے بغیر مجھے تسکین نہ ہوگی۔
گیان شنکر۔ اس کی ضرورت تو اُس وقت ہوتی جب مجھے اُس سے کم خوشی حاصل ہوتی۔ جتنی کہ آپ کو حاصل ہے۔
گائتری۔ میں یہ بحث و حجت ایک بھی نہ سنوں گی۔ آپ خود کچھ نہیں کہتے اس لیے آپ کی جانب سے میں ہی کہے دیتی ہوں۔ آپ اپنے لیے بنارس میں اپنے مکان سے ملحق ایک خوب صورت بنگلہ تعمیر کرا لیجیے۔ چار کمرے ہوں اور چاروں طرف برآمدے۔ برآمدوں پر ولایتی کھپریل ہو اور کمروں پر ڈاٹ کی چھت۔ چھت پر برسات کے لیے ایک ہَوا دار کمرہ بنوالیجیے۔ خوش ہوئے؟

گیان شنکر نے استحسان کی نظر سے دیکھ کر کہا۔ خوش تو نہیں ہوں۔ اپنے اوپر آپ رشک کرتا ہوں۔
گائتری۔ بس دیوالی سے کام شروع کرادیجیے۔ اب بتلایئے مایا کو کیا دوں؟
گیان شنکر۔ مایا کو ابھی کچھ نہ چاہیے۔ اس کا انعام آپ اپنے ہی پاس بطور امانت رہنے دیجیے۔
گائتری۔ آپ ''نو نقد نہ تیرہ اُدھار'' والی کہاوت بھولے جاتے ہیں۔
گیان شنکر۔ امانت پر تو کچھ نہ کچھ سود ملتا ہے۔

گائتری۔ اچھی بات ہے۔ مگر اِس وقت اُس کے لیے کلکتہ کے کسی کارخانے سے ایک چھوٹی

سی ٹمٹم منگا دیجیے۔ اور میرا ٹانگھن جو ٹانگہ میں چلتا ہے بنارس بھیج دیجیے۔ چھوٹی لڑکی کے لیے ہار بنوا دیجیے جو پانچ سو روپے سے کم کا نہ ہو۔

گیان شنکر یہاں سے چلے تو پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ بنگلے کی خواہش اُنھیں مدت سے تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ خواہش میری زندگی کا ایک شیریں خواب ہی رہے گی۔ لیکن خوش نصیبی نے اپنی ایک ہی نگاہ سے اُن کی وہ دیرینہ آرزو پوری کردی۔ آغاز بہت حوصلہ خیز رہا۔ دیکھیں انجام کیسا ہو۔

(۲۴)

آمدنی میں اضافہ اور خرچ میں تخفیف۔ یہ گیان شنکر کی خوش انتظامی کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ گائتری بھی ہمیشہ کفایت پر نگاہ رکھتی۔ مگر اس کی کفایت اشرفیوں کی لُوٹ اور کوئلوں پر مہر کی مصداق تھی۔ گیان شنکر نے سارا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ کارندوں کی لاپروائی سے علاقے میں اراضی کے وسیع قطعات پرتی پڑے تھے۔ ہزاروں بیگھے کی سیر ہوتی تھی مگر غلّے کا کہیں پتہ نہ چلتا تھا۔ سب کا سب سپاہی پیادوں کی خوراک میں صرف ہوجاتا تھا۔ پٹواری کی سازش اور کارندوں کی بے ایمانی سے کتنے ہی قابل زراعت خطّے بنجر اور اُوسر نظر آتے تھے۔ ساری کی ساری آمدنی سرکاری حُکّام کی ضیافت میں صرف ہوجاتی تھی۔ نوکروں کی تعداد بھی ضرورت سے زیادہ تھی۔ گیان شنکر نے کاغذات دیکھے تو اُنھیں بڑا گول مال دکھائی دیا۔ بہت دنوں سے اضافہ لگان نہ ہوا تھا۔ کھیتوں کی جمع بندی بھی قرار واقعی نہ تھی۔ ہزاروں روپے سالانہ عدمِ وصول کی مدّ میں پڑکر خارج ہوجاتے تھے۔ بڑے بڑے قطعات موروثی ہوگئے تھے۔ گیان شنکر نے اِن سبھی معاملات کی چھان بین شروع کی۔ تمام علاقے میں تہلکہ مچ گیا۔ گائتری کے پاس شکائتیں پہنچنے لگیں اور اگرچہ گائتری اسامیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا پسند کرتی تھی۔ مگر جب گیان شنکر نے اسے حساب دکھلایا تو اس کی آنکھیں کُھل گئیں۔ ایک ہزار سے زیادہ ایسے اسامی تھے جن پر اگر فوراً ہی بے دخلی نہ دائر کی جاتی تو وہ ہمیشہ کے لیے زمیندار کے قابو سے باہر ہوجاتے۔ اور اس طرح بیس ہزار سالانہ کا نقصان ہوتا۔ اضافہ لگان سے آمدنی سوا گنی ہوجاتی تھی۔ جس ریاست سے دولاکھ سالانہ کا نفع ہونا بھی مشکل تھا، اس سے بلا کسی دقت کے تین لاکھ روپے سالانہ ملنے کی

اُمید تھی۔ ایسی حالت میں گائتری اپنے قابل منیجر سے کیوں بد ظن ہوتی۔

تین سال تک سارے علاقے میں ایک طوفان سا برپا رہا۔ گیان شنکر کو بہت طرح کی ترغیبیں دی گئیں۔ ساتھ ہی قتل کی دھمکی دی گئی۔ مگر اُنھوں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی۔ اگر وہ چاہتے تو ان حالات کے ہوتے وہ ایک دولتِ کثیر کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر عزّت و اقتدار نے اب اُنھیں ایسی حقیر باتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

مگر جو منصوبے باندھ کر گیان شنکر یہاں آئے تھے۔ وہ ابھی تک پورے ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ گائتری ان کا لحاظ کرتی تھی۔ ہر معاملے میں اُنھیں کی صلاح پر عمل کرتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی وہ اُن سے کِسی قدر کشیدہ رہتی تھی۔ اُنھیں عموماً ہر روز اُن سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ علاقے کے دُور دراز کے مقامات سے بھی موٹر کے ذریعے واپس آیا کرتے تھے۔ لیکن یہ ملاقاتیں ضروری معاملات کے متعلق ہوتی تھی۔ حُسن و عِشق کے فلسفے پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہ تھا۔ دوچار لونڈیاں کھڑی رہتی تھیں۔ اور وہ مایوس ہوکر واپس آتے تھے۔ وہ آگ جو اُنھوں نے ہاتھ سینکنے کے لیے جلائی تھی۔ اب اُن کے دل کو جلانے لگی۔ اُن کی آنکھیں گائتری کے دیدار کی مشتاق رہتیں اور کان اُس کی دلکش باتیں سُننے کے شائق۔ اگر کسی دن اُنھیں مجبوراً دیہات میں ٹھہرجانا پڑتا۔ یا اور کسی سبب سے وہ گائتری کو نہ دیکھ پاتے تو وہ اس افیونی کی طرح بے قرار ہوجاتے تھے جسے وقت پر افیون نہ ملتی ہو۔

ایک روز گائتری نے علی الصباح گیان شنکر کو اندر بلایا۔ آج کل مکان کی صفائی ہو رہی تھی۔ دیوالی کا جلسہ عنقریب ہی ہونے والا تھا۔ گائتری باغیچے میں بیٹھی ہوئی چڑیوں کو چُگا رہی تھی۔ کوئی لونڈی وہاں نہ تھی۔ گیان شنکر کا دل اُچھلنے لگا۔ آج اوّل مرتبہ اُنھیں ایسا موقع ملا تھا۔ گائتری نے اُنھیں دیکھ کر کہا۔ آج آپ کو کوئی زیادہ ضروری کام تو نہیں ہے؟ میں آپ سے ایک خاص معاملے میں رائے لینا چاہتی ہوں۔

گیان شنکر۔ کچھ حساب کتاب دیکھنا تھا۔ مگر کوئی ایسا زیادہ ضروری کام نہیں ہے۔

گائتری۔ میرے سوامی جی نے (شوہر مرحوم) آخری وقت میں مجھے وصیت کی تھی کہ اپنے بعد اس علاقے کو کارِ خیر کے لیے وقف کر دینا اور ضروری انتظامات کے لیے ایک ٹرسٹ بنا دینا۔ مَیں اب چاہتی ہوں کہ اُن کی وصیت پُوری کردوں۔ زندگی کا کوئی

اعتبار نہیں۔ نہ جانے کب پیغامِ اجل آپہنچے۔ کہیں بغیر لکھا پڑھی کیے ہوئے مرگئی تو تمام ریاست بارہ باٹ ہوجائے گی اور وصیّت بھی نقش برآب ہوجائے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اِس مسئلے کو حل کردیں اس سے بہتر کوئی موقع پھر نہ ملے گا۔

گیان شنکر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔ اُن کی تمناؤں کے مثلث کا قاعدہ ہی غائب ہوا جاتا تھا۔ بولے ...... کیا وصیّت تحریری ہے؟

گائتری ۔ اُن کی خواہش میرے لیے ہزاروں تحریروں سے زیادہ واجب التعمیل ہے۔ اگر اُنھیں میری فکر نہ ہوتی تو وہ اپنے حینِ حیات ہی جائداد کو وقف کر دیتے۔ صرف میری دل جوئی کے لیے اُنھوں نے اس ارادے کو ملتوی کردیا تھا۔ جب اُنھیں میرا اس قدر لحاظ تھا میں بھی اُن کی خواہش کو ایشور کا حکم خیال کرتی ہوں۔

گیان شنکر سمجھ گئے اس وقت چالاکی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ تائید سے تردید کا کام لینا چاہیے۔ بولے...... ضرور۔ مگر یہ پہلے طے کرلینا چاہیے کہ اس کارِ خیر کی صورت کیا ہوگی۔

گائتری ۔ آپ اس بارے میں لکھنؤ جاکر والد صاحب سے ملیں۔ اپنے بڑے بھائی صاحب سے بھی رائے لیجیے۔

پریم شنکر کا نام سُن کر گیان شنکر کے تیور پر بَل پڑگئے۔ اُن کی طرف سے اِن کے دل میں گانٹھ سی پڑگئی تھی۔ بولے۔ رائے صاحب سے مشورہ کرنا تو ضروری ہے۔ وہ معاملہ فہم اور تجربہ کار ہیں۔ لیکن بھائی صاحب کو میں ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا۔ جو شخص اتنا کوتاہ فہم ہوکہ اپنی بیوی تک کو بھی ترک کر دے۔ اپنی اُصول پرستی کے بے جا زعم میں برادری کی توہین کرے۔ اور اپنی سیاہ باطنی کو غرباپروری کا رنگ دے کر اپنے بھائی کی گردن پر چُھری چلانے تک میں تامل نہ کرے، ایسے شخص سے اس پاک معاملہ کے متعلق استصواب کرنا محض بے سُود ہے۔ اُن کی بدولت میرا ایک ہزار سالانہ کا نقصان ہوگیا۔ اور تین سال گزر جانے پر بھی موضع میں امن قائم نہیں ہوسکا۔ بلکہ بدامنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ شردھا اسی سبب سے اُن سے نفرت کرتی ہے۔

گائتری۔ میری سمجھ میں تو شردھا ہی کا قصُور ہے۔ جس مرد کے ساتھ بیاہ ہوگیا اُسی کے ساتھ نباہ کرنا ہر فرض شناس عورت کا دھرم ہے۔

گیان شنکر۔ خواہ مرد کافر اور لامذہب ہوجائے۔

گائتری۔ ہاں۔ میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ بیاہ سے زن و مرد کے مفرد وجود متحد ہوجاتے ہیں۔ اُن کی رُوحیں آپس میں مِل جاتی ہیں۔

گیان شنکر۔ اگلے زمانے میں لوگوں کے خیالات ایسے رہے ہوں پر دورِجدید اسے نہیں مانتا۔ وہ عورت کو بالکل خودمختار قرار دیتا ہے۔ وہ خیال قول اور فعل میں کسی کی مطیع نہیں ہے۔ خُدا سے رُوح کا جو خاص تعلق ہے، اس کے مقابلے میں انسانوں کا ایجاد کردہ تعلق کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مغربی ممالک میں آئے دِن مذہبی اختلافات کی بنا پر طلاق کی کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں۔

گائتری۔ اُن ملکوں کی بات نہ چلائیے۔ وہاں کے لوگ تو بیاہ کو صرف ایک رسمی تعلق خیال کرتے ہیں۔ آپ ہی نے ایک بار کہا تھا کہ وہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بیاہ کو محض ڈھونگ خیال کرتے ہیں۔ اُن کی رائے میں عورت اور مرد کی باہمی رضامندی ہی بیاہ ہے۔ مگر ہمارے ہندوستان میں کبھی ایسے خیالات کو مقبولیت نہیں ملی۔

گیان شنکر۔ شاستروں میں تو اس کا ذکر صاف الفاظ میں کیا گیا ہے۔

گائتری۔ کیا کیا گیا ہے، مجھے معلوم ہے۔ لیکن کبھی اس کی اشاعت نہیں ہوئی اور کیوں ہوتی جب کہ ہمارے یہاں عورت اور مرد دونوں ایک ساتھ رہ کر بھی مذہبی کاموں کو اپنے اپنے عقائد کے مطابق انجام دے سکتے ہیں۔ مرد وِشنو کا پُجاری ہے۔ تو عورت شیوکی۔ مرد آریہ سماجی ہے اور عورت اپنے پرانے سناتن دھرم کو مانتی ہے۔ مرد ایشور کو بھی نہیں مانتا۔ اور عورت اینٹ پتّھر تک کو پُوجتی ہے۔ لیکن اس اختلاف کے سبب مردعورت میں علاحدگی نہیں ہوجاتی۔ ایشور وہ بُرا دن یہاں نہ لائے جب لوگوں میں آزاد خیالی کا اتنا زور ہوجائے۔

گیان شنکر۔ میرا مطلب صرف یہی ہے کہ دُنیاوی ذلّت کے خوف سے اپنی محبت یا نفرت کو چھپانا اپنی ذاتی آزادی کا خون ناحق کرنا ہے۔ میں اُس عورت کو قابلِ ستائش نہیں خیال کرتا۔ جو ایک بدچلن مرد سے صرف اس لیے عقیدت رکھتی ہے کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ وہ اپنی اس زندگی کو جو کارآمد بن سکتی ہے، مُفت برباد کر دیتی ہے۔ یہی بات مردوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ہم اس دُنیا میں رونے اور جھینکنے ہی

کے لیے نہیں آئے ہیں اور نہ نفس کشی ہماری زندگی کا معیار ہے۔

گائتری۔ تو آپ کے کہنے کا خُلاصہ یہ ہے کہ ہم اپنی خواہشوں کے پیچھے دیوانہ ہوجائیں۔ جس طرف وہ ہمیں لے جائیں اُسی طرف ہم آنکھوں کو بند کیے چلے جائیں۔ اُنھیں دبانے کی کوشش نہ کریں۔ آپ نے پہلے بھی ایک بار اِنھیں خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جبھی سے میں نے اس پر خوب غور کیا ہے۔ لیکن دل اس کو کسی طرح قبول نہیں کرتا۔ خواہشات پر زندگی بسر کرنا بالو کی دیوار کھڑی کرنا ہے۔ مذہبی کتابوں میں نفس کشی اور ضبط کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔ بلکہ اسی کو نجات کا وسیلہ قرار دیاگیا ہے۔ خواہشات ہی کو انسان کے انحطاط کا خاص سبب بتلایا گیا ہے۔ اور میری سمجھ میں اس پر دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ ایسی حالت میں مغربی اقوام کی پیروی کرنا سراسر حماقت و نادانی ہے۔ رسم و رواج کی غلامی خواہشوں کی غلامی سے بہتر ہے۔

گیان شنکر کو اس بحث میں خاص لُطف آرہا تھا۔ اس سے اُنھیں گائتری کے دل کے استحکام اور ضعف کا پتہ مِل رہا تھا جو آئندہ اُن کی مقصدبراری میں مد ہوسکتا تھا۔ وہ کچھ جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ ایک لونڈی نے تار کا لفافہ لاکر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ گیان شنکر نے چونک کر لفافہ کھولا۔ لکھا تھا۔ جلد آیئے لکھن پور والوں سے فوجداری ہونے کا اندیشہ ہے۔

گیان شنکر نے بے دلی کے ساتھ لفافہ کو زمین پر پھینک دیا۔ گائتری نے پوچھا۔ گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟

گیان شنکر۔ لکھن پور سے آیا ہے وہاں فوجداری ہوگئی ہے۔ اس موضع نے تو میرا ناک میں دم کردیا ۔ سب ایسے سرکش ہیں کہ کسی طرح قابو ہی میں نہیں آتے یہ سب بھائی صاحب کی کرتُوت ہے۔

گائتری۔ تب تو آپ کو جانا ہی پڑے گا۔ کہیں معاملہ طول نہ پکڑ گیا ہو۔

گیان شنکر۔ اب کے ہمیشہ کے لیے فیصلہ کردوں گا۔ یا تو موضع سے استعفٰی ہی دینا پڑے گا یا سارے موضع کو جلاکر ہی چھوڑوں گا۔ وہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی زمیندار سے پالا پڑا تھا۔

گائتری۔ لوٹتے ہوئے مایا کو ضرور لایئے گا۔ اُسے دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ وِدّیا کو بھی

لیتے آیئے تو کیا کہنا۔ میں تو لکھتے لکھتے تھک گئی۔

گیان شنکر۔ یہ وہی رواج کی غلامی ہے جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا۔ بہن کے گھر جانے کا عموماً رواج نہیں ہے۔ وہ اس رواج کو کیوں کر توڑ سکتی ہیں۔ شاید اِسی وجہ سے آپ بھی وہاں نہیں جاسکتیں۔

گائتری۔ (شرماکر) میں ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ مگر یہاں تو آپ دیکھتے ہیں کہ سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ہے۔

گیان شنکر۔ یہی حیلہ وہ بھی کرسکتی ہیں۔

گائتری۔ خیر وہ نہ آئیں تو نہ سہی پر مایا کو ضرور لیتے آیئے گا اور وہاں کا حال لکھتے رہیے گا۔ فراغت پاتے ہی واپس آیئے گا۔

گائتری کے آخری جملے میں کچھ ایسی التجا تھی کہ گیان شنکر کے دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہوگئی۔ اُنھیں یہاں رہتے تین سال سے زیادہ ہوگئے تھے۔ کتنی ہی بار بنارس گئے تھے۔ لیکن گائتری نے کبھی لوٹنے کے لیے ایسے التجا آمیز انداز سے نہ کہا تھا۔ دل نے کہا۔ شاید میرا جادو کچھ اثر کرنے لگا۔ بولے پھر بھی دو ہفتے سے کم کیا لگیں گے۔

گائتری نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ دو ہفتے!

اس طرح گیان شنکر کے خیالات کی تصدیق ہوگئی۔ وہ نو بجے کی ڈاک گاڑی سے روانہ ہوئے۔ اور پانچ بجتے بنارس پہنچ گئے۔

(۲۵)

جس وقت گیان شنکر کی اپیل خارج ہوئی اس وقت لکھن پور والوں پر مصیبت کی کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی کتنے ہی گھر پلیگ سے اُجڑگئے۔ کتنے ہی گھر آگ سے جل کر خاک سیاہ ہوئے۔ متعدد چوری کے واقعات بھی ہوئے۔ آسمانی آفتیں ان کے علاوہ۔ کبھی آندھی آتی۔ کبھی پانی برستا۔ پھاگن کے مہینے میں ایک دن اولے بھی پڑگئے۔ ساری فصل ماری گئی۔ اب گاؤں والوں کے لیے کوئی سہارا نہ تھا۔ بشیشر ساہ نے بھی زمیندار کے مقابلے میں مدد دینے سے انکار کر دیا۔ عورتوں کے گہنے پہلے ہی نِکل چکے تھے۔ اب سکھو چودھری کے سوا اور کوئی نہ تھا جو اپیل کی پیروی کرسکتا۔ لوگ تن بہ تقدیر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس بکیسانہ حالت میں پریم شنکر کے بھیجے ہوئے روپیوں نے بڑا کام کیا۔ مُردے جاگ پڑے۔ قادر خاں دل کو

مضبوط کرکے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور جی توڑکر مقدمے کی پیروی کرنے لگا۔ لیکن کاشتکاروں کی قانونی فتح عملی شکست سے کم نہ تھی۔ گیان شنکر اسامیوں کو اس سرکشی کی سزا دینے کے لیے اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ ابھی گاؤں والے جھونپڑوں ہی میں تھے کہ غوث خاں اپنے تینوں چپراسیوں کو لیے ہوئے آئے اور جھونپڑوں میں آگ لگوا دی۔ باغ کی زمین زمیندارانہ تھی۔ اسامیوں کو وہاں جھونپڑے بنانے کا کوئی حق نہ تھا۔ چپراسیوں میں دو بالکل نئے تھے۔ فیضو اور کرتار دونوں لکڑی کے فن میں ماہر تھے۔ کئی مرتبہ کے سزا یافتہ۔ جن کے دل میں رحم و مروّت کا نام نہ تھا۔ پُرانے آدمیوں میں صرف بندا مہاراج رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی اپنے دوزُخے پن کی بدولت۔ ابھی تک طاعون کے شعلے فرو نہ ہوئے تھے کہ لوگوں کو طوعاً و کرہاً بستی میں آنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی روز ٹھاکر جھپٹ سنگھ پلیگ کی زد میں آگئے۔ اور کلّو اہیر مرتے مرتے بچ گیا۔ جتنی منّت سماجت ہوسکتی تھی وہ سب کی گئی۔ لیکن ظالموں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جھپٹ کے مرجانے پر ڈپٹ بھی مرنے کو تیار ہوا۔ لٹھ چلاکر غوث کو آج جیتا نہ چھوڑوں گا۔ اب کیا خوف ہے۔ لیکن قادر خاں اُن کے پیروں پر گرپڑے۔ اور سمجھابُجھا کر گھر واپس لائے۔

لکھن پور میں ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ گاؤں بھر کے مویشی اس میں پانی پیتے تھے۔ نہانے دھونے کا کام بھی اُسی سے چلتا تھا۔

جُون کا مہینہ تھا۔ کنوؤں کا پانی تحت الثریٰ کو چلا گیا تھا۔ قرب و جوار کے سب گڑھے تالاب خشک ہوگئے تھے۔ صرف اسی بڑے تالاب میں پانی باقی تھا۔ ٹھیک اُسی وقت غوث خاں نے اُس تالاب کا پانی روک دیا۔ دو چپراسی کنارے جاکر ڈٹ گئے۔ اور مویشیوں کو مارمار کر بھگانے لگے۔ گاؤں والوں نے سنا تو چکرائے۔ کیا واقعی زمیندار تالاب کا پانی بھی بند کردے گا؟ یہ تالاب سارے گاؤں کے لیے چشمۂ حیات تھا۔ لوگوں کو کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ ہوا تھا۔ کہ زمیندار اتنی زیادتی کرسکتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے اس پر متصرف تھے۔ مگر آج اُنھیں معلوم ہوا کہ اس تالاب پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ زمیندار کی عنایت تھی کہ وہ اتنے دنوں تک خاموش رہا۔ مگر قدیمی رعایت بھی حق کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ گاؤں کے لوگ فوراً تالاب کے کنارے جمع ہوگئے اور چپراسیوں سے حُجت کرنے لگے۔ قادر خاں نے دیکھا کہ بات بڑھا چاہتی ہے تو اس نے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔

جانتے تھے کہ میرے بعد اور لوگ بھی چلے جائیں گے۔ مگر وہ دو ہی چار قدم گیا تھا۔ کہ یکایک سکھو چودھری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولے۔ کہاں جاتے ہو کادر بھیا؟ جب تک یہاں کوئی نپٹارا نہ ہوجائے تم نہ جانے پاؤ گے۔ جب جابجا ہرایک معاملے میں اسی طرح دبنا ہے۔ تو گاؤں کے سرگنا کاہے کو بنتے ہو؟

قادر۔ تو کیا کہتے ہو؟ لاٹھی چلاؤں؟

سکھو۔ اور لاٹھی ہے کس دن کے لیے؟

قادر۔ کس کے بوتہ پر لاٹھی چلے گی؟ گاؤں میں رہ کون گیا ہے؟ اللہ نے پٹھوں کو تو چُن لیا۔

سکھو۔ پٹھے نہیں ہیں نہ سہی۔ بوڑھے تو ہیں۔ ہم لوگوں کی جندگانی کس دن کام آئے گی؟

غوث خاں کو جب معلوم ہوا کہ گاؤں کے لوگ تالاب کے کنارے جمع ہیں تو وہ بھی لپکے ہوئے آپہنچے اور گرج کر بولے:۔ خبردار کوئی تالاب کی طرف قدم نہ رکھے۔

سکھو آگے بڑھ آئے اور کڑک کر بولے۔ کس کی مجال ہے جو تالاب کا پانی روکے؟ ہم اور ہمارے پُرکھا اِسی تالاب سے کام چلاتے چلے آئے ہیں۔ جمیندار نہیں اگر برہما بھی آکر کہے۔ تب بھی نہ چھوڑیں گے۔ چاہے اس کے پیچھے سربنس لُٹ جائے۔

غوث خاں نے سکھو چودھری کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا اور کہا۔ چودھری کیا اس موقع پر تم بھی دغا دو گے؟ ذرا ہوش میں آؤ۔

سکھو۔ تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ جمیندار کے لیے اپنا ہاتھ کٹوالوں؟ پیروں میں کلہاڑی مارلوں؟ کھیر کھاہی کے پیچھے اپنا حک (حق) نہیں چھوڑ سکتا۔ حک تو جب ایک کا گیا تو سب کا گیا۔ ایک کا رہا تو سب کا رہا۔

کرتار چپراسی نے تمسخر سے کہا۔ ارے تم کا کا پری ہے؟ ہے کوؤ آگے پیچھے؟ چار دِناں ماں ہاتھ پسارے چلے جیہو۔ ای (یہہ) تال تمھرے سنگ نہ جائی۔

بڈھے لوگ موت کا طنز نہیں برداشت کرسکتے۔ سکھو اینٹھ کر بولے۔ کیا ہم ہی چلے جائیں گے۔ کون جانے ہم سے پہلے تم ہی چلے جاؤ۔ اور پھر ہم چلے جائیں گے تو سارا گاؤں تو ہمارے پیچھے نہ چلا جائے گا۔

غوث خاں۔ ہمارے سُلوکوں کا یہی بدلہ؟

سنکھو۔ آپ نے ہمارے ساتھ سلوک کیے ہیں تو ہم نے بھی آپ کے ساتھ سُلوک کیے
ہیں اور پھر کوئی سلوک کے پیچھے اپنے حک پد کو نہیں چھوڑ سکتا۔

فیضو۔ تو فوجداری کرنے کا ارمان ہے؟

سنکھو۔ فوجداری کیوں کریں؟ کیا حاکم کا راج نہیں؟ ہاں جب حاکم بھی نہ سُنے گا تو جو
تمھارے من میں ہے وہ بھی ہوجائے گا۔

یہ کہہ کر سنکھو تالاب کے کنارے سے چلے گئے۔ اور اسی وقت بَیل گاڑی پر بیٹھ کر عدالت کو چلے۔ دوسرے روز دعویٰ دائر ہوگیا۔ لالہ موجی لال پٹواری کی شہادت پر ہارجیت کا انحصار تھا۔ ان کی شہادت گاؤں والوں کے موافق ہوئی۔ غوث خاں نے اُنھیں اپنی طرف کرلینے میں کوئی بات نہ اُٹھا رکھی تھی۔ حتیٰ کہ مارپیٹ کی بھی دھمکی دی تھی۔ مگر موجی لال کا اکلوتا بیٹا اسی طاعون میں مرچکا تھا۔ اس سانحے کو وہ اپنے اعمال سابقہ کا نتیجہ سمجھتے۔ پس وہ راہِ راست سے منحرف نہ ہوئے۔ بے لاگ شہادت دی۔ سنکھوچودھری کی ڈگری ہوگئی۔ اگرچہ اس مقدمے میں کئی سو روپئے برباد ہوئے۔ پر گاؤں میں اُن کی کھوئی ہوئی مرجاد پھر بندھ گئی۔ گاؤں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ سارا گاؤں اُنھیں ماننے لگا۔ اس فتح کا جشن بھی منایا گیا۔ ستیہ نارائن کی کتھا ہوئی۔ برہمنوں کا بھوج (کھانا) ہوا۔ اور تالاب کے چاروں طرف پُختہ گھاٹوں کی نیو پڑگئی۔ غوث خاں کے بھی سینکڑوں روپے پلٹ گئے۔ یہ کانٹے انھوں نے گیان شنکر سے پوچھے بغیر ہی بوئے تھے۔ اس لیے اِس کا پھل بھی اِنھیں چکھنا پڑا۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔ والی مثل پوری اُتری۔

غوث خاں یہ چوٹ کھاکر بوکھلا گئے۔ سنکھو چودھری اُن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ دیاشنکر اب اس حلقے سے تبدیل ہوگئے تھے۔ ان کی جگہ پر نورعالم نامی ایک دوسرے صاحب آگئے تھے۔ غوث خاں نے اُن سے راہ و رسم پیدا کرنی شروع کی۔ دونوں آدمیوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ اور لکھن پور پر نئی مصیبتوں کی یورش ہونے لگی۔

برسات کے دن تھے۔ کسانوں کو شب و روز جوار باجرے کی رکھوالی سے دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ جدھر دیکھیے "ہا۔ہو" کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ کوئی ڈھول بجاتا تھا۔ کوئی ٹین کے پیپوں کو پیٹتا تھا۔ دن میں توتوں کے جُھنڈ کے جھنڈ ٹوٹتے تھے۔ اور رات میں گیدڑوں کے غول کے غول حملہ آور ہوتے تھے۔ اُس پر دھان کی کیاریوں میں پودے

بٹھانے کی زحمت الگ۔ پہر رات رہے تال میں جاتے اور پہر رات گئے آتے تھے۔ مچھروں کے ڈنک سے لوگوں کے جسم پر آبلے پڑرہے تھے۔ کسی کا گھر گرتا تھا۔ کسی کے کھیت کی مینڈیں کٹی جاتی تھیں۔ ہنگامہ مستی خوب زوروں پر تھا۔ اُسی وقت داروغہ نورعالم نے گاؤں پر چھاپہ مارا۔ سکھوچودھری نے کبھی کوکین نہیں کھائی تھی۔ اُس کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کا نام تک بھی نہیں سُنا تھا۔ لیکن اُن کے گھر میں ایک تولہ کوکین برآمد ہوئی۔ پھر کیا تھا مقدمہ تیار ہوگیا۔ مال نکلنے کی دیر تھی۔ کہ حراست میں لے لیے گئے۔ اُنھیں یقین ہوگیا کہ میں بری نہ ہوسکوں گا۔ انھوں نے خود کئی آدمیوں کو اسی طرح سزا دلائی تھی۔ حراست میں لیے جانے کے ایک لمحہ پہلے وہ گھر میں گئے اور ایک ہانڈی لیے ہوئے باہر آئے۔ گاؤں کے سب لوگ جمع تھے۔ اُن سے بولے بھائیوں رام۔ رام۔ اب تم سب سے بِدا ہوتا ہوں۔ کون جانے پھر بھینٹ ہو یا نہ ہو۔ بوڑھوں کی جندگانی کا کیا بھروسا۔ ایسے ہی بھاگ ہوں گے تو بھینٹ ہوگی۔ اس ہانڈی میں پانچ ہجار روپے ہیں۔ یہ کادر بھائی کو سونپتا ہوں۔ تلاؤ (تالاب) کا گھاٹ بنوا دینا۔ جن لوگوں پر میرا کچھ آتا ہے۔ وہ سب چھوڑتا ہوں یہ دیکھو۔ سب کاگد پتر تمھارے سامنے پھاڑے ڈالتا ہوں۔ میری کسی کے یہاں کچھ رقم باقی نہیں۔ سب بھر پایا۔

داروغہ جی وہیں رونق افروز تھے۔ روپیوں کی ہانڈی دیکھتے ہی مُنہ میں پانی بھر آیا۔ سکھو کو بلاکر کان میں کہا۔ احمق ہوکہ اتنے روپۓ رکھ کر بھی بچنے کی فکر نہیں کرتے؟

سکھو۔ اب بچ کر کیا کرنا ہے؟ کیا کوئی رونے دھونے والا بیٹھا ہے؟

نورعالم۔ تم اس گمان میں ہوگے کہ حاکم کو تمھارے بڑھاپے پر ترس آجائے گا۔ اور وہ تمھیں بری کردے گا۔ مگر اس مغالطہ میں نہ رہنا۔ ایسی گھڑکر رپورٹ لکھوں گا اور ایسی معتبر شہادت پیش کروں گا کہ کوئی بیرسٹر بھی زبان نہ کھول سکے گا۔ پانچ ہزار نہیں پانچ لاکھ بھی خرچ کروگے تو بھی میرے پنجے سے نہ چھوٹ سکوگے۔ میں دیا شنکر نہیں ہوں۔ میرا نام نور عالم ہے۔ چاہوں تو ایک بار خدا کو بھی پھانس دُوں۔

سکھو نے پھر لاپروائی سے کہا۔ آپ جو چاہیں کریں۔ اب جندگانی میں کون سا سکھ ہے جس کے لیے کسی کا ٹھینگا سر پر لُوں؟

غوث خاں کے رحم کا چشمہ اُبل پڑا۔ فیضو اور کرتار بھی گُلبلا اُٹھے۔ اور بندا مہاراج

تو ہانڈی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔

سبوں نے الگ الگ اور مِل کر سُکھو کو بہت سمجھایا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر لوگوں نے قادر کو گھیرا۔ نورعالم نے انھیں الگ لے جاکر کہا۔ خاں صاحب۔ اِس بُڈھے کو ذرا سمجھاؤ۔ کیوں جان دینے پر تُلا ہوا ہے؟ دو سال سے کم کی سزا نہ ہوگی۔ ابھی تو معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تو کچھ نہ ہوگا۔ مجھے اُس کے بڑھاپے پر ترس آتا ہے۔

غوث خاں بولے۔ ہاں اس وقت اس پر رحم کرنا چاہیے۔ اب کے طاعون نے بے چارے کا ستیا ناس کر دیا۔

قادرخاں جاکر سُکھو کو سمجھانے لگے۔ بدنامی کا خوف دلایا۔ قیدخانے کی تکلیفوں کا ذکر کیا۔ مگر سُکھو ذرا بھی نہ پسیجا۔ جب قادرخاں نے بہت اصرار کیا اور گاؤں کے سب لوگ ہم زبان ہوکر سمجھانے لگے تو سُکھو بے پروائی سے بولا۔ تم لوگ مجھے کیا سمجھاتے ہو؟ میں کوئی نادان بچہّ نہیں۔ ہوں کادر کھاں سے میری عمر دو ہی چار دن کم ہوگی۔ اتنی بڑی جندگانی اپنے بھائیوں کا اہت کرنے میں کٹ گئی۔ میرے دادا مرے تو گھر میں بھونجی بھانگ نہ تھی۔ کارندوں سے مِل مِل کر میں آج گاؤں کا مُکھیا بن بیٹھا ہوں۔ چار آدمی مجھے جانتے اور مانتے ہیں۔ پر اب آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ اُن کرموں کا پھل کون بھوگے گا۔ بھوگنا تو مجھی کو ہے۔ چاہے یہاں بھوگوں چاہے نرک میں۔ یہ ساری ہانڈی میرے پاپوں سے بھری ہوئی ہے۔ اسی نے میرے گھرانے کا ستیاناس کر دیا۔ کوئی ایک چلّو پانی دینے والا نہ رہا۔ یہ پاپ کی کمائی پُن کے کام میں لگ جائے تو اچھا ہے۔ گھاٹ بنوا دینا۔ اگر کچھ اور لگے تو اپنے پاس سے لگا دینا۔ میں جیتا بچا تو کوڑی کوڑی چُکا دُوں گا۔

دوسرے روز سُکھو کا چالان ہوا۔ فیضو اور کرتار نے پولیس کی طرف سے شہادت دی۔ مال برآمد ہو ہی گیا تھا۔ کئی ہزار روپیوں کا گھر سے نکلنا تائیدی ثبوت بن گیا۔ کوئی وکیل بھی نہ تھا۔ پورے دوسال کی سزا ہوگئی۔ ناکردہ گناہ سُکھو غوث خاں کے کینہ و بغض کا شکار ہوگیا۔

سارے گاؤں میں تہلکہ پڑگیا۔ اضافہ لگان والے دعویٰ کے خارج ہونے سے لوگوں نے سمجھا کہ اب کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔ گویا خود ایشور نے اُنھیں بے خوف کردیا تھا۔

مگر ظلم کے یہ نئے ہتھکنڈے دیکھ کر سب کے دم خشک ہوگئے۔ جب سُکھو چودھری سا بڑا آدمی آن واحد میں تباہ ہوگیا تو دوسروں کا کہنا ہی کیا۔ لیکن غوث خاں کو اب بھی چین نہ پڑی۔ ان کی یہ خواہش کہ سارا گاؤں میرا غلام ہوکر میرے اشاروں پر ناچنے لگے اب تک پُوری نہ ہوئی تھی۔ موروثی کاشتکاروں میں اب تک کئی آدمی بچے ہوئے تھے۔ قادر خاں اب بھی تھا۔ بلراج اور منوہر اب بھی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ یہ سب اس باغ کے کانٹے تھے۔ اُنھیں نکالے بغیر باغ میں سیر کرنے کا لُطف کہاں!

لکھن پور شہر سے دس ہی میل کی دوری پر تھا۔ حاکم لوگ جاتے آتے وقت وہاں ضرور خیال کرتے۔ اگہن کا مہینہ شروع ہی ہوا تھا کہ پولیس کے ایک بڑے افسر کا ڈیرہ خیمہ آپہنچا۔ تحصیلدار صاحب خود ہی رسد کے انتظام کے لیے تشریف لائے۔ چپراسیوں کی ایک فوج ہم راہ تھی۔ کل لشکر میں سو سَوا سو آدمی تھے۔ گاؤں والوں نے یہ جمگھٹا دیکھا تو سمجھ گئے کہ اب خیریت نہیں ہے۔ منوہر نے بلراج کو سسرال بھیج دیا۔ اور وہاں کہلا بھیجا کہ اسے چار پانچ روز نہ آنے دینا۔ لوگ اپنی اپنی لکڑیاں اور بھوسے اُٹھاکر گھروں میں رکھنے لگے۔ لیکن تخم ریزی کا وقت تھا۔ اتنی فرصت کسے تھی۔

علی الصباح بشیشر ساہ دُکان کھول ہی رہے تھے کہ اردلی کے دس بارہ چپراسی دُکان پر جا پہنچے۔ بشیشر نے آٹا دال کے بورے کھول دیے۔ اور جنس تولی جانے لگی۔ دوپہر تک یہی سلسلہ قائم رہا۔ گھی کے کنستر خالی ہوگئے۔ تین پڑاؤں کے لیے جو سامان فراہم کیا تھا وہ ایک ہی پڑاؤ میں ختم ہوگیا۔ بشیشر کے ہوش اُڑگئے۔ پھر آدمیوں کو منڈی دوڑایا۔ بیگار کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ مشکل۔ پانچ بڑے گھوڑوں کے لیے ہری گھاس مہیا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ گاؤں کے سب چمار اس کام میں لگا دیے گئے۔ کئی نونیے پانی بھر رہے تھے۔ چار آدمی روزانہ سرکاری ڈاک لینے کے لیے صدر دوڑائے جاتے تھے۔ کہاروں کو عملے کی خدمت سے سر اُٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ پس جب دو بجے صاحب نے حکم دیا کہ میدان میں گھاس چھیل کر ٹینس کورٹ تیار کیا جائے تو وہ لوگ بھی بیگار میں پکڑ لیے گئے جو ابھی تک اپنی ضعیفی یا مقدرت کی وجہ سے بچے ہوئے تھے۔ چپراسیوں نے پہلے دکھرَن بھگت کو پکڑا۔ بھگت نے چونک کر کہا۔ کیوں مجھ سے کیا کام ہے؟ تو چپراسی نے کہا کہ چلو لشکر میں گھاس چھیلنی ہے۔

بھگت ۔ گھاس چمار چھیلتے ہیں۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔

اس پر ایک چپراسی نے اُسے گردنی دے کر آگے دھکیلا۔ اور کہا چلتے ہو کہ نہیں۔ قانون بگھارتے ہو۔

بھگت ۔ ارے تو ایسا کیا اندھیر ہے۔ ابھی ٹھاکر جی کا بھوگ تک نہیں لگایا۔

چپراسی۔ ایک روز میں ٹھاکر جی بھوکوں نہ مرجائیں گے۔

بھگت نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جھپٹ کر سپاہیوں کے بیچ سے نکل بھاگے اور گھر میں گھس کر کواڑ بند کرلیے۔ چپراسیوں نے دھڑا دھڑ کیواڑ پیٹنا شروع کیا۔ ایک نے کہا۔ لگادے آگ کہ وہیں بھونج جائے۔ دُکھرن نے اندر سے کہا۔ بیٹھو۔ بھوگ لگاکر آتا ہوں۔ چپراسیوں نے کھپریل کو پھوڑنا شروع کیا۔ اتنے میں کئی چپراسی منوہر، قادرخاں وغیرہ کو لیے آپہنچے۔ ڈپٹ سنگھ پہر رات رہے گھرسے غائب ہوگئے تھے۔ قادر نے کہا۔ بھگت گھر میں کیوں گھسے بیٹھے ہو؟ چلو ہم لوگ بھی تو چلتے ہیں۔ بھگت نے دروازہ کھولا اور باہر نکلے۔ قادر ہنس کر بولے۔ آج ہماری تمھاری باجی ہے۔ دیکھیں کون جیادہ گھاس چھیلتا ہے؟ بھگت نے کچھ جواب نہ دیا۔ سب کے سب لشکر کے میدان میں جاکر گھاس چھیلنے لگے۔

منوہر نے کہا۔ کھاں صاحب کے کارن ہم بھی چمار ہوگئے۔

دُکھرن۔ بھگوان کی مرجی۔ جو کبھی نہ کیا وہ آج کرنا پڑا۔

قادر۔ جمیندار کے اسامی نہیں ہو۔ کھیت نہیں جوتتے ہو؟

منوہر۔ کھیت جوتتے ہیں تو اس کا لگان نہیں دیتے ہیں؟ کوئی بھکوا ایک پیسہ بھی تو نہیں چھوڑتا۔

قادر۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟ گڑ کھایا ہے تو کان چھدانے پڑیں گے۔

کچھ اور باتیں کرو۔ کلو۔ اب کی تم سسرال میں بہت دن تک رہے۔ کیا کیا مار لائے؟

کلو۔ مار کیا لایا۔ یہ کہو کہ جان لے کر آگیا۔ یہاں سے چلا تو کل ساڑھے تین روپے پاس تھے۔ ایک روپیہ کی مٹھائی دی۔ آٹھ آنہ ریل کا بھاڑا دیا۔ دو روپے پاس رکھ لیے۔ وہاں پہنچتے ہی بڑے سالے نے اپنا لڑکا لاکر میری گود میں رکھ دیا۔ بنا کچھ دیے اُسے

گود میں کیسے لیتا؟ کمر سے ایک روپیہ نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ رات کو گاؤں بھر کی عورتوں نے اکٹھا ہوکر گالی گائی۔ اُنھیں بھی کچھ نیگ دینا ہی چاہیے تھا۔ ایک ہی روپیہ کی پونجی۔ وہ اُن کی بھینٹ کی۔ نہ دیتا تو جگ ہنسائی ہوتی۔ میں نے سمجھا کہ یہاں روپیوں کا اور کام ہی کیا ہے۔ اور چلتی دفعہ کچھ نہ کچھ بدائی مِل ہی جائے گی۔ آٹھ دن چین سے رہا۔ جب چلنے لگا۔ تو ساس نے ایک مٹکا کھانڈ۔ ایک ٹوکری بھر جوار کی بال اور ایک تھیلی میں کچھ کھٹائی بھر کردی۔ پہنچا نے کے لیے ایک آدمی ساتھ کردیا۔ بس بِدائی ہوگئی۔ اب بڑی چنتا ہوئی۔ کہ گھر تک کیسے پہنچوں گا۔ وہاں کوئی جان نہ پہچان۔ مانگوں بھی تو کِس سے؟ اُس آدمی کے ساتھ ٹیشن (اسٹیشن) تک آیا۔ اتنا بوجھ لے کر پیدل گھر تک آنا کٹھن تھا۔ بہت سوچتے سوچتے سوجھی کہ چل کر جوار کی بال کہیں بیچ دوں۔ آٹھ آنے بھی مِلے تو کام چل جائے گا۔ بجار میں جاکر ایک دُکاندار سے پوچھا۔ کہ بالیں لوگے؟ اس نے دام پوچھے۔ میرے مُنہ سے نکلا۔ کہ دام تو میں نہیں جانتا۔ آٹھ آنے دے دو اور لے لو۔ بنیے نے سمجھا چوری کا مال ہے۔ تھیلا مٹکا بالیں سب رکھوالیں۔ اور کہا چپکے سے چلے جاؤ نہیں تو چوکیدار کو بُلاکر تھانے بھجوادُوں گا۔ تو بھیا کیا کرتا۔ سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑکر بھاگا۔ دن بھر کا بھُوکا پیاسا پہر رات گئے گھر آیا۔ اور کان پکڑے کہ اب سسرال کبھی نہ جاؤں گا۔

قادر۔ تم تو سستے ہی چھوٹ گئے۔ ایک بار میں بھی سسرال گیاتھا۔ جوانی کی عمر تھی۔ دن بھر دھوپ میں چلا تو رتوندی ہوگئی۔ مگر لاج کے مارے کسی سے کہا تک نہیں۔ کھانا تیار ہوا تو سالی دالان میں بُلاکر اندر چلی گئی۔ دالان میں اندھیرا تھا۔ میں اُٹھا تو کچھ سوجھا ہی نہیں کہ کدھر جاؤں۔ نہ کسی کو پکارتے بنے نہ کچھ پوچھتے بنے۔ اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا۔ وہیں ایک کونے میں ایک مینڈھا بندھا ہوا تھا۔ میں اُس کے اُوپر جا پہنچا۔ وہ میرے پیر کے نیچے سے جھپٹ کر اُٹھا۔ اور مجھے ایسی ٹھوکر ماری کہ میں دور جاکر گر پڑا۔ دھکّا سُن کر وہ سالی دوڑی ہوئی آئی۔ اور اندر لے گئی۔ آنگن میں میرے سسر اور دو تین برادر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں میں بھی جاکر بیٹھا۔ پر کچھ سُوجھتا نہ تھا کہ کیا کروں؟ سامنے کھانا رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں میری ساس کڑے چھڑے پہنے چھن چھن کرتی ہوئی دال کی رکابی میں گھی ڈالنے آئی۔ میں نے چھن چھن کی آواز سُنی تو رونگٹے

کھڑے ہوگئے۔ ابھی تک میرے گھٹنوں میں درد ہورہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید مینڈھا چھوٹ گیا۔ کھڑا ہوکر لگا پیترے بدلنے۔ ساس کو بھی ایک مُکا لگایا۔ گھی کی پیالی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ گھبرا کر بھاگیں۔ لوگوں نے دوڑکر مجھے پکڑا۔ اور پُوچھنے لگے۔ کیا ہوا، کیا ہوا؟ شرم کے مارے میری جبان بند ہوگئی۔ کچھ بول ہی نہ سکا۔ سالا دوڑا ہوا گیا۔ اور ایک مولوی کو لِوا لایا۔ مولوی نے دیکھتے ہی کہا کہ اس پر تو سہید مرد سوار ہے۔ چلا ۔ جھاڑ پھونک ہونے لگی۔ گھر میں کسی نے کھانا نہ کھایا۔ ساس اور سُسر میرے سرہانے بیٹھے بڑی دیر تک روتے رہے۔ اور مجھے آوے باربار ہنسی۔ کتنی ہی روکوں پر ہنسی نہ رُکے۔ آکھر مجھے نیند پڑگئی۔ صبح اُٹھ کر میں نے کسی سے کچھ پوچھا نہ گچھا۔ سیدھے گھر کی راہ لی۔

دُکھرن بھگت اپنے سُسرال کی کوئی بات تم بھی کہو۔

دُکھرن۔ مجھے اس بکھت مَسکھری نہیں سُوجھتی۔ یہی جی چاہتا ہے کہ سر پٹک کر مرجاؤں۔

منوہر۔ کادر بھیا۔ آج بلراج ہوتا تو کھون کھرابہ ہوجاتا۔ اس سے یہ دُرگت نہ دیکھی جاتی۔

قادر۔ پھر وہی دُکھڑا لے بیٹھے۔ ارے جو اللہ کو یہی منجور ہوتا کہ ہم لوگ اِجّت آبرو سے رہیں تو ہمیں جمیندار نہ بناتا؟ کہ بیٹھے بیٹھے دوسروں پر حکم چلایا کرتے۔ نہیں تو یہ حال ہے کہ اپنا کماتے ہیں۔ اپنا کھاتے ہیں۔ پھر بھی جسے دیکھو دھونسیں جمایا کرتا ہے۔ سبھی کی گلامی کرنی پڑتی ہے۔ کیا جمیندار۔ کیا سرکار۔ کیا حاکم۔ سبھی کی نگاہ ہمارے اوپر ٹیڑھی ہے۔ اور ساید اللہ بھی ہم سے ناراج ہے۔ نہیں تو کیا ہم آدمی نہیں ہیں۔ کہ کوئی ہم سے جیادہ اَکل والا ہے۔ لیکن کہہ کر کیا کریں؟ کون سُنتا ہے؟ کون دیکھتا ہے۔ اللہ نے بھی آنکھیں بند کرلی ہیں۔ جو کوئی بھلا مانس دُکھ درد میں ہمارے پیچھے کھڑا بھی ہوجاتا ہے اس بے چارے کی جان بھی آپھت میں پھنس جاتی ہے۔ اُسے تنگ کرنے اور پھنسانے کے لیے طرح طرح کے کانون کایدے گڑھ لیے جاتے ہیں۔ دیکھتے تو ہو۔ بلراج کے اکھبار میں کیسی کیسی باتیں لکھی رہتی ہیں۔ یہ سب اپنی تکدیر کی کھوبی ہے۔

یہ کہتے کہتے قادر خاں رو پڑے ۔ وہ دل کی آگ جسے وہ ہنسی مذاق سے دبانا چاہتے تھے۔ یک دم جل اُٹھی۔ منوہر نے دیکھا تو اُن کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ پامال غرور

کا مجسمہ تھا۔

چاروں میں سے کوئی نہ بولا۔ سب کے سب سر جھُکائے چُپ چاپ گھاس چھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ تیسرا پہر ہوگیا۔ سارا میدان صاف ہوگیا۔ سبھوں نے کھرپیاں رکھ دیں۔ اور کمر سیدھی کرنے کے لیے ذرا لیٹ گئے۔ بے چارے سمجھے تھے کہ گلا چُھوٹ گیا۔ لیکن اتنے میں تحصیلدار صاحب نے آکر حکم دیا کہ گوبر لاکر اسے لیپ دو اور خُوب چکنا دو۔ کوئی کنکر پتّھر نہ رہنے پائے۔ کہاں ہیں ناظر جی؟ اِن سبھوں کو ڈول اور رسّی دلوا دیجیے۔

ناظر نے فوراً ڈول اور رسی منگاکر رکھ دی۔ قادر خاں نے ڈول اُٹھایا اور کنوئیں کی طرف چلے۔ لیکن دُکھرن بھگت نے گھر کا راستہ لیا۔ تحصیلدار نے پوچھا: اُدھر کہاں؟

دُکھرن نے گستاخی سے کہا۔ گھر جا رہا ہوں۔

تحصیلدار۔ اور لیپے گا کون؟

دُکھرن۔ جسے گرج ہوگی وہ لیپے گا۔

تحصیلدار۔ جُوتے پڑیں گے۔ دماغ کی گرمی اُتر جائے گی۔

دُکھرن۔ آپ کا اکھتیار ہے۔ جُوتے ماریے چاہے پھانسی دیجیے۔ مگر لیپ نہیں سکتا۔

قادر۔ بھگت تم کچھ نہ کرنا۔ آؤ بیٹھے ہی رہنا۔ تمھارے حصّے کا کام ہم کردیں گے۔

دُکھرن۔ میں تو اب جُوتے کھاؤں گا۔ جو کسر ہے وہ بھی پُوری ہوجائے۔

تحصیلدار۔ اس پر شامت سوار ہے۔ ہے کوئی چپراسی؟ ذرا لگاؤ تو بدمعاش کو پچاس جوتے۔ مزاج ٹھنڈا ہوجائے۔

یہ حکم پاتے ہی ایک چپراسی نے لپک کر بھگت کو اتنی زور سے دھکّا دیا کہ وہ زمین پڑ گر پڑے اور جوتے لگانے لگا۔ بھگت بے حس و حرکت زمین پر پڑے رہے گویا بے ہوش ہوگئے ہوں۔ اُن کے چہرے پر غم و غصّے کا نشان بھی نہ تھا۔ اُن کے مُنہ سے اُف تک نہ نکلتی تھی۔ بیکسی نے قوتِ احساس کو زائل کردیا تھا۔ قادر خاں کنوئیں پر سے دوڑے ہوئے آئے اور اس بے درد چپراسی کے آگے سر جھکاکر بولے۔ سیکھ (شیخ) جی ان کے بدلے مجھے جتنا چاہے مار لیجیے۔ اب بہت ہوگیا۔

چپراسی نے دھکّا دے کر قادر خاں کو دھکیل دیا اور پھر جُوتا اٹھایا کہ اچانک سامنے سے ایک یکّے پر پریم شنکر اور ڈپٹ سنگھ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ پریم شنکر یہ دردناک

نظارہ دیکھتے ہی یکّے سے کود پڑے اور دوڑے ہوئے چپراسی کے پاس جاکر بولے۔ خبردار جو پھر ہاتھ چلایا۔

چپراسی سکتے میں آگیا۔ کلّو، منوہر سب ڈول رسّی چھوڑ چھاڑکر دوڑے اور اُنھیں سلام کرکے کھڑے ہوگئے۔ چمار بھی گھاس لاکر پیسوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ بھی پاس آگئے۔ پریم شنکر کے چاروں طرف ایک بھیڑ سی لگ گئی۔ تحصیلدار نے تند لہجے میں پوچھا۔ آپ کون ہیں؟ آپ کو سرکاری کام میں مداخلت کرنے کا کیا حق ہے؟

پریم شنکر۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ غریب آدمیوں کو جوتے لگوانا بھی سرکاری کام ہے۔ اس نے کیا خطا کی تھی جس کے لیے آپ نے یہ سزا تجویز کی؟

تحصیلدار۔ سرکاری حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ میدان کو گوبر سے لیپ دے۔ پر اس نے بدزبانی کی۔

پریم شنکر۔ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ایک معزز کاشتکار ہے۔ زمین لیپنا یا کوڑا پھینکنا اس کا کام نہیں ہے۔

تحصیلدار۔ جوتے کی مار سب کچھ کرالیتی ہے۔

پریم شنکر کا خون جوش کھانے لگا۔ مگر ضبط سے کام لے کر بولے۔ آپ جیسے ذمّے دار حاکم کی زبان سے یہ بات سُن کر سخت افسوس ہوتا ہے۔

منوہر آگے بڑھ کر بولا۔ سرکار۔ آج جیسی دُرگت ہوئی ہے وہ ہمیں جانتے ہیں۔

ایک چمار بولا۔ دن بھر گھاس چھیلی۔ اب کوئی پیسہ ہی نہیں دیتا۔ گھنٹوں سے کھڑے مانگ رہے ہیں۔

تحصیلدار نے غصہ بھری آواز میں کہا۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ناظرجی! آپ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ چپراسیوں سے کہیے، اِن چماروں کی اچھی طرح خبرلیں۔ یہی ان کی مزدوری ہے۔

چپراسیوں نے بیگاریوں کو گھیرنا شروع کیا۔ کانسٹبلوں نے بھی بندوقوں کے کُندے لگانے شروع کیے۔ کئی آدمی مضروب ہوئے۔ پریم شنکر نے زور سے کہا۔ تحصلیدار صاحب۔ میں آپ سے منّت کرتاہوں کہ چپراسیوں کو اس مارپیٹ کرنے سے باز رکھیے ورنہ ان غریبوں کا خون ہوجائے گا۔

تحصیلدار۔ آپ ہی کے اشارے سے ان بدمعاشوں نے سرکشی اختیار کی ہے۔ اس کے ذمّے دار آپ ہیں۔ میں سمجھ گیا۔ آپ کسی کسان سبھا سے تعلق رکھتے ہیں۔

پریم شنکر نے دیکھا کہ لکھن پور والوں کے چہرے غصّے سے بگڑ رہے تھے۔ ہر لمحہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی اس ظلم کا مقابلہ نہ کر بیٹھے۔ مسئلہ زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تحصیلدار نیز دیگر عملوں سے انسانیت کی اب کوئی اُمید نہ ہوسکتی تھی۔ اُنھوں نے فوراً اپنے طرزِ عمل کو طے کرلیا۔ گاؤں والوں سے مخاطب ہوکر بولے۔ تحصیلدار صاحب کا حکم مان کر ایک آدمی بھی یہاں سے نہ جائے۔ سب آدمیوں کو مُنہ مانگی مزدوری دی جائے گی۔ کوئی فکر مت کرو۔

یہ بات سُنتے ہی سارے آدمی ٹھٹھک گئے۔ اور متحیّر ہوکر پریم شنکر کی طرف دیکھنے لگے۔ سرکاری عملوں کو بھی تعجب ہوا۔ منوہر اور کلّو کنوئیں کی طرف چلے۔ چماروں نے گوبر بٹورنا شروع کیا۔ ڈپٹ سنگھ بھی میدان سے اینٹ پتّھر اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے لگے۔ سارا کام ایسے طریقے سے ہونے لگا گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ صرف دُکھرن بھگت اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

پریم شنکر نے تحصیلدار۔ سے کہا۔ آپ کی اجازت ہو تو یہ آدمی اپنے گھر جائے۔ اسے بہت چوٹ آگئی۔

تحصیلدار نے کچھ سوچ کر کہا...... ہاں جاسکتا ہے۔

بھگت چپکے سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چلے۔ اِدھر دم کے دم میں سب آدمیوں نے میدان کو لیپ پوت کر درست کر دیا۔ سب کے سب ایسا دوڑ دوڑ کر خوشی سے کام کر رہے تھے۔ گویا اُن کے گھر بارات آئی ہو؟

شام ہوگئی تھی۔ پریم شنکر زمین پر بیٹھے ہوئے خیالات میں غرق تھے۔ کب تک غریبوں پر یہ ظلم ہوگا؟ کب اُنھیں انسان سمجھا جائے گا؟ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ کب اپنے غریب بھائیوں کی عزت کرنا سیکھے گا؟ کب اپنی غرض کے لئے اپنے افسروں کی بیجا خوشامد کرنا چھوڑے گا؟

اتنے میں تحصیلدار صاحب سامنے آکر کھڑے ہوگئے اور التجا آمیز انداز سے بولے۔ آپ کو یہاں تکلیف ہو رہی ہے۔ میرے خیمے میں تشریف لے چلیے۔ معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہ تھا۔ غریبوں کے ساتھ آپ کی ہمدردی دیکھ کر بے اختیار آپ کی

تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ خدا نے آپ کو ایسا دردمند دل عطا فرمایا ہے۔ ہم بدنصیبوں کی زندگی تو اپنی ہی تن پروری میں گزری جاتی ہے۔ کروں کیا؟ اگر ابھی صاف صاف کہہ دوں کہ بیگار میں مزدور نہیں ملتے۔ تو نالائق سمجھا جاؤں...... آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ مزدوروں کو آٹھ آنے روزانہ ملتے ہیں۔ پر ان صاحب بہادر سے اتنی مزدوری مانگوں تو وہ ہرگز نہ دیں گے۔ سرکار نے قاعدے بہت اچھے بنائے ہیں۔ مگر یہ حکام قاعدوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ کم از کم پچاس روپے کے مٹی کے برتن لگے ہوں گے۔ لکڑی بھوسا۔ پیال۔ سینکڑوں من اُٹھ گیا۔ کون اُن کی قیمت دیتا ہے۔ اگر قاعدہ پر عمل کروں تو پھر ایک لمحہ بھی رہنا دُشوار ہوجائے۔ اور میں تنہا کرہی کیا سکتا ہوں؟ میرے اور بھائی بھی تو ہیں۔ اُن کی سختیاں آپ دیکھیں تو دانتوں تلے اُنگلی دبالیں۔ خُدا نے جس گھر میں روکھی سُوکھی روٹیاں بھی دی ہوں وہ کبھی یہ ملازمت نہ کرے۔ آئیے۔ بیٹھیے۔ آپ کو ایسی سینکڑوں داستانیں سُناؤں جن میں تحصیلداروں کو قاعدے کے مطابق عمل کرنے پر جہنم واصل کردیا گیا ہے۔ میرے اوپر خود ایک بار گزر چکی ہے۔

پریم شنکر کو تحصیلدار سے ہمدردی ہوگئی۔ سمجھ گئے کہ یہ بے چارے مجبور ہیں۔ دل میں مجوب ہوئے کہ میں نے ان سے بلا سبب ہی تعرض کیا۔ ان کے ساتھ خیمے میں چلے گئے۔ وہاں بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ تحصیلدار صاحب انتہا درجہ کے شریف اور خلیق ثابت ہوئے۔ منصبی سرگزشتوں کو سُنا چکے تو اپنی خانگی تکالیف کا بیان کرنے لگے۔ اُن کے تین لڑکے کالج میں پڑھتے تھے۔ دو لڑکیاں بیوہ ہوگئی تھیں۔ ایک بیوہ بہن اور اس کے بچوں کی پرورش کا بار بھی سر پر تھا۔ دو سو میں بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ پس موقع و محل دیکھ کر رشوت لینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے یہ سارا ماجرا ایسی صفائی اور خلوص سے بیان کیا کہ پریم شنکر کو اُن سے محبت سی ہوگئی۔ یہاں سے اُٹھے تو آٹھ بج چکے تھے۔ چوپال کی طرف جاتے ہوئے ڈکھرن بھگت کے دروازے پر پہنچے تو ایک عجیب تماشا دیکھا۔ گاؤں کے کتنے ہی لوگ جمع تھے اور بھگت اُن کے درمیان میں کھڑے سالگرام کی مُورت لیے ہوئے دیوانوں کی طرح بہک بہک کر کہہ رہے تھے کہ یہ سالگرام ہیں۔ اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں۔ سدا اُن کی رچھا کیا کرتے ہیں۔ اُنھیں موہن بھوگ بہت اچھا لگتا ہے۔ کپور اور دُھوپ کی مہک بہت اچھی لگتی ہے۔ پُوچھو کہ میں نے

ان کی کون سی سیوا نہیں کی۔ آپ ستو کھاتا تھا، بچّے چبینا چباتے تھے، پر اِن کو موہن بھوگ کھلاتا تھا۔ ان کے لیے جاکر کوسوں سے پھول اور بیل پتر لاتا تھا۔ اپنے لیے تماکھو چاہے نہ رہے پر اُن کے لیے کپور اور دُھوپ کی پھکر کرتا تھا۔ ان کا بھوگ لگا کے تب دوسرا کام کرتا تھا۔ گھر میں کوئی مرتا ہی کیوں نہ ہو، پر اِن کی پُوجا کیے بنا کبھی نہ اُٹھتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ ہوا کہ ٹھاکر دُوارے میں جاکر چرنامرت نہ پیا ہو۔ آرتی نہ کی ہو۔ رامائن کا پاٹ نہ کیا ہو۔ یہ ساری پوجا پاٹ کیا اسی لیے کی کہ مجھ پر جُوتے پڑیں۔ ہک ناہک مارا جاؤں۔ چمار بنوں؟ دِھکّار ہے مجھ پر جو پھر ایسے ٹھاکر کا نام لوں۔ جو اِنھیں اپنے گھر میں رکھوں اور اُن کی پوجا کروں۔ ہاں دِھکّار ہے مجھ پر۔ گیانیوں نے سچ کہا ہے کہ یہ اپنے بھگتوں کے بیری ہیں۔ اُن کا اپمان (بے عزتی) کرتے ہیں۔ اُن کی جڑ کھودتے ہیں۔ اور اُس سے پرسن (خوش) رہتے ہیں جو اِن کا اپمان کرے۔ میں اب تک بھُولا ہوا تھا۔ بولو منوہر! کیا کہتے ہو؟ اِنھیں کنوئیں میں پھینکوں یا گھورے پر ڈال دُوں۔ جہاں ان پر منوں کوڑا کرکٹ روج پڑا کرے۔ یا راہ میں پھینک دوں۔ جہاں سیرے سے سانجھ تک اِن پر لاتیں پڑتی رہیں۔

منوہر۔ بھیا۔ تم جانکار ہوکر انجان بنتے ہو۔ وہ سنسار کے مالک ہیں۔ اُن کی مہما کا پاراوار نہیں ہے۔

قادر ۔ کون جانتا ہے کہ اُن کی کیا مرجی ہے۔ بُرائی سے بھلائی کرتے ہیں۔ مَن کو اتنا چھوٹا نہ کرو۔

دُکھرن۔ (ہنس کر) یہ سب من کو سمجھانے کا ڈھکوسلا ہے۔ کادرمیاں یہ پتّھر کا ڈھیلا ہے۔ نرا مٹّی کا پنڈا۔ میں اب تک بھُول میں پڑا ہوا تھا۔ سمجھتا تھا کہ اس کی اُپاسنا کرنے سے میرا لوک پرلوک دونوں بن جائے گا۔ آج آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ یہ نِرا مٹّی کا ڈھیلا ہے۔ یہ لو مہاراج۔ جاؤ جہاں تمھارا جی چاہے۔ تمھاری یہی پُوجا ہے۔ تیس سال کی بھگتی کا تم نے مجھے یہ بدلہ دیا ہے۔ میں بھی تمھیں اس کا بدلہ دیتا ہوں!

یہ کہہ کر بھگت نے سالگرام کی مُورت کو زور سے ایک طرف کو پھینک دیا۔ نہ جانے کہاں جاکر گری۔ پھر دوڑتے ہوئے گھر میں گئے۔ اور پوجا کی پٹاری لیے ہوئے باہر نکلے۔

منوہر لپکا کہ پٹاری اُن کے ہاتھ سے چھین لوں۔ پر بھگت نے اُنھیں اپنی طرف آتے دیکھ کر بڑی پھرتی سے پٹاری کھولی اور اُسے ہوا میں اُچھال دیا۔ سبھی چیزیں اِدھر اُدھر پھیل گئیں۔ تیس سال کی روحانی عقیدت مِٹ گئی۔ مذہبی اعتقاد کی دیوار ہِل گئی۔ اور اس کی اینٹیں بکھر گئیں۔

کتنا دل ہلادینے والا نظارہ تھا۔ پریم شنکر کا دل بھر آیا۔ ایشور اس نامہذب جاہل اور مفلس دہقانی میں اتنی خودداری! اسے بے حرمتی نے اتنا ذکی الحس بنا دیا! کون کہتا ہے دہقانیوں میں یہ احساس نہیں ہوتا؟ کتنا سخت صدمہ ہے۔ جس نے ایمان اعتقاد اور ارادتِ قلبی کو ریزہ ریزہ کردیا!

پریم شنکر سب لوگوں کے عقب میں کھڑے تھے۔ کسی نے اُنھیں دیکھا نہیں۔ وہ وہیں سے چوپال کو چلے گئے۔ وہاں پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ڈپٹ سنگھ چوکا لگا رہے تھے۔ کلو پانی بھرتے تھے۔

اُنھیں دیکھتے ہی غوث خاں نے ادب سے سلام کیا اور کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ حضور کو تحصیلدار صاحب کے یہاں بڑی دیر ہوگئی۔

پریم شنکر۔ ہاں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کیوں۔ یہاں کہار نہیں ہے کیا؟ یہ لوگ کیوں پانی بھر رہے ہیں؟ اُسے بُلائیے۔ مناسب اُجرت دی جائے گی۔

غوث خاں۔ حضور۔ کہار تو چار گھر تھے۔ لیکن سب اُجڑ گئے۔ اب ایک آدمی بھی نہیں ہے۔

پریم شنکر۔ یہ کیوں؟

غوث خاں۔ اب حضور سے کیا عرض کروں۔ ہمیں لوگوں کی شرارت اور ظلم سے یہاں ہمیشہ تین چار چپراسی رہتے ہیں۔ ایک کے لیے ایک خدمت گار چاہیے اور میرے لیے تو جتنے خدمت گار ہوں اتنے تھوڑے ہیں۔ بے چارے سویرے ہی سے پکڑ لیے جاتے تھے۔ اور شام کو چھٹی ملتی تھی۔ کچھ کھانے کو پاگئے۔ ورنہ یوں ہی واپس جاتے تھے۔ آخر سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی کلکتہ گیا۔ کوئی رنگون۔ اپنے بال بچوں کو بھی لیتے گئے۔ اب یہ حال ہے کہ اپنے ہاتھوں برتن تک دھونے پڑتے ہیں۔

پریم شنکر۔ آپ لوگ ان غریبوں کو اتنا ستاتے کیوں ہیں؟ ابھی تحصیلدار صاحب لشکر والوں کی ساری زیادتیوں کا الزام آپ ہی کے سر رکھتے ہیں۔

غوث خاں۔ حضور تو فرشتہ ہیں۔ پر ہمارے چھوٹے سرکار کا ایسا ہی حکم ہے۔ آج کل خطوں میں باربار تاکید کرتے رہتے ہیں کہ گاؤں میں ایک بھی موروثی اسامی نہ رہنے پائے۔ حضور کا نمک خوار ہوں تو حضور کے حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اس لیے مجھے ان بیکسوں پر سبھی طرح کی سختیاں کرنی پڑتی ہیں۔ کہیں مقدمے کھڑے کردیے کہیں بیگار میں پھنسا دیا۔ کہیں آپس میں لڑا دیا۔ سرکاری قانون کا منشا ہے کہ اسامیوں کو لگان دیتے وقت ہی پائی پائی کی رسید دے دی جائے۔ مگر میں صرف اُنھیں لوگوں کو رسید دیتا ہوں جو ذرا چالاک ہیں۔ گنواروں کو یُوں ہی ٹال دیتا ہوں۔ چھوٹے سرکار کا بقایا کی وصولی پر اتنا زور ہے کہ ایک پائی بھی باقی رہے تو نالش کر دو۔ کتنے ہی اسامی تو نالشوں سے تنگ آکر نکل بھاگے۔ میرے لیے تو جیسے جھوٹے سرکار ہیں، ویسے ہی حضور بھی ہیں۔ آپ سے کیا چھپاؤں۔ اس طرح کی دھاندلیوں میں ہم لوگوں کا بھی گزربسر ہوجاتا ہے۔ ورنہ اس قلیل سی آمدنی میں نباہ ہونا مشکل تھا۔

اتنے میں بشیشر۔ منوہر۔ قادر وغیرہ بھی آگئے اور آج کا حال سنانے لگے۔ منوہر دُودھ لائے۔ کلّو نے دہی پہنچایا۔ سبھی پریم شنکر کی آؤبھگت میں مصروف تھے۔ جب وہ کھانا کھاکر لیٹے تو لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ بابوصاحب کو رامائن سُنائی جائے۔ بشیشر ساہ اپنے گھر سے ڈھول مجیرا لائے۔ قادر نے ڈھول لیا۔ مجیرا بھی بجنے لگا اور رامائن کا گانا شروع ہوا پریم شنکر کو ہندی میں مہارت نہ تھی اور شاید ہی کوئی چوپائی ان کی سمجھ میں آتی تھی۔ مگر وہ ان دہقانیوں کے حُسنِ عقیدت سے لُطف اُٹھارہے تھے۔ کتنے بے ریا بے لوث انسان ہیں۔ اِتنی ذلتیں برداشت کرتے ہیں لیکن کدورتِ باطنی کا کہیں نام نہیں۔ اس وقت سبھی سُرور میں مست ہیں۔

رامائن ختم ہوئی۔ تو کلّو بولا...... کادر چاچا۔اب تمھاری کچھ ہوجائے۔

قادر نے لجاتے ہوئے کہا۔ گا تو رہے ہیں۔ کیا اتنی جلد تھک گئے؟

منوہر۔ نہیں بھیا۔ اب اپنی کوئی اچھی سی چیج (چیز) سُنا دو۔ بہت دن ہوئے نہیں سُنا۔ پھر نہ جانے کب بیٹھک ہو۔ سرکار! ایسا گویا ادھر کسی گاؤں میں نہیں ہے۔

قادر۔ میرے گنوارو گانے میں سرکار کو کیا مجا آئے گا۔

پریم شنکر۔ نہیں نہیں۔ مَیں تمھارا گانا بڑے شوق سے سُنوں گا۔

قادر۔ حضور گاتے کیا ہیں۔ رو لیتے ہیں۔ آپ کا حکم کیسے ٹالیں؟

یہ کہہ کر قادر خاں نے ڈھول کا سُر ملایا اور یہ بھجن گانے لگے:۔

میں اپنے رام کو رِجھاؤں

بن میں جاؤں نہ برچھا چھیڑوں نہ کوئی ڈار ستاؤں

پات پات میں ہے ابناسی واہی میں درس کراؤں

میں اپنے رام کو رِجھاؤں

اوکھد کھاؤں نہ بُوٹی لاؤں نہ کوئی بَید بُلاؤں

پُورن بَید ملے ابناسی تاہی کو نبج دِکھاؤں!

مَیں اپنے رام کو رِجھاؤں

قادر کی آواز میں اگرچہ لوچ اور رس نہ تھا۔ پَر تال سُر درست تھا۔ قادر اِس فن میں ہوشیار تھا۔ پریم شنکر بھجن سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔ اس کا ایک ایک لفظ تاثیر اور عقیدت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس میں پیشہ وروں کے گاون کا روکھاپن نہ تھا۔ بلکہ ایک دلکش اور اثرخیز جذبہ تھا۔

گانا ختم ہوا۔ تو ایک نقل ٹھہری۔ کلّو اس فن میں مشتاق تھا۔ قادر میاں راجا بنے۔ کلّو وزیر اور بشیشر ساہ سیٹھ۔ ڈپٹ سنگھ نے ایک چادر اوڑھ لی اور رانی بن گئے۔ شہزادے کی کمی تھی۔ لوگ سوچنے لگے کہ یہ پارٹ کس کو دیا جائے۔ پریم شنکر نے ہنس کر کہا۔ کوئی ہرج نہ ہو تو شاہزادہ مجھے بنا دو۔ یہ سُن کر سب کے سب خوش ہوگئے اور نقل شروع ہوئی۔

پہلا سین

راجا۔ ہائے ہائے بیدوں نے جواب دے دیا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ کسی نے روگ نہ پہچانا۔ سب کے سب لٹیرے تھے۔ اب جندگانی کی کوئی آسا نہیں ۔ یہ سارا راج پاٹ چُھوٹتا ہے۔ میرے پیچھے پرجا پر نہ جانے کیا بیتے گی۔ راجکمار ابھی الہڑ نادان ہے۔ اُس کی سنگت اچھی نہیں ہے۔ (پریم شنکر کی طرف دیکھتے ہوئے)۔ کسانوں سے میل رکھتا ہے۔ اُن کے پیچھے سرکاری آدمیوں سے راڑ کرتا ہے۔ جن گریب دُکھی روگیوں کی

پرچھائیں سے بھی ڈاگڈر لوگ ڈرتے ہیں۔ اُن کی دوا دارو کرتا ہے۔ اسے اپنی جان کا دھن کا تنک بھی کھیال نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا راج کیسے سنبھالے گا؟ جُلمی لوگوں کو کیسے ڈنڈ دے گا؟ ہائے میری پیاری رانی، جس سے میں نے ابھی مہینہ بھر ہوا بیاہ کیا ہے۔ میرے بِنا کیسے جیئے گی؟ کون اس سے پریم کرے گا؟

رانی ۔ سوامی جی ۔ میں اس دُکھ میں مرجاؤں گی۔ یہ اُجلے سَن کے سے بال اور یہ پوپلا منہ کہاں دیکھوں گی؟ (ترچھی نگاہوں سے دیکھ کر) کس کو گود میں لوں گی؟ کس سے ٹھنکوں گی؟ اب میں کسی طرح نہ بچوں گی۔

راجا کا دم اُکھڑ جاتا ہے۔ آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ نبض چُھوٹ جاتی ہے۔ رانی سینہ کوٹ کر رونے لگتی ہے۔ دربار میں کہرام مچ جاتا ہے۔

راجا کے کانوں میں غیب سے آواز آتی ہے۔ ہم تجھے ایک گھنٹے کی مہلت دیتے ہیں۔ اگر تجھے تین آدمی ایسے مِل جائیں۔ جو دِل سے تیری زندگی چاہتے ہوں، تو تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔

راجا کو ہوش آجاتا ہے۔ اس کے چہرے پر زندگی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ وہ خوش ہوکر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اور خودبخود کہتا ہے، اب مَیں کبھی نہ مروں گا۔ ہمیشہ راج کروں گا۔ دشمنوں کا ناش کردوں گا۔ میرے راج میں ایسا کون ہے جو دل سے میرے جینے کی اِچھا نہ رکھتا ہو۔ تین نہیں تین لاکھ آدمی بات کی بات میں نکل آئیں گے۔

دوسرا سین

راجا۔ (ایک معمولی شخص کی صورت میں آپ ہی آپ) وقت کم ہے۔ ایسے تین آدمیوں کے پاس چلنا چاہیے جو میرے ہتو تھے۔ پہلے سیٹھ کے پاس چلوں۔ وہ اُپکار کے کاموں میں میری مدد کرتا تھا۔ میں نے اُس کو کتنی ہی بار بچایا ہے۔ اور اُسے بہت کچھ لابھ پہنچایا ہے۔ یہ سیٹھ جی کا گھر آگیا۔ سیٹھ جی ۔ سیٹھ جی۔ ذرا باہر آؤ۔

سیٹھ ۔ کیا ہے؟ اتنی رات گئے کون کام ہے؟

راجا۔ کچھ نہیں اپنے مرے ہوئے راجا کا جس گاکر اُن کی آتما کو شانتی دینا چاہتا ہوں۔ کیسے دھرماتما اور پرجا کے پیارے راجا تھے۔ اُن کا پرلوک ہوجانے سے سارے دیس میں

اندھیرا چھا گیا ہے۔ پرجا ان کو کبھی نہ بھولے گی۔ آپ سے تو ان کی بڑی دوستی تھی۔
آپ کو تو اور بھی دُکھ ہو رہا ہوگا؟

سیٹھ۔ مجھے اُن کے راج سے کون سکھ تھا کہ اب دُکھ ہوگا۔ مرگئے اچھا ہوا۔ اُن کی بدولت لاکھوں روپے سادھو مہنتوں کو کھلانے پڑتے تھے۔

راجا۔ (دل میں) ہائے۔ اس سیٹھ پر مجھے کتنا بھروسا تھا۔ یہ میرے کہنے پر لاکھوں روپے دان کردیا کرتا تھا۔ سچ کہا ہے کہ بنیا کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ میں جنم بھر اس کے ساتھ رہا پر اسے پہچان نہ سکا ...... اب چلوں وزیر کے پاس وہ بہت وفادار اور بھلا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ میں نے بڑے بڑے سلوک کیے ہیں۔ یہ اُس کا مکان آگیا۔ شاید وہ ابھی دربار سے آرہا ہے۔ منتری جی۔ کہیے دربار سے آرہے ہیں؟ اب تو دربار بھرکو بڑا رنج ہوگا؟ ایسے دھرماتما راجا کے مرنے پر جتنا رنج کیا جائے وہ تھوڑا ہے۔ اب پھر ایسا راجا نہ ہوگا۔ آپ کو تو بہت ہی دُکھ ہو رہا ہوگا؟

وزیر۔ مجھے اُن سے کون سا سکھ ملتا تھا کہ اب دُکھ ہوگا۔ مرگئے اچھا ہوا۔ اُن کے مارے سانس لینے کی بھی چھٹی نہ ملتی تھی۔ رعیت کے پیچھے آپ ہی مرتے تھے اور اپنے ساتھ مجھے بھی مارتے تھے۔ رات دن کمر کسے کھڑے رہنا پڑتا تھا۔

راجا۔ (آپ ہی آپ) ہائے اس میرے بڑے ہتوا نوکر نے بھی دھوکھا دیا۔ میری آنکھ بند ہوتے ہی ساری دُنیا میری بَیری ہوگئی۔ ایسے ایسے لوگ دھوکھا دے رہے ہیں جو میرے پسینہ کی جگہ اپنا گھون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ تین آدمی بھی ایسے نہیں جو مجھے جیتا دیکھنا چاہتے ہوں۔ جب یہ دونوں نکل گئے تو اوروں سے کیا آسا رکھوں۔ اب رانی کے پاس چلوں وہ بڑی پتی برتا استری ہے۔ اس کی سب سکھیاں بھی مجھ پر جان دیتی تھیں۔ وہاں میری مُراد جرور ہی پُوری ہوگی۔ اب صرف تھوڑا سَے اور رہ گیا ہے۔یہ میرا محل بھی آگیا (رانی تنہا لوک میں بیٹھی ہوئی ہے)۔ مہارانی جی۔ اب دھیرج سے کام لیجیے۔ آپ کے سوامی جی ایسے پرتاپی تھے کہ سنسار میں سدا لوگ اُن کا بکھان کیا کریں گے۔ وہ مرکر امر ہوگئے۔

رانی۔ امر نہیں پتّھر ہوگئے۔ اُن سے سنسار کو چاہے جو سکھ مِلا ہو مجھے تو کوئی سکھ نہیں ملا۔ اُن کے ساتھ بیٹھتے لاج آتی تھی۔ میں اُن کا کیا بکھان کروں۔ میں تو اُسی دن

بِدھوا ہوگئی جس دن اُن سے بیاہ ہوا۔ وہ جیتے تھے تب بھی رانڈ تھی۔ مرگئے تب بھی رانڈ ہوں۔ دیکھو تو کنور کیسا سجیلا بانکا جوان ہے۔ میرے لائک وہ تھا۔ نہ کہ ایسا بُڈھا کھوسٹ جس کے منہ میں دانت بھی نہ تھے۔

یہ سُن کر راجا ایک لمبی سانس لیتا ہے اور غش کھاکر گرپڑتا ہے۔ (ڈراپ سین)

پریم شنکر کو اِن گنواروں کے کھیلنے کے طریقے پر تعجب ہوا۔ تصنع کا کہیں نام نہ تھا۔ ہر شخص نے اپنا اپنا پارٹ فطری طریقے پر پورا کیا۔ اگرچہ نہ پردہ تھا نہ کپڑا۔ اور نہ کوئی دوسرا سامان۔ پھر بھی تماشا اچھا ہوا۔

صبح پریم شنکر ٹہلتے ہوئے پڑاؤ کی طرف گئے تو دیکھا لشکر کوچ کی تیاری کر رہا ہے۔ خیمے اُکھڑ رہے ہیں۔ گاڑیوں پر اسباب لادا جا رہا ہے۔ صاحب بہادر کا موٹر تیار ہے۔ اور بشیشر ساہ تحصیلدار کے سامنے کاغذ کا ایک پلندہ لیے کھڑے ہیں۔ تیلی۔ تمبولی۔ بُوچڑ وغیرہ بھی ایک درخت کے تلے مجرموں کی طرح قیمت پانے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پریم شنکر نے تحصیلدار سے ہاتھ ملایا اور وہیں بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔

تحصیلدار۔ کہاں ہیں گاڑی بان لوگ؟ بُلاؤ۔ رسد کا حساب کریں۔

اس پر ایک گاڑی بان نے کہا۔ ہجور۔ یہاں رسد ملی ہے کہ ہماری جان ماری گئی ہے۔ آٹے میں اس بے ایمان بنیئے نے نہ جانے کیا مِلا دیا ہے کہ اسی دن سے پیٹ میں درد ہورہا ہے۔ گھی میں بھی تیل ملا تھا۔ اس پر حساب کرنے کو کہتا ہے۔ ابھی صاحب سے کہہ دوں تو بچہ کو لینے کے دینے پڑجائیں۔

اردلی کے کئی چپراسیوں نے کہا ...... یہ بنیا گولی مار دینے کے لائق ہے۔ ایسا خراب آٹا عمر بھر نہیں کھایا۔ نہ جانے کیا چیز مِلا دی ہے کہ ہضم ہی نہیں ہوتی۔ گھی ایسا بدبو دیتا تھا کہ دال کھائی نہ جاتی تھی۔ اس پر تو جُرمانہ ہونا چاہیے۔ اُلٹا حساب کرنے آیا ہے۔

ایک کانسٹبل صاحب نے کہا۔ ہم اسے خوب جانتے ہیں۔ چھٹا ہوا ہے۔ چینی دی تو اس میں آدھی بالو۔ گھی میں آدھی گھوئیاں۔ آٹے میں آدھا چوکر۔ دال میں آدھا کرکٹ۔ اِسے تو ایسی جگہ مارے جہاں پانی نہ ملے۔

کئی سائس بولے۔ گھوڑے کو جو دانہ دیا ہے وہ بالکل گھُنا ہوا ہے۔ آدھا چنا آدھا چوکر۔ گھوڑوں نے سُونگھا تک نہیں۔ صاحب سے کہہ دیں تو ابھی ہنٹر پڑنے لگیں۔

تحصیلدار۔ یہ سب شکائتیں پہلے کیوں نہ کیں؟

کئی آدمی۔ ہجور۔ روج تو ہائے ہائے کررہے ہیں۔

تحصیلدار (پریم شنکر کی طرف دیکھ کر)۔ مجھ سے کسی نے کہا؟ اب یہ سب کچھ نہ سُنوں گا۔
جس کے ذمّے جو کچھ نکلے کوڑی کوڑی چکا دے۔ ساہ جی، اپنا حساب نکالو۔

بشیشر۔ مولابکس اردلی۔ آٹا تین سیر۔ گھی آدھ سیر۔ چاول دوسیر۔ دال ایک سیر۔ مسالہ پاؤ
بھر۔ تمباکو پاؤ بھر۔ کتھا سُپاری دو آنہ۔ چینی چار ۴ر کل تین روپے۔

تحصیلدار۔ کہاں ہیں مولا بخش؟ قیمت دے کر رسید لو۔

ایک اردلی۔ اس نام کا ہمارے یہاں کوئی آدمی نہیں ہے۔

بشیشر۔ ہے کیوں نہیں۔ لمبے لمبے ہیں۔ چھوٹی ڈاڑھی ہے۔ منہ پر سیتلا کے داگ ہیں۔
سامنے کے دو تین دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔

کئی اردلی۔ اس حلیہ کا یہاں کوئی آدمی ہی نہیں۔ پہچانو ہم میں سے کون ہے؟

بشیشر۔ کہیں چل دئے ہوں گے اور کیا؟

تحصیلدار۔ اچھا۔ اور دوسرا نام بولو۔

بشیشر۔ دھنوا اہیر۔ چاول تین سیر۔ آٹا دوسیر۔ گھی پاؤ بھر۔ کھلی چارسیر۔ دانہ اور چوکر آٹھ
سیر۔ تمباکو ایک آنہ۔ کل دو روپے۔

تحصیلدار۔ کہاں ہے دھنوا اہیر؟ نکال روپے۔

ایک اردلی۔ وہ تو پہر رات رہے صاحب کا ڈیرا لاد کر چلا گیا۔

تحصیلدار۔ حساب نہیں بیباق کیا اور چلا گیا؟ اچھا ناظر جی! اس کا نام نوٹ کر لیجیے۔ کہاں
جاتے ہیں بچہ۔ ایک ایک پائی وصول کروں گا۔

پریم شنکر۔ یہ لشکر والوں کی بڑی زیادتی ہے۔

تحصیلدار۔ کچھ نہ پوچھیے۔ کمبخت کھا کھا کر چل دیتے ہیں اور بدنامی ہوتی ہے تحصیلدار کی۔

بشیشر شاہ نے پھر اسی قسم کی تفصیل پڑھ کر سُنادی۔ یہ جے رام چپراسی کا رقعہ تھا۔
جے رام موجود تھے۔ آگے بڑھ کر بولے ...... کیوں رے گھی آدھ سیر لیا تھا کہ آدھ پاؤ؟

بشیشر۔ کاگد میں تو آدھ سیر لکھا ہوا ہے۔

جے رام۔ جُھوٹ لِکھا ہے۔ سولہ آنے جُھوٹ۔

تحصیلدار ۔ اچھا۔ آدھ پاؤ کے دام دو یا کچھ بھی نہیں دینا چاہتے؟

یہ جھمیلا نو۔ دس بجے تک رہا۔ ایک تہائی سے زیادہ لوگ حساب بیباق کیے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ ایک چوتھائی سے زیادہ آدمی لاپتہ تھے۔ نصف آدمی موجود تھے۔ پر انھیں بھی حساب کے ٹھیک ہونے میں شبہ تھا۔ ایسے دس پانچ ہی بھلے آدمی نکلے۔ جنھوں نے کھرے دام چُکا دیے ہوں۔ جب سب رقعے پُرزے ختم ہوگئے تو بشیشر شاہ نے انھیں لاکر تحصیلدار صاحب کے سامنے پٹک دیا اور کہا ...... میں اور کسی کو نہیں جانتا۔ میں تو ایک ہجور ہی کو جانتا ہوں اور ہجور ہی کے حکم سے رسد دی ہے۔

تحصیلدار۔ میں کیا اپنی گرہ سے دُوں؟

بشیشر۔ ہجور۔ جیسے چاہیں دیں یا دلائیں۔ یہ دوسو میں ستّر ملے ہیں۔ میں ٹکے کا آدمی ۔ اتنا دھکّا کیسے اُٹھاؤں گا۔ مہاجن میرا گھر بکوالے گا۔

تحصیلدار۔ اچھی بات ہے۔ تمھارے دام ملیں گے۔ ناظر جی۔ آپ دو چپراسیوں کو لے کر جایئے۔ اس کے بہی کھاتے اُٹھا لایئے اور خود اس کی سالانہ آمدنی کا تخمینہ تیار کیجیے۔ دیکھیے ابھی قلعی کُھل جاتی ہے۔ میں اس کے سب روپئے دوں گا پر اسی سے لے کر۔ بچہ دو ہزار روپئے سالانہ منافع اُٹھاتے ہو۔ اس پر ایک بار سو روپئے کا گھاٹا ہوا تو دم نکل گیا!

کہاں تو بشیشر ساہ اتنے گرم ہورہے تھے۔ کہاں دھمکی سُنتے ہی بھیگی بلّی بن گئے۔ بولے۔ ہاں ہجور سب حساب کتاب جانچ لیں۔ اس گاؤں میں ایسا کون روجگار ہے کہ دوہجار سال کا نپھا ہوجائے گا۔ کھانے بھر کو مِل جائے۔ یہی بہت ہے۔

تحصیلدار۔ اور یہ آس پاس کے دیہات کا اناج کس کے گھر میں بھرا جاتا ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ حاکموں کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ یہاں اتنا بتلا سکتے ہیں کہ آج تمھارے گھر میں کیا پک رہا ہے۔ یہ رعایت اسی دن کے لیے کرتے ہیں۔ کچھ تمھاری صورت دیکھنے کے لیے نہیں۔

بشیشر ساہ چپکے سے کھسک گئے۔ تیلی اور تمبولی نے دیکھا...... کہ یہاں ملتا جلتا تو کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ اُلٹے اور کچھ علّت لگنے کا ڈر ہے تو انھوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ تحصیلدار نے پریم شنکر کی طرف دیکھ کر کہا۔ دیکھا آپ نے ٹیکس کے نام سے ان سبھوں

کی روح فنا ہوجاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی سالانہ آمدنی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ہوگی۔ لیکن اس طرح چاہے جتنا ہی نقصان برداشت کرلیں مگر اپنا بہی کھاتا نہ دکھائیں گے۔ یہ ان کی عادت ہے۔

پریم شنکر۔ خیر یہ تو اپنی چال بازی کی بدولت نقصان سے بچ گیا۔ مگر اور بے چارے تو مُفت میں پِس گئے۔ اس پر ذلیل ہوئے وہ الگ۔

تحصیلدار۔ جناب! اس کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ جب تک قوم کو آپ لوگ ایک طرف سے بیدار نہ کردیں گے، اس وقت تک ایسے ہتھکنڈوں کا رُکنا محال ہے۔ جہاں دِلوں میں اتنی خودغرضی سمائی ہوئی ہے۔ اور جہاں رعایا اتنی کچّی ہے، وہاں کسی طرح کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ (مسکراکر) ہم لوگ ایک طرح آپ کے مددگار ہیں۔ رعایا کو پیس کر مضبوط بناتے ہیں۔ اور آپ جیسے قومی ریفارمروں کے لیے میدان صاف کرتے ہیں۔

(۲۶)

صبح کا وقت تھا۔ اور کنوار کا مہینہ۔ برسات ختم ہوچکی تھی۔ دیہات میں جِدھر نکل جائیے، سڑی ہوئی سَن کی بدبو پھیل رہی تھی۔ کبھی جیٹھ کی سی سخت دھوپ ہوتی تھی۔ اور کبھی ساون کی طرح ابر محیط ہوجاتا تھا۔ مچھر اور ملیریا کا زور تھا۔ نیم کی چھال اور گُرچ کی بہار تھی۔ چراگاہ میں دُور تک سبز سبز گھاس لہرا رہی تھی۔ ابھی کسی کو کاٹنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اسی وقت بندا مہاراج اور کرتار سنگھ لاٹھی کندھوں پر رکھے ہوئے ایک درخت کے نیچے آکر کھڑے ہوگئے۔ کرتار نے کہا۔ اس بڈھے کو بیٹھے بیٹھے ایک کُھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔ بھلا بتاؤ۔ جو یہاں گاؤں کے جانور نہ چرنے پائیں گے تو کہاں جائیں گے؟ اور جو لوگ سدا سے چراتے آئے ہیں وہ مانیں گے کیسے؟ ایک دھِا اس کی کوئی مرمت کردیتا تو یہ عادت چُھوٹ جاتی۔

بندا۔ ہم کا اِی گاؤں ماں تیس برسیں ہوگئے۔ تب سے دس کارندے آئے۔ پر چراؤ کوؤ نے نہ روکا۔ گاؤں بھر کے ڈھورا (چوپائے) مجے میں چرتے رہے۔

کرتار۔ اُنھیں حکم دیتے کیا لگتا ہے۔ جائے گی تو ہمارے ماتھے۔

بندا۔ ہمار جی تو بَس اُوب گوا ہے کہ من کرت ہے چھونڑ چھانڑ کے گھر چلا جائی۔ سُنت ہیں

مالک اوئیاں (آنے والے) ہیں۔ بس ایک بیر اُن سے بھینٹ ہوئی جائے تو اپنے گھر کی راہ لیئی۔

کرتار۔ پھیجو دن بھر کھاٹ پر پڑا رہتا ہے۔ اس سے کچھ نہیں کہتے۔ بس جب دیکھو کرتار ہی کو دوڑاتے ہیں۔ مانو کرتار ان کے باپ کا نوکر ہے۔ اور دیکھو پیپل کے نیچے جہاں ہم تم جَل چڑھاتے ہیں، وہاں نماج پڑھتے ہیں، وہیں دونوں کُلی کرتے ہیں، وہیں نہاتے ہیں۔ بتاؤ۔ دھرم نشٹ بھیا کہ رہا۔ آپ تو روج کُران پڑھتے ہیں۔ اور میں رامائن پڑھنے لگتا ہوں تو کیسے ڈاٹ کے کہتے ہیں۔ کیا سور مچا رکھا ہے۔ اب کی اساڑھ میں تین سو بجرا نہ ملا۔ ہمیں ایک پائی سے بھینٹ نہیں ہوئی۔

بندا۔ ہم کا تو ایک روپیّا مِلا رہے۔

کرتار۔ یہ بھی کوئی ملنے میں مِلا ہے۔ اور سب کہیں چپڑاسیوں کو روپے میں آٹھ آنہ ملتے ہیں۔ یہ کچھ نہ دیں تو چار آنہ تو دیں۔ لینا دینا تو دور رہا۔ اُس پر آٹھوں پہر سر پر سوار۔ کل تم کہیں گئے تھے۔ مجھ سے بولے کہ کرتار ایک گھڑا پانی کھینچ لو۔ میں نے پھورن جواب دیا کہ اس کے نوکر نہیں ہیں۔ پھوجداری کروا لو۔ لاٹھی چلوا لو۔ اگر کدم پیچھے ہٹائیں تو کہو۔ پر چلم بھرنا، پانی کھینچنا، ہمارا کام نہیں ہے۔ اس پر بہت لال پیلے ہوئے۔ ایک دن پیپل کے نیچے والی مورتوں کو دیکھ کر بولا۔ کہ یہ کیا اینٹ پتھر جمع کر رکھے ہیں۔ میں نے تو ٹھان لیا ہے کہ جہاں اب کی کوئی نجرانہ لے کر آیا اور میں نے ہاتھ پکڑا کہ چار آنہ ادھر رکھ دو۔ جرا بھی نرم گرم ہوئے، منہ سے لام کاپھ نکالی اور میں نے گردن دبائی۔ پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ پھیجو بولے تو اُن سے سمجھ لوں گا۔ کھوب پڑے پڑے روٹی گوس اُڑا رہے ہیں۔ سب نکال دونگا...... وہ دیکھو گاؤں کے جانور اِدھر آرہے ہیں۔ بلراج تو نہیں ہے نا؟

بندا۔ ہوئے کری تو کون ڈر ہے۔ اب کی رَس جر (بخار) آوا ہے کہ ٹھٹھری ہوئے گوا ہے۔

کرتار۔ بڑے کس بل کا پٹھا ہے۔ سکھو چودھری کا تالاب جہاں بن رہا ہے، وہیں ایک دن اکھاڑے میں اس سے میری ایک پکڑ ہوگئی تھی۔ میں اس کو پہلے ہی جھپاٹے میں نیچے لایا۔ پر ایسا تڑپ کر نیچے سے نکلا کہ میں جھونکے سے آگیا۔ سنبھل ہی نہ سکا۔ بدن نہیں لوہا ہے۔

بندا۔ نگاہ کا بڑا سچا جوان ہے۔ کیا مجال کہ کوؤ کی بیٹی، بہن کی طرپھ آنکھ اُٹھاکر دیکھے۔
کرتار۔ وہ پھیچو اور گھوس کھاں بھی ادھر آرہے ہیں۔ آج کُسل نہیں دِکھتی۔
بندا۔ یہ گائیں بھینیس تو منوہر کی جان پرت ہیں۔ بِلاسی لیے آوت ہے۔

کرتار نے زور سے کہا۔ یہ کون جانور لیے آتا ہے؟ یہاں سے نکال لے جاؤ۔ سرکاری حکم نہیں ہے۔

اتنے میں بِلاسی نزدیک آگئی۔ اور بندا مہاراج کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی ...... سُنت ہو مہاراج ٹھاکر کی بات۔

کرتار۔ سرکاری حکم ہوگیا ہے کہ اب یہاں کوئی بھی جانور نہ چرنے پائے۔
بِلاسی۔ کیسا سرکاری حکم؟ سرکار کی جمین نہیں ہے۔ مہاراج تمھیں یہاں ایک جگ بیت گیا۔ کبھی کسی نے چراوا روکی ہے۔
بندا۔ اُن پُرانی باتوں کو نہ گاؤ۔ اب ایسے حکم بھوا ہے جانورن کا اور کو تو کبیت لے جاؤ۔ ناہیں تو وے گوث کھاں آوت ہیں۔ سبھی کا پکڑکے کانی ہودپٹھے دیہیں۔
بلاسی۔ کانی ہود پٹھے کیسے دیہیں۔ کوئی راہ جنی ہے؟ ہمارے جانور سدا سے یہاں چرتے آئے ہیں۔ اور سدا یہیں چریں گے۔ اچھا سرکاری حکم ہے آج کہہ دیا چراور چھوڑ دو۔ کل کہیں گے اپنا اپنا گھر چھوڑ دو۔ پیڑ تلے جاکے رہو۔ ایسا کوئی اندھیر ہے؟

اتنے میں غوث خاں اور فیضو بھی آ پہنچے۔ بلاسی کے آخری الفاظ غوث خاں کے کان میں پڑے۔ ڈپٹ کر بولے۔ ہاں۔ ایسا ہی اندھیر ہے۔ اپنے جانوروں کو فوراً نکال لے جا۔ ورنہ مویشی خانہ بھیج دوں گا۔

بلاسی۔ کیوں نکال لے جاؤں؟ چَراور سارے گاؤں کا ہے۔ جب سارا گاؤں چھوڑدے گا۔ تو ہم بھی چھوڑدیں گے۔
غوث۔ جانوروں کو لے جاتی ہے کہ کھڑے کھڑے قانون بگھارتی ہے۔
بلاسی۔ تم تو کھاں صاحب ایسی گھڑکی جمارہے ہو جیسے میں تمھارا ہی دیا کھاتی ہوں۔
غوث۔ فیضو! یہ زبان دراز عورت یوں نہ مانے گی۔ گھیرلو اس کے جانوروں کو اور مویشی خانہ لے جاؤ۔

فیضو تو مویشی کی طرف لپکا۔ مگر کرتار اور بندا مہاراج دُبدھے میں وہیں کھڑے

رہے۔ خاں صاحب نے اُنھیں بھی للکارا۔ کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو؟ گھیرلو جانوروں کو اور ہانک لے جاؤ۔ سرکاری حکم ہے یا کوئی مذاق ہے؟

اب کرتار اور بندا مہاراج بھی اُٹھے اور جانوروں کو چاروں طرف سے گھیرنے کی تدبیر کرنے لگے۔ مویشیوں نے چوکنّی آنکھوں سے دیکھا۔ کان کھڑے ہوگئے۔ اور اِدھر اُدھر بِدکنے لگے۔ موقع کو تاڑ گئے۔ بلاسی نے کہا ...... میں کہتی ہوں کہ اُنھیں مت گھیرو نہیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔

مگر اُس کی دھمکی پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ تھوڑی دیر میں سب جانور گھِر گئے اور کندھے سے کندھے مِلائے کنکھیوں سے دیکھتے تینوں چپراسیوں کے درمیان میں آہستہ آہستہ چلے۔ بلاسی سخت شش و پنج کی حالت میں بُت کی طرح کھڑی رہی۔ جب جانور کوئی بیس قدم نِکل گئے۔ تو دیوانوں کی طرح دوڑی اور ہانپتی ہوئی بولی:۔ میں کہتی ہوں اُنھیں چھوڑ دو نہیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔

فیضو۔ ہٹ جا راستہ سے۔ کچھ شامت تو نہیں آئی ہے؟

بلاسی راستہ روک کر کھڑی ہوگئی اور بولی:۔ لے کیسے جاؤ گے۔ دِلگی ہے؟

غوث۔ نہ ہٹے تو اس کی مرمت کرو۔

بلاسی۔ کہے دیتی ہوں کہ ان جانوروں کے پیچھے لہُو کی ندی بہہ جاوے گی۔ ماتھے گر جائیں گے۔

فیضو۔ ہٹتی ہے یا نہیں چڑیل؟

بلاسی۔ تو ہی ہٹ جا۔ ڈاڑھی جار۔

اتنا اس کے منہ سے نکلنا تھا کہ فیضو نے آگے بڑھ کر بلاسی کی گردن پکڑ لی۔ اور اُسے اتنی زور سے جھونکا دیا کہ وہ دو قدم پر جا گری۔ اُس کی آنکھیں تلملا گئیں۔ غشی سی طاری ہوگئی۔ ایک لمحہ وہ وہیں بیہوش پڑی رہی۔ تب اُٹھی اور لنگڑاتی ہوئی اُن مردوں سے اپنی اس ذِلّت کی داستان کہنے چلی جو اُس کی عزّت آبرو کے محافظ تھے۔

منوہر اور بلراج دونوں ایک دوسرے گاؤں میں دھان کاٹنے چلے گئے تھے۔ وہ یہاں سے کوس بھر پڑتا تھا۔ لکھن پور میں دھان کے کھیت نہ تھے اس لیے عموماً سبھی لوگ اِس گاؤں میں دھان لگاتے تھے۔ بلاسی دھان کی مینڈھوں پر چلی جاتی تھی۔ کبھی پیر اِدھر پھسلتے

کبھی اُدھر۔ وہ انتقام کے جوش میں چاہتی تھی کہ کسی طرح اُڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ پر گھٹنوں میں چوٹ آگئی تھی۔ پس مجبور تھی۔ اس کے روئیں روئیں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ عضو عضو سے یہ آواز نکلتی تھی کہ ان کی اِتنی مجال؟

اسے اُس وقت نتیجہ اور انجام کی مطلق فکر نہ تھی۔ کون مرے گا؟ کس کا گھر مٹی میں ملے گا؟ یہ باتیں اُس کے خیال میں نہ آتی تھیں۔ پس و پیش کی زنجیروں سے بالکل آزاد ہوگئی تھی۔

لیکن جب وہ اس گاؤں کے قریب پہنچی اور دھان کے لہراتے ہوئے کھیت نظر آنے لگے تو پہلی بار اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ بلراج ایک ہی غصہ ور ہے۔ منوہر اُس سے بھی دو اُنگل آگے۔ میرا رونا سُنتے ہی دونوں بھبھک اُٹھیں گے۔ جان پر کھیل جائیں گے۔ تب؟ مگر زخمی دل نے جواب دیا۔ کیا ہرج ہے؟ لڑکوں کے لیے آدمی کیوں جھینکتا ہے؟ مرد کے لیے کیوں روتا ہے؟ اسی دن کے لیے نا؟ اس کل مُوہے فیضو کا گھمنڈ تو ٹوٹ جائے گا۔ غوث خاں کا گھمنڈ تو چورچور ہوجائے گا۔

تاہم جب وہ اپنے کھیتوں کے ڈانڈے پر پہنچی، منوہر اور بلراج نظر آنے لگے۔ تو اس کے پیر خودبخود رُکنے لگے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان کے پاس پہنچی تو انجام کی فکر نے اس کی ہمت پست کردی۔ وہ زاروقطار رونے لگی۔ جانتی تھی اور سمجھتی تھی کہ یہ آنسو کی بوندیں آگ کی چنگاریاں ہیں۔ مگر دل پر کوئی قابو نہ تھا۔ وہ کھیت کے کنارے کھڑی ہوگئی۔ اور منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ بلراج نے خائف ہوکر پوچھا ...... اماں کیا ہے؟ روتی کیوں ہے؟ کیا ہوا؟ ارے یہ سارا کپڑا کیسے لہولہان ہوگیا؟

بلاسی نے ساڑی کی طرف دیکھا تو واقعی خون کے چھینٹے دکھائی دیے۔ گھٹنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کا دل تھر تھر کانپنے لگا۔ ان چھینٹوں کو چھُپانے کے لیے وہ اس وقت اپنی جان تک دے سکتی تھی۔ ہائے میرے سر پر کون سا بھُوت سوار ہوگیا کہ یہاں دوڑی ہوئی آئی؟ میں کیا جانتی تھی کہ کہیں پھوٹ پھاٹ بھی گیا ہے۔ اب غضب ہوگیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ صبور کیے بیٹھی رہتی۔ سانجھ کو جب یہ لوگ گھر جاتے اور گاؤں کے سب آدمی جمع ہوتے تو سارا حال کہہ دیتی۔ جیسی سب کی صلاح ہوتی ویسا کیا جاتا۔ اس پریشانی کی حالت میں وہ کوئی بہانہ نہ سوچ سکی۔

بلراج نے پھر پوچھا۔ کچھ مُنہ سے بولتی نہیں۔ بس روئے جاتی ہے۔ کیا ہوا؟ کچھ بول تو۔

بلاسی۔ (سسکتے ہوئے) پھیجو اور گوس کھاں ہماری سب گائیں بھینسیں کانی ہود ہانک لے گئے۔

بلراج۔ کیوں؟ کیا اُن کے زمین میں گئی تھی؟

بلاسی۔ نہیں۔ کہتے تھے کہ چراور میں چرانے کی مناہی ہوگئی ہے۔

بلراج نے دیکھا کہ ماں کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور چہرہ خفت آلود ہے۔ اس نے اپنے جوش میں معاملے کو اس سے کہیں زیادہ خوفناک سمجھ لیا جتنا کہ وہ دراصل تھا۔ کچھ اور پُوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آنکھیں غصےؔ سے سرخ ہوگئیں۔ کندھے پر لٹھ رکھ لیا، اور منوہر سے بولا۔ میں بُرا گاؤں تک جاتا ہوں۔

منوہر۔ کیا کام ہے؟

بلراج۔ پھیجو اور گھوس کھاں سے دودو باتیں کرنی ہیں۔

منوہر۔ ایسی باتیں کرنے کا یہ موکا نہیں ہے۔ ابھی جاؤگے تو بات بڑھے گی۔ اور ہاتھ کچھ نہ لگے گا۔ چار آدمی تمھیں کو بُرا کہیں گے۔ بے اِجتی کا بدلہ اس طرح نہیں لیا جاتا۔

منوہر کے ان الفاظ میں اتنا خوفناک ارادہ اتنا خونیں استقلال بھرا ہوا تھا کہ بلراج زیادہ اصرار نہ کرسکا۔ اس نے لاٹھی رکھ دی اور ماں سے کہا، ابھی گھر جاؤ۔ ہم لوگ آئیں گے تو دیکھا جائے گا۔

منوہر۔ نہیں گھر مت جاؤ۔ یہیں بیٹھے رہو۔ سانجھ کو سب جنے ساتھ ہی چلیں گے۔ وہ کون دوڑا آرہا ہے؟ بندا مہاراج ہیں کیا؟

بلراج۔ نہیں۔ کادر دادا جان پڑتے ہیں۔ ہاں وہی ہیں۔ بھاگے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں میں مارپیٹ ہوگئی...... دادا کیا ہے؟ کیسے دوڑے آتے ہو؟ کُسل (خیریت) تو ہے؟

قادر نے دَم لے کر کہا۔ تمھارے ہی پاس تو دوڑے آتے ہیں۔ بلاسی روتی آئی ہے۔ میں ڈرا کہ گُسے میں تم لوگ نہ جانے کیا کر بیٹھو۔ چلاکہ راہ میں مِل جاؤگے تو روک لوں گا پر تم کہیں ملے ہی نہیں۔ اب تو جو ہوگیا سو ہوگیا۔ آگے کی کھبر کرو۔ آج سے

جمیندار نے چراور روک دی ہے۔ یہ اندھیر دیکھتے ہو؟

منوہر۔ ہاں۔ دیکھتا کیوں نہیں ہوں۔ اندھیر سا اندھیر ہے؟

قادر۔ پھر عدالت جانا پڑے گا۔

منوہر۔ چلو میں تیار ہوں۔

قادر۔ ہاں۔ آج آؤ تو صلاح پکّی کر کے سوال دے دیں۔ اب کی ہائی کورٹ تک لڑیں گے۔
چاہے گھر بِک جائے۔ بس ہل پیچھے چندہ لگا لیا جائے۔

منوہر۔ ہاں یہی اچھا ہوگا۔

قادر۔ میں نماج پڑھتا تھا کہ سُنا بلاسی کو چراور میں چپراسیوں نے بُرا بھلا کہا۔ اور وہ روتی ہوئی اِدھر آئی ہے۔ سمجھ گیا کہ آج گجب ہوگیا۔ تم نے صبر سے اچھا کام لیا۔ اللہ اس کا ثواب تم کو دے گا۔ تو میں اب جاتا ہوں۔ سب سے چندے کی بات چیت کرتا ہوں۔ جرا دن رہتے چلے آنا۔

قادرخاں مطمئن ہوکر چلے گئے۔ یہ نہ سمجھے کہ یہاں دل میں کچھ اورہی ٹھن گئی ہے۔ منوہر کے تُلے ہوئے الفاظ کو انھوں نے توکّل کا نشان سمجھا۔ منوہر ایسی مجنونانہ سرگرمی سے اپنے کام میں مصروف تھا گویا اس کا شباب عود کر آیا ہے۔ دھان کے پولوں کے انبار لگتے جاتے تھے۔ نہ آگے دیکھتا تھا نہ پیچھے۔ نہ کسی سے کچھ بولتا تھا نہ کسی کی کچھ سُنتا تھا۔ نہ ہاتھ تھکتے تھے نہ کمر دُکھتی تھی۔ بلراج نے چلم بھرکر رکھ دی۔ تمباکو رکھے ہی رکھے جل گئی۔ بلاسی کھانڈ کا شربت گھول کر سامنے لائی۔ اُس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کتّا پی گیا۔ کنوار کی تیز دُھوپ تھی۔ بدن سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ پسینے کی دھاریں بہتی تھیں۔ مگر وہ سرتک نہ اُٹھاتا تھا۔ بلراج کبھی کھیت میں آتا کبھی درخت کے نیچے جاکر بیٹھتا۔ کبھی چلم پیتا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی آگ تھی۔ ایک میں سُلگتی ہوئی اور دوسرے میں جلتی ہوئی۔ ایک طرف ہوا کے زور سے متحرک اور دوسری طرف سکون سے غیر متحرک۔ دونوں کے دلوں میں ایک ہی ارادہ تھا۔ ایک میں بیتاب اور دوسرے میں سنجیدہ۔

دوپہر ہوئی۔ بلاسی نے آکر ڈرتے ڈرتے کہا ...... چلو چبینا کرلو۔

منوہر نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ چلو آتے ہیں۔

ایک گھنٹہ بعد بلاسی پھر آکر بولی...... چلو چبینا کرلو۔ دن ڈھل گیا۔ کیا آج ہی سب کھیت کاٹ لوگے؟

منوہر نے کرخت آواز میں کہا۔ ہاں یہی ارادہ ہے۔ کون جانے کہ کل آئے یا نہ آئے۔

جیسے کسی بھرے ہوئے گھڑے میں ایک کنکر لگ جائے اور پانی بہہ نکلے اُسی طرح بلاسی کے دل میں ایک چوٹ سی لگی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ رہ رہ کر کف افسوس ملتی تھی۔ کہ ہائے معلوم نہیں اُنھوں نے اپنے دل میں کیا ٹھانی ہے؟

وہ کئی منٹ تک وہیں کھڑی رہی۔ انجام کی ہیبتناک شکل اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ مُنہ کھول کر اسے نگلنے کو دوڑتی تھی۔ اور افسوس کہ اس شکل کو اُسی نے اپنے ہاتھوں بنایا تھا۔ آخر وہ منوہر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور اُس کی طرف نہایت بیکسانہ انداز سے دیکھ کر بولی:...... ہاتھ جوڑکر کہتی ہوں کہ چل کر چبینا کرلو۔ تمھارے اس طرح گُم سُم رہنے سے میرا کلیجہ دہل رہا ہے۔ تم نے کیا من میں ٹھانی ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟

منوہر۔ جاکر چپکے سے بیٹھو۔ جب مجھے بھوک لگے گی، چبالوں گا۔

بلاسی۔ ہائے رام۔ تم کیا کرنے پر تُلے ہوئے ہو؟

منوہر۔ کروں گا کیا؟ کچھ کرنے لائق میں ہوتا تو آج یہ بے اِجتی نہ ہوتی۔ جو کچھ تکدیر میں ہے وہ ہوگا۔

یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ کوئی کسی سے نہ بولا۔ بلراج بھی وقت کاٹتا رہا۔ اور بلاسی اُداس بیٹھی کبھی روتی اور کبھی اپنے کو کوستی۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ تینوں نے دھان کے گٹھے گاڑی پر لادے۔ اور لکھن پور چلے۔ بلراج گاڑی ہانکتا تھا اور منوہر پیچھے پیچھے زور سے برہا گاتا ہوا چلا آتا تھا۔ راستے میں کلو اہیر ملا۔ بولا کہ منوہر کاکا آج بڑے مگن ہو! منوہر کا گانا ختم ہوا تو اُس نے بھی ایک برہا گایا۔ دونوں ساتھ ساتھ گاؤں میں پہنچے تو ایک ہلچل سے مچی ہوئی تھی۔ چاروں طرف چُراور کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ قادر کے دروازے پر ایک پنچایت سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پر منوہر پنچایت میں نہ جاکر سیدھے اپنے مکان پر گیا۔ اور جاتے ہی کھانا مانگا۔ بہو نے کھانا پکا رکھا تھا۔ شکم سیر ہوکر کھایا۔ اور پھر حقہ پینے لگا۔ ذرا دیر بعد بلراج بھی پنچایت سے لوٹا۔ منوہر نے پُوچھا...... کہو کیا ہوا؟

بلراج۔ کچھ نہیں۔ یہی صلاح ہوئی کہ کھاں صاحب کو کچھ نجرانہ دے کر منالیا جائے۔
عدالت سے سب لوگ گھبراتے ہیں۔
منوہر۔ یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اچھا جاکر چٹ پَٹ کھاپی لو۔ آج میں بھی تمھارے ساتھ رکھوالی کرنے چلوں گا۔ آنکھ لگ جائے تو جگا لینا۔
گھنٹہ بھر بعد دونوں کھیت کی طرف چلنے کو تیار ہوئے۔ منوہر نے پوچھا۔ کلہاڑا خُوب چلتا ہے نا؟
بلراج۔ ہاں۔ آج ہی تو رگڑا ہے۔
منوہر۔ تو اُسے لے لو۔
بلراج۔ میرا تو کلیجہ تھر تھر کانپ رہا ہے۔
منوہر۔ کانپنے دو۔ تمھارے ساتھ میں بھی تو رہوں گا، تم دو ایک ہاتھ چلاکے لمبے ہوجانا اور سب میں دیکھ لوں گا۔ تم اس طرح جاکے سو رہنا مانو کچھ جانتے ہی نہیں۔ کوئی کتنا ہی پوچھے، ڈراوے، دھمکاوے پر منہ نہ کھولنا۔ میں اکیلے ہی جاتا پر ایک تو مجھے اچھی طرح سُوجھتا نہیں۔ کئی دنوں سے رتوندی ہوتی ہے۔ اور دوسرے میرے ہاتھوں میں اب وہ بل نہیں کہ ایک ہی چوٹ میں وارا نیارا ہوجائے۔
منوہر یہ باتیں ایسے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ گویا کوئی معمولی خانگی گفتگو ہے۔ بلراج اس کے خلاف شک اور خوف سے پریشان ہو رہا تھا۔ اشتعال میں آکر وہ آگ میں کُود سکتا تھا۔ مگر اس وحشیانہ خوں ریزی کا خیال کرکے اُس کی جان سوکھی جاتی تھی۔
کھیت میں پہنچ کر دونوں مچان پر لیٹے۔ اماوس کی سیاہ رات تھی۔ آسمان پر کچھ ابر بھی تھا۔ چاروں طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دوگھڑی رات گزرنے پر منوہر جاگا اور بلراج سے بولا۔ سوگئے کیا؟
بلراج۔ نہیں نیند نہیں آتی۔
منوہر۔ اچھا۔ تو اب رام کا نام لے کر تیار ہوجاؤ۔ ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اپنی مرجاد کی رچھا کرنا مردوں کا کام ہے۔ ایسے جور جُلم کا ہم اور کیا جواب دے سکتے ہیں۔ بے اِجّت ہوکر جینے سے مرجانا اچھا ہے۔ دل کو خوب سنبھال لو۔ اپنا کام کرکے سیدھے یہاں چلے آنا۔ اندھیری رات ہے۔ کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔ تھانیدار تمھیں

ڈرائیں گے۔ پر کھبردار ڈرنا نہیں۔ بس گاؤں کے لوگوں سے میل رکھو گے تو کوئی تمھارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔ دُکھرن بھگت اچھا آدمی نہیں ہے۔ اُس سے چوکنے رہنا۔ ہاں کادر بھروسے کا آدمی ہے۔ اُس کی باتوں کا بُرا مت ماننا۔ میں تو پھر لوٹ کر گھر نہ آؤں گا۔ تم ہی گھر کے مالک بنوگے۔ اب یہ لڑکپن چھوڑ دینا۔ کوئی چار باتیں کہے تو گم کھانا۔ ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ باپ دادا کے نام کو کلنک لگے۔ اپنی گھر والی کو سر مت چڑھانا۔ اُسے سمجھاتے رہنا کہ ساس کے کہنے میں رہے۔ میں تو دیکھنے نہ آؤں گا۔ پر اسی طرح گھر میں راڑ مچتی رہی تو گھر مٹی میں مِل جائے گا۔

بلراج۔ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ دادا ۔ میری اتنی بات مانو کہ اس بکھت (وقت) صبر کر جاؤ۔ میں کل ایک ایک کی کھوپڑی توڑ کر رکھ دوں گا۔

منوہر۔ ہاں۔ تمھیں کوئی نہ مارے تو تم سنسار بھر کو مار گراؤ۔ پھیجو اور کرتار کیا مٹی کے لونڈے ہیں؟ گوث کھاں بھی پلٹن میں رہ چکا ہے۔ تم لکڑی میں اُن سے جیت نہ سکوگے۔ وہ دیکھو ہرنا (ستارے کا نام) نکل آیا۔ مہابیر جی کا نام لے کر اُٹھ کھڑے ہو۔ ایسے کاموں میں آگا پیچھا کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ گاؤں کے باہر ہی باہر چلنا ہوگا۔ نہیں تو کتے بھونکیں گے۔ اور لوگ جاگ پڑیں گے۔

بلراج۔ میرے تو ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں۔

منوہر۔ کوئی پرواہ نہیں۔ کلہاڑا ہاتھ میں لوگے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم میرے بیٹے ہو۔ تمھارا کلیجہ مجبوط ہے۔ تمھیں ابھی جو ڈر لگ رہا ہے وہ تاپ کے پہلے کا جاڑا ہے۔ تم نے کلہاڑا کندھے پر رکھا، مہابیر جی کا نام لے کر اُدھر چلے تو تمھاری آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں گی۔ سر پر کھون سوار ہوجائے گا۔ باج کی طرح سِکار پر جھپٹوگے۔ پھر تو میں تمھیں منع بھی کروں تو نہ سنوگے۔ وہ دیکھ سیار بولنے لگے۔ آدھی رات ہوگئی۔ میرا ہاتھ پکڑلو اور آگے آگے چلو۔ جے مہابیر کی۔

(۲۷)

پریم شنکر کے مزرعے کا شمار اب شہر کے دل فریب مقامات میں ہونے لگا تھا۔ یہاں ایسی صفائی اور سجاوٹ تھی کہ اکثر شہر کے شوقین لوگ اس جگہ ہواخوری کے لیے جایا کرتے تھے۔ اگرچہ پریم شنکر صرف اُس کے منتظم تھے مگر اسامیوں کی دلی عقیدت کی وجہ

سے وہ دراصل اس کے مالک تھے۔ اب اپنی مرضی کے مطابق نئی نئی فصلیں پیدا کرتے۔ انواع و اقسام کے تجربے کرتے مگر کوئی ذرا بھی نہ بولتا۔ اور بولتا بھی کیوں جب اُن کا کوئی امتحانی تجربہ ناکامیاب نہ ہوتا تھا۔ جن کھیتوں میں بمشکل پانچ سات من کی پیداوار ہوتی تھی، اُن میں اب پندرہ بیس من کی اوسط پڑتی تھی۔ باغ کی آمدنی علاوہ تھی۔ اِنھیں چار سالوں میں قلمی آم۔ بیر۔ نارنگی وغیرہ کے درختوں میں پھل لگنے شروع ہوگئے تھے۔ ساگ بھاجی کی پیداوار مزید برآں تھی۔ پریم شنکر میں تجارتی تنگ دلی کا نام بھی نہ تھا۔ جو لوگ وہاں آجاتے اُنھیں پھل پھُول کا تحفہ ضرور دیتے۔ پریم شنکر کو دیکھ کر حاجی پور والوں نے بھی اپنی زندگی کو کچھ ایسا بنا لیا تھا کہ اُن کی ساری ضروریات زندگی اُسی باغیچے سے پوری ہوجاتی تھیں۔ زمین کا آٹھواں حصہّ کپاس کی کاشت کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ دوسرے صوبوں سے اعلیٰ قسم کے بیج منگاکر بوئے جاتے تھے۔ گاؤں والے خودہی سُوت کات لیتے تھے۔ اور گاؤں ہی کا کولی اس سُوت کا کپڑا بُن دیتا تھا۔ کولی کا نام متا تھا۔ پہلے وہ جُوا کھیلا کرتا تھا اور کئی بار چوری میں پکڑا گیا تھا۔ لیکن اب اپنی محنت کی بدولت گاؤں کے بھلے آدمیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ پریم شنکر کی کوشش سے قرب و جوار کے مواضعات میں بھی کپاس کی کاشت ہونے لگی تھی۔ اور کتنے ہی کولیوں اور جولاہوں کے اُجڑے ہوئے گھر آباد ہوگئے تھے۔ دیہات کے مقدمے باز زمیندار اور کسان اکثر اسی مقام پر ٹھہرا کرتے تھے۔ یہاں سے اُنھیں ایندھن۔ ساگ۔ بھاجی۔ نمک۔ تیل کے لیے پیسے نہ خرچ کرنے پڑتے تھے۔ پریم شنکر اُن سے خوب باتیں کرتے۔ اور اُنھیں اپنے باغیچے کی سیر کراتے۔ سادھو سنتوں کا تو گویا یہ اکھاڑہ ہی تھا۔ دوچار سادھو روزہی پڑے رہتے۔ نہ جانے اس زمین میں کیا برکت تھی کہ اتنی مہمان نوازیوں کے باوجود کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ حاجی پور والے تو اُنھیں دیوتا سمجھتے تھے۔ اور اپنے بھاگ کو سراہتے تھے کہ ایسے نیک شخص نے ہمیں آرام پہنچانے کے لیے یہاں آکر قیام کیا ہے۔ اُن کی نیک دلی۔ سادگی اور فیاضی نے متا کولی کے علاوہ موضع کے کئی بدقماش لوگوں کو سُدھار دیا تھا۔ بھولا اہیر جس کے مارے کھلیانوں میں اناج نہ بچتاتھا۔ دمڑی پاسی جس کا پیشہ ہی فوجداری کرنا تھا۔ اب اُس گاؤں کے سب سے زیادہ محنتی اور ایماندار کسان تھے۔

پریم اکثر کاشتکاروں کے افلاس کے مسئلے پر بھی غور کیا کرتے تھے۔ وہ دیگر ماہرینِ

اقتصاد کی طرح کاشتکاروں پر فضول خرچی۔ کاہلی۔ جاہلیت۔ یا زراعتی اصولوں سے ناواقفیت کا الزام عائد کرکے اس مسئلے کو حل نہ کرتے تھے۔ وہ درپردہ کہا کرتے تھے کہ میں کاشتکاروں کو شاید ہی کوئی ایسی بات بتا سکتا ہوں جس کا علم اُنھیں نہ ہو۔ محنتی تو اِن سے زیادہ دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا۔ کفایت شعاری۔ نفس کُشی۔ خانہ داری سے بھی وہ خوب واقف ہیں۔ اُن کے افلاس کی ذمّے داری اُن پر نہیں، بلکہ اُن حالات پر ہے جن کے تحت اُنھیں اپنی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ وہ حالات کیا ہیں؟ باہمی نفاق، خودغرضی اور ایک ایسے نظام کا وجود جو اُنھیں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہے۔ لیکن ذرا زیادہ غور کرنے پر یہ معلوم ہوجائے گا کہ یہ تینوں شاخیں ایک ہی بڑی شاخ سے نکلی ہیں۔ اور یہ وہی نظام ہے۔ جس کے وجود کا انحصار کسانوں کے خون پر ہے۔ آپس میں نفاق و نزاع کیوں ہے؟ ان قانونی پیچیدگیوں کے باعث جنھیں اس موجودہ نظام نے پیدا کیا ہے۔ آپس میں محبت و اعتبار کیوں نہیں ہے؟ اس لیے کہ موجودہ نظام ان چیزوں کو اپنے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ اور ان کی اشاعت نہیں ہونے دیتا۔ باہمی نزاع کا بدترین نتیجہ کیا ہے؟ آراضی کا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہوجانا اور لگان کا نسبتاً حد سے زیادہ بڑھتے جانا۔ پریم شنکر اس نظام کی اصلاح کو تو انسانی طاقت سے باہر سمجھتے تھے۔ لیکن زمین کی تقسیم در تقسیم کا روکنا اُن کے نزدیک ممکن العمل معلوم ہوتا تھا۔ اور اگرچہ کسی تحریک کا پیشوا بننا اُنھیں پسند نہ تھا۔ مگر اس معاملے کے متعلق ان کے دل میں اس قدر جوش تھا کہ وہ اخباروں کے ذریعے اپنے خیالات کو ظاہر کرنے سے باز نہ رہ سکے اس سے اُن کی غرض صرف یہ تھی کہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار، مشاق اور طبّاع شخص اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے۔

ایک روز وہ اپنے چند خاص احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے اسی مسئلے پر گفتگو کررہے تھے۔ کہ ایک صاحب نے فرمایا۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ تقسیم کی کاروائی قانون سے بند کی جاسکتی ہے۔ تو یہ آپ کا محض خیال ہی ہے۔ اس کے زہریلے پودے کی جڑیں انسانی دِلوں میں ہیں۔ جب تک اُنھیں دل سے کھودکر باہر نہ کیجیے گا۔ پودا یونہی پھولتا پھلتا رہے گا۔

پریم شنکر۔ قانون سے کچھ نہ کچھ سُدھار تو ہوہی سکتا ہے۔

اس پر اُن لوگوں نے زور دے کر کہا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ خودغرضیوں کو عملی اظہار کا

موقع نہ ملے گا تو وہ اور بھی خوفناک صورت اختیار کریں گی۔

اس پر ایک کسان جو بٹوارے کی درخواست دے کر کچہری سے لوٹا تھا اور جو آج یہیں مقیم تھا۔ بول اُٹھا۔ کہوں کچھ نہ ہوئی۔ ہم تو آپے سوگن کے پیچھے پیچھے چلت ہے۔ جب آپے سوگن ماں، بھائی بھائی نباہ نہیں ہوتا ہے تو ہمارا کَسس (کیسے) ہوئی۔ آپ کا نارائن سب کچھ دیے ہے مدا آپے اپنے بھائی سے الگ رہت ہو۔

یہ طعن آمیز الفاظ پریم شنکر کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئے۔ انھوں نے سر جھکا لیا۔ چہرہ خفت آلود ہوگیا۔ دوستوں نے اُس کسان کی طرف حقارت سے دیکھا۔ اس وقت عام حالات سے بحث تھی۔ یہاں ذاتی معاملات کو درمیان میں لانا سراسر نامنصفانہ تھا۔ مگر اکھڑ گنوار ان نکات کو کیا جانے؟ مُنہ میں جو بات آئی کہہ ڈالی۔ ایک صاحب نے کہا۔ بالکل گنوار ہو۔ ذرا بھی تمیز نہیں۔ دوسرے صاحب بولے۔ اگر تمیز ہوتی۔ تو گنوار کیوں کہلاتے؟ نہ موقع و محل کا خیال، نہ موزونیت کی پرواہ۔ جو اُوٹ پٹانگ مُنہ میں آیا بک ڈالا۔

بے چارے کسان کو اب معلوم ہوا کہ مُنہ سے کوئی بات نکل گئی۔ نادم ہوکر بولا۔ صاحب میں گنوار منئی اِی سب پھیرپھار کا جانوں۔ جوں کچھ بھول چوک ہوی گئی ہوے ماپھ کی جائے۔

پریم شنکر۔ نہیں نہیں۔ تم نے کوئی بیجا بات نہیں کہی۔ میرے لیے ایسی صاف بات کی ضرورت تھی۔ تم نے اچھا سبق دیا۔ کوئی شک نہیں کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی نفاق و نزاع کی اتنی ہی گرم بازاری ہے، جتنا کہ جاہل طبقہ میں۔ اور میں خود اس بارے میں گنہگار ہوں۔ مجھے کسی کو سمجھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔

احباب کچھ دیر تک اور بیٹھے رہے۔ مگر پریم شنکر کچھ ایسے افسردہ ہوگئے کہ پھر اُنھوں نے زبان ہی نہ کھولی۔ بالآخر سب ایک ایک کرکے روانہ ہوگئے۔

شام ہورہی تھی۔ پریم شنکر سخت تردد کی حالت میں اپنے جھونپڑے کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ ان کے سامنے اب یہ مسئلہ تھا کہ گیان شنکر سے کیوں کر مِلاپ ہو۔ وہ جتنا بھی غور کرتے تھے اُتنا ہی اپنے کو قصوروار پاتے۔ یہ سب میری ہی کرنی کا پھل ہے۔ جب اُن کے اور اسامیوں کے درمیان نزاع تھی تو میرے لیے اسامیوں کی جانبداری کرنا مناسب نہ تھا۔ مانا کہ گیان شنکر کی زیادتی تھی۔ پھر بھی ایسی حالت میں مجھے بے تعلق رہنا چاہیے تھا یا

اُنھیں بھائی کی طرح سمجھا دینا چاہیے تھا۔ یہ تو مجھ سے نہ ہوا۔ اُلٹا اُنھیں سے لڑ بیٹھا۔ ماناکہ اُن کے اور میرے اصولوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن اُصول پسندی کا اثر برادرانہ محبت پر تو نہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی ماناکہ جب سے میں آیا ہوں، اُنھوں نے میرے ساتھ ہمیشہ بے اعتنائی کی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے بیوی کی محبت سے بھی محروم کردیا ہے۔ مگر میں نے بھی تو کبھی اُن سے ملے رہنے کی، اُن کی بدسلوکیوں کو بھول جانے کی، اُن کی سخت کلامیوں کو برداشت کرلینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مجھ سے ایک اُنگل کھسکے تو میں اُن سے ایک ہاتھ ہٹ گیا۔ اصول پروری کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنوں سے بگاڑ کرلیا جائے۔ اُصولوں کو عزیزوں سے زیادہ عزیز سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔ اُن کے دل کو اپنی طرف سے صاف کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ گیان شنکر اپنے خوش نما بنگلے کے سامنے مولوی ایجاد حسین کے ساتھ بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مولوی صاحب نے سرکاری ملازمت میں خاطرخواہ کامیابی نہ دیکھ کر استعفیٰ دے دیا تھا اور اب کچھ دنوں سے قومی خدمت میں مشغول ہوگئے تھے۔ انھوں نے "انجمنِ اتحاد" نامی ایک جماعت قائم کرلی تھی، جس کا مقصد ہندوؤں مسلمانوں میں باہمی اتحاد و ارتباط پیدا کرنا اور اُسے ترقی دینا تھا۔ یہ تحریک چندے سے جاری تھی اور اسی کام کے لیے سیّدصاحب یہاں تشریف لائے تھے۔ گیان شنکر نے کہا۔ مجھے روزبروز تجربہ ہو رہا ہے کہ زمینداری کرنے کے لیے بڑی سختی کی ضرورت ہے۔ زمیندار نذرنیاز، بَری بیگار، ڈانڑ باندھ سب کچھ چھوڑسکتا ہے پر لگان تو نہیں چھوڑسکتا۔وہ بھی اب بغیر نالشوں کے وصول نہیں ہوتا۔

ایجاد۔ جناب بجا فرماتے ہیں۔ لیکن خاکسار نے ایسے رئیسوں کو بھی دیکھا ہے۔ جو کبھی عدالت کے دروازے تک نہ گئے۔ جہاں کسی اسامی نے سرکشی کی کہ اُس کی مرمّت کردی اور لُطف یہ ہے کہ کبھی ڈنڈے یا ہنٹر سے کام نہیں لیا۔ گرمی میں جھلستی ہوئی دُھوپ اور جاڑے میں برف کا ٹھنڈا پانی۔ بس اسی ٹٹکے کی بدولت اُن کی ساری مالگذاری وصول ہوجاتی ہے۔ مئی اور جُون کی دُھوپ ذرا میرے سرپر لگی اور اسامی نے کمر ڈھیلی کی۔

گیان شنکر۔ معلوم نہیں ایسے اسامی کہاں ہیں؟ یہاں تو ایسے بدمعاشوں سے پالا پڑا ہے جو

بات بات میں عدالت کا راستہ لیتے ہیں۔ میرے ہی موضع کو دیکھیے۔ کیسا طوفان برپا ہوا۔ اور یہ سب محض چراور کو روک دینے پر۔

اتنے میں ڈاکٹر عرفان علی بیرسٹر کا موٹر آپہنچا۔ گیان شنکر نے اُن کا خیر مقدم کیا۔

ڈاکٹر۔ اب کے آپ نے بڑا انتظار کرایا۔ میں تو آپ سے ملنے کے لیے گورکھپور جانے والا تھا۔

گیان شنکر۔ ریاست کا کام اتنا زیادہ ہے کہ کتنا ہی کروں پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر۔ آپ کو معلوم تو ہوگا کہ یہاں یونیورسٹی میں اکنامکس کے پروفیسر کی جگہ خالی ہے۔ اب تو آپ سنڈیکیٹ میں آگئے ہیں۔

گیان شنکر۔ جی ہاں سنڈیکیٹ میں تو لوگوں نے جبراً گھسیٹ لیا۔ لیکن یہاں ریاستی کاموں سے کہاں فرصت ہے کہ اُدھر متوجہ ہوسکوں۔ کچھ کاغذات گئے تھے۔ مگر مجھے اُن کے دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔

ڈاکٹر۔ ڈاکٹرداس کے چلے جانے سے یہ جگہ خالی ہوگئی ہے۔ اور میں اُس کا اُمیدوار ہوں۔

گیان شنکر نے تعجب سے کہا۔ آپ!

ڈاکٹر۔ جی ہاں۔ اب میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔ میری طبیعت روز بروز وکالت سے بے زار ہوتی جاتی ہے۔

گیان شنکر۔ آخر کیوں؟ آپ کی وکالت تو تین چار ہزار سے کم کی نہیں! حکّام کی خوشامد تو نہیں کھلتی یا کانشس (ضمیر) کا خیال ہے؟

ڈاکٹر۔ جی نہیں۔ صرف اس لیے کہ اس پیشے میں رہ کر انسان کی طبیعت بیجا زرپرستی پر مائل ہوجاتی ہے۔ کوئی وکیل کتنا ہی حق شناس کیوں نہ ہو اُسے ہمدردی اور انسانیت سے وہ خوشی نہیں ہوتی جو ایک شریف شخص کو ہونی چاہیے۔ اس کے خلاف آپس کی ناچاقیوں اور دغابازیوں سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ ایک دوسری ہی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے جو جذباتِ لطیف سے خالی ہے۔ میں مہینوں سے اسی کشمکش میں پڑا ہوا ہوں اور اب یہی قصد ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اس پیشے کو آخری سلام کردوں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ فیضو اور کرتار نے سامنے آکر سلام کیا۔ گیان شنکر نے پوچھا ...... کہو سب خیریت ہے؟

فیضو۔ ہجور کھیریت کیا ہے۔ رات کو کسی نے کھاں صاحب کو مار ڈالا۔

ایجاد حسین اور عرفان علی چونک پڑے لیکن گیان شنکر پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ گویا اُنھیں یہ بات پیشتر ہی سے معلوم تھی۔ بولے۔ تم لوگ کہاں تھے؟ کہیں سَیر سپاٹا کرنے چل دیے تھے یا افیون کی پینک میں پڑے تھے؟

فیضو۔ ہجور تھے تو چوپال ہی میں۔ پر کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ واردات ہوگی۔

گیان شنکر۔ کیوں؟ خبر کیوں نہ تھی؟ جو آدمی سانپ کو پیروں سے کُچل رہا ہو، اُسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سانپ کے زہریلے دانت ہوتے ہیں۔ زمینداری کرنا سانپ کو نچانا ہے۔ وہ سپیرا اناڑی ہے جو سانپ کو کاٹنے کا موقع دے۔ خیر۔ قاتل کا کچھ پتہ چلا؟

فیضو۔ جی ہاں۔ وہی منوہر اہیر ہے۔ اُس نے سبیرے ہی تھانہ میں جاکر اکبال کرلیا۔ دوپہر کو تھانہ دار صاحب آگئے۔ اور تحکیکات کر رہے ہیں۔ کھاں صاحب کا تار ہجور کو مِل گیا تھا؟ جس دن کھاں صاحب نے چَراور روکنے کا حکم دیا، اُسی دن گاؤں والوں میں ایکا ہوگیا۔ کھاں صاحب نے گھبراکر ہجور کو تار دیا۔ میں تین بجے تار دے کر لوٹا تو گاؤں میں مکدمہ لڑنے کے لیے چندہ کا گٹ ہو رہا تھا۔ رات کو یہ واردات ہوگئی۔

یکایک پریم شنکر لالہ پربھاشنکر کے ساتھ آگئے۔ گیان شنکر کو دیکھتے ہی پریم شنکر اُن سے لپٹ کر خوب مِلے۔ اور پوچھا...... کب آئے؟ سب خیریت ہے نا؟

گیان شنکر نے رُکھائی سے جواب دیا۔ خیریت کا حال اِن لوگوں سے پوچھیے جو ابھی لکھن پور سے آرہے ہیں۔ گاؤں والوں نے غوث خاں کا کام تمام کر دیا۔

پریم شنکر سکتے میں آگئے۔ اور اُن کی زبان سے نکلا۔ ارے یہ کب؟

گیان شنکر۔ آج ہی رات کو۔

پریم شنکر۔ کیا بات تھی؟

گیان شنکر۔ گاؤں والوں کی سرکشی اور بدمعاشی کے سوا اور کیا بات ہوسکتی ہے؟ میں نے چَراور روکنے کا حکم دیا تھا۔ وہاں ایک باغ قائم کرنے کا ارادہ تھا۔ بس اسی بہانہ پر سب قتل اور خون پر آمادہ ہوگئے۔

پریم شنکر۔ قاتل کا کچھ پتہ چلا؟

گیان شنکر۔ ابھی تو منوہر نے تھانہ میں جاکر اقبال کیا ہے۔
پریم شنکر۔ منوہر تو بڑا سیدھا اور سلیم شخص معلوم ہوتا تھا۔
گیان شنکر۔ (طنز سے) جی ہاں۔ فرشتہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے پُر معنی انداز سے دیکھ کر کہا۔ یہ کسی ایک آدمی کا فعل ہرگز نہیں ہوسکتا۔

گیان شنکر۔ یہی میرا بھی خیال ہے۔ منوہر کی اتنی مجال نہیں کہ وہ تنہا یہ کام کرسکے۔ بلاشبہ یہ تمام گاؤں والوں کی سازش ہے۔ منوہر کو سبوں نے طبلہ کا بندر بنا رکھا ہے۔ دیکھیے تھانیدار کی تحقیقات کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ اب میں اِس موضع کو ویران کرکے ہی چھوڑوں گا۔ کیوں فیضو۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ منوہر اکیلے یہ کام کرسکتا ہے؟

فیضو۔ نہیں ہجور۔ ساٹھ برس کا بڈّھا بھلا کیا کھاکر یہ کام کرتا؟ اور کوئی چاہے اُس کا مددگار نہ ہو مگر اس کا لڑکا تو ضرور ہی ساتھ رہا ہوگا۔

کرتار۔ وہ بوڑھا ہے تو کیا؟ بڑے جیوٹ کا آدمی ہے۔ اس کے سوائے گاؤں میں کسی کا اتنا کلیجہ نہیں ہے۔

گیان شنکر۔ تم گنوار آدمی ہو۔ اِن باتوں کو کیا جانو۔ تمھیں تو بھنگ کا گولا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب اس معاملہ میں مدعی تو سرکار ہوگی۔ لیکن آپ بھی میری طرف سے پیروی کیجیے گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ گاؤں کے کسی بالغ آدمی کو بے داغ نہ چھوڑوں گا۔

پریم شنکر نے دبی زبان سے کہا۔ اگر تمھیں یقین ہوکہ یہ ایک آدمی کا کام ہے تو تمام گاؤں کو ماخوذ کرنا مناسب نہیں ہے۔ ایسا نہ ہوکہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔

گیان شنکر تیز ہوکر بولے۔ بہت اچھا ہو اگر آپ اس معاملے میں اپنے حق و انصاف کے اُصولوں کو دخل نہ دینے دیں۔ یہ اُنھیں اُصولوں کی برکت ہے کہ آج ان بدمعاشوں کو اتنی جرأت ہوئی ہے۔ آپ مجھے صاف گوئی پر مجبور کررہے ہیں۔ یہ سب آپ کی شہ پاکر شیر ہوئے۔ آپ نے ہر موقع پر میرے خلاف اُن کی مدد کی ہے۔ اُن سے برادرانہ

تعلق قائم کیا ہے۔ اور اُن کی حمایت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ آپ کے اسی برادرانہ سلوک نے اُنھیں سرگشتہ کردیا ہے۔ میرا خوف اُن کے دل سے جاتا رہا۔ آپ کے خیالات اور اُصولوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ لیکن آپ کڑوی نیم کو دودھ سے سینچ رہے ہیں اور میٹھے پھلوں کی اُمید کرتے ہیں۔ ایسے نا اہلوں کے ساتھ اِن اُصولوں کو برتنا دیوانوں کے ہاتھ میں مشعل دینا ہے۔

پریم شنکر نے پھر زبان نہ کھولی اور نہ سر اُٹھایا۔ لالہ پربھاشنکر کو یہ باتیں ایسی ناگوار معلوم ہوئیں کہ وہ فوراً اُٹھ کر چلے گئے۔ لیکن پریم شنکر اپنے خیالات میں محو ہوکر خاموش بیٹھے رہے۔ غریب دیہاتیوں کے ساتھ معمولی انسانیت کا برتاؤ کرنے کا نتیجہ ایسا خوفناک ہوگا یہ ان کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ صرف ایک آدمی کی جان ہی نہیں گئی۔ بلکہ اور بھی کتنی ہی جانوں کے قربان ہونے کا احتمال ہے۔ اے ایشور اِن بیکسوں پر رحم کر۔ میں نے سچے دل سے اُن کی خدمت نہیں کی۔ میں انتقام کے جذبات سے متاثر ہوتا رہا۔ میں گیان شنکر کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ یہ پریشانی اُسی انتقامی کوشش کا نتیجہ ہے۔ کیا ایک لکھن پور ہی اپنے ظالم زمیندار کے ظلموں کا شکار تھا؟ ایسا کون سا علاقہ ہے جو زمیندار کے ہاتھوں خون کے آنسو نہ بہا رہا ہو؟ تو لکھن پور والوں ہی کے لیے میری ہمدردی اتنی زیادہ گہری کیوں ہوگئی؟ اور پھر کیا ایسے مظالم اس سے پہلے نہ ہوتے تھے؟ یہ تو آئے دن ہوتا ہی رہتا تھا۔ پر کبھی اسامیوں کو چوں کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس مرتبہ یہ کُشت و خون پر کیوں آمادہ ہوگئے؟ ان سوالات کا اُنھیں صرف ایک ہی جواب ملتا تھا اور وہ اس ذمّے داری کے بار کو زیادہ وزنی بنا دیتا تھا۔ ہائے میں نے اپنی جان کو انتقامی جذبات کے آتش کدے میں کیوں ڈال دیا؟ اب میرا فرض کیا ہے؟ کیا اس آگ کو مشتعل کرکے دُور ہی سے کھڑا تماشا دیکھا کروں؟ یہ سراسر بیجا ہے۔ اب تو ان بدنصیبوں کی مناسب مدد کرنی ہی پڑے گی۔ خواہ گیان شنکر کو کتنا ہی بُرا لگے۔ اس کے سوا میرے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

پریم شنکر اِنھیں خیالات میں غرق تھے کہ مایاشنکر نے آکر کہا ...... چاچا جی اماں کہتی ہیں کہ اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔ حاجی پور کیسے جایئے گا؟ یہیں کھانا کھا لیجیے اور یہیں رہ جایئے۔

پریم شنکر اپنی محویت میں یہ بھول گئے تھے کہ ابھی مجھے حاجی پور واپس جانا ہے۔ مایا

کو پیار کر کے بولے...... نہیں بیٹا۔ میں چلا جاؤں گا۔ ابھی زیادہ رات نہیں گئی ہے۔ رہ جاؤں گا تو وہاں بہت ہرج ہوگا۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گیان شنکر کی طرف غمگین نگاہوں سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے چل دئے۔ گیان شنکر نے اُن کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

اُن کے چلے جانے پر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ میں تو اِن کی بڑی تعریف سُنا کرتا تھا۔ مگر پہلی ہی بار ملنے پر طبیعت آسودہ ہوگئی۔ کچھ ناخوش سے معلوم ہوتے ہیں۔

گیان شنکر۔ بڑے بھائی ہیں۔ اُن کی شان میں مَیں کیا کہوں؟ کچھ دنوں امریکہ میں کیا رہ آئے ہیں گویا تمام حق و انصاف کا آپ ہی نے ٹھیکہ لے لیا ہے۔ حالانکہ ابھی تک امریکہ میں بھی یہ خیالات عملی میدان سے کوسوں دُور ہیں۔ دنیا میں ان خیالات کے تذکرے ہمیشہ ہوتے رہے اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اُن پر کہاں تک عمل کیا جاسکتا ہے۔ میں خود اِن اُصولوں کا قائل ہوں مگر میرے خیال میں ابھی بہت عرصہ تک اس سرزمین میں یہ پودا سرسبز نہیں ہوسکتا۔

بعدازاں کچھ دیر تک اس سانحے کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ جب ڈاکٹر صاحب اور ایجاد حسین چلے گئے تو گیان شنکر گھر میں جاکر بولے۔ دیکھا بھائی صاحب نے لکھن پور میں کیا گُل کھِلایا؟ ابھی اطلاع ملی ہے کہ غوث خاں کو لوگوں نے قتل کر ڈالا۔

دونوں عورتیں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگیں۔

گیان شنکر نے پھر کہا۔ یہ برسوں سے وہاں جاجاکر اسامیوں سے نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ اُن کو نہ جانے کیاکیا سکھاتے تھے۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔ میں نے اُن کی آمدورفت کی خبر پائی اسی وقت میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے ان سے التجا کی تھی کہ آپ گنواروں کو بہت سر نہ چڑھائیں۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ اُن سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ لیکن اپنے آگے کسی کو سمجھتے ہی نہیں۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں اس معاملہ میں وہ بھی پھنس نہ جائیں۔ پولیس والے ایک ہی پاجی ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی موٹے اسامی کو ضرور پھانسیں گے۔ گاؤں والوں پر جہاں ذرا سختی کی، سب کے سب کھل پڑیں گے۔ اور سارا الزام بھائی صاحب کے سر رکھ دیں گے۔

شردھا نے گیان شنکر کی طرف خائف ہوکر دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اپنے دِلی خیالات

کا اظہار نہ کرسکی۔ وِدّیا نے کہا ذرا تم تھانیدار کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟ جیسے ہوسکے اُنھیں راضی کرلو۔

گیان شنکر۔ ہاں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ مگر ایک ادنیٰ آدمی کی خوشامد کرنا اُن کے نازو نخرے برداشت کرنا کتنی ذِلّت کی بات ہے۔ میں بھائی صاحب کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔

شردھا نے سر جھکائے ہوئے غصہ بھری آواز میں کہا ...... پولیس والے اُن پر چاہے جو الزام لگائیں پر وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ گاؤں کو بہکاتے پھریں۔ بلکہ اگر گاؤں والوں کی نیّت اُنھیں پہلے معلوم ہوجاتی تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ تمھیں تھانیدار کی خوشامد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی حفاظت آپ کرسکتے ہیں۔

وِدّیا۔ میں تمھیں برابر سمجھاتی آرہی ہوں کہ گنواروں سے راڑ نہ بڑھاؤ۔ بلّی بھی بھاگنے کی راہ نہیں پاتی تو شیر ہوجاتی ہے۔ مگر تم نے میرے کہنے پر کبھی کان ہی نہ دیے۔

گیان شنکر۔ کیسی بے سر پَیر کی باتیں کرتی ہو۔ میں ان ٹکڑگدے کسانوں سے دبتا پھروں؟ زمیندار نہ ہوا کوئی چڑکٹا ہوا۔ اُن کی مجال تھی کہ میرے مقابلہ میں کھڑے ہوتے۔ ہاں جب اپنے ہی گھر میں آگ لگانے والے موجود ہوں تو جو کچھ نہ ہوجائے وہ تھوڑا ہے۔ میں ایک نہیں سو بار کہوں گا کہ اگر بھائی صاحب نے اُنھیں سر نہ چڑھایا ہوتا تو آج اُن کے حوصلے اتنے نہ بڑھتے۔

وِدّیا۔ (دبی زبان سے) سارا شہر جس کی پوجا کرتا ہے، اسے تم گھر میں آگ لگانے والا کہتے ہو۔

گیان شنکر۔ ایسی دنیاوی عزّت کی ہوس ہی تو ان تمام فسادوں کی جڑ ہے۔

شردھا اور زیادہ سُننے کی تاب نہ لاسکی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

گیان شنکر نے وِدّیا سے کہا کہ مجھے تو اُن کے پھنس جانے میں ذرا بھی شک نہیں ہے۔

وِدّیا۔ تم اپنی طرف سے اُن کے بچانے میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھنا۔ یہ تمھارا دھرم ہے۔ آئندہ جو تقدیر میں ہوگا وہی ہوگا۔

گیان شنکر۔ بھابھی کا مزاج بھی تو کچھ برگشتہ نظر آرہا ہے۔

وِدّیا۔ تم اُن کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ وہ چاہے دادا جی کے سائے سے بھی بھاگیں پر

اُن کے نام پر جان دیتی ہیں۔ اپنے دل میں اُن کی پوجا کرتی ہیں۔

گیان شنکر۔ اِدھر بھی چلتی ہیں اُدھر بھی؟

وِدّیا۔ اِدھر لوک لاج سے چلتی ہیں۔ دل اُدھر ہی ہے۔

گیان شنکر۔ تو پھر مجھے کوئی اور ہی تدبیر سوچنا پڑے گی۔

ودّیا۔ ایشور کے لیے ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو؟

(۲۸)

شردھا کی باتوں سے پہلے تو گیان شنکر کو کچھ اندیشہ ہوا۔ لیکن غور کرنے پر یہ اندیشہ جاتا رہا۔ کیونکہ اس معاملے میں پریم شنکر کا ماخوذ ہوجانا بالکل قرینِ قیاس تھا۔ ایسی حالت میں شردھا کے کمزور غصےّ سے گیان شنکر کا کوئی نقصان نہ ہوسکتا تھا۔

گیان شنکر نے قصد کرلیا کہ اس معاملے میں مجھے ہاتھ پیر ہلانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ ساری باتیں میری مرضی کے مطابق ہو رہی ہیں۔ سب انسپکٹر خود ہی اپنی خودغرضی کی وجہ سے اس معاملے کو طول دے گا۔ سارے گاؤں کے پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ اور اس کا کامیاب ہونا یقینی ہے۔ گاؤں میں کتنا ہی اتفاق ہو مگر کوئی نہ کوئی مخبر نکل آئے گا۔ سب انسپکٹر نے لکھن پور کے زمینداری والے دفتر کے کاغذات ضرور ہی دیکھے۔ وہاں میرے ایسے دوچار خطوط ضرور نکل آئیں گے جن سے بھائی صاحب کی گاؤں والوں کے ساتھ ہمدردی اور ارتباط کا ہونا ثابت ہوسکے۔ میں نے اپنے کئی خطوں میں غوث خاں کو لکھا ہے کہ بھائی صاحب کا یہ وطیرہ مجھے پسند نہیں۔ ہاں ایک بات ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ گاؤں کے لوگ رشوت دے کر اپنا پنڈ چُھڑالیں اور سب انسپکٹر تنہا منوہر کا ہی چالان کرے۔ لیکن ایسے سنگین معاملے میں سب انسپکٹر کی یہ جرأت نہیں ہوسکتی۔ وہ حتی الامکان اِس واردات کو نہایت اہم ثابت کرے گا۔ حُکّام لوگ بھائی صاحب کی جمہوریت پرستی کے سبب اُن سے پہلے ہی بدظن ہو رہے ہیں۔ سب انسپکٹر اُنھیں اس سازش کا محرک ثابت کرکے اپنا رنگ ضرور جمائے گا۔ مقدمے میں کامیابی ہوئی تو اس کی بھی ترقی ہوگی اور اسے انعام بھی ملے گا۔ گاؤں کے باشندے اسے کوئی بڑی رقم دینے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ اور سب انسپکٹر چھوٹی رقموں کے لیے اپنی آئندہ ترقی کی امیدوں کو خاک میں نہ ملائے گا۔ برادرانہ مخالفت کا خیال محض لغو ہے۔ دُنیا میں سب اپنے لیے جیتے ہیں اور

اپنے لیے مرتے ہیں۔ جذبات کا لحاظ کرکے اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی مارنا مضحکہ انگیز ہے۔

گیان شنکر کا قیاس بالکل صحیح نکلا۔ لکھن پور کے تقریباً سبھی بالغ لوگوں کا چالان کٹا۔ بشیشر ساہ کو ٹیکس کی دھمکی نے مخبر بنا دیا۔ زمینداری کے دفتر کا بھی معائنہ ہوا۔ ایک ہفتہ بعد حاجی پور میں پریم شنکر کی خانہ تلاشی ہوئی۔ اور وہ حراست میں لے لیے گئے۔

شام کا وقت تھا۔ گیان شنکر منّو کو ساتھ لئے ہوا خوری کو جا رہے تھے کہ ڈاکٹر عرفان علی نے آکر یہ حال کہا۔ گیان شنکر کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ ایک لمحے کے لیے برادرانہ محبّت نے ادنیٰ جذبات کو دبا دیا۔ لیکن جونہی ضمانت کا سوال درپیش ہوا کہ وہ سارا جوش فرو ہوگیا۔ گھر میں خبر ہوئی تو کہرام مچ گیا۔ شردھا کو غش آگیا۔ بڑی بہو اسے تسکین دہی کے لیے آئیں۔ منّو بھی اندر چلاگیا اور ماں کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پریم شنکر شہر سے کچھ اس طرح الگ تھلگ رہتے تھے کہ اُن کا شہر کے معزّز آدمیوں سے بہت کم تعارف تھا۔ وہ رئیسوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ کچھ خاص آدمیوں نے اخبارات میں اُن کے زراعتی مضامین ضرور دیکھے تھے اور اُن کی قابلیت کے معترف بھی تھے۔ مگر اُنھیں خبطی سمجھتے تھے۔ اُن کے سچّے بہی خواہوں میں زیادہ تر کالجوں کے نوجوان طلباء، دفتروں کے کلرک اور دیہات کے غریب باشندے تھے۔ اُن کی حراست میں لیے جانے کی خبر پاتے ہی ہزاروں آدمی جمع ہوگئے اور پریم شنکر کے پیچھے پیچھے تھانے تک گئے۔ لیکن اُن میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ضمانت دینے کی کوشش کر سکتا تھا۔

لالہ پربھاشنکر نے سُنا تو دیوانوں کی طرح دوڑے ہوئے گیان شنکر کے پاس جاکر بولے...... بیٹا! تم نے تو سُنا ہی ہوگا۔ سارا خاندانی وقار خاک میں مل گیا۔ (روکر) بھیّا کی روح کو اس وقت کتنا صدمہ پہنچ رہا ہوگا۔ جس عزّت کے لیے ہم نے جائدادیں برباد کردیں۔ وہ آج مِٹ گئی۔ ہائے بھیّا اپنی عمر بھر کبھی عدالت کے دروازہ تک نہ گئے۔ گھر میں چوریاں ہوئیں۔ لیکن کبھی تھانہ میں رپٹ تک نہ کی۔ کہ تحقیقات ہوگی۔ اور پولیس دروازہ پر آئے گی۔ اور آج اُنھیں کا لختِ جگر ...... کیوں بیٹا ضمانت، نہ ہوگی؟

گیان شنکر اس بزدلانہ بے صبری پر خفا ہوکر بولے۔ معلوم نہیں۔ حُکّام کی مرضی پر ہے۔

پربھاشنکر۔ تو جاکر حُکّام سے ملتے کیوں نہیں؟ کچھ تمھیں بھی اپنی عزّت کا خیال ہے یا نہیں؟
گیان شنکر۔ کہنا بہت آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے۔
پربھاشنکر۔ بھیّا کیسی باتیں کرتے ہو؟ یہاں کے حُکّام میں تمھارا کتنا رسُوخ ہے۔ بڑے صاحب تک تمھاری کتنی خاطر کرتے ہیں۔ یہ لوگ کس دن کام آئیں گے؟ کیا اس کے لیے کوئی دوسرا موقع ہوگا؟
گیان شنکر۔ اگر آپ کا یہ منشا ہے کہ میں جاکر حکام کی خوشامد کروں، اُن سے رعائت کی استدعا کروں، تو یہ سب مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ میں اُن کے کھودے ہوئے گڈھے میں گرنا نہیں چاہتا۔ نہ میں کسی دعویٰ پر اُن کی ضمانت کرا سکتا ہوں۔ جب میں جانتا ہوں کہ وہ اپنی روش ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے۔

پربھاشنکر نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ہائے ایشور یہ بھائیوں کا حال ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمھارا دل اتنا سخت ہے۔ تمھارا حقیقی بھائی مصیبت میں مبتلا ہے اور تمھارا پتھر کا دل ذرا نہیں پسیجتا۔ خیر کوئی مضایقہ نہیں۔ مگر میرے بھائی کا پیارا بیٹا اس طرح ذلیل نہ ہونے پائے گا۔

گیان شنکر کو اپنے چچا کی اس رحم دلی پر غصہ آرہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف مجھے خفیف کرنے کے لیے یہ اتنی زبان درازی کر رہے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی حُکّام کی نظروں میں گر جاؤں۔ لیکن پربھاشنکر کوئی نمائشی جذبات والے آدمی نہ تھے۔ وہ خاندانی وقار میں اپنی جان تک قربان کرسکتے تھے۔ اُن میں وہ وضعداری تھی کہ وہ خود فاقہ کرکے بھی مہمان کو لقمۂ لذیذ کھلانا اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ افسوس کہ یہ باتیں اب مُلک سے مفقود ہوتی جارہی ہیں۔ اُن کے خیال میں صرف عزّت و ناموس کی حفاظت کے لیے دولت کا ہونا ضروری تھا۔ نہ کہ عیش و عشرت اور نفس پرستی کے لیے۔ اُنھوں نے فوراً جاکر کپڑے پہنے۔ چغہ پہنا۔ عمامہ سر پر رکھا اور ایک پُرانے رئیس کی وضع میں مجسٹریٹ کے پاس جا پہنچے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ مگر اِس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ صاحب کے سامنے انھوں نے جتنی عاجزی دکھلائی، جتنے منّت آمیز لہجے میں اپنی مصیبت کی کہانی کہی، جتنی زیادہ خوشامد کی، جس عقیدت سے دست بستہ کھڑے ہوگئے، اور عمامہ سر سے اُتار کر صاحب کے قدموں پر رکھ رونے لگے۔ اپنے خاندانی وقار کا جو حال بیان کیا اور سرکار کے خیرخواہ

ہونے کے جو ثبوت پیش کیے، ان سبھی باتوں کو ایک نئی روشنی کا نوجوان حددرجہ شرمناک اور مضحکہ انگیز خیال کرتا۔ لیکن صاحب کو رحم آگیا۔ ضمانت منظور کرلینے کا وعدہ کیا۔ مگر رات ہوجانے کی وجہ سے اس وقت کوئی کارروائی نہ ہوسکی۔ پربھاشنکر یہاں سے مایوس ہوکر واپس گئے۔ اُن کی یہ خواہش کہ پریم شنکر رات بھر حراست میں نہ رہیں پوری نہ ہوسکی۔ رات بھر تشویش میں پڑے ہوئے کروٹیں بدلتے رہے۔ بھائی صاحب کی رُوح کو کتنا صدمہ ہورہا ہوگا۔ کئی بار اُنھیں ایسا معلوم ہوا کہ بھائی صاحب دروازے پر کھڑے رو رہے ہیں۔ ہائے بے چارے پریم شنکر پر کیا بیت رہی ہوگی! ایک تنگ و تاریک اور متعفن حجرے میں زمین پر پڑا ہوگا۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو نہ تھمتے ہوں گے۔ اس وقت اس سے کچھ کھایا پیا نہ گیا ہوگا۔ وہاں کے کانسٹبل اور چوکیدار اُس کو دِق کر رہے ہوں گے۔ معلوم نہیں کہ پولیس والے اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں؟ نہ جانے اُس سے کیا کہلانا چاہتے ہوں۔ پولیس کے محکمے میں جاکر انسان بالکل درندہ ہوجاتا ہے۔ میرا دیاشنکر پہلے کیسا نیک بخت لڑکا تھا۔ جب سے پولیس میں گیا مزاج ہی اور ہوگیا ہے۔ اپنی بیوی تک کی بات نہیں پُوچھتا۔ اگر مجھ پر کوئی معاملہ آپڑے تو مجھ سے بھی بغیر رشوت لیے نہ رہے۔ پریم شنکر پولیس والوں کی باتوں میں نہ آتا ہوگا۔ اور وہ سب کے سب اُسے اور بھی ستا رہے ہوں گے۔ بھائی صاحب اس پر جان دیتے تھے۔ کتنا پیار کرتے تھے اور آج اُس کی یہ حالت!

علی الصبّاح لالہ پربھاشنکر پھر مجسٹریٹ کے بنگلے پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ صاحب شکار کھیلنے گئے ہیں۔ وہاں سے پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس گئے۔ یہ صاحب ابھی سو رہے تھے۔ ان سے دس بجے سے پہلے ملاقات ہونے کی اُمید نہ تھی۔ بے چارے وہاں سے بھی مایوس ہوئے۔ اور تیسرے پہر تک بے آب و دانہ حیران پریشان دوڑتے رہے۔ کبھی اِس دفتر میں جاتے کبھی اُس دفتر میں۔ اُنھیں حیرت ہوتی تھی کہ دفتروں کے ادنیٰ اہلکار کیوں اتنے بے مروّت اور بیدرد ہوتے ہیں۔ سیدھے منہ بات کرنا تو دور رہا کھری کھوٹی سُنانے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ بالآخر چار بجے مجسٹریٹ نے ضمانت منظور کی۔ مگر نہ ہزار کی نہ دوہزار کی پورے دس ہزار کی اور وہ بھی نقد۔ پربھاشنکر کا دل بیٹھ گیا۔ ایک لمبی سانس لے کر وہاں سے اُٹھے اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلے۔ گویا جسم میں جان نہ تھی۔ گھر جاکر وہ چارپائی پر گر پڑے اور سوچنے لگے کہ دس ہزار کا بندوبست کیسے کروں؟ اتنے روپے مجھے

اعتبار پر کون دے گا؟ تو کیا جائداد رہن کردوں؟ ہاں اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ مگر گھر والے کسی طرح رضامند نہ ہوں گے۔ گھر میں لڑائی ٹھن جائے گی۔ وہ بڑی دیر تک اسی حیص بیص میں پڑے رہے۔ کھانا کھانے کا وقت آگیا۔ بڑی بہو بُلانے آئیں۔ پربھا شنکر نے بیوی کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا...... "مجھے بالکل بھُوک نہیں ہے۔"

بڑی بہو۔ کیسی بھوک ہے، جو لگتی ہی نہیں؟ کل رات کو نہیں کھایا۔ دن کو نہیں کھایا۔ کیا اس فکر میں جان دے دوگے؟ جنھیں فکر ہونی چاہیے، جو اُن کا حصہ ہضم کیے بیٹھے ہیں، اُن کی پیشانی پر تو شکن تک نہیں۔ اور تم دانہ پانی چھوڑے ہوئے بیٹھے ہو۔ اپنے ساتھ گھر بھر کو بھُوکوں مار رہے ہو۔

پربھا شنکر نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ کیا کروں۔ میری تو بھُوک پیاس بندسی ہوگئی ہے۔ کیسا نیک بخت، کیسا خوش اخلاق۔ کیسا بااُنس لڑکا تھا۔ اُس کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ کھانا کیسے کھاؤں۔ پردیس میں تھا تو بھُول گئے تھے۔ مگر کھوئے ہوئے لعل کو پانے کے بعد اُسے چوروں کے ہاتھ میں دیکھ کر صبر نہیں ہوتا۔

بڑی بہو۔ لڑکا تو ایسا ہے کہ بھگوان سب کو دیں۔ بالکل وہی لڑکپن کا سا سوبھاؤ ہے۔ وہی بھولاپن۔ وہی محبت۔ دیکھ کر چھاتی پھُول اٹھتی ہے۔ گھمنڈ تو چُھوتک نہیں گیا۔ پر دانہ پانی چھوڑنے سے توکام نہ چلے گا۔ چلو کچھ تھوڑا سا کھالو۔

پربھا شنکر۔ دس ہزار نقد کی ضمانت طلب کی گئی ہے۔

بڑی بہو۔ گیان سے کہتے کیوں نہیں کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑواکڑوا تُھو؟ پریم کے حصےّ کا آدھا منافع کیا شردھا کے کھانے کپڑوں ہی میں خرچ ہوجاتا ہے؟

پربھا شنکر۔ اُس سے کیا کہوں؟ سُنے بھی۔ وہ انگریزی تہذیب کا مارا ہوا ہے جو لڑکے کو بالغ ہوتے ہی والدین سے جُدا کر دیتی ہے۔ اس نے وہ تعلیم پائی ہے جس کی اصلی غرض خودغرضی ہے۔ اس میں اب رحم۔ انکسار شرافت اور انسانیت کچھ بھی نہیں ہے۔ اب وہ صرف اپنے نفس کا غلام ہے۔

بڑی بہو۔ تو تم اتنے روپیوں کا کیا بندوبست کروگے؟

پربھا شنکر۔ کیا کہوں؟ کسی سے قرض لینے پڑیں گے۔

بڑی بہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا سا حصہ جو بچا ہوا ہے اُسے بھی اپنے سامنے ہی

ٹھکانے لگا دوگے۔ یہ تو کبھی نہیں دیکھا کہ جو روپے ایک بار لیے گئے وہ پھر ادا کیے
گئے ہوں۔ بس زمین ہی کے ماتھے جاتی ہے۔

پربھاشنکر۔ زمین میری غلام ہے۔ میں زمین کا غلام نہیں ہوں۔

بڑی بہو۔ میں قرض نہ لینے دوں گی۔ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے تو یہ سارا بوجھ ہمارے
ہی سر پر پڑے گا۔ لڑکوں کو کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہ رہے گا۔

پربھاشنکر نے بیوی کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ میں تم سے صلاح نہیں لیتا ہوں اور نہ تم کو اس کا مجاز ہی سمجھتا ہوں۔ تم احسانوں کو بھول جاؤ۔ میں نہیں بھول سکتا۔ میرا خون سفید نہیں ہے۔ لڑکوں کی تقدیر میں آرام لکھا ہوگا تو آرام کریں گے۔ تکلیف لکھی ہوگی تو تکلیف اُٹھائیں گے۔ میں اُن کی تقدیر نہیں ہوں۔ آج دیاشنکر پر کوئی بات آپڑے تو گہنے بیچ ڈالنے میں بھی کسی کو تامل نہ ہوگا۔ میں پریم شنکر کو دیاشنکر سے جو بھر بھی کم نہیں سمجھتا۔

بڑی بہو نے پھر کھانا کھانے کے لیے اصرار کیا اور پربھاشنکر پھر نہیں نہیں کرنے لگے۔ آخر میں اس نے کہا کہ آج کہو کے کباب بنے ہیں۔ میں جانتی ہوتی کہ تم نہ کھاؤگے تو کیوں بنواتی۔

پربھاشنکر کی بے نیازی مفقود ہوگئی۔ حوصلہ سے بولے۔ کس نے بنائے ہیں؟

بڑی بہو۔ بہو نے۔

پربھاشنکر۔ اچھا تو تھالی پروسواؤ۔ بھُوک تو نہیں ہے۔ پر دوچار لقمے کھا ہی لوں گا۔

کھانا کھانے کے بعد پربھاشنکر پھر اسی اُدھیڑبُن میں پڑگئے۔ روپیہ کہاں سے آئے؟ بے چارے پریم شنکر کو آج کی رات پھر حراست میں کاٹنی پڑی۔ بڑی بہو نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں قرض نہ لینے دوں گی اور یہاں قرض کے سوا اور کوئی تدبیر ہی نہ تھی۔ آج لالہ جی پھر تمام رات جاگتے رہے۔ اُنھوں نے قصد مصمّم کرلیا کہ گھر والے خواہ کتنی ہی مخالفت کریں مگر میں اپنا فرض ضرور ہی ادا کروں گا۔ صبح ہوتے ہی وہ سیٹھ دینا ناتھ کے پاس گئے۔ اور اُن سے اپنی مصیبت کا حال کہہ سُنایا۔ سیٹھ جی سے ان کا پُرانا بیوہار تھا۔ اُنھیں کی بدولت سیٹھ جی زمیندار ہوگئے تھے۔ معاملہ کرنے پر راضی ہوگئے۔ لکھا پڑھی ہوئی اور دس بجتے بجتے پربھاشنکر کے ہاتھوں میں دس ہزار کی تھیلی آگئی۔ وہ ایسے خوش تھے۔ گویا

کہیں پڑی ہوئی دولت مِل گئی ہو۔ آبدیدہ ہوکر بولے:۔ سیٹھ جی آپ کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں؟ آپ نے میرے خاندان کی عزت رکھ لی۔ بھائی صاحب کی روح جنت میں آپ کو دعائیں دے گی۔

یہاں سے اُٹھ کر وہ سیدھے کچہری گئے۔ اور ضمانت کے روپے داخل کردیے۔ اس وقت اُن کا دل ایسا خوش تھا، جیسے کوئی ننھا بچہّ میلہ دیکھنے جا رہا ہو۔ اس خیال سے ان کا کلیجہ اُچھل پڑتا تھا۔ کہ بھائی صاحب میرے حُسن عقیدت پر کتنے خوش ہورہے ہوں گے۔

گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مجسٹریٹ کے اجلاس میں لکھن پور کے ملزمان ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے کھڑے تھے۔ شہر کے ہزاروں لوگ عجیب و غریب مخلوقوں کو دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ سبھی منوہر کو ایک نظر دیکھنے کے مشتاق ہو رہے تھے۔ کوئی اس پر نفریں کرتاتھا۔ کوئی کہتا تھا کہ خوب کیا۔ ظالموں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے۔ سامنے ایک درخت کے نیچے بلاسی دم بخود بیٹھی ہوئی تھی۔ بلراج کے چہرے پر بے خوفی جھلک رہی تھی۔ ڈپٹ سنگھ اور دکھرن بھگت متفکر نظر آتے تھے۔ قادر خاں مردانہ توکل کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ مگر منوہر ندامت اور پشیمانی سے ملول تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے آنکھیں نہ ملا سکتا تھا۔ میری ہی بدولت سارے گاؤں پر یہ آفت آئی ہے۔ یہ خیال اس کے دل سے ایک لمحے کے لیے بھی دُور نہ ہوتا تھا۔ ملزموں سے کچھ فاصلے پر بشیشر ساہ کھڑے تھے۔ رنج و حسرت کی زندہ مثال۔ پولیس کے ملازمین اُنھیں‌اس طرح گھیرے کھڑے تھے، جیسے کسی مداری کو لڑکوں کا غول گھیرے رہتا ہے۔ سب کے عقب میں پریم شنکر تھے۔ مطمئن سنجیدہ اور مستقل۔ مجسٹریٹ نے کہا۔ ”پریم شنکر ضمانت پر رہا کیے گئے۔“

پریم شنکر۔ نے سامنے جاکر کہا۔ میں اس مہربانی کے لیے آپ کا ممنون ہوں مگر جب میرے یہ بے قصور بھائی بیڑیاں پہنے ہوئے کھڑے ہیں تو میں ان کا ساتھ چھوڑنا ٹھیک نہیں سمجھتا۔

عدالت میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ سب لوگ متحیر ہوکر پریم شنکر کی طرف دیکھنے لگے۔ پربھاشنکر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولے۔ بیٹا مجھ پر رحم کرو۔ کچھ میری دوادوش کچھ اپنی خاندانی عزّت اور کچھ اپنے عزیزوں کے رنج و ملال کا خیال کرو۔ تمھارے اس فیصلہ سے میرا دل پھٹا جاتا ہے۔

پریم شنکر نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ چچاصاحب میں آپ کی اس پدرانہ شفقت و عنایت کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ انسان کا دل کتنا پاکیزہ، کتنا فیاض اور کتنا دردمند ہوسکتا ہے۔ مگر میرا ساتھ چھوٹنے سے ان بے چاروں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ یہ سب بالکل نا امید ہوجائیں گے۔ پس میرا اُن کے ساتھ رہنا نہایت ضروری ہے۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں ایشور کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ان غریبوں کی تسکین و تشفی کا موقع عطا کیا۔ میری آپ سے ایک اور عرض ہے۔ میرے لیے کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی بے گناہی خود ہی ثابت کرسکتا ہوں۔ ہاں اگر ممکن ہو تو آپ اِن بے زبانوں کے لیے کسی وکیل کی فکر کیجیے۔ ورنہ ممکن ہے کہ ان کے ساتھ بے انصافی ہوجائے۔

لالہ پربھاشنکر مایوس ہوکر اجلاس کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

(۲۹)

اس مقدمے نے شہر میں تہلکہ ڈال دیا۔ جہاں دیکھیے یہی تذکرہ تھا۔ سبھی لوگ پریم شنکر کے ایثار کی تعریف کر رہے تھے۔

اگرچہ پریم شنکر نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرے لیے کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہے مگر لالہ پربھاشنکر کا دل نہ مانا۔ اُنھیں اندیشہ تھا کہ بلا وکیل کے کام بگڑ جائے گا۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کہیں معاملہ بگڑ گیا تو لوگ یہی کہیں گے کہ لالچ کی وجہ سے وکیل نہیں کیا۔ پس یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ اپنے دل میں بھی پچھتاوا ہوگا۔ پس وہ کُل شہر کے نامی وکلاء کے پاس گئے۔ مگر کوئی بھی اس مقدمے کی پیروی پر آمادہ نہ ہوا۔ کسی نے کہا مجھے فرصت نہیں اور کسی نے کوئی اور بہانہ کرکے ٹال دیا۔ سب کو یقین تھا کہ حکام پریم شنکر سے سخت بدظن ہیں۔ پس ایسی حالت میں ان کی وکالت کرنا جان بوجھ کر اپنا نقصان کرنا ہے۔ پربھاشنکر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے۔ تو پھر اُنھوں نے دیگر ملزموں کے لیے بھی کوئی تدبیر نہ کی۔ اُن کی ہمدردی اپنے ہی کنبہ تک محدود تھی۔

مقدمہ مرتب ہوگیا۔ اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں پیشیاں ہونے لگیں۔ سب انسپکٹر صاحب کا بیان ہوا۔ فیضو کا بیان ہوا۔ تحصیلدار۔ چپراسیوں اور چوکیداروں کے بیانات لیے گئے۔ آٹھویں روز گیان شنکر اجلاس میں آکر کھڑے ہوئے۔ پربھاشنکر کو اس قدر رنج

ہوا کہ وہ عدالت کے کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر رونے لگے۔ حقیقی بھائیوں میں یہ مغائرت کہ پولیس کی حمایت میں ایک بھائی دوسرے بھائی کے خلاف شہادت دے۔ تماشائیوں کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ دیکھیں اُن کا کیا بیان ہوتا ہے۔ سب ٹکٹکی لگائے ہوئے گیان شنکر کی طرف تاک رہے تھے۔ پولیس کو یقین تھا کہ ان کا بیان پریم شنکر کو پورے طور پر ماخوذ کردے گا۔ مگر پولیس کو اور اس سے زیادہ اُن سارے تماشائیوں کو کتنا تعجب ہوا، جب اُنھوں نے دیکھا کہ گیان شنکر نے اپنے دل کا سارا بخار صرف لکھن پور والوں پر نکالا۔ اُنھوں نے پریم شنکر کا تو نام تک نہ لیا۔

سرکاری وکیل نے پوچھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ پریم شنکر اسی گاؤں میں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔

گیان شنکر۔ وہ اس گاؤں میں نصف حصّے کے مالک ہیں۔

وکیل۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ جب انسپکٹر جنرل پولیس کا دورہ ہوا تھا تو پریم شنکر نے لکھن پور والوں کی بیگار بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور تحصیلدار سے لڑنے پر آمادہ ہوئے تھے۔

گیان شنکر۔ مجھے اس کی خبر نہیں ہے۔

وکیل۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ جب آپ نے اضافۂ لگان کا دعویٰ کیا تھا تو پریم شنکر نے گاؤں والوں کو پانچ سو روپے مقدمے کی پیروی کے لیے دیے تھے۔

گیان شنکر۔ اس بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتا۔

گیان شنکر کی شہادت ختم ہوگئی۔ سرکاری وکیل کا مُنہ لٹک گیا۔ لیکن دیکھنے والے لوگ ہم زبان ہوکر کہنے لگے۔ بھائی آخر کو بھائی ہے۔ چاہے یوں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد مسٹر جوالا سنگھ اجلاس میں تشریف لائے۔ اُنھوں نے کہا۔ میں یہاں کئی سالوں تک حاکم پرگنہ رہا۔ لکھن پور میرے ہی علاقے میں تھا۔ کئی بار وہاں دورہ کرنے گیا۔ یاد نہیں پڑتا کہ وہاں گاؤں والوں سے رسد یا بیگار کے بارے میں اس سے زیادہ جھنجھٹ ہوا ہو جتنا کہ دوسرے گاؤں میں ہوا کرتا ہے۔ میرے اجلاس میں ایک بار بابو گیان شنکر نے اضافۂ لگان کی نالش دائر کی تھی۔ لیکن میں نے اسے خارج کر دیا تھا۔

سرکاری وکیل۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس معاملے کی پیروی کے لیے پریم شنکر نے گاؤں والوں کو پانچ سو روپے دیے تھے؟

جوالا سنگھ۔ معلوم ہے۔ لیکن جہاں تک سمجھتا ہوں اُن کو یہ روپۓ کسی دوسرے شخص نے گاؤں والوں کی مدد کے لیے دیے تھے۔

وکیل۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ پریم شنکر کی اس گاؤں میں زیادہ آمد و رفت رہتی تھی۔

جوالا سنگھ۔ ہاں وہ طاعون یا دیگر وبائی امراض کے پھیلنے پر اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔

یہ شہادت بھی ختم ہوئی۔ سرکاری وکیل کے سبھی سوالات بے سُود رہے۔ پھر بشیشر ساہ اجلاس پر آئے۔ اُن کا بیان بہت طولانی، مسلسل اور اہم تھا۔ گویا کسی ناولسٹ نے ان حالات کو اپنے دماغ سے ترتیب دیا ہو۔ سب کو تعجب ہو رہا تھا کہ اس جاہل دہقانی میں اتنی روانی کیوں کر پیدا ہوگئی؟ اُس کے بیان میں واقعیّت کا رنگ اس قدر تھا کہ اُس کی صحت پر شبہ کرنا دشوار تھا۔ غوث خاں کے ساتھ گاؤں والوں کی بدذاتیاں۔ بیگار کے موقعوں پر اُن سے حُجت و تکرار۔ چراور کے روک دینے پر گاؤں والوں کا برانگیختہ ہوجانا۔ اور رات کو سب آدمیوں کا مِل کر غوث خاں کو قتل کرنے کی تدبیر سوچنا، یہ ساری باتیں بہت وضاحت سے بیان کی گئی تھیں۔ خصوصاً سازش کا بیان اتنا مفصل اور مکمل تھا کہ اس پر مہاراجا چندرگُپت کا وزیر چانکیہ بھی رشک کرتا۔ رات کو نو بجے منوہر نے آکر قادرخاں سے کہا کہ بیٹھے کیا ہو۔ چراور روک دی گئی ہے۔ اس طرح چپ رہنے سے کام نہ چلے گا۔ اس کا کچھ اُوپائے کرو۔ قادرخاں چوکی پر بیٹھے نماز پڑھنے کے لیے وضو کررہے تھے۔ بولے بیٹھ جاؤ۔ اکیلے ہم تم کیا بنا لیں گے۔ جب مسلّم گاؤں کی رائے ہو، جبھی کچھ ہوسکتا ہے ورنہ اسی طرح یہ کارندہ ہم کو دباتا چلا جائے گا اور ایک روز کھیت سے بھی بے دخل کردے گا۔ جاکر دُکھرن بھگت کو بُلا لاؤ۔ منوہر دُکھرن کے گھر گئے۔میں بھی منوہر کے ساتھ گیا۔ دُکھرن نے کہا۔ میرے پیر میں کانٹا لگ گیا ہے پس میں چل نہیں سکتا۔ خاں صاحب کو یہاں بُلوالاؤ۔ میں جاکر قادر خاں کو بُلا لایا۔ قادرخاں نے کہا کہ ہم لوگ گنوار ہیں۔ اپنی طبیعت سے کوئی بات کر اُٹھا دینگے تو نہ جانے چت پڑے یا پٹ۔ چل کر بابو شنکر سے صلاح لو۔ ڈپٹ سنگھ بولے اُن کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کل جاکر اُنھیں یہاں بُلا

لاؤں گا۔ دوسرے دن شام کو بابو پریم شنکر یکہ پر سوار ہوکر آئے۔ میں دُکان بڑھا رہا تھا۔ منوہر نے آکر کہا کہ چلو بابوصاحب آگئے ہیں۔ مَیں منوہر کے ساتھ قادر کے گھر گیا۔ پریم شنکر نے کہا کہ گیان بابو میرے بھائی ہیں تو کیا۔ ایسے بھائی کی گردن کاٹ لینا چاہیے۔ قادر نے کہا کہ ہماری اُن سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہمارا بَیر تو غوث خاں سے ہے۔ اس ہتیارے نے اس گاؤں میں ہم لوگوں کا رہنا مشکل کر دیا ہے۔ اب آپ بتایئے کہ ہم کیا کریں؟ منوہر نے کہا یہ بے عزتی نہیں سہی جاتی۔ پریم شنکر بولے۔ کہ مرد ہوکر اتنی بے عزتی کیوں سہتے ہو؟ ایک ہاتھ میں تو کام تمام ہوتا ہے۔ قادر نے کہا۔ کہ ہاں کر تو ڈالیں پر سارا گاؤں بندھ جائے گا۔

پریم شنکر بولے کہ ایسی نادانی کیوں کرو؟ سب مل کر کسی ایک آدمی کا نام لے لو۔ اکیلے آدمی کا یہ کام بھی نہیں ہے۔ تین تین پیادے ہیں۔ اور غوث خاں خود بھی شہہ زور آدمی ہیں۔

قادرخاں بولے کہ جو کہیں سارا گاؤں پھنس جائے تو؟ پریم شنکر نے کہا کہ ایسا کیا اندھیر ہے۔ وکیل لوگ کس مرض کی دوا ہیں۔ میں اسی بیچ میں کھانا کھانے گھر چلا گیا۔ پریم شنکر بھی رات ہی کو یکہ پر لوٹ گئے۔ رات کو کوئی بارہ بجے یا ایک بجے مجھے کھٹکا ہوا تو میں گھر کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ کہ اتنے میں کئی آدمی جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کہ ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ قادر کا نام لے کر پکارا۔ قادر نے کہا کہ سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ٹونک مت مارو۔ چپکے سے جاکر پڑ رہو۔ اتنا سُن کر قادرخاں سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ بشیشر ساہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ بشیشر اُوپر اللہ ہے کچھ اُس کا بھی ڈر ہے؟

سرکاری وکیل نے کہا۔ چُپ رہو۔ ورنہ گواہ پر بیجا دباؤ ڈالنے کا دوسرا جُرم لگ جائے گا۔

شام کے وقت یہ لوگ حراست میں بیٹھے ہوئے اِدھراُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ منوہر علاحدہ ایک کوٹھری میں مقید تھا۔ قادر نے پریم شنکر سے کہا۔ مالک آپ تو ہک ناہک اس آپھت میں پھنسے۔ ہم لوگ ایسے ابھاگے ہیں کہ جو ہماری مدد کرتا ہے۔ اُس پر بھی آنچ آجاتی ہے۔ اتنی عمر گجر گئی۔ سینکڑوں پڑھے لکھے آدمیوں کو دیکھا۔ پر آپ کو چھوڑکر

اور کوئی ایسا نہ مِلا جس نے ہماری گردن پر چُھری نہ چلائی ہو۔ وِدّیا کی ساری دُنیا بڑائی کرتی ہے۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بِدیّا پڑھ کر آدمی اور بھی بے ایمان اور دھوکہ باج بن جاتا ہے۔ وہ گریبوں کا گلا کاٹنا سِکھا دیتی ہے۔ آپ کو اللہ نے سچّی بِدیّا دی۔ اُس کے پیچھے لوگ آپ کے بھی دُشمن ہوگئے۔

دُکھرن۔ یہ سب منوہر کی کرنی ہے۔

بلراج۔ نہ جانے اُن کے سر کون سا بھُوت سوار ہوگیا۔ گُسّا ہم کو بھی آیا تھا پر اُن کو تو جیسے نسہ چڑھ جائے۔

ڈپٹ۔ بِچاور کی بساط ہی کیا تھی۔ اُس کے پیچھے یہ توپھانٗ؟

قادر۔ یارو ایسی باتیں نہ کرو۔ بے چارے نے تم لوگوں کے لیے، تمھارے ہک کی رچھا کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ اس کے جیوٹ اور ہیاو کی تعریف تو نہیں کرتے۔ اور اُس کی بُرائی کرتے ہو۔ ہم سب کے سب ڈرپوک ہیں۔ وہی ایک مرد ہے۔

کلّو۔ بسیسر کی مت ہی اُلٹی ہوگئی۔

دُکھرن۔ بیان کیا دیتا ہے کہ جیسے کوئی توتا پڑھا ہو۔

ڈپٹ۔ کیا جانے کس کے لیے اتنا ڈرتا ہے؟ کوئی آگے پیچھے بھی تو نہیں ہے۔

کلّو۔ اگر یہاں سے چھوٹا تو بچہّ کے مُنہ میں کالکھ لگاکر گاؤں بھر گھماؤں گا۔

ڈپٹ۔ ایسا کنجوس ہے کہ کسی بھکاری کو دیکھتا ہے تو چھچھوندر کی طرح گھر میں جاکر دبک جاتا ہے۔

کلّو۔ سہوائن اس کی بھی نانی ہے۔ بسیسر تو چاہے، ایک کوڑی پھینک بھی دے پر وہ دُکان پر ہوتی ہے تو گالیاں چھوڑ اور کچھ نہیں دیتی۔ پیسے کا سودا لینے جاؤ، تو دھیلے کا ہاتھ لگاتی ہے۔ ایسی ڈانڑی مارتی ہے کہ کوئی پرکھ ہی نہیں سکتا۔

بلراج۔ کیوں کادر دادا۔ کالے پانی جاکر لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں نا؟

قادر۔ سُنا ہے کہ وہاں اُوکھ بہت ہوتی ہے۔

بلراج۔ تب تو چاندی ہے۔ کھوب اُوکھ بوئیں گے۔

کلّو۔ مُدر دادا تم چودہ برس تھوڑے ہی جیئو گے۔ تمھاری کبر (قبر) ''کالے پانی'' ہی میں بنے گی۔

قادر۔ ہم تو لوٹ آنا چاہتے ہیں۔ جس میں اپنی ہڑاور میں دِکھن ہوں۔ وہاں تم لوگ نہ جانے مٹی کی کیا گت کرو۔

دُکھرن۔ بھائی مرنے جینے کی بات مت کرو۔ خیر مناؤ کہ بھگوان سب کو جیتا جاگتا پھر اپنے بال بچوں میں لے آئے۔

بلراج۔ کہتے ہیں کہ وہاں پانی بہت لگتا ہے۔

دُکھرن۔ یہ سب تمھارے باپ کی کرنی ہے۔ سارے گاؤں بھر کا ستیاناس کر دیا۔

یکایک کمرے کا دروازہ کھُلا۔ اور جیل کے داروغہ نے آکر کہا ...... بابوپریم شنکر۔ آپ کے اُوپر سے سرکار نے مقدمہ اُٹھا لیا۔ آپ بری ہوگئے۔ آپ کے گھر والے باہر کھڑے ہیں۔

پریم شنکر کو اِن دیہاتیوں کی بات چیت میں بڑا لُطف آرہا تھا۔ وہ چونک پڑے۔ گیان شنکر اور جوالا سنگھ کے بیانات اُن کے موافق ہوئے تھے۔ لیکن یہ امید نہ تھی کہ وہ اس بنا پر بے قصور قرار دیے جائیں گے۔ وہ فوراً تاڑ گئے کہ یہ چچا صاحب کی کرامات ہے اور واقعی تھا بھی ایسا ہی۔ پربھاشنکر کو جب وکیلوں سے کوئی اُمید نہ رہی تو اُنھوں نے حکمتِ عملی سے کام لیا۔ اور دو ڈھائی ہزار روپیوں کی بھینٹ چڑھاکر یہ بردان پایا۔ رشوت۔ خوشامد۔ زمانہ سازی۔ یہ سبھی اُن کی نگاہ میں حراست کی بے عزتی سے بچنے کے لیے قابلِ عفو تھے۔

پریم شنکر نے داروغۂ جیل سے کہا۔ اگر خلافِ قاعدہ نہ ہوتو کم ازکم مجھے رات بھر یہاں اور رہنے دیجیے۔ داروغہ نے متعجب ہوکر کہا۔ یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ کا خیر مقدم کرنے کے لیے سینکڑوں آدمی باہر کھڑے ہیں۔

پریم شنکر نے خیال کیا کہ ان غریبوں کو میرے یہاں رہنے سے ڈھارس تھی۔ شاید اُنھیں اُمید تھی کہ ان کے ساتھ ہم لوگ بھی بری ہوجائیں گے۔ میرے چلے جانے سے یہ سب مایوس ہوجائیں گے۔ ان کی تشفّی کرتے ہوئے بولے۔ بھائیو۔ مجھے مجبوراً ساتھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ مگر میرا دل تمھارے ہی ساتھ رہے گا۔ ممکن ہے کہ باہر جاکر تمھاری کچھ خدمت کرسکوں۔ میں روزانہ تم لوگوں سے ملتا رہوں گا۔

ساتھیوں سے رخصت ہوکر جیوں ہی وہ پھاٹک پر پہنچے کہ لالہ پربھاشنکر نے دوڑکر

اُنھیں سینے سے لگالیا۔ جیل کے چپراسیوں نے اُنھیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور انعام کے خواہاں ہوئے۔ پربھاشنکر نے ہرایک کو دودو روپے دیے۔ بگھی چلنے ہی والی تھی کہ بابوجوالاسنگھ اپنی موٹرسائیکل پر آپہنچے اور پریم شنکر کے گلے سے لپٹ گئے۔ پربھاشنکر چاہتے تھے کہ دونوں دوستوں کو اپنے گھر لے جائیں۔ اور اُن کی دعوت کریں۔ مگر پریم شنکر نے پہلے حاجی پور جاکر پھر لوٹنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جیوں ہی بگھی باغیچے میں پہنچی۔ ہلواہے اور مالی سب کے سب دوڑ پڑے۔ اور پریم شنکر کے گرد کھڑے ہوگئے۔

پریم۔ کیوں جی دمڑی۔ جوتائی ہو رہی ہے نا؟

دمڑی نے شرمندہ ہوکر جواب دیا۔ مالک اوروں کی تو نہیں کہتا۔ پر میرا من کام کرنے میں جُرا بھی نہیں لگتا تھا۔ یہی چنتا (فکر) لگی رہتی تھی کہ آپ نہ جانے کیسے ہوں گے۔ (قریب جاکر) بھولا کل ایک ٹوکری امرود توڑ کر بیچ آیا ہے۔

بھولا۔ دمڑی۔ تم نے سرکار کے کان میں کچھ کہا تو ٹھیک نہ ہوگا۔ مجھے جانتے ہو کہ نہیں؟ یہاں جیل سے نہیں ڈرتے جو کچھ کہنا ہو مُنہ پر صاپھ صاپھ کہو۔

دمڑی۔ تو تم ناہک جامہ سے باہر ہوگئے ہو۔ تمھیں کوئی کچھ تھوڑا ہی کہتا ہے۔

بھولا۔ تم نے کانا پھوسی کیوں کی؟ میری بات نہ کہی ہوگی، کسی اور کی کہی ہوگی۔ تم کون ہوتے ہو کسی کی چُگلی کھانے والے؟ متا کوری نے سمجھایا۔ بھولا تم کھامکھا (خواہ مخواہ) جھگڑا کرنے لگتے ہو۔ تم سے کیا مطلب؟ جس کے جی میں جو آتا ہے وہ مالک سے کہتا ہے تمھیں کیوں بُرا لگتا ہے؟

بھولا۔ چُگلی کھانے چلے ہیں کچھ کام کریں نہ دھندا۔ سارے دن نسا کھائے پڑے رہتے ہیں۔ ان کا مُنہ ہے کہ دوسروں کی سکایت کریں۔ اتنے میں بھوانی سنگھ بھی آپہنچے جو مکھیا تھے۔ یہ جھگڑا سُنا تو بولے۔ کیوں لڑے مرتے ہو یارو۔ کیا دن پھر نہ ملے گا۔ مالک سے کُسل چھیم (خیروعافیت) پُوچھنا تو دُور رہا۔ کچھ سیوا ٹہل تو نہ ہوسکی۔ لگے آپس میں تکرار کرنے۔

اس باموقع تنبیہ نے سبوں کو خاموش کردیا۔ کوئی دوڑکر جھونپڑے میں جھاڑو دینے لگا۔ کسی نے پلنگ ڈال دیا۔ کوئی مونڈھے نکال لایا۔ کوئی دوڑکر پانی لایا۔ کوئی لالٹین جلانے لگا۔ بھوانی سنگھ اپنے گھر سے دُودھ لائے۔ جب تینوں آدمی ناشتہ کرکے آرام سے بیٹھے تو

جوالا سنگھ نے کہا۔ ان لوگوں سے آپ کیوں کر کام لیتے ہیں؟ مجھے تو سبھی نکمّے معلوم ہوتے ہیں۔

پریم ۔ جی نہیں۔ یہ سب لڑتے ہیں تو کیا۔ خوب جی لگاکر کام کرتے ہیں۔ دن بھر کے لیے جتنا کام بتا دیتا ہوں اُتنا دوپہر ہی تک کر ڈالتے ہیں۔

لالہ پربھاشنکر اپنے دل میں ڈر رہے تھے کہ کہیں پریم شنکر اپنی برتیت کے بارے میں کچھ پُوچھ نہ بیٹھیں۔ وہ راز کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ جوالا سنگھ سے باتیں کرنے لگے۔ جب سے اُن کا تبادلہ ہوگیا تھا، اُس وقت سے اُنھیں اطمینان نہ نصیب ہواتھا۔ افسر ناراض، ماتحت ناراض، بات بات پر جواب طلب ہوتا تھا۔ ایک بار معطّل بھی ہوجانا پڑا تھا۔ کتنا ہی چاہا کہ تبادلہ ہوجائے مگر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے۔ بے چارے ملازمت سے تنگ آکر اب استعفیٰ دینے کا ارادہ کر رہے تھے۔

پربھاشنکر نے کہا۔ بیٹا بھول کر بھی استعفیٰ دینے کا قصد نہ کرنا۔ یہ کوئی معمولی عہدہ نہیں ہے۔ اسی عہدہ کے لیے بڑے بڑے روساء اور امراء کی پیشانیاں گھِس جاتی ہیں اور پھر بھی مقصد براری نہیں ہوتی۔ یہ وقار اور اقتدار آپ کو اور کہاں حاصل ہوسکتا ہے؟

جوالا۔ لیکن اس وقار کے حاصل کرنے کے لیے اپنے ضمیر کا کتنا خون کرنا پڑتا ہے۔ اگر بے لوثی سے اپنا کام کیجیے تو بڑے لوگ آزار کے درپے ہوجاتے ہیں۔ اپنے اصولوں کی آزادی سے پابندی کیجیے تو حُکّام تیور بدلتے ہیں۔ البتہ وہی کامیاب ہوتا ہے جو خوشامدی اور چالاک ہے۔ جسے اُصولوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ میں نے تو آج تک کسی بے لوث آدمی کو سرسبز ہوتے نہیں دیکھا۔ بس شطرنج بازوں کی چاندی ہے۔ میں نے خوب آزما دیکھا ہے۔ میرا یہاں نباہ نہیں ہوسکتا۔ اب تو یہی فیصلہ کرلیا ہے کہ استعفیٰ دے کر اسی باغیچے میں قیام کروں اور بابوپریم شنکر کے ساتھ ہی زندگی بسر کروں، بشرطیکہ انھیں کوئی اعتراض نہ ہو۔

پریم۔ آپ شوق سے تشریف لائیے مگر ارادے کو خوب مضبُوط کرکے آیئے گا۔

جوالا۔ اگر کچھ کسر ہوگی تو وہ یہاں پوری ہوجائے گی۔

پریم شنکر نے اپنے آدمیوں سے کھیتی کے متعلق کچھ باتیں کیں اور آٹھ بجتے بجتے لالہ پربھاشنکر کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

رات کے دس بجے تھے۔ جوالا سنگھ کھانا کھاکر لالہ پربھاشنکر کے دیوان خانے ہی میں لیٹے۔ مگر پریم شنکر کو مچھروں نے اتنا تنگ کیا کہ نیند نہ آئی۔ کچھ دیر تک وہ پنکھا جھلتے رہے۔ آخر کو جب اندر نہ رہا گیا تو پریشان ہوکر باہر نکلے اور صحن میں ٹہلنے لگے۔ صحن کی دوسری طرف گیان شنکر کا دروازہ تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سکوت نے پریم شنکر کے جذبات کو متحرک کر دیا۔ سوچنے لگے۔ میری زندگی بھی عجیب ہے۔ شردھا جیسی دیوی کو پاکر بھی میں گرہستی کے سکھوں سے محروم ہوں۔ سامنے شردھا کی خواب گاہ ہے۔ مگر میں اس طرف دیکھنے کی جُرأت نہیں کرسکتا۔ وہ اس وقت کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہی ہوگی۔ مگر مجھے اُس کی میٹھی آواز سُننے کا کوئی حق نہیں!

دفعتاً گیان شنکر کے دروازے سے کوئی عورت نِکلتی ہوئی اُنھیں دکھائی دی۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ مزدورنی ہوگی جو کام دھندے سے فراغت پالینے پر اپنے گھر جاتی ہوگی۔ لیکن نہیں۔ یہ سرسے پَیر تک چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ نوکرانیاں اتنی حیادار نہیں ہوتیں۔ پھر یہ کون ہے؟ چال تو شردھا کی سی ہے۔ قد بھی ویسا ہی ہے۔ مگر اتنی رات گئے اس تاریکی میں شردھا کہاں جائے گی؟ نہیں کوئی اور ہوگی۔ مجھے وہم ہو رہا ہے۔ اس راز کو معلوم کرنا چاہیے۔ اگرچہ پریم شنکر کو ایک اجنبی اور تنہا عورت کے پیچھے جاسوس بن کر چلنا بالکل بیجا معلوم ہوتا تھا، مگر اس عقدے کو حل کرنے کی خواہش اتنی زبردست تھی کہ وہ اسے ضبط نہ کرسکے۔

کچھ دُور تک گلی میں چلنے کے بعد وہ عورت سڑک پر جا پہنچی۔ اور دساس میدھ گھاٹ کی طرف چلی۔ سڑک پر لالٹینیں جل رہی تھیں۔ راستہ بند نہ تھا پر بہت کم آدمی چلتے نظر آرہے تھے۔ پریم شنکر کو اس عورت کی رفتار سے اب کامل یقین ہوگیا کہ وہ شردھا ہی ہے۔ اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ اتنی رات گزرے اس طرف کہاں جاتی ہے؟ اُنھیں اس پر کوئی شک نہ ہوا۔ وہ اُس کی عصمت پروری اور شوہر پرستی کی قسم کھاسکتے تھے۔ مگر اس یقین نے اُن کی تجسس آمیز خواہش کو اور بھی اُکسایا۔ اُس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ گھاٹ کے کنارے کی بلند عمارتیں آپہنچیں۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ مگر کہیں کہیں دریچوں سے روشنی کی شعاعیں آرہی تھیں۔ جیسے کوئی سوتا ہوا آدمی

خواب دیکھ رہا ہو۔ قدم قدم پر سانڈوں کا سامنا ہوتا تھا۔ جابجا گئے زمین پر پڑی ہوئی پتلوں کو چاٹ رہے تھے۔ شردھا سیڑھیوں سے اُتر کر لبِ آب تک جا پہنچی۔ اب پریم شنکر کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں اس نے اپنے دل میں کچھ اور تو نہیں ٹھان لی ہے؟ ان کا دل کانپنے لگا۔ وہ تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے اُترے اور شردھا سے صرف اتنے فاصلہ پر کھڑے ہوگئے کہ ذرا بھی کھٹکا ہونے پر ایک ہی جست میں اُس کے پاس جا پہنچیں۔ گنگا محوِخواب تھی۔ کہیں کہیں آبی جانوروں کے جھپکنے کی آواز آجاتی تھی۔ سیڑھیوں پر کتنے ہی سادھو پڑے سورہے تھے۔ پریم شنکر کا اس وقت اپنی تقصیر کا ناقابلِ برداشت احساس ہوا۔ یہ میری بے رحمی اور بے دردی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی اصول پروری اور انانیت کے زعم میں اس کے دلی جذبات کو پامال کردیا۔ اس کے مذہبی احساس کو حقیر سمجھا۔ جب تمام برادری مجھے دودھ کی مکھی سمجھ رہی ہے۔ جب میرے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ جب میں لامذہب اور کافر سمجھا جا رہا ہوں۔ تو ایک راسخ الاعتقاد عورت کا مجھ سے منحرف ہوجانا بالکل قدرتی تھا۔ نہ جانے کتنی روحانی تکلیف اور دِلی کوفت کے بعد آج اس غریب عورت نے ایسا خوفناک ارادہ کیا ہے۔

شردھا کئی منٹ تک پانی کے قریب خاموش کھڑی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ پانی میں اُتری۔ پریم شنکر نے دیکھا کہ اب دیر کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اُنھوں نے ایک جست بھری اور آخری سیڑھی پر کھڑے ہوکر شردھا کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شردھا چونک پڑی خائف ہوکر بولی:۔ کون ہے؟ دُور ہٹ!

پریم شنکر نے خطاوارانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ میں ہُوں بدنصیب پریم شنکر!

شردھا نے اُن کی طرف بغور دیکھا اور خوفزدہ ہوکر کہا۔ آپ یہاں!

پریم۔ ہاں۔ آج عدالت نے مجھے بری کر دیا۔ چچا صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ کھانا کھاکر نکلا تو تمھیں اس طرف جاتے دیکھا۔ میں ساتھ ہو لیا۔ اب ایشور کے لیے پانی سے باہر آؤ۔ مجھ پر رحم کرو۔

شردھا پانی سے نکل کر زینہ پر آئی اور ہاتھ جوڑکر گنگا کو دیکھتی ہوئی بولی:۔ ماتا۔ تم نے میری بِنتی سُن لی۔ اور کس مُنہ سے تمھارا جَس گاؤں؟ اس ابھاگنی کو تم نے تار دیا۔

پریم۔ تم اندھیرے میں اتنی دور کیسے چلی آئیں؟ خوف نہیں معلوم ہوا؟

شردھا۔ میں تو یہاں کئی دن سے آتی ہوں۔ خوف کس بات کا؟

پریم۔ کیا یہاں کے بدمعاشوں کا حال معلوم نہیں ہے؟

شردھا نے کمر سے چھُرا نکال لیا اور بولی یہ میری رچھا کے لیے کافی ہے۔ دُنیا میں جب کوئی سہارا نہیں ہوتا تو آدمی نِڈر ہو جاتا ہے۔

پریم۔ گھر کے لوگ تمھیں اس طرح آتے دیکھ کر دل میں نہ جانے کیا کہتے ہونگے؟

شردھا۔ جو چاہیں سمجھیں۔ کسی کے مَن پر میرا کون بَس ہے۔ پہلے لوک لاج کا ڈر تھا۔ اب وہ نہیں۔ اُس کی اصلیت معلوم ہوگئی۔ وہ ریشم کا جال ہے دیکھنے میں خوش نما مگر سخت تکلیف دہ ۔ وہ اکثر دھرم کو اَدھرم اور اَدھرم کو دھرم بنا دیتا ہے۔

پریم شنکر کا دل جوشِ مسرّت سے اُچھلنے لگا۔ بولے۔ ایشور کیا میری قسمت کا ستارہ پھر چمکے گا؟ شردھا میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ میری کتنی ہی دفعہ خواہش ہوئی کی پھر امریکہ واپس جاؤں۔ مگر اُمید کی ایک نہایت ہی لطیف اور خیالی زنجیر سے میرے پیر بندھے رہے۔ میں ہمیشہ اپنے چاروں طرف تمھاری محبت اور عصمت مآبی کی روشنی پھیلی ہوئی دیکھتا ہوں۔ میری روحانی تاریکی میں یہی روشنی مشعلِ ہدایت کا کام کرتی ہے۔ میں تمھاری دعاؤں کو کسی گھنے درخت کی طرح اپنے اوپر سایہ ڈالتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے تمھاری جفا میں وفا، تمھاری بے اعتنائی میں التفات، تمھاری سرد مہری میں محبت چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہی چھٹکارے کے لیے تم یہ برت (ریاضت) کر رہی ہو۔ اگر میری محبت بھی بے لوث ہوتی تو میں اس رُوحانی وصل پر ہی قانع رہتا۔ مگر میں تو حسن و عشق کا بندہ ہوں۔ نفسانی خواہشوں کا غلام۔ میری اس روحانی اتصال سے تسکین نہیں ہوتی۔

شردھا ۔ میرے دل سے یہ خیال کبھی دور نہیں ہوتا کہ تم سے مِلنا اَدھرم ہے اور اَدھرم کے خیال ہی سے میرا دل کانپ اُٹھتا ہے۔

پریم۔ یہ خیال کیسے دُور ہوگا؟

شردھا ۔ آپ جان بوجھ کر مجھ سے کیوں پُوچھتے ہیں؟

پریم۔ تمھارے مُنہ سے سُننا چاہتا ہوں۔

شردھا ۔ پرائشچت (کفارہ) سے۔

پریم۔ وہی پرائشچت جو شاستروں میں درج ہے؟

شردھا۔ ہاں وہی۔

پریم۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ چند دریاؤں میں غسل کرنے سے، چند لکڑیوں کے جلانے سے، چند مکروہ چیزیں کھانے سے، براہمنوں کے کھلانے سے، میری ناپاکی دُور ہوجائے گی؟ افسوس کہ تم اتنی عقلمند ہوکر بھی اتنی باطل پرست ہو۔

شردھا کا ایک ہاتھ پریم شنکر کے ہاتھ میں تھا۔ اتنا سُنتے ہی اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور دونوں انگلیوں سے دونوں کانوں کو بند کرتی ہوئی بولی۔ ایشور کے لیے میرے سامنے شاستروں کی نندا (مذمت) مت کرو۔ ہمارے رشیوں منیوں نے شاستروں میں جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ ہمیں ماننا چاہیے۔ اُن میں مین میکھ نکالنا ہمارے لیے ٹھیک نہیں۔ ہم میں اتنا گیان کہاں ہے کہ شاستروں کی سبھی باتوں کو سمجھ سکیں؟ ان کے ماننے ہی میں ہماری بھلائی ہے۔

پریم۔ مجھ سے وہ کام کرنے کو کہتی ہو جو میرے اُصول و اعتقاد کے بالکل منافی ہے۔ میں یہ بات ناننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ غیرملکوں میں جانا کوئی گناہ ہے۔ ایسی حالت میں پرائشچت کی قید لگاکر تم مجھ پر بہت بڑا ظلم کر رہی ہو۔

شردھا نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ تمھارے دل سے ابھی غرور مٹا نہیں۔ جب تک اِسے نہ مٹایئے گا شاستروں کی باتیں آپ کی سمجھ میں کبھی نہ آئیں گی۔

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ پریم شنکر کچھ نہ بول سکے۔ اُسے روکنے کی بھی جُرأت نہ ہوئی۔ شردھا دیکھتے دیکھتے سامنے کی گلی میں داخل ہوئی اور تاریکی میں نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

پریم شنکر کئی منٹ تک وہیں ساکت کھڑے رہے۔ پھر وہ یکایک اس نیم بے ہوشی کی حالت سے ہوش میں آئے۔ جیسے کوئی مریض دیرتک غش میں رہنے کے بعد یک دم چونک پڑے۔ اپنی حالت کا اندازہ ہوا۔ ہائے موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے اُصول کو انسان سے بہتر سمجھا۔ اصول انسان کے لیے ہے۔ اِنسان اُصول کے لیے نہیں۔ میں اتنا بھی نہ سمجھ سکا۔ ماناکہ پرائشچت کا میں قائل نہیں ہوں۔ مگر اس سے دو انسانوں کی زندگی آرام و خوشی میں گزرتی۔ اس اصول پروری نے دونوں ہی کو غارت کردیا۔ کیوں نہ چل کر شردھا سے کہہ دوں کہ مجھے پرائشچت کرنا منظور ہے۔ ابھی وہ بہت دُور نہ گئی ہوگی۔ اس کا عقیدہ

غلط ہی سہی، مگر کتنا مضبوط ہے۔ کتنی بے لوث شوہر پرستی ہے۔ اور کتنی اٹل مذہب پرستی۔

پریم شنکر اِنھیں خیالات میں محو تھے کہ یکایک انھوں نے دو آدمیوں کو اوپر سے اُترتے دیکھا۔ زیادہ سوچنے کے بعد دماغ آرام سے چلتا ہے۔ وہ اُن دونوں کی طرف غور سے دیکھنے لگے کہ یہ کون ہیں؟ اور اس وقت یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ رفتہ رفتہ وہ دونوں نیچے آئے اور پریم شنکر سے کچھ دور کھڑے ہوگئے۔ پریم شنکر نے ان دونوں کی باتیں سُنیں تو آواز سے پہچان گئے۔ یہ دونوں پدم شنکر اور تیج شنکر تھے۔

تیج شنکر نے کہا۔ تمھاری بُری عادت ہے کہ جس سے ملنا ہوتا ہے اُسی سے اِن باتوں کا تذکرہ کرنے لگتے ہو۔ یہ سب باتیں پوشیدہ رکھنے کی ہیں۔ کہنے سے ان کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔

پدم۔ میں نے تو کسی سے نہیں کہا۔

تیج۔ کیوں۔ آج ہی بابوجوالا سنگھ سے کہنے لگے کہ ہم لوگ سادھو ہوجائیں گے۔ کئی دن ہوئے کہ والدہ سے بھی یہی بات کہی تھی۔ اس طرح بکتے پھرنے سے کیا فائدہ؟ ہم لوگ سادھو ضرور ہوجائیں گے۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی اس "بیسا" کو سِدھ کرلو۔ گھر میں لاکھ دولاکھ روپے رکھ دو۔ بس پھر بے فکر ہوکر نکل کھڑے ہو۔ بھیا گھر کی کچھ خبر لیتے ہی نہیں۔ ہم لوگ بھی نکل جائیں تو لالہ جی اتنے لوگوں کی پرورش کیسے کریں گے؟ امتحان تو مجھ سے دِیا نہ جائے گا۔ کون جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں کو رٹتا پھرے۔ اور میٹرک پاس ہی ہوگئے تو کون بادشاہ ہوجائیں گے۔ بہت ہوگا، کہیں پندرہ بیس روپے کے ملازم ہوجائیں گے۔ تین سال سے فیل ہو رہے ہیں۔ اب کی تو یونہی کہیں پڑھنے کے لیے جگہ نہ ملے گی۔

پدم۔ اچھا اب کسی سے کچھ نہ کہوں گا۔ یہ منتر سِدتھ ہوجائے تو چچا صاحب مقدمہ جیت جائیں گے نا؟

تیج۔ ابھی دیکھا نہیں کیا؟ لالہ جی بیس ہزار کی ضمانت دیتے تھے۔ پر مجسٹریٹ نہ لیتا تھا۔ تین ہی روز یہاں آسن جمایا اور آج وہ بالکل بری ہوگئے۔ ایک کوڑی کی بھی ضمانت نہ دینی پڑی۔

پدم۔ بھائی صاحب بڑے نیک مزاج شخص ہیں۔ مجھے اُن کی بہت محبت معلوم ہوتی ہے۔

چھوٹے بھائی کی طرف تو دیکھتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے۔

تیج ۔ انھوں نے بڑے بھائی کو پھنسایا ہے۔ ڈرتا ہوں۔ وگرنہ ایک ہفتہ بھی آسن لگاؤں تو اُن کی جان ہی لے کر چھوڑوں۔

پدم۔ مجھ سے تو کبھی بولتے ہی نہیں۔ چھوٹی بھاوج کا لحاظ کرتا ہوں۔ ورنہ ایک روز مایا کو خوب پیٹتا۔

تیج۔ اب کی تو مایا بھی گورکھپور جا رہا ہے۔ وہیں پڑھے گا۔

پدم۔ جب سے موٹر آیا ہے، مایا کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ یہاں کوئی موٹر کا بھوکا نہیں ہے۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ پریم شنکر اُٹھ کر اُن کے پاس آئے اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ پدم شنکر نے چونک کر زور سے چیخ ماری اور تیج شنکر کھڑا ہو کر کچھ بُدبُدانے اور چُھوچُھو کرنے لگا۔ پریم شنکر بولے:۔ ڈرو مت۔ میں ہوں۔

تیج۔ بھائی صاحب۔ آپ یہاں اس وقت کیسے آگئے؟

پدم۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی بھوت آگیا۔

پریم۔ تم لوگ ان لغویات میں پڑکر اپنا وقت مفت میں خراب کر رہے ہو۔ یہ بڑا خطرناک کام ہے اور اصلیت کچھ بھی نہیں۔ ان منتروں کو جگاکر تم اپنی زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ دل لگاکر پڑھو کام کرو اور نیک چلن بنو۔ دولت اور شہرت پانے کے لیے یہی سب سے بڑھیا اور سچّا منتر ہے۔ اب یہاں سے اُٹھو۔

سب گھر کی طرف چلے۔ راستے بھر میں پریم شنکر دونوں کو سمجھاتے رہے۔ گھر پہنچ کر وہ پھر سونے کے لیے لیٹے۔ مچھّروں کے بجائے اب اُن کے لیے ایک نئی مشکل پیدا ہوگئی تھی۔ شردھا کا آخری جملہ تھا کہ تمھارے دل سے ابھی اہنکار (غرور) نہیں مٹا۔ پریم شنکر نہایت بے دردی سے اپنے کاموں کی جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ اپنے دل کے ایک ایک پردے کو کھول کر دیکھ رہے تھے۔ اور ہر لمحہ اُنھیں یقین ہوتا جاتا تھا کہ میں دراصل اہنکار کا پُتلا ہوں۔ وہ اپنے کسی کام کو۔ کسی ارادے کو انانیت سے خالی نہ پاتے تھے۔ اُنھیں اپنی غریب دوستی میں بھی اہنکار چھپا ہوا نظر آتا تھا۔ اُنھیں گمان ہورہا تھا کہ کیا اُصول پروری انانیت ہی کی دوسری صورت ہے؟ اس کے برعکس شردھا کی مذہب پرستی میں انانیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اتنے میں جوالا سنگھ نے آکر کہا۔ کیا سوتے رہیے گا؟ سویرا ہوگیا۔

پریم شنکر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تو واقعی دن نکل آیا تھا بولے۔ مجھے تو مچھروں کے مارے نیند ہی نہیں آئی۔ میری تو آنکھ بھی نہیں جھپکی۔

جوالا۔ اور یہاں ایک ہی کروٹ میں سویرا ہوگیا۔

پریم شنکر اُٹھ کر ہاتھ مُنہ دھونے لگے۔ آج اُنھیں بہت کام کرنا تھا۔ جوالا سنگھ بھی نہا دھوکر فارغ ہوئے۔ ابھی دونوں آدمی کپڑے پہن رہے تھے۔ کہ تیج شنکر ناشتہ کے لیے تازہ حلوا، سیب کا مُربّہ، تلے ہوئے پستہ بادام اور گرم دودھ لایا۔ جوالا سنگھ نے کہا۔ آپ کے چچا صاحب بڑے مہمان نواز ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہمانوں کی خاطرومدارت کرنے میں اُنھیں خاص خوشی ہوتی ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ مہمانوں کی صورت دیکھتے ہی گویا دب سے جاتے ہیں۔ اُن کی جو کچھ خاطر کرتے ہیں، وہ صرف رسم کے لحاظ سے۔ دل سے یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ بَلا سر سے دُور ہو۔

پریم۔ ایسی مقدس ہستیاں اب دُنیا سے اُٹھتی جاتی ہیں۔ اب تو جدھر دیکھیے اُدھر خودغرضی کا دور دورہ ہے۔ چچا صاحب جیسا کھانا کھاتے ہیں، ویسا بڑے بڑے روساء کو بھی میسّر نہیں۔ وہ خود کھانا پکانے کے فن میں ماہر ہیں۔ مگر اُنھیں خود کھانے کا اتنا شوق نہیں ہے، جتنا دوسروں کو کھلانے کا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ موقع ملے تو ان سے اس کام کو سیکھوں۔

دونوں دوستوں نے ناشتہ کیا۔ اور لالہ پربھاشنکر سے رخصت ہوکر گھر سے باہر نکلے۔ جوالا سنگھ نے کہا کہ کسی وکیل کو کرلینا چاہیے۔

پریم۔ یہ کام سب سے زیادہ ضروری ہے۔ دیکھیں کوئی صاحب ملتے ہیں یا نہیں؟ چچا صاحب کو تو لوگوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔

جوالا۔ ڈاکٹر عرفان علی سے میرا خوب ربط ضبط ہے۔ آیئے پہلے وہیں چلیں۔

پریم۔ وہ تو شاید ہی راضی ہوں۔ گیان شنکر سے اُن کی بات چیت پہلے ہی ہوچکی ہے۔

جوالا۔ ابھی وکالت نامہ تو داخل نہیں ہوا۔ گیان شنکر ایسے بے وقوف نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ ہزاروں روپے خرچ کریں۔ ان کی جو خواہش تھی وہ پولیس کے ہاتھوں پوری ہوئی جاتی ہے۔ سارا لکھن پور چکّر میں پھنس گیا ہے۔ اب اُنھیں وکیل کرکے کیا کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ دونوں آدمیوں کو دیکھتے ہی بڑھ کر ہاتھ ملایا اور بنگلے میں لے گئے۔

ڈاکٹر۔ (جوالا سنگھ سے) آپ سے تو ایک مدّت کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ آج کل تو آپ ہردوئی میں ہیں نا؟ آپ کے بیان نے تو پولیس والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ مگر یاد رکھیے۔ اس کا خمیازہ آپ کو اُٹھانا پڑے گا۔

جوالا۔ اس کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ ان دو رنگی چالوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔

ڈاکٹر۔ حالت ہی ایسی ہے کہ کوئی خوددار شخص اسے گوارا نہیں کرسکتا۔ بس یہاں اُنھیں لوگوں کی چاندی ہے جن کا کانشس (ضمیر) مُردہ ہوگیا ہے۔ میرے ہی پیشہ کو لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ آزاد پیشہ ہے۔ مگر لالہ پربھاشنکر کو سارے شہر میں (پریم شنکر کی طرف دیکھ کر) آپ کی وکالت کرنے کے لیے کوئی وکیل نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ وہ میرے پاس کیوں نہیں تشریف لائے؟

جوالا۔ اُس غلطی کی تلافی کرنے کے لیے ہم لوگ جو حاضر ہوئے ہیں۔ غریب کسانوں پر آپ کو رحم کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر۔ میں اس خدمت کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ پولیس سے میری دیرینہ عداوت ہے۔ ایسے مقدمات کی مجھے تلاش رہتی ہے۔ بس یہی میرا آخری مقدمہ ہوگا۔ مجھے بھی وکالت سے نفرت ہوگئی ہے۔ میں نے یونیورسٹی میں پروفیسری کی درخواست دی ہے۔ منظور ہوگئی تو بوریا بدھنا سمیٹ کر اُدھر کی راہ لوں گا۔

پہلا حصہ ختم

دوسرا حصہ

ڈاکٹر عرفان علی کی باتوں سے پریم شنکر کو بہت اطمینان ہوا۔ ممنتانہ میں ان سے کچھ رعایت چاہتے تھے۔ لیکن لحاظ سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ اتنے میں ہمارے قدیم شناسا سیدایجاد حسین کمرہ میں داخل ہوئے اور جوالاسنگھ کو دیکھتے ہی آداب بجا لاکر ان کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ان کے ہمراہ ایک ہندو نوجوان تھا جو وضع قطع سے کوئی دولت مند بنیا معلوم ہوتا تھا۔

جوالاسنگھ بولے:۔ آیئے آیئے مزاج تو اچھا ہے؟ آج کل کس کی پیشی میں ہیں۔

ایجاد ۔ جب سے حضور چلے گئے میں نے بھی نوکری کو سلام کیا۔ زندگی شکم پروری میں گزری جاتی ہے۔ ارادہ ہوا کہ کچھ دن قوم کی خدمت کروں اسی غرض سے "انجمن اتحاد" قائم کر رکھی ہے۔ اس کا مقصد ہندوؤں مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنا ہے۔ میں اسے قوم کا اہم ترین مسئلہ خیال کرتا ہوں۔ اس کے لیے آپ اگر انجمن کو اپنے قدموں سے ممتاز فرمائیں تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔

جوالا ۔ آپ واقعی قوم کی سچی خدمت کر رہے ہیں۔

ایجاد ۔ شکر ہے! جناب کی زبان سے یہ کلمہ نکلا۔ یہاں مجھے میاں اتحاد کہہ کر میرا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ انجمن پر آوازیں کسی جاتی ہیں۔ مجھے خود مطلب اور خود غرض کہا جاتا ہے۔ یہ ساری ذلتیں برداشت کرتا ہوں۔ دونوں قوموں کے باہمی نفاق کو دیکھتا ہوں تو جگر کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ محبت و اخلاص جس پر قوم کی ہستی قائم ہے روزبروز عنقا ہوجاتا ہے۔ اگر ایک ہندو اسلام پر یقین لاتا ہے تو شور مچ جاتا ہے کہ ہندو قوم تباہ ہوئی جاتی ہے۔ اگر ایک ہندو کوئی اونچا درجہ پاجاتا ہے تو مسلمانوں میں ہائے ہائے کی صدا بلند ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسلام غارت ہوا۔ کوئی کہتا کہ اسلام کی کشتی بھنور میں پڑی۔ لاحول ولاقوۃ، مذہب روحانی تسکین اور نجات کا ذریعہ

ہے نہ کہ دینا کمانے کا ڈھکوسلا۔ اس باہمی کدورت کو ہمارے ملاّ اور پنڈت صاحبان اور بھی بڑھاتے رہتے ہیں۔ میری آواز نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہے مگر قومی ہمدردی اور قومی غیرت مجھے خاموش نہیں بیٹھنے دیتی۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّتا ہوں خواہ کوئی سنے یا نہ سنے۔ انجمن میں اس وقت سو ممبر ہیں۔ کوئی ستر ہندو صاحبان ہیں اور تیس مسلمان۔ اُس کے انتظام سے ایک کتب خانہ اور مدرسہ چلتا ہے۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ ایک اتحادی عبادت گاہ بنائی جائے جس کی ایک طرف شِوالہ ہو اور دوسری طرف مسجد۔ ایک یتیم خانے کی بنیاد ڈال دی گئی ہے۔ دونوں قوموں کے یتامیٰ کو داخل کیا جاتا ہے مگر ابھی تک عمارتیں نہیں بن سکیں۔ یہ سب ادارے روپیہ کے محتاج ہیں۔ فقیر نے تو اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ اب قوم کو اختیار ہے کہ اُسے چلائے یا بند کردے۔ کیوں ڈاکٹر صاحب میرا ہبہ نامہ آپ نے تیار کر دیا؟

عرفان۔ کوئی تعطیل آئے تو اطمینان سے آپ کا کام کروں۔

پریم شنکر نے عقیدت مندانہ لہجہ میں کہا۔ سیدصاحب کی ذات قوم کے لیے برکت ہے۔ میں انجمن کے لیے ایک سو روپیہ کی ناچیز رقم پیش کرتا ہوں۔ اور یتیم خانہ کے لیے پچاس من گیہوں۔ پانچ من شکر اور بیس روپے ماہوار۔

ایجاد۔ خدا آپ کو اجر نیک دے۔ اگر اجازت ہو تو جناب کا نام بھی ٹرسٹیوں میں داخل کر لیا جائے۔

پریم۔ میں اس عزّت کا اہل نہیں ہوں۔

ایجاد۔ نہیں جناب! میری یہ التجا آپ کو قبول کرنی ہوگی۔ خدانے آپ کو ایک دردمند دل عطا فرمایا ہے۔ کیوں نہیں آپ لالہ جٹاشنکر مرحوم کے خلف الرشید ہیں جن کی غریب پروری سے کل شہر آسودہ حال تھا۔ یتیم آپ کو دعائیں دیں گے۔ اور انجمن ہمیشہ آپ کی ممنون رہے گی۔

عرفان علی نے جوالا سنگھ سے پوچھا۔ ”آپ کا قیام یہاں کب تک رہے گا؟“

جوالا ۔ کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ آیا تو اس ارادہ سے ہوں کہ بابو پریم شنکر کی خدمت میں زندگی بسر کروں۔ ملازمت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔

عرفان۔ واللہ آپ دونوں صاحبان بڑے زندہ دل ہیں۔ دعا کیجیے کہ خدا مجھے بھی قناعت کی

دولت عطا کرے اور میں بھی آپ صاحبان کی صحبت سے فیضیاب ہوں۔

جوالا۔ (مسکرا کر) ہمارے ملزموں کو بری کرادیجیے۔ تو ہم شب و روز آپ کے لیے دعائیں کریں گے۔

عرفان۔ (ہنس کر) شرط تو ٹیڑھی ہے مگر منظور ہے۔ ڈاکٹر چوپڑا کا بیان اپنے موافق ہوجائے تو بازی اپنی ہے۔

ایجاد۔ اب ذرا ان غریب کی بھی خبر لیجیے۔ میرے محلّہ میں رہتے ہیں۔ کپڑے کی بڑی دُکان ہے۔ ان کے بڑے بھائی ان سے بے رخی سے پیش آتے ہیں اور اُنھیں جیب خرچ کے لیے کچھ بھی نہیں دیتے۔ حساب بھی نہیں دکھلاتے۔ سارا نفع خود ہضم کر جاتے ہیں۔ کل اُنھیں بہت سخت سست کہا جب ان کا نصف حصہّ ہے تو یہ کیوں نہ اپنے حصےّ کا دعویٰ کریں؟ یہ بالغ ہیں۔ اپنا فائدہ نقصان سمجھتے ہیں۔ بھائیوں کی روٹیوں پر نہیں رہنا چاہیے۔ بولو بھائی متھرا داس، بیرسٹر صاحب کہو کیا کہتے ہو۔

متھرا داس۔ (زمین کی طرف دیکھا اور ایجاد حسین کی طرف کنکھیوں سے تاکتے ہوئے) میں یہی چاہتا ہوں کہ بھیاّ سے آپ میری راجی کھوسی کرا دیں۔ کل میں نے اُنھیں گالی دے دی تھی۔ اب وہ کہتے ہیں کہ تو ہی گھر سنبھال، مجھے کوئی واسطہ نہیں، کنجیاں سب پھینک دی ہیں۔ اور دُکان پر نہیں جاتے۔

ایجاد۔ (متھرا داس کی طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر) صاف صاف اپنا مطلب کیوں نہیں کہتے۔ آپ کو ان کا منشا معلوم ہوگیا ہوگا۔ ابھی ناتجربہ کار آدمی ہو، گفتگو کرنے کی تمیز نہیں ہے جبھی تو روز دھکےّ کھاتے ہو۔ ان کا منشا ہے کہ آپ دعویٰ دائر کریں لیکن یہ معاملہ کو طول دینا نہیں چاہتے صرف علاحدہ ہوجانا چاہتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

متھرا۔ (سادگی کے انداز سے) جی ہاں! یہی چاہتا ہوں کہ ان سے میری راجی کھسی ہوجائے۔

منشی رمضان علی محرّر تھے۔ ایجاد حسین متھرا داس کو ان کے کمرے میں لے گئے وہاں خاصہ دفتر تھا۔ کئی آدمی بیٹھے لکھ رہے تھے۔ رمضان علی نے پوچھا۔ ''کتنے کا دعویٰ ہوگا؟''

ایجاد۔ یہی کوئی ایک لاکھ کا۔

رمضان علی نے وکالت نامہ لکھا۔ کورٹ فیس۔ طلبانہ۔ محنتانہ۔ نذرانہ وغیر وغیرہ وصول کیے۔ جو متھرا داس نے ایجاد حسین کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دیے۔ جیسے کوئی کسان پچھتا پچھتا کر دچھنا کے پیسے نکالتا ہے۔ پھر دونوں آدمیوں نے گھر کی راہ لی۔

راستہ میں متھرا داس نے کہا: "آپ نے خواہ مخواہ مجھے بھیّا سے لڑوا دیا۔ سینکڑوں روپے کی چپت پڑگئی۔ اور ابھی کورٹ فیس باقی ہی ہے۔

ایجاد۔ احسان تو نہ مانو گے کہ بھائی کی غلامی سے آزاد ہونے کا انتظام کر دیا۔ نصف دُکان کے مالک بن بیٹھو گے۔ الٹا اور شکایت کرتے ہو۔

(۳۲)

ڈاکٹر پریاناتھ چوپڑا بہت بااخلاق بامروت اور خوش مزاج آدمی تھے۔ علاج میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ نہایت رحم دل واقع ہوئے تھے۔ اگر مریضوں کی سبزی ترکاری، دودھ، مکھن، اوپلے، ایندھن کا ایک حصہ ان کے گھر میں پہنچ جاتا تھا تو یہ راوجی بات تھی۔ ان کے پیشتر بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ انھوں نے اس میں ترمیم کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس لیے اُنھیں کوئی بدنام نہ کرسکتا تھا اور نہ اُنھیں خود ہی اس میں کوئی بُرائی نظر آتی تھی۔ وہ کم تنخواہ والے اہلکاروں سے صرف آدھی فیس لیا کرتے تھے۔ اور انھوں نے اپنی رات کی فیس بھی معمولی ہی رکھی تھی۔ ان کے یہاں سرکاری شفاخانہ سے مفت دوا مل جاتی تھی۔ اس لیے ان کی پریکٹس دیگر ڈاکٹروں سے زیادہ تھی۔ ان وجوہات سے ان کی اچھی خاصی آمدنی ہوگئی تھی۔ تین سال قبل وہ وہاں آئے تھے، تو پیرگاڑی پر چلتے تھے۔ اب ایک فٹن تھی۔ بچّوں کی ہوا خوری کے لیے چھوٹی سیج گاڑیاں تھیں۔ میز، کرسی۔ فرش وغیرہ سب اسپتال ہی کے تھے۔ ملازموں کی تنخواہ بھی اُنھیں اپنے پاس سے نہ دینی پڑتی۔ مگر اتنی کفایت شعاری پر بھی جب وہ اپنی حالت کا مقابلہ ضلع کے سب انجنیئر یا کسی وکلا کی حالت سے کرتے تھے تو اُنھیں کوئی خاص خوشی نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ اُنھیں کبھی کبھی ایسے موقعے ملتے تھے جو ان کی مالی خواہشات کو پورا کرسکتے تھے، مگر ان کی مصلحت اندیشی کبھی اُنھیں بھٹکنے نہ دیتی تھی۔ کالج چھوڑنے پر

اُنھیں کئی سالوں تک اپنے فرائض کو بے خوفی سے انجام دیا۔ مگر جب کئی بار پولیس کے خلاف شہادت دینے پر اُنھیں منہ کی کھانی پڑی تو چیت گئے۔ اب وہ ہمیشہ پولیس کا رخ دیکھ کر کام کرتے تھے۔ تاہم اپنے طبّی معائنہ اور تحقیقات کو پولیس کے تابع رکھنے میں اُنھیں گونہ خلجان ہوتا تھا۔ پس حب غوث خان کی لاش ان کے پاس معائنہ کے لیے بھیجی گئی تو وہ بڑے شش وپنج میں پڑے۔ معائنہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک شخص کا کام ہے ایک ہی وار میں کام تمام ہوا ہے، مگر پولیس کا کہنا تھا کہ یہ ایک جماعت کا کام ہے۔ بے چارے بڑے مخمصے میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک اہم مقدمہ تھا۔ پولیس نے اپنی کامیابی کے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس کی تردید کرنا، اس سے بیر مول لینا تھا۔

اور تجربہ سے ثابت ہوچکا تھا کہ یہ بہت گراں سودا ہے۔ گناہ تھا مگر بے لذّت کئی دنوں پر اسی حیص بیص میں پڑے رہے، مگر عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ اسی درمیان میں ایک روز گیان شنکر ان کے پاس رانی گائتری کا ایک خط اور پانچ سو روپۓ انعام لے کر پہنچے۔ رانی صاحبہ نے ان کی شہرت سن کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا تھا۔ ان سے اطفال کی پرورش کے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب لکھوانا چاہتی تھیں۔ علاوہ بریں اُنھیں اپنا خاندانی معالج بھی مقرر کیا تھا۔ اور ہر ایک "وِزِٹ" (تشریف آوری) کے لیے سو روپے فیس کا وعدہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب باغ باغ ہوگئے۔ گیان شنکر کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولے:۔ "رانی صاحبہ کی اس قدردانی کا کافی شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ مجھے اپنا خادم سمجھیے۔ یہ سب آپ ہی کی مہربانی ہے ورنہ مجھ جیسے ہزاروں ڈاکٹر پڑے ہوئے ہیں۔"

گیان شنکر نے اس کا مناسب جواب دیا۔ اس کے بعد واقعات حاضرہ کے متعلق کچھ گفتگو درپیش ہوئی۔ ڈاکٹرصاحب کا دعویٰ تھا کہ "میں علاج میں آئی، ایم، ایس والوں سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہوں۔ جنھیں ہمہ وان آئی، ایم، ایس والوں نے جواب دے دیا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے اس زندگی میں اس ماتحتی سے نجات پانے کی کوئی امید نہیں۔ میری قسمت میں ولایت کے نوآموز چھوکروں کی غلامی ہی لکھی ہوئی ہے۔"

گیان شنکر نے اس کے جواب میں ملک کی سیاسی حالت کا تذکرہ کیا۔ چلتے وقت انھوں نے بڑی بے لوثی سے پوچھا۔ "لکھن پور والے معاملہ میں آپ نے کیا تجویز کیا

ہے۔ لاش تو آپ کے یہاں آئی ہوگی۔"

پریا۔ جی ہاں! لاش آئی تھی۔ علامات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک شخص کا کام ہے۔ مگر پولیس اس میں کئی آدمیوں کو گھسیٹنا چاہتی ہے۔ آپ سے کیا سکھاؤں، پولیس کو بدظن نہیں کرسکتا، مگر اس طرح بے گناہوں کو پھنسانے سے دل کو سخت نفرت ہوتی ہے۔

گیان۔ ممکن ہے آپ نے علامات سے جو رائے قائم کی ہے وہی قابلِ تسلیم ہو، مگر دراصل یہ قتل کئی آدمیوں کی سازش سے ہوا ہے۔ لکھن پور میرا ہی موضع ہے۔

پریا۔ اچھا! لکھن پور آپ ہی کا موضع ہے، تو یہ کارندہ آپ کا ملازم تھا؟

گیان۔ جی ہاں! اور بڑا ہوشیار اور وفادار۔ گاؤں والوں کو اس سے صرف یہی چڑھ تھی کہ وہ ان سے میل نہ کرتا تھا۔ ہر معاملہ میں وہ صرف میرے ہی نفع ونقصان کرتا تھا۔ یہ اس کی نمک حلالی کی سزا ہے۔ لیکن میں اس واقع کو پولیس کی نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ قتل ہوگیا، اسے ایک آدمی نے کیا یا کئی آدمیوں نے مل کر۔ میرے لیے یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اگر قاتلوں کو قرار واقعی سزا نہ دی گئی تو اس قسم کی وارداتیں آئے دن ہوتی ہی رہیں گی۔ اور زمینداروں کو اپنی جان بچانا مشکل ہوجائے گا۔

مسئلہ کو اس نئی صورت میں پیش کر کے گیان شنکر رخصت ہوئے۔ اگرچہ اس قتل کے بارے میں ڈاکٹرصاحب کی اب بھی وہی رائے تھی لیکن اب یہ گناہ بے لذت نہ تھا۔ پانچ سو روپے انعام۔ سو روپے فیس، ہزار دوہزار روپے سالانہ ملتے رہنے کی امید۔ اس پر پولیس کی خوشنودی الگ۔

اب پس و پیش کی ضرورت نہ تھی۔ اب اگر خوف تھا تو ڈاکٹر عرفان علی کی جرح کا۔ ڈاکٹرصاحب کی طرح مشہور تھی۔ پس پریاناتھ نے اس کے متعلق کئی طبی کتابوں کی خوب ورق گردانی کی اور اپنے موافق چند نکات کھوج نکالے۔ کتنے ہی بے گناہوں کا خون ناحق ہوجائے گا اس کی انھوں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ اس کا اُنھیں خیال ہی نہ آیا۔ ایسے موقعوں پر ہماری نگاہوں میں کتنی تنگی آجاتی ہے۔

دن کے دس بجے تھے۔ ڈاکٹرصاحب کتابوں کی ایک بنڈل لے کر اور فٹن پر سوار

ہو کر کچہری کو راونہ ہوئے۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا۔ جرح میں اُکھڑ جانے کا ڈر لگا ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی مجسٹریٹ نے اُنھیں طلب کیا۔ جب وہ کٹگھرے کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور ملزمین کو اپنی طرف التجا آمیز نگاہوں سے تاکتے دیکھا، تو ان کا دل بے قابو ہوگیا۔ مگر وہ ایک موزی جذبہ تھا آیا اور چلا گیا۔ انھوں نے نہایت واقف کارانہ اور سنجیدہ طریقہ پر اس قتل کے متعلق اپنا بیان دیا۔ علامات سے یہ صرف ایک آدمی کا کام معلوم ہوتا ہے، مگر قاتلوں نے بڑی چالاکی سے کام لیا ہے۔ اس کام میں وہ بڑے ہوشیار معلوم ہوتے ہیں۔ مقتول کی ہلاکت کا سبب کلہاڑی یا گنڈاسا کا وار نہیں ہے بلکہ گلے کا گھونٹنا اور کئی آدمیوں کی شمولیت کے بغیر غوث خان جیسے توانا آدمی کا گلا کبھی نہ گھونٹا جاسکتا تھا۔ مرجانے پر ایک ہی وار سے اس کی گردن کاٹ لی گئی تاکہ یہ ایک ہی شخص کا کام سمجھا جائے۔

عرفان علی کی جرح شروع ہوئی۔

"آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے؟"

"میں لاہور کا ایل، ایم، ایس اور کلکتہ کا ایم، بی ہوں۔"

"آپ کی عمر کیا ہے؟"

"چالیس سال۔"

"آپ کا مکان کہاں ہے؟"

"دہلی"

"آپ کی شادی ہوئی ہے؟ اگر ہوئی ہے تو اولاد ہے یا نہیں۔؟"

"میری شادی ہوگئی ہے اور کئی اولادیں ہیں۔"

"ان کی پرورش میں آپ کا ماہوار کیا خرچ ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر عرفان علی اس سوالات کو ایسی ہمّت کی شان سے پوچھ رہے تھے گویا اسی پر مقدمہ کا دار و مدار ہے۔ ہر سوال کے بعد جوالاسنگھ کی طرف فخر کے ساتھ دیکھتے جاتے تھے۔ گویا ان سے اپنی اس جرح پر داد کے خواہاں تھے۔ لیکن اس آخری سوال پر مجسٹریٹ نے اعتراض کیا۔ "اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

عرفان علی نے متکبرانہ انداز سے جواب دیا "ابھی میرا مطلب ظاہر ہوا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے پریاناتھ سے جرح شروع کی۔ بے چارے پریاناتھ دل میں سہمے جاتے تھے، کہ معلوم نہیں، یہ صاحب مجھے کس جال میں پھنسا رہے ہیں۔

عرفان۔ آپ میرے آخری سوال کا جواب دیجیے۔

پریا۔ میرے پاس اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔

عرفان۔ آپ کے یہاں ماہوار کتنا دودھ آتا ہے اس کی قیمت کیا دینی پڑتی ہے؟

پریا۔ اس کا حساب میرے نوکروں کے پاس رہتا ہے۔

عرفان۔ گھی پر ماہوار کیا خرچ ہوتا ہے؟

پریا۔ میں اپنے نوکروں سے پوچھے بغیر ان خانگی امور کے متعلق سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔

عرفان۔ (مجسٹریٹ سے) میرے سوالوں کے قابلِ اطمینان جوابات ملنے چاہئیں۔

مجسٹریٹ۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان سوالوں سے آپ کا مطلب کیا ہے۔

عرفان۔ میرا مطلب گواہ کی اخلاقی حالت کا پردہ فاش کرنا ہے۔ ان سوالوں سے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بہت اونچے اُصولوں کا آدمی نہیں ہے۔

مجسٹریٹ۔ میں اس سوال کو درج کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

عرفان۔ تو میں بھی جرح کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر بیرسٹر صاحب اجلاس سے باہر نکل آئے۔ اور جوالا سنگھ سے بولے ''آپ نے دیکھا کہ یہ حضرت کتنی بے جا طرفداری کرتے ہیں۔ واللہ میں تو ڈاکٹر صاحب کے لتے اڑا دیتا۔ یہاں ایسی ایسی جرح نہیں کرتے۔ میں صاف ثابت کر دیتا کہ جو آدمی چھوٹی چھوٹی رقموں پر گرتا ہے، وہ ایسے بڑے مقدمے میں بالکل بے لوث نہیں رہ سکتا۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں ججی میں چلنے دیجیے۔ وہاں ان کی خبر لوں گا۔''

اس کے ایک گھنٹہ بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا۔ جملہ ملزمین سشن سپرد ہوئے۔ شام ہوگئی تھی۔ یہ غم نصیب لوگ پھر حوالات چلے۔ سب کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ پریاناتھ کے بیان نے اُنھیں مایوس کر دیا تھا۔ یہ بات ان کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ اتنا بڑا عہدہ دار لالچ کے پھندے میں پڑکر جھوٹ بول سکتا ہے۔ سبھی گردن جھکائے چلے جاتے تھے۔ صرف منوہر رو رہا تھا۔

اتنے میں پریاناتھ کی فٹن سڑک پر سے گزری۔ ملزمین نے اُنھیں نفرت سے دیکھا گویا کہہ رہے تھے۔ "آپ کو بیکس غریبوں پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔" پریاناتھ نے بھی اُنھیں دیکھا۔ آنکھوں میں غیرت کی نمود تھی۔

(۳۴)

جب مقدمہ سشن سپرد ہوا اور گیان شنکر کو کامل یقین ہوگیا کہ اب ملزموں کا بچنا مشکل ہے تو انھوں نے غوث کی جگہ پر فیض اللہ کو مقرر کیا اور خود گورکھ پور چلے گئے۔ یہاں سے گائتری کے کئی خطوط گئے تھے۔ مایاشنکر کو بھی ساتھ لے گئے ودّیا نے بہت کہا کہ میرا جی گھبرائے گا مگر انھوں نے نہ مانا۔

اس ایک ماہ میں گیان شنکر نے وہ مسئلہ حل کر لیا تھا جس پر وہ کئی مہینوں سے غور کررہے تھے۔ انھوں نے وہ طریقہ سوچ لیا تھا جس سے وہ گائتری کے دل تک رسائی پاسکیں۔ اس کی دو صورتیں تھیں ایک مثبت اور دوسرے منفی۔ انھوں نے اول الذکر پر کار بند ہونے کا تہیّہ کرلیا۔ گائتری کے ان مذہبی عقائد کو مٹانا جو کسی قلعہ کی مضبوط دیواروں کی طرح اس کو خواہشات سے محفوظ کیے ہوئے تھے مشکل تھا۔ گیان شنکر ایک بار اپنی اس کوشش میں ناکام ہوچکے تھے۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہی طریقہ اختیار کر کے وہ پھر ناکامیاب نہ ہوں۔ اس کے برعکس دوسرا طریقہ کس قدر آسان تھا۔ ان مذہبی عقائد کو مٹانے کے بجائے اُنھیں مضبوط کیوں نہ بنا دوں۔ عمارت کو منہدم کرنے کے بجائے اسی بنیاد پر کیوں نہ اور اضافہ کردوں؟ پانی کے بہاؤ کا رخ پلٹ دینے کے بجائے اسی بہاؤ کو کیوں اور زیادہ تیز نہ کردوں۔ اس کو اپنا بنانے کے بجائے میں آپ ہی کیوں نہ اس کا ہوجاؤں۔

گیان شنکر نے گورکھ پور جاکر پہلے سے بھی زیادہ مستعدی اور سرگرمی سے کام کرنا شروع کیا۔ دھرم شالہ کا کام ملتوی ہوگیا تھا۔ اس کے ٹھکیداروں سے کام نہ لے کر انھوں نے اسے اپنی ہی نگرانی میں بنوانا شروع کیا۔ اس کے سامنے ہی ایک ٹھاکر دوارے کی بنیاد بھی ڈال دی۔ وہ روزانہ صبح موٹر پر سوار ہو کر گھر سے نکل جاتے اور علاقہ کا دورہ کرکے شام تک واپس آتے۔ کسی کارندے یا ملازم کی مجال نہ تھی کہ ایک کوڑی بھی کھاسکے۔ کسی شحنہ یا چپراسی کی تاب نہ تھی کہ اسامیوں پر کسی قسم کی سختی کرسکے اور نہ کسی اسامی کی یہ

جرأت تھی کہ وہ لگان ادا کرنے میں ایک روز کی بھی تاخیر کرسکے۔ بینک کا کاروبار بھی سرسبز ہونے لگا۔ کسان مہاجنوں کے پھندوں سے آزاد ہونے لگے اور وہ اس قابل ہونے لگے کہ خریداروں کے نرخ پر جنس نہ فروخت کر کے اپنے ہی نرخ پر فروخت کرسکیں۔ گیان شنکر کی یہ خوش انتظامی اور کارپردازی دیکھ کر گائتری دل میں ان کی معتقد ہوتی جاتی تھی۔ وہ مختلف طریقوں سے ان کا صلہ دینے کی کوشش کرتی۔ وڈیا کے لیے انواع واقسام کے تحفے بھیجتی اور مایا پر جان ہی نثار کرتی تھی۔ اس کی سواری کے لیے دو ٹانگھن تھے۔ پڑھانے کے لیے دو ماسٹر۔ ایک صبح کو آتا اور ایک شام کو۔ اس کی خدمت کے لیے دو نوکر الگ سے تھے۔ وہ اسے اپنے سامنے بٹھاکر ناشتہ کراتی۔ خود عمدہ عمدہ کھانے پکا کر اُسے کھلاتی۔ اُسے کہانیاں سناتی اور اُس کی کہانیاں سنتی۔ اُسے آئے دن انعام دیتی رہتی۔ مایا شنکر اپنی ماں کو بھول گیا تھا۔ وہ ایسا فہیم، ایسا شیریں زبان، ایسا منکسر مزاج اور سلیم لڑکا تھا کہ چند ہی روز میں گائتری اُسے دل سے چاہنے لگی۔

گیان شنکر کی زندگی میں ایک خاص تغیر ہوا۔ اب وہ ہر شام کو بھاگوت سنا کرتے دوچار سادھو جمع ہوجاتے۔ دس پانچ لواحقین جمع ہوجاتے۔ محلّے کے دوچار خوش اعتقاد لوگ بھی آبیٹھتے۔ اس طرح ایک چھوٹی موٹی مذہبی مجلس آراستہ ہوجاتی۔ یہاں زیادہ تر کرشن بھگوان کے چرچے ہوتے تھے۔ ان کی داستانیں سنائی جاتی تھیں اور کبھی کبھی کیرتن بھی ہوتا تھا۔ لوگ پریم میں مگن ہوکر رونے لگتے اور سب سے زیادہ آنسو گیان شنکر کی آنکھوں سے نکلتے۔ وہ پریم کے ہاتھ بک چکے تھے۔

ایک روز گائتری نے کہا کہ اب آپ کے یہاں روزانہ کرشن کی کتھا ہوتی ہے اگر پردہ کا انتظام ہوجائے تو میں بھی آیا کروں۔ گیان شنکر نے عقدت مند نگاہوں سے گائتری کو دیکھ کر کہا کہ یہ سب آپ ہی کی صحبت کا فیض ہے۔ آپ ہی نے مجھے یہ بھگتی کا راستہ دکھایا ہے۔ اور میں آپ ہی کو اپنا گرو مانتا ہوں۔ آج سے کئی ماہ پہلے میں مایا موہ میں پھنسا ہوا خواہشات کا بندہ، نفس پرستیوں کا غلام، دنیا کا قیدی تھا۔ آپ نے مجھے بتایا کہ دنیا میں بے لوث ہوکر کیوں کر رہنا چاہیے۔ اتنی صاحب ثروت و دولت ہوکر بھی آپ بیراگن ہیں۔ آپ کی زندگی نے میرے لیے سچّے اپدیش کا کام کیا ہے۔

گائتری گیان شنکر کو علم وفراست کا بحرِ بیکراں خیال کرتی تھی۔ وہ زبردست شخص

جس کے قلم میں یہ طاقت ہو کہ مجھے رانی کا خطاب دلا دے۔ جس کی تقریروں کو سن کر بڑے بڑے انگریز افسر دنگ رہ جائیں۔ جس کے حُسنِ انتظام کی آج کل ضلع میں شہرت ہے۔ وہی شخص میرا اس قدر متقدر ہو۔ اس خیال ہی سے اس کا مغرور دل دیوانہ سا ہوگیا۔ ایسے اعزاز کے موقعوں پر اُسے اپنے مرحوم شوہر کی یاد آجاتی تھی۔ منکسرانہ انداز سے بولی۔ بابوجی۔ یہ سب بھگوان کی دیا ہے۔ اُنھیں نے آپ کو یہ بھگتی دی ہے۔ ورنہ لوگ عمر بھر اپدیش سنتے رہ جاتے ہیں اور ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ کہیں سوامی جی سے آپ کی ملاقات ہوئی ہوتی تو اُنھیں دیکھ کر ہی آپ خوش ہوجاتے۔ وہ دھرم اور پریم کے اوتار تھے۔ میں جو کچھ ہوں اُنھیں کی بنائی ہوئی ہوں۔ جہاں تک ہوسکتا ہے اُنھیں کی ہدایتوں پر عمل کرتی ہوں۔ ورنہ میری کیا حقیقت کہ بھگتی کا آنند پاسکتی۔

گیان۔ مجھے بھی یہی افسوس ہے کہ میں ان مہاتما کے درشن سے محروم رہا جس کے اپدیش میں اتنی تاثیر تھی وہ خود کس قدر باکمال رہا ہوگا۔ مجھے کبھی کبھی خواب میں اس کے درشن مل جاتے ہیں۔ کتنی پاکیزہ صورت ہے۔ چہرہ سے پریم کا اجالا پھیلتا ہوا معلوم ہوتا ہے گویا کرشن بھگوان کے اوتار ہوں۔

دوسرے روز سے پردہ کا بندوبست ہوگیا اور گائتری ہر روز اس کتھا میں شریک ہونے لگی۔ بھگتوں کی تعداد روزبروز بڑھنے لگی۔ کیرتن کے وقت لوگ مست ہوکر ناچنے لگتے۔ گائتری کے دل میں بھی وہی پریم کی لگن پیدا ہوتی۔ یہاں تک کی گیان شنکر کی طبیعت بھی بے قابو ہوجاتی۔ کرشن کے پاکیزہ پریم کی داستان اُن کے دل کو بھی ایک لمحہ کے لیے اُسی پریم سے متاثر کردیتی۔ اس وقت پریم کی روشنی میں اُنھیں اپنے فریب اور اوچھاپن نہایت مکروہ نظر آتا تھا۔ لیکن مجلس کے برخاست ہوتے ہی یہ ہلکی روشنی پھر خود غرضی کی تاریکی میں غائب ہوجاتی تھی۔ کرشن کی بھولی بھالی شرارتیں، ان کی دلکش توتلی باتیں، جسودا کی وہ مادرانہ محبت، گوپیوں کی وہ بے خودی۔ محبت کے وہ رازو نیاز۔ عشق کے وہ ولولے۔ بنسی کی وہ متوالی صدا، ساحل جمنا کی وہ سیر۔ ان داستانوں سے لوگوں کو ایک روحانی مسرت اور وجدانی کیفیت کا احساس ہوتا تھا۔ مادہ پرستوں کی نگاہوں میں یہ داستانیں کتنی ہی شرمناک کیوں نہ ہوں، مگر ان بھگتوں کے دل اِن داستانوں کو سن کر ہی وجد میں آجاتے تھے۔ رادھا اور جسودا کا نام سنتے ہی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

کرشن کے نام میں کیا جادو ہے اس کا احساس ہوجاتا تھا۔

ایک بار بندرابن منڈلی آئی، اور مہینہ بھر تک راس لیلا کرتی رہی۔ سارا شہر دیکھنے کو اُمنڈ آتا تھا۔ گیان شنکر پریم کا مجسمہ بنے ہوئے لوگوں کی خاطر مدارات کرتے تھے۔ چھوٹے بڑے سب کو خاطر سے بٹھاتے تھے۔ عورتوں کے لیے خاص اہتمام تھا۔ یہاں گائتری اُن کا خیر مقدم کرتی اور اُنھیں اچھی طرح بٹھاتی۔ جس دن کرشن کے متھرا جانے کی لیلا ہوئی تماشائیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ جسودا اور نند کی دردانگیز باتیں سن کر حاضرین میں کہرام مچ گیا۔ روتے روتے کتنے ہی بھگتوں کی ہچکیاں بندھ گئیں ادر گائتری تو غش کھا کر گر بڑی۔ ہوش آنے پر اس نے اپنے کو خواب گاہ میں پایا۔ کمرہ میں سناٹا تھا۔ صرف گیان شنکر کھڑے اُسے پنکھا جھل رہے تھے۔ گائتری پر اس وقت ایک ایسا تھکان تھا جس کے ہونے پر انسان تھکے ہوئے مسافر کی طرح بیتاب ہو کر درخت کے سایہ کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کا دل پاکیزہ محبت سے معمور ہو رہا تھا۔ اُس نے گیان شنکر کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور پھر طفلانہ معصومیت کے ساتھ اُن کی گود میں سر رکھ کر خواہش مندانہ لہجہ میں کہا۔ ”مجھے برندابن لے چلو۔“

تیسرے روز راس لیلا ختم ہوئی۔ اُسی روز گیان شنکر گائتری کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے برندابن کو روانہ ہوئے۔

(۳۴)

سشن جج کے اجلاس میں ایک ماہ سے مقدمہ چل رہا ہے۔ ملزموں نے پھر صفائی دی۔ آج منوہر کا بیان تھا۔ اجلاس میں ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ منوہر نے ایک بیباکانہ استقلال کے ساتھ سارے واقع کو اول سے آخر تک بے کم و کاست بیان کیا۔ اور اگر پبلک کے ہاتھوں میں فیصلہ ہوتا۔ تو اس وقت دیگر ملزمین یقیناً بے داغ چھوٹ جاتے۔ مگر عدالت ضابطہ اور قانون کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ جان کر بھی انجان بننے پر مجبور تھی۔ منوہر کے آخری فقرے بڑے پُر معنی تھے۔ سرکار ماجرا یہی ہے جو میں نے آپ سے اَرج کیا میں نے گوس کھاں کو اسی کلھاڑی سے اور اُنھیں ہاتھوں سے مارا۔ کوئی میرا ساتھی میرا صلاح کار میرا مددگار نہیں تھا۔ اب آپ کو اکھتیار ہے۔ چاہے سارے گاؤں کو پھانسی پر چڑھادیں۔ چاہے کالے پانی بھیج دیں۔ چاہے چھوڑدیں۔ پھیجو۔ بسیسر۔ دروگا نے جو کچھ

کہا ہے۔ وہ سب جھوٹ ہے دروگا جی کی بات تو میں نہیں چلاتا۔ پر سرکار پھیجو اور بسیسر کو اپنے گھر پر بلائیں اور دلاسا دیں کہ پولیس تمھارا کچھ نہ کرسکے گی۔ تو میرے سچ جھوٹ کی پرکھ ہوجائے۔ اور میں کیا کہوں۔ ان لوگوں کا کاٹھ کا کلیجہ ہوگا جو اتنے گریبوں کو بے کسور پھانسی پر چڑھوائے دیتے ہیں۔ بھگوان جھوٹ سچ سب دیکھتے ہیں۔ بسیسر اور پھیجو کی تو تھوڑی اَوکات ہے۔ اور دروگا جی جھوٹ کی روٹی کھاتے ہیں۔ پر ڈاگدر اتنے بڑے آدمی اور ایسے بِدوان ہوکر کیسی جھوٹی گنگا بَہانے لگے اس کا مجھے اچرج ہے۔ اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ گریبوں کا نصیبا ہی کھوٹا ہے۔ کہ بِنا اپرادھ کیے ہی پھانسی پاتے ہیں۔ اب سرکار سے اور پنچوں سے یہی بنتی ہے کہ تم اس گھڑی نیائے کے آسن پر بیٹھے ہو۔ اپنے انصاپھ سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردو۔

عدالت برخاست ہوئی۔ یہ دُکھیارے حوالات چلے۔ اور سبھوں نے تو دل کو سمجھا لیا تھا کہ بھاگ میں جو کچھ بدا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ مگر دُکھرن بھگت کی چھاتی پر سانپ لوٹتا رہتا تھا۔ اسی کے دل میں رہ رہ کر یہ تحریک پیدا ہوتی تھی کہ موقع ملے تو منوہر کو خوب اڑے ہاتھوں لوں۔ مگر مجبور تھا۔ کیونکہ منوہر سب سے الگ رکھا جاتا تھا۔ ہاں وہ بلراج کو طعنے دے دے کر اپنے دل کا بخار نکالتا رہتا تھا۔ آج منوہر کا بیان سن کر اسے اور بھی چڑھ ہوئی۔ جب چڑیاں کھیت چن گئیں۔ تو یہ ایک ہانک لگانے چلے ہیں۔ اس گھڑی عقل کہاں چلی گئی تھی۔ جب ایک جرا سی بات پر کلہاڑا باندھ کر گھر سے چلے تھے؟ اس وقت راستہ میں اسے منوہر پر اپنا غصہ اتارنے کا موقع مل گیا۔ بولے:۔ آج کیا جھوٹ موٹھ کی بکواد کر رہے تھے۔۔ آدمی کو تیر چلانے کے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے کہ یہ کس کو لگے گا۔ جب تیر کمان سے نکل گیا تو پھر پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ تمھارے کارن سارا گاؤں چوپٹ ہوگیا۔ اناتھ لڑکوں اور عورتوں کی کون سُدھ لینے والا ہے؟ بے چارے روٹیوں کو ترستے ہوں گے۔ تم نے مارا سارے گاؤں کو ملیامیٹ کر دیا۔

یہ غم منوہر کو خود ہی ہردم ستاتا رہتا تھا۔ غوث خان کو قتل کرتے وقت بھی اسے یہی فکر تھی۔ اس لیے اس نے خود تھانہ میں جاکر اپنے جرم کا اقبال کرلیا تھا۔ گاؤں کو آفت سے بچانے کے لیے اس کے کیے جو کچھ ہوسکتا تھا وہ اس نے کیا اور اُسے پورا یقین تھا کہ چاہے مجھے اپنے فعل پر کتنا ہی افسوس ہو رہا ہو مگر اور لوگ مجھے صرف معافی کے

قابل ہی نہ سمجھتے ہوں گے۔ بلکہ مجھ سے ہمدردی بھی رکھتے ہوں گے۔ مجھے جلانے کے لیے تو اندر کی آگ کیا کم ہے۔ کہ اوپر سے بھی تیل چھڑکا جائے؟ وہ دُکھرن کی یہ جگر خراش باتیں سن کر بلبلا اٹھا جیسے پکے ہوئے پھوڑے میں ٹھینس لگ جائے۔

آج ملزموں کے لیے پریم شنکر نے جیل کے داروغہ کی اجازت سے کئی اچھے اچھے کھانے تیار کرا کے بھیجے تھے۔ وہ اپنے اعلیٰ اصولوں کے خلاف جیل کے ادنیٰ ملازموں کی بھی دلجوئی اور خوشامد کیا کرتے تھے۔ تاکہ وہ ملزموں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ زندگی کے تجربات نے اُنھیں بتلا دیا تھا کہ اصولوں کی بہ نسبت انسان زیادہ قابلِ عزت ہے۔ اور لوگوں نے تو جی بھر کر کھانا کھایا مگر منوہر اس وقت دل کی جلن سے بے چین تھا۔ کھانوں کی رغبت انگیز خوشبو بھی اس کی اشتہا کو متحرک نہ کر سکی۔ آج وہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ جنھیں اب تک دل ہی سنتا تھا۔ ''تمھارے کارن سارا گاؤں مٹیامیٹ ہوگیا۔ تم نے سارے گاؤں کو چوپٹ کردیا'' ہائے یہ کلنک میرے ماتھے پر سدا کے لیے لگ گیا۔ اب یہ داغ کبھی نہ چھوٹے گا۔ جو ابھی بچے ہیں وہ مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے۔ ان کے بچے مجھے گاؤں کا دشمن سمجھیں گے۔ جب مردوں کے یہ خیال ہیں۔ جو سب باتیں جانتے ہیں۔ جنھیں بخوبی معلوم ہے کہ میں نے گاؤں کو بچانے کے لیے اپنی طرف سے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ اور جو یہ اندھیر ہو رہا ہے۔ وہ دنوں کا پھیر ہے۔ تو بھلا عورتیں کیا کہتی ہوں گی۔ جو بے سمجھ ہوتی ہیں۔ بے چاری بلاسی گاؤں میں کسی کو منہ نہ دکھا سکتی ہوں گی اس کا تو گھر سے نکلنا بھی مشکل ہوگا۔ اور کیوں نہ کہیں؟ ان کے سر پر بیت رہی ہے تو کہے گا کون؟ ابھی تو اگہن کی فصل کی وجہ سے گھر میں کھانے کو ہوگا۔ مگر کھیت تو بوئے نہ گئے ہوں گے۔ چیت میں جب ایک دانہ بھی نہ پیدا ہوگا۔ اور بال بچّے دانہ دانہ کو روئیں گے۔ تب ان کی کیا حالت ہوگی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کمبل میں کھٹمل ہوگئے ہیں۔ نوچے ڈالتے ہیں۔ اور یہ رونا سال دو سال کا نہیں ہے۔ کہیں سب کالے پانی بھیج دیے گئے۔ تو جنم بھر کا رونا ہے کادرمیاں کا لڑکا تو گھر سنبھال لے گا۔ پر اور سب مٹی میں مل جائیں گے۔ اور یہ سب میری کرنی کا پھل ہے۔

سوچتے سوچتے منوہر کو جھپکی آگئی اس نے خواب میں دیکھا۔ کہ ایک وسیع میدان میں ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ پھانسی کھڑی ہے۔ اور مجھے پھانسی پر چڑھایا جا رہا ہے ہزاروں

آنکھیں میری طرف نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ چاروں طرف سے یہی آواز آرہی ہے کہ اس نے سارے گاؤں کو چوپٹ کیا۔ پھر اُسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ میں مرگیا ہوں۔ اور کتنے ہی بھوت پشاچ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ اُسی نے ہمیں دانہ دانہ کو ترسا کر مار ڈالا ہے۔ یہ پاپی ہے۔ اُسے پکڑ کر آگ میں جھونک دو۔ یکایک منوہر کے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی۔ آنکھیں کھل گئیں کمرہ میں خوب اندھیرا تھا۔ لیکن جاگنے پر بھی اُنھیں بھوتوں کی ڈراؤنی صورتیں اس کے چاروں طرف منڈلاتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ منوہر کا سینہ زور سے دھڑک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ کہ باہر نکل جاؤں۔ مگر دروازے بند تھے۔

دفعتاً منوہر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کیا میں یہی سب دیکھنے اور سننے کے لیے زندہ رہوں؟ سارا گاؤں سارا دیس مجھ سے نفرت کر رہا ہے۔ بلراج بھی دل میں مجھے گالیاں دے رہا ہوگا۔ اس نے مجھے کتنا سمجھایا۔ لیکن میں نے نہ مانا۔ لوگ کہتے ہوں گے کہ سارے گاؤں کو بندھوا کر مشٹنڈا اب بھی بنا ہوا ہے۔ اسے ذرا بھی غیرت نہیں ہے۔ سر پٹک کر مر کیوں نہیں جاتا؟ بلراج کو بھی چاروں طرف سے طعنے ملتے ہوں گے اور اُنھیں سن سن کر وہ دل میں کٹ جاتا ہوگا۔ ارے بھگوان یہ کیا اُجالا ہے؟ نہیں اُجالا نہیں ہے۔ کسی پشاچ (بھوت) کی لال لال آنکھیں ہیں! میری ہی طرف لپکا آرہا ہے۔ یا بھگوان کیا کروں؟ منوہر کی پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ یہ لال آنکھیں ہر لحظہ اس کے قریب آتی جاتی تھیں۔ وہ نہ تو ادھر دیکھ ہی سکتا تھا۔ اور نہ ادھر سے آنکھ ہی ہٹا سکتا تھا۔ گویا کسی پلید طاقت نے اس کی آنکھوں کو بندھ دیا ہو۔ ایک لمحہ کے بعد منوہر کو ایک کے بجائے کئی آنکھیں دکھائی دینے لگیں۔ نہیں جلتی ہوئی سرخ آنکھوں کا ایک غول ہے۔ جسم نہیں۔ سر نہیں۔ کوئی عضو نہیں۔ صرف مشتعل آنکھیں ہیں۔ جو میری طرف ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح تیزی سے چلی آرہی ہیں۔ ایک لمحہ اور گزرا۔ یہ آنکھوں کا غول جسم کے ساتھ نظر آنے لگا اور پھر غوث خان کی زخمی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ یکایک باہر سے زور کے دھکے کی آواز آئی۔ منوہر بدحواس ہوکر پشت کی دیوار کی جانب بھاگا۔ مگر ایک ہی قدم۔ دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا اور سر میں چوٹ آگئی۔ پھر اُسے معلوم ہوا کہ کوئی دروازہ کا قفل کھول رہا ہے۔ پھر کسی نے پکارا "منوہر منوہر"۔ منوہر نے آواز پہچانی جیل کا داروغہ تھا۔ اس کی

جان میں جان آئی۔ کڑک کر بولا۔ ہاں صاحب جاگتا ہوں۔ بھوتوں کی دنیا سے نکل کر وہ پھر ٹھوس دنیا میں آگیا۔ اُسے اب آنکھوں کے غول کا بھید معلوم ہوا۔ یہ دواروغہ کی لالٹین کی روشنی تھی جو کواڑ کے دروازوں سے کوٹھری میں آرہی تھی۔ اسی معمولی سی بات نے اسے اتنا خوف زدہ کردیا تھا۔ داروغہ آج گشت کرنے نکلا تھا۔

داروغہ کے چلے جانے پر منوہر کچھ مطمئن ہوگیا۔ واہمہ کو سکون ہوا۔ مگر تحقیر جو بدنامی کے خیالات نے پھر آگھیرا۔ سوچنے لگا۔ کہ ایک وہ ہیں جو اُجڑے ہوئے گاؤں کو آباد کرتے ہیں۔اور جن کا جس سنسار گاتا ہے۔ ایک میں ہوں جس نے گاؤں کو اُجاڑ دیا۔ اب کوئی سویرے میرا نام نہ لے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سبھی کالے پانی جائیں گے۔ ایک بھی نہ بچے گا۔ ابھی نہ جانے کتنے دن یہ معاملہ چلے گا۔ مہینہ بھر لگے۔ دومہینے لگ جائیں۔ اتنے دنوں تک میں سب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہوں گا۔ لوگ مجھے کوسیں گے۔ گالیاں دیں گے۔ آج دُکھرن نے کہہ سنایا۔ کل کوئی اور طعنے دے گا۔ کادر کھاں کو بھی قید میں رہنا اکھرتا ہی ہوگا۔ اور تو اور کہیں بلراج بھی نہ کھل پڑے۔ ہائے مجھے اس کی جوانی پر بھی ترس نہ آیا۔ میرا لال میرے ہی ہاتھوں...... میں اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہی ہاتھوں...... ہائے بھگوان اب یہ دکھ نہیں سہا جاتا۔ پھانسی ابھی نہ جانے کب ہوگی؟ کون جانے کہیں سب کے ساتھ میرا بھی ڈامل ہوجائے۔ تب تو مرتے دم تک ان لوگوں کے جلی کٹی باتیں سننی پڑیں گی۔ بلراج تجھے کیسے بچاؤں؟ کون جانے حاکم یہی فیصلہ کرے کہ یہ جوان ہے۔ اسی نے کلھاڑا مارا ہوگا۔ ہائے بھگوان! تب کیا ہوگا؟ کیا اپنی ہی آنکھوں سے یہ...... نہیں ایسے جینے سے مرنا ہی اچھا۔ نکتا جیا بُرے حوال۔ بس ایک ہی اُپائے ہے۔ ہاں!

(۳۵)

فیض اللہ خان کا غوث خان کی جگہ مقرر ہونا گاؤں والوں کے زخم پر نمک چھڑکنا تھا۔ پہلے ہی دن سے گاؤں کے لوگ اس سے احتراز کرنے لگے اور فیضو نے اس دشمنی کی آگ کو فرو کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ اب وہ مسلم موضع کے مختار کُل تھے۔ ان کا حکم ہی قانون تھا۔ کسی کو چوں چرا کی مجال نہ تھی۔ گاؤں کا دودھ۔گھی۔ اُپلے۔ لکڑی۔ گھاس۔ پیال۔ کدو۔ کھڑے۔ ہل بیل سب ان کے تھے۔ جو اختیارات غوث خاں کو مرتے

دم تک نہ حاصل ہوسکے وہ حسنِ اتفاق سے فیض اللہ کو اول ہی روز سے حاصل ہوگئے۔ تصرف وتشدد کے میدان میں اب ان کے گھوڑے کو کسی ٹھوکر کا خوف نہ تھا۔ پہلے کرتار سنگھ کی جانب سے کچھ اندیشہ تھا۔ مگر ان کی مصلحت بالآخر کرتار کے تعصبات پر غالب آئی۔ وہ اب ان کا فرماں بردار خادم اور دلی خیرخواہ تھا۔ وہ اب گلا پھاڑ پھاڑ کر رامائن پڑھتا۔ اس نے اب تمام گاؤں کے اینٹ پتھر جمع کرکے چوپال کے سامنے ڈھیر لگادیے۔ اور اُن پر گھڑوں پانی چڑھانے لگا۔ گھنٹوں صندل رگڑتا۔ گھنٹوں بھنگ گھونٹتا۔ کوئی مزاحمت کرنے والا نہ تھا۔ فیض اللہ خاں ہر روز صبح کو ٹانگھن پر سوار ہو کر گاؤں کا گشت کرتے۔ کرتار اور بندا مہاراج لٹھ لیے اُن کے پیچھے پیچھے چلتے۔ جو کچھ نوچ کھسوٹے مل جاتا وہ لے کر واپس آتے تھے۔ یوں تو سارا گاؤں ان کے ظلم وستم سے نالاں تھا۔ مگر منوہر کے گھر ان کی خاص نوازش تھی۔ نومبر ہی میں بلاسی پر بقایا لگان کی نالش ہوئی اور اس کے سارے جانور قرق ہوگئے۔ فیضو کو یقینِ کامل تھا۔ کہ اب کے چیت میں مالگذاری تو وصول ہوگی نہیں۔ سبھوں پر بے دخلیاں دائر کردوں گا۔ اور ایک ہی وار میں سب کو سمیٹ لوں گا۔ مسلّم موضع کو بے دخل کردوں گا آمدنی فوراً دگنی ہوجائے گی۔ مگر اتنے ہی سے اُنھیں تسکین نہ ہوتی تھی۔ ڈانٹ پھٹکار گالی گلوچ کے بغیر ان کا رعب جمنا مشکل تھا۔ پس قاعدگی کے ساتھ یہ کام کیا جانے لگا۔ بلاسی مارے خوف کے گھر سے نکلتی ہی نہ تھی۔ اس کی ربیع کی فصل کھیت میں کھڑی خشک ہو رہی تھی۔ پانی کون دے؟ نہ بیل اپنے تھے۔ اور نہ کسی سے مانگنے کا منہ تھا۔

ایک روز شام کے وقت بلاسی اپنے دروازہ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ یہی اس کا معمول تھا۔ منوہر کی خودکشی کی خبر اُسے کئی روز پہلے مل چکی تھی۔ اُسے اپنے خاندان کی بربادی کا اتنا صدمہ نہ تھا جتنا اس بات کا کہ کوئی اس کی بات پوچھنے والا نہ تھا۔ جسے دیکھیے اُسے جلی کٹی سناتا تھا۔ کوئی اس کے گھر نہ آتا جاتا تھا۔ اگر وہ بیٹھے بیٹھے اکتا کر کسی کے گھر چلی جاتی تو وہاں بھی اُسے ذلیل ہونا پڑتا۔ وہ گاؤں کی ناگن سمجھی جاتی تھی۔ جس کے زہر نے سارے گاؤں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اور تو اور۔ اس کی بہو بھی اُسے طعنے دیتی تھی۔ یکایک اس نے سنا کہ سکھو چودھری اپنے مندر میں آکر بیٹھے ہیں۔ وہ فوراً اپنے مندر کی طرف چلی۔ وہ ہمدردی کی بھوکی تھی۔ سکھو اس واقعات کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ یہ

جاننے کی اُسے بڑی خواہش تھی۔ اُسے اُمید تھی کہ سکھوؔ ضرور غیرجانبدارانہ طریقہ پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ جب وہ مندر کے قریب پہنچی۔ تو گاؤں کی کتنی ہی عورتیں اور بچے وہاں جمع تھے۔ سکھو کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ سر پر ایک کنٹوپ تھا اور بدن پر ایک رام نامی چادرا۔ بہت اداس اور دکھی معلوم ہوتے تھے۔ عورتیں ان سے غوث خان کے قتل کا تذکرہ کررہی تھیں۔ منوہر کی خوب ہی "لے دے" ہو رہی تھی۔ بلاسی مندر کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گئی۔ کہ اتنے میں سکھوؔ نے اُسے دیکھا اور کہا۔ آؤ بلاسی آؤ بیٹھو۔ میں تمھارے پاس آپ ہی آنے والا تھا۔

بلاسی۔ تم توکُسل سے رہے؟

سکھوؔ۔ جیتا ہوں۔ بس یہی کُسل ہے۔ جیل سے چھوٹا تو بدری ناتھ چلا گیا۔ وہاں سے جگن ناتھ ہوتا ہوا چلا آتا ہوں بدری ناتھ ایک مہاتما کے درشن ہوگئے۔ ان سے گورومنتر بھی لے لیا۔ اب مانگتا پھرتا ہوں گرہستی کے جنجال سے چھوٹ گیا۔

بلاسی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ یہاں کا حال تو تم نے سنا ہی ہوگا؟

سکھوؔ۔ ہاں جب سے آیا ہوں وہ چرچا ہو رہا ہے۔ اور اسے سن کر مجھے تم پر ایسی سردھا (عقیدت) ہوگئی ہے کہ تمھاری پوجا کرنے کو جی چاہتا ہے تم چھترانی ہو۔ اہیر کی کنیا ہو کر بھی تم چھترانی ہو۔ تم نے وہی کیا جو چھترانیاں کیا کرتی ہیں۔ منوہر بھی چھتری ہے اس نے وہی کیا جو چھتری کیا کرتے ہیں۔ وہ بیر آتما ہے۔ اس مندر میں اب اس کی سمادھی بنے گی اور اس کی پوجا ہوگی۔ اس میں ابھی تک کسی دیوتا کی استھاپنا نہیں ہوئی ہے۔ اب اسی بیر مورت کی استھاپنا ہوگی۔ اس نے گاؤں کی لاج رکھ لی۔ استری کی مرجاد رکھ لی۔ یہ سب چھدر(حقیر) آتمیں بیٹھی اسے برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ اس نے گاؤں کا ستیاناس کر دیا ان میں لاج نہیں ہے۔ اپنی مرجاد کا کچھ کھیال. نہیں ہے۔ اس نے گاؤں کا ستیاناس نہیں کیا بلکہ اسے بیرگت دے دی۔ اس نے اُودھار کر دیا۔ استریوں کی رچھا کرنی پرشوں کا دھرم ہے منوہر نے اپنے دھرم کو نباہا۔ اسے برا وہی کہہ سکتا ہے جس کی آتما مرگئی ہے جو بے حیا ہو گیا ہے۔ گاؤں کے دس پانچ آدمی پھانسی چڑھ جائیں تو کوئی چنتا نہیں یہاں ایک ایک استری کے پیچھے لاکھوں سرکٹ گئے ہیں۔ سیتا کے پیچھے راون کا راج ناس ہوگیا۔

دروپدی کے پیچھے اٹھارہ لاکھ جودھا مرمٹے۔ اِجّت کے لیے دس پانچ جانیں چلی جائیں۔ تو کیا بڑی بات ہے۔ دھنیہ ہے منوہر تیرے ہیاؤ کو۔ تیرے جیوٹ کو۔ تیرے کلیجے کو۔

سکھو کا ایک ایک لفظ بہادرانہ جوش میں ڈوبا ہوا تھا۔ بلاسی کے دل میں وہ گدگدی ہو رہی تھی۔ جو اپنی تعریف سن کر ہو سکتی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ سکھو کے قدموں پر سر رکھ دے مگر اور عورتیں سکھو کی طرف تعجب سے دیکھ رہی تھیں کہ یہ کیا بکتا ہے۔

ذرا دیر بعد سکھو نے بلاسی سے پوچھا۔ کھیتی باڑی کا کیا حال ہے؟

بلاسی کے کھیت سوکھ رہے تھے۔ پر اپنی مصیبت کی داستان سنا کر وہ سکھو کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بولی۔ دادا تمھاری دَیا سے کھیتی اچھی ہوگئی ہے۔ کوئی چنتا نہیں ہے۔

کئی اور سادھو آگئے جو سکھو کے رفیق معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے دھونی جلائی اور چرس کا دم لگانے شروع کیے۔ گاؤں کے لوگ بھی ایک ایک کر کے وہاں سے چلنے لگے۔ جب بلاسی جانے لگی تو سکھو نے کہا۔ بلاسی میں پہر رات رہے یہاں سے چلا جاؤں گا گھومتا گھومتا کئی مہینے میں آؤں گا۔ تب یہاں مورت کی استھاپنا ہوگی۔ اس جگیہ کے لیے بھیک مانگ کر روپے جمع کرنا ہیں۔ تمھیں کسی بات کی تکلیپھ ہو تو کہو۔

بلاسی۔ نہیں دادا تمھاری دَیا سے کوئی تکلیپھ نہیں ہے۔

سکھو تو علیٰ الصباح چلے گئے۔ مگر بلاسی پر ان کی باتوں کا خاص اثر پڑا۔ اب وہ کسی غریب بیکس کی طرح گاؤں والوں کے طعنے نہ سنتی اور نہ کسی کو اتنی بے خوفی سے اس پر طعنہ زنی کرنے کی جرأت ہی ہوتی تھی۔ اتنا ہی نہیں۔ بلاسی کی بات چیت۔ چال ڈھال سے خودداری نمایاں تھی۔ کبھی کبھی وہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتی۔ پڑوسیوں سے کہتی۔ ''تم اپنی لاج بیچ کر اپنی چمڑی کو بچاؤ۔ یہاں تو اِجّت کے پیچھے جان تک دے دیتے ہیں۔ میں بدھوا ہوگئی تو کیا۔ گھر ستیاناس ہوگیا تو کیا۔ کسی کے سامنے آنکھ تو نیچی نہ ہوئی۔ اپنی لاج تو رکھی''۔ شوہر کی وفات اور بیٹے کی جدائی کا غم اب اتنا ناقابلِ برداشت نہ تھا۔

ایک دن اس نے اتنی ڈون کی لی کہ اس کی بہو سے نہ رہا گیا۔ چڑھ کر بولی۔ ''اماں ایسی باتیں کر کے گھاؤ پر نُون نہ چھڑکو۔ تم سب سکھ بلاس کرچکی ہو اب بدھوا ہو ہی گئیں تو کیا۔ ان دُکھیاریوں سے پوچھو۔ جن کی ابھی پہاڑ سی عمر پڑی ہے۔ جنھوں

نے ابھی جِندگانی کا کچھ سُکھ نہیں جانا۔ اپنی مرجاد سب کو پیاری ہوتی ہے۔ پر اس کے لیے جنم بھر کا رنڈاپا سہنا کٹھن ہے۔ تم کیا۔ آج نہیں کل رانڈ ہوتیں۔ تمھارے کھیلنے کھانے کے دن ہوتے تو دیکھتی کہ اپنی لاج کو کتنا پیارا سمجھتی ہو۔

بلاسی تلملا اٹھی۔ اُس دن سے بہو سے بولنا ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ بلراج کا بھی ذکر نہ کرتی۔ جس بیٹے پر جان دیتی تھی۔ اس کے نام سے بھی نفرت کرنے لگی۔ بہو کے ان ناملائم الفاظ نے اس مادرانہ محبت کا خاتمہ کردیا جو آج پچیس سال سے زندگی کی معاون بنی ہوئی تھی۔ کچھ دنوں تک تو اس نے سکوت سے اپنے غصہّ کا اظہار کیا۔ لیکن اس نسخہ کو کچھ زیادہ کارگر نہ ہوتے دیکھ کر اس نے بہو کی بدگوئی کرنی شروع کردی۔ گاؤں میں کتنی ہی ایسی بوڑھی عورتیں تھیں جو اپنی بہوؤں سے جلا کرتی تھیں۔ اُنھیں بلاسی سے ہمدردی ہوگئی۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ بلاسی کے بروٹھے میں روزانہ ساسوں کی ایک سبھا لگتی۔ اور وہاں بہوؤں کے دکھڑے روئے جاتے۔ ادھر بہوؤوں نے بھی اپنی حفاظت کے لیے ایک سبھا قائم کی۔ اس کی روزانہ نشست دُکھرن بھگت کے گھر پر ہوتی۔ بلاسی کی بہو اس سبھا کی محرک تھی۔ اس طرح ہردو جماعتوں میں مخالفت بڑھنے لگی۔ یہاں کی باتیں کسی نہ کسی طرح وہاں جاپہنچتیں۔ اور وہاں کی باتیں بھی کسی جاسوس کے ذریعہ یہاں آجاتیں۔ ان کے جواب دیے جاتے۔ اور جواب الجواب بھی ملتے۔ روزانہ یہی سلسلہ قائم رہتا۔ اس سوال و جواب میں جو دلکشی تھی وہ اپنی مصیبت اور تکلیف پر آنسو بہانے میں کہاں تھی؟ اس طعن آمیز جنگ میں ایک زندہ لطف تھا۔ نفرت بھری سرگوشیاں غم رُبائی میں نغمۂ شیریں سے زیادہ موثر ہوتی ہیں۔

یہاں تو یہ حال تھا۔ ادھر فصل کھیتوں میں خشک ہورہی تھی۔ میاں فیض اللہ خشک کھیتوں کو دیکھ کر شگفتہ ہوجاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے چیت کا مہینہ آگیا۔ مالگذاری کا تقاضا ہونے لگا۔ گاؤں کے بچے ہوئے لوگ اب چیتے۔ وہ بھول سا گئے تھے۔ کہ مالگذاری بھی دینی ہے۔ افلاس میں انسان عموماً تن بہ تقدیر ہو جاتا ہے۔ فیض اللہ نے سختی کرنی شروع کی۔ کسی کو چوپال کے سامنے دھوپ میں کھڑا کرتے۔ کسی کی مشکیں بندھوا کر پٹواتے۔ بیکس عورتوں کے ساتھ اور بھی وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ کسی کی چوڑیاں توڑی جاتیں۔ کسی کے سر کے بال نوچے جاتے۔ ان مظالم کو روکنے والا اب کون تھا؟ ستیا گرہ میں تشدد کو

مغلوب کرنے کی طاقت ہے۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ فیضو جانتا تھا کہ پتھر کو دبانے سے تیل نہ نکلے گا۔ لیکن ان سختیوں سے اس کا مطلب گاؤں والوں کا گھمنڈ توڑنا تھا۔ ان بدکرداریوں سے اس کو ایک خاص مسرت حاصل ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ جیٹھ کا مہینہ بھی گزرا۔ مگرایک کوڑی لگان نہ وصول ہوا۔ کھیت میں اناج ہوتا۔ تو کوئی نہ کوئی مہاجن کھڑا ہوجاتا مگر سوکھی کھیتی کو کون پوچھتا ہے؟ بالآخر گیان شنکر نے بے دخلیاں دائر کردینے کا تہیہ کرلیا۔ اسی کی دیر تھی۔ نالش ہوگئی۔ مگر گاؤں میں روپیوں کا کوئی بندوبست نہ ہوسکا۔ عذرداری کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ سب کو یقین تھا کہ ایک طرفہ ڈگری ہوگی۔ اور سب کے سب بے دخل ہوجائیں گے۔ فیضو اور کرتار بغلیں بجاتے پھرتے تھے۔ اب میدان مارلیا ہے! خان صاحب گئے تو کیا صاف ہوگیا۔ کوئی دخیل کار آسامی رہے گا ہی نہیں۔ جتنا چاہیں زمین کا لگان بڑھاسکتے ہیں۔ ہزار کی جگہ دو ہزار وصول ہوں گے۔ اس کار گزاری کا سہرا میرے سر بندھے گا۔ دور دور تک میرا نام ہوجائے گا۔ ان خیالات سے فیضو میاں پھولے نہ سماتے تھے۔

آخر فیصلہ کی تاریخ آگئی۔ کرتار سنگھ نے ململ کا ڈھیلا کرتا اور گلابی پگڑی نکالی۔ جوتے میں کڑوا تیل لگایا۔ بال بنوائے۔ اور ماتھے پر بھبھوت ملی۔ فیض اللہ خاں نے چار جامہ کی مرمت کرائی۔ اپنی سیاہ اچکن اور سفید پگڑی نکالی۔ بندامہاراج نے بھی دھلی ہوئی گاڑھے کی مرضائی اور گیرو میں رنگی ہوئی دھوتی پہنی۔ بیگاریوں کے سر پر کمبل اور فرش وغیرہ لادے گئے۔ اوراس طرح تینوں آدمی کچہری جانے کو تیار ہوئے۔ صرف خاں صاحب کی نماز کی دیر تھی۔

مگر گاؤں میں ذرا بھی ہل چل نہ تھی۔ مردوں میں قادر کے چھوٹے لڑکے کے سوا اور سب ادنیٰ ذاتوں کے لوگ تھے۔ جنھیں عزت یا ذلت کا کوئی خیال نہ تھا۔اور بے چارہ قانونی باتوں سے ناواقف تھا۔ جھپٹ کے دل میں ایسا خوف سمایا ہوا تھا کہ وہ گھر سے باہر ہی نہ نکلتے تھے۔ رہی عورتیں۔ وہ بے چاری قانون کی باتیں کیا جانیں؟ آج بھی حسبِ معمول ان کے دونوں اکھاڑے جمع ہوئے تھے۔ بوڑھیاں کہتی تھیں کہ کھیت نکل جائیں ہماری بلا سے۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ رہے بھی تو ہمارے کس کام آئیں گے؟ ان رانیوں کا گھمنڈ تو چور ہوجائے گا۔ یہاں تک کہ بلاسی بھی جو ان تمام

پریشانیوں کی بنیاد تھی آج بے فکر بیٹھی ہوئی تھی۔ فریقِ ثانی کو آج التوائے جنگ کی درخواست کی ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن کچھ تو غرور اور کچھ درخواست کی نامنظوری کا خیال اُنھیں اس ضرورت کے اظہار سے باز رکھتا تھا۔

آٹھ بجے خاں صاحب کی نماز پوری ہوئی۔ ادھر بندا مہاراج نے چربن چبا کر تماکو پھانکی اور کرتار سنگھ نے گھوڑا لانے کا حکم دیا۔ کہ اتنے میں سکھو چودھری سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہی پہلے کا سا بھیس تھا۔ سر پر کنٹوپ۔ ماتھے پر صندل۔ گلے میں چادر اور ہاتھ میں ایک چمٹا۔ آکر چوپال میں زمین پر بیٹھ گئے۔ گاؤں کے کئی لڑکے جو ان کے ساتھ دوڑتے آئے تھے۔ باہر ہی رک گئے۔ فیضو نے پوچھا چودھری کہو خیریت تو ہے؟ تمھیں جیل سے نکلے کتنا عرصہ ہوا؟

چودھری نے کرتار سے چلم لی۔ ایک لمبا دم لگایا اور منہ سے دھوئیں کا بادل نکالتے ہوئے بولے۔ آج بے دخلی کی تاریکھ ہے نا؟

کرتار کاگد پتر دیکھا جائے تو جان پڑے۔ یہاں نت ایک نہ ایک مالمہ لگا رہتا ہے۔ کہاں تک کوئی یاد رکھے۔

چودھری۔ بے چاروں پر ایک مصیبت تو تھی ہی۔ یہ ایک دوسری مصیبت سوار ہوگئی۔

فیضو میں مجبور ہوگیا۔ کیا کرتا۔ تقاضا کرتا رہا۔ اس سے زیادہ میرے بس میں اور کیا تھا؟ یہ کہہ کر انھوں نے چودھری کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ رحم ومروت کے پتلے ہیں۔

چودھری۔ اگر آج سب روپے وصول ہوجائیں تو مالمہ کھارج ہوجائے گا نا؟

فیضو۔ نے چودھری کو تعجب سے دیکھ کر کہا۔ خرچا کا سوال ہے۔

چودھری۔ اچھا بتلائیے۔ آپ کے کُل کتنے روپئے ہوتے ہیں؟ کھرچا بھی جوڑ لیجیے۔

یہ کہہ کر چودھری نے کمر سے نوٹوں کا ایک پُلندہ نکالا۔ ایک تھیلی میں سے کچھ روپے بھی نکالے۔ اور خاں صاحب کی طرف منتظرانہ انداز سے دیکھنے لگے۔ فیضو کے ہوش اڑ گئے۔ کرتار کا چہرہ اتر گیا۔ گویا گھر سے کسی کے مرنے کی خبر ملی ہو بندامہراج نے دھیان سے روپیوں کو دیکھا۔ اُنھیں کو شک ہو رہا تھا۔ کہ یہ کوئی شعبدہ بازی نہ ہو۔ کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ جس کشت آرزو کی برسوں سے حفاظت کر رہے تھے۔ وہ

آنکھوں کے سامنے ایک جانور کے زبردست منہ کا لقمہ بنی جارہی تھی۔ وہ اس موقع کے لیے ان لوگوں نے کتنی تدبیریں کی تھیں۔ کتنی چالاکیوں سے کام لیا تھا۔ کتنے ظلم کیے تھے۔اور جب بعد انتظار بسیار وہ مبارک موقع آیا۔ تو مقدر کے زبردست ہاتھ اسے چھینے لیتے تھے۔ غوث خاں کا خون رنگ لا کر اب پھر بے سود ثابت ہو رہا تھا۔ آخر فیضو نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اس کا فیصلہ تو اب عدالت کے ہاتھ ہے۔

عدالت کا نام لے کر وہ چودھری کو ہراساں کیا چاہتے تھے۔

چودھری۔ اچھی بات ہے تو وہیں چلو۔

کرتار نے قانونی ہمہ دانی کے انداز سے کہا۔ پہلے یہ لوگ مہلت کی درکھاس دیں۔ اس درکھاس پر ہماری طرپھ سے اُجرداری ہوگی۔ اس پر حاکم جو کچھ پھیسلہ کرے گا وہ ہوگا۔ ہم لوگ روپیہ کیسے لے سکتے ہیں۔ جابطے کے کھلاپھ ہے۔

بندا مہاراج کے سامنے ایک دوسرا ہی مسئلہ درپیش تھا۔ اسے اتنے روپے کہاں مل گئے؟ ابھی تو جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ گاؤں والوں سے پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی ہوگی۔ اس کے پاس جو کوئی پونجی تھی۔ وہ تالاب اور مندر بنوانے میں خرچ ہوگئی۔ ضرور اسے کوئی ایسی جڑی بوٹی ہاتھ لگ گئی ہے جس سے یہ روپۓ بنا لیتا ہے۔ سادھوؤں کے ہاتھ میں بڑے بڑے کرتب ہوتے ہیں۔

فیضو سمجھ گئے کہ ان روباہ بازیوں سے کام نہ چلے گا۔ کہیں اس نے عدالت کے سامنے جاکر سب روپۓ گن دیے تو اپنا سا منہ لے کر رہ جانا پڑے گا۔ مایوس ہوکر جوتے اتار دیے اور نالش کی فردیں نکال کرحساب جوڑنے لگے اس پر عدالت کا خرچ۔ عملوں کی رشوت۔ وکیل کا محنتانہ۔ زمیندار کا نذرانہ وغیرہ کی رقم اور اضافہ کی اور پھر بولے۔ کُل ایک ہزار سات سو پچاس روپۓ ہوتے ہیں۔

چودھری۔ پھر دیکھ لیجیے کوئی رقم رہ نہ گئی ہو۔ مگر یہ سمجھ لینا کہ حساب ایک کوڑی بھی بیسی لی۔ تو تمھارا بھلا نہ ہوگا۔

بندامہاراج نے خائف ہوکر کہا۔ کہاں صاحب ذرا پھر سے جوڑ لو۔

کرتار۔ سب جوڑا جوڑایا ہے۔ رات دن. تو یہی کیاکرتے ہیں۔ لاؤ نکالو۔ سترہ سو پچاس روپے۔

چودھری۔ سترہ سو پچاس لینا ہے۔ تو عدالت ہی میں لینا۔ یہاں تو میں ایک ہزرا سے بیسی نہ دوں گا۔

فیضو۔ اور عدالت کا خرچا۔

دفعتاً چودھری نے اپنا چمٹا اٹھایا اور اتنی زور سے فیض اللہ کے سر پر مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر بولے۔ یہی عدالت کا خرچہ ہے۔ جی چاہے اور لے لو۔ بے ایمان پاپی کہیں کا۔ کارندہ بنا پھرتا ہے۔ کل کا بنیا آج کا سیٹھ۔ اتنی جلدی آنکھوں میں چربی چھاگئی۔ تو بھی زمیندار کا آسامی ہے۔ تیرا گھر دیکھ آیا ہوں۔ تیرے ماں باپ بھائی بند سب کا حال دیکھ آیا ہوں۔ وہاں ان سبھوں کا بیگار بھرتے بھرتے کچومر نکلا جاتا ہے۔ تو نے چار اچھر پڑھ لیے تو زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔ دین دُکھیاروں کو لوٹتا پھرتا ہے۔ آٹھ سو کی نالش ہے۔ ایک سو عدالت کا کھرچا ہے میں کچہری جا کر پیسکار سے پوچھ آیا ۔ اس کے تو ساڑھے سترہ سو مانگتا ہے اور کیوں رے ٹھاکر۔ تو بھی اس تُرک کے ساتھ پڑ کر اپنے کو بھول گیا؟ چلاچلا کر رامائن پڑھتا ہے۔ بھاگوت کی کتھا کہتا ہے۔ اینٹ پتھر کے دیوتا بنا کر پوجتا ہے۔ کیا پتھر پوجتے پوجتے تیرا دل بھی پتھر ہوگیا؟ یہ چندن کیوں لگاتا ہے؟ تجھے اس کا کیا ادھیکار ہے؟ تو دھن کے پیچھے دھرم کو بھول گیا؟ تجھے دھن چاہیے؟ تیرے بھاگ میں دھن لکھا ہے۔ تو یہ تھیلی اٹھالے (یہ کہہ کر چودھری نے روپیوں کی تھیلی کرتار کی طرف پھینکی)۔ دیکھ تو تیرے بھاگ میں دھن ہے یا نہیں؟ تیرا من اتنا پاپی ہوگیا ہے کہ تو سونا بھی چھوئے تو مٹی ہوجائے گا۔ تھیلی چھوکر دیکھ لے۔ ابھی ٹھیکری ہوئی جاتی ہے۔

کرتار نے پہلے بڑی بے اعتقادی سے باتیں کرنی شروع کی تھیں۔ وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ میں سادھوؤں کا بھیس دھر کر رُعب میں آنے والا آسامی نہیں ہوں۔ ایسے بھولے بھالے کاٹھ کے الو کہیں اور ہوں گے۔ پر چودھری کی یہ ہمت دیکھ کر اور ان کی یہ مجذوبانہ پھٹکار سن کر اس کی بے اعتقادی غائب ہوگئی۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ یہ وہ چودھری نہیں ہے جو غوث خاں کے ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا۔ مگر بلا امتحان کے وہ اب بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ ان کی کرامات کا پردہ کھول کر ان کی خبر لینے پر بھی آمادہ تھا۔ اس نے تھیلی کو غور سے دیکھا۔ روپیوں سے بھری ہوئی تھی۔ پر اس نے ڈرتے ڈرتے تھیلی اٹھائی مگر اس کے چھوتے ہی ایک نہایت تعجب انگیز

بات دکھائی دی۔ سب روپے ٹھیکری ہوگئے یہ کوئی مایا جال تھا۔ یا کوئی جادو یا معجزہ۔ کون کہہ سکتا ہے۔ مداری کا کھیل تھا۔ یا نظر بندی کا تماشا۔ چودھری ہی جانیں۔ روپیوں کی جگہ صاف سرخ سرخ ٹھیکرے جھلک رہے تھے۔ کرتار کے ہاتھ سے تھیلی چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ ہاتھ جوڑ بڑی عقیدت سے چودھری کے پیروں پر گر پڑا۔ اور بولا۔ بابا میرا اپرادھ چھما کیجیے۔ میں اودھم پاپی دُشٹ ہوں۔ میرا اُدّھار کیجیے میں اَب آپ ہی کی سیوا میں رہوں گا۔ مجھے اس لوبھ کے گڑھے سے نکالیے۔

چودھری۔ گریبوں پر دَیا کرو۔ اور وہی پُن تمھیں اس گڑھے سے نکالے گا دَیا ہی سب منتروں کا مول (جڑ) ہے۔

فیضو میاں گرد جھاڑ کر اٹھ بیٹھے تھے۔ بوڑھا کمزور چودھری اس وقت ان کی نظروں میں ایک دیو سا معلوم ہوتا تھا۔ یہ معجزہ دیکھ کر وہ بھی دنگ رہ گئے۔ عذر کرنا شروع کیا۔ باباجی کیا کریں۔ جنجال میں پھنس کر سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اہلکار۔ عملے۔ افسر۔ اردلی۔ چپراسی سبھی کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ چالیں نہ چلیں۔ تو ان کا پیٹ کیسے بھریں؟ یہاں ایک دن بھی نباہ نہ ہو۔ اب مجھے بھی غلامی میں قبول کیجیے۔

کرتار نے چلم پر چرس رکھ کر چودھری کو دی۔ بندا مہاراج کا شک بھی رفع ہوچکا تھا۔ بولے۔ کچھ جل پان کی اِچھا(خواہش) تو سربت بناؤں۔ فیض اللہ نے ان کے بیٹھنے کو اپنا قالین بچھا دیا۔ چودھری خوش ہوگئے اپنی جھولی سے ایک جڑی نکال کر تینوں کو دی اور کہا کہ یہ مرگی کی آزمائی ہوئی دوا ہے۔ جنم کی مرگی بھی اس سے جاتی رہتی ہے۔ اسے حفاظت سے رکھنا اور دیکھو آج ہی مکدمہ اٹھا لینا۔ یہ ایک ہجار کے نوٹ ہیں گن لو۔ سب آسامیوں کو الگ الگ بے باقی کی رسید دے دینا۔ اب میں جاتا ہوں۔ کچھ دنوں بعد پھر آوں گا۔

(۳۶)

علی الصباح جیوں ہی منوہر کی خودکشی کا حال معلوم ہوا۔ تو جیل میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ جیل کے داروغہ۔ عملے۔ سپاہی۔ محافظ۔ سب کے ہاتھوں کے توتے اُڑگئے۔ ذرا دیر میں پولیس کو خبر ملی۔ تو ادنیٰ واعلیٰ عمال کی جماعت فوراً آ موجود ہوئی۔ موقعہ کی تحقیقات ہونے لگی۔ اہلکارانِ جیل کے بیان لیے گئے۔ ایک گھنٹہ میں سول سرجن اور ڈاکٹر پریاناتھ

بھی تشریف لائے پھر کمشنر مجسٹریٹ۔ اورسٹی مجسٹریٹ بھی پہنچے۔ دن بھر تحقیقات ہوتی رہی۔ دوسرے دن بھی یہی ہنگامہ رہا۔ اور یہی کاروائی ہوتی رہی۔ مگر سانپ مرچکا تھا۔ اب اس کی بابنی کو لاٹھی سے پیٹنا بے سود تھا۔ اہلکارانِ متعلقہ پر بن آئی۔ جیل کے داروغہ چھ ماہ کے لیے معطل کردیے گئے۔ محافظوں پر بھاری جرمانے ہوئے۔ جیل کے قواعد میں ترمیم کی گئی۔ دریچوں میں دوہری سلاخیں لگادی گئیں۔ دیگر ملزمین کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ ڈالی گئی تھیں۔ اب دوہری ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ پریم شنکر یہ خبر سنتے ہی دوڑے ہوئے جیل آئے مگر اہلکاروں نے اُنھیں پھاٹک کے سامنے ہی سے بھگا دیا۔ اب تک اہلکارانِ جیل نے اُن کے ساتھ ہر طرح کی رعایت کی تھی۔ ملزموں سے اُنھیں ملا بھی دیا کرتے تھے۔ اُن کے یہاں سے آیا ہوا کھانا بھی ملزموں کے پاس پہنچا دیتے تھے۔ مگر آج ان سبھوں کا رُخ بدلا ہوا تھا۔ پریم شنکر جیل کے سامنے کھڑے سوچ رہے تھے کہ اَب کیا کروں کہ پولیس کا افسر اعلیٰ جیل سے نکلا۔ اور اُنھیں دیکھ کر بولا۔ یہ تمھاری ہی فہمائش کا نتیجہ ہے تمھیں نے بقیہ ملزموں کو بچانے کے لیے یہ خودکشی کرائی ہے۔ داروغہ جیل نے بھی ان سے اسی قسم کی گفتگو کی۔ اس توہین سے پریم شنکر کو دلی رنج ہوا۔ زندگی اُنھیں نئے نئے تجربات کا مکتب نظر آتی تھی۔ یہ پہلا ہی سابقہ تھا۔ کہ ان کی انسانیت اور رحم دلی کا بالکل الٹا اثر پڑا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک اسی سوچ میں وہیں کھڑے رہے پھر اپنے جھونپڑے کی طرف چلے گویا اپنے کسی عزیز کی نعش کو شمشان میں جلاکر واپس جا رہے ہوں۔

گھر پہنچ کر وہ پھر اُنھیں خیالات میں محو ہوگئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ زندگی کا کیا معیار قائم کیاجائے، عام روش اختیار کرنے سے دل کو نفرت ہوتی تھی۔ اور پاکیزہ اصولوں پر کاربند ہونے کے نتیجے اُلٹے ہوتے تھے۔ اُنھیں اپنی مجبوری کا ایسا دل شکن احساس کبھی نہ ہوا تھا انسانی فہم کتنی ناقص ہے۔ اور انسانی نگاہ کتنی تنگ ۔ اس کا ایسا صاف ثبوت کبھی نہ ملا تھا۔ اگرچہ وہ غرور کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ مگر وہ کسی پوشیدہ راستہ سے ان کے دل تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ اپنی نیک کوششوں کو بارآور ہوتے دیکھ کر باغ باغ ہوجاتے تھے۔ اور ان کے دل میں کسی طرف سے دھیمی سی آواز آجاتی تھی۔ کہ میں نے کتنا اچھا کام کیا۔ لیکن ایسے ہر موقع پر ایک ہی لمحہ بعد اُنھیں غیب سے ایک ایسی تنبیہ مل جاتی تھی۔ جو ان کے اس غرور کو توڑ دیتی تھی۔ اے نادان! تجھے اپنے اصولوں پر ناز ہے

دیکھ کہ وہ کتنے کچے ہیں۔ تجھے اپنے علم وعقل کا گھمنڈ ہے۔ دیکھ کہ وہ کتنے ناقص ہیں۔ تجھے اپنی واقفیت اور سلامت روی پر غرور ہے۔ دیکھ کہ وہ کس قدر کوتاہ اور کس قدر قابلِ مذمت ہیں۔ کیا تجھے یقین ہے کہ تیری ہی تحریک غوث خاں کے قتل کا باعث نہیں ہوئی؟ تیری ہی فہمایش نے منوہر کی جان نہیں لی؟ تیری غلط کاریوں نے گیان شنکر کو اور شردھا کو تجھ سے منحرف نہیں کردیا؟

یہ سوچتے سوچتے ان کا دھیان اپنی مالی مشکلات کی طرف گیا۔ ابھی نہ معلوم یہ مقدمہ کتنے دنوں تک چلے گا۔ عرفان علی کوئی تین ہزار لے چکے۔ اور شاید ابھی ان کا اتنا ہی باقی ہے۔ گنّے تیار ہیں لیکن ایک ہزار روپے سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ غریب گاؤں والوں کو کہاں تک دباؤں؟ پھلوں سے جو کچھ ملا وہ سب صرف ہوگیا۔ ابھی کسی کو حساب تک نہیں دکھایا۔ نہ معلوم یہ سب اپنے دل میں کیا خیال کرتے ہوں گے۔ لکھن پور والوں کی کچھ خبر نہ لے سکا۔ معلوم نہیں۔ ان بیکسوں پر کیا گزر رہی ہے۔

دفعتاً بھولا کی عورت بدھیا آکر بولی...... بابو جی۔ دو دن سے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ اور آپ کا ہلواہا میری جان کھائے جاتا ہے۔ بتایئے میں کیا کروں؟ کیا چوری کروں؟ دن بھر چکّی پیستی ہوں اور جو کچھ پاتی ہوں وہ سب اسی گرہستی میں جھونک دیتی ہوں۔ تِس پر بھی بھر پیٹ دانہ نہیں نصیب ہوتا۔ آپ اس کے ہاتھ میں طلب نہ دیا کریں۔ سب جوئے میں اڑا دیتا ہے آپ نہ اسے ڈانٹتے ہیں۔ نہ سمجھاتے ہیں۔ آپ تو سمجھتے ہیں۔ کہ مجوری بڑھاتے ہی وہ ٹھیک ہوجائے گا۔ پر آپ اسے ہجار کا مہینہ بھی دیں تو بھی اس کے لیے پورے نہ پڑیں گے۔ آج سے آپ طلب میرے ہاتھ میں دیا کریں۔

پریم۔ جوا کھیلنا تو اس نے چھوڑ نہ دیا تھا؟

بدھیا۔ وہی دو ایک مہینے نہیں کھیلا تھا۔ بیچ بیچ میں بھی کبھی چھوڑ دیتا ہے۔ پر اس کی تو لت پڑ گئی ہے۔ آپ طلب مجھے دے دیا کریں۔ پھر دیکھوں کیسے جوا کھیلتا ہے۔ آپ کا سیدھا سوبھاؤ ہے۔ جب مانگتا ہے تبھی نکال کر دے دیتے ہو؟

پریم۔ مجھ سے وہ یہی کہتا ہے۔ کہ مین نے جوا چھوڑ دیا۔ جب کبھی روپے مانگتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ کھانے کو نہیں ہے نہ دوں تو کیا کروں۔

بدھیا۔ تبھی تو اس کے مجاج نہیں ملتے کچھ پیشگی تو نہیں لے گیا ہے؟

پریم۔ اسی سے پوچھو لے گیا ہوگا تو بتائے گا نا؟
بُدھیا۔ آپ کے یہاں حساب کتاب نہیں ہے کیا؟
پریم۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔
بُدھیا۔ آپ کو یاد نہیں ہے۔ تو وہ بتا چکا۔ سرابیوں جُواریوں کے بھی کہیں ایمان ہوتا ہے؟
پریم۔ کیوں۔ کیا شراب سے ایمان دُھل جاتا ہے؟
بُدھیا۔ دُھل نہیں جاتا اور کیا۔ دیکھیے بلاکر آپ کے منہ پر پوچھتی ہوں یا نارائن۔ نگوڑا طلب کی طلب اڑادیتا ہے۔ اس پر پیشگی لے کر کھیل ڈالتا ہے۔ اب دیکھوں کہ کہاں سے بھرتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ جھلائی ہوئی گھر گئی۔ اور ذرا دیر میں بھولا کو لے کر آئی۔ بھولا کی آنکھیں سرخ تھیں شرم سے سر جھکائے ہوئے تھا۔ بُدھیا نے پوچھا بتاؤ تم نے بابو جی سے کتنے روپۓ پیشگی لیے ہیں؟

بھولا۔ نے بیوی کی طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تو کون ہوتی ہے پوچھنے والی؟ بابو جی جانتے نہیں ہیں کیا؟
بُدھیا۔ بابوجی ہی تو پوچھتے ہیں، نہیں تو مجھے کیا پڑی تھی؟
بھولا۔ ان کے میرے اوپر لاکھ آتے ہیں۔ اور میں ان کا جنم بھر کا گلام ہوں۔
بُدھیا۔ دیکھا بابوجی۔ میں کہتی نہ تھی۔ کہ وہ کچھ نہ بتائے گا۔ جواری کبھی ایمان کے سچے ہوئے ہیں۔ کہ یہ ہوگا۔
بھولا۔ تو سمجھتی ہے کہ میں باتیں بنا رہا ہوں۔ باتیں ان سے بنائی جاتی ہیں جو دل کے کھوٹے ہوتے ہیں۔ جو ایک دھیلا دے کر پیسے کا کام کرانا چاہتے ہیں۔ دیوتاؤں سے بات نہیں بنائی جاتی۔ یہ جان اُن کی ہے یہ تن اُن کا ہے؟ اسارہ بھر مل جائے۔
بدھیا۔ ارے جا۔ جلیبے کہیں کے۔ بابوجی بیسیوں بار سمجھا کے ہار گئے۔ تجھ سے ایک جوا تو چھوڑا نہیں جاتا۔ اور کیا کرے گا۔ جان پر کھیلنے والے اور ہوتے ہیں۔
بھولا۔ جھوٹی کہیں کی۔ میں کب جوا کھیلتا ہوں؟
پریم۔ سچ کہنا بھولا۔ کیا تم اب بھی جوا کھیلتے ہو؟ تم مجھ سے کئی بار کہہ چکے ہو میں بالکل

چھوڑ دیا۔

بھولا کا گلا بھر آیا۔ نشہ کی حالت میں انسان کے خیالات مبالغہ کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ جب جی ذرا ہلکا ہوا تو سسکیاں بھرتا ہوا بولا۔ مالک یہ آپ کا ایک حکم ہے۔ جسے میں نے ٹالا ہے۔ اور کوئی بات نہیں ٹالی۔ آپ مجھے یہیں بٹھاکر سر پر سو جوتے گن کر لگائیں۔ جب یہ بھوت اترے گا۔ میں روج سوچتا ہوں کہ اب کبھی نہ کھیلوں گا۔ پر سانجھ ہوتے ہی مجھے جیسے کوئی دھکیل کر پھڑکی کی طرف لے جاتا ہے۔ ہائے میں آپ سے جھوٹھ بولا۔ آپ سے کپٹ کیا۔ بھگوان میری کیا گت کریں گے؟ یہ کہہ کر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ندامت کی اس پاکیزگی کو دیکھ کر پریم شنکر کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ شرابی اور جواری بھولا جسے وہ کمینہ سمجھتے تھے۔ دل کا کس قدر پاک و صاف تھا۔ انھوں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ تم کیوں روتے ہو؟ میں تمھیں کچھ کہتا تھوڑا ہی ہوں۔

بھولا۔ آپ کا کچھ نہ کہنا ہی تو مجھے مارے ڈالتا ہے۔ مجھے گالیاں دیجیے کوڑوں سے ماریے۔ تب یہ نشہ اُترے گا۔ ہم لاتوں کے دیوتا باتوں سے نہیں مانتے۔

پریم۔ تمھاری تنخواہ بُڈھیا کو دے دیا کروں؟

بھولا۔ جی ہاں۔ آج سے مجھے ایک کوڑی بھی نہ دیا کیجیے۔

پریم۔ (بُڈھیا سے) لیکن جو یہ جُوئے سے بھی بُری کوئی عادت پکڑے تو؟

بُڈھیا۔ جُوئے سے بری چوری ہے۔ جس دن اُسے چوری کرتے دیکھوں گی۔ جہر(زہر) دے دوں گی۔ مجھے رانڈ بننا منجور ہے۔ پر چور کی لُگائی نہیں بن سکتی۔

اس نے بھولا کا ہاتھ پکڑ کر گھر چلنے کا اشارہ کیا اور پریم شنکر کے سامنے ایک مشکل مسئلہ پیش کرگئی۔

(۳۷)

ڈاکٹر عرفان علی بیٹھے سوچ رہے تھے کہ منوہر کی خودکشی کا بقیہ ملزمان پر کیا اثر پڑے گا۔ قانونی کتابوں کا ڈھیر سامنے لگا ہوا تھا۔درمیان میں سوچنے لگتے تھے کہ میں نے یہ مقدمہ ناحق لیا۔ سو روپۓ روزانہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ اور ابھی معلوم نہیں کہ کتنے روز لگیں گے۔ لاحول و لاقوۃ! پھر روپۓ کی طرف خیال کیا۔ کتنا چاہتا ہوں کہ دل کو

ادھر نہ جانے دوں مگر خیال آہی جاتا ہے۔ وکالت چھوڑے بھی نہیں بنتا۔ گیان شنکر سے پروفیسری کے لیے کہہ تو آیا ہوں مگر جو واقعی یہ جگہ مل گئی تو ٹیڑھی کھیر ہوگی۔ میں اب زیادہ عرصہ تک تو اس پیشہ کو کرنہیں سکتا۔ اور نہ سہی۔ تو صحت کے لیے تو ضرور ہی ترک کرنا پڑے گا۔ بس یہی چاہتا ہوں کہ گھر بیٹھے ایک ہزار ماہوار کی رقم مل جایا کرے۔ اگر پروفیسری سے ایک ہزار ملے تو بھی کافی ہوگا۔ نہیں۔ ابھی چھوڑنے کا وقت نہیں آیا۔ تین سال کی سخت محنت کرنے کے بعد البتہ چھوڑنے کا ارادہ کرسکتا ہوں۔ لیکن ان تین سالوں تک مجھے چاہیے کہ رعایت اور مروّت کو بالائے طاق رکھ دوں۔ سب سے پورا محنتانہ لوں۔ ورنہ آج کل کی طرح پھنستا رہا۔ تو زندگی بھر نجات نہ ملے گی ہاں تو آج اس مقدمہ میں بحث ہوگی۔ اُف۔ ابھی تک تیار نہیں ہوسکا گواہوں کے بیانات پر نگاہ ڈالنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ کچھ نہ کچھ باتیں تو یاد ہی ہیں۔ بہت کچھ ادھر کے وکیل کی تقریر سن کر سوجھ جائے گی۔ ذرا نمک مرچ اور لگادوں گا۔ بس خاصی بحث ہوجائے گی۔ یہ تو روز ہی کا کام ہے اس کی کیا فکر۔ اتنے میں امولی کے راجا صاحب کا موٹر آپہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے باہر نکل کر راجا صاحب کا خیرمقدم کیا راجا انگریزی سے ناواقف تھے۔ لیکن انگریزی وضع قطع اور انگریزی طور طریق سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے کپڑے ولایت سے سِل کر آتے تھے۔ لڑکوں کی تعلیم کے لیے لیڈیاں نوکر تھیں۔ اور ریاست کا منیجر بھی انگریز تھا۔ راجا صاحب کا وقت زیادہ تر انگریزی دُکانوں کی سیر کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ ٹکٹ اور سکّے جمع کرنے کا شوق تھا۔ تھیئٹر جانے میں ناغہ نہ ہوتا تھا۔ کچھ دنوں سے ان کے منیجر نے ریاست کی آمدنی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا تھا۔ اس لیے راجا صاحب اُنھیں برطرف کرنا چاہتے تھا۔ مگر انگریزی حکام کے خوف سے ہمّت نہ پڑتی تھی۔ منیجر خود راجا صاحب کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔ آمدنی کا حساب دینا تو دور رہا۔ راجا صاحب اس معاملہ کو دیوانی میں لے جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ مگر منیجر صاحب کی جج سے گہری دوستی تھی۔ اس لیے عدالت کے اکثر وکلا نے اس مقدمہ کو ہاتھ میں لینے سے انکار کردیا تھا۔ مایوس ہوکر راجا صاحب نے عرفان علی کی پناہ لی۔ ڈاکٹر صاحب دیر تک ان کی باتیں سنتے رہے۔ بیچ بیچ میں اُن کی تشفی بھی کرتے جاتے تھے۔ کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں منیجر صاحب سے ایک ایک کوڑی وصول کرلوں گا۔ یہاں کے

وکیل دبّو ہیں، خوشامدی ٹٹو۔ پیشہ کو بدنام کرنے والے۔ ہمارا پیشہ آزاد ہے حق کی حمایت کرنا ہمارا کام ہے۔ خواہ بادشاہ ہی سے کیوں نہ سامنا کرنا پڑے۔ آپ ذرا بھی تردّد نہ کریں۔ میں ساری باتیں ایسی خوب صورتی سے طے کردوں گا۔ کہ آپ پر چھینٹا بھی نہ آنے پائے گا۔

دفعتاً تار کے چپراسی نے آکر ڈاکٹرصاحب کو ایک تار کا لفافہ دے دیا۔ گیان شنکر نے ایک مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے پانچ سو روپیہ روزانہ فیس پر طلب کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے راجا صاحب سے کہا یہ پیشہ بڑا موذی ہے۔ کبھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ رانی گائتری دیوی کا ایک تار ہے گورکھ پور بلا رہی ہیں۔

راجا۔ میں اپنے مقدمہ کو ملتوی نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے کہ منیجر کوئی اور چال چل جائے۔

ڈاکٹر۔ آپ مطلق اندیشہ نہ کریں میں نے مقدمہ کو ہاتھ میں لے لیا۔ اپنے دیوان صاحب کو بھیج دیجیے گا۔ وکالت نامہ تیار ہوجائے گا میں کاغذات دیکھ کر فوراً دعویٰ دائر کردوں گا۔ گورکھپور گیا بھی تو آپ کے کاغذات لیتا جاؤں گا۔

گھڑی میں دس بجے۔ خانساماں نے دسترخوان بچھایا۔ کھانا کھانے کا کمرہ اس دفتر کے بغل میں ہی تھا۔ مسالاجات کی خوشبو کمرہ میں پھیل گئی۔ لیکن ڈاکٹرصاحب اپنا شکار پھنسانے میں محو تھے۔ اندیشہ تھا کہ میں کھانا کھانے چلا جاؤں۔ اور شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک وہ راجا صاحب سے مقدمہ کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ راجا صاحب کے جانے کے بعد وہ دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانا ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ دو ہی چار نوالے کھائے تھے۔ کہ گیار بجے۔ دستر خوان سے اٹھ بیٹھے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ اور کچہری چلے۔ راستہ میں پچھتاتے جاتے تھے کہ شکم سیر ہوکر کھانے بھی نہ پایا۔ آج پلاؤ کیسا لذیذ بنا تھا۔ اس پیشہ کا بُرا ہو۔ کھانے پر بھی فرصت نہیں۔ ہاں رانی کو کیا جواب دوں۔ واجب تو یہی ہے۔ کہ جب تک کسانوں کا معاملہ طے نہ ہوجائے۔ کہیں نہ جاؤں۔ مگر یہ چار سو روزانہ کا نقصان کیسے برداشت کروں؟ پھر ایک بڑی ریاست سے تعلق ہو رہا ہے سال میں سینکڑوں مقدمے ہوتے ہوں گے۔ سینکڑوں اپیلیں ہوتی ہوں گی۔ وہاں اپنا رنگ ضرور جمانا چاہیے۔ محرّرصاحب سامنے ہی بیٹھے تھے۔ پوچھا کیوں منشی جی۔ رانی صاحبہ کو کیا جواب دوں؟ آپ کے خیال میں اس وقت میرا جانا مناسب ہے؟

محررؔ۔ حضور کسی کے تابعدار نہیں ہیں۔ شوق سے جائیں۔ سبھی وکلا یہی کرتے ہیں۔ ایسے
موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

ڈاکٹر۔ بدنامی ہوتی ہے۔

محررؔ۔ ذرا بھی نہیں۔ جب یہی عام رواج ہے تو کون کسے بدنام کرسکتا ہے؟

ان الفاظ نے عرفان علی کے دُوبدھے کو دور کردیا۔ اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ مل گیا۔
جیوں ہی موٹر کچہری میں پہنچا۔ پریم شنکر دوڑتے ہوئے آئے اور بولے۔ میں تو بڑی فکر
میں تھا۔ پیشی ہوگئی۔

ڈاکٹر۔ امولی کے راجا صاحب آگئے۔ اس وجہ سے ذرا دیر ہوگئی۔ کھانا بھی نصیب نہ ہوا۔
اس پیشہ کی نہ جانے کیوں لوگ اتنی تعریف کرتے ہیں۔ اصل میں تو اس سے بدتر
کوئی پیشہ نہیں۔ چند روز میں انسان کولھو کا بیل بن جاتا ہے۔

پریم۔ آپ اس طرف کہاں جارہے ہیں؟

ڈاکٹر۔ ذرا سب جج کے اجلاس میں ایک بات دریافت کرنی ہے۔ آپ چلیں۔ میں ابھی آتا
ہوں۔

پریم۔ سرکاری وکیل نے بحث شروع کردی ہے۔

ڈاکٹر۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کرنے دیجیے۔ میں اس کا جواب پہلے ہی سے تیار کرچکا ہوں۔

پریم شنکر ان کے ساتھ سب جج کے اجلاس تک گئے۔ ڈاکٹرصاحب تقریباً ایک
گھنٹہ تک دفتر والوں سے باتیں کرتے رہے۔ آخر نکلے تو بڑے ندامت آمیز لہجہ میں
بولے۔ آپ کو یہاں کھڑے کھڑے بے حد تکلیف ہوئی معاف فرمایئے گا۔ مجھے یہ کہتے
ہوئے بہت ندامت معلوم ہوتی ہے۔ کہ میں تین چار روز اس مقدمہ کی پیروی نہ کرسکوں
گا۔

پریم۔ یہ تو آپ نے بُری خبرسنائی۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایسے نازک موقع پر آپ
کا نہ رہنا کتنا بڑا ظلم ہے۔

ڈاکٹر۔ مجبور ہوں۔ آپ کے بھائی صاحب نے تار دے کر مجھے گورکھ پور بلایا ہے۔

پریم۔ اس خبر سے میری تو روح فنا ہوگئی۔ آپ ان بے چارے کسانوں کو منجدھار میں
چھوڑ دیتے ہیں۔ خیال فرمایئے۔ ان کی کیا حالت ہوگی۔ اتنے تنگ وقت میں کوئی

دوسرا وکیل بھی تو نہیں مل سکتا۔
ڈاکٹر۔ مجھے خود نہایت افسوس ہے۔ مگر جب تک دُکان ہے خریداروں کی خاطر کرنی ہی پڑے گی۔ یہ پیشہ ایسا منحوس ہے۔ کہ اس میں آئین پر قائم رہنا ہی دشوار ہے۔ مجھے ان مصیبت زدوں کا خود خیال ہے مگر مسٹر گیان شنکر کو ناراض بھی تو نہیں کرسکتا۔ اور جناب صاف بات تو یہ ہے۔ کہ جب کافر ہوئے تو شراب سے کیوں توبہ کریں۔ جب وکالت کا سیاہ جامہ پہنا۔ تو اس پر شرافت کا سفید داغ کیوں لگائیں؟ جب لوٹنے پر آئے تو دونوں ہاتھوں سے کیوں نہ سمیٹیں۔ دل میں دولت کا ارمان کیوں رہ جائے؟ بنیوں کو لوگ خواہ مخواہ لالچی کہتے ہیں۔ اس لقب کے مستحق ہم ہیں۔ دولت ہمارا دین ہے۔ ہمارا ایمان ہے۔ یہ نہ سمجھیے۔ کہ اس پیشہ میں جو لوگ چوٹی پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ زیادہ روشن خیال ہیں۔ نہیں جناب۔ وہ بگلا بھگت ہیں۔ ایسے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ گویا دنیا سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ لیکن شکار نظر آتے ہی آپ ان کی پھرتی جھپٹ دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے۔ جس طرح قصاب بکرے کو صرف اس کے وزن کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ اسی طرح ہم انسان کو محض اس اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ کہ وہ کتنا آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہے۔ لوگ اسے آزاد پیشہ کہتے ہیں۔ میں اسے انتہا درجہ کی غلامی کہتا ہوں۔ ابھی چند ماہ ہوئے۔ میرے بھائی کی شادی درپیش تھی۔ سادات کے قصبہ میں بارات گئی تھی۔ وہاں بارات تین روز تک مقیم رہی۔ میں روزانہ علی الصباح یہاں چلا آتا تھا۔ اور رات کی گاڑی سے لوٹ جاتا تھا۔ سبھی رسمیں میری غیرحاضری میں ادا ہوئیں۔ ایک روز بھی کچہری کا ناغہ نہیں کیا۔ میں اپنی اس ہوس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ اور میں اس شخص کا تازیست ممنون رہوں گا۔ جو مجھے اس مرض سے نجات دلا دے۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب موٹر پر جا بیٹھے۔ اور ایک لمحہ میں گھر پہنچ گئے۔ ایک بجے گاڑی جاتی تھی۔ سفر کا سامان ہونے لگا۔ دوچرمی صندوق۔ ایک ہینڈ بیگ۔ ہیٹ رکھنے کا صندوق۔ آفس بکس۔ کھانوں کا صندوق وغیرہ سارا سازوسامان بگھی پر لادا گیا۔ ہر چیز پر ڈاکٹرصاحب کا نام لکھا ہوا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ ڈاکٹرصاحب گھر میں نہ گئے۔ موٹر پر بیٹھنا ہی چاہتے تھے۔ کہ مہری نے آکر کہا۔ حضور ذرا اندر چلیں۔ بیگم صاحب بُلا رہی

ہیں۔ منیرہ کو کئی دست آئے ہیں اور قے بھی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر۔ تو ذرا عرق کافور کیوں نہیں پلادیتیں۔ کھانے میں کوئی بدپرہیزی ہوئی ہوگی۔ چیخنے چلانے کی کیا ضرورت ہے؟

مہری۔ حضور دوا تو پلائی ہے۔ ذرا آپ چل کر دیکھ لیں۔ بیگم صاحب ڈاکٹر بلانے کو کہتی ہیں۔

عرفان علی جھلّائے ہوئے اندر گئے۔ اور بیگم سے بولے۔ تم نے یہ کیا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے؟

بیگم۔ منیرہ کی حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ذرا چل کر دیکھو تو۔ اس کے ہاتھ پیر اکڑے جاتے ہیں۔ مجھے تو خوف ہورہا ہے۔ کہیں کالرا نہ ہو۔

عرفان۔ یہ سب تمھارا وہم ہے۔ صرف کھانے پینے کی بے احتیاطی ہے۔ اور کچھ نہیں۔ عرق کافور دد دو گھنٹہ بعد پلاتی رہو۔ شام تک ساری شکایت دور ہوجائے گی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں اسی ٹرین سے ذرا گورکھپور جا رہا ہوں۔ تین چار روز میں واپس آجاؤں گا۔ روزانہ خیریت کی اطلاع دیتی رہنا۔ میں رانی گائتری کے بنگلے میں ٹھہروں گا۔

بیگم نے اُنھیں حقارت سے دیکھ کر کہا۔ لڑکی کی یہ حالت ہے اور آپ اسے چھوڑے چلے جاتے ہیں۔ خدانخواستہ اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو؟

عرفان۔ تو میں رہ کر ہی کیا کروں گا؟ اس کی تیمارداری تو مجھ سے ہوگی نہیں اور نہ مرض سے میری دوستی ہے۔ کہ میرے ساتھ رعایت کرے۔

بیگم۔ لڑکی کی جان کو خدا کے حوالے کرتے ہو۔ لیکن روپے خدا کے حوالے نہیں کیے جاتے۔ لاحول ولاقوۃ۔ آدمی میں انسانیت نہ ہو۔ اولاد کی محبت تو ہو۔دولت کی ہوس اولاد ہی کے لیے ہوتی ہے۔ جب اولاد ہی نہ رہی تو روپیوں کا کیا رلاؤ گے گا؟

عرفان۔ تم احمق ہو۔ تم سے کون سر مغزن کرے؟ یہ کہہ کر وہ باہر گئے۔ موٹر پر بیٹھے اور اسٹیشن کو روانہ ہوگئے۔

(۳۸)

سیدایجاد حسین کا مکان دارانگر کی ایک گلی میں تھا۔ برآمدہ میں دس بارہ خستہ حال

لڑکے ایک پھٹے ہوئے بوریے پر بیٹھے کریما اور خالق باری کی رٹ لگایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ امنگ میں آکر زور زور سے اپنا سبق یاد کرنے لگتے۔ تو کانوں پڑی آواز نہ سنائی دیتی؟ معلوم ہوتا کہ بازار لگی ہوئی ہے۔ اس ہربونگ میں لڑکے گالیاں بکتے ایک دوسرے کو منہ چڑھاتے۔ چٹکیاں کاٹتے۔ اگر کوئی لڑکا شکایت کرتا۔ تو سب کے سب مل کر ایسا واویلا مچاتے کہ اس کی آواز ہی دب جاتی تھی۔ برآمدہ کے وسط میں مولوی صاحب کا تخت تھا۔ اس پر ایک ریٹائل مولوی صاحب تہمد باندھے ایک میلی کچیلی مسند لگائے اپنا مدریا حقہ پیا کرتے تھے۔ اور اس شوروغل میں پورے اطمینان کے ساتھ جھپکیاں لیتے رہتے تھے۔ اُنھیں حقہ پینے کا مرض تھا۔ ایک کنارے انگھیٹی میں اپلے سلگا کرتے تھے۔ اور وہیں چمٹا پڑا رہتا تھا۔ چلم بھرنا لڑکوں کے لیے ایک تفریح کا مشغلہ تھا۔ خواہ ان کی تعلیمی حالت قابلِ اطمینان نہ ہو۔ مگر استاد کی خدمت کرنے میں سبھی مشاق تھے۔ یہی سید ایجاد حسین کا "اتحادی یتیم خانہ" تھا۔

لیکن برآمدے کے اوپر والے کمرہ کی کچھ اور ہی کیفیت تھی۔ صاف ستھرا فرش بچھا ہوا تھا۔ قالین اور مسند بھی قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ پاندان۔ خاصدان۔ اوگالدان وغیرہ موقع سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک گوشہ میں جانماز بچھا ہوا تھا۔ تسبیح بھی کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ چھت میں جھالردار چھت گیر تھی۔ جس کی سجاوٹ رنگین ہانڈیوں کے سبب اور بھی بڑھ گئی تھی۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔

صبح کا وقت تھا۔ مرزا صاحب مسند لگائے ہارمونیم بجا رہے تھے۔ ان کے سامنے تین کم سن خوب صورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی ڈاکٹراقبال کی مشہور نظم "شوالا" خوش الحانی سے گارہی تھیں۔ ایجاد حسین خود بھی ان کے ساتھ گا کر تال سُر بتاتے جاتے تھے۔ یہ اتحادی یتیم خانہ کی لڑکیاں بتلائی جاتی تھیں۔ لیکن فی الواقع ایک تو ان کی لڑکی تھی۔ اور دو ان کی بہن کی لڑکیاں تھیں۔ اتحاد کی اشاعت میں یہ تثیت لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتی تھی۔ کامل ایک گھنٹہ کی مشق کے بعد مرزا صاحب نے خوش ہو کر فخر کی نگاہوں سے لڑکیوں کو دیکھا۔ اور اُنھیں چھٹی دی۔ اس کے بعد لڑکوں کی باری آئی۔ مگر یہ مکتب والے نحیف اور خستہ حال لڑکے نہ تھے۔ تھے تو کل چار لڑکے مگر چاروں میں زندہ دلی اور ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ خوبصورت تھے اور خوش پوش۔ چاروں چہکتے ہوئے گھر سے

آئے۔ اور فرش پر بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب نے پھر ہارمونیم کے سُر ملائے۔ اور لڑکوں نے حقانی لہجہ میں ایک غزل گانی شروع کی۔ جو خود مرزا صاحب کے فکر کا نتیجہ تھی۔ اس میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک پُر فضا باغ سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اور عوام کو نہایت دردناک اور موثر الفاظ میں ترغیب دی گئی تھی، کہ وہ اس باغ کی حفاظت کریں۔ اس کے دلکش مناظر سے لطف اٹھائیں اور باہمی نفرت وکدورت کی خاردار جھاڑیوں میں نہ الجھیں۔ لڑکوں کی پیاری اور دلکش آواز میں گائی جاکر یہ غزل غضب ڈھاتی تھی۔ ساتھ ہی یہ لڑکے جذبات کے اظہار میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ "اتحادی یتیم خانہ" کے لڑکے بتلائے جاتے تھے۔ لیکن دراصل یہ مرزا صاحب کی دونوں بہنوں کے لڑکے تھے۔

مرزا صاحب ابھی گانے کی مشق کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں ایک شخص نیچے سے آیا۔ اور سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ لالہ گوپال داس نے بھیجا ہے۔ اور کہا ہے کہ آج حساب چکتا نہ ہوگیا تو کل نالس کردی جائے گی۔ کپڑے کا بیوپار مہینہ دو مہینہ کا ہے۔ اور آپ کو کپڑا لیے تین سال سے جیادہ ہوگئے۔

مرزاصاحب نے ایسا منہ بنایا۔ گویا کُل دنیا کے تفکرات کا بوجھ اُنھیں کے سر پر گرا ہوا ہے۔ اور کہا۔ نالش کیوں کریں گے۔ کہہ دو کہ تھوڑا سا زہر بھیج دیں کھاکر مرجاؤں۔ کسی طرح دنیا سے نجات ملے۔ اُنھیں تو خدا لاکھوں دیے ہیں۔ گھر میں روپیوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اُنھیں کیا خبر کہ یہاں جان پر کیا گزرہی ہے۔ کنبہ بڑا۔ آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہیں۔ دنیا چالاک ہتھے نہیں پڑتی۔ کیا کروں؟ مگر انشاء اللہ ایک ماہ کے اندر آکر سب نیا پرانا حساب صاف کردوں گا۔ اب کے مجھے وہ چال سوجھی ہے جو کبھی پٹ نہیں پڑسکتی۔ ان لڑکوں کی غزلیں سن کر مجلسیں پھڑک اٹھیں گی۔ جاکر سیٹھ جی سے کہہ دو۔ کہ جہاں اتنے دنوں تک صبر کیا ہے۔ وہاں ایک مہینہ اور صبر کریں۔

اس شخص نے ہنس کر کہا۔ آپ تو مرزاصاحب ایسی ہی باتیں کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ اور وہاں مجھ پرلتاڑ پڑتی ہے۔ منیم جی کہتے ہیں کہ تم جاتے ہی نہ ہوگے یا کچھ لے دے کر چلے آتے ہوگے۔

مرزا صاحب نے ایک چونی اس کے نذر کی۔ اس کے چلے جانے کے بعد انھوں نے مولوی صاحب کو بلایا۔ اور بولے۔ کیوں میاں امجد۔ میں نے تم سے تاکید نہ کردی

تھی۔ کہ کوئی آدمی اوپر نہ آنے پائے۔ اس آدمی کو کیوں آنے دیا؟ منہ میں دہی جما ہوا تھا۔ اتنا کہتے نہ بنتا تھا۔ کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں؟ اگر اس طرح تم لوگوں کو آنے دوگے۔ تو صبح سے شام تک تانتا لگا رہے گا۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا؟

امجد۔ میں تو اس سے بار بار کہتا رہا۔ کہ مرزاصاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ زبردستی زینہ پر چڑھ آیا۔ کیا کرتا۔ اس سے فوجداری کرتا؟

مرزا۔ بیشک اسے دھکے دے کر ہٹا دینا چاہیے تھا۔

امجد۔ تو جناب روکھی روٹیوں اور چلی دال میں یہ قوت نہیں ہوتی۔ اس پر دماغ لونڈے چڑ جاتے ہیں۔ ہاتھا پائی کس بوتہ پر کروں؟ کبھی سالن تک تو نصیب نہیں ہوتا۔ دروازہ پر پڑا ہوا مسالے اور پیاز کی خوشبو لیا کرتا ہوں۔ سارا گھر پلاؤ اور زردہ اڑاتا ہے۔ یہاں خشک روٹیوں ہی پر بسر ہے۔ دسترخوان پر کھانے کو ترس گیا۔ روز وہی مٹی کے پیالے سامنے آجاتے ہیں۔ مجھے بھی ''ترمال'' کھلایئے۔ پھر دیکھوں کہ گھر میں کون قدم رکھتا ہے۔

مرزا۔ لاحول ولاقوۃ۔ تم ہمیشہ پیٹ کا ہی رونا روتے رہے۔ ارے میاں خدا کا شکر کرو۔ کہ بیٹھے بیٹھے روٹیاں تو مل جاتی ہیں۔ ورنہ اس وقت کہیں پھک پھک پھائیں پھائیں کرتے ہوتے۔

امجد۔ آپ سے دل کی بات کہتا ہوں۔ تو آپ گالیاں دینے لگتے ہیں۔ لیجیے جاتا ہوں۔ اب اگر پھر صورت دکھاؤں تو سمجھیے گا کوئی کمینہ تھا۔ خدا نے منہ دیا ہے۔ تو رزق بھی دے گا۔ اس سودیشی کے زمانہ میں مَیں بھوکوں نہ مروں گا۔

یہ کہہ کر میاں امجد آبدیدہ ہو کر اترنے لگے کہ ایجاد حسین نے پھر بلایا اور تشفی کے لہجہ میں بولے۔ آپ تو بس ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو کہ یہاں گھر میں کتنا خرچ ہے۔ کثیرالاولاد ہی خدا کی مار ہے۔ اس پر پورا لواحقین کا جماؤ ٹڈیوں کا دل ہے۔ جو دم زدن میں درخت کی ٹھونٹھ کر دیتا ہے۔ کیا کروں؟ اولاد کی پرورش فرض ہے۔ اور لواحقین سے بے مروّتی کرنا اپنی سرشت میں نہیں۔ اس جال میں پھنس کر طرح طرح کی چالیں چلتا ہوں۔ طرح طرح کے سوانگ بھرتا ہوں پھر بھی چول نہیں بیٹھتی۔

اب اندر تاکید کردوں گا۔ کہ جو کچھ پکے وہ آپ کو ضرور ملے۔ دیکھیے اب کوئی اوپر نہ
آنے پائے۔

امجد۔ میں نے تو قسم کھالی ہے۔

ایجاد۔ ارے میاں کیسی باتیں کرتے ہو ایسی قسمیں دن میں سینکڑوں بار کھایا کرتے ہیں۔
جایئے دیکھیے۔ پھر کوئی شیطان آیا ہے۔

میاں امجد نیچے آئے تو سچ مچ ایک شیطان کھڑا تھا۔ پستہ قامت گٹھا ہوا بدن۔ سیاہ فام۔ تنزیب کا نیچا کرتا پہنے ہوئے امجد کو دیکھتے ہی بولا۔ مرزا سے کہہ دو۔ وفاتی آیا ہے۔

امجد۔ نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ مرزا صاحب کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔

وفاتی۔ میاں کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ ابھی گوپال داس کا آدمی ملا تھا۔ کہتا تھا کہ اوپر کمرے
میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے جلدی کیا اُڑ کر چلے گئے؟

امجد۔ اس نے تمھیں جھانسا دیا ہوگا۔ مرزا صاحب تو کل ہی سے نہیں ہیں۔

وفاتی۔ تو میں ذرا اوپر جاکر دیکھ نہ آؤں؟

امجد اوپر جانے کا حکم نہیں ہے۔ بیگمات بیٹھی ہوں گی۔ یہ کہہ کر وہ زینہ کا دروازہ روک کر کھڑے ہوگئے۔ وفاتی نے ہاتھ سے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور زینہ پر چڑھا۔ امجد نے پیچھے سے اس کو پکڑلیا۔ وفاتی نے جھلاّ کر ایسا جھونکا دیا۔ کہ میاں امجد گرے اور لڑھکتے ہوئے نیچے آگئے۔ لونڈوں نے زور کا قہقہہ مارا۔ وفاتی نے اوپر جاکر دیکھا۔ تو مرزا صاحب بہ نفس نفیس مسند لگائے ہوئے رونق افروز ہیں۔ بولا۔ واہ مرزاجی واہ۔ آپ کا عجیب حال ہے۔ کہ آپ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور گھر والے کہتے ہیں۔ کہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اب بھی دام دیجیے گا یا کیامت کے دن ہی حساب ہوگا؟ دوڑتے دوڑتے تو پیروں میں چھالے پڑگئے۔

مرزا۔ اوہ اس سے بہتر کیا ہوگا؟ قیامت کے دن تمھاری کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔ اس وقت
زندگی بھر کا اندوختہ پاس رہے گا۔ کوئی دقت نہ ہوگی۔

وفاتی۔ لایئے لایئے آج دلوایئے۔ برسوں ہوگئے۔ آپ یتیم خانہ کے نام پر چاروں طرف
سے ہزاروں روپے لیتے ہیں۔ میرا کیوں نہیں دیتے؟

مرزا۔ میاں کیسی باتیں کرتے ہو؟ دنیا نہ ایسی اندھی ہے اور نہ ایسی احمق۔ اب لوگوں کے

دل پتھر ہوگئے ہیں۔ کوئی پسیجتا ہی نہیں۔ اگر اس طرح روپے برستے۔ تو تقاضوں میں ایسا کون سا مزا ہے۔ کہ اٹھایا کرتا۔ یہ اپنی مجبوری ہے۔ کہ تم لوگوں سے نادم ہونا پڑتا ہے۔ خدا کے لیے ایک ماہ اور صبر کرو۔ دسمبر کا مہینہ آنے دو۔ جس طرح دسمبر میں ہماری فصل تیار ہوتی ہے۔ ہر ایک شہر میں جلسے ہونے لگتے ہیں۔ اب کے میں نے وہ منتر جگایا ہے۔ جو کبھی بے اثر ہو ہی نہیں سکتا۔

وفاتی۔ اس طرح حیلہ حوالہ کرتے تو آپ کو برسوں ہوگئے۔ آج کچھ نہ کچھ پچھلے حساب میں تو دے دیجیے۔

مرزا۔ آج تو اگر حلال بھی کرڈالو تو لاش کے سوا اور کچھ نہ پاو گے۔

وفاتی مایوس ہوکر چلا گیا۔ مرزا صاحب نے اب کے جاکر زینہ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اور پھر ہارمونیم سنبھالی۔ کہ پوسٹ مین نے پکارا۔ مرزا صاحب خطوط کا عاشقانہ بیتابی کے ساتھ انتظار کیا کرتے تھے۔ جاکر دروازہ کھولا۔ اور اخبارات وخطوط کا ایک بنڈل لیے خوش خوش اوپر آئے۔ پہلا خط ان کے بڑے صاحبزادے کا تھا۔ جو الہ آباد میں قانون پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے ایک سوٹ اور قانونی کتاب کے لیے روپے طلب کیے تھے۔ مرزاصاحب نے جھنجھلا کر خط کو پٹک دیا۔ جب دیکھو روپیوں کا تقاضا گویا یہاں روپے پھلتے ہیں۔ دوسرا خط ایک یتیم لڑکے کا تھا۔ مرزاصاحب نے احتیاط سے صندوق میں رکھا۔ تیسرا خط ایک سیوا سمتی(انجمن خادمان) سے آیا تھا۔ اس نے اتحادی یتیم خانہ کے لیے بیس روپیہ ماہوار کی امداد پیش کی تھی۔ اس خط کو پڑھ کر وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑے۔ اور اس کو کئی بار آنکھوں سے لگایا۔ اس کے بعد اخبارت کی باری آئی۔ لیکن مرزا صاحب کی نگاہ مضامین یا خبروں پر نہ تھی۔ وہ صرف اتحادی یتیم خانہ کی تعریفی اذکار کے متلاشی تھے مگر اس بارے میں اُنھیں گونہ مایوسی ہوئی۔ جب کسی اخبار میں بھی اس کا کچھ ذکر نہ ملا۔ دفعتاً ان کی نگاہ ایک ایسی خبر پر پڑی کہ وہ خوشی سے پھڑک اٹھے۔ گورکھپور میں سناتن دھرم سبھا کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا۔ گیان شنکر اس کے سیکرٹری تھے۔ علماء سے استدعا کی گئی تھی۔ کہ وہ اپنے قدموں سے جلسہ کو رونق بخشیں۔ مرزاصاحب بھی سفر کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔

مسٹر گیان شنکر کا مذہبی انہماک اس قدر بڑھا۔ کہ اُنھیں دنیاوی باتوں سے نفرت ہونے لگی۔ دنیا سے جی اچاٹ ہوگیا۔ وہ اب بھی علاقہ کا سارا انتظام اتنے ہی حوصلہ اور محنت سے کرتے تھے۔ لیکن اب سختی کے بجائے نرمی سے کام لیتے تھے۔ مقررہ لگان کے علاوہ ہر کاشتکار سے ٹھاکر دوارہ اور دھرم شالہ کا چندہ بھی لیا جاتا تھا۔ مگر اس رقم کو وہ اس خوش اسلوبی سے وصول کرتے کہ کسی کو مطلق شکایت نہ ہوتی۔ اب وہ اخراج اضافہ اور بقایا کے مقدمات بہت کم دائر کرتے۔ کاشتکاروں کو بنک سے برائے نام سود پر روپے دیتے اور سوائی ڈیوڑھے کی جگہ صرف آٹھواں حصہ وصول کرتے۔ ان کاموں سے جو وقت ملتا اسے ٹھاکر دوارے اور دھرم شالے کی نگرانی میں لگاتے۔ دور دور سے ہوشیار معمار بلائے گئے تھے۔ جو گل کاری۔ نقاشی۔ مصوری وغیرہ کے ماہرینِ فن تھے۔ جے پور سے سنگ مرمر کی گاڑیاں بھری چلی آتی تھیں۔ چنار اور گوالیار سے انواع اقسام کے پتھر منگوائے جاتے تھے۔ گیان شنکر کا دلی منشا تھا۔ کہ دونوں عمارتیں لاثانی ہوں۔ اور گائتری تو یہاں تک تیار تھی۔ کہ ریاست کی ساری آمدنی تعمیر ہی میں صرف ہوجائے۔ تو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ میں صرف سیر کی آمدنی پر گزر بسر کرلوں گی۔ لیکن گیان شنکر آمدنی کے ایسے ایسے ذریعے کھوج نکالتے تھے۔ کہ اس قدر صرفِ کثیر کے باوجود بھی ریاست کے سالانہ محاصل میں ذرا بھی تخفیف نہ واقع ہوتی تھی۔ بڑے بڑے مواضعات میں پانچ چھ بازاریں لگوا دیں۔ دوچار نالوں پر پل بندھوا دیے۔ کئی مقامات پر پانی کے روکنے کے لیے بند قائم کردیے۔ آبپاشی کی چند کلیں منگا کر کرایہ پر چلانے لگے۔ تیل نکالنے کا ایک بڑا کارخانہ کھول دیا۔ ان ذرائع سے علاقہ کی آمدنی میں تخفیف کے بجائے کچھ اضافہ ہوگیا۔ گائتری تو ان کے حسنِ انتظام کی اتنی قائل ہوگئی تھی۔ کہ کسی معاملہ میں ذرا بھی اعتراض نہ کرتی۔

گیان شنکر کی وضع قطع طور وطریق میں بھی اب نمایاں فرق نظر آتا تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال تھے۔ بوٹ کی جگہ عموماً کھڑاویں۔ کوٹ کے بجائے ایک ڈھیلا ڈھالا گھٹنوں سے نیچے تک کا گیروے رنگ میں رنگا ہوا کُرتا پہنتے تھے۔ یہ پوشاک ان کے بدن پر خوب پھبتی تھی۔ ان کے چہرہ پر بھی ایک نورانی جلوہ نظر آتا تھا۔ اور ان کی باتوں میں ایک

دلکش سادگی تھی ۔ اب بحث اور دلائل کا اُنھیں شوق نہ تھا۔ اس طرح باتیں کرتے گویا اُنھیں عین الیقین ہے۔ اگر کوئی شک کرتا۔ تو وہ اس کا جواب ایک پُر معنی تبسم سے دیتے تھے۔ جو ہزاروں دلیلوں سے زیادہ موثر ہوتی تھی۔

ان کے دیوان خانہ میں اب کرسیوں اور میزوں کے بجائے ایک صاف ستھرا فرش تھا۔ جس پر مسند اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سامنے ایک خوش نما صندلی سنگھاسن پر ننھے کرشن کی مورت رکھی ہوئی تھی۔ کمرہ میں روز اگر کی بتیاں جلا کرتی تھیں۔ وہاں جاتے ہی خوشبو سے دماغ معطر ہوجاتا تھا۔ اور اس کی صفائی اور سادگی دل کو عقیدت سے معمور کردیتی تھی۔ یہ بلبھ پنتھ کر پیرو تھے۔ پھولوں سے دلکش نغموں سے شاعرانہ جذبات سے اُنھیں خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ جو روحانی ترقی کا خاص نشان ہے۔ حسن پرستی ہی ان کے مذہب کا خاص جزو تھا۔ اس وقت وہ ایک ستاریے سے سیتار بجانا سیکھتے تھے۔ ستار پرسور داس لے بھجن سن کر وہ مست ہوجاتے تھے۔ گائتری پر اس محبت کی کیفیت کا رنگ اور بھی زیادہ گہرا تھا۔ وہ میرابائی کی طرح کرشن کی مورت کو نہلاتی۔ اسے کپڑوں اور گہنوں سے سجاتی۔ اس کے لیے طرح طرح کے لذیذ کھانے بناتی۔ اور اس کے سامنے نشۂ محبت سے سرشار ہو کر گھنٹوں بھجن کیرتن کیا کرتی۔ آدھی رات ان کی داستانیں سنتی اور سناتی۔ اب اس نے پردہ کرنا چھوڑدیا تھا۔ سادھو سنتوں کے پاس بیٹھ کر ان سے پریم اور گیان کی باتیں سنا کرتی۔ مگر ان باتوں سے اس کو روحانی سکون ملنے کے بجائے اس پر ہمیشہ بیتابی اور دردانگیز فراق کی کیفیت طاری رہتی۔ اس کا دل ہمیشہ ایک نامعلوم آرزو سے بے قرار رہتا تھا۔ وہ خود معلوم نہ کرسکتی تھی۔ کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ دراصل وہ رادھا کرشن کی محبت کی اصلیت کو نہ سمجھ سکتی تھی۔ اس کی مادی نگاہ اس محبت کے ظاہری قصہ سے آگے نہ جاسکتی تھی۔ اور اس کا دل اس محبت کے تصورات سے آسودہ اور مطمئن نہ ہوتا تھا۔ وہ اس کیفیت کا عملی احساس کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہجرو وصال۔ سوز و درد۔ راز و نیاز۔ سیر وتفریح کو ان کی واقعی صورتوں میں دیکھنا چاہتی تھی۔ پہلے شوہر پرستی کی یاد ہی اس کے لیے سب کچھ تھی دریا اپنے کناروں کے اندر ہی ہلکورے لیا کرتا تھا۔ اب اس کو اس یاد کا نقش کچھ پھیکا۔ کچھ لٹا ہوا کچھ بگڑا سا معلوم ہوتا تھا۔ دریا امنڈ گیا تھا۔ عفت پروری کا وہ باندھ جو خاندانی عزت اور خوداری پر قائم تھا۔ اس بھگتی اور محبت

کی باڑھ سے ٹوٹ گیا۔ معرفت دنیاوی بندشوں کا کیسا خیال کرتی ہے؟ وہ اب ان خیالات وتصورات کو بلا کسی پس وپیش کے اپنے دل میں جگہ دیتی تھی۔ جنھیں وہ پہلے شعلوں سے کم نہ سمجھتی تھی۔ اسے اب صرف کرشن لیلا کے دیکھنے ہی سے تسکین نہ ملتی تھی۔ بلکہ وہ خود بھی کوئی نہ کوئی پارٹ کھیلنا چاہتی تھی۔ وہ ان دلی جذبات کو زبان سے حرکات وسکنات سے ظاہر کرنا چاہتی تھی جو اس کے دل کی فضا میں پرندوں کی طرح آزادی سے اڑ رہے تھے۔ اور اس کا کرشن کون تھا؟ وہ خود اسے تسلیم کرنے کی جرأت نہ کرسکتی تھی۔ مگر اس کرشن کی شباہت گیان شنکر سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ وہ اپنے کرشن کو اُنھیں کی صورت میں آشکارا دیکھتی تھی۔

گائتری پہلے بھی فیاض تھی۔ اب اس میں اور بھی فیاضی آگئی تھی۔ اس کے یہاں اب ہمیشہ سدا برت چلتا تھا۔ جتنے سادھو سنت آجائیں ان سب کی تواضع وتکریم کی جاتی تھی۔ وہ ملک کی مذہبی اور قومی جماعتوں کو بھی حتی الامکان مدد دیتی تھی۔ اب اسے سناتن دھرم سے خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ پس اب کے جب سناتن دھرم کا جلسہ گورکھپور میں کیا جانا طے ہوا تو ممبروں نے کثرتِ رائے سے رانی گائتری کو پریسیڈنٹ منتخب کیا۔ یہ پہلا ہی موقع تھا۔ کہ یہ اعزاز ایک خاتون کو دیا گیا تھا۔ گائتری کو رانی کا خطاب ملنے سے بھی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی۔ جتنی کہ اس اعزاز سے۔ اس نے گیان شنکر کو جو سناتن دھرم سبھا کے سکریٹری تھے طلب کیا اور اُنھیں اپنے زیورات کا صندوقچہ دے کر بولی۔ اس میں پچاس ہزار کے زیورات ہیں۔ میں اُنھیں سناتن دھرم سبھا کے نذر کرتی ہوں۔

اخبارات میں یہ خبر شائع ہوگئی۔ جلسہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سیکرٹری صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھتے تھے۔ ایسا وسیع شاندار پنڈال شاید ہی کبھی بنا ہو۔ مہمانوں کی ضیافت اور رہائش کا ایسا اچھا انتظام کبھی نہ کیا گیا تھا۔ اوپدیشکوں کے لیے ایسے نذرانے کبھی نہ تجویز ہوئے تھے اور نہ عوام جلسہ سے کبھی اتنی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ والنٹیروں کے غول کے غول زرق برق وردیاں پہنے ہوئے چاروں طرف دوڑتے پھرتے تھے۔ پنڈال کے احاطہ میں سینکڑوں دُکانیں نظر آتی تھیں۔ ایک سرکس اور دو تھیٹر کی کمپنیاں بھی بلائی گئی تھیں۔ کل شہر میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ بازاروں میں ایک خاص رونق تھی۔ سڑکوں پر دودھیا برقیں اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔

جلسہ کے ایک روز قبل سے لیکچرار اور پنڈت وغیرہ آنے لگے۔ ان کے لانے کے لیے اسٹیشن پر موٹرگاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ ان لوگوں میں کتنے ہی سنیاسی بھی تھے۔ وہ تلک دھاری پنڈتوں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور موٹروں پر بیٹھنے کے لیے پیش قدمی کرتے تھے۔ ایک سنیاسی مہاتما جنھیں وڈیا رتن کا خطاب ملا ہوا تھا۔ موٹر نہ ملنے سے اس قدر ناراض ہوگئے۔ کہ بہت منت سماجت کرنے پر بھی فٹن پر نہ بیٹھے۔ پنڈال تک پیدل ہی آئے۔

لیکن جس کروفر کے ساتھ ایجادحسین صاحب تشریف لائے وہ کسی اور کو میسر نہ تھا۔ جس وقت وہ پنڈال میں پہنچے جلسہ شروع ہوگیا تھا۔ اور ایک ودوان پنڈت صاحب بدھوا بیاہ پر گل فشانی کررہے تھے۔ ایسے رکیک مسئلہ پر متانت سے غور کرنا نامناسب سمجھ کر وہ اس کا خوب مضحکہ اڑا رہے تھے۔ اور موقعہ موقعہ پر ظرافت اور طنز ابتذال اور تمسخرے سے کام لیتے تھے۔

"سجنو! یہ کوئی گلپت(فرضی) گھٹنا (واقعہ) نہیں۔ میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ میرے پڑوس میں ایک بابوصاحب رہتے تھے۔ ایک دن وہ اپنی ماتا سے بدھوا بیاہ کی تعریف کررہے تھے۔ ماتاجی نے گمبھیر(متین) بھاؤ سے کہا۔ بیٹا۔ میری ایک بنتی ہے۔ اسے مانو۔ کیوں میرا بھی نہیں کسی سے بیاہ کردیتے؟ دیس بھر کی بدھوائیں سہاگن ہوجائیں گی۔ تو مجھ سے کیسے رہا جائے گا؟" سامعین نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ قہقہوں سے پنڈال گونج اٹھا۔

اتنے میں سیدایجادحسین صاحب پنڈال میں وارد ہوئے۔ آگے آگے چار لڑکے ایک قطار میں تھے۔ دو ہندو اور دو مسلمان۔ ہندو لڑکوں کی دھوتیاں اور کُرتے زرد رنگ کے تھے۔ مسلمان لڑکے سبز رنگ کے کرتے اور پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے چار لڑکیوں کی ایک قطار تھی۔ دو ہندو اور دو مسلمان۔ ان کی پوشش میں بھی وہی امتیاز مدِنظر رکھا گیا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں رنگین جھنڈیاں تھیں۔ جن پر سفید حروف میں "اتحادی یتیم خانہ" لکھا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے سیدایجادحسین تھے۔ گورا رنگ۔ سفید بال۔ سر پر سبز عمامہ۔ سیاہ الپاکے کی عبا۔ سفید تن زیب کی اچکن۔ سلیم شاہی جوتہ گویا پاگیزگی اور شرافت کے مجسمہ تھے۔ ان کے ہاتھ میں بھی اسی قسم کی ایک جھنڈی تھی۔ ان کے پیچھے ان کے

صاحبزادے سیدارشاد حسین تھے۔ لانبا قد۔ ناک پر سنہری عنیک۔ البرٹ فیشن کی داڑھی۔ تُرکی ٹوپی۔ نیچی اچکن۔ سراپا زندہ دلی کی تصویر بنے ہوئے۔ سب سے پیچھے سازندے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ہارمونیم تھا۔ اور دوسرے کے ہاتھ میں طبلے۔ بقیہ دو آدمی کرتال لیے ہوئے تھے۔ ان سب کی وردیاں ایک ہی قسم کی تھیں اور ان ٹوپیوں پر انجمن اتحاد کی مہر لگی ہوئی تھی۔ پنڈال میں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ سب کے سب اتحاد کے ان علم برداروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پنڈت کا دلکش لیکچر پھیکا پڑگیا۔ انھوں نے بہت اچھل کود کی اپنی ساری ظرافت صرف کردی۔ سوقیانہ کبت سنائے۔ ایک بھدی سی غزل بھی بے سرے راگ میں گائی۔ مگر کسی طرح رنگ نہ جما۔ سارا مجمع اتحادیوں کا گرویدہ ہورہا تھا۔ ایجاد حسین ایک شان کے ساتھ پلیٹ فارم پر جاپہنچے۔ وہاں کئی سنیاسی۔ مہاتما۔ کئی اوپدیشک۔ نقرئی کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ سبھوں نے سیدصاحب کو حسد کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور اپنی جگہوں سے نہ ہٹے۔ صرف بھگت گیان شنکر ہی ایک ایسے شخص تھے۔ جنھوں نے ہنستے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ اور پلیٹ فارم پران کے لیے ایک کرسی رکھوادی۔ لڑکے اور سازندے پلیٹ فارم کے نیچے بیٹھ گئے۔ اوپدیشک اور مہاتما سب کے سب دل ہی دل میں ایسا کڑھ رہے تھے۔ گویا ہنسوں کی سبھا میں کوئی کوا آگیا ہو۔ دو ایک زندہ دل حضرات نے دبی زبان سے پھبتیاں بھی اڑائیں۔ مگر سیدایجاد حسین کے تیور پر ذرا بھی بل نہ پڑا۔ وہ اس اپنی سبکی کے لیے تیار تھے۔ ان کے چہرہ سے پرسکون استقلال جھلک رہا تھا۔ جو مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کانٹوں میں بھی راہ نکال لیتا ہے۔

پنڈت جی نے اپنا رنگ جمتا نہ دیکھا۔ تو اپنی تقریر ختم کردی۔ اور جگہ پر آ بیٹھے۔ حاضرین جلسہ نے سمجھا۔ کہ اب اتحادیوں کے راگ سننے میں آئیں گے۔ سب نے کرسیاں آگے کھسکائیں۔ اور ہمہ تن گوش ہوکر بیٹھ گئے مگر اوپدیشکوں سے یہ کب برداشت ہوسکتا تھا۔ کہ کوئی مسلمان ان سے سبقت لے جائے۔ ایک سنیاسی صاحب نے فوراً اپنا لیکچر شروع کردیا۔ یہ حضرت ویدانت کے ماہر اور جوگ کے عامل تھے۔ سنسکرت کے عالم تھے۔ وہ ہمیشہ سنسکرت ہی بولتے تھے۔ ان کی نسبت مشہور تھا۔ کہ سنسکرت ہی ان کی مادری زبان ہے۔ ان کی تقریر کو لوگ اسی شوق سے سنتے تھے۔ جیسے چنڈول کا گانا سنتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ مگر ان کی قابلیت اور روانی بیان کا رعب دلوں پر طاری

ہوجاتا تھا۔ وہ ایک عجیب انسان سمجھے جاتے تھے۔ اور یہی ان کی ہردل عزیزی کا سبب تھا۔ مجمع کتنا ہی خاطر برداشتہ ہو رہا ہو۔ مگر ان کے پلیٹ فارم آتے ہی اٹھنے والے بیٹھ جاتے تھے۔ اور جانے والے رک جاتے تھے۔ محفل جم جاتی تھی۔ اسی غرۃ پر اس وقت انھوں نے اپنی تقریر شروع کی مگر آج ان کا جادو بھی نہ چلا۔ اتحادیوں نے ان کا رنگ بھی پھیکا کردیا۔ انھوں نے سنسکرت کی جھڑی لگادی۔ خوب تڑپے خوب گرجے۔ مگر وہ بھادوں کی نہیں بلکہ چیت کی بارش تھی۔ بالآخر وہ بھی تھک کر بیٹھ رہے۔ اور اب کسی بھی اوپدیشک کو کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اتحادیوں نے میدان مار لیا۔

گیان شنکر نے کھڑے ہو کر کہا۔ "اب انجمنِ اتحاد کے بانی سیدایجادحسین صاحب اپنی امرت بانی سنائیں گے۔ آپ لوگ دھیان دے کر سنیں۔"

پنڈال میں سکوت چھا گیا۔ لوگ سنبھل بیٹھے۔ ایجادحسین نے ہارمونیم اٹھا کر میز پر رکھا۔ سازندوں نے ساز نکالے۔ یتامیٰ حلقہ باندھ کر بیٹھے۔ سیدایجادحسین نے انجمن اتحاد کے قواعد کا پلندہ نکالا۔ لمحہ بھر میں ایک نعتیہ غزل کے نغمے پنڈال میں گونجنے لگے۔ لڑکوں کی آواز میں ایک خاص لوچ ہوتا ہے۔ ان کا ہمنوا ہوکر گانا۔ اس پر ساز کی موافقت۔ ایک سماں چھا گیا۔ ساری مجلس محو ہو کر رہ گئی۔

نغمہ بند ہوگیا۔ اور سیدایجادحسین بولنا شروع کیا۔ "پیارے دوستوں۔ آپ کو حیرت ہوگی۔ کہ ہنسوں میں یہ کوا کیوں کر آگھسا۔ اولیاء کے مجمع میں یہ بھانڈ کیسے آپہنچا۔ یہ میری تقدیر کی خوبی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ جسم حادث ہے اور روح قدیم۔ میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے ظاہر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نام وہی ہے۔ لمبی داڑھی وہی ہے۔ لباس وہی ہے۔ مگر میری روح کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ ظاہر سے مغالطہ میں نہ آیئے۔ دل میں بیٹھ کر دیکھیے۔ وہاں جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ "ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندستان ہمارا"

لڑکوں اور سازندوں نے علامہ اقبال کی مشہور غزل الاپنی شروع کی۔ مجلس لوٹ پوٹ ہوگئی۔ لوگوں کی آنکھوں سے غرور کی شعاعیں نکلنے لگیں۔ کوئی موچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ کسی نے بے بسی کی لمبی سانس بھری۔ کسی نے اپنے بازوؤں پر نگاہ ڈالی ۔ اور کتنے ہی اہلِ دل کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ خصوصاً اس مصرعہ پر "ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان

ہمارا" تو ساری مجلس تڑپ گئی۔ لوگوں نے کلیجے تھام لیے۔ بندے ماترم کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا۔ گانا بند ہوتے ہی پھر تقریر شروع ہوئی "بھائیو۔ مذہب دل کی تسکین کے لیے ہے۔ دنیا کمانے کے لیے نہیں ملکی حقوق حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ وہ آدمی جو مذہب کی آڑ میں دولت وعزّت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اگر ہندو ہے تو ملیچھ ہے۔ اور مسلمان ہے تو کافر ہے۔ ہاں کافر ہے۔ مردود ہے۔ رُوسیاہ ہے۔"

تالیوں کی صدا سے پنڈال ہل گیا۔

"ہم ستر پشتوں سے اسی سرزمین کا دانہ کھا رہے ہیں۔ اسی سرزمین کے آب و گِل سے ہماری سرشت ہوتی ہے۔ تُف ہے اُس مسلمان پر جو حجاز وعراق کو اپنا وطن کہتا ہے۔"

پھر تالیاں بجیں۔ ایک گھنٹہ تک تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ سیدصاحب نے گویا مجلس پر جادو ڈال دیا۔ ان کا خوددارانہ انکسار۔ ان کی صاف گوئی ان کی میٹھی چٹکیاں ان کی قومیت میں ڈوبی ہوئی باتیں۔ ان کی نکتہ چینیاں۔ ان کی حب الوطنی اس پر ان کی رواں بیانی اور بلند خیالی اور موقع موقع پر قومی گیتوں کے نغموں نے لوگوں کو باکل گرویدہ بنالیا۔ دلوں میں بیداری کی لہریں اٹھنے لگیں۔ کوئی سوچتا تھا۔ کہ نہ ہوئے اس وقت میرے پاس ایک لاکھ روپے کہ ابھی لٹا دیتا۔ کوئی سوچتا تھا۔ کہ بال بچوں کی فکر نہ ہوتی۔ تو گلے میں جھولی باندھ کر قوم کے لیے بھیک مانگتا۔

اس طرح قومی جذبات کو اکسا کر۔ زمین کو پولی بناکر سیدصاحب مطلب پر آئے۔ تخم ریزی شروع کی۔ "دوستو۔ اب مذہب پروری کا زمانہ نہیں رہا۔ پرانی باتوں کو بھول جائیے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ آریوں نے یہاں کے اصلی باشندوں پر صدیوں تک حکومت کی۔ آج وہی شُودر، آریوں کے تمدنی نظام میں داخل ہیں۔ دشمنوں کو حسنِ سلوک سے دوست بنا لینا آپ کے بزرگوں کی صاف صفت تھی وہ صفت آپ میں بھی موجود ہے۔ آپ نے بارہا ہم سے گلے ملنے کے لیے پیش قدمی کی۔ مگر ہم "پدرم سلطان بود" کے زعم میں آپ سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے۔ لیکن دوستو۔ ہماری بدگمانی سے ناراض نہ ہو۔ تم زندہ قوم ہو۔ تمھارے دلوں میں درد ہے۔ ہمّت ہے۔ فیّاضی ہے۔ ہماری تنگ دلی کو بھول جائیے۔ اسی بیگانہ قوم کا ایک فرد۔ یہ فقیر۔ آج آپ کی خدمت میں یہ پیغام لے کر حاضر ہوا ہے۔ اسی کی حوصلہ افزائی کیجیے۔ اتحاد کا یہ ننھا سا مرجھایا ہوا پودا آپ کی

طرف بھوکی پیاسی نظروں سے تاک رہا ہے۔ اسے اپنی دریا دلی کے اُبلتے ہوئے چشموں سے سیراب کردیجیے۔ اس وقت آپ دیکھیں گے۔ کہ پودا کتنی جلد تناور درخت ہوجاتا ہے۔ اور اس کے اثمارِشریں سے کتنوں کی زبانیں تر ہوتی ہیں۔ ہمارے دل میں بڑے بڑے حوصلے ہیں۔ بڑے بڑے منصوبے ہیں۔ ہم اتحاد کی صدا سے اس پاک سرزمین کے ایک ایک گوشہ کو بھردینا چاہتے ہیں۔ اب تک جو کچھ کیا ہے۔ آپ ہی نے کیا ہے۔ آئندہ جو کچھ کریں گے۔ آپ ہی کریں چندہ کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔ وہ آپ ہی کے اسمائے گرامی سے پر ہے۔ اور سچ پوچھیے۔ تو آپ ہی اس کے بانی ہیں۔ رانی گائتری کنور صاحبہ کی سخاوت کی شہرت اس وقت چار دنگ عالم میں ہے۔ بھگت گیان شنکر کی قوم پروری کیا کوئی چھپی ہوئی بات ہے؟ وزیرے چنیں شہریارے چناں۔ ایسے پاک نفوس جس قوم میں ہوں۔ وہ بیشک خوش نصیب ہے۔ آج جب میں نے اس شہر کی پاک سرزمین پر قدم رکھا۔ تو باشندگانِ شہر کے اخلاق ومروّت اور ان کی مہمان نوازیوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا۔ کہ یہ اس مذہبی جوش کی برکت ہے۔ یہ پریم کے اوتار سری کرشن جی کی بھگتی کا اثر ہے۔ جس نے لوگوں کو انسانی درجہ سے اٹھاکر فرشتوں کا ہم سر بنا دیا ہے۔ حضرات۔ میں عرض نہیں کرسکتا۔ کہ میرے دل میں سری کرشن جی کی کتنی عزت ہے۔ اس سے خواہ میری مسلمانی پر طعنے کیوں نہ دیے جائیں۔ پر میں بہ آوازبلند کہتا ہوں۔ کہ وہ روح پاک الوہیت کے اس درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ جہاں تک کسی نبی یا پیغمبر کو پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ آج اس جلسہ میں میں سچّے دل سے انجمن اتحاد کو اسی روح پاک کے نام پر معنون کرتا ہوں۔ مجھے امید نہیں‌یقین ہے۔ کہ ان کے بھگتوں کے سامنے میری درخواست نامنظور نہ ہوگی۔ اتحادی یتیم خانہ کے بچّے آپ کی طرف آرزومند نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ قومی فقیر آپ کے دروازہ پر کھڑا ہوا دعائیں دے رہا ہے۔ اس لمبی داڑھی پر نگاہ ڈالیے۔ ان سفید بالوں کی لاج رکھیے۔

پھر ہارمونیم بجا۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ کرتال کی جھنکار کی۔ اور ایجاد حسین کا شکوہ شروع ہوا۔ حاضرین کے کلیجے مسوس اٹھے۔ چندہ کی اپیل ہوئی تو رانی گائتری دیوی کی طرف سے ایک ہزار کا اعلان ہوا۔ بھگت گیان شنکر نے یتیم خانہ کو ایک گاۓ دی۔ چاروں طرف سے لوگ چندہ دینے کو لپکے۔ ادھر تو چندہ کی فہرست گھمائی جا رہی تھی۔

ادھر سید ارشاد حسین نے انجمن کے پمفلٹ اور تمغے بیچنے شروع کیے۔ تمغے نہایت خوش نما تھے۔ لوگوں نے شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیے۔ ایک لمحہ میں ہزاروں سینوں پر یہ تمغے چمکنے لگے۔ دلوں پر دونوں طرف سے اتحاد کی چھاپ پڑگئی۔ کل چندہ کی میزان پانچ ہزار تھی۔ ایجاد حسین کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ انھوں نے پھر لوگوں کے شکریہ میں ایک غزل گائی اور آج کی کاروائی ختم ہوئی۔ رات کے دس بجے تھے۔

جب سید ایجاد حسین کھانا کھا کر لیٹے۔ اور خمیرہ کا ذائقہ لینے لگے۔ تو ان کے صاحبزادے نے فرمایا۔ اتنی امید تو آپ کو بھی نہ تھی۔

ایجاد۔ ہرگز نہیں۔ میں نے زیادہ سے زیادہ ایک ہزار کا اندازہ کیا تھا۔ مگر آج معلوم ہوا۔ کہ یہ سب کتنے احمق ہوتے ہیں۔ اسی اپیل پر کسی اسلامی جلسہ میں مشکل سے سو روپے ملتے۔ ان گوکھوں کی خوب تعریف کیجیے۔ ہجو ملیح کی حد تک ہو تو مضائقہ نہیں۔ پھر ان سے جتنا چاہے وصول کرلیجیے۔

ارشاد۔ آپ کی تقریر لاجواب تھی۔

ایجاد۔ اسی پر زندگی کا دارومدار ہے۔ نہ کسی کے نوکر نہ چاکر۔ بس دنیا میں کامیابی کا نسخہ ہے۔ یہ تو وہ شطرنج بازی ہے۔ آدمی ذرا لسان ہو۔ ذرا مردم شناش ہو اور ذرا گرہ باز ہو۔ بس اس کی چاندی ہے۔ دولت اس کی گھر کی لونڈی ہے۔

ارشاد۔ سچ کہو۔ ابا جان۔ کیا آپ کا کبھی یہ خیال تھا۔ کہ یہ سب دنیا سازی ہے۔

ایجاد۔ کیا تم مجھے معمولی آدمیوں سے بھی گیا گزرا ہوا سمجھتے ہو؟ یہ دغا بازی ہے۔ صریح دغابازی پر کروں کیا؟ اولاد اور خاندان کی محبت اپنی نجات کی فکر سے زیادہ وزندار ہے۔

(۴۰)

جلسہ نہایت خوش اسلوبی سے ختم ہوا۔ رانی گائتری کے خطبۂ صدارت پر سارے ملک میں واہ واہ مچ گئی۔ اس نے سناتن دھرم سبھا کے تاریخی حالات بیان کرنے کے بعد اس کے مدّ و جزر۔ اس کی اصلاح وتجدید۔ اس کی موافق ومخالف تحریکوں کا نہایت عالمانہ تبصرہ کیا تھا۔ اس کی موجودہ حالت اور آئندہ رفتار پر بھی نہایت محققانہ نگاہ ڈالی گئی تھی۔ اخباروں میں اِسے پڑھ پڑھ کر لوگ عش عش کرتے تھے۔ اور جنھوں نے اسے اپنے

کانوں سے سنا۔ وہ اس کا روحانی لطف کبھی نہ بھولیں گے۔ کیا اندازِ بیان تھا۔ کتنا سلیس کتنا شیریں اور کتنا موثر کتنا قابلانہ۔ تقریر کیا تھی ایک دلکش نغمہ تھا۔

تین دن گزر چکے تھے۔ گیان شنکر اپنے عالیشان محل میں اخباروں کا ایک دفتر سامنے رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آج کل ان کا یہی کام تھا۔ کہ اخباروں میں جہاں کہیں اس جلسہ کا ذکر دیکھتے۔ تو اسے کاٹ کر رکھ لیتے۔ گائتری اب گیان شنکر کو دیوتا کی طرح پوجتی تھی۔ اُنھیں کے بدولت آج تمام ملک میں اس کا شہرہ ہوگیا تھا۔ ان کے اس عظیم احسان کا ایک ہی معاوضہ تھا۔ اور وہ محبت آمیز عقیدت تھی۔

شام ہوگئی تھی۔ کہ دفعتاً گیان شنکر اخبارات کا ایک بنڈل لیے ہوئے اندر گئے۔ اور گائتری سے بولے۔ دیکھیے۔ رائے صاحب نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔

گائتری۔ نے چیں بہ جبیں ہوکر کہا۔ میرے سامنے ان کا نام نہ لیجیے۔ میں نے کتنی منت سماجت کی تھی۔ کہ ایک روز کے لیے جلسہ میں ضرور تشریف لایئے۔ مگر انھوں نے مطلق خیال نہ کیا۔ خط کا جواب تک نہ دیا۔ باپ ہیں تو کیا۔ میں ان کے ہاتھوں کبھی اپنی ذلت نہیں برداشت کرسکتی۔

گیان۔ میں نے تو سمجھا کہ ان کی لاپرواہی ہے۔ لیکن اس خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل وہ ایک دوسری ہی دھن میں ہیں۔ شاید اسی وجہ سے فرصت نہ ملی ہو۔

گائتری۔ کیا بات ہے؟ کسی انگریز سے لڑ تو نہیں بیٹھے؟

گیان۔ نہیں آج کل ایک سنگیت کانفرنس کی تیاری کر رہے ہیں۔

گائتری۔ ان کے یہاں تو اب بارھوں مہینے سنگیت کانفرنس ہوا کرتی ہے۔

گیان۔ نہیں۔ یہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوگا۔ ملک کے سبھی مشہور گوئیوں کے نام نوید کے خطوط بھیجے گئے ہیں۔ یورپ سے بھی چند ماہرینِ فن طلب کیے گئے ہیں۔ رؤسا اور حکام کو دعوتیں دی گئیں ہیں۔ جلسہ ایک ہفتہ تک ہوگا۔ یہاں کی گان وڈیا میں کچھ ترمیم اور اصلاح کرنا اس کا مقصد ہے۔

گائتری۔ ہماری گان وڈیا رِشیوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی کیا اصلاح کرے گا؟ اسی بھیرو اور دُھرپد کے شبد(الفاظ) جسودا نندن کی بنسی سے نکلے تھے۔ پہلے کوئی گا تو لے۔ سدھار کرنا تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

گیان۔ رائے صاحب کو کوئی اور فکر تو نہیں۔ ایک نہ ایک سوانگ بھرتے رہتے ہیں۔ قرض بڑھتا جاتا ہے۔ ریاست زیربار ہوتی جاتی ہے مگر وہ اپنی دُھن میں کسی کی کب سنتے ہیں؟ میرا خیال ہے۔ کہ اس وقت ان پر کوئی ساڑھے تین لاکھ کا قرض ہے۔

گائتری۔ اتنی دولت کرشن بھگوان کی سیوا میں خرچ کرتے تو پرلوک بن جاتا۔ چٹھیاں تو کھولیے۔ ضرور ان کا کوئی خط ہوگا۔

گیان۔ ہاں دیکھیے۔ یہ لفافہ اُنھیں کا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اُنھیں کا ہے۔ مجھے بلا رہے ہیں اور آپ کو بھی بلا رہے ہیں۔

گائتری۔ میں جاچکی۔ جب وہ یہاں آنے میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ تو مجھے کیا پڑی ہے۔ کہ ان کے جلسوں تماشوں میں شریک ہوں۔ ہاں وِدّیا کو چاہے پہنچا دیجیے۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ بھی وہاں دو روز سے زیادہ نہ ٹھہریں۔

گیان۔ اس کے بارے میں سوچ کر طے کروں گا۔ یہ دو خط برہل اور آم گاؤں کے کارندوں کے ہیں۔ دونوں لکھتے ہیں۔ کہ آسامیاں سبھا کا چندہ دینے سے انکار کرتے ہیں۔

گائتری کے تیور بدل گئے۔ پریم کی دیوی غصہ کی دیوی بن گئی۔ بولی۔ کیا دیہاتیوں میں بھی یہ ہوا پھیلنے لگی؟ کارندوں کو لکھ دیجیے کہ ان پاجیوں کے گھروں میں آگ لگوادیں۔ اور اُنھیں کوڑوں سے پٹوائیں۔ ان کی یہ مجال کہ میرے حکم کی تعمیل سے انکار کریں! دیوکی نندن تم ان پاپیوں کو چھما کرو! آپ آج ہی وہاں آدمی روانہ کریں۔ میں یہ حکم عدولی نہیں برداشت کرسکتی۔ یہ سب کے سب ناشکرے ہیں۔ کسی دوسرے راج میں ہوتے۔ تو آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا۔ میں ان کے ساتھ اتنی رعایت کرتی ہوں ان کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں۔ اُن کے لیے نقصان اٹھاتی ہوں اور اس کا یہ نتیجہ!

گیان۔ یہ منشی سینی کا خط ہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ ٹھاکر دوارے کا کام تین روز سے بند ہے۔ بیگاروں کو کتنی ہی تاکید کی جاتی ہے۔ پر کام پر نہیں آتے۔

گائتری۔ اُنھیں مزدوری تو دی جاتی ہے نا؟

گیان۔ جی ہاں۔ مگر زمیندارنہ شرح سے دی جاتی ہے۔ جو دو آنہ یومیہ ہے۔ عام شرح چھ آنہ یومیہ ہے۔

گائتری۔ آپ مناسب سمجھیں۔ تو رام سینی کو لکھ دیں۔ کہ چار آنہ یومیہ کے حساب سے مزدوری دی جائے۔

گیان۔ لکھ تو دوں۔ درحقیقت دو آنہ یومیہ میں ایک آدمی کا پیٹ بھی نہیں بھرسکتا لیکن ان جاہل دہقانوں پر رحم بھی کیا جائے۔ تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سے دب گئے۔کل کو چھے آنہ مانگنے لگیں گے۔ اور پھر بات بھی نہ سنیں گے۔

گائتری۔ تو پھر لکھ دیجیے کہ بیگاروں کو جبراً پکڑوالیں۔ اگر نہ آئیں۔ تو اُنھیں گاؤں سے نکال دیجیے۔ ہم خود ان کی حالت پر ترس کھا کر ان کے ساتھ اپنی جانب سے چاہے جو سلوک کریں۔ مگر یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کوئی اسامی میرے سامنے ہیکڑی جتائے۔ اپنا رعب داب قائم رکھنا ضروری ہے۔

گیان۔ یہ خط املیا کی بازار سے آیا ہے۔ ٹھیکیدار لکھتا ہے۔ کہ لوگ اپنی چیزوں کو اندر نہیں لاتے باہر درختوں کے نیچے بیٹھ کر سودا بیچتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارا جہاں جی چاہے گا بیٹھیں گے۔ ایسی حالت میں ٹھیکہ منسوخ کر دیا جائے۔ ورنہ میرا بڑا نقصان ہوگا۔

گائتری۔ بازار کے باہر بھی تو میری ہی زمین ہے۔ وہاں کسی کو دُکان رکھنے کا کیا حق ہے؟

گیان۔ کچھ نہیں بدمعاشی ہے۔ بازار میں فی روپیہ ایک پیسہ بیعائی دینی پڑتی ہیں۔ تول ٹھیک ٹھیک ہوتی ہے۔ کچھ پُن ارتھ دینا پڑتا ہے۔ باہر تو من مانا راج ہے۔

گائتری۔ یہ کیا بات ہے۔ کہ جو کام عوام کے فائدہ اور آرام کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اس کی بھی لوگ مخالفت کرتے ہیں۔

گیان۔ کچھ نہیں یہ انسانی فطرت ہے۔ انسان کو قدرتاً دباؤ سے جبر سے چاہے وہ اسی کے فائدہ کے لیے کیوں نہ ہو چڑھ ہوتی ہیں۔ کسان اپنے جاہل پروہت کے پیر دھو دھو کر پیے گا۔ مگر کارندہ کو خواہ وہ وِدّانی برہمن ہی کیوں نہ ہوں۔ سلام کرنے میں بھی اُسے تامل ہوتا ہے۔ یوں چاہے۔ وہ دن بھر دھوپ میں کھڑا رہے۔ لیکن کارندہ یا چپراسی کو دیکھ کر چارپائی سے اٹھنا بھی اسے شاق گزرتا ہے۔ وہ آٹھوں پہر اپنی پستی کے خیال سے دبا رہنا پسند نہیں کرتا۔ اپنی خوشی سے نیم کی پتیاں چبائے گا۔ لیکن حکماً دودھ اور شربت بھی نہ پیے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہمیں مجبوراً ان پر سختی کرنی

پڑتی ہے۔

اسی اثنا میں مایاشنکر ایک پیتامر اوڑھے ہوئے اوپر سے اترا۔ اس کی عمر چودہ سال سے متجاوز نہ تھی۔ لیکن بشرہ سے ایک عجیب متانت ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ جو اس عمر میں شاذ ہی دیکھا جاتا ہے۔ گیان شنکر نے پوچھا کہاں چلے منو؟

مایا نے کسی قدر تیکھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ گھاٹ کی طرف سندھیا کرنے جاتا ہوں۔

گیان۔ آج سردی بہت ہے۔ یہیں باغ میں کیوں نہیں کرلیتے؟

مایا۔ وہاں تنہائی میں دل خوب یکسو ہوجاتا ہے۔

وہ چلا گیا تو گیان شنکر نے کہا۔ اس لڑکے نے کچھ عجیب قسم کا مزاج پایا ہے۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ سواریاں سب موجود ہیں۔ مگر پیدل ہی جائے گا۔ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتا۔

گائتری۔ مہریاں کہتی ہیں۔ کہ اپنا بستر تک کسی کو نہیں چھونے دیتا۔ وہ بے چاریاں ان کا کام کرنے کو ترسا کرتی ہیں۔ مگر اسے کسی سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔

گیان۔ اس عمر میں کبھی کبھی یہ خبط سوار ہوہی جایا کرتا ہے۔ سنسار کا کچھ گیان تو ہوتا نہیں۔ کتابوں میں جن باتوں کی تعریف کی گئی ہے۔ ان پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ پر مجھے تو اس کی عقل میں کچھ فتور سا معلوم ہوتا ہے۔ اتنا بڑا ہوا۔ پیسے کی کچھ وقعت ہی نہیں سمجھتا۔ ابھی سو روپے دے دیجیے تو شام تک ایک کوڑی بھی پاس نہ رہ جائے گی۔ نہ جانے کہاں اڑا دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مانگتا کبھی نہیں۔ جب تک خود نہ دیجیے۔ اپنی زبان سے کبھی نہ کہے گا۔

گائتری۔ میرے خیال میں تو یہ اپنے پورب جنم میں کوئی سنیاسی مہاتما رہتے ہوں گے۔

گیان شنکر نے آج کی گاڑی سے بنارس جاکر وِدّیا کو ساتھ لیتے ہوئے لکھنؤ جانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ گائتری اصرار کے باوجود بھی جانے پر رضامند نہ ہوئی۔

(۴۱)

رائے کملانند کو دیکھے ہوئے ہمیں تقریباً سات سال ہوگئے مگر اتنا وقت گزر جانے پر بھی ان کی صحت میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔ ان کی طاقت وتوانائی ان کے طوروطریق

سب حسبِ سابق ہیں۔ اور حسبِ سابق ہی ان کا وقت سیر و شکار۔ پولو و ٹینس۔ عیش وعشرت میں گزرتا ہے۔ جوگ (مراقبہ) بھی کرتے ہیں۔ دولت کو انھوں نے ہمیشہ حقیر سمجھا۔ اور اب بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں۔ جو دُھن سوار ہوئی ۔ اسے پوری کرکے چھوڑتے ہیں۔ اس کی ذرا بھی فکر نہیں کہ روپے کہاں سے آئیں گے۔ وہ اب بھی کونسل کے ممبر ہیں۔ اس درمیان میں دو مرتبہ انتخاب ہوا اور دونوں مرتبہ کثیر رائے سے وہی چُنے گئے۔ اگرچہ کسانوں اور اوسط طبقہ کے لوگوں کو استحقاق مل گیا تھا۔ مگر رائے صاحب کے مقابلہ میں کون جیت سکتا تھا۔ کسانوں کے ووٹ ان کے دیگر معاونین کے ہاتھوں میں تھے اور قومی تحریکوں میں چندہ دے کر درمیانی درجہ کے لوگوں کو بھی اپنے ہاتھ میں کرلینا مشکل نہ تھا۔

رائے صاحب اتنے دنوں تک ممبر رہے۔ مگر اُنھیں اس بات کا گھمنڈ تھا۔ کہ میں نے اپنی طرف سے کونسل میں کبھی کوئی تجویز پیش نہیں کی۔ وہ کہتے مجھے خوشامدی ٹٹو کہنے میں اگر کسی کو خوشی ہوتی ہے۔ تو وہ شوق سے کہے۔ مجھے ملک وقوم کا دشمن کہنے سے اگر کسی کا پیٹ بھرتا ہے۔ تو بھرے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ مگر میں اپنی عادت کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ اگر رسی توڑا کر جنگل میں بلا روک ٹوک چر سکوں۔ تو میں آج ہی کھونٹے کو اکھاڑ پھینکو لیکن جب جانتا ہوں۔ کہ رسی توڑ دینے پر بھی میں باڑے کے باہر نہیں جاسکتا۔ بلکہ اوپر سے اور مار کھانے کا اندیشہ ہے۔ تو کھونٹے پر ہی کیوں نہ چپ چاپ کھڑا رہوں؟ اور کچھ نہ سہی۔ تو مالک کی مہربانی تو بنی رہے گی۔ جب اختیار حکّام کے ہاتھوں میں ہے تو ہمارے اعتراض پر یا ترکِ تعاون سے اس میں کوئی فرق نہیں واقع ہوسکتا۔ تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم بے فائدہ حکّام کی نکتہ چینی کریں۔ اور ان کی نگاہوں میں کھٹکیں۔ ہم کاٹھ کے پتلے ہیں۔ تماشے دکھانے کے لیے کھڑے کیے گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں ڈوری کے اشارے پر ناچنا چاہیے۔ یہ ہماری خام خیالی ہے۔ کہ ہم اپنے کو قوم کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ قوم تو ہم جیسوں کو جن کا وجود ہی اس کے خون پر ہے۔ کبھی اپنا ترجمان نہ بنائے گی۔ جس دن قوم میں اپنا نفع ونقصان سمجھنے کی قابلیت آجائے گی۔ اس دن ہم اور آپ کھیتوں میں پھاوڑے چلاتے نظر آئیں گے۔ ہماری ترجمانی کے دعوے کا انحصار کلیتًا ہماری خود غرضی اور جاہ طلبی پر ہے۔ ہم لوگ اپنی تنخواہوں کا مقابلہ انگریزں

سے کرتے ہیں کیوں؟ ہمیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر یہ روپے ہماری مٹھی میں نہ آکر قوم کی ترقی اور فلاح میں صرف ہوں تو بہتر ہے۔ انگریز لوگ اگر دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹورتے ہیں۔ تو بٹورنے دیجیے۔ وہ اسی مقصد سے اس ملک میں آئے ہیں۔ اُنھیں ہماری قوم پروری کا دعویٰ نہیں ہے۔ ہم تو قوم پروری کا دعویٰ کرتے ہوے بھی قوم کا گلا گھونٹ رہیں۔ ہم اپنی قومی بھارت کی تباہی کا رونا روتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ آپ کے ہاتھوں یہ حالت اور بھی ناقابلِ اصلاح ہوجائے گی۔ ہم بے شمار میلیں کھولیں گے۔ بے شمار کارخانے قائم کریں گے۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمارے دیہات ویران ہوجائیں گے۔ اور ہمارے کسان کارخانوں کے مزدور بن جائیں گے۔ قوم تباہ وبرباد ہوجائے گی۔ آپ اسی کو قومی عروج کا معیار سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ قومی زوال کا معیار ہے۔ قوم کی جو کچھ درگت ہوئی ہے۔ وہ ہمارے ہی ہاتھوں ہوئی۔ ہم زمیندار ہیں۔ مہاجن ہیں۔ وکیل ہیں۔ سوداگر ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔ سرکاری عہدیدار ہیں۔ ان میں سے کون قوم کی سچی ہمدردی اور قوم کی سچی ترجمانی کا دعویٰ کرسکتا ہے؟ آپ قوم کے ساتھ بڑی بھلائی کرتے ہیں تو کونسل میں جبریہ اور عام تعلیم کا ریزولیوشن رکھ دیتے ہیں۔ اگر آپ قوم کے سچّے رہنما ہوتے یہ زیادتی کبھی نہ کرتے۔ کوئی اپنی مرضی کے خلاف بہشت میں بھی جانا پسند نہیں کرتا۔ ہم میں سے تو اکثر اصحاب نے بڑی بڑی علمی ڈگریاں حاصل کی ہیں مگر اس اعلیٰ تعلیم نے ہم میں بجز عیش پسندی۔ جاہ طلبی۔ خودغرضی اور شیخی کے ہم میں کون سا وصف پیدا کردیا ہے؟ ہم اپنے زعم میں خود کو قوم کا ایک نہایت ضروری عضو خیال کرتے ہیں۔ مگر فی الواقع ہم بدگوشت سے بھی بدتر ہیں! قومی خدمت کرنے کے لیے دوہزار روپیہ ماہوار یا روزانہ نیز موٹر۔ فٹن۔ برقی روشنی اور پنکھوں کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نانِ خشک پر بسر کرتے ہوئے قومی خدمت کو اس سے کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔ آپ کہیں کہ واہ۔ ہم نے محنت سے پڑھا ہے۔ تو کیا اسی لیے؟ تو اگر آپ نے اپنے جسمانی عیش وآرام کے لیے اتنی محنت کی ہے۔ تو قوم پر اس کا کیا احسان؟ آپ کس منہ سے قوم کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں؟آپ میلیں کھولتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے قوم کی ایک زبردست خدمت کی۔ مگر درحقیقت دس بیس ہزار آدمیوں کو غریب الوطن بنا دیا۔ آپ نے ان کی اخلاقی تباہی کا سامان پیدا کردیا۔ ہاں آپ نے اور آپ کے شرکاء نے کچھ فی صدی

نفع ضرور اٹھایا! تو بھئی جب تک یہ دھینگا دھینگی چلتی ہے۔ چلنے دو۔ نہ تم مجھے بُرا کہو۔ اور نہ میں تمھیں بُرا کہوں۔ ہم اور آپ نرم اور گرم دونوں قوم کے دشمن ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے کو قوم کا دشمن سمجھتا ہوں۔ اور آپ اپنے گھمنڈ میں خود کو ان کا دوست سمجھتے ہیں۔

ان دلیلوں کو سن کر لوگ اُنھیں جھکّی اور بکّی کہتے تھے۔ عمر کے ساتھ رائے صاحب کا گانے کا شوق اور بھی بڑھتا جاتا تھا۔ حکام سے ملنے کا اب اُنھیں اتنا شوق نہ تھا۔ جہاں کہیں کسی مشہور گویئے کی خبر پاتے تو اسے فوراً بلاتے اور ہر طرح اس کی خاطرو مدارات کرتے۔ فن کے موجودہ میلان کو دیکھ کر اُنھیں خوف ہوتا تھا۔ کہ اگر کچھ دنوں تک یہی حالت رہی تو اس کی صورت بالکل مسخ ہوجائے گی۔ دیس اور بھیروی کی تمیز بھی کسی کو نہ ہوسکے گی۔ وہ اس فن کو قوم کا سب سے بڑا کمال سمجھتے تھے۔ اس کا انحطاط ان کی رائے میں قومی زوال کا بدترین پہلو تھا۔

مصارف کا تخمینہ چار لاکھ کیا گیا تھا۔ رائے صاحب نے تو کسی سے کچھ مدد نہ مانگی تھی۔ لیکن کئی رؤسا نے اپنی جانب سے دو دو لاکھ کے وعدے کیے تھے۔ پھر بھی رائے صاحب پر دو ڈھائی لاکھ کا بار پڑجانا یقینی تھا۔ یورپ سے چھ ماہرینِ فن آگئے تھے۔ دوجرمنی سے۔ دو اٹلی سے۔ ایک فرانس سے۔ ایک انگلینڈ سے۔ میسور۔ گوالیار۔ ڈھاکہ۔ جے پور اور کشمیر کے نامی استادوں کو دعوتی خطوط بھیج دیے گئے تھے۔ رائے صاحب کا پرائیویٹ سیکریٹری سارے دن خط وکتابت میں مشغول رہتا تھا۔ اس پر بھی خطوط کی اتنی کثرت ہوجاتی تھی۔ کہ بسا اوقات رائے صاجب کو خود ہی جوابات تحریر کرنے پڑتے تھے۔ اسی کام میں مدد دینے کے لیے انھوں نے گیان شنکر کو بلایا تھا۔ اور وہ آج ہی مع ودیا کے آگئے تھے۔ رائے صاحب نے گائتری کے نہ آنے پر اظہار افسوس کیا اور کہا۔ وہ اسی لیے نہیں آئی۔ کہ میں سناتن دھرم کے جلسہ میں نہ جا سکا تھا۔ اب رانی ہوگئی ہے۔ کیا اتنا غرور بھی نہ کرے؟ یہاں تو مرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ جاتا کیوں کر؟

گیان شنکر تمام رات جاگے تھے۔ کھانا کھا کر لیٹے تو سہ پہر کو اٹھے۔ رائے صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے خطوط ملاحظہ فرمارہے تھے۔ گیان شنکر کو دیکھ کر بولے۔ آیئے بھگت جی آیئے۔ تم نے تو بالکل صورت ہی تبدیل کردی۔ بڑے خوش نصیب ہو کہ اتنی

ہی عمر میں معرفت شناس ہوگئے یہاں تو بڈّھا ہوگیا۔ مگر دنیا پرستی سے طبیعت سیر نہ ہوئی۔ دیکھو۔ پونا سے پروفیسر مدھولکر نے یہ خط بھیجا ہے۔ اُنھیں نہ جانے کیوں یہ شک ہوگیا ہے۔ کہ میں اس ملک میں غیر ملکی گانے کے طریقوں کی اشاعت کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپ نے مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

گیان شنکر کو گفتگو کے موقع کی تلاش تھی۔ وہ موقع مل گیا۔ بولے۔ بدگمانیاں پھیل رہی ہیں۔ کچھ معاوضہ بھی طے ہوا ہے؟

رائے صاحب۔ ہاں یہ تو پہلی بات تھی۔ دو صاحبوں کی فیس تو دو دو ہزار روزانہ ہے۔ زادِ راہ الگ۔ جرمنی کے دونوں اصحاب ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روزانہ لیں گے۔ صرف اٹلی کے دونوں آدمیوں نے اس دعوت کو شوقیہ قبول کیا ہے۔

گیان۔ اگر یہ چاروں اصحاب یہاں پندرہ روز رہیں تو ایک لاکھ روپے اُنھیں کو چاہیے۔

رائے۔ہاں اس سے کیا کم ہوگا؟

گیان۔ تو کل خرچ غالبًا پانچ چھ لاکھ تک پہنچ جائے۔

رائے۔ تخمینہ تو چار لاکھ کیا گیا تھا۔ مگر شاید اس سے کچھ زیادہ صرف ہوجائے۔

گیان۔ یہاں کے رؤساء نے بھی کچھ دریا دلی دکھائی؟

رائے۔ ہاں کئی اصحاب نے وعدے کیے ہیں۔ ممکن ہے دو لاکھ مل جائیں۔

گیان۔ اگر وہ اپنے وعدے پورے بھی کردیں تو آپ کو ڈھائی تین لاکھ کا خسارہ ہوگا۔

رائے صاحب نے طنز کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ میں اسے خسارہ نہیں سمجھتا۔ دولت عیش و آرام کے لیے ہے۔ اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ میں دولت کو اپنی خواہشات کا غلام سمجھتا ہوں۔ اس کا غلام نہیں بننا چاہتا۔

گیان۔ لیکن ورثا کو تو آرام اٹھانے کا تھوڑا بہت حق ہے۔

رائے۔ دنیا میں سبھی لوگ اپنے اعمال کے مطابق آرام تکلیف اٹھاتے ہیں۔ میں کسی کی تقدیر کا بنانے بگاڑنے والا نہیں ہوں۔

گیان۔ معاف فرمایئے گا۔ مگر یہ الفاظ ایک ایسے شخص کی زبانی بھلے نہیں معلوم ہوتے۔ جو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ختم کرچکا ہو۔

رائے صاحب نے تند لہجے میں کہا۔ تم کو مجھے نصیحت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میں اپنی جائداد کا مالک ہوں۔ اسے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق صرف کروں گا۔ اگر اس سے تمھارے ثروت کے خواب پریشان ہوتے ہیں۔ تو میں اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ یہ ممکن نہیں کہ کل دنیا میں کانفرنس کا اعلان کرنے کے بعد اب میں اسے ملتوی کردوں۔ اگر میری ساری جائداد بِک جائے تو بھی میں نے جو کام شروع کیا ہے اُسے ختم کرکے ہی چھوڑوں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تم کرشن کے ایسے بھگت بن کر اور بیراگ کے ایسے دلدادہ ہو کر دنیا سے اس قدر چمٹے ہوئے ہو۔ جس نے کرشن کا دامن پکڑا۔ پریم کا مضبوط سہارا لیا۔ بھگتی کو اختیار کیا۔ اس کے لیے دنیا اور دنیا کے ساز و سامان کیا چیز ہیں۔ تمھاری باتیں سن کر اور تمھارے دل کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے شبہ ہوتا ہے۔ کہ تم نے فقط یہ بہروپ بھرا ہے۔ تم پریم اور بھگتی کی لذت سے بالکل ناآشنا ہو۔ کرشن کا بھگت۔ پریم کا متوالا کبھی اس قدر تنگ دل نہیں ہوسکتا۔ مجھے اب شک ہورہا ہے۔ کہ تم نے یہ جال کہیں سیدھی سادی گائتری کے پھنسانے کے لیے نہ بچھایا ہو۔

یہ کہہ کر رائے صاحب نے گیان شنکر کو تیز نگاہوں سے دیکھا۔ ان کا نشانہ ایسا ٹھیک بیٹھا تھا۔ کہ گیان شنکر کا دل کانپ اٹھا۔ اس شک کو رفع کرنا نہایت ضروری تھا۔ رائے صاحب کے دل میں اس کا باقی رہ جانا بہت ہی خوفناک تھا۔ اتنا ہی نہیں۔ شک کے رفع کے لیے بے خوفی کی بھی سخت ضرورت تھی۔ اس معاملہ میں کسی قسم کے لحاظ کی گنجائش نہ تھی۔ بولے۔ آپ کی زبان سے بہروپ اور سوانگ کی بات سُن کر ایک مثل یاد آتی ہے مگر آپ کی شان میں میں اُسے مستعمل نہیں کرسکتا۔ جو شخص مذہب کے نام پر شہوت پرستی اور شراب خوری کو مستحسن خیال کرتا ہو۔ وہ اگر دوسروں کے مذہبی رجحان کو ریاکاری سمجھے۔ تو میں اُسے قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔

رائے صاحب نے گیان شنکر کو پھر چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ اور تحکمانہ انداز سے بولے۔ تمھیں سچ کہنا ہوگا۔

گیان شنکر کو ایسا محسوس ہوا۔ گویا ان کے دل پر سے کوئی پردہ سا اٹھا جا رہا ہے۔ ان پر ایک نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ عاجزی کے لہجہ میں بولے۔ جی ہاں۔ سچ کہوں گا۔

رائے۔ تم نے یہ جال کس کے لیے بچھایا ہے۔

گیان۔ گائتری کے لیے۔

رائے۔ تم اُس سے کیا چاہتے ہو؟

گیان۔ اس کی جائداد اور اس کی محبت۔

رائے صاحب کھِل کھِلاکر ہنسے۔ گیان شنکر کو ایسا معلوم ہوا کہ میں کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھا ہوں۔ اُن کی زبان سے جو باتیں نکلی تھیں وہ اُنھیں یاد تھیں۔ ان کا مصنوعی غصہ رخصت ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ اس خفت اور بے بسی نے لے لی تھی۔ جو کسی اقبالی مجرم کے چہرہ پر نظر آتی ہے۔ وہ سمجھ گئے۔ کہ رائے صاحب نے مجھ کو اپنی روحانی طاقت سے مغلوب کرکے مجھ سے جرم کا اقبال کرا لیا۔ اس وقت رائے صاحب ان کی نگاہوں میں بہت ہی ہیبتناک معلوم ہوتے تھے۔ ان کے دل میں انتقام کا ایک سفاکانہ جوش لہریں مار رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان پر ایک عجیب ہیبت طاری تھی۔ وہ اس شیطان کے سامنے اپنے کو بالکل کمزور اورلاچار پاتے تھے۔ ان سب باتوں سے وہ اس قدر پریشان تھے۔ کہ جی میں آتا تھا۔ کہ خود کشی کرلوں۔ جس عمارت کو وہ چھ سات برسوں سے ایک ایک اینٹ جوڑ کربنا رہے تھے۔ وہ اس وقت ہل رہی تھی۔ اور قریب تھا۔ کہ گر پڑے۔ اسے سنبھالنا ان کے امکان سے باہر تھا۔ آہ میرے سارے منصوبے مٹی میں ملے جاتے ہیں۔ اِدھر سے بھی گیا۔ اور اُدھر سے بھی۔ دفعتاً رائے صاحب بولے۔ بیٹا تم ناحق مجھ پر اس قدر غصہ کررہے ہو۔ میں ایسا تنگ ظرف نہیں ہوں۔ کہ تمھیں گائتری کی نگاہوں میں گراؤں۔ اگر اس کی جائداد تمھیں مل جائے۔ تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کون سی بات ہوگی؟اگر تمھاری نیت اس کی جائداد ہی تک محدود رہتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ آخر وہ جائداد کسی نہ کسی کو ملے گی ہی۔ اور جنھیں ملے گی۔ وہ مجھے تم سے زیادہ عزیز نہیں ہوسکتے۔ لیکن میں اس کی عصمت کو اس کی جائداد سے کہیں زیادہ بیش قیمتی سمجھتا ہوں۔ اور اس پر کسی کی لالچ بھری نگاہوں کا پڑنا میں برداشت نہیں کرسکتا۔ تمھاری خوش اطواری کی میں تعریف کیا کرتا تھا۔ تمھاری قابلیت اورخوش انتظامی کا میں قائل تھا۔ مگر مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا۔ کہ تم اتنے خودغرض ہو۔ تم مجھے ریاکار اور نفس پرست کہتے ہو۔ مجھے اس کا ذرا بھی ملال نہیں ہے۔ مادہ پرستوں کے دل میں ایسا

خیال ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کبھی حُسن کو ملوث نگاہوں سے نہیں دیکھا میں حُسن کی پرستش کرتا ہوں۔ اُسے اپنی نفس کشی کا ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ اس سے روحانی غذا حاصل کرتا ہوں۔ اُسے ہوس رانی کا آلہ نہیں بناتا۔ اور مان لو کہ میں نفس پرست ہی سہی۔ تو اب بہت دن گزر گئے۔ تھوڑے دن اور باقی ہیں۔ جیسا اب تک رہا ویسا ہی آئندہ بھی رہوں گا۔ اب میرا سدھار نہیں ہوسکتا۔ مگر تمھارے سامنے ابھی ساری عمر پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے میں تم سے بہ اصرار کہتا ہوں۔ بلکہ التجا کرتا ہوں۔ کہ نفس کے خواہشات کے غلام نہ بنو۔ تم اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہو کہ انسان اپنی تقدیر کو آپ بناتاہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ہم تقدیر کے کھلونے ہیں۔ تقدیر کے بنانے والے نہیں۔ وہ ہمیں اپنی مرضی کے مطابق نچایا کرتی ہے۔ تمھیں کیا معلوم کہ جس کے لیے تم نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ عذاب و ثواب کو یکساں سمجھتے ہو۔ وہ اس مبارک ساعت تک ہر ایک آفت سے محفوظ ومصئون رہے گا۔ ممکن ہے۔ کہ عین اس وقت جب کہ جائداد پر اس کا نام لکھا جا رہا ہو ایک چھوٹی سی پھنسی اس کا کام تمام کردے۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تمھارا بداندیش ہوں۔ میں تمھارے سامنے ممکنات کی ایک صورت پیش کررہا ہوں۔ میں نے تقدیر کے کتنے ہی کرشمے دیکھے ہیں۔ اور میں خود اس کا مارا ہوا ہوں۔ اُسے اپنے حسبِ خواہش بنا لینا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی اور اپنی اولاد کی بہبود کی کوشش نہ کرو یا دولت نہ پیدا کرو۔ نہیں۔ تم خوب روپیہ کماؤ۔ خوب ثروت حاصل کرو۔ مگر اپنی روح اور اپنے ضمیر کو اس پر قربان نہ کرو۔ دغا وفریب۔ ریاکاری ۔ اور روباہ بازی سے محترز رہو۔ میری جائداد بیس لاکھ سے کم مالیت کی نہیں ہے۔ اگر دوچار لاکھ قرض بھی ہوجائے تو تمھیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ کیا اتنی جائداد مایاشنکر کے لیے کافی نہیں ہے؟ تمھاری موروثی جائداد بھی دو لاکھ سے کم نہیں ہے۔ اگر اتنا کافی نہیں سمجھتے تو گائتری کی جائداد پر بھی نگاہ رکھو۔ اُسے میں برا نہیں کہتا۔ اپنی خوش انتظامی سے کارپردازی سے۔ کفایت شعاری سے۔ خیرخواہی سے اس کی تالیف نہ کرو۔ کہ اس کے بھولے پن، سادہ مزاجی اور ضعیف الاعتقادی کے اوپر اپنا تختۂ مشق بناؤ اور محبت کے سبز باغ دکھا کر اس کے سب سے زیادہ

جواہر کو لوٹ لینے کو کوشش کرو۔

اس اثنا میں پرائیویٹ سیکریٹری صاحب آگئے۔ رائے صاحب ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ گیان شنکر رو رہے تھے۔ افشاء راز کا غم تھا۔ قدیم آرزوؤں کی پامالی کا صدمہ۔ کچھ خفت۔ کچھ اپنے کمیناپن کا افسوس اور کچھ کمزور غصہ استدلال کی قوت اتنے حملوں کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔

گیان شنکر اٹھ کر باغ میں ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ ماگھ کا مہینہ تھا۔ اور شام کا وقت۔ مگر اس وقت اُنھیں ذرا بھی سردی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ان کا سارا بدن دل کی آگ سے جل رہا تھا۔ رائے صاحب کی بزرگانہ نصیحت کا اثر بالکل باقی نہ تھا۔ صرف یہ فکر تھی۔ کہ گرتی ہوئی دیوار کو کیوں کر تھامیں۔ جاں بلب تمناؤں کو کیوں کر سنبھالیں؟ یہ حضرت کہتے تو ہیں کہ گائتری سے کچھ نہ کہوں گا۔ مگر ان کی بات کا اعتبار ہی کیا۔ انھوں نے جہاں اس کے کان بھرے کہ وہ میری صورت سے بیزار ہوجائے گی۔ مغرور عورت ہے۔ اُسے اپنی عصمت پر ناز ہے اگرچہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔ مگر ابھی تک اُس کی بنیاد دھرم پر قائم ہے دلی جذبات پر نہیں۔ اس کے قیام کا کیا ٹھکانا۔ کمبخت اپنی جائداد کو تو برباد کیے ہی ڈالتا ہے۔ اب ادھر کا دروازہ بھی بند کیے دیتا ہے۔ تاکہ مجھے کہیں نکلنے کی گنجائش نہ رہے۔ میں اتنی مایوسیوں کا محتمل نہیں ہوسکتا۔ اس جینے میں اب کوئی مزہ نہیں رہا۔ جب تمام آرزوؤں کا خاتمہ ہوا جاتا ہے تو پھر جی کر کرنا ہی کیا ہے۔ ہائے کیا سوچتا تھا اور کیا ہوا چاہتا ہے۔ رائے صاحب تو شام کو کلب چلے گئے۔ اور گیان شنکر اسی مقام پر تنہا بیٹھے ہوئے زندگی اور موت کا فیصلہ کرتے رہے۔ ان کی حالت اس تاجر کی سی تھی۔ جس کا سب کچھ غرقاب ہوگیا ہو۔ یا اس طالب علم کی سی جو برسوں کی محنت شاقے کے بعد امتحان میں فیل ہوگیا ہو۔ جب باغ میں خوب اوس پڑنے لگی۔ تو وہ اٹھ کر کمرہ میں چلے گئے۔ پھر اُنھیں خیالات نے آ گھیرا۔ زندگی میں اب مایوسی اور ذلّت کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ ٹھوکریں کھاتا رہوں گا۔ زندگی کا خاتمہ ہی اب میری ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگا سکتا ہے۔ رائے صاحب اتنے کم ظرف نہیں ہیں۔ کہ مرجانے پر بھی وہ مجھے بدنام کریں۔ انھوں نے بہت سچ کہا تھا۔ کہ انسان اپنی تقدیر کا کھلونا ہے۔ میں اس حالت میں ہوں۔ کہ موت ہی میری ساری تکلیفوں کا واحد علاج ہے۔ عموماً لوگ یہی سمجھیں گے۔

کہ میں نے دنیا سے بیزار ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ دنیوی علائق سے آزاد ہوگیا۔ ایسی آزادی پسند روح کے قیام کے لیے یہ تاریک دنیا موزوں نہ تھی۔ ودیا کی نگاہوں میں میری عزت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ اور گائتری تو مجھے کرشن کا اوتار ہی سمجھنے لگے گی۔ بہت ممکن ہے کہ میری روح کی خوشنودی کے خیال سے وہ مایا کو راس نشین کرے۔ چچا اور بھائی دونوں مجھ سے ناراض ہیں۔ میری موت اُنھیں بھی نرم کر دے گی۔ اور مشکل ہی کیا ہے؟ کل گومتی نہانے جاؤں۔ ایک سیڑھی بھی زیادہ اترا تو بس کام تمام ہے! بیس ہزار روپے جو میں نقد چھوڑے جاتا ہوں۔ وہ ودیا کے گزارہ کے لیے کافی و وافی ہیں لکھن پور کی آمدنی اس کے علاوہ ہے۔

یہ سوچتے سوچتے گیان شنکر کے دل پر رقت طاری ہوگئی۔ اور وہ زور زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ زندگی کا یہی انجام ہے؟ اسی لیے دنیا بھر کے منصوبے باندھے تھے! یہ پاجی کملانند میری گردن پر چھری پھیر رہا ہے یہی بے درد میری جان کا گاہک ہو رہا ہے۔

اسی اثنا میں ودیاوتی آگئی۔ اور بولی...... آج لالہ جی سے اور تم سے کچھ جھگڑا ہوگیا کیا؟ مختار صاحب کہتے تھے کہ رائے صاحب بہت غصہ میں تھے۔ تم ناحق ان کے بیچ بولا کرتے ہو۔ جو کچھ کریں۔ کرنے دو۔ اماں سمجھاتے سمجھاتے مر گئیں۔ انھوں نے کبھی رتی بھر پرواہ نہ کی۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

گیان۔ میں نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا۔ کہ آپ مفت میں دو تین لاکھ روپیوں کا خون کررہے ہیں یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ بس اسی بات پر بگڑ اٹھے۔

ودیا۔ یہ تو ان کی عادت ہی ہے۔ جہاں ان کی کسی نے کاٹی کہ وہ بگڑے۔ مجھے برا معلوم ہوتا ہے۔ پر زبان کھولتے ڈرتی ہوں۔

گیان۔ مجھے ان کی جائداد کی پرواہ نہیں ہے۔ میں نے برندابن بہاری کا دامن پکڑا ہے۔ اب کسی چیز کا ہوس نہیں ہے۔ لیکن یہ فضول خرچی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

ودیا چلی گئی۔ ذرا دیر بعد مہراج نے کھانوں کا تھال لاکر سامنے رکھ دیا لیکن گیان شنکر کو کچھ کھانے کی خواہش نہ ہوئی۔ انھوں نے صرف قدرے دودھ پی لیا۔ اور پھر اپنے خیالات میں محو ہوگئے۔ عورتوں کی نگاہ کتنی محدود ہوتی ہے۔ جبھی تو اُنھیں صبر ہوجاتا

ہے۔ یہ سمجھتی ہیں۔ کہ آدمی کو آرام سے کھانے پہننے کے لیے ملتا جائے۔ زیورات بنتے جائیں۔ اولاد ہوتی جائے بس اور کیا چاہیے؟ گویا انسانی زندگی بھی دیگر جانداروں کی طرح صرف اپنی قدرتی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہے۔ وِدّیا کس قدر صابر ہے۔ لوگ عورتوں کے اس وصف کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے۔ کہ یہ صبر وقناعت ان کی کوتاہ فہمی کی دلیل ہے۔ ان کی عقل میں اتنی وسعت ہی نہیں ہوتی۔ کہ حالات کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ رائے صاحب کی فضول خرچی وِدّیا کو بھی کھلتی ہے۔ مگر کچھ بولتی نہیں۔ اُسے اس کی ذرا بھی فکر نہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سراسر اپنا ہی نقصان اپنی ہی بربادی ہے۔ حالات نے کیسے پلٹا کھایا ہے۔ اگر میری بندشیں کامیاب ہوجاتیں۔ تو دوچار برسوں میں تین لاکھ روپے سالانہ منافع کا مالک ہوتا۔ ایک لاکھ بھی خرچ کردیتا تو دو لاکھ سالانہ کی بچت ہوتی۔ دس پندرہ برسوں میں تو میرے قبضہ میں بے شمار دولت ہوتی۔ مگر من کے لڈو کھانے سے کیا ہوتا ہے۔

گیان شنکر بہت مستقل مزاج آدمی تھے۔ ان میں نیک ارادوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جھونکوں سے ان کے پیر نہ اکھڑتے تھے۔ مشکلوں میں ان کی ہمت پست نہ ہوتی تھی۔ گورکھپور میں ان پر چاروں طرف سے نرغے ہوتے رہے مگر انھوں نے کبھی پرواہ نہ کی۔ مگر ان کی مستقل مزاجی وہ نہ تھی۔ جو بے حسی یا بے حیائی تک جا پہنچتی ہے۔ وہ ان قمار بازوں میں نہ تھے۔ جو اپنا سب کچھ ایک داؤں پر ہار کر اکڑتے ہوئے چلتے ہیں۔ معمولی ہار اور معمولی ناکامیوں کا اثر ان پر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ان منصوبوں کا مٹی میں مل جانا جن پر زندگی قربان کردی گئی ہو۔ زبردست سے زبردست استقلال کو بھی ہلا دیتا ہے۔ اور پھر یہاں صرف مایوسی کا غم نہ تھا۔ بلکہ اپنی ذلت ورسوائی کا بھی۔ میری ریاکاریوں کا پردہ فاش ہوجائے گا۔ میری بھگتی میرے دھرم۔ میرے بیراگ۔ میری پاکیزگی۔ میری بلند معیاری کی قلعی کھل جائے گی۔ دنیا اب میرے اصلی رنگ میں دیکھے گی۔ اب تک میں نے اپنی دلیلوں سے لسانیوں سے اپنی خباثت کو چھپایا۔ اب وہ بات کہاں!

گیان شنکر کو نیند نہ آئی۔ ذرا آنکھیں جھپک جاتیں تو متوحش خواب دکھائی دینے لگتے۔ کبھی دیکھتے کہ میں گومتی میں ڈوب گیا ہوں۔ اور میری لاش چتا پر جلائی جارہی ہے۔ کبھی دیکھتے کہ میرا عالی شان محل پست ہوگیا ہے۔ اور مایا شنکر اس کے کھنڈروں میں

بیٹھا ہوا رو رہا ہے۔ ایک بار ایسا معلوم ہوا۔ کہ گائتری میری طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر یہ کہہ رہی ہے کہ تم مکّار ہو۔ میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔

علی الصباح گیان شنکر اُٹھے۔ تو ان کی طبیعت نہایت مضمحل تھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کوئی بڑی منزل طے کرکے آئے ہوں۔ انھوں نے کسی سے کچھ بات چیت نہ کی۔ دھوتی اٹھائی اور پیدل گومتی کی طرف چلے۔ ابھی آفتاب طلوع نہ ہوا تھا۔ لیکن تمباکو والوں کی دُکانیں کھل گئی تھیں۔ گیان شنکر نے سوچا۔ کہ کیا تمباکو ہی زندگی کی سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ کہ سب سے پہلے اسی کی دُکان کھلتی ہے۔ ذرا دیر بعد "ملائی مکھن" کی آواز کانوں میں آئی۔ بے وقوف۔ کتنا زبان اینٹھ کر بولتا ہے۔ سمجھتا ہوگا۔ کہ میری کرخت آواز سے لوگوں کے دلوں میں رغبت پیدا ہوگی۔ بن پھونکے پیئو تو زبان ہی جل جائے مگر ذائقہ وہی گرم پانی کا۔ یہ کون صاحب گھوڑا دوڑائے چلے آتے ہیں؟ کوئی فوجی افسر ہیں۔ گھوڑا ذرا ٹھوکر کھائے۔ تو صاحب بہادر کی ہڈیاں چور ہوجائیں۔

وہ گومتی کے کنارے پر جا پہنچے۔ بھگت لوگوں کا مجمع تھا۔ پانی کی سیاہ چادر پر کہرے کی سیاہ گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ آفتاب کی زریں شعاعیں اس سیاہ گھٹا میں سما جانے کے لیے بیتاب تھیں۔ دو چار کشتیاں پانی پر کھڑی کانپ رہی تھیں۔

گیان شنکر نے دھوتی ایک چوکی پر رکھ دی اور پانی میں گئے۔ تو یکایک ان کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ کمر تک پانی میں گئے۔ آگے بڑھنے کی ہمت نہ پڑی۔ ذلّت اور مایوسی کے جن خیالات نے ان کے ارادوں کو مشتعل کررکھا تھا۔ وہ دفعتاً دب سے گئے۔ کتنے نشۂ جنگ کے متوالے میدانِ جنگ میں آکر قدم پیچھے ہٹالیتے ہیں۔ موت دور سے اتنی خوفناک نہیں معلوم ہوتی۔ جتنی کہ پاس آکر۔ شیر کتنا خوفناک درندہ ہے۔ اس کا اندازہ اسے سامنے ہی دیکھ کر ہوسکتا ہے۔ پہاڑوں کو دور سے دیکھیے۔ تو اونچی مینڈ کی طرح نظر آتے ہیں۔ اور ان پر چڑھنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ مگر نزدیک جائیے۔ تو ان کی سربفلک چوٹیوں کو دیکھ کر دل پر کیسی دہشت چھا جاتی ہے۔ گیان شنکر نے مرنا جتنا آسان سمجھا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ مشکل معلوم ہوا۔ اُنھیں اس وقت خیال ہوا۔ کہ میں کیسا احمق ہوں۔ کہ ایک ذرا سی بات کے لیے جان دینے پر آمادہ ہوں۔ مانا کہ میر رائے صاحب کی نظروں میں گرگیا۔ گائتری بھی مجھ سے بولنے کی روادار نہ ہوگی۔ اور وِدّیا بھی

مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔ تو بھی کیا میں زندگی میں کوئی کام نہیں کرسکتا؟ اپنی زندگی کامیاب نہیں بناسکتا؟ دنیا کا دائرِ عمل اتنا تنگ نہیں ہے۔ میں اس وقت آج سے چھ سات سال پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ بہتر حالت میں ہوں۔ میرے بیس ہزار روپے بینک میں جمع ہیں۔ دوسو روپیہ ماہوار کی آمدنی موضع سے ہے۔ بنگلہ ہے۔ موٹر ہے۔ مکان کرایہ پر اٹھا دوں۔ تو پچاس ساٹھ روپے ماہوار اور ملنے لگیں۔ اگر کسی کی ملازمت نہ کروں۔ تو ایک رئیس کی طرح زندگی بسر کرسکتا ہوں۔ رائے صاحب اگر میری قلعی کھول دیں۔ تو کیا میں ان کی خبر نہیں لے سکتا؟ اُنھیں اپنے قلم کے زور سے اتنا ذلیل کرسکتا ہوں۔ کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ گائتری بھی میری گرفت میں ہے۔ اگر میری طرف سے ذرا بھی نگاہ بدلے۔ تو اب میں اس کا دامن کیوں چھوڑوں؟ اس سے ناامید کیوں ہو جاؤں؟ اگر اس ٹوٹی ہوئی کشتی پر بیٹھ کر میں نے آدھی ندی پار کرلی ہے۔ تو اس پر سے پانی میں کیوں کود پڑوں؟

گیان شنکر نہاکر پانی سے باہر نکل آئے۔ ان کے چہرہ پر فاتحانہ مسرّت کی جھلک تھی! جس طرح کوئی ظفریاب فوج دشمن کی فوج کو میدان سے ہٹا کر اور بھی حوصلہ مند بن جاتی ہے۔ اور دشمن کو اتنا کمزور بنا دیتی ہے کہ میدان جنگ میں پھر نہ آسکے۔ اسی طرح گیان شنکر کے حوصلے بھی بڑھے۔ انھوں نے سوچا۔ کہ اس کی نوبت ہی کیوں آنے دوں۔ کہ مجھ پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگیں۔ اور میں اپنی صفائی دیتا پھروں۔ میں مرکر نیک نام بننا چاہتا تھا۔ کیوں نہ مارکر نیک نام بنوں؟ ہاں اس وقت ہمتِ مردانہ کا یہی اقتضا ہے۔ مرنے سے مارنا کہیں زیادہ آسان ہے۔ تقدیر۔ تیرے کارخانے بھی عجیب ہیں۔ تو نے مجھے موت کے منہ سے باہر نکال لیا۔ موت سے بال بال بچا! میں اب بھی اپنے ارادوں کو پورا کرسکتا ہوں۔ دولت۔ ثروت۔ شہرت سب مجھے حاصل ہوسکتی ہیں۔ صرف تھوڑی سی ہمت چاہیے۔ ایشور کا کوئی خوف نہیں وہ عالم الغیب ہے۔ پردہ تو صرف انسانوں کی آنکھوں پر ڈالنا ہے۔ اور مجھے اس کام میں خاصی مہارت ہے۔

گیان شنکر ایک کرایہ کے تانگہ پر بیٹھ کر مکان پر آئے۔ راستہ بھر اُنھیں خیالات میں محو رہے۔ ان کے باثروت ہوجانے کی کوشش میں رائے صاحب ہی روکاوٹ ڈال رہے تھے۔ اس روکاوٹ کو دور کرنا نہایت ضروری تھا۔ پہلے گیان شنکر نے مایوس ہوکر اس

کوشش سے باز آنے کا قصد کرلیا تھا۔ وہ اپنی جان دے کر اس مشکل سے عہدہ برآ ہونا چاہتے تھے۔ اب انھوں نے رائے صاحب کو اپنی آرزوؤں پر قربان کر دینے کا فیصلہ کرلیا۔ دنیا اسے قتل کے نام سے پکارے گی۔ اس کی نگاہ یہ بدترین گناہ ہے۔ بالکل وحشیانہ اور سراسر ناقابل عفو! مگر فلسفیانہ نقطہ خیال سے دیکھیے۔ تو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں۔ رائے صاحب کے مرجانے سے کسی کا کیا نقصان ہوگا؟ ان کے بال بچے نہیں ہیں جو بلا سرپرست کے ہوجائیں گے۔ وہ کوئی ایسا بڑا کام بھی نہیں کررہے ہیں۔ جو ان کے مرجانے سے ناتمام رہ جائے گا۔ ان کی جائداد بھی تلف نہ ہوگی بلکہ ایسی صورت پیدا ہوجائے گی کہ وہ جائداد بالکل محفوظ رہے گی۔ تمدن و اقتضاء کے اعتبار سے تو اسے قتل کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اخلاقی خیال سے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں صرف مذہب کی رو سے یہ گناہ کہا جاسکتا ہے۔ دنیاوی مصلحت کے لحاظ سے تو یہ کام صرف مستحسن ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔ یہ کارزار ہستی ہے۔ اس کے میدان میں مذہب اور اخلاق کا گزر نہیں۔ یہ کوئی دھرم کی لڑائی نہیں ہے۔ یہاں مکروفریب دغا سب جائز ہیں۔ اگر ان سے اپنا مقصد پورا ہوتا ہو۔ یہاں شب خوں مارنا۔ کمینگاہ سے وار کرنا۔ فتح کے لوازمات ہیں۔ یہاں کام کے جا اور بے جا ہونے کا فیصلہ کامیابی کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اگر جیت گئے۔ تو سارے دھوکے اور مغالطے مساحدت کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اور ہمارے کام کی تعریف ہوتی ہے۔ اگر ہار گئے۔ تو اُنھیں گناہ کہا جاتا ہے۔ بس اس پتّھر کو راستہ سے ہٹا دوں۔ پھر میرا راستہ صاف ہے۔

گیان شنکر نے متعدد دلائل سے اپنی خیالات کو اسی طرح مرکوز کرنے کو کوشش کی۔ جس طرح کبوترباز بھکے ہوئے کبوتروں کو اپنی چھتری پر بلاتا ہے۔ آخر کو ان کا قاتلانہ ارادہ مضبوط ہوگیا۔ دنیا قتل کے نام سے کانپتی ہے۔ گردن زدنی ہے۔ اس کی صورت دیکھنا بھی گناہ ہے۔ لیکن یہ وسیع دنیا صرف احمقوں کی بستی ہے۔ اس کے خیالات و جذبات کا لحاظ کرنا کانٹوں پر چلنا ہے۔ یہاں کوئی اصول نہیں۔ کوئی آئین نہیں۔ کوئی انصاف نہیں۔ اس کی زبان بند کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دو۔ اور پھر وہ تمھارے کاموں پر ذرا بھی اعتراض نہ کرے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تمھیں اپنی جماعت کا ایک ممتاز رُکن سمجھے گی۔

مکان پر پہنچ کر گیان شنکر رائے صاحب کے کتب خانہ میں گئے اور انگریزی کی ضخیم طبی لغت نکال کر سمیات کی تاثیر اور ان کے خواص کی کھوج کرنے لگے۔

(۴۲)

دو روز ہوگئے اور گیان شنکر رائے صاحب کے روبرو نہ گئے۔ رائے صاحب ان بے رحم آدمیوں میں نہ تھے۔ جو زخم لگا کر اس پر نمک چھڑکتے ہیں۔ وہ جب کسی پر ناراض ہوتے۔ تو یہ مسلمہ بات تھی۔ کہ اس کی تقدیر یاد رہے۔ کیونکہ غصہّ کے فرو ہوتے ہی وہ اُنھیں بدسلوکیوں کی بڑی فیاضی سے تلافی کیا کرتے تھے۔ ایک بار ایک خدمتگار کو اس لیے پیٹا تھا۔ کہ اس نے فرش پر پانی گرا دیا تھا۔ دوسرے ہی روز پانچ بیگھے زمین اُسے بطور معافی کے دے دی۔ ایک کارندہ سے غبن کے معاملہ میں سخت ناراض ہوئے اور اُسے اپنے ہاتھوں سے ہنٹر لگائے۔ مگر چند ہی روز بعد اس کی تنخواہ بڑھا دی۔ ہاں یہ ضروری تھا۔ کہ خاموشی اور صبر سے ان کی باتیں برداشت کرلی جائیں۔ ان سے زبان درازی نہ کی جائے۔ گیان شنکر کو برا بھلا کہنے کے ذرا ہی دیر بعد اُنھیں افسوس ہونے لگا۔ کہ کہیں وہ روٹھ کر چلے نہ جائیں۔ دنیا میں ایسا کون سا شخص ہے۔ جو اپنے مطلب کے لیے حرام کو حلال نہیں بناتا؟ میں خود بھی تو بے لوث نہیں ہوں۔ جب دنیا کا یہی شعار ہے۔ تو مجھے ان کو اتنا ذلیل کرنا مناسب نہ تھا۔ کم از کم ان کے اطوار کو اس قدر مطعون نہ کرنا چاہیے تھا۔ سمجھدار آدمی ہیں۔ ان کے لیے اشارہ کافی تھا۔ لیکن میں نے تو غصہّ میں آکر کھلی کھلی گالیاں دیں۔ بس آج جب رائے صاحب کھانا کھانے بیٹھے تو مہاراج سے کہا۔ کہ بابوجی کو بھی بلا لو اور ان کی تھالی بھی یہاں لاؤ۔ نہ آئیں تو کہنا کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو وہ بھی نہ کھائیں گے۔ گیان شنکر راضی نہ ہوتے تھے مگر وِدّیا نے سمجھایا۔ کہ چلے کیوں نہیں جاتے؟ جب وہ بڑے ہوکر بلاتے ہیں۔ تو آپ کے نہ جانے سے اُنھیں ملال ہوگا۔ اُن کی عادت ہے۔ کہ غصہّ میں جو کچھ منہ میں آتا ہے۔ بک ڈالتے ہیں۔ مگر بعد کو افسوس کرتے ہیں۔ گیان شنکر اب کوئی حیلہ نہ کرسکے۔ رونی صورت بنائے ہوئے آئے ۔ اور رائے صاحب سے ذرا ہٹ کر آسن پر بیٹھ گئے۔ رائے صاحب نے کہا۔ اتنی دور کیوں بیٹھے ہو؟ میرے پاس آجاؤ۔ دیکھو میں نے آج تمھارے لیے کئی انگریزی کھانے پکوائے ہیں۔ لاؤ مہاراج یہیں تھالی رکھو۔

گیان شنکر نے دبی زبان سے کہا۔ کہ مجھے تو اس وقت بالکل بھوک نہیں ہے معاف رکھیے۔

رائے۔ بھوک تو کھانوں کی خوشبو سے پیدا ہوجائے گی۔ تھالی سامنے تو آنے دو۔ مہاراج کو میں نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس نے اپنی ساری عقل صرف کردی ہوگی۔

مہاراج نے تھالی لاکر گیان شنکر کے سامنے رکھ دی۔ گیان شنکر کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ سینہ زور سے دھڑک رہا تھا۔ خوف نے امید کو مغلوب کردیا تھا۔ وہ کسی طرح یہاں سے بھاگنا چاہتے تھے۔ اس نظارہ کی اُنھیں تاب نہ تھی۔ ان کے جسم کا ہر ایک عضو تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہاں تک کہ آواز بھی بند سی ہوگئی تھی۔ اُنھیں اس وقت معلوم ہو رہا تھا۔ کہ جان لینا جان دینے سے زیادہ مشکل ہے۔

رائے صاحب نے چار، ہی پانچ لقمے کھائے تھے کہ دفعتاً انھوں نے تھالی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور گیان شنکر کو تیز نگاہوں سے دیکھا۔ گیان شنکر کی روح فنا ہوگئی۔ رائے صاحب نے اگر اس وقت گولی مار دی ہوتی تو اُنھیں اتنی چوٹ نہ لگتی۔ وہ بے ہوش سے ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی مقناطیسی قوت ان کی جان کو رگوں سے کھینچ رہی ہے۔ اپنی کشتی کو بھنور میں ڈوبتے دیکھ کر بھی کوئی اتنا خوف زدہ، اتنا بدحواس نہ ہوتا ہوگا۔ رائے صاحب کی تیز نگاہی نے ثابت کر دیا۔ کہ پردہ فاش ہوگیا۔ میری ساری احتیاطیں پیش بندیاں بے سود ہوئیں۔ وائے شومئی قسمت کہ کہیں کا نہ رہا۔ کیا خبر تھی کہ یہ حضرت غیب دانی کا اس قدر مادہ رکھتے ہیں۔

اتنے میں رائے صاحب نے حقارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک بار تم سے کہہ دیا۔ کہ دولت وثروت تمھاری تقدیر میں نہیں ہیں۔ تم جو چالیں چلو گے وہ سب الٹی پڑیں گی۔ صرف ذلت ندامت تمھارے ہاتھ لگیں گی۔

گیان شنکر نے تجاہل دکھلاتے ہوئے کہا۔ میں نے آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔

رائے۔ بالکل غلط ہے۔ تم میرا مطلب خوب سمجھ رہے ہو۔ اس سے زیادہ کچھ کہوں گا تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ میں چاہوں تو ساری حقیقت تمھاری زبان سے کہلا لوں۔ مگر اس کی ضرورت نہیں۔ تمھیں بڑا دھوکا ہوا۔ میں تمھیں بہت ہوشیار سمجھتا ہوں۔

لیکن اب معلوم ہوا کہ تمھاری عقل بہت موٹی ہے۔ تمھیں اتنے دنوں تک مجھ سے سابقہ رہا پر ابھی تک تم مجھے پہچان نہ سکے۔ تم شیر کا شکار بانس کی تیلیوں سے کرنا چاہتے ہو۔ اس لیے اگر اس کی دبوچ میں آجاؤ تو یہ تمھارا اپنا قصور ہے۔ مجھے انسان مت سمجھو میں شیر ہوں۔ اگر ابھی اپنے دانت اور ناخون دکھا دوں۔ تو تم کانپ اٹھو گے۔ اگرچہ وہ تھال بیس پچیس آدمیوں کو سلا دینے کے لیے کافی ہے۔ شاید ایک لقمہ کھانے کے بعد اُنھیں دوسرا لقمہ کھانے کی نوبت نہ آئے گی۔ میں پورا تھال ہضم کرسکتا ہوں اور تمھیں میری پیشانی پر شکن بھی نظر نہ آئے گی۔ میں شکتی کا اپاسک ہوں۔ ایسی چیزیں میرے لیے دودھ اور پانی ہیں۔

یہ کہہ کر رائے صاحب نے تھال سے کئی لقمے اٹھا کر جلد جلد کھائے۔ دفعتاً گیان شنکر تیزی سے لپکے۔ تھال اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ اور رائے صاحب کے قدموں پر گر کے چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ رائے صاحب کی روحانی عظمت نے آج اُنھیں مغلوب کردیا۔ اُنھیں آج معلوم ہوا کہ یہ چوہا اور شیر کی لڑائی ہے۔

رائے صاحب نے اُنھیں اٹھا کر بیٹھا دیا اور بولے۔ لالہ۔ میں اتنا نرم نہیں ہوں۔ کہ ان آنسوؤں سے پگھل جاؤں۔ آج تمھاری اصلی صورت دکھائی دی۔ تم خود غرضی میں سر تا پا مبتلا ہو۔ یہ تمھارا قصور نہیں۔ تمھاری تعلیم کا قصور ہے۔ تمھیں ابتدا ہی سے مادی تعلیم دی گئی ہے۔ دلی جذبات دب گئے۔ تمھارے استاد بھی غرض کے بندے تھے۔ انھوں نے کبھی سادہ اور قانع زندگی کا معیار تمھارے سامنے نہیں رکھا۔ تم اپنے گھر میں، اسکول میں، دنیا میں ہمیشہ دیکھتے تھے۔ کہ چالاکی کی کتنی قدر و وقعت ہے۔ تم نے ہمیشہ انعامات اور تمغے حاصل کیے۔ درجہ میں تمھاری تعریف ہوتی رہی۔ ہر موقع پر تمھیں مثال کے طور پر دوسروں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ تمھاری روحانی ترقی کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ تمھارے خیالات تمھارے دلی جذبات کو ٹھیک راستہ پر لے جانے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ تم نے مذہب اور اعتقاد کے نور کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ نور جو دل کی تاریکی دور کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ تم جو کچھ ہو اپنی تعلیمی روش کے بنائے ہوئے ہو۔ اگلے سنسکاروں نے جو تم میں بیج بویا تھا اسے تمھاری مادی تعلیم نے اگاکر ایک تناور درخت بنا دیا۔ تمھاری کوئی خطا نہیں۔ حالات وکیفیات کا قصور ہے۔ میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔

اور پرماتما سے دعا کرتا ہوں۔ کہ تمھیں گیان دے۔

یہ کہتے کہتے رائے صاحب کے ہونٹ نیلے پڑگئے۔ چہرہ زرد ہوگیا۔ اور آنکھیں پتھرانے لگیں۔ پیشانی پر عرق کے قطرے نمودار ہوگئے۔ پسینہ سے سارا بدن تر ہوگیا۔ سانس زور زرو سے چلنے لگی۔ گیان شنکر ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پنکھا جھلنے لگے۔ لیکن رائے صاحب نے اشارہ کیا۔ کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔ یہ کہہ کر انھوں نے فوراً اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ گیان شنکر بے حس وحرکت دروازہ پر کھڑے تھے۔ جیسے کسی نے ان کے پیروں کو وہاں گاڑ دیا ہو۔ اس وقت انھیں اپنی مذموم حرکت پر اتنا رنج ہو رہا تھا۔ کہ جی چاہتا تھا۔ اسی تھال سے ایک لقمہ کھا کر زندگی کا خاتمہ کروں۔ پہلے رائے صاحب کی باتیں سن کر انھوں نے خیال کیا تھا۔ کہ زہر کا ان پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ مگر اب اس خیالی امید کی جگہ خوف ہو رہا تھا۔ کہ انھوں نے اپنی روحانی طاقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔ کیا کروں؟ کسی ڈاکٹر کو بلاؤں؟ اس ہوس پرستی کا برا ہو۔ جس نے مجھے اس حرکت پر آمادہ کیا۔ جس نے میرے ہاتھوں ان کا خون کرایا۔ ہائے خودغرضی تیرا برا ہو۔ تو نے مجھے شیطان بنا دیا۔ میں کیوں ان کا دشمن ہو رہا ہوں؟ اسی جائداد کے لیے اسی ریاست کے لیے اسی دولت کے لیے۔ کیا یہی دولت میرے قبضہ میں آکر دوسروں کو میرا جانی دشمن نہ بنا دے گی؟ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ میرا بھی یہی حشر نہ ہوگا؟

گیان شنکر نے دروازہ پر کان لگا کر سنا۔ ایسا معلوم ہوا کہ رائے صاحب ہاتھ پیر پٹک رہے ہیں۔ مارے دہشت کے گیان شنکر کے جسم میں رعشہ ہونے لگا۔ اُنھیں اپنی فرومائگی۔ اپنی سیاہ باطنی کا ایسا زبردست احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ اُنھیں اس وقت انجام کی فکر نہ تھی۔ یہ نہ خیال تھا۔ کہ میرا کیا حال ہوگا۔ بس یہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ رائے صاحب کی نہ جانے کیا حالت ہو رہی ہے۔ کوئی جبراً بھی ہٹاتا تو وہ وہاں سے نہ ہٹتے۔ معلوم نہیں۔ ایک لمحہ میں کیا ہوجائے۔

اتنے میں مہاراج تھالی میں کچھ اور چیز لایا۔ اسے دیکھتے ہی گیان شنکر کا خون خشک ہوگیا۔ سمجھ گئے۔ کہ اب جان نہ بچے گی۔ میں گرفتار ہوجاؤں گا۔ وہ اس وقت اُنھیں ملک الموت سا معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے اُسے قریب نہ آنے دیا۔ دور ہی سے کہا۔ ہم لوگ

کھانا کھاچکے۔ اب اور کچھ نہ لاؤ۔

مہاراج نے بند دروازے کو تعجب سے دیکھا۔ اور آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ کہ دفعتاً گیان شنکر باز کی طرح جھپٹے۔ اور اُسے زور سے دھکا دے کر کہا۔ میں تم سے کہتا ہوں۔ کہ یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بات کیوں نہیں سنتے؟

مہاراج ہکا بکا ہوکر گیان شنکر کا منہ تاکنے لگا۔ گیان شنکر پر اس وقت ہراس کی وہ حالت طاری تھی۔ کہ جب انسان پتے کی کھڑک سن کر لاٹھی سنبھال لیتا ہے۔ اُنھیں اب رائے صاحب کی فکر نہ تھی۔ ان کے خیال میں وہ اب فکر کی قوتِ ازالہ خارج ہوگئے تھے۔ وہ اب خود ہی اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔ ان کی ساری قوتِ ارادی اس راز کو پوشیدہ رکھنے میں صرف ہو رہی تھی۔

یکایک اندر سے دروازہ کھلا اور رائے صاحب باہر نکلے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ پسینہ سے تر تھے گویا لوہار بھٹی کے سامنے سے اُٹھ کر آیا ہو۔ دونوں تھال سمیٹ کر ایک جگہ رکھ دیے تھے۔ کٹورے بھی صاف تھے۔ سب کھانا ایک انگیٹھی میں جل رہا تھا۔ آگ اس خوانِ لطف کا مزہ لے رہی تھی۔

چشم زدن میں گیان شنکر کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ جب تک اُنھیں اندیشہ تھا۔ کہ رائے صاحب دم توڑ رہے ہیں۔ اس وقت تک وہ ان کی سلامتی کے لیے ایشور سے دعا کررہے تھے۔ جب باہر کھڑے کھڑے اس امر کا یقین ہوگیا۔ کہ رائے صاحب کا انتقال ہوگیا۔ تووہ اپنی جان کی خیر منانے لگے۔ اب اُنھیں سامنے دیکھ کر اُنھیں غصہ آرہا تھا۔ کہ یہ مر کیوں نہ گئے۔ اتنی ذلت۔ اتنی دماغی تکلیف مفت ہی برداشت کرنی پڑی۔ ان کی حالت اس وقت اس تھکے ماندے ہلواہے کی سی ہو رہی تھی۔ جس کے بیل کھیت سے دروازہ پر آکر بدک گئے ہوں۔ دن بھر کی سخت محنت کے بعد ساری رات اندھیرے میں بیلوں کے پیچھے پیچھے دوڑانے کا خیال اس کی ہمت کو توڑے ڈالتا ہو۔

رائے صاحب نے باہر نکل کر کئی بار زور سے سانس بھری۔ گویا دم گھٹ رہا ہو۔ پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ مرا نہیں پر مرنے سے بدتر حالت میں ہوگیا۔ اگرچہ میں نے زہر کو عمل کے ذریعہ خارج کر دیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میری رگوں میں خون کی بجائے کوئی پگھلی ہوئی دھات گردش کر رہی ہے۔ یہ آگ کچھ دنوں بعد مجھے جلا

کر خاک کردے گی۔ اب مجھے پھر پولو اور ٹینس کھیلنا نصیب نہ ہوگا۔ میری زندگی کی دائمی بہار رخصت ہوگئی۔ اب جینے میں وہ لطف کہاں جو رنج و تفکر کو ہیچ سمجھتا تھا۔ میں نے زبان سے تو تمھیں معاف کر دیا۔ مگر میرا دل تمھیں کبھی معاف نہ کرے گا۔ تم میرے لڑکے ہو۔ میں تمھارے باپ کی جگہ ہوں۔ مگر اب ہم ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ یہ ہمارے موجودہ طرزِ معاشرت کا قصور ہے۔ لیکن یہ جان کر بھی دل کو صبر نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں اسی جائداد کے سبب ہوئیں۔ اسی جائداد کے سبب ہم اور تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ دنیا میں جدھر دیکھو۔ طمع وحرص۔ کینہ وحسد۔ کشت وخون کا بازار گرم ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن۔ باپ بیٹے کا دشمن۔ شوہر بیوی کا دشمن۔ یہ سب اسی جائداد کے لیے اسی دولت کے لیے۔ اس کے ہاتھوں جتنا ظلم ہوا۔ ہو رہا ہے۔ اور ہوگا۔ اس کے دیکھتے کہیں بہتر تھا کہ اہلِ جائداد ہونے کا رواج ہی مفقود ہوجاتا۔ یہی وہ کھیت ہے۔ جہاں دغا اور فریب کے پودے لہراتے ہیں۔ جس کے سبب سے دنیا ایک میدانِ کارزار بنی ہوئی ہے۔ اسی نے انسانوں کو حیوانوں سے بھی بدتر بنادیا ہے۔

یہ کہتے کہتے رائے صاحب کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ دیوار کا سہارا لیے ہوئے دیوان خانہ میں آئے۔ اور فرش پر گر پڑے۔ گیان شنکر بھی پیچھے پیچھے تھے۔ مگر اتنی جرأت نہ ہوئی کہ انھیں سنبھال لیں۔ نوکروں نے یہ حالت دیکھی تو دوڑے۔ اور اُنھیں اٹھاکر کوچ پر لٹا دیا۔ گلاب اور کیوڑے کا عرق چھڑکنے لگے۔ کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ کوئی ڈاکٹر کے لیے دوڑا۔ سارے گھر میں تہلکا پڑگیا۔ دیوان خانہ میں ایک میلہ سا لگ گیا۔ دس منٹ کے بعد رائے صاحب نے آنکھیں کھولیں اور سب کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن جب گیان شنکر بھی اور لوگوں کے ساتھ جانے لگے۔ تو رائے صاحب نے اُنھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ یہ جائداد نہیں ہے۔ اسے ریاست کہنا حماقت ہے۔ یہ محض دلالی ہے۔ اس زمین پر میرا کیا حق ہے۔ میں نے اسے زورِ بازو سے فتح نہیں کیا۔ نوابوں کے زمانہ میں کسی صوبیدار نے اس علاقہ کے محاصل وصول کرنے کے لیے میرے دادا کو مامور کیا تھا۔ میرے والد پر بھی وہی نوازش قائم رہی۔ اس کے بعد انگریزوں کا زمانہ آیا۔ اور یہ جائداد میرے والد کے ہاتھ سے نکل گئی۔ لیکن غدر میں والدصاحب نے انگریزوں کی ہرطرح مدد

کی۔ اور انگریزی حکومت قائم ہوجانے پر ہم کو ہماری وہی جائداد پھر مل گئی۔ یہی اس ریاست کی حقیقت ہے۔ ہم صرف لگان وصول کرنے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اسی دلالی کے لیے ہم ایک دوسرے کے خون سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرتے ہیں۔ اسی غربا کشی کو ہم اقتدار کہتے ہیں۔ اسی شعنہ گری پر ہم پھولے نہیں سماتے۔ سرکار اپنا فرض کو پورا کرنے کے لیے ہمیں اس علاقہ کا مالک کہتی ہے۔ لیکن جب سال میں دو بار ہم سے مال گزاری وصول کی جاتی ہے تو ہم مالک کہاں رہے؟ ہائے یہی تو رونا ہے۔ کہ اس ریاست نے ہمیں عیش پسند۔ کاہل اور نکما بنا دیا۔ ہم اب کسی مصرف کے نہیں رہے۔ ہم پالتو چڑیا ہیں۔ ہمارے بازو بیکار ہوگئے ہیں۔ ہم میں اب پرواز کی طاقت نہیں ہے۔ ہماری نگاہ ہمیشہ اپنے پنجڑے کے گُلھیے اور پیالی پر رہتی ہے ہم نے اپنی آزادی کو میٹھے ٹکروں کے لیے بیچ ڈالا ہے۔

رائے صاحب کے چہرہ پر کسی اندرونی کرب کے آثار نظر آنے لگے۔ لیٹے تھے۔ کراہ کر اٹھ بیٹھے۔ چہرہ سکڑ گیا۔ درد سے بے قرار ہو کر دل پر ہاتھ رکھے ہوئے بولے۔ بیٹا۔ تم نے وہ قاتل زہر کھلا دیا۔ کہ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ اب جان نہ بچے گی۔ اگر ایک مرنے والے کی بددعا میں کچھ تاثیر ہے۔ تو تمھیں اس ریاست سے لطف اندوز ہونا نصیب نہ ہوگا۔ جاؤ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ممکن ہے کہ میں اس غصہ کی حالت میں تمھیں دونوں ہاتھوں سے دبا کر مسل ڈالوں۔ میں اپنے آپے میں نہیں ہوں۔ میری حالت متوالے سانپ کی سی ہو رہی ہے۔ میری نگاہ سے دور ہوجاؤ۔ اور پھر کبھی مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ ہاں میرے مرجانے پر تمھیں آنے کا اختیار ہے۔ اور یاد رکھو۔ کہ اگر تم نے پھر کبھی گورکھپور کا قصد کیا۔ یا گائتری سے کوئی تعلق رکھا تو تمھارے حق میں برا ہوگا۔ میرے مخبر سایہ کی طرح تمھارے ساتھ رہیں گے۔ تم نے میری ہدایت سے ذرا بھی انحراف کیا۔ تو تم جہنم کو واصل ہوئے۔ ہائے جسم جلا جاتا ہے۔ پاجی شیطان ابھی گیا نہیں۔ شیرخان ...... کوئی ہے ...... میرا پستول لاؤ۔ (زور سے) میرا پستول لاؤ...... کیا سب مرگئے؟

گیان شنکر فوراً اٹھ کر وہاں سے بھاگے۔ اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کرلیا۔ جلد جلد کپڑے پہنے۔ موٹرسائیکل کو تیار کرایا۔ اور سیدھے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ وِدّیا سے ملنے کا بھی موقع نہ ملا۔

شام کا وقت تھا۔ بنارس کے سشن جج کی عدالت میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ لکھن پور کے مقدمہ سے اب سارے شہر کو ایک خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ منوہر کی خودکشی نے اس کی خبر کل شہر میں پھیلا دی تھی۔ ہر تاریخ پر شہر کے لوگ عدالت میں آجایا کرتے تھے۔ عوام کو ملزموں کی بے گناہی کا اب پورا یقین ہوگیا تھا۔ منوہر کی خودکشی پر مختلف رائیں دی جاتی تھیں اور سب کا لب لباب یہی نکلتا تھا۔ کہ صرف منوہر ہی قاتل تھا۔ اور لوگ تو محض عداوت کی وجہ سے ماخوذ کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر پریاناتھ کی بدنیتی اورعرفان علی کی خودغرضی پر علانیہ چوٹیں کی جاتی تھیں۔ پریم شنکر کی بے غرضانہ خدمت کی سبھی سراہنا کرتے تھے۔ اس مقدمہ نے اُنھیں ہردل عزیز بنا دیا تھا۔

آج فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ پس ہجوم بھی اور دنوں سے زیادہ تھا۔ لکھن پور کے لوگ تو آئے ہی تھے۔ قُرب و جوار کے مواضعات کے لوگ بھی بہت بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ ٹھیک چار بجے جج نے فیصلہ سنا دیا۔ بشیشر ساہ رہا ہوگئے۔ بلراج اور قادر خان کو کالے پانی کی سزا ملی۔ بلراج نے بشیشر کو غصہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔ جو کہہ رہی تھیں۔ کہ ایک لمحہ کے لیے بھی آزاد ہوجاؤں۔ تو تمھارا خون پی لوں۔ قادر خان بہت مغموم تھے۔ یہ فیصلہ سنا تو آنسوؤں کے کئی قطرے مونچھوں پر گر پڑے۔ زندگی کا خاتمہ ہی ہوگیا۔ قبر میں پیر لٹکائے تو بیٹھے ہی تھے۔ اس پر سزا ملی کالے پانی کی! چاروں طرف کہرام مچ گیا۔ تماشائی لوگ ملزموں کی طرف دوڑے۔ مگر گارڈ کے سپاہیوں نے کسی کو ان سے کچھ کہنے سننے کا موقع نہ دیا۔ موٹر تیار کھڑا تھا۔ ساتوں ملزم اسی میں بٹھا دیے گئے۔ کھڑکیاں بند کردی گئیں۔ اور موٹر جیل کو راونہ ہوا۔

پریم شنکر رنج و غم کی تصویر بنے ہوئے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر مغموم نگاہوں سے موٹر کی طرف تاک رہے تھے۔ جیسے کسی گاؤں کی عورتیں گاؤں کی آخری حد پر کھڑی ہوئی آنسو بھری آنکھوں سے سسرال جانے والی لڑکی کی پالکی کو دیکھتی ہیں۔ موٹر دور نکل گیا۔ تو تماشائیوں نے اُنھیں آگھیرا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ پریم شنکر ان کی طرف بکیسانہ انداز سے دیکھتے تھے۔ مگر کسی کوکچھ جواب نہ دیتے تھے۔ دفعتاً اُنھیں کچھ یاد آگیا۔ وہ جیل کی طرف چلے۔ تماشائیوں کا ہجوم بھی ان کے ساتھ چلا۔

سب کو امید تھی کہ شاید ملزموں کو دیکھنے کا اور ان سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ ابھی یہ لوگ کچہری کے احاطہ سے باہر نکلے ہی تھے۔ کہ ڈاکٹر عرفان علی اپنے موٹر پر دکھائی دیے۔ آج ہی گورکھپور سے لوٹے تھے اور ہوا خوری کے لیے جارہے تھے۔ پریم شنکر کو دیکھتے ہی موٹر روک لیا اور پوچھا۔ کہیے آج فیصلہ سنا دیا گیا؟

پریم شنکر نے روکھائی سے جواب دیا۔ جی ہاں۔

اتنے میں صدہا آدمیوں نے موٹر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور ایک قوی ہیکل آدمی نے سامنے آکر کہا۔ اِنھیں کی گردن پر ان بے گناہوں کا خون ہے۔

اس پر صدہا آوازیں سنائی دیں۔ موٹر کھینچ لو۔ ذرا ان کی خدمت کردی جائے۔ اس نے جتنے روپے لیے ہیں۔ بس اس کے پیٹ سے نکال لو۔

اسی قوی ہیکل آدمی نے عرفان علی کا پہونچا پکڑ کر اتنی زور سے جھٹکا دیا۔ کہ بے چارے گاڑی سے باہر نکل پڑے۔ جب تک موٹر میں تھے۔ چہرہ غصہ سے سرخ ہورہا تھا۔ نیچے آکر دھکے ملے تو جان سوکھ گئی۔ ملتجی نگاہوں سے پریم شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ خود حیران تھے۔ کہ کیا کروں۔ انھیں پہلے کبھی ایسی باتوں سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اور نہ اس عقیدت ہی کا انھیں علم تھا۔ جو لوگوں کو ان کے ساتھ تھی۔ ہاں وہ جذبہ جو مظلوموں کی حمایت کے لیے ان کے دل میں موجود تھا۔ متحرک ہوگیا۔ انھوں نے عرفان علی کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اورغصہ سے بولے۔ یہ کیا کرتے ہو؟ ہاتھ چھوڑ دو۔ ایک طاقتور نوجوان بول اٹھا۔ ان کی گردن پر ایک پورے گاؤں کا خون سوار ہے۔

پریم۔ خون ان کی گردن پر نہیں۔ ان کے پیشہ کی گردن پر ہے۔

نوجوان۔ ان سے کہیے کہ اس پیشہ کو چھوڑ دیں۔

کئی آوازیں اٹھیں۔ بلا کچھ مرمت کے ان کی عقل ٹھکانے نہ آئے گی۔

صدہا گلوں سے آوازیں نکلیں۔ ہاں ہاں۔ لگے۔ بے بھاؤ کے پڑنے دو۔

پریم شنکر نے گرج کر کہا۔ خبردار جو کسی نے ہاتھ اٹھایا۔ ورنہ تم لوگوں کو یہاں میری لاش دکھائی دے گی۔ جب تک مجھ میں کھڑے ہونے کی طاقت ہے۔ تم ان کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے۔

اس دلیرانہ للکار نے فوراً اثر دکھلایا۔ لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس سے ہٹ گئے۔ ہاں

ان کی مزاج پرسی کے ایسے نادر موقع سے فائدہ اٹھا سکنے پر آپس میں شرگوشیاں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جیوں ہی میدان صاف پایا۔ انھوں نے ممنونیت کی نگاہوں سے پریم شنکر کو دیکھا۔ اور موٹر پر بیٹھ کر ہوا ہوگئے۔ ہزاروں آدمیوں نے تالیاں بجائیں۔ بھاگا۔ بھاگا۔

پریم شنکر بڑے مخمصے میں پڑگئے۔ ہر لمحہ یہ خوف ہوتا تھا کہ یہ لوگ نہ جانیں کیا آفت ڈھائیں گے۔ کسی بگھی یا فٹن کو آتے دیکھ کر ان کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ کہ یہ لوگ کہیں اسے روک نہ لیں۔ وہ کسی طرح ان سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی کوئی تدبیر ذہن میں نہ تھی۔ ہزاروں جھلائے ہوئے آدمیوں کو قابو میں رکھنا بڑا مشکل تھا۔ سوچتے تھے۔ کہ اب کے تو میری دھمکی کارگر ہوگئی۔ مگر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ دوسرے موقع پر بھی وہ کارگر ہوگی۔ کہیں پولیس آجائے تو شورش ہی برپا ہوجائے۔ دوچار آدمیوں کی جانوں پر ضرور ہی آبنے۔ انھیں تفکرات میں مبتلا ہوکر وہ آگے بڑھے۔ راستہ ہی میں ڈاکٹر پریاناتھ کا بنگلہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت برآمدہ میں ٹہل رہے تھے۔ ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں تھا۔ شاید گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ جم غفیر دیکھا۔ تواپنے پھاٹک پر آکر کھڑے ہوگئے۔

دفعتاً کسی نے کہا۔ ذرا ان کی بھی خبر لیتے چلو۔ سچ پوچھو۔ تو انھیں حضرت نے بے چاروں کی گردن کاٹی ہے۔

کئی آدمیوں نے تائید کی۔ ہاں ہاں پکڑلو۔ جانے نہ پائے۔

جب تک پریم شنکر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچیں۔ سینکڑوں آدمیوں نے اُنھیں گھیر لیا۔ اسی طاقتور نوجوان نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے ریکٹ چھین لیا۔ اور بولا...... بتایئے صاحب۔ لکھن پور والے معاملہ میں کتنی رشوت کھائی تھی؟

کئی آدمیوں نے کہا۔ بولتے کیوں نہیں۔ کتنے روپے ہضم کیے تھے؟

ڈاکٹر صاحب نے زور زور سے نوکروں کو پکارنا شروع کیا۔ مگر نوکروں نے آنا مناسب نہ سمجھا۔

ایک آدمی نے کہا۔ یہ بلا سمجھاؤن بجھاون کے نہ بتائیں گے۔

پریاناتھ۔ میں تم سب کو جیل بھجوا دوں گا۔ تم ریسکل لوگ۔

ڈاکٹر صاحب نے تخویف سے کام نکالنا چاہا۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ جو لوگ عموماً آنکھ کے اشارے پر کانپ اُٹھتے ہیں۔ وہ شورش کے وقت گولیوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اُن کی زبان سے اتنا نکلا تھا۔ کہ لوگوں کے تیور بدل گئے۔ شور مچا۔ جانے نہ پائے مار کر گرا دو۔ دیکھا جائے گا۔

اتنے میں پریم شنکر ڈاکٹرصاحب کے پاس جاکھڑے ہوگئے۔ سینکڑوں لاٹھیاں۔ چھتریاں اور چھڑیاں اٹھ چکی تھیں۔ پریم شنکر کو سامنے دیکھ کر سب کی سب ہوا میں تنی رہ گئیں۔ صرف، ایک لاٹھی نہ رک سکی۔ وہ پریم شنکر کے کندھے پر زور سے لگی۔ اسی نوجوان نے ڈاکٹرصاحب پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا۔ ان کے پیچھے کیا چوروں کی طرح چھپے کھڑے ہو۔ سامنے آجاؤ تو مزہ چکھا دوں۔ خوب رشوتیں کھاکھا کر شدید کا خفیف اور خفیف کا شدید بنایا ہے۔

ابھی جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا۔ کہ لوگوں نے پریم شنکر کو زمین پر لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ کسی نے کسی سے کچھ کہا نہیں مگر سب کو کسی سانحہ کی خبر مل گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کی شورش خوف کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ سب پوچھنے لگے۔ کہ یہ کس کی لاٹھی تھی؟ یہ کس نے مارا؟ اُس کے ہاتھ توڑ دو۔ پکڑ کر گردن مروڑ دو۔ کِس کی لاٹھی تھی؟ سامنے کیوں نہیں آتا؟ کیا زیادہ چوٹ آئی؟

دفعتاً ڈاکٹر پریاناتھ نے بلند لہجہ میں کہا۔ ادھ مُوا ہی کیوں چھوڑ دیا؟ ایک لاٹھی اور کیوں نہ مار دی کہ کام تمام ہوجاتا؟ جاہلو۔ تمھارا خطاوار تو میں تھا۔ انھوں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟

یہ کہہ کر وہ پریم شنکر کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ اور زخم کو غور سے دیکھا۔ شانہ کی ہڈّی ٹوٹ گئی تھی۔فوراً رومال نکال کر شانے میں پٹی باندھی۔ پھر ہسپتال جاکر وہاں سے ایک لسٹر لوا لائے اور پریم شنکر کو اٹھاکر ہسپتال لے گئے۔ ہزاروں آدمی شفاخانہ کے سامنے متردد کھڑے تھے۔ سب کو یہی اندیشہ ہورہا تھا۔ کہ کہیں زیادہ چوٹ نہ آگئی ہو۔ لیکن جب ڈاکٹرصاحب نے مرہم پٹی کرنے کے بعد آکر کہا۔ کہ چوٹ تو بہت زیادہ آئی ہے۔ اور شانہ کی ہڈّی ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن امید ہے کہ بہت جلد اچھے ہوجائیں گے۔ تو لوگوں کی جان میں جان آئی۔ سب ایک ایک کرکے وہاں سے چل دیے۔

لالہ پربھاشنکر کو جوں ہی اس سانحہ کی خبر ملی۔ وہ بدحواس دوڑے ہوئے آئے۔ اور پریم شنکر کے پاس بیٹھ کر دیر تک روتے رہے۔ پریم شنکر کو ہوش آگیا تھا۔ البتہ وہ درد کی شدت سے بیتاب تھے۔ ڈاکٹر نے بولنے یا ہلنے کو منع کر دیا تھا۔ اس لیے خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ لیکن جب پربھاشنکر کو بہت بے قرار دیکھا تو بولے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں جلد صحت یاب ہوجاؤں گا۔ کندھوں میں درد ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ان باتوں سے پربھاشنکر کی کچھ تسکین ہوئی۔ جاتے وقت انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے پاس جاکر نہایت عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ بابوجی۔ یہ لڑکا میرے خاندان کا آفتاب ہے۔ آپ اس پر نوازش کی نظر رکھیے گا۔ اس کی جان بچ گئی۔ تو آپ کی خدمت کرنے میں حتی الامکان کوتاہی نہ کروں گا۔ اگرچہ میں کسی لائق نہیں ہوں۔ مگر مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا۔ وہ ضرور آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

پریاناتھ نے کہا۔ لالہ جی آپ یہ کیا فرماتے ہیں؟ اگر میں ان کے معالجہ میں ذرا بھی تساہلی کروں۔ تو مجھ سے زیادہ احسان فراموش شخص دنیا میں نہ ہوگا۔ میری ہی وجہ سے انھیں چوٹ پہنچی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتے تو میری ہڈیوں کا بھی پتہ نہ لگتا۔ انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچائی ہے۔ ان کے بارِ احسان سے میں کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

تین چار روز میں پریم شنکر اس قابل ہوگئے۔ کہ تکیہ کے سہارے بیٹھ سکیں۔ لکڑی لے کر شفاخانہ کے برآمدے میں ٹہلنے بھی لگے۔ ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے روزانہ شہر سے سینکڑوں آدمی آتے رہتے تھے۔ پریم شنکر سب سے ڈاکٹر صاحب کی تعریف کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کی خاص توجہ نے پریم شنکر کو ان کا معتقد بنا دیا تھا۔ وہ روزانہ کئی بار اُنھیں دیکھنے آتے۔ کبھی کبھی اخبار بھی پڑھ کر سناتے۔ اور ان کے لیے اپنے ہی گھر میں خاص طور پر کھانا پکواتے۔ پریم شنکر اپنے دل میں بہت پشیماں تھے۔ کہ ایسے نیک دل ایسے فرشتہ خصلت انسان کے بارے میں میں نے کیوں بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ دی۔ وہ اپنی گہری عقیدت سے اب اس کی تلافی کر رہے تھے۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ پریم شنکر اداس بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کہ ان غریب ملزموں کا اب کیا حال ہوگا۔ میں یہاں پڑا ہوا ہوں۔ اپیل کا ابھی تک کچھ طے نہ ہوا۔

اور اپیل بھی ہوگی کیسے؟ اتنے روپے کہاں سے آئیں گے؟ آج کل تو انصاف غریبوں کے لیے ایک نایاب چیز ہوگئی ہے۔ قدم قدم پر روپے کا صرفہ۔ اور پھر یہ کیا معلوم کہ اپیل کا نتیجہ ہمارے موافق ہو۔ کہیں یہی سزائیں بحال رہیں۔ تو اپیل کرنا بے فائدہ ہوگا۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ اپیل تو ہونا ہی چاہیے۔ روپے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔ اور کچھ نہ ہوگا۔ تو دُکان دُکان اور گھر گھر گھوم کر چندہ مانگوں گا۔ غریبوں سے ہر شخص کو قدرتاً ہمدردی ہوا کرتی ہے۔ اور ممکن ہے۔ کہ اس طریقہ پر کافی روپیہ ہاتھ آجائے۔ گیان شنکر کو ناگوار ہوگا۔ تو ہوا کرے۔ اس میں میرا کچھ بس نہیں۔ کیا اُنھیں میری اس چوٹ کی خبر نہ ملی ہوگی۔ آنا تو دور رہا ایک خط بھی نہ لکھا۔ کہ مجھے تسکین ہوتی۔

وہ انھیں خیالات میں محو تھے۔ کہ ڈاکٹر پریاناتھ آگئے۔ اور بولے آپ اس وقت بہت متفکر معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا سی چائے پی لیجیے۔ کہ دل کو کچھ فرحت ملے۔

پریم۔ جی نہیں۔ بالکل خواہش نہیں ہے۔ آپ مجھے یہاں سے کب تک جانے کی اجازت دیں گے؟

پریا۔ ابھی شاید آپ کو یہاں ایک ہفتہ تک اور نظر بندر رہنا پڑے گا۔ ابھی ہڈی کے جڑنے میں تھوڑی کسر ہے۔ اور پھر ایسی جلدی کیا ہے۔ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔

پریم۔ آپ مجھ پر احسانوں کا اتنا بوجھ رکھتے جاتے ہیں۔ کہ میں شاید جنبش بھی نہ کرسکوں۔ یہ آپ کی نوازش۔ محبت اور شرافت کا نتیجہ ہے۔ کہ میں نے درد کی تکلیف کو کبھی محسوس ہی نہ کیا۔ مجھے یاد نہیں آتا۔ کہ اتنا آرام کہیں اور ملا ہو۔ آپ کی ہمدردانہ شفقت نے مجھ پر یہ واضح کردیا۔ کہ دنیا میں بھی فرشتوں کا قیام ہوسکتا ہے۔ مہذب۔ انسانوں پر سے میرا اعتقاد بالکل اٹھ چکا تھا۔ آپ نے اسے پھر قائم کردیا۔

پریم شنکر کا انکسار اور ان کی سادگی ڈاکٹر صاحب کے دل کو روزبروز ان کا گرویدہ بنارہی تھی۔ ایسے پاک باطن اور بے نفس آدمی کے حسنِ اعتقاد کا مرجع بن کر ان کی ساری خامیاں خود بخود دور ہوتی جارہی تھیں۔ اس روشنی کا انعکاس ان کے دل کی تاریکیوں کو مٹائے دیتا تھا۔ ان کے حسنِ اعتقاد سے وہ اس قدر خوش تھے۔ جیسے کوئی مفلس آدمی دولت کو پاکر خوش ہوجاتا ہے۔ انھیں ہمیشہ یہ فکر کہ کہیں یہ بیش بہا جواہر ان کے ہاتھ

سے چلا نہ جائے۔ ان کی کئی روز سے یہ خواہش ہو رہی تھی۔ کہ لکھن پور والے معاملہ کے متعلق پریم شنکر پر اپنی حالت کو واضح کر دیں۔ مگر کوئی موقع ہاتھ نہ آتا تھا۔ اس وقت موقع پاکر بولے۔ آپ مجھے بہت نادم کررہے ہیں۔ کسی دوسرے شخص کی زبان سے یہ باتیں سن کر میں ضرور سمجھتا کہ مجھے بنا رہا ہے۔ آپ مجھے اس سے کہیں زیادہ دانش مند اور شریف خیال کررہے ہیں۔ جتنا کہ میں فی الواقع ہوں۔ میں بھی عام آدمیوں کی طرح دنیا پرست خواہشات کا غلام اور نفس کا بندہ ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے گناہ کیے ہیں۔ اگر میں اُنھیں آپ سے بیان کروں۔ تو آپ خواہ کتنی ہی فیاضی سے کام لیں۔ پھر بھی میں فوراً آپ کی نظروں میں گر جاؤں گا۔ میں خود اپنی بداعمالیوں کا پردہ بنا ہوا ہوں۔ اُنھیں اپنے ظاہر سے ڈھانکے ہوئے ہوں۔ لیکن اس مقدمہ کے بارے میں عوام نے مجھے جتنا بدنام کر رکھا ہے۔ اس کا میں مستوجب نہیں ہوں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں وہ سرتا پا بے بنیاد ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ قتل کے متعلق رائے قائم کرنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو اورضرور ہوئی ہے۔ لیکن میں اتنا بے درد اور بد دیانت نہیں ہوں۔ کہ اپنی غرض کے لیے اتنے بیگناہوں کا گلا کاٹتا۔ یہ میری ملازمت کی زندگی ہے۔ جس نے میرے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے۔

پریم شنکر نے ندامت آمیز لہجہ میں کہا۔ بھائی صاحب آپ کی اس بدنامی کا الزام میرے سر ہے۔ میں ہی آپ کا مجرم ہوں۔ میں نے ہی لوگوں کے کہنے میں آکر آپ پر بے جا شکوک کیے۔ اس کا مجھے جتنا رنج و افسوس ہے۔ وہ آپ سے بیان نہیں کرسکتا۔ آپ جیسے پاکیزہ شخص کے ساتھ بے انصافی کرنے کی پاداش میں ایشور مجھے نہ جانے کیا سزا دے گا۔ مگر میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ کہ آپ میری نافہمی کا خیال کرکے مجھے معاف کریں۔ پریاناتھ کے دل سے ایک بوجھ سر اتر گیا۔ پریم شنکر اس کے تین چار روز بعد حاجی پور واپس گئے۔ مگر ڈاکٹرصاحب ہر روز شام کو اُن سے ملنے کے لیے آیا کرتے۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ فرض شناس ہوگئے تھے۔ دس بجنے کے قبل ہی علی الصباح وہ شفاخانہ پر جا بیٹھتے۔ مریضوں کے حالات کا غور سے معائنہ کرتے اور انھیں تسکین دیتے۔ اتنا ہی نہیں۔ پہلے وہ پوری فیس لیے بغیر جگہ سے جنبش نہ کرتے تھے۔ اب اکثر بلا فیس لیے ہی غربا کو دیکھنے چلے جایا کرتے۔ ادنیٰ اہلکاروں سے آدھی ہی فیس لیتے۔ شہر کی صفائی کا باقاعدہ معائنہ کرتے۔ جس گلی یا سڑک سے نکل جاتے لوگ نہایت ادب سے انھیں سلام کرتے۔ چندہی

مہینوں میں اُن کی سارے شہر مین تعریف ہونے لگی۔ بنارس کا مشہور اخبار ''گورو'' ان کا پرانا دشمن تھا۔ پہلے ان پر ہمیشہ حملے کرتا تھا۔ اب وہ بھی ان کا مرید ہوگیا۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا ''بنارس نہایت خوش نصیب ہے کہ اُسے بہت دنوں کے بعد ایک ایسا رعایا پرور ایسا نیک دل اور ایسا فرض شناس ڈاکٹر مل گیا۔ ڈاکٹری کا پیشہ کسبِ زر کے لیے نہیں۔ کسبِ ثواب کے لیے ہے۔ اور ڈاکٹر پریاناتھ نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ اس معیار کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا اپنی زندگی کا اعلی ترین مقصد سمجھتے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب کو نیک نامی کا مزہ مل گیا۔ اب غریبوں کی خدمت سے ان کا دل جتنا خوش ہوتا تھا۔ اتنا اپنے اندوختہ کی روز افزوں ترقی سے کبھی نہ ہوا تھا۔ اگرچہ دولت کی ہوس سے انھیں چھٹکارا نہ ملا تھا۔ مگر نیک نامی کی ہوس نے دولت کی ہوس کو مغلوب کر دیا تھا۔ پریم شنکر کے سامنے جاتے ہی ان کا دل شبنم سے ڈھکے ہوئے پھول کی طرح نکھر کر شگفتہ ہوجاتا تھا۔ اس سادہ قانع اور بے لوث زندگی کے سامنے انھیں اپنی زرپرستی کی ہوس بہت حقیر معلوم ہونے لگتی تھی۔ عیالداری کے تفکرات کا بار کسی قدر ہلکا ہوجاتا تھا۔ جب اس حالت میں بھی ہم قانع اور خوش رہ سکتے ہیں۔ نیک نام بن سکتے ہیں۔ دوسروں کی مدد کرسکتے ہیں تو پھر دولت پر جان دینا بے سود ہے۔ انھیں معلوم ہوتا جاتا تھا کہ کامیاب زندگی کے لیے دولت کوئی لابدی چیز نہیں ہے۔ انھیں افسوس ہوتا تھا۔ کہ میری ضرورتیں کیوں اس قدر زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ میں ڈاکٹر ہوکر ذائقہ کا غلام کیوں بنا ہوا ہوں؟ خوش نما اور قیمتی کپڑوں کا دلدادہ کیوں ہوں؟ انھیں کے باعث تو میں سارے شہر میں بدنام تھا۔ حریص۔ خودغرض۔ بے رحم بنا ہوا تھا۔ اور اب بھی ہوں۔ لوگوں کو اندیشہ ہوتا تھا۔ کہ کہیں یہ مرض کو نہ بڑھا دیں۔ اس لیے جلدی کوئی مجھے بلاتا نہ تھا۔ ان خیالات کا اثر ڈاکٹرصاحب کی وضع قطع میں بھی نظر آنے لگا۔

ایک روز ڈاکٹرصاحب کسی مریض کو دیکھ کر واپس آتے ہوئے پریم شنکر کے مزرعہ کے سامنے سے گزرے۔ دس بج گئے تھے۔ دھوپ تیز تھی۔ آفتاب کی تیز شعاعیں آسمان کو تیروں سے چھیدتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ڈاکٹرصاحب کے جی میں آیا۔ کہ دیکھتا چلوں کیا کر رہے ہیں۔ اندر جاکر دیکھا۔ تو وہ اپنے جھونپڑے کے سامنے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے گیہوں کے پولے بکھیر رہے تھے۔ کئی مزدور بولی کر رہے تھے۔ پریاناتھ کو دیکھتے ہی

پریم شنکر جھونپڑے میں آگئے۔ اور بولے دھوپ تیز ہے۔
پریاناتھ۔ مگر آپ تو اس طرح کام میں مصروف ہیں کہ گویا دھوپ ہی نہیں ہے۔
پریم۔ ان مزدوروں کو دیکھیے۔ دھوپ کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔
پریا۔ وہ مزدور ہیں۔ اس کے عادی ہیں۔
پریم۔ ہمیں اس نقلی تہذیب نے چوپٹ کردیا ورنہ ہم بھی ایسے ہی عادی ہوتے۔ اور محنت کو معیوب نہ سمجھتے۔

پریم شنکر کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ اسی اثناء میں دو بوڑھی عورتیں سر پر لکڑی کے گٹھے رکھے ہوئے آئیں۔ اور پوچھنے لگیں۔ کہ سرکار لکڑی لوگے؟ ان عورتوں کے پیچھے پیچھے کئی لڑکے بھی لکڑیوں کے بوجھ لیے ہوئے تھے۔ سبھوں کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ سینہ اور پسلی کی ہڈیاں نکلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہونٹ خشک تھے۔ اور جسم پر میل جما ہوا۔ اس پر سوکھے ہوئے پسینہ کی لکیریں سی بن گئی تھیں۔ پریم شنکر نے لکڑیوں کی قیمت پوچھی۔ کچھ مول تول نہ کیا۔ سبھوں کے گٹھے اترا لیے۔ مگر دیکھا تو صندوق میں پیسے نہ تھے۔ مستا کو روپیہ بھنانے کے لیے دیا۔ دونوں عورتیں درخت کے نیچے سایہ میں بیٹھ گئیں۔ اورلڑکے مٹر کے بکھرے ہوئے دانے چن چن کر کھانے لگے۔ پریم شنکر کو ان پر ترس آیا۔ تھوڑے تھوڑے مٹر سب لڑکوں کو دیے۔ دونوں عورتیں دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔ بابو جی۔ نارائن تمھیں سدا سکھی رکھیں۔ ان لڑکوں نے ابھی کچھ کلیوا نہیں کیا ہے۔
پریم۔ تمھارا گھر کہاں ہے؟
ایک بوڑھیا۔ سرکار نے لکھن پور کا نام سنا ہوگا۔
پریاناتھ۔ آپ نے گٹھے دیکھے نہیں۔ سبھوں نے خوب قینچی لگائی ہے۔
پریم۔ مفلسی سب کچھ کرالیتی ہے (بڑھیا سے) تم لوگ اتنی دور لکڑی بیچنے آجاتی ہو؟۔
بڑھیا۔ کیا کریں مالک۔ بیچ میں اور کوئی بستی نہیں ہے۔ بڑی رات کے چلے ہیں۔ دوپہر ہوگئی۔ کسی پیڑ کے نیچے پڑے رہیں گے۔ دن ڈھلے گا۔ تو سانجھ تک گھر پہنچیں گے۔ کرم کا لکھا بھوگ رہے ہیں۔ جو کبھی نہ کرنا پڑا تھا وہ مرتے سمے کرنا پڑا۔
پریم۔ آج کل گاؤں کا کیا حال ہے۔
بوڑھیا۔ کیا حال بتاویں سرکار۔ جمیندار کی نگاہ ٹیڑھی ہوگئی۔ سارا گاؤں بندھ گیا۔ کوئی ڈامل

گیا۔ کوئی کیکر گیا۔ سب کے بال بچّے اب دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔ میرے دو بیٹے تھے۔ دو ہل کی کھیتی ہوتی تھی۔ ایک تو ڈامل گیا۔ دوسرے کا سال بھر سے کچھ ٹوہ نہیں ملا۔ بیل تھے۔ وہ چارے بنا ٹوٹ گئے۔ کھیتی باڑی کون کرے؟ بہوئیں ہیں۔ سو وہ باہر آجا نہیں سکتیں۔ میں ہی اُپلے بیچ کر لے جاتی ہوں۔ تو سب کے منہ میں دانہ پڑتا ہے۔ پوتے تھے وہ نارائن نے پہلے ہی ہر لیے۔ بڑھاپے میں یہی بھوگنا بدا تھا۔

پریم۔تم ڈپٹ سنگھ کی ماں تو نہیں ہو؟

بوڑھیا۔ ہاں سرکار آپ کیسے جانتے ہیں؟

پریم۔ طاعون کے دنوں میں جب تمھارے پوتے بیمار تھے تو میں وہیں تھا۔ کئی بار اور ہو آیا ہوں۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میرا نام پریم شنکر ہے۔

بوڑھیا نے تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیا۔ بیکسی کی جگہ خوداری کا ایک ہلکا سا رنگ چہرے پر آگیا۔ بولی۔ ہاں بیٹا۔ اب میں نے پہچانا۔ آنکھوں سے اچھی طرح سوجھتا نہیں۔ بھیا تم جگ جگ جیو۔ آج سارا گاؤں تمھارا جس گا رہا ہے۔ تم نے اپنی والی کر دی۔ پر بھاگ میں جو کچھ لکھا تھا وہ کیسے ٹلتا۔ بیٹا سارے گاؤں میں ہاہاکار مچا ہوا ہے۔ دکھرن بھگت کو توجانتے ہی ہوگے۔ یہ بوڑھیا انھیں کی گھر والی ہے۔ پرانا کھاتی تھی۔ نیا رکھتی تھی۔ اب گھر میں کچھ نہیں رہا۔ یہ دونوں لڑکے بدھو کے ہیں۔ ایک رنگی کا لڑکا ہے۔ اور یہ دونوں کادرمیاں کے پوتے ہیں۔ نہ جانے کیا ہوگیا۔ کہ گھر سے مردوں کے جاتے ہی جیسے برکت ہی اٹھ گئی۔ سنتی تھی کہ کادر میاں کے پاس بڑا دھن ہے۔ پر اتنے ہی دنوں میں یہ حال ہوگیا۔ لڑکے مجوری نہ کریں تو منہ میں مکھی آئے جائے۔ بھگوان اس کل مونہے پھیچو کا ستیاناس کریں۔ اس نے اور بھی اندھیر مچا رکھا ہے۔ اب تک تو اس نے گاؤں بھر کو بے دکھل کردیا ہوتا۔ نارائن سکھو چودھری کا بھلا کریں۔ کہ انھوں نے ساری باکی کوڑی چکا دی۔ پر اب کی انھوں نے کھبر نہ لی۔ اور اکیلا آدمی کہاں تک سارے گاؤں کو سنبھالے۔ سال دو سال کی بات ہو تو نباہ بھی دے۔ یہاں تو جندگی بھر کا رونا ہے۔ کارندہ چپراسی ابھی سے دھمکا رہے ہیں۔ کہ اب کی بے دکھل کر کے تبھی دم لیں گے۔ اب کی سال تو کچھ آدھے ساجھے میں کھیتی ہوگئی تھی۔ کھیت نکل جائیں گے تو دیو جانے کیا گت ہوگی۔

یہ کہتے کہتے بڑھیا رونے لگی۔ پریم شنکر کی آنکھیں بھی بھر آئیں پوچھا۔ بشیسر ساہ کا کیا حال ہے؟

بڑھیا۔ کیا جانوں بھیا۔ میں تو سال بھر سے ان کے دوار پر جھانکا بھی نہیں۔ اب کوئی اُدھر نہیں جاتا۔ ایسے آدمی کا منہ دیکھنا پاپ ہے۔ لوگ دوسرے گاؤں سے نون تیل لاتے ہیں۔ وہ بھی اب گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ دُکان اٹھا دی ہے۔ گھر میں بیٹھا نہ جانے کیا کیا کرتا ہے۔ جو دوسرے کو گڈّھا کھو دے گا۔ اس کے لیے کنواں تیار ہے۔ دیکھا تو نہیں پر سنتی ہوں کہ جب سے یہ ماملہ اٹھا ہے۔ اس کے گھر میں کسی کو چین نہیں۔ ایک نہ ایک پرانی کے سر بھوت آیا ہی کرتا۔ اوجھے سیانے رات دن جمع رہتے ہیں۔ پوجا پاٹ جپ تپ ہوا کرتا ہے۔ ایک دن بلاسی سے راستے میں مل گئے تھے۔ رونے لگا۔ بہت پچھتاتا تھا۔ کہ میں دوسروں کی باتوں میں آکر یہ کُکرم کیا۔ منوہر اس کے گلے پڑا ہوا ہے۔ مارے ڈر کے سانجھ ہی سے کواڑ بند ہوجاتا ہے۔ رات کو باہر ہی نہیں نکلتا۔ منوہر رات دن اس کے دوار پر کھڑا رہتا ہے۔ جس کو پاتا ہے۔ اسی کو چپیٹ لیتا ہے۔ سنتی ہوں کہ اب گاؤں چھوڑ کر کسی دوسرے گاؤں میں بسنے والا ہے۔

پریم شنکر یہ باتیں سن کر گہرے سوچ میں پڑگئے۔ میں کتنا بے پرواہ ہوں۔ ان بے چاروں کو سزا پائے ہوئے سال بھر ہونے آتا ہے۔ اور میں نے ان کے بال بچوں کی سدھ تک نہ لی۔ وہ سب اپنے من میں کیا کہتے ہوں گے۔ گیان شنکر سے قول ہار چکا ہوں۔ لیکن اب وہاں جانا ہی پڑے گا۔ اپنی بات کے پیچھے اتنے بیکسوں کو تباہ ہونے دوں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ان غریبوں کی جانیں میرے قول سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ یکایک بڑھیا نے کہا۔ کیوں بھیا۔ کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا؟ لوگ کہتے ہیں۔ کہ ابھی کسی اور بڑے حاکم کے یہاں پھریاد لگ سکتی ہے۔

پریم شنکر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ روپیہ کا انتظام کرنا تو اتنا دشوار نہ تھا۔ مگر انھیں اپیل سے کچھ فائدہ ہونے کی بہت کم امید تھی۔ اس لیے وہ اس مسئلہ کو ٹالتے آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی انھوں نے اپیل کا تذکرہ کبھی نہ کیا تھا۔ پریاناتھ ان کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دلی خیالات کو سمجھ گئے۔ اور ان کی

پریشانی کو دور کرنے کے لیے خود ہی بولے...... بڑھیا ہاں فریاد لگ سکتی ہے۔ اس کا بندوبست ہو رہا ہے۔ دھیرج رکھو۔ جلد ہی اپیل دائر کردی جائے گی۔

بڑھیا۔ بیٹا۔ دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو۔ سنتی ہوں کوئی بڑا ڈاکٹر تھا۔ اسی نے جمیندار سے کچھ روپئے لے دے کر ان گریبوں کو پھنسا دیا۔ نہ ہوتو تم دونوں آدمی اسی کے پاس جاکر ہاتھ پاؤں جوڑو۔ کون جانے وہ تمھاری بات مان جائے۔ اس کے آگے بھی تو بال بچے ہوں گے۔ کیوں ہم گریبوں کو بے کسور مارتا ہے۔ کسی کی ہائے بٹورنا اچھا نہیں ہوتا۔

پریم شنکر زمین میں گڑے جاتے تھے۔ ڈاکٹرصاحب کو کتنا صدمہ پہنچ رہا ہوگا۔ وہ اپنے دل میں کتنے نادم ہو رہے ہوں گے۔ کہیں بڑھیا گالیاں نہ دینے لگے۔ اِسے کیسے چپ کراوں؟ ان خیالات سے وہ بہت بے چین ہو رہے تھے۔ مگر پریاناتھ کے چہرہ پر ایک فیاضانہ شگفتگی نمودار تھی۔ آنکھوں میں شفقت ظاہر ہو رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے بولے۔ ہم لوگ اس ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ اسے خوب سمجھایا ہے۔ ہے تو لالچی پر کہنے سننے سے راہ پر آگیا ہے۔ اب سچی گواہی دے گا۔

اتنے میں متا پیسے لے کر آگیا۔ پریم شنکر نے لکڑی کے دام دیے۔ بڑھیا لڑکوں کے ساتھ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے پھر کہا۔ بھیا بھول نہ جانا۔ دھرم کا کام ہے۔ تمھیں بڑا جس ہوگا۔

ان کے چلے جانے پر کچھ دیر تک پریم شنکر اور پریاناتھ خاموش بیٹھے رہے۔ پریم شنکر کی زبان لحاظ نے بند کر رکھی تھی۔ اور ڈاکٹرصاحب کی زبان شرم نے۔

یکایک پریاناتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور یقین کے لہجہ میں بولے۔ بھائی صاحب اپیل ضرور کیجیے۔ آپ آج ہی الہ آباد چلے جایئے۔ آج کے نظارہ نے میرا دل ہلا دیا۔ انشاء اللہ اب کے حق کی فتح ہوگی۔

(۴۴)

ڈاکٹرعرفان علی اس واقعہ کے بعد ہوا خوری کو نہ جاسکے۔ اور سیدھے اپنے مکان کی طرف چلے۔ راستہ بھر انھیں کھٹکا لگا ہوا تھا۔ کہ کہیں اس مفسدوں سے پھر نہ مڈبھیڑ ہوجائے۔ ورنہ اب کے جان کے لالے پڑجائیں گے۔ آج بڑی خیریت ہوئی۔ کہ پریم شنکر

موجود تھے۔ ورنہ ان بدمعاشوں کے ہاتھوں میری نہ جانے کیا دُرگت ہوتی۔ جب وہ اپنے مکان پر بخیریت پہنچ گئے۔ اور برآمدہ میں آرام کرسی پر لیٹے تو اس مسئلہ پر غور کرنے لگے۔ اب تک وہ حق انصاف کی بیباکانہ حمایت کے لیے مشہور تھے۔ پولیس کے خلاف ان کی وکالت کی تلوار ہمیشہ نیام سے باہر رہتی تھی۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ وہ بہت مطالعہ یا کھوج کرنے والے یا کوئی منطقی وکیل نہ تھے۔ مگر ان کی بے خوفی نے ان تمام خامیوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ مگر اس لکھن پور والے مقدمہ میں پہلی بار ان کی خود غرضی کا پردہ فاش ہوا۔ پہلے وہ عموماً پولیس سے ہار کر بھی جیت میں رہتے تھے۔ عوام کا اعتقاد ان پر برابر قائم رہتا تھا۔ بلکہ اور زیادہ ہوتا تھا۔ آج پہلی بار انھیں واقعی شکست ملی۔ عوام کا اعتقاد ان پر سے اٹھ گیا۔وہ عام نظروں میں گرگئے۔ ان کے کانوں میں یہ الفاظ اب تک گونج رہے تھے۔ کہ ان بیکسوں کا خون انھیں کی گردن پر ہے۔ عرفان علی ان لوگوں میں نہ تھے۔ جن کا ضمیر حرص و ہوا کے نیچے دب کر مردہ ہوجاتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے احباب سے اپنی مشکلات کا رونا رویا کرتے تھے اور واقعی یہ آنسو ان کے دل سے نکلتے تھے۔ وہ بار بار ارادہ کرتے تھے۔ کہ اس پیشہ کو ترک کردوں۔ لیکن قماربازوں کے عہد کی طرح ان کا یہ ارادہ کافی مضبوط نہ ہوتا تھا۔ بلکہ روز بروز لالچ میں پڑ کر وہ اور ڈوبتے جارہے تھے۔ ان کی حالت اس مسافر کی سی تھی۔ جو شام ہونے کے قبل اپنی منزل پر پہنچ جانے کے خیال سے زیادہ تیزی سے قدم اٹھاتاہے۔ عرفان علی وکالت چھوڑنے سے پہلے اتنی دولت کما لینا چاہتے تھے کہ زندگی آرام سے کٹے۔ پس وہ جادۂ ہوس پر اور بھی تیز گام ہوتے جاتے تھے۔

مگر آج کے واقعہ سے اس کے دل پر خاص اثر پڑا۔ اب تک ان کی حالت ان رؤسا کی سی تھی۔ جو وہم کا علاج کیا کرتے ہیں۔ کبھی کوئی لذیذ معجون بنوالی، کبھی کوئی مفرّح عرق تیار کرا لیا۔ اور حسبِ خواہش ان کا استعمال کرتے رہے۔ مگر آج انھیں معلوم ہوا۔ کہ میں ایک شدید مرض میں مبتلا ہوں۔ اب معجون اورعرق سے کام نہ چلے گا۔ اس مرض کا ازالہ تیز نشتر اور تلخ دواؤں سے ہوگا۔ میں حق کا خادم بنتا ہوں۔ فی الواقع میں اپنے نفس کا بندہ ہوں۔ پریم شنکر نے مجھے ناحق بچا لیا۔ ذرا دو چار چوٹیں پڑجاتیں تو ذرا میری آنکھیں اور کھل جاتیں۔

معاذاللہ۔ میں کتنا خود غرض ہوں۔ اپنی غرض کے مقابلہ میں دوسروں کی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ میں نے اس مقدمہ میں اوّل سے آخر تک دغا و فریب سے کام لیا۔ کبھی مسئلوں کو توجہ سے نہیں دیکھا۔ کبھی جرح کے سوالات پر غور ہی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ گواہوں کے بیانات بھی پورے نہ سنے۔ کبھی دوسرے مقدموں کی پیروی کرنے چلا جاتا تھا۔ کبھی دوستوں سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ میں نے ذرا غور سے کام لیا ہوتا۔ تو پریاناتھ کو چٹکیوں میں اڑادیتا۔ مخبر کو دو چار جرحوں میں اکھاڑ سکتا تھا۔ سب انسپکٹر کا بیان بھی کچھ ایسا معقول نہ تھا لیکن میں نے تو اپنے فرض کا کبھی خیال ہی نہیں کیا۔ عدالت میں اس طرح جا بیٹھتا جیسے کوئی مجلسِ احباب میں جا بیٹھے۔ میں اس پیشہ کو برا کہتا ہوں۔ یہ میری مکاری ہے۔ ہماری کج روی ہے۔ جس نے اس پیشہ کو بدنام کر رکھا ہے۔ مناسب تو یہ ہے۔ کہ ہماری نگاہ حق پر ہو۔ مگر اس کے بجائے ہماری نگاہ ہمیشہ روپیہ پر رہتی ہے۔ انشاء اللہ اب آئندہ سے وہی کروں گا۔ جو مجھے کرنا چاہیے۔ ہاں اب سے ایسا ہی ہوگا۔ اب میں بھی پریم شنکر کے طرزِ زندگی کو اپنا معیار بناؤں گا۔ قناعت اور خدمت کے راہِ راست پر چلوں گا۔

جب پریم شنکر شفاخانہ میں رہے۔ عرفان علی عموماً ہر روز ان کی مزاج پرسی کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان کی ہمت واستقلال پر ڈاکٹر صاحب کو حیرت ہوتی تھی۔ پریم شنکر سے انھیں روزبروز زیادہ عقیدت ہوتی جاتی تھی۔ اپنے موکلوں کے ساتھ ان کا برتاؤ اب زیادہ ہمدردانہ ہوتا تھا۔ وہ ان مقدموں کو غور سے دیکھتے۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ مقدمہ نہ لیتے۔ اور ایک مقدمہ کو اجلاس پر چھوڑ کر دوسرے مقدمہ کی پیروی کرنے کو تو گویا انھوں نے قسم ہی کھالی تھی۔ وہ اپیل کرنے کے لیے کئی بار پریم شنکر کو ترغیب دینا چاہتے تھے۔ مگر اپنی نازیبا حرکت کو یاد کرکے محجوب ہوجاتے تھے۔ باالآخر انھوں نے سیتا پور جاکر بابوجوالاسنگھ سے اس بارے میں مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر بابوصاحب اب تک ذُبدھے میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ پریم شنکر کو کئی بار لکھ چکے تھے۔ کہ استعفیٰ دے کر جلد ہی آپ کی خدمت میں آتا ہوں۔ لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات درپیش ہوجاتی تھی کہ انھیں مجبوراً ارادہ ملتوی کرنا پڑتا۔ بات یہ تھی۔ کہ شیل منی ان کے استعفیٰ دینے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ وہ کہتی۔ بلا سے تمھارے افسر تم سے ناخوش ہیں۔ ترقی نہیں ہوتی نہ

سہی۔ تمھیں انصاف کرنے کا اختیار تو حاصل ہے۔ اگر افسرانِ بالا ناراض ہوکر تمھیں تنزل کردیں۔ تو تمھیں اپیل کرنی چاہیے۔ اور حکام اعلی کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ افسروں نے ذرا تیور بدلے اور تم نے ڈر کر استعفیٰ دینے کی ٹھان لی۔ تمھاری اس بزدلی سے تمھارے کتنے ہی انصاف پسند اور خوددار ساتھیوں کی ہمتیں پست ہوجائیں گی۔ اور وہ بھی بھاگ نکلنے کی تدبیریں کرنے لگیں گے۔ محکمہ شریف لوگوں سے خالی ہوجائے گا۔ اور وہی خوشامدی ٹٹو۔ حکام کے اشاروں پر ناچنے والے باقی رہ جائیں گے۔ جوالا سنگھ اس دلیل پر لاجواب ہوجاتے تھے۔ جب ڈاکٹر عرفان علی ان کے پاس جاپہنچے تو وہ اپنی سہل اندازی اور اقتدار پرستی کا سارا الزام شیل منی پر رکھ کر اپنے کو غیر ذمہ دار نہ قرار دے سکے۔

شیل منی سمجھ گئی۔ کہ اب انھیں روکنا مشکل ہے۔ میری ایک نہ سنیں گے۔ موقع پاتے ہی اس نے جوالا سنگھ سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب کو کیا جواب دیا؟

جوالا۔ جواب کیا دینا ہے۔ استعفیٰ دیئے دیتا ہوں۔ اب ٹال مٹول سے کام نہ چلے گا۔ جب تک میں نہ جاؤں گا۔ بابو پریم شنکر کچھ نہ کرسکیں گے۔ بدقسمتی سے وہ مجھ پر اس سے کہیں زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ جس کے قابل میں واقعی ہوں۔ اپیل کی معیاد گزر جانے پر کچھ بھی نہ ہوسکے گا۔ اپیل سے کامیابی کی بہت کچھ امید ہے۔ اور اگر میری کوشش سے کئی بے گناہوں کی جان بچ جائے۔ تو اب مجھے کوئی لمحہ بھی دیر نہ کرنی چاہیے۔

شیل منی۔ تو کچھ دنوں کی رخصت کیوں نہیں لے لیتے؟

جوالا۔ تم تو جان بوجھ کر انجان بنتی ہو۔ وہاں مجھے کتنی ہی ایسی باتیں کرنی پڑیں گی۔ جنھیں ملازمت کی بیڑیاں پہنے ہوئے میں نہیں کرسکتا۔ صرفہ کے لیے چندہ مانگنا۔ وکیلوں سے ملنا جُلنا۔ لکھن پور والوں کی تکلیفیں رفع کرنا۔ یہ ساری باتیں کرنی ہوں گی۔ پولیس کی نگاہوں پر چڑھ جاؤں گا۔ حکام اور بھی کشیدہ خاطر ہوجائیں گے۔ تو اس ملازمت کی زنجیر کو توڑ ہی کیوں نہ دوں؟ مجھے یقینِ کامل ہے۔ کہ آزاد ہوکر جتنی قومی خدمت کرسکتا ہوں اتنی اس حالت میں رہ کر کبھی نہیں کرسکتا۔

شیل منی بہت دیر تک ان سے حجت و بحث کرتی رہی آخر میں ناخوش ہوکر بولی۔

اونہہ۔ جو مزاج میں آئے وہ کرو۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ سوکھا ساون ویسا بھرا بھادوں۔ آپ ہی پچھتاؤ گے۔ یہ سارا اعزاز اسی وقت تک ہے جب تک حاکم ہو۔ جب قومی خدمت کرنے لگو گے۔ تو کوئی بات بھی نہ پوچھے گا۔ کیا وہاں سب کے سب بھلے آدمی ہی ہیں؟ بھلے بُرے سبھی جگہ ہوتے ہیں۔ پریم شنکر کو تو میں نہیں کہتی۔ وہ دیوتا ہیں۔ لیکن قومی خدمت کرنے والوں میں تمھیں سینکڑوں آدمی ایسے ملیں گے۔ جو نفس کے غلام ہیں۔ اور خدمت کی آڑ میں گلچھرے اڑاتے ہیں۔ وہ پاک اور بے لوث آدمیوں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔ تمھیں ان کے ساتھ رہنا دوبھر ہوجائے گا۔ ان کی زیادتی۔ ان کی تنگ دلی۔ ان کی دغابازی دیکھ کر تم کڑھوگے۔ مگر اُن سے کچھ نہ کہہ سکوگے۔ اس لیے جو کچھ کرو۔ خوب سمجھ کر کرو۔

یہ وہی باتیں تھیں۔ جو جوالا سنگھ نے خود ہی شیل منی سے کہی تھیں۔ شاید یہی باتیں سن سن کر وہ استعفیٰ کے خلاف ہوگئی تھی۔ مگر اس وقت وہ ان حوصلہ شکن باتوں کو سننے کی تاب نہ لاسکے۔ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور اسی جوش کی حالت میں استعفیٰ لکھنا شروع کیا۔

(۴۵)

کئی ماہ گزر گئے۔ اور پریم شنکر اپیل دائر کرنے کا فیصلہ نہ کرسکے۔ جس کام میں انھیں کسی دوسرے سے مدد ملنے کی امید نہ ہوتی تھی۔ اسے وہ بڑی مستعدی سے کرتے تھے۔ مگر جب کوئی انھیں سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔ تو ان پر ایک عجیب بے بسی سی طاری ہوجاتی تھی۔ اس کے علاوہ روپیہ کا نہ ہونا بھی اپیل میں روکاوٹ پیدا کر رہا تھا۔ ججی کے خرچ نے انھیں اتنا زیر بار کر دیا تھا۔ کہ ہائی کورٹ جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اگرچہ کتنے ہی آدمیوں کو ان سے عقیدت تھی۔ اور وہ اس کارِثواب کے لیے کافی روپیہ جمع کرسکتے تھے۔ مگر ان کی قدرتی سادگی اور مسکینی اس بات کو ان کے خیال میں بھی نہ آنے دیتی تھیں۔

ایک روز شام کے وقت پریم شنکر بیٹھے ہوئے اخبار دیکھ رہے تھے۔ گورکھپور کے سناتن دھرم کے جلسہ کا حال جلی حروف میں چھپا ہوا نظر آیا۔ غور سے پڑھنے لگے۔ گیان شنکر کو انھوں نے چالاک اور خودغرض سمجھ رکھا تھا اب ان کی صداقت اور ان کے مذہبی

انہاک کی خبر سے انھیں اپنی تنگ خیالی پر افسوس ہوا۔ ہائے میں کتنا کم فہم ہوں۔ ایسے پاک باطن اور بے لوث شخص پر بے جا شکوک کرنے لگا۔ انھیں گیان شنکر سے ایک قسم کی عقیدت سی پیدا ہوگئی۔ ان کی تعریف کرنے کی ایسی زبردست خواہش ہوئی کہ انھوں نے متا اور بھولا کو کئی آواز دی۔ جب کسی نے جواب نہ دیا۔ تو وہ خود متا کی جھونپڑی کی طرف چلے۔ کہ دفعتاً در گا۔ متا اور مزرعہ کے دیگر ملازمین ایک شخص کو کشاں کشاں لاتے ہوئے دیکھائی دیے۔ سب کے سب اُسے گالیاں دے رہے تھے۔ اور متا رہ رہ کر ایک دھول جما دیتا تھا۔ پریم شنکر نے آگے بڑھ کر تیز لہجہ میں کہا۔ کیا ہے بھولا۔ اسے کیوں مار رہے ہو؟

متا۔ بھیا۔ یہ نہ جانے کون آدمی ہے۔ پھاٹک سے چمٹا ہوا کھڑا تھا۔ ابھی میں پھاٹک بند کرنے گیا۔ تو اسے دیکھا۔ مجھے دیکھ یہ اور بھی دبک گیا۔ بس میں نے چپکے سے آکر سب کو ساتھ لیا۔ اور پھر بنچا کو دھر لیا۔ جرور سے جرور کوئی چور ہے۔

پریم۔ چور سہی۔ تمھارا کچھ چرایا تو نہیں؟ پھر اسے کیوں مارتے ہو؟

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے برآمدہ میں آکر بیٹھ گئے۔ چور کو بھی لوگوں نے وہیں لاکر کھڑا کیا۔ جیوں ہی لالٹین کے اُجالے میں اس کی صورت دکھائی دی۔ پریم شنکر کے منہ سے دفعتاً ایک چیخ سی نکل گئی۔ یہ تو بشیشر شاہ ہیں!

بشیشر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ہاں سرکار۔ میں بسیسر ہی ہوں۔

پریم شنکر نے اپنے ملازموں سے تند لہجہ میں کہا۔ تم لوگ بالکل گنوار اور جاہل ہو۔ نہ جانے تمھیں کبھی سمجھ آئے گی بھی یا نہیں۔

متا۔ بھیا ہم تو بار بار پوچھتے رہے کہ تم کون ہو۔ یہ کچھ بولے ہی نہیں تو میں کیا کرتا۔

پریم۔ بس چپ رہ۔ گنوار کہیں کا۔

نوکروں نے دیکھا۔ کہ ہم سے غلطی ہوگئی۔ چپکے سے ایک ایک کرکے کھسک گئے۔ پریم شنکر کو غصہ میں دیکھ کر سب کے سب تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ اگرچہ پریم شنکر ان سبھوں سے بھائی چارہ کا برتاؤ کرتے تھے۔ مگر وہ سب ان کا بڑا ادب و لحاظ کرتے تھے۔ ان کے سامنے چلم تک نہ پیتے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد پریم شنکر نے بشیشر شاہ کو چار پائی پر بیٹھایا اور بہت شرمندہ ہوکر بولے۔ ساہ جی مجھے سخت افسوس ہے۔ کہ میرے

آدمیوں نے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا۔ سب کے سب جاہل اور گنوار ہیں۔

بشیشر نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔ نہیں بھیا۔ انھوں نے کوئی برا برتاؤ نہیں کیا۔ میں اسی لائق ہوں۔ آپ مجھے کھمبے سے باندھ کر کوڑے لگوائیں۔ تب بھی برا نہ مانوں گا۔ میں بسواس گھاتی ہوں۔ مجھے جو ڈنڈ ملے وہ تھوڑا ہے۔ میں نے اپنی جان کے ڈر سے سارے گاؤں کو ملیامیٹ کردیا۔ نہ جانے میری بدھی کہاں چلی گئی تھی۔ پولیس والوں کی بھپکی میں آگیا۔ وہ سب ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اتنا ڈراتے اور دھمکاتے ہیں۔ کہ سیدھا سادہ آدمی بالکل ان کی مٹھی میں ہوجاتا ہے۔ انھیں جرور سے جرور کسی دیوتا کا ایشٹ ہے۔ کہ وہ جو کچھ کہلاتے ہیں۔ وہی منہ سے نکلتا ہے۔ بھگوان جانتے ہیں جو گوس کھاں کے بارے میں مجھے کسی سے بات چیت ہوئی ہو۔ مجھے تو ان کے کتل کا حال دن چڑھے معلوم ہوا۔ جب میں پوجا پاٹ کرکے دُکان پر آیا۔ پر جب دروگاجی تھانے میں لے جاکر میری سانست کرنے لگے۔ تو مجھ پر جیسے کوئی جادو چڑھ گیا۔ میں ان کی ایک ایک بات دوہرانے لگا۔ جب میں عدالت میں بیان دے رہا تھا۔ تو سرم کے مارے میری آنکھیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔ میرا جیسا کُوکرمی سنسار میں نہ ہوگا۔ جن آدمیوں کے ساتھ رات دن کا رہنا سہنا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ جو میرے دُکھ درد کے ساتھی تھے انھیں کی گردن پر میں نے چھری چلائی۔ جب کادر نے میرا بیان سن کر کہا کہ بسیسر بھگوان سے ڈرواوس گھڑی میرا ایسا جی چاہتا تھا۔ کہ دھرتی پھٹ جائے۔ اور میں اس میں سماجاؤں۔ من ہوتا تھا۔ ساپھ ساپھ کہہ دوں کہ یہ سب سکھائی پڑھائی باتیں ہیں۔ پر دروگاجی کی طرف جونہی آنکھ اٹھتی تھی۔ تیوں ہی میرا ہیاؤ چھوٹ جاتا تھا۔ جس دن منوہر نے اپنے گلے میں پھانسی لگائی ہے۔ اس دن سے میری نیند حرام ہوگئی۔ رات کو سوتے سوتے چونک پڑتا ہوں۔ جیسے منوہر سرہانے کھڑا ہو۔ سانجھ ہوتے ہی گھر کے کواڑ بند کرلیتا ہوں۔ باہر نکلتا ہوں۔ تو جان پڑتا ہے۔ کہ منوہر سامنے آرہا ہے۔ گھر والی اُسی دن سے بیمار پڑی ہوئی ہے۔ گھر کی تو یہ دردسا ہے ادھر سارے گاؤں میں اندھیرا مچا ہوا ہے۔ سب کے بال بچے بھوکوں مررہے ہیں۔ پھیچو اور کرتار نت نئے توپھان اٹھاتے رہتے ہیں۔ بھگوان سکھو چودھری کا بھلا کریں۔ ان کے دل میں دیا آئی۔ دوسال کی مال گجاری ادا کردی۔ نہیں تو اب تک سارا گاؤں بے دکھل ہوگیا ہوتا اس پر پھیچو جل جل رہتا ہے۔ جب سکھو آجاتے ہیں۔ تو

بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ پر جیوں ہی وہ چلے جاتے ہیں پھر وہی بکھیڑے کرنے لگتا ہے۔ ان گریبوں کا دکھ اب مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جیسے چاہتا ہے مارتا ہے۔ ڈانٹر لیتا ہے۔ ایک دن کادرمیاں کے گھر میں آگ لگوادی۔ اور تو اور اب گاؤں کی بہو بیٹیوں کی اجت بچتی نہیں دکھائی دیتی۔ منوہر کے گھر ساس بہو میں جھگڑا مچا ہوا ہے۔ دونوں الگ الگ رہتی ہیں۔ پرسوں رات کی بات ہے۔ کہ پھیچو اور کرتار دونوں بہو کے گھر میں گھس رہے۔ اس بے چاری نے چلانا شروع کیا۔ ساس پہنچ گئی۔ اور لوگ بھی پہنچ گئے۔ دونوں نکل کر بھاگے۔ سیرا ہوتے ہی اس کی کسر نکلی۔ کرتار نے منوہر کی گھر والی کو اتنا مارا۔ کہ بے چاری پڑی ہلدی پی رہی ہے۔ یہ سب پاپ میرے سوا اور کس کے سر پڑتا ہوگا۔ میں ہی اس ساری بپت لیلا کی جڑ ہوں۔ بھگوان میری نہ جانے کیا دُرگت کریں گے۔ کاہے بھیا کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا؟ سنتے ہیں کہ تم اپیل کرنے والے ہو۔ پھر جلدی کر کیوں نہیں دیتے؟ ایسا نہ ہو کہ میعاد بیت جائے۔ تم مجھے طلب کرا دینا۔ مجھ پر دروغ حلپھی کا الجام آئے گا تو کیا۔ پر میں اب کی سب کچھ سچ سچ کہہ دوں گا۔ یہی نہ ہوگا کہ میری سجا ہوجائے گی۔ گاؤں کا تو بھلا ہوجائے گا۔ میں ہجار پانچ سو سے مدد بھی کرسکتا ہوں۔

پریم۔ ہائی کورٹ میں تو مِسل دیکھ کر فیصلہ ہوتا ہے۔ وہاں کسی کے بیان نہیں لیے جاتے۔

بشیشر۔ بھیا کچھ لینے دینے سے کام چلے تو دے دو۔ ہجار پانچ سو کا منہ مت دیکھو۔ مجھے جو کچھ کہو گے۔ اس کے لیے حاجر ہوں۔ یہ بات میرے من میں مہینوں سے سمائی ہوئی ہے۔ پر آپ کو منہ دکھانے کے ہمت نہ پڑتی تھی۔ آج کچھ سودا لینے چلا۔ تو چوپال کے سامنے پھیچو مل گئے۔ کہنے لگے کہ جاتے ہو تو یہ روپے لیتے جاؤ۔ مالکوں کے گھر بھجوا دینا۔ میں نے روپے لے لیے اور ڈیوڑی پر جا کر چھوٹی بہو کے پاس روپے بھیج دیے۔ جب چلنے لگا۔ توبڑی بہو نے دیوان کھانہ میں مجھے بلایا۔ ان کو دیکھ کر ایسا جان پڑا۔ مانو ساچھات دیوی کے درشن ہوگئے۔ انھوں نے مجھے ایسا ایسا اوپدیس دیا۔ کہ آپ سے کیا کہوں۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ من میں ٹھان کر چلا۔ کہ آپ سے اپیل دائر کرنے کو کہوں۔ جس میں میرا بھی ادھار ہوجائے۔ پر دو تین بار آآ کر لوٹ گیا۔ آپ کو منہ دکھاتے لاج آتی تھی۔ سورج ڈوبنے کے بکھت پھر آیا۔ پر وہیں پھاٹک کے پاس دوبدھا میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ کہ کیا کروں۔ اتنے میں

آپ کے آدمیوں نے دیکھ لیا۔ اور آپ کی سرن میں لے آئے۔ مجھ جیسے جھوٹھے دگاباج آدمی کا اعتبار ہی کیا؟ پر اب میں سوگند کھاکر کہتا ہوں۔ کہ پھر جو میرا بیان لیا جائے گا تو میں ایک ایک بات کھول کر کہہ دوں گا۔ چاہے الٹی پڑے۔ چاہے سیدھی۔ آپ جرور سے جرور اپیل کیجیے۔

پریم شنکر بشیشر شاہ کو انتہا درجہ کا خودغرض۔ دغاباز اور کمینہ سمجھتے تھے۔ ان کی رائے میں وہ انسان کہے جانے کے قابل بھی نہ تھا۔ لیکن اُس کی اِس ندامت آمیز گفتگو نے اُسے شیطان کے درجہ سے نکال کر انسان بنا دیا۔ نارائن جس کو میں بدباطن سمجھتا تھا۔ اس کے دل میں پشیمانی کا یہ پاک جذبہ۔ یہ روحانی کمال اور یہ خوفِ خدا۔ میں کتنی غلطی پر تھا۔ دنیا کو لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ میں نے تو ہر ایک برے کو اچھا ہی پایا۔ اسے اپنی خوش قسمتی کے سوا اور کیا کہوں۔ ایشور۔ مجھے ان بدگمانیوں کے لیے معاف کرنا۔ یہ سوچ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولے...... ساہ جی۔ تمھاری باتیں سن کر مجھے وہی سکھ ملا۔ جو کسی سچے سادھو کے اپدیش سے ملتا۔ میں بہت جلد اپیل کرنے والا ہوں مشکل یہی ہے کہ گواہوں کے بیانات کیسے بدلے جائیں گے۔ ممکن ہے۔ کہ ہائی کورٹ مقدمہ پر نظر ثانی کرنے کا حکم دے دے۔ اور پھر اسی عدالت میں معاملہ پیش ہو۔ لیکن بیانات کو تبدیل کرنے سے تم اور ڈاکٹر پریاناتھ دونوں پھنس جاؤ گے۔ پریاناتھ نے تو اپنے بچاؤ کی حکمت سوچ لی ہے۔ لیکن تمھارا بچنا مشکل ہے۔ اسے اچھی طرح سوچ لو۔

بشیشر۔ کھوب سوچ لیا ہے۔

پریم۔ تو ایشور نے چاہا۔ تو تم بچ بھی جاؤ گے۔ میں کل وکیلوں سے اس بارے میں صلاح لوں گا۔

یہ کہہ کر بشیشر کے کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے لیے چلے گئے۔

(۴٦)

گیان شنکر لکھنو سے سیدھے بنارس پہنچے۔ مگر اداس اور مغموم رہتے۔ نہ ہوا خوری کے لیے جاتے اور نہ کسی سے ملتے جلتے۔ اس کی حالت اس وقت اس پرند کی سی تھی۔ جس کے دونوں بازو کٹ گئے ہوں۔ یا اُس عورت کی سی جسے خدائی قہر نے شوہر اور لڑکے سے محروم کردیا ہو۔ ان کی زندگی کی ساری تمنائیں برباد ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ابھی ایک ہفتہ قبل ان کی کشتِ آرزو ہوا کے فرحت بخش جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔ وہاں اب صرف جھلسی ہوئی پتیوں کا ایک انبار تھا۔ انھیں یقینِ کامل تھا۔ کہ رائے صاحب نے سارا حال گائتری کو لکھ بھیجا ہوگا۔ پوری چیز کی ہوس میں آدھی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ انھیں سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا۔ کہ میری سیاہ باطنی کا پردہ فاش ہوگیا۔ اگر تسکین کا کوئی ذریعہ تھا۔ تو یہی فلسفیانہ خیال تھا۔ کہ موجودہ حالات میں میرے لیے حصولِ مقصد کا کوئی راستہ نہ تھا۔ انھیں اپنی بدکاریوں پر ذرا بھی ندامت یا پشیمانی نہ تھی۔ بس یہی رنج تھا کہ میری ساری کوششیں برباد ہوگئیں۔

لکھنو سے انھوں نے گائتری کو کئی خط لکھے تھے۔ مگر بنارس سے اسے لکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس کے پاس سے آئے ہوئے خطوط کو بھی وہ بہت ڈرتے ڈرتے کھولتے تھے۔ اخباروں کو کھولتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ تھے۔ وِدّیا کے خطوط روزانہ آتے تھے۔ انھیں پڑھنا گیان شنکر کے لیے نوشتۂ تقدیر سے کم صبر آزما نہ تھا۔ وہ ایک ایک فقرہ کو اس طرح ڈر ڈر کر پڑھتے گویا کسی تاریک غار میں قدم رکھتے ہوں۔ انھیں کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں اس واقع کا ذکر نہ آجائے۔ اکثر وہ معمولی جملوں پر غور کرنے لگتے کہ کہیں اس میں کوئی کنایہ یا راز تو نہیں ہے۔ دسویں دن گائتری کے پاس سے ایک بہت طویل خط آیا۔ گیان شنکر نے اسے ہاتھ میں لیا تو اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے خط کھولا۔ اور جس طرح ہم کڑوی دوا کو ایک ہی گھونٹ میں پی جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک ہی سرسری نگاہ میں سارا خط پڑھ لیا۔ دل کو سکون ہوا۔ رائے صاحب کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ پھر انھوں نے اطمینان سے خط کو دوبارہ پڑھا۔ گائتری نے ان کے خط نہ بھیجنے پر موثر پیرایہ میں اپنی بے قراری کا اظہار کیا تھا۔ اور ان سے جلد ہی گورکھپور آنے کے لیے عاجزانہ اصرار بھی۔ گیان شنکر نے اطمینان کی سانس لی۔ گائتری نے اپنے دلی حالت کو چھپانے کی بڑی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا ایک ایک لفظ گیان شنکر کی جاں بلب تمناؤں کے لیے آبِ حیات تھا۔ آس بندھی۔ اطمینان ہوا کہ ابھی بات نہیں بگڑی۔ میں اب بھی ضرورت پڑنے پر شاید اس کی نظروں میں بے گناہ و بے قصور بن سکوں۔ شاید رائے صاحب کے الزامات کو غلط ثابت کرسکوں۔ شاید سچ کو جھوٹ ثابت کرسکوں۔ ممکن ہے کہ میری اشک آلود آنکھیں اب بھی میری بے گناہی کا یقین دلا سکیں۔ اسی رو

میں انھوں نے گائتری کو ایک خط لکھا جس کا بیشتر حصہ داستانِ ہجر کے نذر کرنے کے بعد انھوں نے کنایتاً رائے صاحب کی بدگمانیوں کا بھی ذکر کیا۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔ آپ میرے مزاج اور دلی خیالات سے بخوبی واقف ہیں۔ مجھے اس زندگی میں اگر کوئی آرزو ہے تو یہ ہے۔ کہ مُرلی کی دُھن سنتے ہوئے میں اس دارِفانی سے رخصت ہوجاؤں۔ مرنے لگوں۔ تو اسی مُرلی والے کی صورت میرے آنکھوں کے سامنے ہو۔ اور یہ سر رادھا کی گودی میں ہو۔اس کے علاوہ مجھے اور کوئی تمنا۔ کوئی ہوس نہیں ہے۔ رادھا کی ایک ترچھی چتون ایک شیریں تبسم ایک میٹھی چٹکی۔ ایک انوکھے جلوہ پر میں دنیا کی کل نعمتوں کو نثار کرسکتا ہوں۔ مگر جب تک دنیا میں ہوں۔ دنیا کی کالکھ سے کیوں کر بچ سکتا ہوں؟ میں نے رائے صاحب سے موسیقی کانفرنس کے بارہ میں کچھ صاف صاف باتیں کی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اب وہ میری جان کے دشمن ہوگئے ہیں۔ آپ سے اپنی مصیبت کا حال کیا عرض کروں۔ آپ کو سن کر ملال ہوگا۔ انھوں نے مجھے مارنے کے لیے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اگر بھاگ نہ جاتا۔ تو یہ خط لکھنے کے لیے زندہ نہ رہتا۔ مجھے حکم ہوا ہے۔ کہ اب پھر انھیں منہ نہ دکھاؤں۔ اتنا نہیں۔ مجھے آپ سے بھی ترکِ تعلق کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حکم عدولی کی سزا ایسی سخت تجویز کی جا چکی ہے۔ کہ اس کا ذکر کرکے میں آپ کے نازک دل کو دکھانا نہیں چاہتا۔ میری خاموشی کا یہی سبب ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے پاس بھی اس مضمون کی کوئی تحریر پہنچی ہو۔ اور آپ کو بھی مجھے دودھ کی مکھی سمجھنے کی فہمائش کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ پتا کی آگیاں (حکم) کے سامنے سر جھکانا آپ کا فرض ہے۔ آپ ایسا ہی کریں۔ میں آپ سے دور رہ کر بھی آپ کے نزدیک ہوں۔ کوئی دنیاوی طاقت مجھے آپ سے جدا نہیں کرسکتی۔ روحانی تعلق کو کون مٹاسکتا ہے۔ یہ کرشن کا پریمی ہمیشہ ہمیشہ رادھا کی یاد میں مگن رہے گا۔ آپ سے صرف یہی چاہتا ہوں۔ کہ آپ میری طرف سے بدگمان نہ ہوں۔ اور اپنے فیاض دل کے ایک گوشہ میں میری یاد قائم رکھیں۔

گیان شنکر کے چلے آنے کے بعد گائتری کو ایک ایک لمحہ کاٹنا دشوار ہوگیا۔ اسے اب معلوم ہوا۔ کہ میں کتنے گہرے پانی میں آگئی ہوں۔ جب تک گیان شنکر کے ہاتھوں کا سہارا تھا۔ اسے عمق کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ اس سہارا کے چھٹتے ہی اس کے پیر پھسلنے لگے۔

وہ سنبھلنا چاہتی تھی۔ مگر لہروں کی تیز روانی سنبھلنے نہ دیتی تھی۔ اب کے گیان شنکر پورے ایک سال بعد گورکھ پور سے نکلے تھے۔ وہ روزانہ انھیں دیکھتی تھی۔ روزانہ ان سے باتیں کرتی تھی اور اگرچہ ایسا موقع دن میں دو ایک بار سے زیادہ نہ ملتا تھا۔ مگر ان کے قرب کا یقین اس کی تقویت کا باعث تھا۔ اب پنجرے کو خالی دیکھ کر اسے طائر کی یاد بار بار آتی تھی۔ وہ سادہ اور مغرور تھی۔ لیکن اس کے دل کی گہرائی میں محبت کا ایک ابلتا ہوا چشمہ تھا۔ وہ اب تک غرور کے موٹے کتل سے دبا ہوا اخراج کا کوئی راستہ نہ پانے کے باعث ایک سکون کی حالت میں تھا۔ یہی سکون اس کی عفت پروری تھی۔ مگر اب بھگتی اور پریم نے اس غرور کے کتل کو ہٹا دیا تھا۔ اور ابلتا ہوا چشمہ ایک سیلابی زور کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ اس پر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ بے ہوش سی ہوگئی تھی۔ اسے اس کا وہم بھی نہ تھا۔ کہ یہ بھگتی اسے مجاز کی طرف کھینچے لیے جاتی ہے۔ وہ اس محبت کے نشہ میں کتنی ہی ایسی باتیں کرتی تھی۔ اور کتنی ہی ایسی باتیں سنتی تھی۔ جن سے وہ پہلے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ جو اگر پہلے اس کے دل میں آتیں تو وہ خودکشی پر آمادہ ہوجاتی۔ پر اب وہ گوپی تھی۔ وہ دائمی محبت کی مورت تھی۔ اس روحانیت میں مادیت کا دخل کہاں؟ اس میں کثافتِ نفس کا گزر کہاں؟ کرشن کا نام۔ کرشن کی بھگتی۔ کرشن کی رٹ نے اس کے دل اور روح کو پاک محبت سے معمور کردیا تھا۔ گائتری جب گیان شنکر کی طرف شوخ نگاہوں سے دیکھتی یا معشوقانہ انداز سے مسکراتی تو وہ اپنے کو گوپی سمجھتی تھی۔ جو کرشن کے ساتھ ٹھٹھولی یا راس کررہی ہو۔ اس کی اس نگاہ اور اس تبسم میں ایک معنوی پہلو ہوتا تھا۔ گیان شنکر جب اس کی طرف مستانہ انداز سے دیکھتے یا اس کی سرد مہری کا شکوہ کرتے تو ان کی باتوں میں بھی اس کو وہی معنوی پہلو نظر آتا تھا۔ اس محبت طرازی اور لطف اندوزی کا چسکا روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ان کے بغیر دل اُچاٹ رہتا تھا۔ گائتری اس بے قراری کی حالت میں کبھی گیان شنکر کے دیوان خانہ کی طرف جاتی۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ کبھی باغیچہ میں۔ مگر کہیں جی نہ لگتا تھا۔ وہ گوپیوں کے دردِفرقت کا اپنے دردِفرقت کے ساتھ موازنہ کرتی۔ سورداس کے ان پدوں (اشعار) کوگاتی جن میں گوپیوں کی حالتِ فراق کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس کے باغ میں ایک کدم کا درخت تھا۔ اس کے نیچے سبز گھاس پر لیٹی ہوئی وہ کبھی گاتی۔ کبھی روتی۔ اور کبھی بیتاب ہوکر ٹہلنے لگتی۔ کبھی

سوچتی کہ لکھنؤ جاؤں۔ کبھی گیان شنکر کو تار دے کر بلانے کا ارادہ کرتی۔ کبھی تہیہ کرتی کہ اب انھیں باہر نہ جانے دوں گی۔ ان کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرا کرتی۔ ان کی باتیں کانوں میں گونجا کرتیں۔ وہ صورت کتنی دل فریب ہے۔ ان کی باتیں کتنی رسیلی ہیں۔ وہ سراپا کرشن کی مورت ہیں۔ اسے تعجب ہوتا تھا۔ کہ میں نے انھیں تنہا کیوں جانے دیا۔ کیا میں بھی ان کے ساتھ نہ جاسکتی تھی؟ وہ گیان شنکر کو خط لکھتی۔ تو ان کی غفلت اور بے دردی کا خوب رونا روتی۔ ان کے خط آتے تو بار بار پڑھتی۔ اظہارِ محبت میں اب غیرت یا حجاب کا خیال مانع نہ ہوتا تھا۔ گوپیوں کی ہجروغم کی داستانوں میں اِن دنوں اسے ایک عجیب رقت انگیز لطف آتا تھا۔ پریم ساگر کی دوچار چوپائیاں بھی نہ پڑھنے پاتی کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

مگر جب گیان شنکر بنارس چلے گئے۔ اور ان کے خطوط کا آنا یک قلم بند ہوگیا۔ تو گائتری کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ گویا میں اس دنیا ہی میں نہیں ہوں۔ بلکہ یہ کوئی دوسری ویران اور سنسان دنیا ہے۔ اسے گیان شنکر کے بنارس جانے کا حال معلوم نہ تھا۔ وہ لکھنؤ کے پتہ پر روزانہ خط بھیجتی رہی۔ لیکن جب متواتر کئی خطوں کا جواب نہ آیا۔ تو اسے اپنے اوپر جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ وہ گوپیوں کی طرح آپ اپنے ہی کو ملامت کرتی کہ میں کیوں ایسے بے درد۔ سنگ دل اور ظالم آدمی کے پیچھے اپنی جان کھپارہی ہوں۔ کیا ان کی طرح میں بھی بے مروت نہیں بن سکتی؟ کیا وہ اگر مجھے بھول سکتے ہیں۔ تو میں انھیں نہیں بھول سکتی؟ ایک ہی لمحہ میں اس کا غرور ہوا ہوجاتا اور وہ پھر کھوئی ہوئی سی اِدھر اُدھر گھومنے لگتی۔

مگر جب دسویں روز گیان شنکر کا معذرت آمیز خط پہنچا۔ تو اسے پڑھتے ہی گائتری کا دل بے قرار ہوگیا۔ وہ ایک مجبورانہ جوش کے ساتھ ان کی طرف لپکی۔ یہ اس کی محبت کی پہلی آزمائش تھی۔ اب تک اس کی محبت کا راستہ کانٹوں سے صاف تھا۔ یہ پہلا کانٹا تھا۔ جو اس کے پیر میں چبھا۔ کیا یہ پہلی ہی روکاوٹ مجھے اس راستہ سے برطرف کردے گی؟ میرے ہی سبب تو گیان شنکر پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ میں ہی تو ان کی ساری پریشانیوں کی جڑ ہوں۔ پتا جی ان سے ناراض ہیں۔ تو ہوا کریں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ میں کیوں راہِ محبت سے منہ موڑوں؟ محبت صرف دو دلوں کا معاملہ ہے۔ کسی

تیسرے کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آخر پتا جی نے انھیں کیوں مجھ سے محترز رہنے کی تاکید کی؟ وہ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ ان کی ساری زندگی عیش وعشرت میں گزری ہے۔ وہ محبت کے رموز کو کیا جانیں؟ انھیں اس پاک جذبہ کا کیا علم؟ پرماتما نے انھیں عارفانہ نگاہ عطا کی ہوتی۔ تووہ گیان شنکر کی روحانی عظمت کو جانتے۔ جبھی انھیں معلوم ہوتا کہ میں نے ایسے پاک باطن شخص کو متہم کرکے کتنی زیادہ بے انصافی کی ہے۔ پتا کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ مگر محبت کے سامنے اس حکم کی کیا حقیقت ہے۔ یہ آگ نورِ ازل کا ایک پرتو ہے۔ یہ سوز ابدی سکون کا ایک ترانہ ہے! اس شعلہ کو کون بجھا سکتا ہے؟

دوسرے روز گائتری نے گیان شنکر کو تار دیا۔ کہ میں آرہی ہوں اور شام کی گاڑی سے مایا شنکر کو لے کر بنارس روانہ ہوگئی۔

(۴۷)

گیان شنکر کو بنارس آئے ہوئے دو ہفتے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ موسیقی کانفرنس ختم ہوچکی تھی۔ اور اخبارات میں ابھی تک اس کا چرچا تھا۔ اگرچہ طبیعت کی ناسازی کے سبب رائے صاحب اس میں اپنے پورے حوصلے کے ساتھ کام نہ کرسکے۔ مگر ان کے حُسنِ انتظام میں کانفرنس کی کامیابی میں کوئی نقص نہ آنے دیا۔ شام ہوگئی تھی وِدّیا اندر بیٹھی ہوئی ایک پُرانا شال رفو کررہی تھی۔ رائے صاحب نے اس کی سیروتفریح کے لیے ایک بہت اچھی سیج گاڑی مخصوص کردی تھی۔ اور کوچبان کو تاکید کردی تھی۔ کہ جب ودیا کا حکم پائے تو فوراً سواری تیار کرکے اس کے پاس لے جائے۔ لیکن اتنے دنوں میں وِدّیا کہیں ایک دن بھی سیر کرنے نہ گئی تھی۔ اس کی طبیعت گھر کے دھندوں میں زیادہ لگتی تھی۔ اسے نہ تھیٹر کا شوق تھا۔ نہ سیر کا اور نہ گانے بجانے کا۔ ان کی بہ نسبت اُسے کھانا پکانے یا سینے پرونے میں زیادہ لطف آتا تھا۔ اس گوشہ نشینی کے باعث اس کا چہرہ پژمردہ سا رہتا تھا۔ اکثر دردِ سر میں مبتلا رہتی تھی۔ وہ نہایت نازک اور حسین عورت تھی۔ مگر اس میں غرور کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اسے مانگ، چوٹی، آئینہ، کنگھی سے نفرت تھی۔ اسے حیرت ہوتی تھی۔ کہ گائتری کیوں کر اپنے وقت کا بیشتر حصہ بناؤ سنگار میں صرف کرتی ہے۔ کمرہ میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ مگر وہ اپنے کام میں ایسی محو تھی۔ کہ اسے بجلی کے بٹن دبانے کا بھی خیال نہ تھا۔ اتنے میں رائے صاحب کمرہ کے دروازہ پر آکر کھڑے ہوگئے۔

اور بولے ایشور سے بڑی غلطی ہوگئی۔ کہ اس نے تمھیں درزن نہ بنایا۔ اندھیرا ہوگیا۔ آنکھوں سے سوجھتا نہیں۔ مگر تمھیں اپنے سوئی تاگے سے فرصت نہیں۔

وِدّیا نے دوشالہ رکھ دیا۔ اور نادم ہوکر بولی تھوڑا سا باقی رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا۔ کہ اسے پورا کرلوں تو اٹھوں۔

رائے صاحب پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اور کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہ انھیں زور سے کھانسی آئی۔ اور تھوڑا سا خون منہ سے نکل پڑا۔ آنکھیں بے نور سی ہوگئیں اور دل میں تیز درد ہونے لگا۔ چہرہ زرد ہوگیا۔ وِدّیا نے گھبرا کر پوچھا۔ پانی لاؤں؟ یہ مرض تو آپ کو نہ تھا۔ کسی ڈاکٹر کو بلا بھیجوں؟

رائے۔ نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی اچھا ہوجاؤں گا۔ یہ سب میرے لائق۔ فائق۔ عالم فاضل۔ داماد گیان شنکر کی عنایت کا نتیجہ ہے۔

وِدّیا نے استفہامیہ حیرت سے رائے صاحب کی طرف دیکھا۔ اور ندامت سے زمین کی طرف تاکنے لگی۔ رائے صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور درد کی شدّت سے کراہ کر بولے۔ جی تو نہیں چاہتا۔ کہ مجھ پر جو کچھ گزری ہے۔ وہ میرے اور گیان شنکر کے سوا کسی دوسرے شخص کے کانوں تک پہنچے۔ لیکن تم سے پوشیدہ رکھنا نامناسب ہی نہیں۔ بلکہ ناقابلِ عفو ہے۔ تمھیں سن کر صدمہ ہوگا۔ مگر ممکن ہے۔ کہ اس وقت کا صدمہ تمھیں آنے والی مصیبتوں سے بچائے۔ جن کا سامان غیب سے ہوتا نظر آرہا ہے۔ شاید تم اپنی دانائی اور دوراندیشی سے ان مصیبتوں کو دفع کرسکو۔

وِدّیا کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ وہ ایک طائر کی طرح ڈالیوں ڈالیوں اڑنے لگا۔ مایاشنکر کا خیال آیا۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہوگیا۔ گیان شنکر پر تو کوئی مصیبت نہیں پڑگئی۔ اس نے خوف بھری نگاہوں سے رائے صاحب کی طرف دیکھا۔

رائے صاحب بولے۔ آج تک میں گیان شنکر کو ایک نہایت سلیم الطبع اور راست باز آدمی سمجھتا تھا۔ مجھے ان کی لیاقت وقابلیت پر فخر تھا۔ میں اپنے احباب سے ان کی تعریف کیا کرتا تھا۔ مگر اب کے مجھے معلوم ہوا۔ کہ فرشتہ کے قالب میں بھی شیطان رہ سکتا ہے۔

وِدّیا کے تیور پر بل پڑگئے۔ اس نے سخت نگاہ سے رائے صاحب کی طرف دیکھا۔

لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ان باتوں کو نہیں سننا چاہتی۔

رائے صاحب نے اٹھ کر بجلی کا بٹن دبایا۔ اور روشنی میں ودیا کی ناپسندیدگی صاف نظر آنے لگی۔ مگر انھوں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ میرا سترواں سال ہے۔ ہزاروں آدمیوں سے مجھے سابقہ پڑا۔ مگر میری قیافہ شناسی نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع ہے۔ کہ مجھے ایسا دھوکا ہوا۔ میں نے ایسا خودغرض آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

وڈیا بیتاب ہوگئی۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ رائے صاحب یہ کیا تمہید باندھ رہے ہیں۔ کیوں ایسے بُرے کلمات استعمال کررہے ہیں۔

رائے۔ اس شخص کی سلامت روی پر میرا زبردست اعتقاد تھا۔ میرے ہی ایما سے گائتری نے اسے اپنی ریاست کا منتظم بنایا۔ میں ذرا بھی آگاہ ہوتا تو گائتری پر اس کا سایہ بھی نہ پڑنے دیتا۔ علم و عمل میں اس قدر تضاد ہوسکتا ہے۔ اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ جس کے قلم میں جادو کی تاثیر ہو۔ جس کے منہ سے لطیف اور پاکیزہ باتوں کی دھار بہتی ہو۔ اس کا باطن ایسا سیاہ ایسا زنگ آلود ہوگا۔ اس کی مجھے ذرا بھی خبر نہ تھی۔

وڈیا سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ اگر چہ وہ گیان شنکر کی خودغرضی سے خوب واقف تھی۔ جس کا ثبوت اسے بارہا مل چکا تھا۔ مگر اس کی خودداری ان کی توہین کو نہ گوارا کرسکتی تھی۔ نہ ان کی مذمت کا ایک لفظ بھی اپنے کانوں سے سننا چاہتی تھی۔ اس کے دھرم میں یہ بڑا پاپ تھا۔ تیز لہجہ میں بولی۔ آپ میرے سامنے ان کی برائی نہ کیجیے۔ یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ اور جن خیالات کا اظہار نہ ہوسکا تھا۔ وہ آنسو بن کر آنکھوں سے بہ نکلے۔

رائے صاحب نے ذرا تامل سے کہا۔ برائی نہیں کرتا۔ سچ بات کہتا ہوں۔ مجھے اب معلوم ہوا۔ کہ اس نے مہاتماؤں کی صورت کیوں بنا رکھی ہے۔ اور مذہبی کاموں میں کیوں اس قدر منہمک ہوگیا ہے۔ میں نے اس کی زبان سے سب کچھ ادا کرلیا۔ یہ رنگین جال اس نے بھولی بھالی گائتری کے لیے بچھایا ہے اور وہ غالباً اس میں پھنس بھی چکی ہے۔

وڈیا کی بھویں تن گئیں۔ چہرہ تمتما گیا۔ خوددارانہ لہجہ میں بولی۔ لالہ جی میں نے

ہمیشہ آپ کا ادب کیا ہے۔ اور آپ سے اختلاف کرتے ہوئے مجھے جتنا ملال ہو رہا ہے۔ وہ بیان نہیں کرسکتی۔ مگر یہ ناممکن ہے۔ کہ میں ان کے بارے میں اس الزام کو اپنے کانوں سے سنوں۔ مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے آج سترہ سال ہوگئے ہیں۔ مگر میں نے انھیں کبھی لغزش کرتے نہیں دیکھا۔ جو شخص اپنے عین عالمِ شباب میں بھی باقاعدگی کے ساتھ رہا ہو۔ اس کے متعلق ایسا شک کرکے آپ اسی کے ساتھ نہیں بلکہ گائتری بہن کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی کررہے ہیں۔ اس سے آپ کی آتما کو پاپ لگتا ہے۔

رائے۔ تم میری آتما کی فکر نہ کرو۔ اس پاجی کو سمجھاؤ۔ ورنہ اس کی خیریت نہیں ہے۔ میں گائتری کو اس کی نفس پرستی کا شکار نہ بننے دوں گا۔ مجھے تمھارا بیوہ ہوجانا منظور ہے۔ مگر میں اپنی خاندانی عزت و وقار میں بٹا لگتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے چلتے چلتے اس سے تاکید کردی تھی۔ کہ گائتری سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ مگر گائتری کے خطوط روزانہ چلے آرہے ہیں۔ انھیں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے پھندوں میں کیسے جکڑی ہوئی ہے۔ اگر تم اسے بچا سکتی ہو تو بچاؤ۔ ورنہ یہی ہاتھ جنھوں نے ایک دن ان کے پیروں پر پھول اور مالے چڑھائے تھے۔ اسے خاندانی عزت پر قربان کردیں گے۔

ودّیا۔ روتی ہوئی بولی۔ آپ مجھے اپنے گھر پر بلا کر اتنا ذلیل کر رہے ہیں۔ یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کا دل اتنا سخت ہوگیا ہے۔ جب آپ کے دل میں ایسے ایسے خیالات پیدا ہورہے ہیں۔ تو میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتی۔ میں جس پرش کی استری ہوں۔ اس پر شک کرکے اپنی عاقبت نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ آپ کے کہنے کے مطابق بدچلن سہی۔ بدباطن سہی۔ سیاہ کار سہی۔ مگر میری نگاہوں میں ایک قابلِ پرستش دیوتا ہے۔ اگر میں جانتی کہ آپ مجھے اتنا ذلیل کریں گے۔ تو بھول کر بھی یہاں نہ آتی۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ میں جائداد کی لالچ سے یہاں آتی ہوں۔ اور آپ کو پھندے میں پھنسانا چاہتی ہوں۔ تو آپ بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ مجھے جائداد کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ میں ایشور کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ کہ میں اپنی موجودہ حالت پر بالکل قانع ہوں۔ اور مجھے یقینِ کامل ہے۔ کہ مایاشنکر بھی ایک قناعت پسند لڑکا ہے۔ اسے آپ کی اس نیت کا حال معلوم ہوگیا۔ تو وہ اس جائداد

کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ تو آپ کو اس بارے میں اول سے آخر تک مغالطہ ہوا ہے۔

بارے ان باتوں سے رائے صاحب کچھ ملائم ہوئے۔ نادم ہوکر بولے۔ ہاں ممکن ہے اس لیے میں بڈھا ہوں کچھ کا کچھ دیکھتا ہوں۔ کچھ کا کچھ سنتا ہوں۔ زیادہ طمعی زیادہ شکی ہوگیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھاری نظروں میں تمھارے شوہر کو اس سے زیادہ گراؤں۔ جتنا کہ اس کی حفاظتِ جان کے لیے ضروری ہے۔ مگر تمھاری کج اعتقادی مجھے مجبور کر رہی ہے کہ اس کی بد اعمالیوں کا مفصل تذکرہ کروں۔ تم نے مجھے پہلے بھی دیکھا تھا۔ کیا میری یہی حالت تھی؟ میں ایسا ہی نحیف و ناتواں اور نیم جاں تھا؟ کیا اسی طرح مجھے ایک قدم بھی چلنا دشوار تھا؟ میں اسی طرح خون تھوکتا تھا۔ یہ سب اسی ظالم کی کرتوت ہے۔ اس نے مجھے کھانے کے ساتھ اتنا زہر کھلا دیا۔ کہ اگر اسے بیس آدمی کھاتے۔ تو ایک بھی زندہ نہ بچتا۔ یہ صرف وہم ہی نہیں ہے۔ میں مجسم ثبوت بنا ہوا موجود ہوں۔ اس نے خود اپنے اس جرم کا اقبال کیا۔ پہلا لقمہ کھاتے ہی مجھے سارا بھید معلوم ہوگیا۔ مگر میں نے محض یہ دکھلانے کے لیے مجھے مارنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا اس نے سمجھا تھا۔ پوری تھالی صاف کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ میں جوگ کے عمل سے سارا زہر جسم سے خارج کر دوں گا۔ مگر چشم زدن میں وہ زہر میرے رگ وریشہ میں سرایت کرگیا۔ میں اسے خارج نہ کرسکا۔ میں نے اپنی صحت اور درازی عمر کے لیے وہ سب کچھ کیا۔ جو انسان کے امکان میں ہے۔ اور جس کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ میں بہتر سال کا بڈھا ہوکر ایک پچیس سالہ نوجوان سے بھی زیادہ توانا قوی تھا۔ میں اپنی زندگی کو انتہائی حد تک لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے کتنی نفس کشی کی۔ جوگ کے کتنے عمل کیے کتنے سادھوؤں مہاتماؤں کی خدمت کی۔ جڑی بوٹیوں کی کھوج میں کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ تبت اور کشمیر کی خاک چھانتا پھرا۔ مگر اس گرگِ خون آشام نے میری ساری کوششیں برباد کر دیں۔ میں نے اپنی ساری دولت تن پروری کے لیے وقف کر دی تھی۔ جوگ اور منتر اسی لیے سیکھا تھا۔ کہ دائمی شباب کا لطف اٹھاتا رہوں۔ عیش ہی میری زندگی کا خاص مقصد تھا۔ فکر کو میں ہمیشہ کالا ناگ سمجھتا تھا۔ میرے ملازمین انواع واقسام کے مظالم کرتے تھے۔ مگر میں نے کبھی ان کی فریاد کو اپنے قلبی اطمینان میں مخل نہیں ہونے دیا۔

اگر کبھی اپنے علاقہ میں جانا بھی تھا۔ تو رعایا کی تکالیف رفع کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف سیر و شکار کے لیے۔ مگر اس موذی کی بدولت سارے گناہ بے لذت ہوگئے۔ اب میں محض ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوں۔ زندگی اور طاقت سے خالی!

یہ کہتے کہتے رائے صاحب شدتِ درد سے کراہ اٹھے۔ زور سے کھانسی آئی۔ اور خون کے لوتھڑے منہ سے نکل آئے۔ کئی منٹ تک ان پر ایک غشی کی سی حالت طاری رہی۔ دفعتاً وہ یک دم اٹھ بیٹھے۔ اور بولے۔ تم کل صبح بنارس چلی جاؤ۔ اور ممکن ہو تو اس شخص کو آتش کدہ میں گرنے سے بچاؤ۔ تمھاری شوہرپرستی کے جذبہ نے مجھے نرم کردیا۔ میں اس بذات کو جان کی امان دیتا ہوں۔ لیکن نادان گائتری کی حفاظت کا بار تمھارے ہی اوپر ہے۔ اگر اس کی عصمت پہ حرف آیا۔ تو تمھارے خاندان کا ستیاناس ہوجائے گا۔ یہ میری آخری بدؔعا ہے۔ گائتری کی عصمت کا محفوظ رہنا ہی اس بدؔعا کے اثر کو زائل کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمھارے بہبود کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

یہ کہہ کر رائے صاحب آہستہ سے اٹھے۔ اور چلے گئے۔ وڈیا ندامت اور مایوسی سے متاثر ہوکر پلنگ پر جا پڑی۔ اور زاروقطار رونے لگی۔ رائے صاحب کے پہلے الزام کی اس نے تردید کی تھی۔ مگر اس جرم کے متعلق وہ بد اعتقادی سے کام نہ لے سکی۔ اپنے شوہر کی خودغرضانہ نیت سے وہ خوب واقف تھی۔ مگر ان کی کجروی اتنی مہلک ہوسکتی ہے۔ اس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔ اب تک ان کی بدنیتی کا پردہ فاش نہ ہوا تھا۔ جو رنج و غم ہوتا تھا۔ اسی تک محدود رہتا تھا۔ مگر یہاں آکر وہ پردہ فاش ہوگیا۔ وہ اپنے والد کی نظروں میں گرگئی۔ اس کے منہ میں کالکھ لگ گئی۔ رائے صاحب کا یہ سمجھنا بالکل قدرتی تھا۔ کہ اس کام میں وڈیا کا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ضرور ہوگا۔ شاید یہی سمجھ کر وہ اس سے سارا ماجرا بیان کرنے آئے تھے۔ وہ سارا الزام اپنے شوہر کے سر رکھ کر اپنے کو بالکل بری الذمہ کیسے قرار دے سکتی تھی۔ اس اُدھیڑبن میں جب وڈیا کا خیال اس گناہ کبیرہ کے انجام کی طرف گیا۔ تو وہ کانپ اٹھی۔ ایشور میں دُکھیا ہوں۔ ابھاگنی ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔ تمھاری سرن ہوں۔ طرح طرح کے شکوک اس کے دل کو مضطرب کرنے لگے۔ مایاشنکر کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ ایسا جی چاہتا تھا۔ کہ پیروں میں پر لگ جائیں۔ اور میں اُڑکر اس کے پاس جا پہنچوں۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ایک ہوک سی اٹھتی تھی۔ اور

کسی آنے والی مصیبت کا خیال اسے بے چین کیے دیتا تھا۔

ایک لمحہ میں اس غم وخوف نے زیادہ مہیب صورت اختیار کرلی۔ آگ کی بکھری ہوئی چنگاریاں ایک شعلہ بن کر گیان شنکر کی طرف لپکیں۔ تم اتنے کم ظرف۔ اتنے بد طینت۔ اتنے بُزدل ہو۔ تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ تمھارے کارن میری یہ دُرگت ہو رہی ہے۔ اور ابھی نہ جانے کیا کیا ہونے کو ہے۔ نہ جانے پورب جنم میں ایسا کون سا پاپ کیا تھا کہ تمھارے پلے پڑی۔ اس نے گیان شنکر کو اسی وقت ایک خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ اور سوچنے لگی۔ کہ کس طریقہ پر لکھوں۔ اس سوچ میں پڑے پڑے اسے نیند آگئی۔ وہ دیر تک سوتی رہی۔ جب سردی معلوم ہوئی تو چونکی۔ کمرہ میں سناٹا تھا۔ سارے گھر میں خاموشی تھی۔ مہریاں بھی سوگئی تھیں۔ اس کے کھانوں کا تھال سامنے چھوٹی میز پر رکھا ہوا تھا۔ اورایک پالتو بلّی اس کے قریب ان چوہوں کی تاک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جو کھانوں کا ذائقہ لینے کے لیے المازی کے گوشے سے نکل کر آتے تھے۔ اور ایک نامعلوم خوف کے سبب نصف راستہ سے لوٹ جاتے تھے۔ وِدّیا کئی منٹ تک اس نظارہ کو دیکھتی رہی۔ سونے سے اس کی طبیعت کو کچھ سکون ہوگیا تھا۔ اسے چوہے پر ترس آیا۔ جو ایک لمحہ میں بلی کا لقمۂ دہن بن جائے گا۔ اس کا خیال اس چوہے کا گیان شنکر سے مقابلہ کرنے لگا۔ کیا ان کی حالت بھی اسی چوہے کی سی نہیں ہے؟ ان پر غصہ کیا کروں؟ وہ رحم کے مستحق ہیں! وہ اسی چوہے کی طرح غذائے لطیف کی ہوس میں آکر موت کے منہ میں دوڑے جارہے ہیں۔ وہ اپنے نفس کے ہاتھوں میں کاٹھ کی پتلی بنے ہوئے ناچ رہے ہیں۔ میں جاکر انھیں سمجھاؤں گی۔ ان سے التجا کروں گی۔ کہ مجھے ایسی دولت کی خواہش نہیں ہے۔ جس کے لیے ضمیر کا خون کیا گیا ہو۔ ایسی دولت یا جائداد کو میرا دور ہی سے سلام ہے! میرا لڑکا غریب ہوکر رہے گا۔ اپنے پسینہ کی کمائی کھائے گا۔ مگر جب تک میرا بس چلے گا۔ میں اسے اس جائداد کی ہوا تک نہ دوں گی۔

(۴۸)

گائتری بنارس پہنچ کر ایسی خوش ہوئی جیسے کوئی بالو پر تڑپتی ہوئی مچھلی پانی میں جاپہنچے۔ گیان شنکر پر رائے صاحب کی دھمکیوں کا ایسا خوف غالب تھا۔ کہ گائتری کے

آنے پر وہ اور بھی پریشان ہوگئے۔ لیکن گائتری کی دلجوئیوں نے رفتہ رفتہ ان کا خوف دور کر دیا۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ کہ میرا پریم پتا کے حکم کا مطیع نہیں ہوسکتا۔ وہ گیان شنکر کو مظلوم سمجھتی تھی۔ اور تشفیوں سے ان کی پریشانی دور کرنا چاہتی تھی۔ گیان شنکر جب گائتری کی طرف سے بے فکر ہوگئے۔ تو اسے بنارس کے گھاٹوں اور مندروں کی سیر کرانے لگے۔ صبح کو اسے لے کر گنگا اشنان کرنے جاتے اور شام کو اسے کشتی پر بیٹھا کر گھاٹوں کی سیر کراتے۔ ان کے دروازہ پر پنڈوں کا ہجوم لگا رہتا۔ گائتری کی دادودہش کی سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ ایک روز وہ ہندو ودیالیہ دیکھنے گئی۔ اور بیس ہزار دے آئی۔ دوسرے روز اتحادی یتیم خانہ کا معائنہ کیا۔ اور دوہزار روپے تعمیری فنڈ کو عطا کیے۔ سناتن دھرم سبھا کے ارکان گوروکل آشرم کے لیے چندہ مانگنے آئے۔ چار ہزار روپۓ ان کو بھی نذر کیے گئے۔ ایک روز گوپال مندر میں پوجا کرنے گئی۔ اورمہنت جی کو دو ہزار روپے بھینٹ کر آئی۔ آدھی رات تک کیرتن کا لطف اٹھاتی رہی۔ اس کا دل کیرتن میں شریک ہونے کے لیے بے قرار ہورہا تھا۔ مگر گیان شنکر کو یہ بات مناسب نہ معلوم ہوئی۔ ایسا کیرتن اس نے کبھی نہ سنا تھا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام ہوگئی تھی۔ گائتری بیٹھی ہوئی بنارسی ساڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس میں سے ایک ساڑی خریدنا چاہتی تھی۔ مگر رنگ کا فیصلہ نہ کرسکتی تھی۔ ایک ایک ساڑی کو سر سے اوڑھ کر آئینہ میں دیکھتی۔ اور پھر اسے تہ کر کے رکھ دیتی۔ کون رنگ سب سے زیادہ کِھلتا ہے۔ اس کا تصفیہ نہ ہوتا تھا۔ اتنے میں شردھا آکر کھڑی ہوگئی۔ گائتری نے کہا...... بہن تم خوب آئیں۔ تبلاؤ ان میں سے کون ساڑی لوں۔ مجھے توسب ایک سی معلوم دیتی ہیں۔

شردھا نے مسکرا کر کہا۔ میں گنوارن ان باتوں کو کیا سمجھوں ۔

گائتری۔ چلو باتیں نہ بناؤ۔ میں اس کا فیصلہ تمھارے ہی اوپر چھوڑتی ہوں۔ ایک اپنے لیے چنو اور ایک میرے لیے۔

شردھا۔ آپ لے لیجیے۔ مجھے ضرورت نہیں یہ فیروزی ساڑی آپ پر خوب کھلے گی۔

گائتری۔ میری خاطر سے ایک ساڑی لے لو۔

شردھا۔ میں لے کر کیا کروں گی؟ دھیرے دھیرے کیڑے کھا جائیں گے۔

شردھا نے یہ الفاظ کچھ ایسی حسرت بھری آواز میں کہے۔ کہ گائتری کے دل پر چوٹ سی لگی۔ بولی کب تک یہ جوگ سادھوگی۔ بابو پریم شنکر کو منا کیوں نہیں لیتیں۔

شردھا نے آب دیدہ ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔ کیا کروں مجھے منانا نہیں آتا۔

گائتری۔ میں میل کرادوں؟

شردھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا احسان ہوگا۔ مجھے آپ کی کامیابی کی امید نہیں ہے۔ انھیں اپنی ٹیک ہے اور مجھے اپنی۔ میں دھرم شاستر سے ٹل نہیں سکتی۔ پھر بھلا میل کیوں کر ہوگا؟

گائتری۔ پریم سے۔

شردھا۔ مجھے ان سے جتنا پریم ہے۔ وہ بیان نہیں کرسکتی۔ اگر ان کا ذرا بھی اشارہ پاؤں۔ تو آگ میں کود پڑوں۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ انھیں بھی مجھ سے اتنا ہی پریم ہے۔ لیکن پریم صرف دلوں کو ملاتا ہے۔ جسموں پر اس کا کچھ بس نہیں ہے۔

اتنے میں گیان شنکر آگئے اور گائتری سے بولے۔ میں ذرا گوپال مندر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں چند بھگتوں کا ارادہ ہے۔ کہ آپ کے آنے کی خوشی میں کرشن لیلا کا ناٹک کھیلیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اس بنگلہ کے سامنے میدان میں اسٹیج تیار کیا جائے۔

گائتری کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ بولی یہ جگہ کافی ہوگی؟

گیان۔ ہاں۔ بہت جگہ ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ بھی کوئی پارٹ لیں۔

گائتری۔ (مسکرا کر) آپ پارٹ لیں گے۔ تو میں بھی لوں گی۔

گیان شنکر دوسرے ہی روز سے اسٹیج بنوانے میں مصروف ہوگئے۔ ایک وسیع پنڈال بنایا گیا۔ کئی روز تک اس کی آرائش ہوتی رہی۔ فرش کرسیاں۔ شیشے وآلات۔ پھولوں کے گملے۔ خوش نما تصویریں۔ سبھی لگائے گئے۔ پبلک میں اشتہارات تقسیم کیے گئے۔ رؤساء کے نام چھپے ہوئے دعوتی کارڈ بھیجے گئے۔ چار روز تک گیان شنکر کو دم لینے کی بھی فرصت نہ ملی۔ ایک پیر دیوان خانے میں رہتا تھا۔ جہاں ناٹک کھیلنے والے اپنے اپنے پارٹ کی مشق کررہے تھے۔ دوسرا پیر شامیانہ میں رہتا تھا۔ جہاں سینکڑوں مزدور بڑھئی اور مصور اپنا کام کررہے تھے۔ اسٹیج قابلِ دید تھا۔ جدھر دیکھیے سبزے کی بہار تھی۔ پردہ اٹھتے ہی بنارس اور

برندابن کا نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ جمنا کا کنج۔ کنج کے سایہ میں آرام کرتی ہوئی گائیں۔ ہرنوں کے غول۔ کدم کی ڈالیوں پر بیٹھے ہوئے مور اور پپیہے۔ سارا منظر شعریت میں ڈوبا ہوا تھا۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ برقی روشنی سے سارا پنڈال منور ہو رہا تھا۔ صدر پھاٹک پر بجلی کا ایک آفتاب بنا ہوا تھا۔ جس کی روشنی میں زمین پر رینگنے والی چیونٹیاں بھی نظر آتی تھیں۔ سات ہی بجے سے تماشائیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ لالہ پربھاشنکر اپنا سیاہ چغہ پہنے اور ایک زعفرانی عمامہ باندھے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ مستورات کے لیے دوسری جانب پردے لگائے گئے تھے۔ اگرچہ شردھا کو ان لیلاؤں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر گائتری کے اصرار سے اس نے مستورات کی خاطر مدارات کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے پنڈال تماشائیوں سے بھر گیا۔ جیسے میلوں میں ریل گاڑیاں بھر جاتی ہیں۔ مایاشنکر نے سب کے اصرار کرنے پر بھی کوئی پارٹ نہ لیا تھا۔ پنڈال کے دروازہ پر کھڑا لوگوں کے جوتوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس وقت تک شامیانہ میں بازار سا لگا ہوا تھا۔ کوئی ہنستا تھا کوئی اپنے سامنے والوں کو دھکے دیتا تھا۔ کچھ لوگ سیاسی معاملات پر گفتگو کررہے تھے۔ کہیں جگہ کے لیے لوگوں میں ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ باہر سردی سے ہاتھ پیر اکڑے جاتے تھے۔ مگر شامیانہ کے اندر خاصی گرمی تھی۔

ٹھیک نوبجے پردہ اٹھا۔ رادھکا ہاتھ میں بین لیے کدم کے نیچے کھڑی ہوئی سورداس کا ایک پد گارہی تھی۔ اگرچہ رادھکا پارٹ اس کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس کا غرور۔ اس کے حسن کی متانت۔ اس کی شوکت۔ اہیر کی شوخ لڑکی کے حسبِ حال نہ تھی۔ مگر اس نے نورانی جلوہ نے ناقدانہ نگاہوں کو چوندھیا دیا تھا۔ ساری مجلس حیرت اور محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ تو کوئی بہشت کی حور ہے! اس کی میٹھی آواز۔ اس کا دلکش گانا۔ اس کا بناؤ سنگار۔ اس کے ناز و انداز کس کس کی تعریف کی جائے۔ وہ یگانہ تھی۔ بے مثل تھی۔ کوئی اس کا ثانی اس کا جواب نہ تھا۔

رادھکا کے بعد تین سکھیاں اور آئیں۔ للتا۔ چندراولی اور شیاما۔ سب اپنی اپنی داستانِ ہجر سنانے لگیں۔ کرشن کی بے دردی اور مکاری کا تذکرہ ہونے لگا۔ اس پر گھر والوں کی بندشیں اور ان کی چشم نمائیاں اور بھی ستم ڈھا رہی تھیں۔ ایک بولی۔ مجھے تو

پنگھٹ پر جانے کی ممانعت ہوگئی ہے۔ دوسری بولی۔ میں دروازہ پر کھڑی ہوکر جھانکنے بھی نہیں پاتی۔ تیسری بولی۔ جب دہی بیچنے جاتی ہوں تو بڑھیا ساتھ ہو لیتی ہے۔ رادھکا نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ میں تو بدنام ہوگئی۔ اب کسی سے ان کی بات نہیں کرسکتی۔ للتا بولی۔ وہ آپ ہی بے درد ہیں ورنہ کیا ملنے کی کوئی تدبیر ہی نہ تھی۔

چندراولی۔ انھیں ہم کو جلانے اور تڑپانے میں مزہ آتا ہے۔

شیاما۔ یہ بات نہیں۔ وہ ہمارے گھر والوں سے ڈرتے ہیں۔

رادھکا۔ چل۔ تو ان کی یوں ہی طرفداری کیا کرتی ہے۔ بڑے سیانے تو بنتے ہیں۔ پھر کیا ان بچھیا کے تاوؤں کو بھی ہوا نہیں بتا سکتے؟ بات یہ ہے کہ انھیں ہماری سدھ نہیں ہے۔

للتا۔ چلو۔ آج ہم سب ان کی آزمائش کریں۔

اس پر سب متفق ہوگئیں۔ سب ایک رازدارانہ انداز سے آگے پیچھے تاک جھانک کر ہاتھوں سے بتا بتا کر اور آنکھوں کو نچا نچا کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ آزمائش کا کیا طریقہ ہوگا۔ اس کا فیصلہ ہوگیا۔ چاروں خوش ہوکر ایک گیت گاتی ہوئیں اسٹیج سے رخصت ہوگئیں۔ پردہ گر گیا۔

پھر پردہ اٹھا۔ درختوں کے جھرمٹ میں ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ پھوس کے کئی جھونپڑے تھے۔ بہت صاف ستھرے۔ پھول پتیوں سے سجے ہوئے۔ ان میں کہیں گائیں بندھی تھیں۔ کہیں بچھڑے کلیلیں کرتے تھے اور کہیں دودھ بلویا جاتا تھا۔ منظر نہایت دلکش تھا۔ ایک مکان میں چندراولی چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کے سرہانے کئی آدمی بیٹھے پنکھا جھل رہے تھے۔ کئی عورتیں پائینتے کی جانب کھڑی تھیں۔ بَید بَید کی پکار مچی ہوئی تھی۔ دوسری جھونپڑی میں للتا پڑی تھی۔ اس کے پاس بھی کئی عورتیں بیٹھی ٹونے ٹوٹکے کررہی تھیں۔ کوئی کہتی تھی۔ آسیب ہے۔ کوئی چڑیل کا پھیر بتلاتی تھی۔ اوجھا جی کے بلانے کی بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان کھڑا ہوا کہہ رہا تھا کہ یہ سب تمھارا ڈھکوسلا ہے۔ اسے کوئی دل کی بیماری ہے۔ کسی ہوشیار وَید کو بلانا چاہیے۔ تیسرے جھونپڑے میں شیاما کی چارپائی تھی۔ وہاں بھی یہی بید بید کی پکار تھی۔ چوتھا مکان بہت بڑا تھا۔ دروازے پر بڑی بڑی گائیں بندھی تھیں۔ ایک طرف غلہ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

دوسری طرف مٹکوں میں بھرا دودھ رکھا تھا۔ چاروں طرف خوب صفائی تھی۔ اس مکان میں رادھکا بیمار پڑی تھی۔ اس کے قریب ایک پنڈت جی آسن پر بیٹھے ہوئے پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ دروازہ پر فیقروں کو خیرات میں غلہ تقسیم کیا جارہا تھا۔ گھر کے لوگ رادھکا کو متفکر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور بید بید پکارتے تھے۔

دفعتاً دور سے آواز آئی۔ بید بید۔ سب روگوں کا بید۔ کام کا بید۔ کرودھ کا بید۔ موہ کا بید۔ ارتھ کا بید۔ دھرم کا بید۔ مکتی (نجات) کا بید۔ من کا میل نکالے۔ اگیان (جہالت) کا میل نکالے۔ گیان کی سینگی لگائے۔ دل کا درد مٹائے۔ بید بید۔ لوگوں نے باہر نکل کر بید جی کو بلایا۔ ان کے کندھے پر جھولی تھی۔ سر پر ایک سرخ گول پگڑی۔ بدن پر ایک سبز بانات کی حاشیہ دار اچکن۔ آنکھوں میں سرمہ۔ لبوں پر پان کی سرخی، چہرہ شرارت آمیز تبسّم اور رفتار میں بانکپن۔ اسٹیج پر آتے ہی انھوں نے جھولی اتار کر رکھ دی اور بانسری بجا بجا کر گانے لگے۔

میں تو ہرت بر کی پیر

پریم راہ کو سیتل کرتا جیسے اگن کو پر۔ میں تو ہرت ......

نرمل گیان کی بوٹی دے کر دیت ہردے کو دھیر۔ میں توہرت

رادھکا کے گھر والے انھیں ہاتھوں ہاتھ اندر لے گئے۔ رادھکانے انھیں دیکھتے ہی مسکرا کر منہ چھپا لیا۔ بید جی نے نبض دیکھنے کے بہانے سے اس کی گوری کلائی پکڑ کر آہستہ سے دبا دی۔ رادھکا نے جھجک کر ہاتھ چھوڑا لیا۔ پھر رمزوکنایہ میں گفتگو ہونے لگی۔

رادھا۔ ندی میں اتھاہ جل ہے۔

بید۔ جس کے پاس ناؤ ہے اسے جل کا کیا خوف؟

رادھا۔ آندھی ہے۔ بھیانک لہریں ہیں اور بڑے بڑے ڈراؤنے دریائی جانور ہیں۔

بید۔ ملاح ہوشیار ہے۔

رادھا۔ سورج نکل آیا مگر تارے کیوں جگمگا رہے ہیں؟

بید۔ روشنی پھیلے گی تو وہ خود غائب ہوجائیں گے۔

بید جی نے گھر والوں کو آنکھوں کے اشارہ سے ہٹا دیا۔ جب تخلیہ ہوگیا تو رادھا نے مسکرا کر کہا...... پریم کا دھاگا کتنا مضبوط ہے۔

گیان شنکر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔

گائتری پھر بولی۔ آگ لکڑی کو جلاتی ہے۔ پر لکڑی جل جاتی ہے تو آگ بھی بجھ جاتی ہے۔

گیان شنکر نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔

گائتری نے ان کے چہرہ کی طرف حیرت سے دیکھا۔ یہ خاموشی کیوں؟ اپنا پارٹ بھول تو نہیں گئے۔ جب تو بڑا مضحکہ ہوگا۔

گیان شنکر کے ہونٹ بند تھے۔ سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ پیر کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی اور چہرہ سے ایک خوفناک ارادہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی خوں‌خوار درندہ اپنے شکار پر چھپٹ پڑنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہا ہو۔

گیان شنکر نے فی الواقع جست مارنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ وہ ایک جست میں کامیابی کی چوٹی پر پہنچنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ ڈراما کھیلا تھا۔ جست مارنے کا یہی موقع تھا۔ اس وقت چوکنا گناہ تھا۔انھوں نے توتے کو دانہ دے کر پرچا لیا تھا۔ وہ بے خوف ہوکر ان کے صحن میں دانہ چگتا پھرتا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ دانہ کی چاٹ اسے پنجرے میں لائے گی۔ انھوں نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ توتے نے پنجرے کو دیکھتے ہی چونک کر پر تولے اور اڑ کر منڈیر پر جا بیٹھا۔ دانہ کی چاٹ اس کی فطری قوتِ پرواز کو مردہ نہ کرسکی تھی۔ گائتری کی بھی یہی حالت تھی۔ گیان شنکر کی یہ حالت دیکھ کر جھجکی۔ یہ کوئی آزادی فعل نہ تھا۔ وہ الفت کی چاشنی چکھ چکی تھی۔ مگر حفظِ ناموس کی باطنی تحریک کا ابھی بالکل فقدان نہ ہوا تھا۔ وہ جھجکی اور اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کسی ناگہانی حملے کو روکنے کے لیے ہمارے ہاتھ خودبخود اٹھ جاتے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور اسی سراسیمگی کی حالت میں اسٹیج کے پیچھے کی جانب نکل گئی۔ وہاں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس پر جا کر گر پڑی۔ وہ بے ہوش سی ہو رہی تھی۔ جیسے رات کے سناٹے میں کوئی گیدڑ کی آواز سنے اور چلاکر گرپڑے۔ اسے کچھ احساس تھا تو صرف خوف کا۔

مگر اس میں توتے کا سا فطری خوف تھا تو اسی توتے کی سی خفیف غیرت بھی تھی۔ جیسے وہ ایک ہی لمحہ میں پھر دانہ پر گرپڑتا ہے اور بالآخر پنجرے میں قید ہوجاتا ہے۔ اسی طرح گائتری بھی ایک ہی لمحہ میں اپنی اس جھجک پر نادم ہوئی۔ اس کی باطنی عصمت کب

کی فنا ہوچکی تھی۔ اب اس سے اضطراری مقابلہ کی قوت بھی سلب ہوگئی۔ اس کے احساسات میں اب زیادہ وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ عصمت اس کے ایک گوشہ میں پیر پھیلا کر بیٹھ سکتی تھی۔ ایک ہی لمحہ میں وہ پھر اسٹیج پر آئی۔ شرمندہ تھی کہ گیان شنکر اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ ہائے میں بھگتی کے نشہ میں بھی اپنی ذات کو فراموش نہ کرسکی۔ یہاں بھی خودی کو نہ مٹاسکی۔ ناظرین اپنے دل میں نہ جانے کیا خیال کرتے ہوں گے۔ وہ اسٹیج پر پہنچی تو گیان شنکر ایک غزل گاگا کر لوگوں کا دل بہلاؤ کر رہے تھے۔ اس کے اسٹیج پر آتے ہی پردہ گرگیا۔

نصف گھنٹہ کے بعد تیسری بار پردہ اٹھا۔ پھر وہی کدم کا درخت تھا۔ وہی گھنا کنج۔ چاروں سکھیاں بیٹھی ہوئی کرشن کے بہروپ کا چرچا کر رہی تھیں۔ وہ اپنے بھگتوں کے بھگت ہیں۔

اس کے بعد ایک منظوم مکالمہ شروع ہوا۔ جس میں مجاز سے حقیقت کا موازنہ کیا گیا تھا۔ اور بالآخر مجاز ہی کے حق میں فیصلہ کیا گیا تھا۔ چاروں سکھیوں نے آرتی گائی اور ڈراما ختم ہوا۔ پردہ گر گیا۔ گائتری کے انداز لہجہ کھیل کی قابلیت کی سب لوگ تعریف کررہے تھے۔ کتنے ہی خوش اعتقاد بھگتوں کو تو یقین کامل ہوگیا کہ گائتری سچ مچ رادھا کا اوتار ہے۔ نئی روشنی کے لوگ اتنے قابل تو نہ تھے۔ پھر بھی گائتری کے حسن۔ اس کی متانت۔ اس کے لب ولہجہ کا جادو سبھی پر چڑھ گیا تھا۔ گیان شنکر کے پارٹ کی بھی تعریف ہو رہی تھی۔ اگرچہ ان کا گانا کسی کو پسند نہ آیا تھا۔ ان کی آواز میں لوچ کا نام بھی نہ تھا۔ پھر بھی ان کا بید والا پارٹ بے عیب کہا جاتا ہے۔

گائتری جب اپنے کمرہ میں آکر پلنگ پر بیٹھی تو ایک بج گیا تھا۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ چاروں طرف اس کی واہ واہ ہورہی تھی۔ شہر کے کئی جوہرشناس لوگوں نے چلتے وقت اس کے پاس جاکر اس کی اداشناسی کی بے حد تعریف کی تھی۔ یہاں تک کہ شردھا بھی اس کے کمال پر عش عش کر رہی تھی۔ اس کا مغرور دل اس خیال سے مست ہو رہا تھا۔ کہ آج سارے شہر میں میری ہی دھوم ہے اور یہ سب کس کی صحبت کا۔ کس کی تحریک کا نتیجہ تھا؟ گائتری کے روئیں روئیں سے گیان شنکر کے متعلق عقیدت مندانہ راگ نکلنے لگا۔ اس نے گیان شنکر پر بے جا شک کرنے کے لیے اپنے آپ کو ملامت کی۔

مجھے ان سے معافی مانگنی چاہیے۔ میں ان کے پیروں کی دھول ہوں۔ انھوں نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچایا ہے۔ میں نے اُن پر شک کیا۔ مجھ سے زیادہ احسان فراموش کون ہوگا؟ وہ انھیں خیالات میں محو تھی۔ کہ گیان شنکر آکر کھڑے ہوگئے۔ اور بولے۔ آج تو آپ نے ساری مجلس پر جادو کردیا۔

گائتری نے مسکرا کر کہا۔ یہ جادو آپ ہی کا سکھایا ہوا ہے۔

گیان۔ سنا کرتا تھا۔ کہ انسان کا جیسا نام ہوتا ہے۔ ویسے ہی خواص بھی اس میں آ جاتے ہیں۔ پر مجھے یقین نہ آتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ خیال بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ مجھے دو مرتبہ سے تجربہ ہو رہا ہے کہ میں جب اپنا پارٹ کرنے لگتا ہوں تو کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔ دل پر ایک عجب سرور انگیز کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ میں واقعی کرشن ہوں۔

گائتری۔ میں بھی یہی کہنے والی تھی۔ میں تو اپنے کو بالکل بھول ہی جاتی ہوں۔

گیان۔ ممکن ہے کہ مجھے اس خودفراموشی کی حالت میں کوئی بے ادبی ہوگئی ہو تو اسے معاف فرمایئے گا۔

گائتری۔ شرماتی ہوئی بولی۔ پریم کے جذبہ میں دل پاک ہوتا جاتا ہے۔ اس میں نفس پرستی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

گیان شنکر ایک منٹ تک کھڑے ہوئے ان الفاظ کے مفہوم پر غور کرتے رہے اور پھر باہر چلے گئے۔

(۴۹)

دوسرے روز ودیا بنارس پہنچی۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔ صرف ایک معتبر ملازم کو ساتھ لے کر چلی آئی تھی۔ جیوں ہی دروازہ پر پہنچی اسے وسیع شامیانہ نظر آیا۔ اندر گئی تو شردھا دوڑ کر اس سے گلے ملی۔ مہریاں دوڑی آئیں۔ وہ سب کی سب ودیا کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ گائتری گنگا اشنان کو گئی ہوئی تھی۔ ودیا کے کمرہ پر گائتری کا قبضہ تھا۔ اس کے ساز و سامان سے سارا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ ودیا کو ایسا غصہ آیا کہ سارا اسباب اٹھوا کر باہر پھینک دوں۔ مگر کچھ سوچ کر رہ گئی۔ گائتری کے ساتھ کئی مہریاں بھی آئی تھیں۔ وہ یہاں کی مہریوں پر رُعب جماتی تھیں۔ ودیا کو دیکھ کر سب اِدھر

اُدھر چلی گئیں۔ کوئی مزاج پرسی کے لیے بھی نہ آئی۔ وِدّیا ان حالات کو اسی نگاہ سے دیکھتی تھی جیسے کوئی پولیس کا افسر کسی واردات کے نشانات کو دیکھے۔ اس کے دل میں جو شک پیدا ہوا تھا اس کی تصدیق ہوتی جا رہی تھی۔ جیوں ہی تخلیہ ہوا۔ وِدّیا نے شردھا سے پوچھا۔ یہ شامیانہ کیسا تنا ہوا ہے؟

شردھا۔ رات کو وہاں کرشن لیلا ہوئی تھی۔

وِدّیا۔ بہن نے بھی کوئی پارٹ لیا تھا؟

شردھا۔ وہ رادھا بنی تھیں اور بابوجی نے کرشن کا پارٹ لیا تھا۔

وِدّیا۔ بہن سے کھیلتے تو بنا ہوگا؟

شردھا۔ واہ وہ اس فن کی ماہر ہیں۔ ساری مجلس لٹو ہوگئی۔ آتی ہوں گی خود ہی بیان کریں گی۔

ودیا۔ کیا روزانہ گنگا اشنان کو جاتی ہیں؟

شردھا۔ ہاں صبح کو گنگا اشنان کے لیے جاتی ہے اور شام کو کیرتن سننے کے لیے۔

اتنے میں مایاشنکر نے آکر ماں کے پیر چھوئے۔ وِدّیا نے اُسے سینہ سے لگالیا اور کہا۔ بیٹا آرام سے تو رہے؟

مایا۔ جی ہاں خوب آرام سے تھا۔

وِدّیا۔ بہن دیکھو۔ اتنے دنوں میں اس کی آواز کیسی بدل گئی ہے کہ بالکل پہچانی نہیں جاتی۔ موسی جی کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟ خوب پیار کرتی ہیں نا؟

مایا۔ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ بہت اچھا مزاج ہے۔

وِدّیا۔ وہاں بھی کرشن لیلا ہوتی تھی کہ نہیں؟

مایا۔ ہاں۔ وہاں تو روز ہی ہوتی رہتی تھی۔ کیرتن روزانہ ہوتا تھا۔ متھرا برندابن سے راس والے بلائے جاتے تھے۔ بابو جی بھی کرشن کا پارٹ کھیلتے ہیں۔ ان کے بال خوب بڑھ گئے ہیں۔ صورت سے مہنت معلوم ہوتے ہیں تم نے تو دیکھا ہوگا۔

وِدّیا۔ ہاں دیکھا کیوں نہیں۔ بہن اب بھی اداس رہتی ہیں۔

مایا۔ میں نے تو کبھی اداس نہیں دیکھا۔ ہمارے گھر میں تو ایسا خوش دل کوئی ہے ہی نہیں۔

وِدّیا ان سوالات کو اس طرح دریافت کر رہی تھی۔ جیسے کوئی وکیل گواہ سے جرح

کر رہا ہو۔ ہر جواب سے اس کے شبہ کی تصدیق ہی ہوتی تھی۔

دس بجے دروازہ پر موٹر کی آواز سنائی دی۔ سارے گھر میں ایک ہل چل سی پڑ گئی۔ کوی مہری گائتری کا پلنگ بچھانے لگی۔ کوئی اس کے سلیپروں کو صاف کرنے لگی۔ کسی نے فرش جھاڑنا شروع کیا۔ کوئی اس کے ناشتے کی چیزیں نکال کر طشتری میں رکھنے لگی۔ اور ایک نے لوٹا گلاس صاف کرکے رکھ دیا۔ اتنے میں گائتری اوپر آپہنچی۔ پیچھے پیچھے گیان شنکر بھی تھے۔ وِدّیا اپنے کمرہ سے نہ نکلی۔ لیکن گائتری دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور بولی۔ تم کب آئیں؟ پہلے سے خط بھی نہ لکھا۔ وِدّیا گلا چھڑا کر الگ ہوگئی۔ اور رکھائی سے بولی۔ خط لکھ کر کیا کرتی؟ یہاں کسے فرصت تھی کہ مجھے لینے جاتا؟ دامور مہاراج کے ساتھ چلی آئی۔

گیان شنکر نے وِدّیا کے چہرہ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس پر جلی حروف میں جواب لکھا ہوا تھا۔ وِدّیا راز داری کے فن میں کچی تھی۔ ساری داستان اس کے چہرہ پر لکھی ہوئی تھی۔ اس نے گیان شنکر کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مزاج پرسی کی تو بات ہی کیا۔ شمشیر برہنہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے تیور صاف کہہ رہے تھے۔ کہ وہ بھری ہوئی بیٹھی ہے اور موقع پاتے ہی ابل پڑے گی۔ گیان شنکر پریشان ہوگئے۔ وہ انجام کی فکر۔ وہ وسوسے جو گائتری کے آنے سے دب گئے تھے پھر ابھر پڑے اور ان کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ وِدّیا سب کچھ جان گئی۔ اب وہ موقع پاتے ہی گائتری سے ساری داستان کہہ سنائے گی۔ میں اسے کسی طرح باز نہیں رکھ سکتا۔ فہمائش۔ تخویف۔ منت سماجت۔ سب بے سوذ ہوگی۔ اب اگر کوئی نجات کی صورت ہے تو صرف یہ کہ اسے گائتری سے بات چیت کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ یا تو آج ہی شام کی گاڑی سے گائتری کو لے کر گورکھپور چلا جاؤں یا دونوں میں کوئی ایسا رخنہ ڈال دوں کہ ایک دوسرے سے کھل کر مل ہی نہ سکیں۔ عورتوں کو آپس میں لڑا دینا کون سا مشکل کام ہے۔ ایک اشارہ میں تو ان کے تیور بدلتے ہیں۔ گیان شنکر کو ابھی یہ گمان نہ تھا کہ وِدّیا میری بھگتی اور پریم کے تہہ تک پہنچی ہوئی ہے۔ وہ ابھی تک صرف رائے صاحب والے سانحے کو اس برہمی کا باعث سمجھ رہے تھے۔

وِدیا نے گائتری سے الگ ہٹ کر اس کے سر سے پیر تک ایک چبھتی ہوئی نگاہ

ڈالی۔ اس نے اس کو چھ سال قبل دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ پژمردہ تھا۔ وہ شام کی طرح اداس اور ست تھی۔ مگر اس وقت اس کا چہرہ شگفتہ تھا۔ اس میں صبح کی سی مسرت۔ روشنی اور زندہ دلی تھی۔ ودیا اس برقی مشلہ کے مقابل چراغ کی طرح پھیکی معلوم ہوتی تھی۔

گائتری نے پوچھا۔ سنگیت کے جلسہ کا تو خوب لطف اٹھایا ہوگا؟

گیان شنکر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ انھوں نے وڈیا کی طرف ایک بیکسانہ انداز سے دیکھا۔ اس کی نگاہ زمین کی طرف تھی۔ اس نے کہا۔ میں توکبھی اس جلسہ میں گئی ہی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ جلسہ کچھ پھیکا رہا۔ لالہ جی بہت بیمار ہوگئے اور ایک دن بھی جلسہ میں شریک نہ ہوسکے۔

گائتری۔ میرے نہ جانے سے ناراض تو ضرور ہی ہوتے ہوں گے؟

ودیا۔ تمھیں ان کے ناراض ہونے کی کیا پرواہ ہے۔ وہ ناراض ہوکر تمھارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟

اگرچہ یہ جواب کافی دل شکن تھا۔ مگر گائتری اپنی کرشن لیلا کا ذکر کرنے کے لیے ایسی بیتاب تھی کہ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ بولی۔ کیا کہوں۔ تم کل نہ آگئیں کہ یہاں کرشن لیلا کا لطف اٹھاتیں۔ نارائن کی کچھ ایسی کرپا ہو گئی کہ اس لیلا کی سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ کسی طرح کا نقص نہ تھا۔ اسٹیج تو تم کو ابھی دکھاؤں گی مگر اس کی آرائش اتنی دلکش تھی کہ بیان نہیں کرسکتی۔ صرف پردوں کی تیاری میں ہزاروں روپے صرف ہوگئے۔ برقی روشنی سے سارا پنڈال ایسا روشن تھا کہ اس کی جگمگاہٹ دیکھتے ہی بنتی تھی۔ میں اتنی بڑی سبھا کے سامنے آتی ڈرتی تھی پر کرشن بھگوان کی کچھ ایسی دیا ہوئی کہ میرا پارٹ سب سے بڑھ کر رہا۔ پوچھو بابو جی سے شہر میں اس کا کیسا چرچا ہو رہا ہے۔ لوگوں نے مجھے ایک ایک پد کو کئی کئی بار گانے پر مجبور کیا۔

وڈیا۔ مایوسی سے کہا۔ میری بدنصیبی تھی کہ کل نہ آگئی۔

گائتری۔ ایک بار پھر وہی لیلا کرنے کا ارادہ ہے۔ اب کے تمھیں بھی کوئی پارٹ دوں گی۔

وڈیا۔ نہیں مجھے معاف کرنا۔ ناٹک کھیل کر مجھے بیکنٹھ جانے کی امید نہیں ہے۔

گائتری حیرت سے ودیا کا منہ تاکنے لگی مگر گیان شنکر دل میں خوش ہو رہے تھے۔ دونوں بہنوں میں وہ جس بدمزگی کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود بخود پیدا ہوئی جاتی تھی۔

یہ فال نیک تھی۔ گائتری سے بولے۔ میرے خیال میں یہاں اب آپ کو تکلیف ہوگی۔ کیوں نہ بنگلہ میں ایک کمرہ آپ کے لیے خالی کر دوں؟ وہاں آپ زیادہ آرام سے رہ سکیں گی۔

گائتری نے وڈیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیوں وڈیا بنگلے میں چلی جاؤں برا تو نہ مانوگی؟ میرے یہاں رہنے سے تمھارے آرام میں خلل پڑے گا۔ میں اکثر بھجن گایا کرتی ہوں۔

وِدیا۔ تم میرے آرام کی فکر نہ کرو۔ میں اتنی نازک دماغ نہیں ہوں۔ ہاں اگر تمھیں یہاں کچھ تکلیف ہو تو شوق سے بنگلے میں چلی جاؤ۔

گیان شنکر نے گائتری کا اسباب اٹھوا کر بنگلہ میں رکھوا دیا۔ گائتری نے بھی وڈیا سے اور کچھ نہ کہا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ یہ اس وقت حسد سے جلی جاتی ہے اور ایسا کون شخص ہوگا جو حاسد کی جلن سے حظ نہیں اٹھانا چاہتا۔ اس نے ایک بار وڈیا کو فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا اور زینہ کی طرف چلی گئی۔

رات کے نو بجے تھے۔ گائتری بین بجا کر ایک پد گا رہی تھی کہ گیان شنکر کمرہ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے آج دیوی سے "بردان" مانگنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لوہا لال ہو رہا تھا۔ اب پس و پیش کا موقع نہ تھا۔ متواتر غزلوں کی ضرورت تھی۔ ایک دن کی دیر بھی ایک مدت کی سرگرم کوششوں پر پانی پھیر سکتی تھی۔ زندگی کی ساری آرزوؤں کو خاک میں ملا سکتی تھی۔ وڈیا کی ایک بے موقع بات سارا نقشہ پلٹ سکتی تھی۔ اس کا ایک اشارہ ان کے سارے ہوائی قلعہ کو زمین دوز کرسکتا تھا۔ شاید میدان جنگ میں کسی سپہ سالار کو اتنا اہم اور فیصلہ کن موقع ہاتھ نہ آتا ہوگا۔ جتنا اس وقت گیان شنکر کو معلوم ہو رہا تھا۔ ان کی حالت اس سپاہی کی سی تھی جو کچھ دور پر کھڑا ہوا اسلحہ خانہ میں آگ کی چنگاری کو پڑتے ہوئے دیکھے اور اس کے بجھانے کے لیے بے تحاشا دوڑ پڑے۔ ان کی یہ تیزی کتنی اہم اور کتنی قیمتی ہے۔ ایک منٹ کی دیر فوج کی تباہی، قلعہ کی مسماری، سلطنت کی بربادی اور قوم کی پامالی کا سبب ہوسکتی ہے۔ گیان شنکر آج دوپہر سے اسی عقدہ کے حل میں مصروف تھے کہ بات کیوں کر چھیڑوں؟ ایسا انداز ہونا چاہیے کہ میری بے غرضی کا پردہ فاش ہونے نہ پائے۔ انھوں نے اپنے دل میں باتوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم کرلیا تھا کہ

مایاشنکر کے گود لینے کی استدعا خود گائتری کی طرف سے ہو اور وہ اس تجویز کے حُسن و قبح کے متعلق بے غرضانہ طریقہ پر اپنی رائے ظاہر کرسکیں اور اس معاملہ میں ان کی حیثیت محض ایک ثالث کی حیثیت ہے۔ انھوں نے اپنی فراست۔ اپنی فکر۔ اپنی دوراندیشی اپنی پیش بینی سے اتنا کام کبھی نہ لیا تھا۔ ان کی کامیابی میں جو جو باتیں سدِراہ ہوسکتی تھیں ان سبھوں پر انھوں نے کافی غور کرلیا تھا۔ انھوں نے اپنے دل میں ایک ایک لفظ ایک ایک اشارہ ایک ایک طرز کا تعین کیا تھا۔ وہ ایک زعفرانی رنگ کی ریشمی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ان کے لمبے بال چادر پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے بھگتی کا سرور ٹپک رہا تھا۔ اور چہرہ پریم کے نور سے سوز تھا۔ انھوں نے گائتری کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ آپ کے پدوں میں غضب کا جادو ہے۔ دل میں پریم کی ترنگیں اٹھنے لگتی ہیں۔ طبیعت پر بھگتی کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔

گائتری نے مسکرا کر کہا۔ یہ جادو میرے پدوں میں نہیں ہے۔ آپ کے نازک دل میں ہے۔ باہر کی پھیکی صدا بھی اندر جاکر سریلی اور دلکش بن جاتی ہے۔ معمولی چراغ بھی موٹے شیشہ کے اندر جاکر برقی لیمپ سا بن جاتا ہے۔

گیان۔ میرے دل کی آج کل ایک عجیب کیفیت ہوگئی ہے۔ مجھے اب یقین ہوتا جاتا ہے
کہ انسانی دل میں ایک ہی ساتھ دو مختلف جذبے نہیں رہ سکتے۔ ایک ہی روح دو صورتیں نہیں اختیار کرسکتی۔

گائتری نے ان کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھا اور بین کو میز پر رکھ کر ان کا منہ تاکنے لگی۔

گیان شنکر نے کہا۔ ہم جو روپ بھرتے ہیں اس کا ہمارے عادات واطوار پر اتنا اثر پڑتا ہے کہ ہمارا اصلی وجود غائب سا ہوجاتا ہے۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ لوگ کیوں ناٹکوں میں لڑکوں کو عورتوں کا روپ بھرنے، ناچنے اور بھاؤ بنانے سے منع کرتے ہیں۔ ایک رحم دل آدمی فوج میں رہ کر کتنا تندمزاج اور سخت ہوجاتا ہے۔ گرد و پیش کے حالات اس کی رحم دلی کو مٹا دیتے ہیں۔ اب روزانہ میرے کانوں میں بنسی کی سریلی آواز گونجا کرتی ہے اور آنکھوں کے سامنے ہر وقت گوکل اور برسانے کے مناظر پھرا کرتے ہیں۔ میرا وجود کرشن کی ذات میں فنا ہوتا جاتا ہے۔ رادھا اب ایک لمحہ کے لیے بھی

میرے دھیان سے نہیں اترتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا دل مجھے کدھر لیے جاتا ہے۔

یہ کہتے کہتے گیان شنکر کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ چہرہ پر پریم کا رنگ چھا گیا اور آواز میں ایک کیفیت انگیز دلکشی پیدا ہوگئی۔ بولے۔ گائتری دیوی چاہے یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہو مگر حق تو یہ ہے کہ اس محویت کے عالم میں تمھارا رتبہ تمھاری دولت وثروت۔ تمھارا رشتہ ۔ سب میری نگاہوں سے دور ہو جاتا ہے اور تم مجھے وہی رادھا۔ وہی برندابن کی البیلی ترچھی چتون والی۔ میٹھی مسکان والی دلکش آداؤں والی اور شوخ رادھا معلوم ہوتی ہو۔ میں اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہتا ہوں کہ تمھیں رانی گائتری سمجھوں۔ جس کا میں ایک ادنیٰ ملازم ہوں مگرمیں بار بار بھول جاتا ہوں۔ تمھاری ایک آواز۔ تمھاری ایک جھلک۔ تمھارے پیروں کی آہٹ۔ یہاں تک کہ صرف تمھاری یاد مجھے اس دنیا سے اٹھا کر کسی دوسری دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ میں اپنے کو بالکل بھول جاتا ہوں۔ اب تک میں نے اس کیفیت کو تم سے پوشیدہ رکھا تھا۔ مگر جس طرح مضراب کی چوٹ سے ستار بجنے لگتا ہے اسی طرح محبت کی چوٹ سے دل ناطق بن جاتا ہے۔ میں نے آپ سے اپنے دل کی حالت بیان کردی۔ مجھے تشفی ہوگئی۔ اس محبت کا انجام کیا ہوگا۔ اسے ان کے سوا اور کون جانتا ہے جنھوں نے دل میں اس شعلہ کو پیدا کیا ہے۔

جس طرح پیاس سے تڑپتا ہوا آدمی ٹھنڈا پانی پی کر ترو تازہ ہوجاتا ہے۔ ایک ایک گھونٹ اس کے چہرہ اور اس کی آنکھوں میں شگفتگی پیدا کردیتا ہے۔ اسی طرح اس داستانِ عشق نے گائتری کے چہرہ کو منور کر دیا۔ اس کی آنکھیں مخمور ہوگئیں۔ اسے اپنی زندگی میں تازگی کا احساس ہونے لگا۔ اس کے خیال میں یہ محبت روحانی تھی نہ کہ بشری۔ اس کے محرک کرشن تھے اور وہی گیان شنکر کے دل میں بیٹھے ہوئے ان کی زبانی اس محبت کے راگ کو الاپ رہے تھے۔ اس کے دل میں بھی ایسے ہی جذبات پیدا ہوتے تھے۔ لیکن انھیں حیا کے باعث زبان پر نہ لاسکتی تھی۔ رادھا کا پارٹ کھیل چکنے کے بعد وہ پھر گائتری ہوجاتی تھی۔ مگر اس وقت یہ باتیں سن کر اس پر ایک سرور سا چھا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ رادھا میرے دل میں موجود ہے۔ پس اس کی زبان حیا کی قید سے آزاد ہوگئی۔ اس روحانی نعمت کے سامنے کل دنیا یہاں تک کہ اپنی ہستی بھی ہیچ معلوم ہونے

لگی۔ باطنی غرور سے آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولی۔ پیارے! میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی اسی آگ سے جل رہی ہوں۔ یہ تن اور من اب تمھاری بھینٹ ہے۔ تمھاری محبت جیسی نعمت پاکر اب مجھے کوئی خواہش۔ کوئی ہوس نہیں رہی۔ اس روحانیت کی روشنی نے مایا اور موہ کی تاریکی کو مٹادیا۔ دنیاوی چیزوں سے میری طبیعت سیر ہوگئی۔ اب یہی آرزو ہے کہ یہ سر تمھارے قدموں پر ہو اور تمھاری یاد میں زندگی ختم ہوجائے۔ میں رانی نہیں ہوں۔ گائتری نہیں ہوں۔ میں تمھارے پریم کی بھکھارنی۔ تمھارے پریم کی متوالی۔ تمھارے چیری رادھا ہوں۔ تم میرے مالک۔ میری زندگی کا سہارا۔ میرے معبود ہو۔ میں تمھارے ساتھ برسانے کی گلیوں میں گھوموں گی۔ جمنا کے کنارے تمھارے پریم کا راگ گاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ میں تمھارے قابل نہیں ہوں۔ ابھی میرا دل دنیوی خواہشات کا غلام ہے۔ ابھی. میں عصمت اور اخلاق کی بندشوں سے نجات نہیں پاسکی ہوں۔ مگر میں جیسی کچھ ہوں تم مجھے اپنی خدمت میں قبول کرو۔ تمھاری ہی صحبت کے فیض نے مجھے اس روحانی نعمت کا مزہ چکھایا ہے۔ کیا وہ میرے دل کو آلائشوں سے پاک نہ کردے گا؟

یہ کہتے کہتے گائتری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بھگتی کے جوش میں گیان شنکر کے قدموں پر گر پڑی۔ گیان شنکر نے اسے فوراً اٹھا کر سینہ سے لگایا۔ دفعتاً کمرہ کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور وِدّیا نے اندر قدم رکھا۔ گیان شنکر اور گائتری دونوں نے چونک کر دروازہ کی طرف دیکھا اور جھجک کر الگ کھڑے ہوگئے۔ دونوں کی آنکھیں زمین کی طرف جھک گئیں اور چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ گیان شنکر تو سامنے ہی کی الماری میں سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگے۔ مگر گائتری جیوں کی تیوں بت کی طرح بے حس وحرکت کھڑی رہی۔ پیشانی پر پسینہ آگیا۔ جی چاہتا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ وہ کوئی بہانہ۔ کوئی حیلہ نہ کرسکی۔ ندامت نے دلیری کی گنجائش ہی باقی نہ رکھی تھی۔ اسے فرش پر جلی حروف میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ ''اب تو کہیں کی نہ رہی تیرے منہ میں کالکھ لگ گئی۔'' یہی حال اس کے دل کو بے چین کیے دیتا تھا۔ یہی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ زار وقطار رونے لگی۔ ابھی ایک لمحہ قبل اس کی آنکھوں میں روحانی غرور کی جھلک تھی مگر اس وقت اس سے زیادہ بیکس اور حقیر دنیا میں کوئی نہ تھا۔ دم زدن میں اس کی روحانیت اور معرفت۔ اس کی بھگتی اور پریم کا پردہ کھل

گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ میری بھگتی کے صاف و شفاف پانی کی تہہ میں کیچڑ تھا۔ میرے پریم کے پرفضا پہاڑ کے نیچے تاریک غار تھا۔ میں پانی میں قدم رکھتے ہی کیچڑ میں پھنس گئی۔ پہاڑ پر چڑھتے ہی غار میں جا گری۔ ہائے اس صاف سنہرے لہراتے ہوئے پانی نے مجھے دھوکا دیا۔ ان خوش نما دلکش بلندیوں نے مجھے للچایا۔ اور اب کہیں کی نہ رہی۔ اپنی کمزوری اور فروتنی پر اسے اتنا رنج ہوا۔ ندامت اورپشیمانی کی اس پر وہ کیفیت طاری ہوئی کہ چیخ کر رونے لگی۔ ہائے وڈیا مجھے اپنے دل میں کتنی بے غیرت سمجھ رہی ہوگی۔ وہ میری کتنی عزت کرتی تھی۔ میرا کتنا ادب کرتی تھی۔ اب میں اس کی نگاہوں میں چھچوری ہوں۔ ننگ خاندان ہوں۔ میں اس کے سامنے عصمت وعفت کی کیسی ڈینگیں مارتی تھی۔ پاکیزہ اور نیک کاموں کی کتنی تعریفیں کرتی تھی۔میں اس کے سامنے ویوی اور ستی بنتی تھی۔ اپنی عصمت پروری پر غرور کرتی تھی۔ مگر اب اسے منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں۔ ہائے وہ مجھے اپنی سوت سمجھ رہی ہوگی۔ مجھے آنکھوں کی کرکری اور دل کا کانٹا خیال کرتی ہوگی۔ میں اس کا گھر جلانے والی آگ اس کی ہانڈی میں منہ ڈالنے والی کتیا ہوں۔ ہائے ایشور میں کیسی اندھی ہوگئی تھی۔ یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ یہ میری کنیا (دختر) کی طرح ہے۔ اس خیال نے گائتری کے دل کو اتنی زور سے مسوس دیا کہ وہ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئی۔ دفعتاً وہ روتی ہوئی اٹھی اور وڈیا کے پیروں پر گر پڑی۔

وڈیا اس وقت محض اتفاق سے یہاں آگئی تھی۔ وہ اوپر اپنے کمرہ میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ گائتری بہن کو کیا ہوگیا ہے۔ اسے کیوں کر سمجھاؤں کہ یہ حضرت (گیان شنکر) تجھے پریم اور بھگتی کے سبز باغ دکھا رہے ہیں۔ یہ سارا سوانگ تیری جائداد کے لیے بھرا جارہا ہے۔ نہ جانے کیوں دولت وثروت کے پیچھے اتنے اندھے ہورہے ہیں کہ مذہب وایمان کو پیروں سے کچل رہے ہیں۔ کتنا بدباطن و کتنا مکار۔ کتنا لالچی۔ کتنا خود غرض انسان ہے کہ اپنی ہوس کے مقابلہ میں کسی کی جان کسی کی آبرو کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ باتیں تو ایسی کرتا ہے گویا بڑے روشن ضمیر ہیں۔ ایسا عالم۔ ایسا پاک طینت۔ ایسا فیاض طبع شخص دنیا میں نہ ہوگا۔ مگر دل میں حیوانیت۔ مکاری۔ بداعمالی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بس اس کو یہی دھن ہے کہ گائتری کسی طرح مایا کو گود لے لے۔ اس کی لکھا پڑھی ہوجائے اور علاقہ پر میرا قبضہ ہو۔ اس کے سیاہ وسفید کا اختیار میرے ہاتھوں میں آجائے۔

اس لیے اس نے پریم اور بھگتی کا یہ جال بچھا رکھا ہے۔ بھگت بنا ہوا ہے۔ بال بڑھائے ہیں۔ ناچتا ہے۔ گاتا ہے۔ کنھیا بنتا ہے۔ اُف ۔ کتنی مکاری اور کتنی خباثت ہے۔

وہ انھیں خیالات میں محو تھی کہ اس کے کانوں میں گائتری کے گانے کی آواز آئی۔ وہ بین پر سورداس کا ایک عشقیہ پد گا رہی تھی۔ راگ اتنا دلکش اور پُرتاثیر تھا۔ انداز میں اتنا درد و گداز بھرا ہوا تھا۔ آواز میں اتنا لوچ تھا کہ وڈیا سننے کے لیے بے قرار ہوگئی۔ نغمہ کی کشش نے اسے بزور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے سوچا کہ سچے پریم سچی لگن کے بغیر گانے میں یہ تاثیر نہیں پیدا ہوسکتی۔ اس کی دُھن اس کی بھگتی سچی ہے۔ اس پر منتر ڈال دیا گیا ہے۔ میں اس منتر کو اتار دوں۔ ممکن ہو تو اسے غار میں گرنے سے بچا لوں۔ اسے بخوبی آگاہ کردوں۔ بیشک یہ حضرت مجھ سے ناراض ہوں گے ۔ مجھے اپنا دشمن سمجھیں گے۔ میرے خون کے پیاسے ہوجائیں گے۔ کچھ پرواہ نہیں۔ اس کام میں اگر میری جان بھی جائے تو بھی مجھے تامل نہ کرنا چاہیے۔ جو شخص ایسا خونی۔ ایسا قاتل ایسا رنگا ہوا سیار ہو۔ اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ اس کا منہ دیکھنا۔ اس کے گھر میں رہنا۔ اس کی استری کہلانا پاپ ہے۔

وہ اوپر سے اتری اور آہستہ آہستہ گائتری کے کمرہ میں آئی مگر پہلا ہی قدم اندر رکھا تھا کہ جھجک گئی۔ گائتری اور گیان شنکر ہم آغوش ہو رہے تھے۔ وہ یہاں اس وقت بہت نیک ارادوں کے ساتھ آئی تھی۔ مگر بے حیائی کا یہ نظارہ دیکھ کر اس کا خون ابل اٹھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ توہین و ملامت کے الفاظ منہ سے نکل جانے کے لیے زور مارنے لگے۔ اس نے آتشیں نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس کی بددعا میں اگر قوت ہوتی کہ وہ گیان شنکر کو جلاکر خاک سیاہ کردے تو وہ ایسی بددعا سے باز نہ رہتی۔ اس کے نازک ہاتھوں میں اگر اتنی طاقت ہوتی کہ وہ ایک ہی وار میں ان کا کام تمام کردے تو وہ ایسا وار ضرور کرتی۔ مگر اس کے امکان میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ اس جوش کی حالت میں وہ وہاں ٹھہر نہ سکتی تھی۔ وہ الٹے پاؤں لوٹنا چاہتی تھی۔ خرمن میں آگ لگ چکی تھی۔ طائر کی گردن پر چھری چل چکی تھی۔ اب اسے بچانے کی کوشش بے سود تھی۔ گائتری سے اسے ذرا دیر پہلے جو ہمدردی تھی وہ بالکل غائب ہوگئی۔ اب وہ ہمدردی کے قابل نہ تھی۔ ہم سفید کپڑوں کو چھینٹوں

سے بچاتے ہیں۔ مگر جب چھینٹے پڑجاتے ہیں تو اسے دور پھینک دیتے ہیں۔ اس کے چھونے سے نفرت ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں گائتری اب اسی قابل تھی کہ اپنے کیے کا پھل بھوگے۔ میں اس وہم میں تھی کہ اس بدکار نے تجھے بہکا دیا ہے۔ تیرا باطن صاف ہے مگر اب یہ وہم دور ہوگیا۔ کرشن کی بھگتی اور پریم کا نشہ اتنا گاڑھا نہیں ہوسکتا کہ نیک و بد کی تمیز باقی نہ رہے۔ یہ بے حیائی اغوائے نفس کے بغیر ناممکن ہے۔ ہائے ابھاگنی۔ آدھی عمر گزر جانے پر تجھے یہ سوجھی۔ جس شوہر کو تو دیوتا سمجھتی تھی۔ جس کی یاد کی تو پرستش کرتی تھی۔ جس کا نام لیتے ہی تیرے چہرہ پر غرورِ عصمت کی سرخی نمودار ہوجاتی تھی۔ اس کی روح کو تو نے یوں جلایا اس کی مٹی یوں خراب کی!

لیکن جب اس نے گائتری کو سرجھکا کر اور چیخ کر روتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل نرم ہوگیا۔ اور جب گائتری آکر اس کے قدموں پر گرپڑی تو محبت اور عقیدت کے جوش سے بیتاب ہوکر وہ بیٹھ گئی اور گائتری کا سر اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ دونوں بہنیں رونے لگیں۔ ایک ندامت سے اور دوسری محبت سے۔

اب تک گیان شنکر شش و پنج کی حالت میں کھڑے تھے۔ وِدّیا پر جھنجلا رہے تھے۔ مگر زبان سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں یہ شکار پھندا توڑ کر نکل نہ جائے۔ گائتری کی گریہ وزاری پر انھیں سخت غصہ آرہا تھا۔ جب تک گائتری اپنی جگہ پر کھڑی روتی رہی۔ اس وقت تک انھیں امید تھی کہ اس چوٹ کی دوا ہوسکتی ہے۔ مگر جب گائتری جا کر وِدّیا کے قدموں پر گر پڑی اور دونوں بہنیں گلے مل کر رونے لگیں تو وہ ضبط نہ کرسکے۔ اب خاموش رہنا اپنی جیتی ہوئی بازی کو ہاتھ سے کھونا۔ اپنے پھندے میں آئے ہوئے شکار کو خود بہکا دینا تھا۔ انھوں نے تند لہجہ میں وِدّیا سے کہا۔ بے سبب۔ تم کو بلا اجازت کسی کے کمرہ میں آنے کا کیا حق ہے؟ وِدّیا کچھ نہ بولی۔ گائتری نے اس کی گردن زیادہ سے زیادہ زور سے پکڑلی گویا ڈوبنے سے بچنے کا یہی ایک سہارا تھا۔

گیان شنکر نے زیادہ کرخت آواز میں کہا۔ تمھارے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں اور تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ تم اسی دم یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ میں تمھارا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دینے پر مجبور ہوجاؤں گا۔ تم کئی بار میری راہ کا کانٹا بن چکی ہو۔ لیکن اب کی بار میں تمھیں ہمیشہ کے لیے اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتا ہوں۔

ودیا نے تیور بدل کر کہا۔ میں اپنی بہن کے پاس آئی ہوں اور جب تک وہ مجھے جانے کو نہ کہے گی۔ میں ہرگز نہ جاؤں گی۔

گیان شنکر نے گرج کر کہا۔ چلی جا۔ نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔

وڈیا نے بے خوفی سے جواب دیا۔ کبھی نہیں۔ تمھارے کہنے سے کبھی نہیں۔

گیان شنکر غصہ سے کانپتے ہوئے تیر کی طرح وڈیا کے پاس آئے۔ اور چاہا کہ جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑلوں کہ گائتری کھڑی ہوگئی اور تحکمانہ انداز سے بولی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس قدر برہم کیوں ہو رہے ہیں۔ وہ مجھ سے ملنے آئی ہے اور میں ابھی نہ جانے دوں گی۔ گائتری کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے گلا ابھی تک تھرتھرا رہا تھا۔ سسکیاں لے رہی تھی۔ مگر یہ گزرے ہوئے طوفان کے نشانات تھے۔ وہ پھر اپنے آپ میں آ چکی تھی۔ اس کا فطری غرور پھر بیدار ہوگیا تھا۔

گیان شنکر نے کہا۔ گائتری دیوی۔ تم اپنے کو بالکل بھولی جاتی ہو۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ ایک زمانہ دراز کی بھگتی اور پریم کے باوجود بھی تم دنیاداری کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو۔ یاد کرو کہ تم کون ہو۔ سوچو کہ میں کون ہوں۔ خیال کرو کہ میرا اور تمھارا کیا رشتہ ہے۔ کیا تم اس پاک رشتہ کو اتنا کمزور سمجھ رہی ہو کہ اسے ہوا اور روشنی سے بچایا جائے۔ وہ ایک روحانی رشتہ ہے اسے کوئی دنیاوی طاقت توڑ نہیں سکتی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ روحانی ملاپ کے باوجود بھی تم مجھ سے اس قدر بدظن ہو۔ کیا میں سمجھ لوں کہ تم اتنے دنوں تک صرف گڈیوں کا کھیل کھیل رہی تھیں؟ اگر واقعی یہی بات ہے تو تم نے مجھ کو کہیں کا نہ رکھا۔ میں اپنا دل۔ اپنی جان۔ اپنا دین۔ اپنا ایمان سب پریم کے نذر کرچکا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم نے بھی خوب سوچ سمجھ کر پریم کے راستہ میں قدم رکھا ہے اور اس کی مشکلات سے واقف ہو۔ پریم کا راستہ کٹھن ہے۔ نہایت دشوارگزار اور طویل۔ یہاں بدنامی ہے۔ رسوائی ہے۔ ذلت و خواری ہے۔ طعنے اور سرگوشیاں ہیں۔ یہاں وہی منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے جو دنیا سے منہ موڑے۔ اس سے اپنا سارا تعلق منقطع کرے۔ اس راستہ میں دنیاوی رشتے پیروں کی بیڑیاں ہیں۔ انھیں توڑے بغیر ایک قدم رکھنا بھی مشکل ہے۔ اگر تم نے انجام کا خیال نہیں کیا اور محض تفریحاً چل کھڑی ہوئیں تو تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ اس کا عذاب تمھاری گردن پر ہوگا۔

اگرچہ گیان شنکر اپنے جذبات کو چھپانے میں کافی مشاق تھے۔ مگر اس وقت ان کی اس وزن دار تقریر اور ان کے کھسیائے ہوئے چہرے میں فوراً ذرا بھی مناسبت نہ تھی۔ ملمع کی انگوٹھی تاؤ کھا چکی تھی۔

اس کے قبل گیان شنکر کی زبان سے ایسی باتیں سن کر گائتری شاید رونے لگتی اور گیان شنکر کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگتی۔ نہیں بلکہ گیان شنکر کی سردمہری دیکھ کر یہ الفاظ خود اس کی زبان سے نکلتے۔ لیکن وہ نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس نے گیان شنکر کے چہرہ کی طرف اُڑتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ اس پر روحانیت کا وہ روغن نہ تھا۔ ایکٹر کے لمبے بال اور زرق برق کپڑے اُتر چکے تھے۔ وہ صورت جس پر دیکھنے والے لٹو ہوجاتے تھے۔ اور جس کا اسٹیج پر تالیوں سے خیر مقدم کیا جاتا تھا بگڑ گئی تھی۔ جس طرح کوئی سیدھا سادہ دہقانی ایک بار تاش والوں کے دم میں آکر دوبارہ ان کے پاس کھڑا نہیں ہوتا، اس خوف سے کہ کہیں پھر ان کے بہکانے میں نہ آجائے۔ اسی طرح گائتری بھی یہاں سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔ اس نے گیان شنکر کو کچھ جواب نہ دیا اور ودیا کا ہاتھ پکڑے ہوئے دروازہ کی طرف چلی۔ گیان شنکر کو معلوم ہوگیا کہ میرا منتر نہ چلا۔ انھیں طیش آیا مگر گائتری پر نہیں۔ انھیں اپنی ناکامی اور بدقسمتی پر افسوس ہوا کہ میری سات برسوں کی محنت برباد ہوئی جاتی ہے۔ زندگی کی تمنائیں سامنے آکر روٹھی جاتی ہیں۔ کیا کروں؟ انھیں کیوں کر مناؤں؟ میں نے اپنے نفس پر کتنا ظلم کیا۔ کیسی کیسی ریاکاریاں کیں۔ اسی ایک تمنا پر اپنی دنیا اور آخرت دونوں قربان کر دیا۔ وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا۔ ناچنا سیکھا۔ نقلیں کیں۔ سوانگ بھرے مگر ساری کوششیں برباد ہوگئیں۔ رائے صاحب نے سچ کہا تھا کہ دولت و ثروت میری تقدیر میں نہیں ہے۔ میرا مقصد کبھی نہ پورا ہوگا۔ یہ آرزو چتا پر میرے ساتھ جلے گی۔ گائتری کی بے اعتنائی بھی کچھ کم جگرخراش نہ تھی۔ گیان شنکر کو گائتری سے سچی محبت نہ سہی مگر وہ اس کے حسن پر شیدا تھے۔ اس کی فیاضی۔ اس کا اخلاق۔ اس کی شرافت۔ اس کی ذہانت۔ اس کی سادگی۔ انھیں اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اگر ایک طرف گائتری ہوتی اور دوسری طرف اس کی جائداد اور گیان شنکر کو انتخاب کرنے کی آزادی ہوتی تو یقیناً وہ اس کی جائداد ہی پر لپکتے۔ لیکن اس کی ذات سے علاحدہ ہو کر اس کی جائداد طعام بے نمک تھی۔ یہی گائتری ان سے منہ پھیر کر چلی جارہی تھی۔

ان پریشان کن خیالات نے گیان شنکر کے دل کو اتنا بے چین کیا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور دیوار کی طرف منہ پھیر کر رونے لگے۔ اپنی لاچاری پر انھیں اتنا رنج کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام عمر میں اس قدر رنجیدہ کبھی نہ ہوئے تھے۔ انھیں اپنی خود غرضی۔ اپنی دنیا پرستی اپنی کم ظرفی کا ایسا دل شکن احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ جس طرح بیماری میں انسان کو خدا یاد آتا ہے اسی طرح ناکام ہونے پر اسے اپنی منصلہ کاریوں پر افسوس ہوتا ہے۔ شکست کی روحانی اہمیت فتح سے کہیں زیادہ ہے۔

گائتری نے گیان شنکر کو روتے دیکھا تو دروازہ پر جاکر رک گئی۔ اس کے قدم باہر نہ پڑسکے۔ عورتوں کے آنسو پانی ہیں۔ مردوں کے آنسو خون ہیں۔ وہ صبر واستقلال کے فقدان کی خبر دیتے ہیں۔ حفظِ ناموس کا شعلہ جو ابھی ذرا دیر پہلے اس کے دل میں روشن ہوا تھا ان آنسوؤں سے بجھ گیا۔ وہ تصورات تازہ ہوگئے جو سات برسوں سے اس کے دل کو محو کر رہے تھے۔ وہ پرلطف باتیں وہ دلکش کھیل۔ وہ سرور بخش کیرتن۔ وہ محبت کی گھاتیں۔ وہ ہجر کے تصورات۔ یہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ندامت اور پشیمانی کے بادل پھٹ گئے۔ محبت کا چاند چمکنے لگا۔ وہ گیان شنکر کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اور رومال سے ان کے آنسو پونچھنے لگی۔ فرطِ محبت سے بے قرار ہو کر اس نے اُن کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اسے ان کی آنکھوں میں پریم کا دریا لہریں مارتا ہوا نظر آیا۔ وہ چہرہ آفتابِ عشق کے شعاعوں سے منور ہو رہا تھا۔ اس نے ان کی طرف رغبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ نگاہوں میں التجا کا بھی شائبہ تھا۔ گویا وہ کہہ رہی تھی۔ ہائے میں کتنی کمزور ہوں۔ کتنی بداعتقاد ہوں۔ کتنی ظاہر پرست ہوں۔ میں حقیقت اور مجاز میں تمیز نہ کرسکی۔ میری بداعتقادی نے ان کے نازک دل کو کتنا صدمہ پہنچایا ہوگا۔ تم نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچایا۔ تم نے میرے دل میں بھگتی کا بیج بویا۔ تمھاری ہی نصیحتوں سے مجھے پریم کا روحانی حظ حاصل ہوا۔ یکایک میری آنکھوں پر پردہ کیسے پڑگیا۔ میں اتنی اندھی کیسے ہوگئی۔ بیشک کرشن بھگوان مجھے آزما رہے تھے۔ اور میں اس آزمائش میں پوری نہ اتری۔ انھوں نے مجھے پریم کی کسوٹی پر کسا اور میں کھوٹی نکلی۔ افسوس کہ میری سات سال کی ریاضت ایک لمحہ میں برباد ہوگئی۔ میں نے اس شخص پر شبہ کیا جس کے دل میں کرشن کا قیام ہے۔ جس کی آواز میں مرلی کی سریلی تان ہے۔ تم نے کیوں میرے دل پر سے اپنا

جادو ہٹالیا؟ میرے دل میں آکر بیٹھو اور مجھے دھرم کا امرت پلاؤ۔

یہ سوچتے سوچتے گائتری کی آنکھیں مخمور ہوگئیں۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی......
بھگوان تمھاری چیلی تمھارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی اپنی خطا کی معافی چاہتی ہے۔

گیان شنکر نے اس کی طرف چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور سمجھ گئے کہ میرے آنسو کام کرگئے۔ اس طرح چونک پڑے گویا خواب سے بیدار ہوئے ہوں اور بولے۔ رادھا! گائتری۔ میری خطا معاف کیجیے۔

گیان۔ تم مجھ سے معافی چاہتی ہو نہ۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ تم پریم کی دیوی ہو۔ محبت کی مورت۔ بے عیب۔ بے خطا۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ تم اتنی تلون طبع ہو۔ عشاق کے نصیبوں میں آرام کہاں۔ تمھارے تلون نے مجھے بدحواس کر دیا ہے۔ مجھے اب بھی وہم ہو رہا ہے کہ میں گائتری دیوی سے باتیں کر رہا ہوں یا رادھا رانی سے۔ میں اپنے آپ کو بھول گیا ہوں۔ میرے دل کو ایسا سخت صدمہ پہنچا ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ دیکھوں کہ مجھے کبھی صحت ملتی ہے یا نہیں۔ جس پریم اور بھگتی کو میں نے اٹل سمجھا تھا وہ بالو کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور نکلی۔ اس پر میں نے جو پودا نصب کیا تھا جو باغ لگایا تھا سب غرقاب ہوگیا۔ آہ۔ میں کیسا دلکش خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ پریم کا باغ کبھی پھولے پھلے گا۔ ہم اور تم دنیا کے مایاجال سے الگ ہوکر برندابن کے کسی کنج میں بیٹھے ہوئے بھگتی کا لطف اٹھائیں گے۔ اپنے پریم کے نغموں سے درختوں کے کنجوں کو ترنم ریز کردیں گے۔ ہمارے ان نغموں سے جمنا کی لہریں گونجنے لگیں گی۔ میں کرشن کا چاکر بنوں گا۔ تم ان کے لیے پکوان بناؤ گی۔ دنیا سے الگ۔ زندگی کے جھگڑوں سے دور۔ ہم اپنا آشیانہ بنائیں گے اور رادھا کرشن کی اٹل بھگتی میں زندگی کے دن کاٹ دیں گے۔ یا اپنے ہی کرشن مندر میں رادھا کرشن کے چرنوں سے لگے ہوئے اس عالمِ فانی سے رخصت ہوجائیں گے۔ اسی نیک ارادہ کو رکھتے ہوئے میں نے آپ کی ریاست کا اور یہاں کا انتظام مکمل کیا۔ مگر اب ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ کہ وہ ساری حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ جائیں گی اور میں جلد ہی اس دنیا سے نامراد اور دل شکستہ رخصت ہوجاؤں گا۔ گائتری نے پُرجوش خلوص کے ساتھ کہا۔ بھگوان ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ میں

کمزور عورت ہوں۔ جہالت کی تاریکی میں پڑی ہوئی۔ رواجی عقیدوں کے سامنے جھک جاتی ہوں۔ مگر میں نے تمھارا دامن پکڑا ہے تمھارے زیرِ پناہ ہوں۔ تمھیں میری کمزوریوں اور تنگ خیالیوں سے درگزر کرنا پڑے گا۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ تمھارے قدموں سے لگی رہوں۔ میں بھی دنیا سے منہ موڑ لوں گی۔ سب سے ناتا توڑ دوں گی اور تمھارے ساتھ برسانہ اور برندابن کی گلیوں میں گشت کروں گی۔ مجھے اگر کوئی دنیاوی فکر ہے تو یہ ہے کہ میرے بعد علاقہ کا انتظام قابل ہاتھوں میں رہے۔ میری رعایا پر ظلم نہ ہو اور ریاست کی آمدنی کارِخیر میں صرف ہو۔ میرا اور تمھارا گزر دس بارہ ہزار روپے سالانہ میں بخوبی ہوجائے گا۔ مجھے اور کچھ نہ چاہیے۔ ہاں یہ خواہش ضرور ہے کہ میری یاد قائم رہے۔ میرا نام زندہ رہے۔ لوگوں میں میرا بکھان ہوتا رہے۔ یہی فکر ہے جو اب تک میرے پیروں کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔ آپ اس زنجیر کو توڑ دیں۔ یہ بار میں آپ ہی کے اوپر ڈالتی ہوں۔ جیوں ہی آپ ان دونوں باتوں کا انتظام کردیں گے وہیں میں بے فکر ہوجاؤں گی اور پھرتمام عمر ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ایک ٹرسٹ قائم کردیجیے۔ میرے سوامی کی بھی یہی خواہش تھی۔

گیان۔ ٹرسٹ قائم کرنا تو آسان ہے پر مجھے امید نہیں کہ اس سے آپ کا مقصد پورا ہو۔ میں پہلے بھی دو ایک بار ٹرسٹ کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرچکا ہوں۔ آپ اپنی مرضی کے مطابق کتنے ہی بے لوث اور نیک نیت ٹرسٹیوں کو مقرر کریں۔ لیکن موقع پاتے ہی وہ اپنے گھر بھرنے پر آمادہ ہوجائیں گے۔ انسانی فطرت عجیب چیز ہے۔ آپ کسی کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتیں کہ اس کی نیت کبھی فاسد نہ ہوجائے گی۔ وہ جادہ راستی سے کبھی منحرف نہ ہوگا۔ ہم لوگ تو برندابن میں بیٹھے ہوں گے۔ یہاں رعایا پر انواع واقسام کے مظالم ہوں گے۔ کون ہے جو ان کی فریاد سنے گا؟ سدا برت کی رقم ناچ مجرے میں صرف ہوگی۔ اس لیلا کی رقم گارڈن پارٹیوں میں خرچ کی جائے گی۔ مندر کے آرائش کے سامان ٹرسٹیوں کے دیوان خانوں میں نظر آئیں گے۔ سادھو مہاتماؤں کی خاطرو مدارات کے بجائے یار لوگوں کی دعوتیں ہوں گی۔ آپ کو نیک نامی کے بجائے بدنامی ملے گی۔ یوں توکہیے۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کردوں۔ مگر ٹرسٹیوں پر میرا ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔ آپ کا

مقصد جبھی پورا ہوگا جب ریاست کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں ہو جو آپ کا احترام کرتا ہو۔ جسے آپ سے عقیدت ہو۔ جو آپ کا احسان مانے۔ جو دل سے آپ کے نیک ارادوں کی قدر کرتا ہو۔ جو خود آپ ہی کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ جس کے دل میں رحم اور محبت ہو۔ اور یہ سارے اوصاف اسی شخص میں ہوسکتے ہیں جسے آپ اپنے ہی لڑکے کی طرح چاہتی ہوں اور جو آپ کو اپنی ماں سمجھتا ہو۔ اگر آپ کو ایسا کوئی لڑکا نظر آئے تو میں مشورہ دوں گا کہ آپ اسے گود لے لیجیے۔ اس سے بہتر مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ لوگوں کو کچھ دنوں تک اس کی نگرانی کرنی پڑے مگر اس کے بعد ہم بالکل آزاد ہوجائیں گے۔ جبھی ہمارے آنند اور بہار کے دن ہوں گے۔ میں اپنی پیاری رادھا کے گلے میں پریم کا ہار ڈالوں گا۔ اسے پریم کے نغمے سناؤں گا دنیا کی کوئی فکر کوئی الجھن۔ کوئی جھونکا۔ ہمارے پرلطف سکون میں مخل نہ ہوسکے گا۔

گائتری خوش ہوگئی۔ اس سرور انگیز زندگی کا تصور اس کے آنکھوں میں پھر گیا۔ اس کی طبیعت لہرا اٹھی۔ اس وقت اسے اپنے شوہر کی وہ وصیت یاد نہ رہی جو انھوں نے جائداد کی نسبت کی تھی اور جس پر گیان شنکر کا اعتراض سن کر وہ کئی بار گرم ہو پڑی تھی۔ وہ ٹرسٹ کے حسن و قبح پر خود کچھ بھی نہ غور کرسکی۔ گیان شنکر کا قول فیصل تھا۔ ٹرسٹ پر سے اس کا اعتبار جاتا رہا۔ بولی۔ آپ کا کہنا درست ہے۔ ٹرسٹیوں کا کیا اعتبار۔ انسان کسی کے دل میں تو بیٹھ نہیں سکتا۔ اندر کا حال کیا معلوم۔

وہ دو تین منٹ تک سوچتی رہی کہ ایسا کون لڑکا ہے جسے میں گود لے سکوں۔ اس نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا دل ہی دل میں جائزہ لیا مگر یہ عقدہ حل نہ ہوا۔ لڑکے تھے ایک نہیں کئی۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ گائتری کی نگاہوں میں نہ جچتے تھے۔ سوچتے سوچتے وہ یکایک چونک پڑی اور مایاشنکر کا نام اس کی زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ گیان شنکر نے اب تک اپنے دلی ارادہ کو ایسا پوشیدہ رکھا تھا اور اپنی وضعداری کو ایسا نباہا تھا کہ پہلے تو مایاشنکر کی طرف گائتری کا دھیان ہی نہ گیا اور جب گیا تو اسے اپنا منشا ظاہر کرتے ہوئے خوف ہوتا تھا کہ کہیں گیان شنکر کے احساسات کو چوٹ نہ لگے۔ حالانکہ گیان شنکر کا اشارہ صاف تھا۔ مگر گائتری پر اس وقت وہ نشہ تھا جو شراب اور پانی میں امتیاز

نہیں کر سکتا۔ اس نے کئی بار ہمت کی کہ یہ تذکرہ چھیڑوں مگر گیان شنکر کے بشرے سے ایک ایسا استغناء کا اظہار ہو رہا تھا۔ کہ اس کی زبان نہ کھل سکی۔ اب مایاشنکر کی سلیم الطبعی اس کی ذہانت و فراست۔ اس کے اخلاق وآداب وغیرہ اسے یاد آنے لگے۔ اس سے بہتر وارث کا ملنا غیر ممکن تھا۔ گیان شنکر اس شش و پنچ میں پڑا ہوا دیکھ کر بولے۔ آیا کوئی لڑکا خیال میں؟ گائتری شرماتی ہوئی بولی۔ جی ہاں آیا تو۔ پر معلوم نہیں کہ آپ بھی اسے پسند کریں گے یا نہیں۔ میں اس سے بہتر انتخاب نہیں کر سکتی۔

گیان۔ سنوں۔ کون ہے۔

گائتری۔ وعدہ کیجیے کہ آپ اسے منظور کریں گے۔

گیان شنکر کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ بولے۔ بغیر جانے میں ایسا وعدہ کیوں کر سکتا ہوں۔

گائتری۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو اعتراض ہوگا اور وِدّیا تو کسی طرح راضی ہی نہ ہوگی۔ لیکن اس لڑکے کے سوا میری نظر اور کسی پر پڑتی ہی نہیں۔

گیان شنکر اپنی دلی مسرّت کو چھپاتے ہوئے بولے۔ سنوں تو۔ وہ خوش نصیب کون ہے۔

گائتری۔ بتادوں؟ برا تو نہ مانیے گا؟

گیان۔ ذرا بھی نہیں۔ کہیے۔

گائتری۔ مایا شنکر۔

گیان شنکر۔ اس طرح چونک پڑے گویا ان کے کانوں کے پاس کوئی بندوق داغ دی گئی ہو۔ تعجب بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس انداز سے بولے گویا گائتری نے ان سے مذاق کیا ہو۔ مایاشنکر؟

گائتری۔ ہاں۔ آپ وعدہ کر چکے ہیں ماننا پڑے گا۔

گیان۔ میں نے کہا تھا کہ نام سن کر رائے دوں گا۔ اب نام سن لیا اور مجبوراً کہتا ہوں کہ میں آپ سے متفق نہیں ہوسکتا۔

گائتری۔ میں تو یہ بات پہلے ہی سے جانتی تھی۔ مگر مجھ میں اور آپ میں جو تعلق ہے اسے دیکھتے ہوئے آپ کو اعتراض نہ کرنا چاہیے۔

گیان۔ مجھے خود کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو اپنا سب کچھ آپ پر نثار کرچکا ہوں۔ لڑکا بھی آپ کی نذر ہے۔ لیکن آپ کو میرے خاندانی وقار کا حال معلوم ہے۔ بنارس میں اتنا ممتاز کوئی دوسرا خاندان نہیں ہے۔ مفلوک ہونے پر بھی اس کی پرانی امارت باقی ہے۔ میرے چچا صاحب نیز دیگر اعزا اسے پسند نہ کریں گے اور وِدّیا تو سن کر زہر کھانے پر آمادہ ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ میری بدنامی بھی ہے۔ ممکن ہے لوگ یہ سمجھیں کہ میں نے آپ کی فیاضی اور سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اور آپ کے گھرانے کے لوگ تو میری جان کے خواہاں ہوجائیں گے۔

گائتری۔ میرے گھرانے کی طرف سے تو آپ بے فکر رہیے۔ میں انھیں آپس میں لڑا کر ماروں گی۔ بدنامی اور رسوائی آپ کو میری خاطر سے گوارا کرنی پڑے گی۔ رہی وِدّیا۔ اسے میں راضی کرلوں گی۔

گیان۔ نہیں اس سے یہ امید نہ رکھیے۔ آپ اسے راضی کرلینا آسان سمجھ رہی ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ آپ نے اس کے تیور نہیں دیکھے۔ وہ اس وقت سوتیا ڈاہ سے جل رہی ہے۔ اسے امرت بھی دیجیے تو زہر سمجھے گی۔ جب تک لکھا پڑھی نہ ہوجائے اور سارے مراسم ادا نہ ہوجائیں اس کے کانوں میں اس کی بھنک بھی نہ پڑنی چاہیے۔ مگر یہ تو سب ہوگا۔ ان لوگوں کا صبر کس پر پڑے گا۔ جو برسوں سے ریاست پر دانت لگائے بیٹھے ہیں؟ ان کے گھرانے میں تو کہرام مچ جائے گا۔ سب کے سب میرے خون کے پیاسے ہوجائیں گے۔ اگرچہ مجھے ان سے کوئی خوف نہیں ہے لیکن دشمن کو کبھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔ ہم جس کی دولت اور زمین چھین لیں اس کی جانب سے کبھی مطمئن نہیں رہ سکتے۔

گائتری۔ آپ ان حریصوں کا خیال نہ کیجیے۔ یہ کتے ہیں جو ایک چھیچھڑے پر لڑمریں گے۔

گیان شنکر کچھ دیر تک خاموش ہوکر زمین کی طرف تاکتے رہے۔ جیسے کوئی بڑی قربانی کر رہے ہوں۔ پھر آب دیدہ ہو کر بولے۔ جیسی آپ کی مرضی آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ایشور سے یہی دعا ہے کہ یہ لڑکا آپ کو مبارک ہو۔ اور اس سے آپ کو جو امیدیں ہیں وہ پوری ہوں۔ ایشور اسے توفیق دے کہ وہ آپ کے نقشِ قدم پر چلے۔ وہ آج سے میرا نہیں۔ آپ کا لڑکا ہے۔ اگرچہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے پہلو سے جدا کرتے

ہوئے میرے دل پر جو گزر رہی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں لیکن سری برندابن بہاری نے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا کرکے گویا ہمارے لیے بھگتی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔

گائتری نے گیان شنکر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ کل ہی کسی پنڈت سے شبھ مہورت پوچھ لیجیے۔

(۵۰)

رات کے آٹھ بجے تھے۔ گیان شنکر کے دیوان خانہ میں شہر کے کئی معزز آدمی جمع تھے۔ درمیان میں ایک آہنی ہون کنڈ رکھا تھا جس میں ہون ہورہا تھا۔ ہَون کُنڈ کے ایک طرف گائتری بیٹھی تھی۔ دوسری طرف گیان شنکر اور مایا۔ ایک پنڈت جی وید منتر پڑھ رہے تھے۔ گائتری کا چمپئی رنگ آگ کے شعلوں سے منور ہوکر کندن ہو رہا تھا۔ فیروزی رنگ کی ساری اس کے بدن پرخوب کھِل رہی تھی۔ سارے مجمع کی آنکھیں اسی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ مایا کے گود لینے کی تقریب تھی۔ وہ گائتری کا دھرم پُتر بن رہا تھا۔ کچھ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کیسا خوش نصیب لڑکا ہے۔ لاکھوں کی جائداد کا مالک بنایا جا رہا ہے۔ یہاں توآج تک کبھی ایک پیسہ بھی پڑا ہوا نہ ملا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے۔ گیان شنکر ایک ہی بنا ہوا آدمی ہے۔ کیسا چنگ پر چڑھایا کہ جائداد لے ہی کر چھوڑی۔ اب معلوم ہوا کہ حضرت نے یہ سارا سوانگ کس لیے رچایا تھا۔ یہ جٹائیں اسی دن کے لیے بڑھائی تھیں۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ گیان شنکر اس سے بھی زیادہ سیاہ باطن شخص ہے۔

لالہ پربھاکر شنکر نے پہلے اس تجویز کو سنا تو بہت برہم ہوئے۔ لیکن جب گائتری نے نہایت انکسار کے ساتھ ساری داستان کہہ سنائی تو وہ بھی نیم راضی ہوگئے۔ ہَون کے بعد دعوت ہوئی۔ دعوت کا سارا انتظام انھیں کے ذمہ تھا۔ ان کی رضامندی کو مکمل بنانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ انھیں اختیارِ کامل دے دیا گیا تھا کہ وہ جس قدر چاہیں صرف کریں اور جن جن کھانوں کو ضروری سمجھیں انھیں تیار کرائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس موقع پر اپنا سارا مطبخی کمال صرف کردیا تھا۔ اس وقت خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ لوگوں کے منہ سے کھانوں کی تعریفیں سن سن کر وہ اپنے جامہ

میں پھولے نہ سماتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کے لیے کھانا عموماً ایک ناگوار فرض تھا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ہر چیز کو تول ناپ کر کھاتے تھے۔ مگر آج یہاں کے ملذّذ طعام نے کم اور زیادہ اشتہا والے لوگوں میں کوئی فرق باقی نہ رکھا تھا۔ رغبت نے کمزور ہاضمہ کو بھی قوی بنا دیا تھا۔

دعوت ختم ہونے پر گانا شروع ہوا۔ الہ دین ایک ہفت سالہ لڑکا تھا لیکن فنِ موسیقی کا ماہر کامل۔ یہ اس کا وہی کمال تھا۔ جل ترنگ۔ طاؤس۔ ستار۔ سروج۔ سارنگی۔ پکھاوج۔ ان سبھی باجوں پر اسے استادانہ قابو تھا۔ لوگ اس کے اس سن و سال پر اس زبردست کمال کو دیکھ کر متحیر ہوجاتے تھے۔ جب بڑے بڑے استادوں نے ایک ایک باجا پر پورا قابو حاصل کرنے میں اپنی عمریں گزار دی تھیں وہ بھی اس کے ہاتھوں کی صفائی اور نزاکت پر سر دھنتے تھے۔ اس وقت تمام ہندستان میں اس کی شہرت تھی گویا اس نے اپنی فتح کا سکّہ سارے ملک پر جما دیا تھا۔ گیان شنکر نے اس تقریب پر اسے کلکتہ سے بلایا تھا۔ وہ بہت کمزور۔ بے ڈھنگا اور بدصورت سا لڑکا تھا۔ مگر اس کا کمال اس کی شکل کو دلکش بنائے ہوئے تھا۔ اس کی آواز میں کوئل کی آواز کا سا لوچ تھا۔ کل مجمع محو ہو رہا تھا۔

یہاں تو ساز و سامان تھے اور اُدھر وِدّیا اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ طبلہ کی ایک ایک تھاپ اس کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگتی تھی۔ وہ ایک خوددار۔ متین۔ صابر و شاکر عورت تھی۔ اگرچہ شوہر کی خودغرضانہ رفتار سے اُسے نفرت تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ اپنے شوہر کی خدمت گزاری اپنا خاص فرض سمجھتی تھی۔ مگر جب سے اس نے رائے صاحب کی زبان سے اپنے شوہر کی خباثت کی داستان سنی تھی اس وقت سے اس کی دلی عقیدت میں فرق ہوگیا تھا۔ رات کے شرمناک نظارہ سے رہی سہی عقیدت بھی مٹ گئی تھی۔ جب گیان شنکر کو روتے دیکھ کر گائتری دیوان خانہ کے دروازہ تک آکر پھر ان کے پاس واپس چلی گئی تھی تو وِدّیا وہاں نہ ٹھہر سکی۔ وہ ایک مجنونانہ طیش کی حالت میں تیزی سے اوپر چلی گئی اور اپنے کمرہ میں پہنچ کر وہیں فرش پر گر پڑی۔ یہ حسد کا جذبہ نہ تھا جس میں کینہ ہوتا ہے۔ یہ انتقام کا جذبہ بھی نہ تھا جس میں کینہ ہوتا ہے یہ انتقام کا جذبہ بھی نہ تھا جو خون آشام ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو

جلانے والی آگ تھی۔ یہ وہ غصہ جو اپنا ہی ہونٹ چباتا ہے۔ اپنی ہی کھال نوچتا ہے۔ اپنے ہی اعضا کو دانتوں سے کاٹتا ہے۔ وہ فرش پر پڑی ہوئی تمام رات روتی رہی۔ اب میں کس کی ہو کر رہوں؟ میرا شوہر نہیں۔ میرا گھر اب میرا گھر نہیں۔ میں اب اناتھ ہوں۔ کوئی میرا پوچھنے والا نہیں۔ پرمیشور۔ تم نے مجھے کس گناہ کی یہ سزا دی ہے؟ میں نے تو اپنی دانست میں کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ تم نے مجھے کیوں تباہ کردیا؟ میرا سہاگ کیوں لٹ گیا؟ یہی میرے پاس ایک دولت تھی۔ اسی کا مجھے غرور تھا۔ اسی پر مجھے بھروسا تھا۔ تم نے میرا غرور توڑ دیا۔ سہارا چھین لیا۔ جب آگ ہی نہ رہی تو راکھ کس کام کی۔ یہ سہاگ کی پٹاری ہے۔ یہ سہاگ کی ڈبیا ہے۔ انھیں لے کر کیا کروں؟ وِدّیا نے سہاگ کی پٹاری طاق پر سے اتار لی اور اسی یاس وجنون کی حالت میں اس کی ایک ایک چیز نکال کر کھڑکی سے نیچے باغ میں پھینک دی۔ کتنا دردناک نظارہ تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ اپنی چوڑیاں توڑ توڑ کر زمین پر پھینک رہی تھی۔ یہ اس کے کمزور غصہ کی انتہا تھی۔ وہ ایک امیر کی لڑکی تھی۔ یہاں اسے اتنا آرام بھی نہ تھا جو اس کے میکے کی مہریوں کو تھا۔ لیکن اس کے مزاج میں صبروتوکل تھا۔ وہ اپنی تقدیر پر قانع تھی۔ گیان شنکر خودغرض تھے۔ حریص تھے۔ بے درد تھے۔ اپنے فرض سے غافل تھے۔ اس کا اسے رنج تھا۔ مگر وہ پھر بھی اپنے تھے۔ ان کو سمجھانے بجھانے کا انھیں نشانہ ملامت بنانے کا اسے اختیار تھا۔ ان کی خباثت۔ کم ظرفی۔ نفس پرستی کا حال سن کر اس کے بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ وہ لکھنو سے برقِ بلا بن کر آئی تھی۔ وہ گیان شنکر پر تڑپنا اور ان کی ہوسناکیوں کو جلاکر خاک سیاہ کر دینا چاہتی تھی۔ وہ انھیں طعن وتشنیع کے تیروں سے چھیدنا اور اپنی سخت کلامیوں سے ان کے دل کو زخمی کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت تک اسے اپنے سہاگ کا غرور تھا۔ رات کے آٹھ بجے تک وہ گیان سنکر کو اپنا سمجھتی تھی۔ اسے ان کو نادم اور ذلیل کرنے کا حق تھا کیونکہ وہ اپنے تھے۔ ہم سے اپنے گھر میں آگ لگتے نہیں دیکھا جاتا مگر جب کسی وجہ سے وہ گھر اپنا نہ رہے تو پھر خواہ آگ کے شعلے آسماں تک بلند ہوں ہم کو رنج نہیں ہوتا۔ رات کے نفرت انگیز نظارہ نے وِدّیا کے دل سے اس اپنے پن کو مٹا دیا تھا۔ اب اسے غم تھا تو اپنی بدنصیبی کا۔ رنج تھا تو اپنی بیکسی کا۔ اس کی حالت بالکل اس پتنگ کی سی تھی جس کی ڈور ٹوٹ گئی ہو یا اس درخت کی سی جس کی جڑ

کٹ گئی ہو۔

ودّیا ساری رات اسی خلجان میں پڑی رہی۔ کبھی سوچتی کہ لکھنو چلی جاؤں اور وہیں زندگی کے دن کاٹوں۔ کبھی سوچتی کہ زندہ رہ کر کرنا ہی کیا ہے۔ ایسی زندگی سے تو موت کیا بری ہے؟ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ دن چڑھ آیا۔ مگر اس کا اٹھنے کا جی نہ چاہتا تھا۔ اتنے میں شردھا آکر کھڑی ہوگئی اور اس کے اداس چہرہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ کیا آج ساری رات جاگتی ہی رہیں کیا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔

ودّیا نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ ہاں آج نیند نہیں آئی۔

شردھا۔ گائتری دیوی سے کچھ بات چیت نہیں ہوئی؟ مجھے تو ڈھنگ ہی نرالے نظر آتے ہیں۔ تم ان کی بڑی تعریف کیا کرتی تھیں۔

ودّیا۔ کیوں؟ کوئی نئی بات دیکھی کیا؟

شردھا۔ روز ہی دیکھتی ہوں۔ لیکن رات کو جو تماشا دیکھا اور جو باتیں سنیں اُسے بیان کرتے شرم آتی ہے۔ کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ مجھے اپنے کمرہ میں پڑے پڑے نیچے کسی کے بول چال کی آہٹ ملی۔ میں ڈری کہ کہیں چور نہ آئے ہوں۔ آہستہ سے اٹھ کر نیچے گئی۔ دیوان خانہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ میں نے شیشہ سے اندر جھانکا تو دل میں کٹ کر رہ گئی۔ اب تم سے کیا کہوں۔ میں گائتری کو اتنا بے غیرت نہ سمجھتی تھی۔ کہاں تو کرشن کی اُوپاسنا کرتی ہے۔ بھگتن بنتی ہے۔ اور کہاں یہ چھچھورا پن۔ میں تو انھیں دیکھتے ہی اپنے دل میں کھٹک گئی تھی پر یہ نہ جانتی تھی کہ اتنے گہرے پانی میں ہیں۔

ودّیا۔ میں نے بھی کچھ ایسا تماشا دیکھا تھا۔ تم میرے چلے آنے کے بہت دیر بعد گئی تھیں۔ مجھے لکھنؤ ہی میں ساری کتھا معلوم ہوگئی تھی۔ بدانجامی کو روکنے ہی کی غرض سے میں یہاں دوڑی آئی۔ مگر یہاں کا رنگ دیکھ کر مایوس ہوگئی۔ یہ لوگ اب منجدھار میں پہنچ چکے ہیں اور انھیں بچانا مشکل ہے۔ لیکن میں پھر کہوں گی کہ اس میں گائتری کا قصور نہیں۔ ساری کرتوت انھیں حضرت کی ہے جو جٹا بڑھائے اور پیتامبر پہنے ہوئے بھگت جی بنے پھرتے ہیں۔ گائتری بے چاری سیدھی سادی عورت ہے۔ اس کی طبیعت دھرم کی جانب خصوصاً مائل ہے۔ اسی لیے یہ حضرت بھی بھگت بن

بیٹھے اور انھوں نے یہ سوانگ بھر کر اس پر اپنا جادو ڈالا۔ ایسا خبیث آدمی دنیا میں نہ ہوگا۔ بہن تم سے دل کی بات کہتی ہوں۔ مجھے ان کی صورت سے نفرت ہوگئی ہے۔ مجھ پر ایسا وار کیا گیا ہے کہ میرا بچنا مشکل ہے۔ اس بھاری پاپ کا ڈنڈ ضرور ملے گا۔ ایشور نہ کرے کہ مجھے ان آنکھوں سے گھر کو تباہ ہوتے دیکھنا پڑے۔ دو سونے کی گھڑی ہوگی جب اس دنیا سے میرا ناتا ٹوٹ جائے گا۔

شردھا۔ کسی کی برائی کرنا اچھا تو نہیں ہے اور اس لیے میں اب تک سب کچھ دیکھتی ہوئی بھی اندھی ہی رہی۔ مگر اب بغیر بولے ہوئے نہیں رہا جاتا۔ میرا بس چلے تو ایسی حرام زادیوں کا سر کٹوا لوں۔ یہ بھولا پن نہیں ہے۔ بے حیائی ہے۔ دکھانے کے لیے بھولی بنی بیٹھی ہوئی ہیں۔ مرد ہزار رسیا ہو۔ ہزار چالاک ہو۔ ہزار ڈورے ڈالے مگر ستی (پاک باز) عورتوں پر ان کا ایک منتر بھی نہیں چل سکتا۔ وہ آنکھ ہی کیا جو ایک نگاہ میں مرد کی چال ڈھال کو نہ تاڑ لے۔ جلانا آگ کا گن ہے پر ہری لکڑی کو بھی کسی نے جلتے دیکھا ہے؟ حیا عورتوں کی جان ہے۔ اس کے بغیر وہ سوکھی لکڑی ہے جنھیں آگ کی ایک چنگاری جلاکر راکھ کر دیتی ہے۔ اسے اپنے شوہر کی آتما پر بھی ترس نہ آیا۔ اسے کتنا صدمہ ہو رہا ہوگا۔ اس کے آنے سے میرا گھر ناپاک ہوگیا۔ رات کو ان دونوں کی باتوں کی بھنک جو میرے کان میں پڑی اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گائتری مایا کو گود لینا چاہتی ہے۔

وِدّیا نے سہمی ہوئی آواز سے کہا۔ مایا کو؟

شردھا۔ ہاں۔ آج شاید اس کی تیاری ہے۔ شہر والوں کو مدعو کیا جا رہا ہے۔

وِدّیا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے نظر آئے۔ جیسا کہ مٹر کی پھلی میں دانے ہوتے ہیں۔ بولی۔ بہن تب تو میری ناؤ ڈوب گئی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب میری سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ اس مکار نے اسی لیے یہ جال پھیلایا تھا۔ اسی لیے اس نے یہ سوانگ بھرا تھا۔ اسی نیت سے اس نے گائتری کی غلامی کی تھی۔ میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی۔ کتنا سمجھایا۔ کتنا منع کیا پر اس نے میری ایک بھی نہ سنی۔ اب معلوم ہوا کہ اس کے دل میں کیا ٹھنی تھی۔ آج سات برس سے یہ اسی دھن میں پڑا ہوا ہے۔ ابھی تک میں یہی سمجھتی تھی کہ گائتری کے رنگ روپ بناؤ سنگار بات چیت پر وہ ریجھ گیا

ہے۔ یہ کام برا ہونے پر بھی نفرت کے قابل نہیں ہے۔ جو شخص پریم کرسکتا ہے اس میں دیا دھرم وغیرہ اچھی باتوں کا ابھاؤ نہیں ہوجاتا۔ پریم کی روشنی اس کے دل کو منور کرتی رہتی ہے۔ لیکن جو شخص پریم کا سوانگ بھر کر اس سے مطلب نکالنا چاہتا ہے۔ جو ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلتا ہے اس سے زیادہ کمینا آدمی کوئی ہو نہیں سکتا۔ پریم جیسے پاک جذبہ کی تحقیر کرتا ہے۔ اس کا پاپ چھما نہیں ہوسکتا۔ میں بے چاری گائتری کو اب بھی بے خطا سمجھتی ہوں۔ بہن اب اس خاندان کے تباہ ہونے میں دیر نہیں ہے۔ جہاں اتنا اُدھرم اتنا پاپ۔ اتنی مکّاری ہو وہاں کی خیر نہیں۔ اب مجھے اپنے پتاجی کی چتاونی یاد آرہی ہے۔ انھوں نے چلتے وقت مجھے کہا تھا کہ اگر تو نے یہ آگ نہ بجھائی تو تیرے خاندان کا ستیاناس ہوجائے گا۔ ہاں میرے رونگٹے کھڑے ہورہے ہیں۔ بے چارے مایا پر کیا بیتے گی؟ یہ حرام کا مال۔ یہ حرام کی جائداد اس جان کی گاہک ہوجائے گی۔ اسے سانپ بن کر ڈس لے گی۔ بہن میرا کلیجہ بیٹھا جاتا ہے۔ میں اپنے مایا کو اس آگ سے کیسے بچاؤں؟ وہ میری آنکھوں کی پتلی ہے۔ میری زندگی کا سہارا ہے۔ یہ خونخوار دیو یہ قصائی میرے لال کی گردن پر چھری چلارہا ہے۔ اسے کیسے اپنی گود میں چھپالوں؟ اسے کیسے اپنے دل میں بٹھالوں؟ باپ ہوکر اسے زہر دے رہا ہے۔ پاپ کا اگن کنڈ جلا کر اس میں میرے لال کو جھونکے دیتا ہے۔ اپنی آنکھوں سے یہ تباہی نہیں دیکھ سکتی۔ بہن تم سے کہتی ہوں۔ لڑکے کے جنم کے بعد اس پاپی نے نہ جانے کیا کھلا کر میری کوکھ ہرلی۔ نہ جانے کون سا اُنشٹھان کرا دیا۔ وہی زہر اس نے پہلے ہی کھلا دیا ہوتا۔ وہی اُنشٹھان پہلے ہی کرا دیا ہوتا تو آج یہ دن کیوں آتا۔ بانجھ رہنا اس سے کہیں اچھا ہے کہ اولاد گودی سے چھن جائے۔ ہائے۔ میرے لال کو کون بچائے گا؟ میں اب اسے نہیں بچاسکتی۔ آگ کی لہریں اس کی طرف دوڑی چلی آتی ہیں۔ بہن تم جاکر اس بے درد کو سمجھاؤ اگر اب بھی ہو سکے تو میرے مایا کو بچالو۔ نہیں۔ یہ اب تمھارے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ دیو اب کسی کے سمجھانے سے نہ مانے گا۔ اس نے من میں ٹھان لیا ہے کہ آج ہی سب کچھ کر ڈالوں گا۔

یہ کہتے کہتے وہ اٹھی اور کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگی۔ دیوان خانے کے سامنے والے صحن کی صفائی ہورہی تھی۔ دریاں جھاڑی جارہی تھیں۔ اس کی آنکھیں مایا کو کھوج رہی تھیں۔ وہ مایا کو اپنے پہلو سے چمٹانا چاہتی تھی۔ مایا کہیں نظر نہ آیا۔ اسی اثنا میں موٹر صحن

میں آیا۔ گائتری اور گیان شنکر اس میں بیٹھے۔ مایا بھی ایک منٹ میں دیوان خانہ سے نکلا اور موٹر میں جا بیٹھا۔ ودّیا نے بے اختیار ہوکر پکارا۔ مایا۔ مایا۔ یہاں آؤ۔ لیکن یا تو مایا نے سنا نہیں یا سن کر دھیان نہیں دیا۔ وہ کھڑی پکارتی ہی رہی اور موٹر ہوا ہوگیا۔ ودّیا کو ایسا معلوم ہوا گویا پانی میں پیر پھسل پڑے۔ وہ اسی دم پچھاڑ کھاکر گر پڑی۔ لیکن شردھا نے سنبھال لیا۔ چوٹ نہیں آئی۔

ذرا دیر تک ودّیا غشی کی حالت میں پڑی رہی اور شردھا اس کا سر گود میں لیے بیٹھی روتی رہی۔ میں اپنے ہی کو ابھاگنی سمجھتی تھی۔ اس دکھیا کی مصیبت اور بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ کسی طرح انھیں (پریم شنکر) ان باتوں کی خبر ہوتی تو وہ ضرور گائتری کو سمجھاتے۔ گائتری ان کی عزّت کرتی ہے۔ شاید مان جاتی ۔ لیکن ان حضرت کے سامنے ان کی ملاقات بھی تو گائتری سے نہیں ہوسکتی۔ اسی اندیشہ سے تو گھر کے باہر نکل گئے ہیں کہ کام میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ کچھ نہیں۔ یہ سب اسی کی بھول ہے۔ جیوں ہی میں نے اس سے گود لینے کی بات کہی۔ اسے اسی دم باہر جاکر لوگوں کو ملامت کرنا اور مایا کا ہاتھ پکڑ کر اسے یہاں کھینچ لانا چاہیے تھا۔ مجال تھی کہ میرے لڑکے کو کوئی مجھ سے چھین لے جاتا۔ دفعتاً ودّیا نے آنکھیں کھول دیں اور کمزور لہجہ میں کہا۔ بہن۔ اب کیا ہوگا۔

شردھا۔ ہونے کو تو اب بھی کچھ ہوسکتا ہے مگر کرنے والا چاہیے۔

ودیا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ سب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چاچا جی بھی نہ جانے کیسے راضی ہوگئے۔

شردھا۔ میں ذرا جاکر کہاروں سے پوچھتی ہوں کہ کب تک آنے کو کہہ گئے ہیں۔

ودّیا۔ شام ہونے کے پہلے وہ کبھی نہ لوٹیں گے۔ مایا کو ہٹا دینے کے لیے ہی یہ چال چلی گئی ہے۔ ان لوگوں نے جو بات دل میں ٹھان لی ہے وہ ہوکر رہے گی۔ پتا جی کی بددعا میرے آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ بات ہونی ہے اور ہوگی۔

شردھا۔جب تمھاری یہی حالت ہے تو جو کچھ نہ ہوجائے وہ تھوڑا ہے۔

ودیا نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔ بھلا میرے بس کی کون سی بات ہے؟

شردھا۔ بس کی بات کیوں نہیں ہے۔ ابھی شام کو جب وہ لوگ لوٹیں تو نیچے چلی جاؤ اور مایا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لاؤ۔ وہ نہ مانے تو ساری باتیں کھول کر اس سے کہہ دو۔

سمجھدار لڑکا ہے۔ فوراً ادھر سے اس کا دل پھر جائے گا۔
وڈیا۔ (سوچ کر) اور اگر وہ سمجھانے سے بھی نہ آوے؟ ان لوگوں نے اسے خوب سکھا
پڑھا رکھا ہوگا۔
شردھا۔ تو رات کو جب شہر کے لوگ جمع ہوں۔ جاکر بھری مجلس میں کہہ دو کہ یہ سب
میری مرضی کے خلاف ہو رہا ہے۔ میں اپنے لڑکے کو گود نہیں دینا چاہتی۔ ابھی
لوگوں کی سب چالیں پٹ پڑجائیں۔ تمھاری جگہ میں ہوتی تو وہ بکھیڑا مچتا کہ ان کے
دانت کھٹے ہوجاتے۔ کیا کروں میرا کچھ اختیار نہیں ہے ورنہ انھیں تماشا دکھا دیتی۔
وڈیا نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ بہن۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ مجھ میں نہ اتنی طاقت ہے
اور نہ جرأت۔ اگر اور کچھ نہ ہو مایا ہی میری باتوں کو نہ مانے تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔
بھری مجلس میں جانا تو میرے لیے ناممکن ہے۔ ادھر پیر ہی نہ اٹھیں گے اور اٹھیں بھی
تو وہاں جا کر زبان بند ہوجائے گی۔
شردھا۔ پتہ نہیں۔ یہ لوگ کدھر گئے ہیں۔ گائتری ایک لمحہ کے لیے اکیلی مل جاتی تو ایک
بار میں بھی سمجھا دیتی۔
دیوان خانہ میں بزمِ طرب آراستہ تھی۔ ماسٹر الہ دین کا اعجاز لوگوں کو مسحور بنا رہا
تھا۔ دروازوں پر تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ صحن میں بھکاریوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع تھے۔ مایا
شنکر کو دن بھر کے بعد ماں کی یاد آئی۔ وہ آج خوشی سے جامہ میں پھولا نہ سماتا تھا۔ اس
کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ دوڑ دوڑ کر کام کر رہا تھا۔ گیان شنکر بار بار کہتے تھے کہ تم
آرام سے بیٹھو۔ اتنے آدمی تو ہیں پس تمھارے ہاتھ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر اس
سے نچلانہ بیٹھا جاتا تھا۔ کبھی لیمپ صاف کرنے لگتا کبھی خاصدان اٹھا لیتا۔ آج تمام دن
موٹر پر سیر کرتا رہا اورلوٹتے ہی پدم شنکر اور تیج شنکر سے اپنی سیر کا حال بیان کرنے لگا۔
یہاں گئے۔ وہاں گئے۔ یہ دیکھا وہ دیکھا۔ اسے مبالغہ میں بڑا لطف آرہا تھا۔ یہاں سے
فراغت ملی تو ہون پر جا بیٹھا۔ اس کے بعد بھوج میں شریک ہوگیا۔ جب گانا شروع ہوا تو
اس کی طبیعت یکسو ہوئی۔ سب لوگ محو ہو کر گانا سن رہے تھے۔ اس کی باتیں سننے والا
کوئی نہ تھا۔ اب اسے یاد آیا کہ ماں کو بندگی کرنے تو گیا نہیں۔ اوہو۔ اماں مجھے دیکھتے ہی
دوڑ کر چھاتی سے لگائیں گی۔ مجھے دعائیں دیں گی۔ میرے انَ ریشمی کپڑوں کی خوب

تعریف کریں گی۔ وہ خیالی پلاؤ پکاتا اور مسکراتا ہوا وڈّیا کے کمرے میں گیا۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک دھندلی سی دیوار گیری جل رہی تھی۔ وڈّیا پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ مہریاں نیچے گانا سننے چلی گئی تھیں۔ لالہ پربھاشنکر کے گھر کی مستورات کو نہ بلاوا دیا گیا تھا اور نہ وہ آئی تھیں۔ شردھا کمرے میں بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھی۔ مایا نے ماں کے قریب جاکر دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہونٹ نیلے پڑگئے تھے۔ اور چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے گھبراکر کہا اماں اماں۔ وڈّیا نے آنکھیں کھولیں اور ایک لمحہ تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ تھا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھی۔ مایا کو چھاتی سے لگا کر اس کا سر آنچل سے ڈھک لیا گویا اسے کسی کی زد سے بچا رہی ہو اور اکھڑی ہوئی آواز سے بولی۔ آؤ میرے پیارے لال تمھیں آنکھ بھر کر دیکھ لوں۔ تمھارے اوپر بہت دیر سے میرا جی لگا ہوا تھا۔ تمھیں لوگ اگن کنڈ کی طرف دھکیلے لیے جاتے تھے۔ میری چھاتی دھک دھک کر رہی تھی۔ بار بار پکارتی تھی۔ مگر تم سنتے ہی نہ تھے۔ بھگوان نے تمھیں بچالیا۔ وہی غریبوں کا رچھا کرنے والے ہیں۔ اب میں تمھیں نہ جانے دوں گی۔ یہیں میری آنکھوں کے سامنے بیٹھو۔ میں تمھیں دیکھتی رہوں گی۔ دیکھو دیکھو وہ تمھیں پکڑنے کے لیے دوڑا آتا ہے۔ میں کواڑ بند کیے دیتی ہوں۔ تمھارا باپ ہے مگر اسے تمھارے اوپر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ میں کواڑ بند کیے دیتی ہوں۔ تم بیٹھے رہو۔

یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ کی طرف چلی مگر پیر لڑکھڑائے اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ مایا اس کی حالت دیکھ کر اور اس کی بہکی بہکی باتیں سن کر تھرا گیا۔ خوف کے مارے وہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکا۔ تیر کی طرح کمرہ سے نکلا اور دیوان خانہ میں جا کر دم لیا۔ گیان شنکر مہمان کی تواضع وتکریم میں مصروف تھے۔ ان سے کچھ کہنے کا موقع نہ تھا۔ گائتری چق کی آڑ میں بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ اس الہٰ دین کو کیرتن کے لیے نوکر رکھ لوں تو اچھا ہو اور میرے مندر کی سارے ملک میں دھوم مچ جائے۔ مایا نے آکر کہا۔ ماسی جی آپ ذرا چل کر اماں کو دیکھیے۔ نہ جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں۔ انھیں ڈلیریَم (سرسام) سا ہوگیا ہے۔

گائتری کا کلیجہ سَن سے ہو گیا۔ وہ وڈّیا کے مزاج سے خوب واقف تھی۔ اسے یہ

خبر سن کر اس سے کہیں زیادہ اندیشہ ہوا جتنا معمولی حالتوں میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کل سے وڈیا کے بدلے ہوئے تیور دیکھ رہی تھی۔ رات کا واقعہ بھی اُسے یاد آیا۔ وہ زینہ کی طرف چلی۔ مایا بھی پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن اس کمرہ میں اُس وقت کتنی ہی چیزیں بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ گائتری نے کہا۔ تم یہیں بیٹھو ورنہ ان میں سے ایک چیز کا بھی پتہ نہ چلے گا۔ میں ابھی آتی ہوں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ شاید اسے بخار ہوگیا ہے۔

گائتری وڈیا کے کمرہ میں پہنچی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اسے واقعی حالت کا کچھ احساس سا ہو رہا تھا۔ اس نے بہت آہستہ سے کمرہ میں قدم رکھا۔ دھندلی دیوار گیری اب بھی جل رہی تھی اور وڈیا دروازہ کے پاس فرش پر بے خبر پڑی ہوئی تھی۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اورسانس زور زور سے چل رہی تھی۔ حالانکہ سخت سردی پڑ رہی تھی مگراس کا جسم پسینہ سے تر تھا۔ ماتھے پر پسینہ کے قطرے جھلک رہے تھے۔ جیسے مرجھائے ہوئے پھول پر اس کی بوندیں۔ گائتری نے لیمپ تیز کرکے وڈیا کو غور سے دیکھا۔ ہونٹ نیلے پڑگئے تھے۔ اور ہاتھ پیر آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ اس نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اپنا خوشبو میں ڈوبا ہوا رومال نکال لیا اور اس کے منہ پر جھلنے لگی۔ دردِ محبت سے اس کا دل تڑپنے لگا۔ گلا بھر آیا۔ بولی۔ کیسی طبیعت ہے؟

وڈیا نے آنکھیں کھول دیں اور گائتری کو دیکھ کر بولی۔ "بہن" اس کے سوا وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ بار بار بولنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اس کے چہرہ پر ایک نہایت دردناک حسرت چھا گئی۔ اس نے معذور نگاہوں سے پھر گائتری کو دیکھا۔ آنکھیں سرخ تھیں مگر ان میں وحشت یا اضطراب نہ تھا۔ ان میں ایک روحانی شعاع جھلک رہی تھی۔ وہ التجا عضو اور سکون سے لبریز تھیں۔ ہماری آخری نگاہیں ہماری زندگی کا جوہر ہوتی ہیں۔ صاف و شفاف۔ حسد وکینہ جیسی مادی کثافتوں سے پاک۔ وڈیا کی زبان بند تھی لیکن آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ میرا قصور معاف کرنا۔ میں چند لمحوں کی مہمان ہوں۔ میری طرف سے تمھارے دل میں جو ملال ہو وہ نکال ڈالنا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ شُدنی پر تمھارا کیا اختیار۔ میری تقدیر میں جو کچھ بدا تھا وہ ہوا۔ اور تمھاری تقدیر میں جو کچھ بدا ہے وہ ہوگا۔ میں تمھیں اپنا سب کچھ سونپے جاتی ہوں۔ اسے اچھی طرح رکھنا۔

گائتری نے روتے ہوئے کہا۔ وڈیا تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟ کیسا جی ہے ڈاکٹر بلاؤں؟

ودیا نے حسرتناک نگاہوں سے دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔ آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔ گائتری بیتابانہ نیچے دیوان خانہ میں گئی اور مایا سے بولی بابو.جی کو اوپر لے آؤ۔ میں جاتی ہوں۔ وِدّیا کی حالت اچھی نہیں ہے۔

ایک لمحہ میں گیان شنکر اور مایا دونوں اوپر آئے۔ شردھا بھی ہلچل سن کر دوڑی ہوئی آئی۔ گیان شنکر نے ودیا کو دو تین بار پکارا پر اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ انھوں نے فوراً الماری سے عرق گلاب کی بوتل نکالی اور اس کے منہ پر کئی چھینٹے دیے۔ وِدّیا کی آنکھیں کھل گئیں مگر گیان شنکر کو دیکھتے ہی اس نے زور سے ایک چیخ ماری۔ اگر چہ اس کے ہاتھ پیر اکڑے ہوئے تھے مگر ایسا معلوم ہوا کہ ان میں کوئی برقی لہر دوڑ گئی۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے دروازہ کی طرف چلی۔

گائتری نے اسے سنبھالا اور پوچھا۔ وِدّیا پہچانتی نہیں۔ بابوگیان شنکر ہیں۔

وِدّیا نے خوف بھری نگاہوں سے گیان شنکر کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔ ارے یہ پھر آگیا۔ ایشور کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔

گائتری۔ ودیا۔ طبیعت کو ذرا سنبھالو۔ تم نے کچھ کھا تو نہیں لیا ہے؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟

وِدّیا۔ مجھے اس سے بچاؤ۔ ایشور کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔

گائتری۔ پہچانتی نہیں ہو۔ بابو جی ہیں۔

وِدّیا۔ نہیں نہیں۔ یہ دیو ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ وہ دیکھو دانت نکالے میری طرف دوڑا آتا ہے۔ ہائے ہائے اسے بھگاؤ۔ مجھے کھا جائے گا۔ دیکھو دیکھو مجھے پکڑے لیتا ہے۔ اس کے سینگیں ہیں۔ بڑے بڑے دانت ہیں۔ بڑے بڑے ناخن ہیں۔ نہیں نہ جاؤں گی۔ چھوڑ دے ظالم۔ میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ ہائے مجھے اگن کنڈ میں جھونکے دیتا ہے۔ ارے دیکھو اس نے مایا کو پکڑلیا۔ کہتا ہے کہ بلاون دوں گا۔ ظالم تیرے دل میں ذرا بھی رحم نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دے۔ میں چلتی ہوں۔ مجھے اگن کنڈ میں جھونک دے مگر ایشور کے لیے اسے چھوڑ دے۔

یہ کہتے کہتے وِدّیا پھر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ گیان شنکر نے خفت آمیز تشویش سے کہا۔ زہر کھا لیا۔ میں ابھی ڈاکٹر پریاناتھ کے یہاں جاتا ہوں۔ شاید ان کے معالجے سے اب بھی اس کی جان بچ جائے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مایا کو تمھاری گود میں دینے کا اُسے

اتنا صدمہ ہوگا۔ میں نے اسے آج تک نہ سمجھا۔ یہ مجسم پاکیزگی تھی۔ دیوی تھی۔ مجھ جیسے حریص اور خودغرض شخص کے قابل نہ تھی۔

یہ کہہ کر وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے باہر چلے گئے۔ شردھا نے وِدّیا کو اٹھا کر گود میں لے لیا۔ گائتری پنکھا جھلنے لگی۔ مایا کھڑا رو رہا تھا۔ کمرہ بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ سناٹا جو گوشۂ مرگ کے سوا اور کہیں نہیں ہوتا۔ سب کی سب ودیا کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر منہ سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ سب کے دلوں پر موت کی دہشت طاری تھی۔

نصف گھنٹہ کے بعد وِدّیا نے آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر اشارہ سے پانی مانگا۔

شردھا نے عرق گلاب اور پانی ملا کر کٹورا اس کے منہ سے لگایا۔ اس نے پانی پینے کو منہ کھولا لیکن ہونٹ کھلے رہ گئے۔ اعضا پر ارادہ کا قابو نہ رہا تھا۔ ایک لمحہ میں اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

شردھا سمجھ گئی کہ یہ آخری وقت ہے۔ بولی۔ بہن۔ کسی سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مایا تمھارے سامنے کھڑا ہے۔ وِدّیا کی بجھی ہوئی آنکھیں شردھا کی طرف پھریں۔ ان سے آنسو کے چند قطرے گرے۔ اعضا میں تشنج ہوا اور روح پرواز کر گئی۔

ایک ہفتہ کے بعد منّی بھی ہُڑک ہُڑک کر بیمار پڑ گئی۔ رات دن اماں اماں رٹ لگایا کرتی۔ نہ کچھ کھاتی نہ پیتی۔ یہاں تک کہ دوا پلانے کے وقت منہ کو ایسا بند کرلیتی کہ کسی طرح نہ کھولتی۔ شردھا گود میں لیے اسے بہلانے کی کوشش کرتی مگر کامیاب نہ ہوتی۔ مایا اسے اپنی گود میں لیے اس کے مرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھتا اور رونے لگتا۔ گیان شنکر کو تو فرصت نہ ملتی تھی۔ مگرلالہ پربھاشنکر دن میں کئی کئی بار ڈاکٹر کے پاس جاتے۔ دوائیں لاتے۔ لڑکی کا دل بہلانے کے لیے انواع واقسام کے کھلونے لاتے۔ مگرمنّی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ گائتری سے اسے نہ جانے کیا چڑھ تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی رونے لگتی۔ ایک بار گائتری نے گود میں اٹھایا تواسے دانتوں سے کاٹ لیا۔ چوتھے روز اسے بخار آیا اور تین روز بیمار رہ کر ماںتا کی بھوکی لڑکی چل بسی۔

وِدّیا کے مرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کتنی خلیق اور ہر دل عزیز تھی۔ محلّہ کی عورتیں شردھا کے پاس آ آ کر اس کی یاد میں چار آنسو بہا جاتیں۔ ایسی عورتوں کا دن بھر تانتا سا لگا رہتا۔ بڑی بہو بھی سچّے دل سے اس کا ماتم کر رہی تھیں۔ اس نیک بخت نے اپنی زندگی میں کسی کو "رے" یا "تو" نہیں کہا۔ مہریوں سے بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ تقدیر خواہ کھوٹی ہو مگر دل میں درد تھا۔ کسی کا دکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ فراخ دست ایسی تھی کہ کسی بھوکے بھکاری دکھیارے کو دروازہ سے ناکام نہ جانے دیتی۔ دھیلے کی جگہ پیسہ اور آدھ پاؤ کی جگہ پاؤ بھر دینے کی نیت رکھتی۔ گائتری ان عورتوں سے آنکھیں چرایا کرتی۔ اگر وہ کبھی آجاتی تو سب کی سب خاموش ہوجاتیں اور اس کو حقارت سے دیکھتیں۔ گائتری انھیں اپنی طرف راغب کرنے کے لیے ان کے بچّوں کو مٹھائیاں اور کھلونے دیتی۔ رو رو کر وِدّیا کا ذکر کرتی مگر اس کا مقصد پورا نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ کوئی عورت زبان سے کچھ نہ کہتی تھی مگر ان کی نگاہیں طنز سے بھی زیادہ مؤثر تھیں۔ ایک دن بڑی بہو نے گائتری کے منہ پر کہا۔ نہ جانے ایسا کون سا کانٹا تھا جس نے اس کے دل میں چبھ کر اس کی جان لے لی۔ بھگوان نے دودھ پوت سب کچھ دیا تھا مگر اس کانٹے کی کسک نہ برداشت ہوسکی۔ یہ کانٹا کون تھا؟ اس معاملہ میں ان عورتوں کی آنکھیں ان کی زبانوں سے کہیں زیادہ ناطق تھیں۔ گائتری دل میں کٹ کر رہ گئی۔

واقعی میں خاندان یا محلّہ کی عورتوں کو وِدّیا کے مرنے کا جتنا رنج تھا اس سے کہیں زیادہ رنج گائتری کو تھا۔ ڈاکٹر پریاناتھ نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس نے زہر کھالیا ہے۔ علامتوں سے بھی اسی بات کی تصدیق ہوتی تھی۔ گائتری اس خون سے اپنا دامن سرخ پاتی تھی۔ اس کا غیور دل اس خیال سے کانپ اٹھتا تھا۔ وہ اپنی خاص مہریوں سے بھی وِدّیا کا ذکر کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ شبِ مرگ کا نظارہ اس کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ وِدّیا کی وہ التجا آمیز نگاہیں اس کی آنکھوں میں پھرا کرتی تھیں۔ ہائے اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ اسے میری جانب سے ایسی سخت غلط فہمی ہوئی تو یہ نوبت نہ آتی۔ لیکن پھر جب وہ اس کے پہلے والی رات کے واقعہ پر غور کرتی تو اس کا دل خود کہتا تھا کہ وِدّیا کا شک کرنا ایک قدرتی امر تھا۔ نہیں اب اسے ایسی کتنی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یاد آتی تھیں جو اس نے وِدّیا

کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر صرف اسے جلانے اور سلگانے کے لیے کہیں تھیں۔ گو اس وقت اس نے وہ باتیں اپنی پاک محبت کے سرور میں کہی تھیں۔ اور محض وِدّیا ہی نہیں بلکہ کل دنیا کے سامنے کہنے کو تیار تھی۔ مگر ان خون کے چھینٹوں سے وہ نشا ہرن ہوگیا۔ ان کا دل خود اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ وہ محبت پاک نہ تھی بلکہ اس میں نادانستہ طور پر نفس کا دخل ہوگیا تھا۔ وِدّیا مجھے دیکھ کر نرم ہوگئی تھی۔ مگر گیان شنکر کی صورت دیکھتے ہی اس کا جھجکنا، چیخنا چلانا صاف کہہ رہا تھا کہ اس نے ہمارے ہی اوپر جان دی۔ یہ اس کی کشادہ دلی تھی کہ اس نے مجھے بے قصور سمجھا۔ اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بار اس کی روح کو کچلے دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس خیال کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ بھگتی اور پریم سے اسے نفرت ہونے لگی۔ اس کے خیال میں یہ حادثہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ہم بھگتی کے بلند معیار سے گر گئے۔ پریم کے شفاف دریا میں تیرتے ہوئے ہم نفس پرستی کے سیواروں میں الجھ گئے۔ گویا یہ حادثہ ہماری تنبیہ کے لیے ایک تازیانۂ غیب تھا۔ اب گیان شنکر اس کے پاس جاتے تو وہ بے التفاتی سے پیش آتی۔ گیان شنکر نے وِدّیا کی چتا میں خود آگ نہ دی تھی۔ انھوں نے اس کی کریا کرم ایک برہمن سے کرا دی تھی۔ گائتری کو ان کی یہ بے حسی اور نالائقی ناگوار گزری۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ وِدّیا کی تعزیتی رسمیں رواج کے موافق اور خلوص دل کے ساتھ ادا کی جائیں۔ اس کی روح کی تشفی کا اب ایک ہی ذریعہ تھا۔ اس نے گیان شنکر سے اس کا اشارہ بھی کیا مگر وہ ٹال گئے۔ پس وہ انھیں دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی تھی۔ انھیں اپنی تقریر کا جادو ڈالنے کا موقع نہ دیتی تھی۔ اسے خوف ہوتا تھا کہ ان کی یہ سبک سری مجھے اور بھی بدنام کر دے گی۔ وہ کم ازکم دنیا کی نگاہوں میں اس خون کے الزام سے پاک رہنا چاہتی تھی۔

گائتری پر اب گیان شنکر کے مزاج کے جوہر بھی کھلنے لگے۔ انھوں نے اس سے اپنے خاندان والوں کی اتنی برائیاں کی تھیں کہ وہ انھیں صبر و برداشت کا مجسمہ سمجھتی تھی۔ مگر یہاں کچھ اور ہی بات نظر آئی۔ انھوں نے پریم شنکر کو اس سانحہ کی اطلاع تک نہ دی تھی مگر انھوں نے جیوں ہی سنا۔ فوراً دوڑے ہوئے آئے اور سولہ دنوں تک روزانہ آکر تعزیتی کاموں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ لالہ پربھاشنکر رسوم کی ادئیگی میں برہمنوں کے بھوج میں برادری کی ماتمی دعوت میں ایسے منہمک تھے کہ گویا آپس میں کوئی مغازت ہی

نہ تھی۔ بڑی بہو کے برتاؤ سے بھی سچی ہمدردی اور یگانگت کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن گیان شنکر کے رنگ ڈھنگ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں ان لوگوں کی شرکت ناگوار ہے۔ وہ ان سے دور دور رہتے تھے۔ ان سے یہ باتیں کرتے تو رکھائی سے۔ گویا سبھی ان کے دشمن ہیں اور انھیں اسی حیلہ سے تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس بھوج کے دن لالہ پربھاشنکر سے ان کی خاصی جھپٹ ہوگئی۔ پربھاشنکر اصرار کر رہے تھے کہ مٹھائیاں گھر ہی پر بنوائی جائیں۔ گیان شنکر کہتے تھے کہ یہ خلافِ مصلحت ہے۔ ممکن ہے کہ گھر کی مٹھائیاں اچھی بنیں مگر صرف زیادہ ہوگا۔ بازار سے معمولی مٹھائیاں منگوائی جائیں۔ پربھاشنکر نے کہا کہ کھلاتے ہو تو ایسی چیز کھلاؤ کہ کھانے والے سمجھیں کہیں دعوت کھائی تھی۔ گیان شنکر نے جھنجھلا کر کہا۔ میں ایسا احمق نہیں ہوں کہ اس واہ واہ کے لیے اپنا گھر لٹا دوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بازار سے سستے میل کی مٹھائیاں آئیں۔ برہمنوں نے ڈرکر کھا تو لیا مگر سارے شہر میں گیان شنکر کی مذمت کی۔

گائتری کو جو بات سب سے زیادہ بری لگتی تھی وہ اس کی نظر بندی تھی۔ گیان شنکر اس کے خطوط کھول کر پڑھ لیتے۔ اس خوف سے کہ کہیں رائے صاحب کا کوئی خط نہ ہو۔ اگر وہ پریم شنکر یا لالہ پربھاشنکر سے کچھ باتیں کرنے لگتی تو وہ فوراً جا کر بیٹھ جاتے اور ایسی بے جا باتیں کرنے لگتے کہ معمولی بات چیت بھی مباحثہ کی صورت اختیار کرلیتی۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ گائتری کے پاس کسی غیر شخص کا اٹھنا بیٹھنا انھیں پسند نہیں ہے۔اتنا ہی نہیں وہ حتی الامکان گائتری کو عورتوں سے بھی ملنے کا موقع نہ دیتے تھے۔ خودداری مذہبی امور میں رائے عامہ کو جتنا سچ سمجھتی ہے۔ دنیاوی امور میں وہ اس کی اتنی ہی قدر کرتی ہے۔ گائتری کو ودّیا کے خون کے الزام سے بری ہونے کے لیے خاندان اور محلّہ کی عورتوں کی ہمدردی حاصل کرنی ضروری تھی۔ وہ اپنے برتاؤ سے ودیا کے ذکر خیر سے یہاں تک کہ گیان شنکر کی برائی کر کے بھی اپنا یہ مقصد پورا کرنا چاہتی تھی۔ کھوڑسی اور بھوج کے بعد اس نے ایک روز شہر کی ساری کنیا پاٹھ شالاؤں کا معائنہ کیا اور ہر پاٹھ شالا کو ودّیا کے نام پر ایک ایک وظیفہ قائم کرنے کے لیے روپے دے آئی۔ یہ محض نمائش نہ تھی۔ ودّیا سے اُسے بڑی محبت تھی۔ اور اس کے مرنے کا اسے دلی رنج تھا۔ ودّیا کو یاد کر کے وہ اکثر تنہائی میں رو پڑتی۔ اس کی صورت اس کی

نگاہوں سے کبھی نہ اترتی تھی۔ جب شردھا اور بڑی بہو وغیرہ ودیا کا تذکرہ کرنے لگتیں تو گائتری ضرور ہی ان کی باتیں جاکر سنتی۔ ان کے اشاروں اور کنایوں پر اس کی نظر نہ پڑتی۔ ایسے موقعوں پر جب گیان شنکر اسے ریاست کے کسی کام کے بہانے بلاتے تو اسے نہایت ناگوار معلوم ہوتا۔ وہ کبھی کبھی جھنجھلا کر کہہ دیتی کہ "جاکر کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں میں مجھ سے صلاح لینے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اتنی عقل بھی ایشور نے نہیں دی؟ ریاست۔ ریاست۔ انھیں کسی کے مرنے جینے کی پرواہ نہ ہو مگر سب کے دل تو ایک سے نہیں ہوسکتے۔" کبھی کبھی وہ صرف گیان شنکر کو چڑھانے کے لیے شردھا کے پاس گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ وہ اب ان کی کٹھ پتلی بن کر نہ رہنا چاہتی تھی۔ اس کا مغرور دل آزاد ہونے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ اس قید سے نکل جانا چاہتی تھی۔ ایک دن وہ گیان شنکر سے کچھ کہے بغیر ہی پریم شنکر کے مزرعہ میں جا پہنچی اور تمام دن وہیں رہی۔ ایک دن اس نے لالہ پربھاشنکر اور پریم شنکر کی دعوت کی اور سارے کھانے اپنے ہاتھوں سے پکائے۔ لالہ جی کو بھی اس کے کمال کا معترف ہونا پڑا۔

دو مہینے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ مستورات کو گائتری پر اعتماد ہونے لگا۔ کینہ وکدورت کے پردے ہٹنے لگے۔ اس کے سامنے ایسی ایسی باتیں ہونے لگیں جن کی بھنک بھی پہلے اس کے کانوں میں نہ پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسی مجلس کا ایک خاص رکن بن گئی۔ یہاں عموماً روزانہ گیان شنکر کے چال چلن کا تذکرہ ہوتا اور ان کا وقار گائتری کے دل سے روزبروز اٹھتا جاتا تھا۔ بڑی بہو اور ان کی بہو دونوں گیان شنکر کی کج ادائیوں کی داستان کہنے لگتیں تو وہ ختم ہی نہ ہونے آتی تھی۔ شردھا اگرچہ زیادہ محتاط تھی۔ لیکن یہ اخذ کرنے کے لیے زیادہ فراست درکار نہ تھی کہ اسے بھی گیان شنکر سے کوئی خاص اُنس نہ تھا۔ گیان شنکر کی کم ظرفی اور خود غرضی روز بروز گائتری پر آشکارا ہونے لگی۔ اب اسے معلوم ہونے لگا کہ پتا جی نے مجھے گیان شنکر سے محترز رہنے کی جو تاکید کی تھی اس میں بھی کوئی نہ کوئی راز ضرور تھا۔ گیان شنکر کے پریم اور بھگتی پر سے بھی اس کا اعتبار اٹھنے لگا۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ انھوں نے محض اپنا مطلب نکالنے کے لیے تو یہ سوانگ نہیں رچا۔ اب اسے کتنی ہی ایسی باتیں یاد آنے لگیں جو اس شبہ کی تائید کرتی تھیں۔ جیوں جیوں یہ شبہ بڑھتا تھا۔ اس کا دل گیان شنکر کی طرف سے پھرتا جاتا تھا۔ گیان شنکر

گائتری کے مزاج کی یہ کیفیت دیکھ کر بہت پریشان ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں اس کے اصلاح کی بہترین صورت یہ تھی کہ گائتری کو کسی طرح گورکھ پور کھینچ لے چلوں۔ لیکن اس کے سامنے اس تجویز کو پیش کرتے ہوئے وہ ڈرتے تھے۔ اپنی کامیابی کے لیے وہ گائتری کا تنہائی میں رہنا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ مایاشنکر کو گود لینے ہی سے کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ گائتری کی عمر پینتیس سال سے متجاوز نہ تھی۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ابھی پینتالیس سال تک اور نہ زندہ رہے۔ یہ طولانی انتظار گیان شنکر جیسے بے صبر آدمی کے لیے حوصلہ شکن تھا۔ اس لیے وہ پریم اور بھگتی کا وہی منتر چلا کر گائتری کو اپنے بس میں کرنا چاہتے تھے۔

ایک روز وہ ایک خط لیے ہوئے گائتری کے پاس جا کر بولے۔ گورکھپور سے یہ نہایت ضروری خط آیا ہے۔ مختارصاحب نے لکھا ہے کہ فصل کے دن ہیں۔ آپ لوگوں کا آنا ضروری ہے۔ ورنہ سیر کی پیداوار ہاتھ نہ لگے گی۔ نوکر چاکر سب کھا جائیں گے۔

گائتری نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ اس کا جواب تو میں پیچھے دوں گی۔ پہلے یہ فرمایئے کہ آپ میرے خطوط کیوں کھول لیا کرتے ہیں؟

گیان شنکر سناٹے میں آگئے۔ سمجھ گئے کہ میں اس کی نگاہوں میں اس سے کہیں زیادہ گر گیا ہوں جتنا کہ میں سمجھتا ہوں۔ بغلیں جھانکتے ہوئے بولے۔ میرا خیال تھا کہ اس روحانی تعلق کے ہوتے کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن آپ کو ناگوار معلوم ہوتا ہے تو آئندہ سے ایسی غلطی نہ ہوگی۔

گائتری نے نادم ہو کر کہا۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری نج کی چٹھیاں نہ کھولی جایا کریں۔

گیان۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں اپنی ذات کو آپ کی ذات میں شامل سمجھتا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر کی تفرقہ پرداز آب و ہوا نے ذاتوں میں تفریق پیدا کردی ہے۔ آئندہ سے احتیاط رکھوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری نحوست کے دن آئے ہیں۔ دیکھوں ابھی اور کیا کیا دیکھنا پڑتا ہے۔

گائتری نے گفتگو کا پہلو بدل کر کہا۔ مختارصاحب کو لکھ دیجیے کہ ابھی ہم لوگ نہ آسکیں گے۔ تحصیل وصول شروع کر دیں۔

گیان۔ میری رائے میں ہم لوگوں کا وہاں رہنا ضروری ہے۔
گائتری۔ تو آپ چلے جائیں۔ میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی یہاں کچھ دنوں اور رہنا چاہتی ہوں۔

گیان شنکر نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن آپ کے بغیر وہاں ایک ایک لمحہ مجھے ایک ایک سال معلوم ہوگا۔ کرشن مندر تیار ہی ہوگیا ہے وہاں بھجن کیرتن میں جو لطف آئے گا وہ یہاں ناممکن ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اب کے برسات برندابن میں کٹتی۔ اس امید پر پانی پھر گیا۔ آپ کی ذات میری زندگی کی مشعل ہے۔ آپ ہی میرے پریم اور بھگتی کی مرکز ہیں۔ آپ کے بغیر مجھے اپنے چاروں طرف اندھیر نظر آئے گا۔ عجب نہیں کہ میں دیوانہ ہوجاؤں۔

دو مہینے پہلے ایسی پریم بھری باتیں سن کر گائتری کا دل بدمست ہو جاتا تھا۔ لیکن اتنے دنوں تک یہاں رہ کر اسے ان کے طور طریق سے خوب واقفیت ہوگئی تھی۔ وہ ساز جو بے سرے الاپ میں بھی ایک کیفیت پیدا کردیتا تھا۔ اب بند ہوچکا تھا۔ وہ اب ردِ سحر کرنا سیکھ گئی تھی۔ بولی۔ یہاں میری حالت اس سے بھی بدتر ہوگی۔ کھوئی کھوئی سی پھروں گی مگر کروں کیا؟ یہاں لوگوں کے دلوں کو اپنی جانب سے صاف کرنا ضروری ہے۔ یہ جدائی کا صدمہ اسی لیے برداشت کر رہی ہوں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ یہاں دل بستگی کا اور کون سا سامان ہے۔ جسم پر قابو ہے۔ اسے یہاں رکھوں گی۔ رہا دل وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے کرشن کا دامن نہ چھوڑے گا۔ روحانی تعلق میں ہزاروں کوس کے فاصلہ پر بھی دوری محسوس نہیں ہوتی۔ ہجر میں وصال کا مزہ ملتا ہے۔ ہاں خط لکھتے رہیے گا ورنہ میری جان پر بن جائے گی۔

گیان شنکر نے گائتری کو پُرمعنی نگاہوں سے دیکھا۔ یہ وہ بھولی بالی سیدھی سادی گائتری نہ تھی۔ وہ اب تریا چرتر کے فن سے خوب آشنا ہوگئی تھی۔ دغا کا جواب دغا سے دینا سیکھ گئی تھی۔ سمجھ گئے کہ اب یہاں میری دال نہ گلے گی۔ اس بازار میں اب کھوٹے سکے نہ چلیں گے۔ اس بازی کو جیتنے کے لیے اب کوئی نئی چال چلنی پڑے گی۔ نئے قلعے باندھنے پڑیں گے۔ گائتری کو یہاں چھوڑکر جانا شکار کو ہاتھ سے کھونا تھا۔ کسی اور موقع پر اس مسئلہ کو چھیڑنے کا ارادہ کرکے وہ اٹھے۔ دفعتاً گائتری نے پوچھا۔ توکب تک جانے کا

ارادہ ہے؟ میری رائے میں آپ کا صبح کی گاڑی سے چلا جانا اچھا ہوگا۔

گیان شنکر نے بیکسانہ انداز سے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ بہتر ہے۔

گائتری۔ ہاں جب جانا ہی ہے تو دیر کیوں کیجیے۔ جب تک اس مایا جال میں پھنسے ہوئے ہیں تب تک تو یہاں کے راگ الاپنے ہی پڑیں گے۔

گیان۔ جیسا ارشاد۔

یہ کہہ کر وہ بایاس وحسرت وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے چلے جانے پر گائتری کو وہ پچھتاوا ہوا جو کسی دوست کو بے جا تکلیف دے کر ہمیں ہوتا ہے مگر اس نے انھیں روکا نہیں۔

(۵۲)

شردھا اور گائتری میں روز بروز میل جول بڑھنے لگا۔ گائتری کو اب معلوم ہوا کہ شردھا میں کتنا ایثار۔ انکسار۔ کتنا رحم اور کتنی عصمت پروری ہے۔ ارتباط نے ان میں بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی محرم راز بن گئیں۔ آپس میں کوئی پردہ نہ رہا۔ دونوں آدھی آدھی رات تک بیٹھی اپنے دل کی باتیں کہا کرتیں۔ شردھا کی داستان عشق وفراق کی پُردرد داستان تھی جس میں اوّل سے آخر تک کچھ چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ رو رو کر اپنے درد فراق کا حال کہتی۔ پریم شنکر کی بے دردی اور اصول پروری کا رونا روتی۔ اپنی ہٹ پر بھی پچھتاتی۔ کبھی پریم شنکر کے اوصافِ حسنہ کا فخر کے ساتھ ذکر کرتی۔ اپنا حال کہنے میں اپنے دلی جذبات کے ظاہر کرنے میں اسے ایک خاص مسرت ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف گائتری کی داستان محبت سے شروع ہو کر ندامت و پشیمانی پر ختم ہوتی تھی۔ اعتماد کے اظہار میں بھی اسے احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ وہ کچھ چھپانے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ اس کے دل میں چند ایسے سیاہ داغ تھے جنھیں دکھانے کی اسے جرأت نہ ہوتی تھی۔ بالخصوص شردھا کو جس کا ظاہروباطن یکساں تھا۔ وہ اس کے سامنے پریم اور بھگتی کا ذکر کرتے ہوئے شرماتی تھی۔ وہ جب گیان شنکر کی اس بیباکی کو یاد کرتی جس کا اظہار انھوں نے رات کو تھیئٹر سے لوٹتے وقت کیا تھا تو اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت تک میرا دل پاک و صاف تھا اگر چہ اس میں ترغیبات پیدا ہو چلی تھیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب گیان شنکر کی نفس پروری اور میری اخلاقی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ جسے میں

بھگتی سمجھتی تھی۔ گیان شنکر نے محض اپنا ناپاک مطلب پورا کرنے کے لیے میرے سامنے بھگتی کا یہ رنگین جال بچھایا۔ میرے متعلق ان کا وہ مضمون لکھنا مذہبی اور دنیاوی حلقوں میں مجھے مشہور کرنا۔ ان کی وہ طاعت شعاری۔ وہ سرگرمی۔ وہ وفاداری۔ یہ سب ان کی مقصد برآری کے وسیلے تھے۔ مجھے میری نخوت نے ڈبایا۔ میں اپنی شہرت پسندی کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ میرا وہ مذہبی انہاک۔ میری وہ حماقت آمیز جھوٹی بھگتی۔ میری وہ سرگوشیاں۔ میری وہ پُرجوش شکر گزاری جس پر مجھے اپنی خودداری اور پاکیزگی کو قربان کر دینے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ محض میری اسی نخوت کی گلکاریاں تھیں۔ اس گھاگ نے میری فطرت کے نازک ترین مقام پر نشانہ مارا۔ اس نے میری باقاعدگی اور نفس کشی کو خاک میں ملا دیا۔ اس نے محض اپنی شہوت کی ہوس میں مجھے تباہ کر دیا۔ عورت اپنی خام کاریوں کا الزام ہمیشہ مرد پر رکھتی ہے۔ وہ اپنے کو مظلوم اور مجروح سمجھتی ہے۔ گائتری کے دل میں اس وقت گیان شنکر کا وہ اظہارِ محبت۔ وہ ہمدردانہ سلوک۔ وہ بیباکانہ التفات تیر کی طرح چبھ رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی غم وغصہ سے اتنی برانگیختہ ہوجاتی کہ اس کا جی چاہتا کہ اس نے جس طرح میری زندگی کو تباہ کیا ہے اسی طرح میں بھی اس کو ملیامیٹ کردوں۔

ایک روز وہ اسی قسم کے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہ وہیں شردھا بھی آکر بیٹھ گئی اور اس کے منہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ چہرہ کیوں سرخ ہو رہا ہے؟ آب دیدہ کیوں ہو؟

گائتری۔ کچھ نہیں۔ طبیعت ہی تو ہے۔

شردھا۔ کیا میرے سننے کے لائق بات نہیں۔

گائتری۔ تم سے چھپا ہی کیا ہے جو پوچھتی ہو۔ میں نے اپنی طرف سے چھپایا ہے۔ مگر تم سب جانتی ہو۔ یہاں کون نہیں جانتا ہے؟ ان باتوں کو جب یاد کرتی ہوں تو ایسا جی ہوتا ہے کہ ایک ہی کٹار سے اپنا اور اس کا کام تمام کردوں۔ خون کھولنے لگتا ہے۔ مجھے ذرا بھی گمان نہ تھا کہ یہ شخص اتنا بڑا مکار اور بدمعاش ہے۔ بہن۔ اب چاہے جو کچھ ہو میں اس سے اپنی عصمت کے خون کا بدلہ ضرور لوں گی۔ عزت تو یہی کہتی ہے کہ وِدّیا کی طرح زہر کھا کر مرجاؤں۔ لیکن یہ تو خود اس کے دل کی بات ہوگی۔ وہ اپنے نصیبوں کو سراہے گا اور دل کھول کر ثروت کے مزے اڑائے گا۔ نہیں میں ایسی حماقت نہ کروں گی۔

میں اسے گھلا گھلا کر اور جلا جلا کر ماروں گی۔ میں اس کا سر اس طرح کچلوں گی جیسے سانپ کا سر کچلا جاتا ہے۔ ہائے مجھ جیسی بدنصیب عورت دنیا میں نہ ہوگی۔

یہ کہتے کہتے گائتری زار و قطار رونے لگی۔ ذرا دم لے کر پھر اسی لہجہ میں بولی۔ شردھا تمھیں یقین نہ آئے گا۔ یہ شخص پکا جادوگر ہے۔ اس نے مجھ پر ایسا جادو ڈالا کہ میں اپنے کو بالکل بھول گئی۔ میں تم سے اپنی صفائی نہیں بیان کر رہی ہوں۔ ہوا میں مختلف امراض کے کیڑے اڑا کرتے ہیں۔ ان کا زہر انھیں لوگوں پر اثر کرتا ہے جن میں اس زہر کے قبول کرنے کا مادہ پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ مچھر کے ڈنک سے سب کو بخار ولرزہ نہیں ہوتا۔ یہ باہر کی چیزیں جاکر صرف اندر کے ناقص مادہ کو ابھار دیتی ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو آج ساری دنیا میں ایک انسان بھی تندرست نہ نظر آتا۔ مجھ میں یہ ناقص مادہ تھا۔ مجھے اپنی روحانی طاقت پر غرور تھا۔ میں ترغیبات کو ہیچ سمجھتی تھی۔ اس بدکار نے اسی چراغ سے جس سے میرا اندھیرا گھر روشن تھا میرے اس گھر میں آگ لگادی۔ جو تلوار میری حفاظت کرتی تھی وہی تلوار میری گردن پر چلا دی۔ اب میں وہی تلوار اس کی گردن پر پھیروں گی۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ میں عورت ہوں۔ کمزور ہوں۔ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی مگر میں دِکھا دوں گی کہ عورت پانی کی طرح رقیق ہو کر بھی پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرسکتی ہے۔ میرے پتا جی روشن ضمیر ہیں۔ انھیں اس کی بدنیتی کا علم ہوگیا تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے مجھے اس سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔ انھوں نے ضرور وِدّیا سے یہ بات کہی ہوگی۔ اسی لیے وِدّیا یہاں مجھے آگاہ کرنے آئی تھی۔ مگر افسوس کہ میں نشہ میں ایسی چور تھی کہ میں نے پتاجی کی چتاونی کی بھی کچھ پرواہ نہ کی۔ اس شیطان نے مجھے ان کی نظروں میں بھی گرا دیا۔ اب وہ میرا منہ دیکھنا بھی گوارہ نہ کریں گے۔

گائتری یہ کہہ کر پھر اپنے غم میں محو ہوگئی۔ شردھا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی کیوں کر تشفی کروں۔ دفعتاً گائتری اٹھ کھڑی ہوئی اور صندوقچہ سے قلم دوات اور کاغذ نکال لائی۔ بولی بہن اب جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔ اس کے لیے زندگی بھر رونا ہے۔ وِدّیا دیوی تھی۔ اس نے ذلت پر موت کو ترجیح دی۔ میں ڈائن ہوں۔ موت سے ڈرتی ہوں۔ لیکن اب سے یہ زندگی نفس کشی اور توبہ کے نذر ہوگی۔ میں اپنی ریاست سے استعفیٰ دیے دیتی ہوں۔ میرا اس پر اب کوئی حق نہیں ہے۔ تین سال سے اس پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔

میں اتنے دنوں تک اس پر بلا کسی استحقاق کے قابض رہی۔ یہ ریاست میری عصمت پروری اور وفاداری کا صلہ تھی۔ یہ ساری دولت و ثروت مجھے اس لیے ملی تھی کہ خاندانی ناموس کی حفاظت کرتی رہوں۔ میری عصمت پروری قائم رہے۔ وہ عزّت کتنی بیش بہا جنس ہوگی جس کی حفاظت کے لیے مجھے کروڑوں کی جائداد عطا کی گئی۔ لیکن میں نے اس عزّت کو مٹا دیا۔ اس بیش بہا جواہر کو اپنی نفس پروری پر قربان کر دیا۔ اب میرا اس ریاست پر کوئی حق نہیں ہے۔ میں اس گھر میں قدم رکھنے کی بھی مجاز نہیں وہاں کا ایک ایک دانہ میرے لیے حرام ہے۔ میں اتنے دنوں تک حرام کے مال پر عیش کرتی رہی۔

یہ کہہ کر گائتری کچھ لکھنے لگی۔ مگر شردھا نے کاغذ اٹھا لیا اور کہا۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ اتنی عجلت اچھی نہیں۔

گائتری۔ خوب سوچ لیا ہے۔ میں اسی وقت یہ نقلی لباس اتار کر پھینک دوں گی اور کسی ایسے گوشہ میں جا بیٹھوں گی جہاں کوئی میری صورت نہ دیکھے۔

شردھا۔ بھلا سوچو تو کہ دنیا کیا کہے گی۔ لوگوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوں گی۔ مان لیا کہ تم نے استعفیٰ ہی دے دیا تو یہ کیا معلوم ہے کہ جن کے ہاتھوں میں ریاست جائے گی وہ اس کا جائز استعمال کریں گے۔ اب تو تمھارے لوک اور پرلوک کی بھلائی اسی میں ہے کہ بقیہ زندگی بھگوت بھجن میں گزارو تیرتھ جاترا کرو۔ سادھوسنتوں کی خدمت کرو۔ ممکن ہے کوئی ایسے مہاتما مل جائیں جن کے اپدیش سے تمھارا چت شانت ہوجاوے۔ بھگوان نے تمھیں دھن دیا ہے۔ اس سے اچھے اچھے کام کرو۔ اناتھوں اور بدھواؤں کو پالو۔ دھرم شالائیں بنواؤ۔ تالاب اور کنوئیں کھدواؤ۔ بھگتی کو چھوڑ کر گیان پر چلو۔ بھگتی کا راستہ سیدھا ہے مگر کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ گیان کا راستہ ٹیڑھا ہے لیکن صاف ہے۔

شردھا کی نصیحت آمیز باتیں ابھی ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ ایک مہری نے آکر کہا۔ بہو جی وہ ڈپٹیائن آئی ہیں۔ جو پہلے آیا کرتی تھیں۔ یہیں لوا لاؤں۔

شردھا۔ شیل منی تو نہیں ہیں؟

مہری۔ ہاں ہاں وہی ہیں۔ سانولی سانولی۔ پہلے تو گہنوں سے لدی رہتی تھیں آج تو ایک مندری بھی نہیں ہے۔ بڑے آدمیوں کا من گہنے سے پھر جاتا ہے۔

شردھا۔ ہاں۔ یہیں لوا لاؤ۔

ایک لمحہ میں شیل منی آکر کھڑی ہوگئیں۔ صرف ایک سفید ساڑی پہنے ہوئے تھیں۔ زیور کا تو ذکر ہی کیا۔ ہونٹوں پر پان کی سرخی بھی نہ تھی۔ شردھا اٹھ کر ان سے گلے ملی اور بولی۔ سیتا پور سے کب آئیں؟

شیل منی۔ آج ہی آئی ہوں اور اسی لیے آئی ہوں کہ لالہ گیان شنکر سے دو دو باتیں کروں۔ جب سے غریب وڈیا کے زہر کھا کر جان دینے کا حال سنا ہے۔ کلیجہ میں ایک آگ سی سلگ رہی ہے۔ یہ سب اس کی بہن کی کرامات ہے جو رانی بنی پھرتی ہے۔ اسی نے زہر دیا ہوگا۔

شیل منی نے گائتری کی طرف نہ دیکھا تھا یا دیکھا بھی تھا تو پہچانتی نہ تھی۔ شردھا نے دانتوں تلے زبان دبائی اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں سے گائتری کی طرف اشارہ کیا۔ شیل منی نے چونک کر بائیں جانب دیکھا تو ایک عورت سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے حسن کی شان اوراس کی وضع کی نفاست دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ گائتری یہی ہے۔ اس کا سینہ دَھک سے ہوگیا۔ لیکن اس کی زبان سے ایسے الفاظ نکل گئے تھے۔ جن کی تاویل یا تحریف نہ ہوسکتی تھی۔ وہ جلتا ہوا لقمہ منہ میں رکھ چکی تھی اور اسے نگلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اگر چہ اس کا غصہ بجا تھا۔ گائتری کے منہ پر وہ ایسی سخت باتیں نہ کہتی۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے غصہ نے ہیکڑی کی صورت اختیار کرلی اور نادم ہونے کے بجائے وہ اور بھی بیباک ہوگئی۔ گائتری کی طرف منہ کر کے بولی۔ اچھا رانی صاحبہ تو یہیں رونق افروز ہیں۔ میں نے آپ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ آپ کو ضرور ہی ناگوار گزرا ہوگا لیکن اس کے لیے میں آپ سے معافی نہیں مانگ سکتی۔ میں یہی باتیں آپ کے منہ پر کہہ سکتی تھی اور ایک میں کیا ساری دنیا یہی کہہ رہی ہے۔ زبان سے خواہ کوئی نہ کہے مگر سب کے دل میں یہی بات ہے۔ لالہ گیان شنکر سے جس کا ایک بار بھی سابقہ پڑچکا ہے وہ اسے بعید از قیاس نہیں سمجھ سکتا۔ میرے بابو جی ان کے ساتھ پڑھے ہوئے ہیں اور ان سے خوب واقف ہیں۔ جب وہ یہاں مجسٹریٹ تھے تو لالہ گیان شنکر نے اپنے اسامیوں پر اضافہ لگان کا دعویٰ دائر کیا تھا۔ مہینوں میری خوشامد کرتے رہے کہ میں بابو جی سے کہہ کر ان پر ڈگری کرا دوں۔ میں کیا سمجھتی تھی۔ ان کے چکموں میں آگئی۔

بابوجی پہلے تو بہت آنا کانی کرتے رہے لیکن جب میں نے ضد کی تو راضی ہوگئے۔ خیریت یہ ہوئی کہ اسی درمیان میں مجھے ان حضرت کی اخترا پردازیوں کا حال معلوم ہوگیا اور ڈگری نہ ہونے پائی ورنہ کتنے ہی غریب اسامیوں کی جان پر بن آتی۔ دعویٰ خارج ہوگیا۔ اس پر یہ ایسے برہم ہوئے کہ اخباروں میں لکھ لکھ کر بابو جی کو بدنام کر دیا۔ بابوجی جب اخبارات میں ان کے مذہبی جوش کے تذکرے پڑھتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ حضرت ضرور کوئی نہ کوئی نیا سوانگ رچ رہے ہیں۔ گورکھ پور میں سناتن دھرم کے جلسہ میں جو دھوم دھام ہوئی اور بنارس میں کرشن لیلا کا جو ناٹک کھیلا گیا ان کا حال پڑھ کر بابوجی نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ یہ حضرت رانی صاحبہ کو سبز باغ دکھا رہے ہیں۔ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ لالہ جی مجھے یہاں مل جاتے تو ایسے آڑے ہاتھوں لیتی کہ وہ یاد کرتے۔

گائتری کھڑکی کی طرف تاک رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی نگاہوں سے کھڑکی غائب ہوگئی۔ اس کے دل سے رنج و پشیمانی کی لہریں سی اٹھ اٹھ کر حلق تک آتی تھیں اور اس کی آنکھوں کی کشتیوں کو جھکولے دے دے کر لوٹ جاتی تھیں۔ وہ بے ہوش سی ہوگئی تھی۔ اس کے سارے اعضاء سُن ہو رہے تھے۔ شردھا نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا تو آنسو نہ تھام سکی بدنصیب دُکھیا پر اُسے اتنا ترس کبھی نہ آیا تھا۔ وہاں زیادہ بیٹھنا اُس پر زیادہ ظلم کرنا تھا۔ وہ اور کچھ نہ کر سکی۔ شیل منی کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ وہاں ان دونوں میں دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ شردھا اس خون کا سارا الزام گیان شنکر پر عاید کرتی تھی اور شیل منی گائتری کو بھی ماخوذ کرتی تھی۔ دونوں نے اپنے دعوے کی تائید میں دلائل پیش کیے۔ آخر میں شردھا کی باتوں میں زیادہ وزن معلوم ہوا۔ اس کے بعد شیل منی نے اپنا ماجرا بیان کیا۔ اولاد کے لیے کیا کیا تدبیریں کیں۔ کن کن دائیوں کو دکھلایا۔ کن کن ڈاکٹروں کی دوائیں استعمال کیں۔ یہاں تک کہ وہ شردھا کو اپنے حاملہ ہوجانے کا یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی۔ مگر افسوس کہ ساتویں ماہ میں اسقاط ہوگیا اور ساری تمنائیں برباد ہوگئیں۔ شردھا نے صدق دلی سے اس کی تشفی کی۔ پھر کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شردھا نے پوچھا کہ اب ڈپٹی صاحب کا کیا ارادہ ہے؟

شیل منی۔ اب تو استعفیٰ دے کر آئے ہیں اور بابو پریم شنکر کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔

انھیں ان سے بے انتہا عقیدت ہے۔ پہلے جب استعفیٰ دینے کا تذکرہ کرتے تو میں سمجھتی کہ کام سے جی چراتے ہیں۔ میں راضی نہ ہوتی تھی۔ مگر ان تین برسوں میں مجھے تجربہ ہوگیا کہ اس ملازمت کے ساتھ اصول پروری کا نباہ نہیں ہوسکتا۔ قومی لیڈر رعایا کی بہتری کے لیے جو تدبیریں کرتے ہیں۔ سرکار اس میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ تحریک کو دبانا چاہتی ہے اسے خوف ہوتا ہے کہ مبادا یہاں کے لوگ اتنے ترقی یافتہ ہوجائیں کہ اس کا رعب قائم نہ رہے۔ اس لیے وہ رعایا کے جذبات کو پامال کرنے کے لیے ان کا منہ بند کرنے کے لیے نئے قوانین وضع کرتی رہتی ہے۔ لیڈروں نے ملک کو مفلسی کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے چرخوں اور کرگھوں کو رائج کیا۔ سرکار اس میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہے۔ سودیشی کپڑوں کی اشاعت کرنے کے لیے دُکانداروں اور گاہکوں کو سمجھانا جرم قرار دیا گیا ہے۔ منشیات کا استعمال کم کرنے کے لیے نشہ بازوں اور ٹھیکیداروں سے بھی کچھ کہنا جرم ہے۔ ابھی گزشتہ سالوں میں جب جنگ یورپ کا زمانہ تھا تو سرکار نے رعایا سے قرض لیا۔ کہنے کو قرض تھا مگر دراصل جبریہ ٹیکس تھا۔ حکام نے غریب مفلس رعایا پر انواع و اقسام کے مظالم کیے۔ طرح طرح کے دباؤ ڈالے حتیٰ کہ انھیں ہل بیل بیچ کر سرکار کو قرض دینے پر مجبور کیا گیا۔ جس نے انکار کیا اسے یا توحکام سے پٹوایا یا اس پر کوئی جھوٹا الزام لگا کر پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ بابو جی نے اپنے علاقہ میں کسی پر سختی نہیں کی۔ کہہ دیا جس کا جی چاہے وہ قرض دے۔ جس کا جی نہ چاہے وہ قرض نہ دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور علاقوں سے تولاکھوں روپے وصول ہوئے مگر ان کے علاقہ سے بہت کم ملا۔ اس پر حاکم ضلع نے ناراض ہو کر ان کی شکایت کردی۔ ان سے یہ عہدہ چھین لیا گیا اور درجہ گھٹا دیا گیا۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو خود ہی اصرار کر کے ان سے استعفیٰ دلا دیا۔ جب رعایا کا روپیہ کھاتے ہیں تو رعایا ہی کے فائدہ کا کام بھی کرنا چاہیے۔ یہ کیا کہ جس کی کمائی کھائیں۔ اسی کا گلا دبائیں۔ یہ تو نمک حرامی ہے اور انتہا درجہ کا کمینہ پن۔ یہ تو وہ کرے جس کا ضمیر مردہ ہوگیا ہو۔ جسے پیٹ پالنے کے سوا دنیا عاقبت کی کوئی فکر نہ ہو۔ جس کے دل میں اپنی قوم کا ذرا بھی درد ہے وہ ایسا ظلم نہیں کرسکتا۔ بھلا تو ہوتا ہے سرکار کا۔ رعب و اقتدار تو بڑھتا ہے اس کا۔

جیبیں تو بھرتی ہیں انگریز تاجروں کی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں یہ پیٹ کے غلام۔ یہ خودغرضی کے بندے یعنی حکّام۔ اور پھر ہمیں نوکری کی پرواہ ہی کیا ہے۔ گھر میں کھانے کو بہت ہے۔ دوچار کو کھلا کر کھاسکتے ہیں۔ اب تو پختہ ارادہ کرکے آئے ہیں کہ یہیں بابو پریم شنکر کے ساتھ رہیں اور اپنے سے جہاں تک دوسرں کی بھلائی کریں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کب تک روٹھی رہوگی۔ کیا اسی طرح رو رو کر زندگی کے دن گزار دو گی؟

شردھا۔ قسمت میں جو کچھ لکھا ہے اسے کون مٹا سکتا ہے؟

شیل۔ کچھ نہیں۔ یہ تمھاری بیہودہ ضد ہے۔ میں اب کی تمھیں گھسیٹ لے چلوں گی۔ اس ویرانہ میں مجھ سے اکیلے کیوں کر رہا جائے گا۔ ہم اور تم دونوں رہیں گے تو آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ موقع پاتے ہی میں ان حضرت کی بھی خبر لوں گی۔ دنیا کے لیے توجان دیتے پھرتے ہیں اور اپنے گھر والوں کی خبر ہی نہیں۔ ذرا سا پرائشچت کرنے میں کیا شان گھٹی جاتی ہے۔

شردھا۔ تم ابھی انھیں جانتی نہیں ہو۔ وہ سب کریں گے مگر پرائشچت نہ کریں گے۔ وہ اپنے اصول کو نہ توڑیں گے۔ اس پر بھی وہ میری طرف سے بے خبر نہیں ہیں۔ گیان شنکر جب سے گھورکھپور میں رہنے لگے تب سے وہ عموماً روزانہ ایک بار یہاں آجاتے ہیں۔ اگر کام پڑے توانھیں یہاں رہنے میں بھی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن اپنے اصول انھیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

شیل منی نے آسمان کی طرف دیکھا تو بادل گھر آئے تھے۔ گھبرا کر بولی۔ کہیں پانی نہ برسنے لگے۔ اب چلوں گی۔ شردھا نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ رُکی۔ آخر اس نے کہا۔ ذرا گائتری کے پاس چل کر اس کے آنسو پونچھ دو۔ بے چاری جبھی سے بیٹھی رو رہی ہوگی۔

شیل۔ رونا تو ان کے نصیبوں میں لکھا ہے۔ ابھی کیا روئی ہیں۔ ایسے آدمی کی یہی سزا ہے۔ ناراض ہو کر میرا کیا بنالیں گی۔ رانی ہوگی تو اپنے گھر کی۔

شیل منی کو رخصت کرکے شردھا جھجکتی ہوئی گائتری کے پاس آئی۔ وہ ڈر رہی تھی۔ کہ کہیں گائتری مجھ پر شبہ نہ کرنے لگی ہو کہ یہ ساری کرتوت اسی کی ہے۔ اس

نے ڈرتے ڈرتے مجرم کی طرح کمرہ میں قدم رکھا۔ گائتری نے التجا آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔ وہ بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ چہرہ مغموم تھا مگر اس پر ایک مستقل ارادہ کی جھلک تھی۔ کئی منٹ تک وہ لکھنے میں ایسی منہمک رہی کہ گویا شردھا کے آنے کا اسے علم ہی نہ تھا۔ دفعتاً بولی۔ بہن اگر تمھیں تکلیف نہ ہو تو ذرا مایا کو بلا دو۔ میری مہریوں کو بھی پکار دو۔

شردھا سمجھ گئی کہ اس کے دل میں کچھ اور ٹھن گئی۔ کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے جا کر مایا اور مہریوں کو بلایا۔ ایک لمحہ میں مایا آکر گائتری کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ مہریاں باغ میں جھولا جھول رہی تھیں۔ بھادوں کا مہینہ تھا۔ گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ بجلی بہت سہاونی معلوم ہوتی تھی۔

گائتری نے مایا کو سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ تم جانتے ہو کہ کس کے لڑکے ہو؟

مایا نے تعجب سے دیکھ کر کہا۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتا۔

گائتری۔ میں تمھاری زبان سے سننا چاہتی ہوں جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ تم مجھ کو کیا سمجھتے ہو۔

مایا۔ پہلے اس سوال کا مطلب نہ سمجھتا تھا۔ اتنا اشارہ پاکر سنبھل گیا۔ بولا پہلے لالہ گیان شنکر کا لڑکا تھا۔ اب آپ کا لڑکا ہوں۔

گائتری۔ اس لیے تمھیں ہر معاملہ میں ایشور کے بعد میرے ہی حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔

مایا۔ بیشک۔

گائتری۔ بابو گیان شنکر کو تمھاری تعلیم و تربیت تمھاری پرورش و پرداخت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا حق ہے۔

مایا۔ آپ کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی ان سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ جب سے میں نے اماں کو مرتے وقت ان کی صورت دیکھتے ہی چیخ کر بھاگتے دیکھا۔ جبھی سے ان کی عزّت میرے دل سے اٹھ گئی۔

گائتری۔ تو تم اس سے کہیں زیادہ سمجھدار ہو جتنا میں خیال کرتی تھی۔ میں آج بدری ناتھ کی جاترا کرنے جارہی ہوں۔ کچھ پتہ نہیں کہ کب تک لوٹوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تمھیں بابو پریم شنکر کی نگرانی میں رکھوں۔ یہ میرا حکم ہے کہ تم انھیں اپنا باپ

سمجھو۔ اور انھیں کے مقلد بنو۔ میں نے ان کے نام یہ خط لکھ دیا ہے۔ اسے لے کر تم ان کے پاس جاؤ۔ وہ تمھاری تعلیم کا معقول بندوبست کردیں گے۔ تمھاری حیثیت کے مطابق تمھارے آرام وسہولت کا بندوست بھی کریں گے۔ تم کو چند ہی روز بعد معلوم ہوجائے گا کہ تم اپنے باپ سے کہیں زیادہ بہتر ہاتھوں میں ہو۔ ممکن ہے کہ لالہ پریم شنکر کو تم سے اتنی محبت نہ ہو جتنی کہ تمھارے باپ کو ہے۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ تمھیں اپنے آئندہ فرائض کی انجام دہی کے لیے جتنی قابلیت ان کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتی ہے۔ تمھارے عادات و اطوار کی جیسی عمدہ تربیت وہ کرسکتے ہیں وہ اور کسی سے ممکن نہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کریں گے۔ اس کے لیے تم اور میں دونوں ہی ان کے احسان مند ہوں گے۔ یہ دوسرا خط میں نے بابو گیان شنکر کو لکھا ہے۔ میری واپسی تک وہ ریاست کے منیجر رہیں گے۔ میں نے انھیں تاکید کردی ہے کہ بابو پریم شنکر کے پاس دو ہزار روپے ماہوار بھیج دیا کریں۔ خط ڈاک خانہ بھجوا دو۔

اتنے میں چاروں مہریاں آگئیں۔ گائتری نے ان سے کہا۔ میں آج بدری ناتھ کی جاترا کرنے جارہی ہوں۔ تم میں سے کون میرے ساتھ چلتی ہے۔ مہریوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔ ہم سب کی سب چلیں گے۔

گائتری۔ نہیں مجھے صرف ایک کی ضرورت ہے۔

مہریاں۔ سرکار جیسا حکم دیں۔ بال بچوں کو مہینوں سے نہیں دیکھا ہے۔

گائتری۔ تو تم گھر جاؤ۔ تم چلو گی کیسر؟

کیسر۔ کب تک لوٹنا ہوگا؟

گائتری۔ یہ نہیں کہہ سکتی۔

کیسر۔ مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں ہے پر سنتی ہوں کہ وہاں پہاڑ کا پانی بہت لگتا ہے۔

گائتری۔ تو تم بھی گھر جاؤ۔ تو چلے گی انسوئیا؟

انسوئیا۔ سرکار۔ میرے گھر میں کوئی مرد مانس نہیں ہے۔ گھر چوپٹ ہو رہا ہے۔ وہاں چلوں گی تو چھٹانک بھر دانہ بھی نہ ملے گا۔

گائتری۔ تو تم بھی گھر جاؤ۔ اب تمھیں رہ گئیں رادھا۔ تم سے بھی پوچھ لوں۔ چلوگی

میرے ساتھ؟

رادھا۔ ہاں سرکار۔ چلوں گی۔

گائتری۔ آج ہی چلنا ہوگا۔

رادھا۔ جب سرکار کا جی چاہے چلیں۔

گائتری۔ تمھیں بیس بیگھے معافی ملے گی۔

تینوں مہریوں نے خفت کے ساتھ کہا۔ سرکار چلنے کو ہم سبھی تیار ہیں۔ آپ کا دیا ہوا کھاتے ہیں تو ساتھ کس کے رہیں گے۔

گائتری۔ نہیں مجھے تم لوگوں کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ اکیلی رادھا رہے گی۔ تم احسان فراموش ہو۔ تم سے اب میرا کوئی ناتا نہیں ہے۔

یہ کہہ کر گائتری جاترا کی تیاری کرنے لگی۔ شردھا کھڑی دیکھ رہی تھی مگر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں انسان کے دل کو قرار نہیں ہوتا۔ ذرا سی بات پر ناراض ہوتا اور ذرا سی بات پر خوش ہوجاتا ہے۔

(۵۳)

بابوگیان شنکر گورکھپور آئے لیکن اس طرح جیسے لڑکی سسرال آتی ہے۔ وہ ہمیشہ مغموم و متفکر رہتے۔ انھیں گائتری سے سچی محبت نہ سہی لیکن وہ محبت ضرور تھی جو شرابیوں کو شراب سے ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان کا یہاں ذرا بھی جی نہ لگتا تھا۔ وہ سارے دن اپنے کمرہ میں پڑے ہوئے کچھ نہ کچھ سوچتے یا پڑھتے رہتے تھے۔ نہ کہیں سیر کرنے جاتے۔ نہ کسی سے ملتے جلتے۔ کرشن مندر کی طرف بھول کر بھی نہ جاتے تھے۔ وہ بار بار افسوس کرتے تھے کہ میں نے گائتری کو بنارس جانے کی ناحق تحریک کی۔ یہ سب اسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ یہ ساری شرارت شردھا، پریم شنکر اور بڑی بہو کی ہے۔ انھیں نے گائتری کے کان بھرے اور اسے میری جانب سے بد ظن کردیا۔ کبھی کبھی انھیں اپنی ہوس پرستی پر بھی غصہ آتا اور وہ اس مایوسی کے عالم میں نوشتۂ تقدیر کے قائل ہوجاتے تھے۔ مشیت ایزدی بھی ضرور کوئی نہ کوئی چیز ہے۔ ورنہ کیا میرے سارے کھیل یوں بگڑ جاتے۔ کوئی چال سیدھی ہی نہیں پڑتی۔ دولت کی ہوس نے مجھ سے کیا کیا نہیں کرایا۔ میں نے اپنے ضمیر کا۔ اپنے دین وایمان کا خون کیا اور ایک پاک باطن اور وفادار عورت کی جان

لی۔ پھر بھی قسمت پر فتح یاب نہ ہوسکا۔ منزلِ مقصود کا سواد ضرور نظر آرہا ہے مگر معلوم نہیں کہ وہاں تک پہنچنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ اس وار فتگی اور مایوسی کے عالم میں انھیں بار بار گائتری کی یاد آتی۔ اس کی دلکش تصویر آنکھوں میں پھر جاتی۔ اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی باتیں کانوں میں گونجنے لگتیں اور ان کے دل سے ایک آہِ سرد نکل جاتی۔

گیان شنکر کو اب ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں گائتری مجھے برطرف نہ کر دے۔ وہ خطوط کھولتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں گائتری کا کوئی خط نہ نکل آئے۔ انھوں نے اسے کئی خطوط لکھے تھے۔ مگر ایک کا بھی جواب نہ آیا تھا۔ اس سے انھیں اور بھی الجھن ہوتی تھی۔ مایاشنکر کے خطوط ضرور آیا کرتے تھے مگر ان سے انھیں کچھ تسکین نہ ہوتی تھی۔ بنارس میں کیا ہورہا ہے۔ یہ جاننے کے لیے وہ بے قرار رہتے تھے۔ ایسا کوئی نہ تھا جو وہاں کے حالات بالتفصیل لکھتا۔ کبھی کبھی وہ خود بنارس جانے کا ارادہ کرتے لیکن یہ خوف ہوتا کہ معلوم نہیں کیا نتیجہ ہو۔ یہاں تو اس کی نظروں سے دور پڑا ہوں۔ ممکن ہے کہ کچھ دنوں میں اس کا دل میری طرف سے نرم ہوجائے۔ مجھے دیکھ کر وہ کہیں اور بھی برہم ہوجائے تو رہی سہی امید بھی جاتی رہے۔

اس طرح تین چار مہینے گزر گئے۔ بھادوں کا مہینہ تھا۔ جنم اسٹمی آرہی تھی۔ شہر میں جابجا اس تقریب کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کئی برسوں سے گائتری کے یہاں جنم اسٹمی کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے کیا جاتا تھا۔ دور دور سے گویّے آتے تھے۔ راس لیلا کی منڈلیاں بلائی جاتی تھیں۔ رئیسوں اور حاکموں کو دعوتیں دی جاتی تھیں۔ گیان شنکر نے خیال کیا کہ گائتری کو یہاں بلانے کا یہ ایک اچھا حیلہ ہے۔ ایک طولانی خط لکھا اور باصرار اسے بلایا۔ کرشن مندر کی سجاوٹ ہونے لگی۔ لیکن تیسرے ہی روز جواب آیا کہ میرے یہاں جنم اشٹمی نہ ہوگی۔ کوئی تیاری نہ کی جائے۔ یہ ماتم کا سال میں کسی طرح کا جشن نہیں مناسکتی۔ خواہ وہ مذہبی ہی کیوں نہ ہو۔ گیان شنکر کے دل پر بجلی سی گری۔ سمجھ گئے کہ اب یہاں سے علاحدہ ہونے کے دن قریب آگئے۔ یاس کا رنگ اور بھی گہرا ہوگیا۔ ان کا خوف اس قدر بڑھا کہ ڈاکیا کی صورت دیکھ کر ان کا سینہ دھڑکنے لگتا۔ کسی بگھی یا موٹر کی آہٹ پاکر سر چکرا جاتا کہ کہیں گائتری نہ آرہی ہو۔ دن رات میں بنارس سے چار گاڑیاں آتی تھیں۔ گیان کے لیے یہ سخت آزمائش کے اوقات تھے۔ گاڑیوں کے

آنے کے وقت ان کی نیند خود بخود اچٹ جاتی۔ چار روز تک ان کی یہی حالت رہی۔ پانچویں روز ڈاک سے گائتری کا رجسٹری شدہ خط آیا۔ سرنامہ دیکھتے ہی گیان شنکر کی روح فنا ہوگئی۔ انھیں یقین ہوگیا کہ یہ میری برطرفی کا پروانا ہے ورنہ رجسٹری سے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا۔ لکھا تھا کہ میں آج بدری ناتھ جا رہی ہوں۔ آپ ہوشیاری سے ریاست کا انتظام کرتے رہیے گا۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔ اسی بھروسے پر میں نے یہ جاترا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس کے بعد وہ استدعاء کی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ گیان شنکر کو کچھ اطمینان ہوا۔ لفافہ رکھ دیا اور سوچنے لگے۔ بات وہی ہوئی جو وہ چاہتے تھے۔ گائتری سب کچھ انھیں پر چھوڑ کر چلی گئی۔ جاترا کٹھن ہے راستہ دشوار گزار ہے۔ پانی خراب ہے۔ ان خیالات نے انھیں ذرا دیر کے لیے متفکر کر دیا۔ کون جانتا ہے کیا ہو۔ وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ ایک بار دل میں آیا کہ کیوں نہ میں بھی بدری ناتھ چلوں۔ راستہ میں ملاقات ہو ہی جائے گی۔ وہاں تو کوئی اس کا کان بھرنے والا نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ میں اپنا گیا ہوا اعتبار پھر قائم کرسکوں۔ محبت کے بجھے ہوئے چراغ پھر جلا سکوں۔ اس یاس و امید کے دور کا خاتمہ ہوجاوے۔ گائتری کے بغیر اب انھیں سب کچھ سونا معلوم ہوتا تھا۔ یہ بے انتہا دولت اگر دریائے عیش تھی تو گائتری اس دریا کی کشتی تھی۔ کشتی کے بغیر سیرِ دریا کا لطف کہاں؟ مگر ذرا ہی دیر میں ان کی یہ گھبراہٹ کم ہوگئی۔ انھوں نے سوچا کہ ابھی وہ مجھ سے بھری ہوئی بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اور جل جائے گی۔ میری طرف سے اس کا دل کتنا سخت ہوگیا ہے۔ مایا کو مجھ سے چھینے لیتی ہے۔ اپنے خیال میں اس نے مجھے سخت سے سخت سزا دی ہے۔ ایسی حالت میں میرے لیے سب سے اچھی بات یہی ہے کہ اپنی وفاداری، خوش انتظامی اور رعایا پروری سے اسے خوش کرنے کی کوشش کروں ۔ پریم شنکر نے اچھا نشانہ لگایا۔ بگلا بھگت ہے۔ بیٹھے بیٹھے دو ہزار روپے ماہوار اینٹھنے کا ذریعہ پیدا کرلیا۔ بے چارہ مایا کہیں کا نہ رہا۔ پریم شنکر اسے ایک اچھا خاصا کسان بنا دیں گے۔ لیکن وہ اس کو ایک ہوشیار علاقہ دار نہیں بنا سکتے۔ انھیں کیا خبر کہ روساء کی تربیت کیسی ہونی چاہیے۔ خیر جو کچھ ہو میری حالت اتنی قابلِ افسوس نہیں ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔

گیان شنکر نے ابھی تک اور خطوط نہ کھولے تھے۔ اپنے دل کو اس طرح سمجھا کر

انھوں نے دوسرا لفافہ اٹھایا تو رائے صاحب کا خط تھا۔ ان کے بارے میں گیان شنکر کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وڈیا کی وفات کے بعد وہ اپنا علاج کرانے کے لیے مصوری چلے گئے ہیں۔ خط کھول کر پڑھنے لگے۔

بابوگیان شنکر دعا۔ دو ایک ماہ قبل میری زبان سے تمھارے لیے دعا کا لفظ نہ نکلتا۔ لیکن اب میرے دل کی وہ کیفیت نہیں ہے۔ رشیوں کا قول ہے کہ برائی سے بھلائی پیدا ہوتی ہے۔ میرے حق میں یہ قول حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ تم میرے دشمن ہو کر میرے دوست نکلے۔ تمھاری بدولت مجھے آج یہ مبارک دن نصیب ہوا۔ میں اپنا معالجہ کرانے کے لیے مصوری آیا۔ مگر مجھے یہاں وہ چیز مل گئی جس پر میں ایسی ایسی صدہا زندگیاں نثار کرسکتا ہوں۔ میں عیش وعشرت کا دلدادہ تھا۔ میں نے اپنے دل ودماغ کی ساری قوتیں عیش پسندی کے نذر کر دی تھیں۔ دنیا یا عقبیٰ کی تفکرات کو میں اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتا تھا۔ یہاں مجھے ایک مہاتما کی صحبت کا فیض حاصل ہوگیا اور اب مجھے معلوم ہورہا ہے کہ میری ساری زندگی تلف ہوگئی۔ میں نے یوگ سے عشق کی۔ شیوا اور شکتی کی عبادت کی۔ اپنی مقناطیسی قوتوں کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔ یہاں تک کہ میرا دل قوتِ جاذبہ کا خزانہ ہوگیا۔ مگر ان تمام سرگرمیوں کا مقصود نفس پرستی اور تن پروری تھی۔ کبھی کبھی عیش وعشرت کی محویت میں میں یہ سمجھتا تھا کہ یہی روحانی سرور ہے۔ لیکن اب معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سب محض میرا وہم تھا۔ اسی غفلت کی حالت میں میں اپنے کو روشن ضمیر سمجھتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوجاتا۔ مگر تم نے معالج کی تلاش میں مجھے گھر سے باہر نکالا اور حسنِ اتفاق سے جسمانی امراض کے معالج کے بجائے مجھے روحانی امراض کا معالج مل گیا۔ میرے دل سے تمھارے لیے بار بار دعائیں نکلتی ہیں۔ مگر یاد رکھو کہ میری دعاؤں سے جتنی تمھاری بھلائی ہوگی اس سے کہیں زیادہ برائی گائتری کی سرد آہوں سے ہوگی۔ وڈیا کی خودکشی نے اسے ہوشیار کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں دوسری عورت خوش ہوتی مگر گائتری کا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہوگیا تھا۔ اس نے تمھارے تسخیر کے عمل کو رد کر دیا۔ تمھارا باطن اب گائتری کے لیے ایک کھلا ہوا ورق ہے۔ تم اس کی بددعاؤں کی آگ سے اب کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ تمھیں بہت جلد اس دنیا سے ناشاد و نامراد ہو کر رخصت ہوجانا پڑے گا۔ پس مناسب ہے کہ تم اپنی زندگی کے بقیہ چند دنوں کو اپنی

اصلاح میں گزار دو۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے۔ میں اپنی کل جائداد مایا شنکر کو دیتا ہوں۔ وہ ہونہار لڑکا ہے اور خاندان کا نام روشن کرے گا۔ اس کے بالغ ہونے تک تم ریاست کا انتظام کرتے رہو۔ مجھے اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس خط کو پڑھ کر گیان شنکر کے دل پر خوشی کی جگہ ایک موہوم دہشت کا غلبہ ہوا۔ وہ پیشنگوئیوں کے قائل نہ تھے۔ مگر ایسے بزرگ کے منہ سے اپنی خرابی کی بات سن کر جس کے ترک تعلق سے اس کے روشن ضمیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان کا دل مغموم ہوگیا۔ اس وقت ان کی زندگی کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ انھیں خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ میں اس قدر جلد رائے صاحب کی بہت بڑی جائداد کا مختارِ کل ہوجاؤں گا۔ نہیں وہ اس کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے۔ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ رائے صاحب اسے کسی ٹرسٹ کے حوالہ کرجائیں گے۔ یہ سب اندیشہ پیدا ہوا جو کسی عورت کے دل میں اس کی بائیں آنکھ کے پھڑکنے سے ہوتا ہے۔ ان کی حالت اس وقت اس شخص کی سی تھی جسے ڈاکوؤں کی قید میں مٹھائیاں کھانے کو ملیں۔ سوکھے ٹھنٹھ کا پھولنا کسے متفکر نہ کردے گا۔ وہ ایک گھنٹا تک فکر میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہے۔ اس کے بعد وہ کرشن مندر گئے۔ اور بڑے حوصلہ کے ساتھ جنم اسٹمی کے جلسہ کی تیاریاں کرنے لگے۔

گیان شنکر کی زندگی میں اب سے ایک نیا باب شروع ہوا۔ پہلے سے کہیں زیادہ روشن۔ پرلطف اور مسرت خیز۔ ابھی دس منٹ قبل ان کی کشتئ امید منجدھار میں پڑی چکر کھا رہی تھی مگر دیکھتے دیکھتے لہروں میں سکوں پیدا ہوگیا۔ ہوا موافق ہوگئی اور کشتی ساحل پر آ پہنچی جہاں نگاہ کی حد تک مُرادوں کا ہرا بھرا گلزار نظر آرہا تھا۔

(۵۴)

بابو جوالا سنگھ کو بنارس آئے ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ کل تو وہ تکانِ سفر کے باعث دن بھر آرام کرتے رہے مگر صبح ہوتے ہی انھوں نے لکھن پور والوں کی اپیل کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ پریم شنکر نے کہا۔ میں تو آپ ہی کا منتظر تھا۔ پہلے مجھے ہر کام میں اپنے اوپر اعتماد ہوتا تھا۔ لیکن آپ سا دستگیر پاکر اب مجھے قدم قدم پر آپ کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا اپنے اوپر سے اعتماد ہی اٹھ گیا۔ آپ کے خیال میں اپیل کے لیے کتنے روپیوں کی ضرورت ہوگی۔

جوالا۔ زیادہ نہیں تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور ہی درکار ہوں گے۔
پریم۔ اور میرے پاس تو چار پانچ سو روپے بھی نہیں۔
جوالا۔ اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ آپ کے نام پر دس بیس ہزار مل سکتے ہیں۔
پریم۔ میں ایسا کون سا قومی لیڈر ہوں جس سے لوگوں کو اتنی عقیدت ہوگی۔
جوالا۔ پبلک آپ کو آپ سے زیادہ سمجھتی ہے۔ میں آج ہی چندہ وصول کردوں گا۔
پریم۔ مجھے امید نہیں کہ آپ کو اس میں کامیابی ہوگی۔ ممکن ہے کہ دو چار سو روپے مل جائیں۔ لیکن لوگ یہی سمجھیں گے کہ انھوں نے بھی کمانے کھانے کا یہ ڈھنگ نکالا۔ چندہ کے ساتھ ہی لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے۔ آپ تو دیکھتے ہی ہیں کہ چندہ نے ہمارے کتنے پیشواؤں کو بدنام کر دیا۔ ایسا شاید ہی کوئی شخص ہو جو چندے کے چکر میں پڑکر بے داغ نکل گیا ہو۔ میرے پاس شردھا کے کچھ زیور ابھی بچے ہوئے ہیں۔ اگر وہ سب فروخت کردیے جائیں تو شاید ایک ہزار روپے مل جائیں۔
اسی اثنا میں شیل منی ان لوگوں کے لیے ناشتہ لائی۔ یہ بات اس کے کانوں میں پڑی۔ بولی۔ کبھی ان کی سدھ بھی لیتے ہیں یا صرف ان کے زیوروں پر ہی ہاتھ صاف کرنا جانتے ہیں۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو میرے گہنے لے جایئے۔
جوالا۔ کیوں نہ ہو۔ آپ ایسی ہی سخی تو ہیں۔ ایک ایک زیور کے لیے تو آپ مہینوں روٹھتی ہیں۔ انھیں لے کر کون اپنی جان ضیق میں ڈالے۔
شیل۔ جس آگ سے انسان ہاتھ سینکتا ہے کیا کام پڑنے پر اسی سے اپنے چنے نہیں بھون لیتا۔ عورتیں گہنوں پر جان دیتی ہیں۔ لیکن موقع پڑنے پر انھیں اتار بھی پھینکتی ہیں۔
مایاشنکر ایک طرف اپنی کتاب کھولے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ مگر اس کا دھیان انھیں باتوں کی طرف تھا۔ ایک خیال اس کے دل میں بار بار اٹھ رہا تھا مگر وہ اسے ظاہر کرتے ہوئے شرماتا تھا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ کچھ کہوں مگر پریم شنکر کی طرف دیکھتے ہی اس کی زبان بند سی ہوجاتی تھی۔ اور نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ شیل منی کی باتیں سن کر وہ ضبط نہ کرسکا۔ جوالا کی طرف شرمیلی نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔

جوالا۔ ہاں ہاں شوق سے کہو۔

مایا۔ میرا اس ماہ کا پورا وظیفہ اپیل میں صرف کر دیجیے۔ مجھے روپیوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

شیل منی اور جوالا سنگھ نے مایا کی اس تجویز کو طفلانہ جوش سمجھ کر پریم شنکر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ مایا نے ان کا یہ انداز دیکھ کر سمجھا کہ مجھ سے بے ادبی ہوگئی۔ مجھے ایسے اہم معاملہ میں دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا۔ چچاصاحب میری اس بے ادبی پر ضرور ناراض ہوں گے۔ ندامت سے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس کے منہ سے بے اختیار ایک سسکی نکل گئی۔ پریم شنکر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے دلی جذبات کو سمجھ گئے۔ اسے محبت سے سینہ سے لگا لیا اور اس کی تشفی کرتے ہوئے بولے۔ تم روتے کیوں ہو بیٹا؟ تمھاری یہ فیاضی دیکھ کر میرا دل جتنا خوش ہوا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں گو تم میرے لڑکے ہو مگر میرا جی چاہتا ہے کہ تمھارے پیروں پر سر رکھ دوں۔ تمھارے دل میں رحم بھی ہے اور عقل بھی اور مجھے یقین ہے کہ تمھاری زندگی دوسروں کی بھلائی میں بسر ہوگی۔ لیکن میں نے تمھارے تعلیمی مصارف کا جو تخمینہ تیار کیا ہے وہ تمھارے ماہواری وظیفہ سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

مایا شنکر کو اب کچھ جرأت ہوئی۔ بولا۔ میری تعلیم میں اتنے روپے صرف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

پریم۔ کیوں آخر تمھیں گھر پر پڑھانے کو ماسٹر رہیں گے یا نہیں؟ ایک انگریزی اور حساب پڑھائے گا۔ ایک ہندی اور سنسکرت۔ ایک اردو اور فارسی۔ ایک فرنچ اور جرمن۔ پانچواتمھیں ورزش کرنا۔ گھوڑے پر سوار ہونا۔ کشتی چلانا اور شکار کھیلنا سکھائے گا۔ تاریخ اور جغرافیہ میں خود پڑھاؤں گا۔

مایا۔ میرے درجہ میں جو لڑکے سب سے اچھے ہیں وہ گھر پر کسی ماسٹر سے نہیں پڑھتے۔ میں اپنے کو ان سے کچھ کم نہیں سمجھتا۔

پریم۔ تمھیں ہوا کھانے کے لیے ایک فٹن کی ضرورت ہے۔ سواری کی مشق کے لیے دو گھوڑے بھی چاہیے۔

مایا۔ قصور معاف۔ مگر میرے لیے اتنے ماسٹروں کی ضرورت نہیں ہے۔ فٹن موٹر۔ شکار۔

پولو وغیرہ کو بھی میں فضول سمجھتا ہوں۔ ہاں ایک گھوڑا گھورکھپور سے منگوا دیجیے تو سواری کیا کروں۔ ناؤ کھینے کے لیے میں ملاحوں کے ناوؤں میں جا بیٹھوں گا۔ ان کے ساتھ پتوار گھمانے اور ڈانڈ چلا نے میں جو لطف آئے گا وہ تنہا ماسٹر کے ساتھ بیٹھنے میں نہیں آسکتا۔ ابھی سے لوگ کہنے لگے ہیں کہ اس کا مزاج نہیں ملتا۔ پدمو کئی بار طعنے دے چکے ہیں۔ مجھے نوبڑھے رئیس زادوں کی طرح اپنی ہنسی کرانی منظور نہیں ہے۔ لوگ یہی کہیں گے کہ ابھی کل تک تو ایک ماسٹر بھی نہ تھا آج دوسروں کی دولت پاکر اتنا غرور ہوگیا ہے۔

پریم۔ حفظِ مراتب کا خیال تو ضرور ہے۔

مایا۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ آپ ان لوازمات کے بغیر ہی عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ سبھی آپ کی عزت کرتے ہیں۔ میرے اسکول کے لڑکے بھی آپ کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ حالانکہ شہر کے دیگر روساء کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ میرے لیے کسی خاص سامان کی ضرورت کیوں ہو؟

مایا کے ہر جواب پر یم شنکر کا دل غرور سے پھولا جاتا تھا۔ انھیں تعجب ہوتا تھا کہ اس لڑکے میں قناعت اور بے لوثی کا ایسا ظہور کیوں کر ہوا۔ اس عمر میں عموماً لڑکے نمائش اور نمود پر جان دیتے ہے۔ خوش نما کپڑوں سے ان کی سیر ہی نہیں ہوتی۔ چمک دمک والی چیزوں پر لٹو ہوجاتے ہیں۔ غرور سے زمین پر قدم نہیں رکھتے۔ یہ اگلے جنم کا سنسکار ہے اور کچھ نہیں۔ لاجواب ہو کر بولے۔ رانی گائتری کی یہی خواہش تھی۔ ورنہ اتنے روپے کیوں کر خرچ کرتی۔

مایا۔ اگر ان کی یہی خواہش ہوتی تو کیا وہ مجھے تعلقداروں کے اسکول میں نہیں بھیج سکتی تھیں۔ مجھے آپ کی خدمت میں رکھنے کا یہ منشاء تھا کہ میں آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلوں۔

پریم۔ تو یہ روپے خرچ کیوں کر ہوں گے؟

مایا۔ اس کا فیصلہ رانی اماں نے آپ ہی کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ مجھے آپ اسی طرح رکھیے جیسے آپ اپنے لڑکوں کو رکھتے ہیں۔ مجھے ایسی تعلیم نہ دیجیے اور ایسے تکلفات کا عادی نہ بنایئے کہ میں اپنی غریب رعایا کے رنج وغم میں شریک نہ ہوسکوں۔ آپ

کے خیال میں کیا میری تربیت و تعلیم کی بہترین صورت یہی ہے جو آپ نے تجویز کی ہے؟

پریم۔ نہیں میرا خیال تو ایسا نہیں مگر دنیا کو دِکھانے کے لیے ایسا ہی کرنا پڑے گا ورنہ لوگ یہی کہیں گے کے میں تمھارے وثیقہ کا ناجائز استعمال کر رہا ہوں۔

مایا۔ تو آپ مجھے اس طریقہ پر تعلیم دینا چاہتے ہیں جسے آپ خود مفید نہیں سمجھ رہے ہیں۔ لوگوں کی بدگمانیوں سے بچنے کے لیے آپ نے یہ تجویزیں کی ہیں؟

پریم شنکر۔ شرماتے ہوئے بولے۔ ہاں بات تو یہی ہے۔

مایا۔ میں نے اپنے وظیفے کے خرچ کرنے کی اور ہی تدبیر سوچی ہے۔ آپ برا نہ مانیں تو کہوں۔

پریم۔ ہاں ہاں۔ شوق سے کہو۔ تمھاری باتوں سے میری روح خوش ہوتی ہے۔ میں تمھیں اتنا بیدار مغز نہ سمجھتا تھا۔

جوالا سنگھ نے کہا۔ اس عمر میں میں نے کسی کو اتنا وسیع النظر نہیں دیکھا۔

شیل منی پریم شنکر کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ اس پر آپ ہی کی پرچھائیں پڑی ہے۔

مایا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا وظیفہ غریب لڑکوں کی امداد میں صرف کیا جائے۔ دس دس روپیوں کے ایک سو ننانوے وظیفے دیے جائیں تو میرے لیے دس روپے بچ رہیں گے۔ اتنے میں میرا کام بخوبی چل سکتا ہے۔

پریم شنکر۔ خوش ہو کر بولے۔ بیٹا تمھاری فیاضی قابلِ ستائش ہے۔ تمھیں آفرین ہے۔ تم فرشتہ خصلت ہو۔ کتنا زبردست ایثار ہے۔ کتنی قناعت ہے۔ ایشور تمھارے ان پاک خیالات کو تقویت دے۔ مگر میں تمھارے ساتھ اتنی زیادتی نہیں کرسکتا۔

مایا۔ دو چار وظیفے کم کر دیجیے۔ لیکن یہ وظیفے انھیں طلبا کو دیے جائیں جو اس مزرعہ میں آکر کاشتکاری یا کپڑے بننے کا کام سکھیں۔

جوالا۔ میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ میری رائے میں تمھیں اپنے لیے کم ازکم سو روپے رکھنے چاہیے۔ باقی روپئے تمھاری مرضی کے مطابق صرف کیے جائیں۔ بھائی صاحب فنِ زراعت کے ماہر ہیں۔ بنائی کا کام میں سکھایا کروں گا۔ میں نے اس میں

کافی مہارت پیدا کرلی ہے۔

پریم شنکر جوالا سنگھ کی طرف معترضانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ میں اس معاملہ میں رانی گائتری کی اجازت اور منشاء کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہتا۔

مایا شنکر نے مایوسانہ انداز سے جوالا سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کتاب کے دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔

اسی وقت ڈاکٹر عرفان علی کے دیوان خانہ میں بھی اسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اپنے پیشہ کی مذمت دل کھول کر کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ منطق یا فلسفہ کی پروفیسری کرنے کا بھی ارادہ کرتے تھے مگر ان کے ارادوں میں پختگی نہ تھی۔ نہ ان کے دل میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت تھی۔ مشکل یہ تھا کہ وہ جن باتوں کو ہجو کرتے تھے انھیں عمل میں لاتے ہوئے وہ ذرا بھی نہ ہچکتے تھے۔ جیسے کوئی پرانا مریض پرہیزی کھانوں سے تنگ آکر سبھی طرح کی غذائیں استعمال کرنے لگے۔ انھیں اس پیشہ کی زرپرستی سے سخت نفرت تھی۔ مگر وہ خود موکلوں کو نہایت بے دردی سے نچوڑتے تھے۔ وکلاء کی بدنیتی کا روز ہی رونا روتے تھے مگر آپ کا ہمیشہ وہی شعار تھا۔ انھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ موکل مرے یا جیے۔ ان کی خودغرضی اور بدعہدی ہی کے سبب لکھن پور والوں کا ستیاناس ہوگیا تھا۔

مگر جب سے پریم شنکر نے مفسدوں کے ہاتھوں سے انھیں بچایا تھا اس وقت سے ان کے طور و طریق نیز خیالات میں ایک نمایاں تغیر نظر آتا تھا۔ ان کی ہوس اب اتنی بے دردانہ نہ تھی۔ موکلوں کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آتے۔ ان کے حالات کو نہایت غور سے سنتے۔ مقدموں کی دل لگا کر پیروی کرتے اور اکثر غریب موکلوں سے صرف شکرانہ لے کر ہی صبر کرتے۔ اس حسن اخلاق کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پھر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ پریم شنکر کی صابرانہ اور بے نفس زندگی اور قلبی سکون و اطمینان اس کا خاص سبب تھا۔ انھیں جب موقع ملتا پریم شنکر سے ضرور ملنے جاتے اور ہر ملاقات کے بعد ان کی پاکیزہ نفسی اور سادگی سے متاثر ہو کر لوٹتے تھے۔ اب تک شہر میں کوئی ایسا سچا اور بے لوث شخص نہ تھا جو ان پر اپنا اثر ڈال سکے۔ اپنے ہم چشموں میں وہ کسی کو اپنے سے زیادہ با اصول۔ دانشمند اور ہمدرد

نہ پاتے تھے۔ ایسی حالت میں وہ اپنے ہی کو سب سے زیادہ نیک سمجھتے تھے۔ اور وکالت کے پیشہ کی ہجو کرکے اپنی ذات کو بسا غنیمت جانتے تھے۔ ان کی خودپسندی کو سرمست بنا دینے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ مگر اب ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا شخص موجود تھا جو انھیں سا عالم اور تحریر و تقریر میں ویسا ہی قابل تھا۔ مگر ساتھ ہی کتنا منکسر مزاج کتنا فیاض۔ کتنا دردمند۔ کتنا سنجیدہ جو ان کی بدعہدی سے ملول ہو کر بھی ان سے کینہ نہ رکھتا تھا۔ پس اب ڈاکٹر صاحب کو اپنی گذشتہ بے عنوانیوں پر افسوس ہوتا تھا۔ وہ تلافی کے ذریعہ اپنی بدنامی کو مٹانا چاہتے تھے۔ اُنھیں ندامت و پشیمانی کی وجہ سے پریم شنکر سے کبھی اپیل کی تحریک کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مگر انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپیل میں دل توڑ کر پیروی کروں گا۔ اور ملزموں کو صاف رہا کرا لوں گا۔وہ اپیل کے مصارف کا بار بھی اپنے ہی ذمہ لینا چاہتے تھے۔وہ مہینوں سے اپیل کی تیاری کر رہے تھے۔ انھوں نے مقدمہ کی مسلوں کا غور سے مطالعہ کرلیا تھا۔ جرحی سوالات کے نوٹ تیار کرلیے تھے اور افتتاحی بحث بھی لکھ ڈالی تھی۔ انھیں اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ جوالا سنگھ کے آنے پر اپیل ہوگی۔ ان کی آمد کا بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔

صبح کا وقت تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو جوالا سنگھ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے جا ہی رہے تھے کہ سید ایجاد حسین تشریف لائے۔ ان کی نورانی صورت پر سیاہ چغہ بہت زیب دیتا تھا۔ مزاج پرسیوں کے بعد سید صاحب نے عرفان علی کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ آپ نے دیکھا۔ ان دونوں بھائیوں نے رانی گائتری کو کیسا شیشہ میں اتار لیا۔ ایک صاحب نے ریاست ہاتھ میں کرلی اور دوسرے صاحب دو ہزار روپے ماہوار کے مستقل وثیقہ دار ہوگئے۔ اس لونڈے کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو روپے خرچ ہوجائیں گے اور کیا۔ دنیا میں کیسے کیسے بگلا بھگت چھپے ہوئے ہیں۔

ایجاد حسین کو بدگمانی کا مرض تھا۔ جب سے انھیں یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ ان کے سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ گویا انھیں کے جیب سے روپے نکلے جاتے تھے۔ یہ کیسا غضب تھا کہ پریم شنکر کو تو دو ہزار روپے ماہوار بلا غل و غش گھر بیٹھے مل جائیں اور ان غریب کو اتنا مکر و فریب کرنے پر بھی معاش کی فکر سے نجات نہ ملے۔

ڈاکٹر صاحب نے طنز سے کہا۔ اس موقع پر آپ چوک گئے۔ اگر آپ رانی صاحبہ

کی خدمت میں ڈیپوٹیشن لے کر جاتے تو اتحادی یتیم خانہ کے لیے ایک ہزار روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر ہوجاتا۔

ایجاد۔ آپ تو جناب مذاق کرتے ہیں۔ میں ایسا خوش نصیب نہیں ہوں مگر دنیا میں کیسے کیسے لوگ پڑے ہوئے ہیں جو ترک واستغنا کا نورانی جال پھیلاکر سونے کی چڑیا پھنسا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے پرملامت نظروں سے دیکھ کر کہا۔ لالہ گیان شنکر کی نسبت آپ جو چاہیں خیال کریں مگر بابوپریم شنکر جیسے نیک نیت آدمی پر آپ کا یوں شبہ کرنا بالکل بے جا ہے اور جب وہ آپ کے مددگاروں میں ہیں تو آپ کا ان کی جانب سے بدگمان ہونا قرینِ انصاف نہیں۔ میں انھیں عرصہ سے جانتا ہوں اور دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا بے لوث آدمی اس شہر میں کیا۔ سارے ملک میں مشکل ہی سے ملے گا۔ وہ اپنے کو مشہور نہیں کرتے مگر قوم کی جو خدمت وہ کر رہے ہیں کاش اور لوگ بھی کرتے تو یہ ملک رشکِ فردوس بن جاتا۔ جو آدمی دس روپے پر زندگی بسر کرے اپنے مزدوروں سے مساوات کا برتاؤ کرے۔ مظلوموں کی حمایت کرنے میں دل و جان سے تیار ہے۔ اپنے اصولوں پر اپنی جائداد تک قربان کردے اس کی نسبت ایسا شک کرنا شرافت سے بعید ہے۔ آپ ان کے ملازموں کو سو روپے ماہوار پر بھی رکھنا چاہیں تو وہ نہ آئیں گے۔ وہ ان کے ملازم نہیں ہیں بلکہ پیداوار میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ گائتری غضب کی مردم شناس عورت معلوم ہوتی ہے۔

ایجاد حسین نے تعجب سے کہا۔ کیا واقعی وہ دس روپے ماہوار پر بسر کرتے ہیں؟ یہ کیوں کر؟

عرفان۔ اپنی ضرورتوں کو کم کرکے۔ ہم اور آپ تکلف کی چیزوں کو ضروریات میں داخل کیے ہوئے ہیں اور شب و روز اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ یہ نفس کی غلامی ہے۔ انھوں نے نفس کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔ ہم لوگ اپنی فرصت کا وقت زمانہ اور تقدیر کی شکایت کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ شب و روز اسی ادھیڑبن میں رہتے ہیں کہ کیوں کر اور ملے۔ اس "اور" کی ہوس میں حلال وحرام کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ انھیں میں نے کبھی اپنی تقدیر کا دکھڑا روتے ہوئے نہیں پایا۔ وہ ہمیشہ

بشاش نظر آتے ہیں گویا انھیں کوئی غم ہی نہیں ہے۔

اسی اثناء میں بابوجوالا سنگھ آپہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ مزاج پرسی کے بعد پوچھا۔ اب تو آپ کا ارادہ یہاں مستقل طور پر رہنے کا ہے نہ۔

جوالا۔ جی ہاں۔ آیا تو اسی ارادہ سے ہوں۔

عرفان۔ فرمایئے۔ اپیل کب ہوگی؟

جوالا۔ اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ اس وقت تو مجھے سید صاحب سے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضور کے درِدولت پر حاضر ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے بابو پریم شنکر نے آپ سے یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ آپ مایاشنکر کے اردو فارسی کا اتالیق بننا منظور فرمائیں گے؟

عرفان۔ منظور کیوں نہ کریں گے۔ آخر گھر میں بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہیں۔ اتحادی جلسے تو سال میں دس پانچ ہی ہوتے ہیں اور فکرِ معاش تو چوبیسوں گھنٹے سر پر سوار رہتی ہے۔ تنخواہ کیا تجویز کی ہے؟

جوالا۔ فی الحال سو روپے ماہوا ملیں گے۔

عرفان۔ بہت معقول ہے۔ کیوں مرزا صاحب منظور ہے نا؟ ایسا موقع آپ کو پھر نہ ملے گا۔

ایجاد حسین۔ نیک ممنونیت کے لہجہ میں کہا۔ دل وجان سے حاضر ہوں۔ میری زبان میں طاقت نہیں ہے کہ اس احسان کا شکریہ ادا کروں۔ حیرت تو یہ ہے کہ مجھے ان سے ایک ہی بار شرفِ نیاز حاصل ہوا اور انھیں میری پرورش کا اتنا خیال ہے۔

جوالا۔ وہ انسان نہیں۔ فرشتہ ہیں۔ آپ کے یتیم خانہ کا کئی بار تذکرہ کر چکے ہیں۔ شاید یتیموں کے لیے کچھ وظیفے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت کل کتنے یتامیٰ ہیں۔

احسان کے اثر نے ایجاد حسین کے دل کو جذباتِ پاک سے معمور کر دیا۔ وہ مبالغہ سے کام نہ لے سکے۔ ایک لمحہ تک وہ کشمکش میں مبتلا رہے مگر بالآخر نیکی غالب آئی، بولے۔ جناب اگر آپ نے کسی دوسرے موقع پر یہ سوال کیا ہوتا تو میں اس کا کچھ اور ہی جواب دیتا۔ مگر آپ صاحبوں کی شرافت اور ہمدردی کا مجھ جیسے دغاباز شخص پر بھی اثر پڑ ہی گیا۔ میرے یہاں دو قسم کے یتامیٰ ہیں۔ ایک مستقل اور دوسرے فصلی۔ ضرورت

کے وقت ان دونوں کی تعداد پچاس سے بھی متجاوز ہوجاتی ہے۔ لیکن فصلی یتیموں کو نکال دیجیے تو صرف دس یتیم رہ جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ انھیں یتیم نہ خیال کریں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مفلس اور کثیر الاولاد والدین کے لڑکے سچے یتیم ہیں۔

ایجاد حسین نے ندامت سے سر جھکا کر کہا...... قبلہ ضرورت انسان سے سب کچھ کرالیتی ہے۔ میں وکیل نہیں۔ بیرسٹر نہیں۔ تاجر نہیں۔ جاگیردار نہیں ۔ ایک معمولی لیاقت کا آدمی ہوں۔ مجھ روسیاہ کے والد ریاست ٹونک میں اعلیٰ منصب دار تھے۔ ہزاروں کی آمدنی تھی۔ اور ہزاروں کا خرچ تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے میں فکرِ معاش سے آزاد رہا۔ کنکوّے اور بیٹروں سے دل بہلاتا رہا۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی خاندان کی پرورش کا بار مجھ پر پڑا۔ اور خاندان بھی وہ جو عیش وتکلف کا عادی تھا۔ میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ جن لوگوں پر والد مرحوم نے اپنا سایہ کر رکھا تھا ان سے منہ موڑ لوں۔ مجھ میں لیاقت نہ تھی مگر خاندانی غیرت موجود تھی۔ اوائل عمری کی بری صحبتوں نے مکر و دغا کے فن میں مشاق کر دیا تھا۔ ٹونک میں گزر بسر کی کوئی صورت نہ دیکھی تو سرکاری ملازمت کرلی اور کئی اضلاع کی خاک چھانتا ہوا یہاں آیا۔ آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ۔ چند روز میں گھر کی بچی کھچی پونجی غائب ہوگئی۔ اب بجز اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ یا تو فاقہ کروں یا گزر بسر کی کوئی نئی سبیل نکالوں۔ سوچتے سوچتے یہی سوجھی جو اب میں کر رہا ہوں۔

عرفان۔ تخمیناً آپ کو سالانہ کتنے روپے مل جاتے ہوں گے؟

ایجاد۔ اب کیا کچھ بھی پردہ نہ رہنے دیجیے گا؟

عرفان۔ ادھوری کہانی نہیں چھوڑی جاتی۔

ایجاد۔ تو جناب کوئی بندھی ہوئی آمدنی تو ہے نہیں اور نہ میں حساب لکھنے کا عادی ہوں۔ جو کچھ مقدر میں لکھا ہے مل جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ایک مہینہ میں ہزاروں کی یافت ہوجاتی ہے اور کبھی مہینوں تک روپیوں کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ مگر کم ہو یا زیادہ۔ اس کمائی میں برکت نہیں ہے۔ ہمیشہ شیطان کی پھٹکار رہتی ہے۔ کتنی ہی عمدہ غذا کھائیے۔ کتنے ہی بیش قیمت کپڑے پہنیے۔ کتنی ہی شان سے رہیے۔ مگر وہ قلبی اطمینان وسکون نہیں حاصل ہوتا جو حلال کی روکھی روٹیوں اور گزی گاڑھوں

میں ہے۔ کبھی کبھی تو اتنا رنج ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے۔ اس زندگی کا خاتمہ ہوجائے تو بہتر ۔ میرے لیے یہ آپ کے سو روپے لاکھوں کے برابر ہیں۔ انشاء اللہ ارشاد بھی جلد ہی کسی نہ کسی کام میں لگ جائے گا۔ تو معاش کی فکر سے نجات ہوجائے گی۔ بقیہ عمر توبہ استغفار میں گزرے گی۔ "اتحاد" کی خدمت اب بھی کرتا رہوں گا مگر اب سے یہ سچی خدمت ہوگی۔ خودغرضی سے پاک۔ اس کا ثواب خدا بابوپریم شنکر کو عطا کرے گا۔

ذرا دیر تک اپیل کے بارے میں مشورہ کرنے کے بعد جوالا سنگھ مرزاصاحب کو ساتھ لے کر حاجی پور چلے۔ ڈاکٹرصاحب بھی ان کے ہم راہ ہوگئے۔

(۵۵)

ہائی کورٹ جیوں ہی دسہرا کی تعطیل کے بعد کھلا۔ اپیل دائر ہوگئی۔ اور اخباروں کے اوراق مقدمہ کی کاروائیوں سے بھرے جانے لگے۔ مسئلہ بڑا پیچیدہ تھا۔ سزا یافتہ ملزمین نے ان شہادتوں کو دوبارہ پیش کرنے کی استدعا کی تھی۔ جن کی بناء پر انھیں سزائیں دی گئی تھیں۔ وکیل سرکار نے اس مطالبہ کی پرزور مخالفت کی۔ مگر عرفان علی نے اس دعویٰ کے ایسے پُرزور دلائل سے تائید کی اور ملزموں کی بے گناہی کو اتنے موثر پیرایہ میں بیان کیا کہ ججان ہائیکورٹ نے مقدمہ کی دوبارہ تحقیقات کا حکم صادر کر دیا۔

عدالت ماتحت نے مجبور ہو کر پھر شہادتوں کو طلب کیا۔ بشیشر شاہ۔ ڈاکٹر پریاناتھ۔ داروغہ خورشیدعالم۔ کرتار سنگھ۔ فیضو اور تحصیلدارصاحب پھر حاضر عدالت ہوئے۔

بشیشر شاہ کا بیان تین روز تک متواتر ہوتا رہا۔ بیان کیا تھا۔ پولیس کے ہتھکنڈوں اور اس کی ریشہ دوانیوں کی ایک طویل اور عبرتناک داستان تھی۔ یہ وہ کمزور۔ انکم ٹیکس سے ڈرنے والا پولیس کے اشاروں پر ناچنے والا بشیشر شاہ نہ تھا۔ ان دو برسوں کی ندامت و پشیمانی اور خدائی آفات نے اس کی بالکل کایا پلٹ کر دی تھی۔ ایک تو اس کا بیان یوں ہی بھنڈا پھوڑ تھا۔ دوسرے عرفان علی کی جرحوں نے رہا سہا پردہ بھی فاش کر دیا۔ وکیل سرکار نے پہلے تو بشیشر کو اپنے پچھلے بیان سے پھر جانے پر دھمکایا۔ جج نے بھی ڈانٹ پلائی مگر بشیشر پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ عرفان علی نے نہایت مودبانہ عرض کی کہ گواہ کا یوں پھرجانا بیشک سزا کے قابل ہے مگر اس مقدمہ کی حالت نرالی ہے۔ یہ سارا طوفان

پولیس کا اٹھایا ہوا ہے۔ اتنے بے گناہوں کی زندگی کا خیال کرکے قانون شہادت کی اتنی سختی سے پابندی نہ کرنی چاہیے۔ اس التماس نے جج صاحبان کو مطمئن کر دیا۔ پُرانے جج صاحب تبدیل ہوگئے تھے اور ان کی جگہ پر یہ نئے صاحب آئے تھے۔

وکیل سرکار نے بھی اپنے موافق خوب جرح کی۔ یہ ثابت کرنا چاہا کہ گاؤں والوں کی تخویف پریم شنکر کی تحریک یا اسی قسم کے دیگر اسباب نے گواہ کو منحرف کر دیا ہے مگر بشیشر کسی طرح بھی دام میں نہ آیا۔ انگریزی اور ہندوستانی اخبارات نے اس واقعہ پر رائے زنی شروع کی۔ انگریزی اخبارت کی رائے تھی کہ گواہ کا یہ انحراف سیاسی جماعت کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ اس نے پولیس کو نیچا دکھانے کے لیے یہ چال چلی ہے۔ عدالت نے اس بیان کو قبول کرنے میں فاش غلطی کی ہے۔ مخبر کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔ ہندوستانی اخبارات کو پولیس کو مطعون کرنے کا بہانہ ملا۔ عدالت میں ابھی مقدمہ پیش ہی تھا مگر اخباروں کی طرف سے تقاضے ہونے لگے کہ ان تمام افسران پولیس کی تنبیہ ہونی چاہیے۔ ایک گرم اخبار نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ ہندوستان میں پولیس رعایا کے حفظِ جان و مال کے لیے نہیں بلکہ جان و مال کے اتلاف کے لیے ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو بخوبی ثابت ہوجائے گا کہ یہاں کے ستاسی فیصدی جرائم کی ذمہ دار پولیس ہی ہے۔ بعض اخبارات کوپولیس کی آڑ میں زمینداروں کے مظالم کا خوفناک کرشمہ دکھائی دیتا تھا۔ انھیں زمینداروں کی دست درازیوں پر زہر اگلنے کا زریں موقع ہاتھ آیا تھا۔ کئی اخبارات نے زمینداروں کی بیکسی اور بدحالی پر آنسو بہانے شروع کیے۔ یہ تحریک ہونے لگی کہ گورنمنٹ کی جانب سے زمینداروں کو ایسے حقوق ملنے چاہئیں کہ وہ اپنے اسامیوں کو قابو میں رکھ سکیں ورنہ بہت ممکن ہے کہ فتنہ انگیزی کی یہ ناموافق ہوا قوم کے نظامِ تمدن ہی کو منتشر کردے۔

بشیشر شاہ کے بعد ڈاکٹر پریاناتھ کی شہادت ہوئی۔ افسرانِ پولیس کو ان کی جانب سے پورا اطمینان تھا۔ مگر جب ان کا بیان سنا تو ششدر ہوگئے۔ ان کے حیرت کی انتہا نہ تھی گویا کوئی نئی دنیا قائم ہوگئی تھی۔ وہ شخص جو پولیس کا دست راست بنا ہوا تھا۔ جو پولیس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی تھا۔ جس نے پولیس کی بدولت ہزاروں روپے کمائے ہو۔ وہ آج یوں دغا دے جاوے۔ آئینِ وفا کو اس بے دردی سے پامال کرے!

ڈاکٹر صاحب نے صاف کہہ دیا کہ میرا پہلا بیان طبی اصولوں کی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ مقتول کے دل و جگر کی حالت دیکھ کر میں نے غلط نتیجہ اخذ کیا تھا۔ بیان دینے کے قبل مجھے کتاب دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ ان اعضاء میں خون کا منجمد ہوجانا اس امر کی قاطع دلیل تھی کہ ان کا فعل ناگہانی طور پر بند ہوگیا تھا۔ قتل کے پہلے گلا گھوٹنے سے ان اعضا کی حرکت بتدریج بند ہوئی اور اتنی مقدار میں خون کا انجماد ممکن نہ تھا۔ اپنی دلیل کی تائید میں انھوں نے کئی مشہور ڈاکٹروں کی رائیں بھی پیش کیں۔ ڈاکٹر عرفان علی نے بھی اس بحث پر کئی مستند طبی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ان جرحی سوالات نے پریاناتھ کے بیان کو اور بھی وزن دار بنا دیا۔ تیسرے روز وکیل سرکار کی جرح شروع ہوئی۔ انھوں نے جب طبی سوالات پر پریاناتھ کو قابو میں آتے نہ دیکھا تو ان کی نیت پر حملہ کرنے لگے۔

وکیل۔ کیا یہ سچ ہے کہ پہلے جس روز اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا تھا اس روز لوگوں نے آپ کے بنگلہ پر جاکر آپ کو گھیر لیا تھا؟

پریا۔ جی ہاں۔

وکیل۔ اس وقت بابو پریم شنکر نے آپ کو زد و کوب سے بچایا تھا؟

وکیل۔ جی ہاں۔ وہ نہ آجاتے تو میری جان نہ بچتی۔

وکیل۔ یہ بھی سچ ہے کہ آپ کو بچانے میں وہ مجروح ہوگئے تھے؟

پریا۔ جی ہاں۔ انھیں بہت چوٹ آئی تھی۔ شانہ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

وکیل۔ آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ وہ ایک دوررس آدمی ہیں اور ملزموں سے انھیں گہری ہمدردی ہے۔

پریا۔ جی ہاں۔ ایسا ہی ہے۔

وکیل۔ ایسی حالت میں یہ امر بالکل یقینی ہے کہ انھوں نے آپ کو ملزمین کی حمایت پر آمادہ کیا ہو؟

پریا۔ مجھ سے اور ان سے اس بارے میں کبھی بات چیت بھی نہیں ہوئی۔

وکیل۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے احسانات نے آپ کو نادانستہ طریقہ پر مجبور کیا ہو؟

پریا۔ میں اپنے ذاتی جذبات کو اپنے فرائضِ منصبی سے علاحدہ رکھتا ہوں اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے بابو پریم شنکر ہی مجھ سے بدظن ہوجاتے۔

وکیل صاحب ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر آتے تھے مگر پریاناتھ چالاک مچھلی کی طرح ہر مرتبہ چارہ کتر کر نکل جاتے تھے۔ دو دن تک جرح کرنے کے بعد بالآخر وہ ہار کر بیٹھ رہے۔

داروغہ خورشیدعالم کا بیان شروع ہوا۔ یہ ان کے سابق بیان کی بجنسہٖ نقل تھی۔ مگر دوسرے روز عرفان علی کی جرح نے ان کا بالکل قلع قمع کردیا۔ بے چارے بہت تڑپھڑائے پر اس جال سے نہ نکل سکے۔

عرفان علی کو اب اپنی کامیابی کا یقین ہوگیا۔ وہ آج عدالت سے باہر نکلے تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ وہ اس کے قبل بھی بڑے بڑے مقدمات کی پیروی کرچکے تھے۔ اور دونوں جیب نوٹوں سے بھرے ہوئے گھر چلتے تھے لیکن ان کا دل کبھی اتنا خوش نہ ہوا تھا۔ پریم شنکر تو ایسے خوش تھے گویا لڑکے کی شادی ہو رہی ہے۔

اس کے بعد تحصیلدارصاحب کا بیان ہوا۔ وہ گھنٹوں تک لکھن پور والوں کی بدمعاشی اور فتنہ پردازی کا آلھا گاتے رہے۔ لیکن ڈاکٹر عرفان علی نے ان کے کل پرزے ڈھیلے کردیے۔

عرفان۔ آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب ملزم لکھن پور کے خاص آدمیوں میں ہیں؟

تحصیلدار۔ ہوسکتے ہیں مگر ذات کے اہیر۔ جوالا ہے اور کُرمی ہیں۔

عرفان۔ اگر کوئی چمار لکھ پتی ہوجائے تو آپ اس سے جوتے گٹھوانے کا کام لیتے ہوئے ہچکیں گے یا نہیں؟

تحصیلدار۔ ان آدمیوں میں کوئی لکھ پتی نہیں ہے۔

عرفان۔ مگر سب کاشتکار ہیں۔ مزدور نہیں۔ ان سے آپ کو گھاس چھلوانے کا کیا حق تھا؟

تحصیلدار۔ سرکاری ضرورت۔

عرفان۔ کیا یہ سرکاری ضرورت مزدوروں کو اجرت دے کر کام کرانے سے رفع نہ ہوسکتی تھی؟

تحصیلدار۔ مزدوروں کی تعداد اس موضع میں زیادہ نہیں ہے۔

عرفان۔ آپ کے چپراسیوں میں اہیر، کُرمی یا جوالا نہ تھے۔ آپ نے انھیں سے یہ کام کیوں نہ لیا؟

تحصیلدار۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو اُن سے ہی یہ کام لیے جاتے ہیں۔
عرفان۔ آپ جانتے ہے کہ زمین لیپنا کس کا کام ہے؟
تحصیلدار۔ یہ کسی خاص ذات کا کام نہیں ہے۔
عرفان۔ مگر آپ کو اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ عموماً اہیر اور ٹھاکر یہ کام نہیں کرسکتے؟
تحصیلدار۔ ضرورت پڑنے پر کرسکتے ہیں۔
عرفان۔ ضرورت پڑنے پر کیا آپ اپنے گھوڑے کے آگے گھاس نہیں ڈال دیتے؟ کیا اس لحاظ سے آپ اپنے کو سائیس کہلانا پسند کریں گے؟
تحصیلدار۔ میری حالت کا ان کاشتکاروں سے مقابلہ نہیں ہوسکتا۔
عرفان۔ بہرحال آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو لوگ جس کام کے عادی نہیں ہیں اور اسے کرنا اپنی ذلت سمجھتے ہیں ان سے وہ کام لینا سخت بے انصافی ہے۔ کوئی برہمن خوشی سے آپ کے برتن نہ دھوئے گا۔ اگر آپ اس سے جبراً یہ کام لیں تو وہ چاہے اسے خوف کے سبب کردے مگر اس کا دل زخمی ہوجائے گا۔ وہ موقع پانے پر آپ کی شکایت کرے گا۔
تحصیلدار۔ ہاں آپ کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے مگر کبھی کبھی افسروں کو مجبور ہوکر سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔
عرفان۔ تو آپ کو ایسی حالت میں ملائم الفاظ سننے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ لکھن پور والوں پر کیوں الزام رکھیے۔ یہ منصفانہ فطرت کا قصور ہے۔ اب تو آپ تسلیم کریں گے کہ ان کاشتکاروں سے جو بے ادبی ہوئی وہ آپ کی زیادتیوں کا نتیجہ تھی۔
تحصیلدار۔ افسروں کی آسائش کے لیے......

تحصیل دار صاحب کا مطلب سمجھ کر جج نے انھیں روک دیا۔

عرفان علی جب شام کو اپنے گھر پہنچے تو انھیں بابوگیان شنکر کا ضروری تار ملا۔ انھوں نے ایک ضروری مقدمہ کی پیروی کے لیے فی الفور طلب کیا تھا۔ ایک ہزار روپے روزانہ محنتانہ کا وعدہ تھا۔ ڈاکٹرصاحب نے تار پھاڑ کر پھینک دیا اور فوراً تار سے جواب دے دیا کہ افسوس ہے۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ میں لکھن پور کے معاملہ کی پیروی کر رہا ہوں۔

گائتری کی حالت اس وقت اس مسافر کی سی تھی جو سادھوؤں کے بھیس والے ڈاکوؤں کے جال میں پڑ کر لٹ گیا ہو۔ یہ اس مسافر کی طرح پچھتاتی تھی کہ میں نا وقت چلی کیوں؟ میں نے چلتی ہوئی سڑک کیوں چھوڑ دی؟ میں نے بھیس بدلے ہوئے سادھوؤں پر اعتبار کیوں کیا اور انھیں اپنے روپیوں کی تھیلی کیوں دکھائی؟ اسی مسافر کی طرح اب وہ ہر مسافر کو توہم کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ یہ سانحہ اس کے لیے ہزاروں نصیحتوں سے زیادہ عبرتناک اور سبق آموز تھا۔ اب اسے یاد آتا تھا کہ ایک سادھو نے مجھے پرشاد کھلایا تھا۔ ذرا دور چل کر مجھے پیاس لگی تو اس نے مجھے شربت پلایا۔ جسے پیاس کی شدت کے سبب میں نے شکم سیر ہوکر پی لیا۔ اب اسے یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ یہ پیاس اسی پرشاد کا نتیجہ تھی۔ جیوں جیوں وہ اس واقعہ پر غور کرتی تھی اس کے سارے کرشمے علت و معلول کے رشتہ میں بندھے ہوئے نظر آتے تھے۔ گائتری نے اپنے زیورات تو بنارس ہی میں اتار کر شردھا کو سونپ دیے تھے۔ اب اس نے رنگین کپڑے بھی ترک کر دیے۔ پان کھانے کی شائق تھی۔ اسے بھی چھوڑ دیا۔ آئینہ و شانہ کو تربینی میں ڈال دیا۔ لذیذ کھانوں کو بھی خیرباد کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ انھیں شوق والی باتوں نے میرے نفس کو بے قابو کردیا تھا۔ میں اپنی عصمت پروری کے غرور میں عیش کوشیوں کو بے ضرر سمجھتی تھی۔ مجھے یہ نہ سوجھتا تھا کہ لذات دنیوی صرف حواسوں کی متابعت پر قانع نہیں ہوتیں بلکہ وہ رفتہ رفتہ نفس کو بھی اپنا مطیع بنالیتی ہیں۔ اب وہ صرف ایک سفید ساڑی پہنتی تھی۔ ننگے پاؤں چلتی تھی اور روکھا سوکھا کھانا کھاتی تھی۔ وہ اپنے نفس سے انتقام لے رہی تھی۔ وہ اسے کچل ڈالنا چاہتی تھی۔ شیشہ جیوں جیوں صاف ہوتا ہے اس کے بال زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ گائتری کو اب اپنے نفس کی بداطواریاں صاف نظر آرہی تھیں۔ کبھی کبھی غم وغصہ کے جنون میں اس کا جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرلوں۔ گنگا میں ڈوب مروں۔ اب اسے خواب میں اکثر اپنے شوہر کے درشن ہوتے۔ ان کی دل دوز باتیں جگر کے پار ہوجاتیں۔ ان کی تیز نگاہیں دل کو چھید ڈالتیں۔

بنارس سے وہ الہ آباد آئی اور کئی روز تک جھوسی کے ایک دھرم شالہ میں مقیم رہی۔ یہاں اُسے کئی مہاتماؤں کے درشن ہوئے۔ لیکن ان کے اپدیشوں سے اس کی دلجمعی

نہ ہوتی تھی۔ وہ سب دنیا کے بندے تھے۔ پہلے تو اس سے مخاطب تک نہ ہوئے مگر جیون ہی معلوم ہوا کہ رانی گائتری ہے تو سب گیان اور بیراگ کے پتلے بن گئے۔ گائتری کو معلوم ہوگیا کہ ان کا تیاگ (ترک) محض ان کا نکماپن ہے۔ اور ان کا بھیس صرف خوش اعتقاد بھگتوں کے لیے ایک مایا جال۔ وہ مایوس ہو کر چوتھے روز ہردوار جا پہنچی۔ یہاں مذہب کی ظاہرداری تو بہت زیادہ نظر آئی مگر اصلیت بہت کم۔ جاتری لوگ دور دور سے آئے ہوئے تھے مگر تیرتھ کرنے کے لیے نہیں بلکہ سیر و تماشا کے لیے۔ آٹھوں پہر گنگا کے کنارہ پر شوق اور سنگار کی بہار رہتی تھی۔ گائتری بددل ہوکر تیسرے ہی روز وہاں سے رشی کیش چلی گئی۔ وہاں اس نے کسی سے اپنے کو ظاہر نہ کیا۔ روز پہر رات رہے اٹھتی اور گنگا اشنان کر کے دو تین گھنٹے گیتا کا پاٹ کیا کرتی۔ بقیہ وقت مذہبی کتب کے مطالعہ میں صرف کرتی۔ شام کو سادھو مہاتماؤں کے اُپدیش سنا کرتی۔ اگرچہ وہاں دو ایک تیاگی (تارک الدنیا) مہاتماؤں کے درشن ہوئے مگر کوئی ایسا معرفت شناس نہ ملا جو اس کے دل کو دنیا سے منحرف کردے۔ اتنا ضبط اور اتنی نفس کشی پر بھی وہ دنیاوی تفکرات سے پریشان رہتی۔ معلوم نہیں گھر پر کیا ہو رہا ہے۔ نہ جانے سدا برت چلتا ہے یا گیان شنکر نے بند کر دیا۔ فرش وفروش۔ ساز و سامان کی نہ جانے کیا حالت ہوگی۔ نوکر چاکر چاروں طرف لوٹ مچا رہے ہوں گے۔ میرے دیوان خانہ میں منوں گرد جم گئی ہوگی۔ اب کی بخوبی مرمت نہ ہوئی ہوگی تو چھتیں جابجا پھٹ گئی ہوں گی۔ موٹریں اور بگھیاں ہر روز مانگی جاتی ہوں گی۔ جو شخص بھی اگر دو چار خوشامد کی باتیں کرتا ہوگا لالہ جی اسی کو دے دیتے ہوں گے۔ سمجھتے ہوں گے کہ اب تو میں مالک ہوں۔ باغیچہ بالکل جنگل ہو رہا ہوگا۔ معلوم نہیں کہ کوئی چڑیوں اور جانوروں کی خبر لیتا ہے یا نہیں۔ بے چارے بھوکوں مر گئے ہوں گے یا کوئی مانگ لے گیا ہوگا۔ صندوقوں کی کنجیاں تو شردھا کو دیے آئی ہوں مگر گیان شنکر جیسے بدنیت آدمی سے کوئی بات بعید نہیں۔ اکثر مذہبی کتب کا مطالعہ کرتی یا جپ کرتے وقت یہ تفکرات اُسے آگھیرتی تھیں۔ جس طرح ٹوٹے ہوئے برتن میں ایک طرف سے پانی بھرا تو دوسری طرف سے ٹپک جاتا ہے۔ اسی طرح گائتری ایک طرف تو تزکیۂ نفس کی کوششوں میں سرگرم تھی لیکن دوسری طرف طرح طرح کی فکریں اسے لگی رہتی تھیں۔ وہ سکون۔ وہ یکسوئی نہ حاصل ہوتی تھی جو روحانی ترقی کا خاص ذریعہ ہے۔

تعجب تو یہ ہے کہ وہ ان مکروہات کا خیر مقدم کرتی تھی اور انھیں پیار سے اپنے دل میں جگہ دیتی تھی۔ وہ بنارس سے ارادہ کرکے چلی تھی کہ اب دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھوں گی۔ مگر اب اسے معلوم ہوتا تھا کہ صفائی باطن کے لیے تارک الدنیا ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ میں اپنے گھر پر رہ کر ریاست کا انتظام کرتے ہوئے کیا بے لوث نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کی طبیعت جھنجھلا اٹھتی تھی۔ وہ اپنے کو سمجھاتی کہ اب میرا ریاست سے کیا علاقہ ہے۔ بہت حظ اٹھا چکی۔ اب مجھے نجات ہی کے راستہ پر چلنا چاہیے۔ یہ جنم تو بگڑ ہی گیا۔ اب دوسرا جنم بھی کیوں بگاڑوں؟

اسی کشمکش میں پڑ کر گائتری بدری ناتھ کی جاترا کے لیے تیار نہ ہوسکی۔ رشی کیش میں پڑے پڑے تین مہینے گزر گئے اور جاڑا سر پر آپہنچا۔ جاترا ناممکن ہوگئی۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ پہاڑوں پر برف گرنے لگی تھی۔ صبح کی سنہری کرنوں میں برف سے ڈھکے ہوئے کوہستانی سلسلہ کی خوب صورتی ناقابلِ بیان تھی۔ ایک روز گائتری نے سنا کہ چترکوٹ میں کہیں سے ایسے مہاتما آئے ہیں جن کے صرف درشن ہی سے دل کو سکون مل جاتا ہے۔ وہ اُپدیش بہت کم کرتے ہیں مگر ان کا ایک نظر دیکھ لینا بھی اُپدیشوں سے کہیں زیادہ مؤثر اور فیض رساں ہوتا ہے۔ ان کے چہرہ پر وہ جلال ہے کہ گویا کھرا کندن ہو۔ وہ صرف دودھ پیتے ہیں اور وہ بھی ایک چھٹانک سے زیادہ نہیں۔ مگر ان کا جسم ایسا سڈول اور مضبوط ہے کہ بلند سے بلند پہاڑوں پر بھی بلا تکان چڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ نہ ان کا دم پھولتا ہے۔ نہ پیر کانپتے ہیں اور نہ انھیں پسینہ آتا ہے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر بڑے بڑے یوگی بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ پسونی ندی کے ٹھٹھرے ہوئے پانی میں پہر رات ہی سے کھڑے ہوکر دو تین گھنٹے ریاضت کیا کرتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں کچھ ایسی کشش ہے کہ وحش و طیور بھی ان کے اشاروں کی تعمیل کرتے ہیں۔ گائتری نے ان کے کمال کا یہ تذکرہ سنا تو ان کا درشن کرنے کے لیے بے قرار ہوگئی۔ اس نے دوسرے ہی روز چترکوٹ کی راہ لی۔ چوتھے روز وہ پسونی کے کنارے ایک دھرم شالا میں بیٹھی ہوئی تھی۔

یہاں ہر شخص کی زبان پر انھیں سوامی جی کے چرچے تھے۔ اربابِ شوق دور دور سے آئے ہوئے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ روشن ضمیر ہے۔ کوئی انھیں غیب دان بتلاتا تھا۔

گائتری ان کے کمال کی داستانیں سن سن کر ایسی دیوانی ہوئی کہ اسی وقت جاکر ان کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ لیکن رات ہوجانے کے سبب مجبور تھی۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی کہ میں منہ اندھیرے ہی جاکر مہاتما جی کے پیروں پر گر پڑوں گی اور کہوں گی کہ مہاراج میں‌ابھاگنی ہوں۔ آپ روشن ضمیر ہیں۔ میرا حال آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں اتھاہ جل میں ڈوبی جاتی ہوں۔ اب آپ ہی مجھے ابھار سکتے ہیں۔ مجھے ایسا اُپدیش دیجیے اور میری کمزور روح کو اتنی طاقت عطا کیجیے کہ وہ علائق کی بندشوں سے آزاد ہوجائے۔ میرے دل پر اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اسے آپ اپنی تجلیوں کے انوار سے روشن کردیجیے۔ ان خیالات سے اس پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ گھنٹوں تک پڑی روتی رہی۔ اس کے خیال میں وہ تازگی پیدا ہوگئی کہ سوامی جی کے تشفی آمیز الفاظ بھی اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ جیوں ہی میں ان کے پیروں پر گروں گی وہ پریم سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہیں گے۔ "بیٹی۔ تجھ پر بڑی مصیبت پڑی ہے۔ ایشور تیرا کلیان کریں گے۔" جاڑے کی لمبی رات کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ بار بار اٹھ کر دیکھتی کہ تڑکا تو نہیں ہوگیا ہے۔ مگر آسمان پر جگمگاتے ہوئے تاروں کو دیکھ کر ہر بار مایوس ہوجاتی تھی۔ پانچویں بار جب وہ اٹھی تو پو پھٹ رہی تھی۔ ستارے کسی نغمۂ شیریں کی آخری صداؤں کی طرح غائب ہوتے جاتے تھے۔ آسمان ایک عارفِ خرقہ پوش کی طرح تھا جس کا چہرہ کیفِ باطن کے سرور سے بشاش نظر آرہا ہو۔ اور زمین ایک رازِ حقیقت تھی۔ شبنم کی نیلی چادر میں چھپی ہوئی۔ گائتری نے فوراً پسونی میں غسل کیا اور سوامی جی کی زیارت کے لیے چل پڑی۔

سوامی جی کی کٹی ایک بلند پہاڑی پر تھی۔ وہاں وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں چٹانوں کے فرش پر بھگت لوگ آآکر بیٹھتے جاتے تھے۔ چڑھائی دشوار تھی مگر شوقِ ارادت لوگوں کو اوپر لیے جاتا تھا۔ ناتوانی اور خستگی نے بھی جذبۂ عقیدت کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ نیچے سے اوپر تک آدمیوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ گائتری نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دور چڑھ کر اس کا دم پھول گیا۔ پیر من من بھر کے ہوگئے۔ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ لیکن وہ دم لے لے کر ہاتھوں اور گھنٹوں کے بل چٹانوں پر چڑھتی ہوئی اوپر جا پہنچی۔ اس کا سارا جسم پسینہ سے تر تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ لیکن

اوپر پہنچتے ہی اس کا دل ایسا خوش ہوا جیسے کسی پیاسے کو پانی مل جائے۔ گائتری کے سینہ میں دھڑکن سی ہونے لگی۔ ندامت اور پشیمانی کا ایسا روح فرسا احساس اُسے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس مہاتما کو کون سا منہ دکھاؤں؟ اُسے سوامی جی کی طرف تاکنے کی جرأت نہ ہوئی جیسے کوئی شخص صراف کے ہاتھوں میں کھوٹا سکہ دیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ وہ اسی حیص بیص میں تھی کہ دفعتاً اس کے کانوں میں آواز آئی..... گائتری میں بہت دیر سے تیرا منتظر ہوں۔ یہ راشئے کملانند کی آواز تھی۔ درد اور محبت میں ڈوبی ہوئی۔ گائتری نے چونک کر سامنے دیکھا۔ سوامی جی اس کی طرف چلے آرہے تھے۔ ان کے پُر جلال چہرہ پر رقت نمایاں تھی اور آنکھوں میں محبت کے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گائتری کی آنکھیں جھک گئیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا میں تیز لہروں میں بہی جارہی ہوں۔ ہائے میں اس بڑے مہاتما کی لڑکی! پشیمانی نے کہا آہ۔ گنہگار! حیا نے کہا۔ آہ عقبت سوز! مایوسی بولی۔ آہ بدنصیب! رنج نے کہا۔ تجھ پر لعنت! تو اس قابل نہیں کہ دنیا کو اپنا منہ دکھائے۔ گراوٹ میں اب کیا کسر باقی ہے جس کے لیے جینے کی خواہش ہے؟ تیری قسمت میں گیان اور بیراگ نہیں لکھا۔ ان خیالات نے گائتری کو اتنا بے چین کر دیا کہ توبہ اور اصلاح اور ایثار کی ساری خواہشیں مفقود ہوگئیں۔ ان سے دیوانہ وار نیچے کی طرف دیکھا اور جیسے کوئی چوٹ کھائی ہوئی چڑیا اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلائے ہوئے درخت سے گرتی ہے اسی طرح وہ اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلائے ہوئے پہاڑ سے کود پڑی۔ نیچے ایک گہرا کھنڈ تھا۔ اس نے اس کی ہڈیوں کو دنیا کی بیدردانہ نگاہوں سے بچانے کے لیے اپنے سینہ کی گہری تاریکی میں چھپا لیا۔

(۵۷)

لالہ پربھا شنکر نے عاقبت اندیشی کا سبق نہ پڑھا تھا۔ کل کی فکر انھیں کبھی نہ ستاتی تھی۔ ان کی ساری زندگی عیش و عشرت اور خاندانی وضعداری کے نباہنے میں بسر ہوئی تھی۔ کھلانا۔ کھانا۔ اور نام کے لیے مر جانا۔ یہی ان کی زندگی کا معیار تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اسی تثلیث کی پرستش کی تھی۔ اور اپنی موروثی جائداد کا بیشتر حصہ برباد کر چکنے پر بھی وہ اپنے عملی اصولوں میں کسی اصلاح کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ تو اب کسی نئے راستہ پر چلنا ان کے لیے غیر ممکن تھا۔ وہ ایک آزاد اور فراخ دست آدمی تھے۔ دولت ان کی نظروں میں محض وضعداری کے لیے ایک آلہ تھی۔ اس سے ثروت کی افزونی بھی ممکن ہے۔ یہ

بات ان کے خیال میں نہ آئی تھی۔ فکروں کو وہ ہیچ سمجھتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کے ازالہ کے لیے زیادہ سے زیادہ اپنے مہاجن کے دروازہ تک جانا پڑتا تھا۔ ان کا جو روپیہ اور وقت مہمانوں کی تواضع و تکریم میں صرف ہوتا تھا اسے وہ بسا غنیمت خیال کرتے تھے۔ داد و دہش کے مواقع پر ان کی نظر ہمت آسمان پر جا پہنچتی تھی۔ اس سرور کی حالت میں انھیں یہ خیال نہ رہتا تھا کہ پھر کیا ہوگا اور کام کیسے چلیں گے۔ یہ بڑی بہو کا کام تھا کہ اس چڑھی ہوئی ندی کو تھامیں۔ وہ روپے کو ان کی نگاہوں سے اس طرح بچاتی تھیں جیسے چراغ کو ہوا سے بچاتے ہیں۔ وہ بے دھڑک کہہ دیتی تھیں کہ اب یہاں کچھ نہیں ہے۔ لالہ پربھاشنکر ان پر لعنت بھیجنے لگتے۔ کمبخت۔ کم ہمت۔ تنگ دل۔ جو کچھ منہ میں آتا بک ڈالتے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھیں۔ اگر وہ ہمیشہ اسی طریقہ پر چل سکتیں تو اب تک جائداد بچی رہتی۔ مگر لالہ صاحب ایسے موقعوں پر حکمت سے کام لیتے۔ وہ التجاؤں کی اہمیت سے ناواقف نہ تھے۔ بڑی بہو ان کے غیظ و غضب کا سامنا کر سکتی تھیں مگر ان کی شیریں کلامیوں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔

پریم شنکر کی ضمانت کے موقع پر لالہ پربھاشنکر نے جو روپے قرض لیے تھے اس کا بیشتر حصہ ان کے پاس بچ رہا تھا۔ یہ روپے انھوں نے مہاجن کو واپس نہ کیے تھے۔ شاید قرض کے روپیوں کو وہ اپنی کمائی سمجھتے تھے۔ کسبِ زر کا کوئی دوسرا ذریعہ انھیں معلوم ہی نہ تھا۔ بہت دنوں کے بعد اتنے روپے یک مشت ملے تھے گویا ان کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔ رشتہ داروں اور دوستوں کے یہاں تحفے جانے لگے اور احباب کی دعوتیں ہونے لگیں۔ لالہ جی کو کھانا پکانے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے متعلق انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں انواع و اقسام کے لذیذ و نظیف کھانوں کے تیار کرنے کی ترکیبیں درج تھیں۔ انھوں نے حلوائیوں اور باورچیوں کی ناز برداریاں کر کے یہ ترکیبیں سیکھی تھیں۔ وہ نمکوڑیوں کی ایسی لذیذ کھیر پکا سکتے تھے جس پر بادام کا دھوکا ہو۔ سرخ کڑوے مرچوں کا ایسا حلوا بنا سکتے تھے کہ اس پر سوہن حلوے کا گمان ہو۔ آم کی گٹھلیوں کا کباب بنا کر انھوں نے بارہا اپنے قدر شناس دوستوں کو مغالطہ میں ڈال دیا تھا۔ ان کا سوڑے کا مربہ انگور کے مربہ سے بھی زیادہ لذیذ ہوتا تھا۔ اگرچہ ان چیزوں کے تیار کرنے میں روپیہ زیادہ صرف ہوتا تھا۔ دردِ سری بہت کرنا پڑتی تھی اور نقل نقل ہی رہتی

تھی مگر لالہ پربھاشنکر اس معاملہ میں پورے شاعر تھے۔ جن کے لیے دوستوں کی تحسین ہی بہترین صلہ تھی۔ اب کے کئی سال کے بعد انھوں نے اپنے بڑے بھائی کی برسی بڑے حوصلہ کے ساتھ کی۔ بھوج اور دعوتوں کا سلسلہ ہفتوں تک قائم رہا۔ شہر میں ایک سے ایک نامی رئیس تھے مگر ان سے کوئی بھی مقابلہ کرنے کی ہمّت نہ کرسکتا تھا۔

بڑی بہو جانتی تھیں کہ جب تک گھر میں روپے رہیں گے ان کا ہاتھ ہرگز نہ رُکے گا۔ سال چھ مہینے میں ساری رقم خوردبُرد کردیں گے۔ اس لیے جب گھر میں آگ ہی لگائی ہے تو کیوں نہ ہاتھ سینک لیں۔ موقع پاتے ہی انھوں نے اپنی دونوں لڑکیوں کی شادی کی بات چیت شروع کردی۔ اگرچہ لڑکیاں ابھی شادی کے قابل نہ تھیں مگر مصلحت یہی تھی کہ چلتے ہاتھ اس فرض سے سبکدوشی حاصل کرلی جائے۔ جس دن جوالاسنگھ اپیل دائر کرنے کے لیے الہ آباد گئے اسی دن لالہ پربھاشنکر کے برچھا چڑھائی۔ دوسرے ہی روز سے وہ براتیوں کی تواضع وتکریم کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ ایسے نیک کاموں میں وہ کفایت کو معیوب ہی نہیں بلکہ قابلِ سرزنش سمجھتے تھے۔ ان کے ارادے توبہت بڑھے ہوئے تھے مگر خیریت یہ تھی کہ آج کل پریم شنکر عموماً روزانہ ان کی مدد کرنے کو آجاتے تھے۔ پربھاشنکر دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔ اور پس ان کی صلاحیں بالکل بے سود نہ ہوتی تھیں۔ شادی کی تاریخیں اگہن میں پڑتی تھیں۔ یہ ڈیڑھ دو مہینے تیاریوں کے ہی نذر ہوئے۔ پریم شنکر اکثر شام کو یہیں کھانا بھی کھاتے اور کچھ دیر گپ شپ کرکے حاجی پور لوٹ جاتے۔ تعجب تو یہ تھا کہ اب مسٹر گیان شنکر بھی چچاصاحب کے ملتفت معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے گورکھپور سے کئی بار چاول اور شکر اور گھی کے کنستر روانہ کیے تھے۔ شادی کے ایک روز پیشتر وہ خود نہایت کروفر کے ساتھ تشریف لائے۔ کئی مسلح سپاہی ہمراہ تھے۔ فرش قالین دریاں تو اتنی لائے تھے کہ کئی باراتوں کی زینت ہوجاتی۔ دونوں دُلہوں کو ایک ایک سونے کی گھڑی اور ایک ایک موہن مالا دی۔ براتیوں کو کھاتے وقت ایک ایک اشرفی دی۔ دونوں بھتیجوں کے لیے طلائی ہار بنوا لائے تھے اور دونوں سمدھیوں کو ایک ایک سجی ہوئی پالکی بھینٹ کی۔ برات کے نوکروں ۔ کہاروں اور نائیوں کو پانچ پانچ روپے رخصتانہ میں دیے۔ ان کی اس غیر معمولی فیاضی پر سارا گھر تعجب کرتا تھا اور پربھاشنکر تو ان کے ایسے معتقد ہوگئے گویا وہ کوئی دیوتا تھے۔ سارے شہر میں واہ واہ ہونے

لگی۔ لوگ کہتے تھے۔ کہ مرا ہاتھی تو بھی نو لاکھ کا۔ بگڑ گئے۔ پھر بھی حوصلہ اور شان وہی ہے۔ یہ خاندانی رئیسوں کا ہی گروہ ہے۔ دوسرے کیا کھاکر ان کی برابری کریں گے؟ گھر میں لاکھوں بھرے ہوں کون دیکھتا ہے۔ یہی حوصلہ امارت کی پہچان ہے۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ لالہ صاحب نے کس قیمت پر یہ ناموری خریدی ہے؟

شادی کے بعد چند روز تک تو بچی ہوئی چیزوں سے لالہ پربھاشنکر کی زبان کو ذائقہ ملتا رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ دروازہ بھی مسدود ہوا۔ اور پھر روکھا سوکھا کھانا ملنے لگا۔ اس بارش کے بعد اب یہ خشک سالی بہت کھلتی تھی۔ لذیذ کھانوں کے بغیر ان کی آسودگی نہ ہوتی تھی۔ سادہ کھانا ان کے حلق کے نیچے اترتا ہی نہ تھا۔ اکثر چوکے پر سے منہ جھوٹا کر کے اٹھ آتے تھے مگر تمام دن جی للچایا کرتا۔ اپنی بیاض کھول کر اس کی ورق گردانی کرتے کہ کون سی چیز آسانی سے بن سکتی ہے مگر وہاں ایسی کوئی چیز نہ ملتی۔ بے چارے مایوس ہوکر کتاب بند کر دیتے اور دل کو بہلانے کے لیے برآمدے میں ٹہلنے لگتے۔ بار بار گھر میں جاتے۔ الماریوں اور طاقوں کی طرف حسرتناک نگاہوں سے دیکھتے کہ شاید کوئی چیز نکل آئے۔ ابھی تک تھوڑی سی نورتن چٹنی بچی ہوئی تھی۔ کچھ اور نہ ملتا تو سب کی نگاہ بچا کر اس میں سے ایک چمچی نکال کر چاٹ جاتے۔ ستم یہ تھا کہ اس مصیبت میں کوئی ان کا رفیق یا ہمدرد نہ تھا۔ بڑی بہو سے اگر کبھی ڈرتے ڈرتے کسی چیز کی فرمائش کرتے تو یا تو وہ ٹال جاتیں یا جھنجھلا کر کہتیں۔ تمھاری زبان بھی بچوں کی طرح چٹوری ہے کہ جب دیکھو کھانے ہی کی فکر ہے۔ ساری جائداد زردہ اور پلاؤ کی نذر کردی اور ابھی تک تسکین نہیں ہوئی۔ اب کیا رکھا ہے؟ بے چارے لالہ صاحب یہ لعن طعن سن کر خفیف ہوجاتے۔ عشاق کی معشوقوں کے چرچا سے تسکین ہوتی ہے مگر افسوس یہ تھا کہ یہاں کوئی اس کا چرچا کا سننے والا بھی نہ تھا۔

بالآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ خوانچہ والوں کو بلاتے اور ان سے لوزیات کے دانے لے کر مکان کے کسی گوشہ میں جا بیٹھتے اور چپ چاپ مزے لے لے کر کھاتے۔ پہلے ان چیزوں کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہ تھے۔ اب وہ شان بھی نہ تھی۔ ڈیڑھ دو ماہ تک ان کا یہی وطیرہ رہا۔ لیکن کم بضاعت خوانچے والے وعدوں پر کب تک صبر کرتے؟ ان کے تقاضے ہونے لگے۔ لالہ جی جو ان کی عجیب وغریب آوازوں پر کان

لگائے رہتے تھے۔ اب ان کی آواز سنتے ہی چھپنے کے لیے بل ڈھونڈنے لگتے۔ ان کے وعدے اب سچے نہ ہوتے تھے۔ ان میں خوشامد اور بے اعتباری کی شمولیت زیادہ ہوتی تھی۔ معلوم نہیں کہ اس قسم کے تقاضوں سے انھیں کب تک منہ چھپانا پڑتا لیکن حسنِ اتفاق سے ان کے ایفاء کی ایک صورت نکل آئی۔ شردھا نے انھیں ایک روز بازار سے دو جفت ساڑیاں لانے کے لیے قیمت دی۔ وہ ساڑیاں تو اُدھار لائے اور روپے خوانچہ والوں کو دے کر ان سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ بزاز کی طرف ایسے سخت اور رسوا کن تقاضوں کا خوف نہ تھا۔ اسے برسوں تک وعدوں پر ٹالا جاسکتا تھا مگر اس روز سے خوانچہ والوں نے ان کے دروازہ پر جانا ہی ترک کر دیا۔

لیکن چاٹ بری لت ہے۔ خوش بختی کے زمانہ میں وہ گلے کی زنجیر ہے لیکن بے نوائی کی حالت میں تو وہ تیز خنجر بن جاتی ہے جو خودداری اور غیرت کا تسمہ بھی باقی نہیں چھوڑتی۔ ماگھ کا مہینہ۔ سردی کا یہ عالم کہ جسم میں خون تک جما جاتا تھا۔ لالہ پربھا شنکر روز ہواخوری کے بہانے پریم شنکر کے پاس جا پہنچتے اور وہاں اخباری باتیں سنتے موقع پاتے ہی کسی نہ کسی لذیذ غذا کا چرچا چھیڑ دیتے۔ اس وقت کی باتیں کہنے لگتے۔ جب وہ غذا کھائی تھی۔ دوستوں نے اس پر کیا۔ کیا رائے زنی کی تھی۔ پریم شنکر کی ذائقہ طلبی کتنی زبردست تھی۔ اس کا انھیں علم نہ تھا۔ پس کبھی کبھی لالہ جی کا دلی مقصد وہاں بھی حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس وقت وہ گھر آتے وقت سیدھی راہ سے نہ آتے۔ ذائقہ کی ہوس انھیں نانبائیوں کے محلہ میں لے جاتی۔ پیاز اور مسالوں کی خوشبو سے ان کے دل کو تسکین ملتی تھی۔ کتنا دردناک نظارہ تھا۔ ستر سال کا بزرگ آدمی۔ خاندانی عزت و وقار پر جان دینے والا شخص شام سے ذائقہ کا مزہ لینے کے لیے گھنٹوں تک نانبائیوں کی گلی میں گشت لگایا کرتا۔ شرم سے منہ چھپائے ہوئے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ تازہ کباب کی خوشبو سے ان کے منہ میں پانی بھر آتا۔ یہاں تک کہ حرام و حلال کا بھی خیال نہ رہتا۔ اس وقت صرف ایک نامعلوم خوف، ایک موہوم لحاظ ان کے پھسلتے ہوئے پیروں کو سنبھال لیا کرتا تھا۔

ایک روز لالہ جی پریم شنکر کے پاس گئے تو انھوں نے اپیل کا فیصلہ سنایا۔ پربھا شنکر خوش ہو کر بولے۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ ایشور نے تمھاری محنت ٹھکانے لگائی۔ بے چارے

ناکردہ گناہ کسان قید خانہ میں پڑے سڑ رہے تھے۔ ایشور بڑا دیالو(رحیم) ہے اسی خوشی کی تقریب میں ایک دعوت ہونی چاہیے۔

مایا۔ جی ہاں۔ یہی تو ابھی میں بھی کہہ رہا تھا۔ میں تو اپنے اسکول کے سب لڑکوں کو مدعو کروں گا۔

پریم شنکر۔ پہلے بے چارے آ تو جائیں۔ ابھی تو ان کے آنے میں مہینوں کی دیر ہے۔ کوئی کسی جیل میں ہے کوئی کسی میں۔ جج نے تو پولیس کی طرفداری کرنی چاہی تھی مگر ڈاکٹر عرفان علی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

پربھا۔ ان ججوں کا یہی حال ہے۔ ان کا مقصد سرکار کا رعب جمانا ہوتا ہے۔ اسی مقدمہ میں تم نے اتنی دوا دوش نہ کی ہوتی تو ان غریبوں کی کون سنتا؟ ایسے کتنے بے گناہ محض پولیس کی کرشمہ سازیوں اور وکلاء کی نااہلیت کے باعث بے انصافی اور ظلم کے شکار ہوجاتے ہیں۔ میں تو جب وکیلوں کو بحث کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بھاٹ لوگ کبت پڑھ رہے ہوں۔ انصاف پر کسی فریق کی نگاہ نہیں ہوتی۔ دونوں زبان کی طاقت سے ایک دوسرے کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔ جو زیادہ چرب زبان ہے اسی کی فتح ہوتی ہے۔ انسانوں کی زندگی اور موت کا انحصار انصاف کی طاقت پر نہیں بلکہ انصاف کو دھوکا دینے کی طاقت پر ہوتا ہے۔

پریم۔ جب تک مدعی اور مدعاعلیہ اپنے اپنے وکیل عدالت میں لائیں گے اس وقت تک حالت میں اصلاح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وکیل تو اپنے موکل کا ترجمان ہوتا ہے۔ اسے جھوٹ سچ کی تحقیق سے مطلق سروکار نہیں۔ اس کا فرض صرف اپنے موکل کے دعوے کی حمایت اور تائید کرنا ہے۔ حقیقی انصاف کی توقع تو جبھی ہوسکتی ہے جب وکلاء کو عدالت خود ہی مقرر کرے اور عدالت بھی سیاسی جذبات اور اسی قسم کے دیگر اثرات سے پاک ہو۔ میری رائے میں سرکار کو محکمہ پولیس میں نہایت اعلیٰ چال چلن کے آدمیوں کو چن چن کر مقرر کرنا چاہیے۔ ابھی تک اس محکمہ میں نیک چلنی پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا جاتا۔ وہی لوگ داخل کیے جاتے ہیں جو رعایا کو زیر کرسکیں اور ان پر رعب جما سکیں حق و انصاف کا لحاظ بالکل نہیں کیا جاتا۔

پربھا۔ ذرا تجویز تو سناؤ۔ دیکھوں کیا لکھا ہے۔

پریم۔ ہاں سنیے۔ میں ترجمہ کرتا جاتا ہوں۔ دیکھیے پولیس کی کیسی خبر لی ہے۔ یہ مقدمہ پولیس کے طرزِ عمل کی ایک روشن مثال ہے۔ کسی معاملہ کے تعلق سے سچ اور جھوٹ کی تحقیق کے لیے یہ ضروری ہے کہ شہادت پر بالکل غیر جانبدارانہ طریقہ پر غور کیا جائے اور اسی کی بناء پر کوئی رائے قائم کی جائے۔ لیکن اہل کارانِ پولیس کا وطیرہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ پہلے ایک رائے قائم کرلیتے ہیں اور پھر اس کو ثابت کرنے کے لیے شہادت کی تلاش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ اسباب سے نتائج کی طرف نہیں بلکہ نتائج سے اسباب کی طرف چلتے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے مظنہ میں کوئی ترمیم روا رکھیں وہ شہادت ہی کو قطع و بُرید کر کے اُسے اپنے مظنہّ کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔ یہ غلط روش کیوں اختیار کی جاتی ہے اس کا اندازہ کرنا خواہ عموماً دشوار ہو مگر اس مقدمے میں دشوار نہیں۔ ایک مجمع جتنا بوجھ سنبھال سکتا ہے اتنا ایک شخص کے لیے ممکن نہیں۔

پربھاشنکر نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ یہ تو کھلا ہوا الزام ہے۔ پولیس سے جواب تو نہ طلب ہوگا؟

پریم۔ ان باتوں کوکون پوچھتا ہے۔ ان پر کچھ توجہ دی جاتی تو پولیس کب کی سدھر گئی ہوتی۔

اتنے میں جوالاسنگھ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ پریم شنکر نے کہا۔ چچا صاحب فرماتے ہیں کہ اس فتح کی خوشی میں ایک جلسہ کرنا چاہیے۔

جوالا۔ میری بھی یہی رائے ہے۔

(۵۸)

عہدِ طفلی کے بعد ایسا زمانہ آتا ہے جب ایک بے جا جنون سر پر سوار ہوجاتا ہے۔ اس میں شباب کا مستقل ارادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک زبردست امید آفرینی جو مشکل کو آسان اور ناممکن کو بالکل ممکن سمجھتی ہے۔ طرح طرح کے دلکش خیالات دل کو متحرک کیا کرتے ہیں۔ آوارہ گردی پر طبیعت مائل رہتی ہے۔ کبھی جی میں آتا ہے کہ ریل گاڑی میں بیٹھ کر دیکھیں کہ کہاں تک جاتی ہے۔ جنازہ کو دیکھ کر مدفن تک جاتے ہیں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ مداری کے شعبدے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ ہم بھی گلے میں جھولی ڈالے ہوئے

جگہ جگہ گھومتے اور ایسے ایسے ہی تماشے دکھاتے۔ اپنی قابلیت پر ایسا اعتماد ہوتا ہے کہ رکاوٹ کا تو خیال بھی نہیں آتا۔ ایسی سادگی جو الہٰ دین کے چراغ کو ڈھونڈھ نکالنا چاہتی ہے۔ اس وقت اپنی قابلیت کے حدود کی انتہا نہیں ہوتی۔ علمی میدان میں ہم لوکمانیہ تلک کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں نپولین اعظم سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی دنیا پرست فقیر بنتے ہیں۔ کبھی ٹاٹا سے بھی زیادہ دولت مند بن جاتے ہیں۔ ہمیں اس زمانہ میں سادھوؤں اور فقیروں سے ایسی عقیدت ہوتی ہے جو ان کی خاکِ پا کو کیمیا سمجھتی ہے۔
تیج شنکر اور پدم شنکر دونوں ہی ہر وہ گرو تھے۔ گھر پر کوئی ان کی نگرانی کرنے والا نہ تھا جو انھیں ترغیبات سے دور رکھتا۔ ان کے منچلے پن کو ان کے بڑھے ہوئے خیالات کو حسنِ اخلاق کی طرف مائل کرسکتا۔ لالہ پربھاشنکر انھیں مدرسہ میں داخل کراکے ان کی مزید نگرانی غیرضروری سمجھتے تھے۔ دونوں لڑکے گھر سے مدرسہ کو جاتے لیکن دریا کے کنارہ پر گھومنے، بینڈ سننے یا فوج کی قواعد دیکھنے کی خواہش انھیں درمیان ہی میں روک لیا کرتی۔ کتابوں سے دونوں کو نفرت تھی اور دونوں ایک ہی درجہ میں کئی کئی سال فیل ہو جانے کے سبب مایوس ہوگئے تھے۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں علم آ ہی نہیں سکتا۔ ایک بار لالہ جی کی الماری میں اندرجال کی ایک کتاب مل گئی تھی۔ دونوں نے اس کو بڑے شوق سے پڑھا اور اس کے منتروں کو جگانے کی کوشش کرنے لگے۔ دونوں اکثر دریا کی طرف چلے جاتے اور سادھوؤں سنتوں کی باتیں سنتے۔ عملِ تسخیر کی طرح طرح کی داستانیں سن کر ان کے دلوں میں بھی تسخیر کی زبردست خواہش پیدا ہوتی۔ اس خیال سے انھیں ایک فخرآمیز مسرّت حاصل ہوتی تھی کہ ان عملیات کے توسل سے ہم سب کچھ کرسکتے ہیں۔ دفینے نکال سکتے ہیں۔ انھوں نے دو ایک ٹٹکوں کی مشق بھی کی تھی اور اگرچہ ابھی تک ان کی آزمائش کا موقع نہ ملا تھا مگر انھیں اپنی کامیابی پر اٹل بھروسا تھا۔
لیکن جب سے گائتری نے مایاشنکر کو گود لیا تھا رشک اور خودغرضی کی آگ سے دونوں جل رہے تھے۔ یہ جلن انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی چین نہ لینے دیتی۔ جو لڑکا ابھی کل تک ان کے ساتھ کا کھلاڑی تھا اور دفعتاً اتنے اونچے مرتبہ پر پہنچ جائے۔ دونوں یہی سوچا کرتے کہ کوئی ایسا عمل کرنا چاہیے کہ جس کے سامنے دولت و ثروت کی کوئی ہستی ہی نہ رہے۔ جس کے اثر سے وہ مایا شنکر کو نیچا دِکھا سکیں۔ آخر بہت غور و خوض کے

بعد انھوں نے بھیرو منتر کے جگانے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک منتر کی کتاب کھوج نکالی جن میں اس عمل کی ترکیبیں مفصل لکھی ہوئی تھیں۔ دونوں نے کئی روز تک اس منتر کو یاد کیا۔ اس کے حفظ ہوجانے پر یہ صلاح ہونے لگی کہ اس منتر کا جگانا کب سے شروع کیا جاوے۔ تیج شنکر نے کہا چلو۔ آج ہی سے شروع کردیں۔

پدم۔ جب کہو تب۔ بس اسی گھاٹ کی طرف چلیں۔

تیج۔ بس چالیس روز تک ہم یہ منتر جگالیں۔ پھر تو ہم امر ہوجائیں گے۔ بندوق۔ تلوار۔ توپ کا ہم پر کچھ اثر ہی نہ ہوگا۔

پدم۔ یار بڑا مزا آئے گا۔ سینکڑوں برس تک زندہ رہیں گے۔

تیج۔ سینکڑوں! اجی ہزاروں کیوں نہیں کہتے؟ ہمالیہ کے غاروں میں ایسے ایسے سادھو پڑے ہوئے ہیں، جن کی عمریں چار چار سو سال سے زیادہ کی ہیں۔ انھوں نے بھی یہی منتر جگایا ہوگا۔ اب موت کا ان پر کوئی قابو نہیں چلتا۔

پدم۔ ماما بڑی شیخی مارا کرتے ہیں۔ بچہ ایک دن مرجائیں گے۔ سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔ یہاں کیا غم ہے۔ توپ سے بھی نہ ڈریں گے۔

تیج۔ لیکن منتر جگانا آسان نہیں ہے۔ ڈرے اور کام تمام ہوا۔ ذرا بھی چونکے اور وہیں ڈھیر ہوگئے۔ تم نے تو کتاب میں پڑھا ہی ہے۔ کیسی کیسی ڈراؤنی صورتیں نظر آتی ہیں۔ دیو۔ جن۔ بھوت وغیرہ برہنہ تلواریں لیے ہوئے مارنے دوڑتے ہیں۔ اس وقت ذرا بھی خوف نہ کرنا چاہیے۔

پدم۔ میں ذرا بھی نہ ڈروں گا۔ وہ کوئی سچ مچ کے بھوت پلید تھوڑے ہی ہوں گے۔ دیوتا لوگ آزمائش کے لیے ڈراتے ہوں گے۔

تیج۔ ہاں اور کیا۔ سب وہم ہے۔ اپنا کلیجہ مضبوط کیے رہنا۔

تیج شنکر نے غرور سے مسکرا کر کہا۔ میں نے ڈر کو بھون کر کھا لیا ہے۔ وہ میرے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ میں تو سچ مچ کے بھوتوں سے نہ ڈروں۔ خیالی بھوتوں کی کون چلائے۔

پدم۔ تو ہم لوگ امر ہوجائیں گے؟

تیج۔ ضرور۔ اس میں بھی کچھ شک ہے؟

دونوں نے اس طرح مشورہ کرکے منتر جگانا شروع کیا۔ جب گھر کے سب لوگ سو جاتے تو دونوں چپکے سے نکل جاتے اور اسی گھاٹ پر گنگا کے کنارے بیٹھ کر منتروں کے جپ کرتے۔ اس طرح انتالیس دنوں تک دونوں نے مشق کی۔ اس خوفناک امتحان میں وہ کیوں کر پورے اترتے اس کی تشریح کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ انھیں وہ سب خوفناک صورتیں نظر آئیں۔ وہ سبھی مہیب آوازیں سنائی دیں۔ جن کا اس کتاب میں ذکر تھا۔ کبھی معلوم ہوتا کہ آسمان پھٹا پڑتا ہے۔ کبھی آگ کی لہر سی سامنے آتی ہوئی نظر آتی۔ کہیں کوئی بھاری دیو منہ سے شعلے اگلتا ہوا انھیں نگل جانے کو دوڑتا۔ لیکن خوف کی انتہا کا نام جرأت ہے۔ دونوں لڑکے آنکھیں بند کیے بت کی طرح خاموش اور بے حس وحرکت بیٹھے رہتے۔ جپ کرنے کا تو صرف نام ہی نام تھا۔ ان کی ساری قوتیں ان توہمات کو دور رکھنے میں صرف ہوجاتی تھیں۔ یہ خیال کہ ذرا بھی چونکے یا جھجکے یا ڈانوا ڈول ہوئے تو فوراً زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ انھیں اپنی جگہ پر باندھے رہتا تھا۔ میرا بھائی قریب ہی بیٹھا ہوا ہے یہ یقین ان کی تقویت کا ایک خاص سبب تھا۔ حالانکہ اس یقین سے تیج شنکر کو اتنی ڈھارس نہ ہوتی تھی جتنی پدم شنکر کو۔ اسے پدم پر وہ اعتماد نہ تھا جو پدم کو اس پر تھا۔ اس لیے تیج شنکر کے لیے یہ امتحان مقابلتاً زیادہ سخت تھا۔ مگر یہ خدشہ کہ میں ذرا بھی ہلا تو پدم کی جان پر بن جائے گی۔ اس بے اعتمادی کی تھوڑی سی کسر پوری کردیتا تھا۔ ان دنوں دونوں بہت کمزور ہوگئے تھے۔ چہرہ زرد، آنکھیں انتشار آگیں اور لب خشک۔ دونوں سارا دن بے ہوش سے پڑے رہتے۔ کھیل کود، سیر و تفریح سے ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی۔ ہر وقت دل ڈانوا ڈول بنا رہتا یہاں تک کہ انھیں کھانا بھی اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔

اس طرح انتالیس دن گزر گئے اور چالیسواں دن آپہنچا۔ آج صبح ہی سے ان پر ایک اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ توہمات نے زیادہ خوفناک صورت اختیار کی۔ امیدیں بھی قوی ہوئیں۔ دونوں امید و بیم کی حالت میں بیٹھے ہوئے کبھی حیاتِ ابدی کے خیال سے خوش ہوتے اور کبھی آج کی سخت ترین آزمائش کے خوف سے کانپ اٹھتے۔ مگر امید خوف پر غالب تھی۔ سارے شہر میں ہل چل مچ جائے گی۔ ہم لوگ جلتی ہوئی آگ میں کود پڑیں گے اور بے داغ نکل آئیں گے۔ آنچ تک نہ آئے گی۔ اس منڈیر پر سے

بے خوف ہوکر نیچے کود پڑیں گے۔ ذرا بھی چوٹ نہ لگے گی۔ لوگ دیکھ کر دنگ ہوجائیں گے۔ دن بھر دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔ کبھی نیچے آتے۔ کبھی اوپر جاتے۔ کبھی ہنستے۔ کبھی روتے۔ کبھی ناچتے۔ کوئی دوسرا شخص ان کی یہ حالت دیکھ کر سمجھتا کہ پاگل ہوگئے ہیں۔

جب اندھیرا ہوا تو تیج شنکر گھر میں سے ایک تلوار نکال لایا جو لالہ جی نے حال ہی میں جے پور سے منگوائی تھی۔ دونوں نے کمرہ کا دروازہ بند کرکے اسے مٹی تیل سے خوب صاف کیا۔ پھر اسے پتھر پر رگڑا۔ یہاں تک اس میں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ پھر اسے بستر کے نیچے چھپا کر دونوں بازار کی سیر کو نکل گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو نو بج گئے تھے۔ بڑی بہو کے اصرار سے دونوں نے چند لقمے کھائے اور بعدہ اپنے کمرے میں آکر لوگوں کے سو جانے کا انتظار کرنے لگے۔ جیوں جیوں وقت قریب آیا تھا ان کی شعاعِ امید خوف کی تاریکی میں غائب ہوتی جاتی تھی۔ اس وقت ان کی حالت اس مجرم کی سی تھی جس کی پھانسی کا وقت ہر لمحہ قریب تر آتا جارہا ہو۔ طرح طرح سے وسوسے اوہام پیدا ہورہے تھے۔ مگر اس طوفان میں بھی ایک کشتی کا صاف نشان دور سے نظر آرہا تھا۔ جس سے ان کی ہمت بندھ جاتی تھی۔

مقررہ وقت آپہنچا تو دونوں گھر سے نکلے۔ ماگھ کا مہینہ تھا۔ برفیلی ہوا ہڈیوں تک چھبی جا رہی تھی۔ ہاتھ پیر اکڑتے جاتے تھے۔ تیج شنکر نے تلوار کو اپنی چادر کے نیچے چھپا لیا اور دونوں چلے۔ جیسے کوئی بدذہن لڑکا امتحان کے کمرہ کی طرف چلے۔ قدم قدم پر وہ گھبرا کر ٹھٹھک جاتے۔ پھر دل مضبوط کر کے آگے بڑھتے۔ یہاں تک کہ کئی بار انھوں نے لوٹنے کا ارادہ کیا لیکن انتالیس دنوں کی سخت ریاضت کے بعد ثمرۂ ریاضت کے ملنے کے دن ہمت ہار جانا ایک ناقابل عفو کمزوری اور بزدلی تھی۔ اب تو چاہے جو ہو یہ آخری امتحان ضروری تھا۔ اس طرح ڈرتے ہچکتے دونوں گھاٹ پر پہنچ گئے۔ راستہ میں کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

اماوس کی رات تھی۔ آنکھوں کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ستارے بھی بادلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھے۔ تاریکی نے پانی اور ریت۔ زمین وآسمان کو یکساں کر دیا تھا۔ صرف بہاؤ کی ہلکی آواز سے دریا کا پتہ چلتا تھا۔ ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ دریا کی آواز بھی اس میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا ابھی تک کتمِ عدم میں روپوش ہے۔

حیاتِ جاوید آفرینیوں سے قدم قدم پر چونکتے۔ دریا کے کنارے پہنچے اور برہنہ ہو کر پانی میں اترے۔ پانی برف ہو رہا تھا۔ ان کے سارے اعضاء شل ہوگئے۔ نہاکر دونوں ریت پر بیٹھے اور منتر کو جپنے لگے۔ لیکن تعجب تو یہ تھا کہ آج انھیں کوئی ایسا منظر نہ دکھائی دیا جسے وہ دیکھ نہ چکے ہوں اور نہ کوئی ایسی آواز سنائی دی۔ جسے وہ سن نہ چکے ہوں۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ سردی نے توہمات کو بھی دبا دیا تھا۔ خوفناک خیالات میں بھی وہ تازگی باقی نہ رہی۔ دونوں ڈر رہے تھے کہ آج نہ جانے کیسی کیسی مہیب صورتیں دکھائی دیں گی۔ شیطان نہ جانے کن کن طریقوں سے چوٹ کریں گے۔ نہ جانے جان بچے گی یا نہیں۔ لیکن آج اور دنوں سے بھی زیادہ سستے چھوٹ گئے۔

جب وِرد ختم ہوگیا اور دونوں چلہ کشوں نے آنکھیں کھولیں۔ تو آسمان پر صبح کی سرخی نظر آئی۔ زمین آہستہ آہستہ پردۂ تاریکی سے نکلنے لگی۔ دریا کا دوسرا کنارہ اور اس پار والے درخت دکھائی دینے لگے۔ جیسے کسی بے ہوش مریض کے چہرہ پر ہوش کی علامتیں نمودار ہو رہی ہوں۔ دریا کا سیاہ پانی تیزی سے بہہ رہا تھا گویا تاریکی کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتا ہو۔ اس پار کے درخت اس طرح سر جھکائے کھڑے تھے گویا ماتمی جلوس کسی لاش کو دفن کرکے فرطِ غم سے سر جھکائے چلا آتا ہو۔

دفعتاً تیج شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ جے بھیرو کی۔

پدم شنکر نے کڑک کر کہا۔ جے بھیرو کی۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک غیر قدرتی چمک تھی۔ دونوں کے چہروں پر ایک عجیب جلال آشکارا تھا۔

تیج۔ تلوار ہاتھ میں لو۔ میں سر جھکائے ہوئے ہوں۔

پدم۔ نہیں پہلے تم چلاؤ۔ میں سر جھکاتا ہوں۔

تیج۔ کیا اب بھی ڈرتے ہو؟ ہم نے موت کو کچل دیا۔ کال کو جیت لیا۔ اب ہم امر ہیں

پدم۔ نہیں پہلے تمھیں شروع کرو۔ ایسا ہاتھ چلانا کہ ایک ہی وار میں گردن الگ جا گرے۔ مگر یہ بتاؤ کہ درد تو نہ ہوگا؟

تیج۔ کیسا درد؟ ایسا معلوم ہوگا کہ کسی نے پھول سے مارا ہو۔ اسی سے تو کہتا ہوں کہ پہلے تم شروع کرو۔

پدم۔ نہیں۔ پہلے میں سر جھکاتا ہوں۔

تیج شنکر نے تلوار ہاتھ میں لی۔ اسے تولا۔ دو تین بار پینترے بدلے اور پھر "جے بھیرو" کا نعرہ مار کر پدم شنکر کی گردن پر تلوار چلائی۔ ہاتھ بھرپور پڑا۔ تلوار تیز تھی۔ سر دھڑ سے الگ جاگرا۔ خون کا فوارا چھوٹنے لگا۔ تیج شنکر کھڑا مسکرا رہا تھا گویا کوئی پھلجھڑی چھوٹ رہی ہو۔ اس کے چہرہ پر ایک زبردست سکون چھایا ہوا تھا۔ کوئی شکاری بھی طائر کو زمین پر تڑپتا دیکھ کر اتنا مطمئن نہ رہتا ہوگا۔ کوئی کہنہ مشق جلّاد بھی جانور کی گردن پر تلوار چلا کر اتنا پرسکون نہ رہ سکتا ہوگا۔ وہ ایسے مضبوط یقین انداز سے کھڑا تھا جیسے کوئی کبوتر باز اپنے کبوتر کو اڑا کر اس کے لوٹ آنے کی راہ دیکھ رہا ہو۔

لاش کچھ دیر تک تڑپتی رہی اس کے بعد ساکت ہوگئی۔ خون کا فوارہ بند ہوگیا۔ صرف ایک ایک بوند ٹپک رہی تھی۔ جیسے بارش کے بند ہوجانے کے بعد اولتی ٹپکتی ہے۔ مگر دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی علامت نہ نظر آئی۔ ایک منٹ اور گزرا۔ تیج شنکر کو اندیشہ ہوا مگر یقین نے اسے مٹا دیا۔ اس نے گنگاجل کو چلو میں بھر کر اس پر بھیرو کا منتر دم کیا اور پھر اسے لاش پر چھڑک دیا۔ مگر یہ اثر بھی بے اثر رہا۔ اس سربریدہ میں کوئی حرکت نہ ہوئی اس بے جان لاش میں زندگی کی کوئی علامت نہ نظر آئی۔ بھیرو منتر کی مسیحائی بے اثر رہی۔

اب تیج شنکر کے یقین میں تزلزل واقع ہونے لگا۔ اس کتاب میں صاف لکھا تھا کہ سر گردن سے جدا ہوتے ہی اس سے فوراً پھر چمٹ جاتا ہے اور اگر اس عمل میں کچھ دیر ہو تو بھیرو منتر سے دم کیے ہوئے پانی کا ایک چلو کافی ہے۔ یہاں اتنی دیر ہوگئی اور ابھی تک کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ بات کیا ہے؟ مگر یہ غیر ممکن ہے کہ منتر میں اثر نہ ہو۔ کتنے ہی لوگوں نے یہ عمل کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ نہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ابھی جان آئی جاتی ہے۔

اس نے تین چار منٹ تک اور انتظار کیا مگر لاش ایسی ہی ساکت پڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر گنگاجل چھڑکا۔ پھر منتر پڑھا مگر سب بے سود۔ اس نے چلّا کر کہا۔ ہائے ایشور۔ اب میں کیا کروں؟ شمعِ یقین بجھ گئی۔ اس نے مایوسانہ انداز سے دریا کی طرف دیکھا۔ لہریں ڈھاڑیں مارمار کر روتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اشجار غم سے سر دھنتے ہوئے نظر

آئے۔ اس کے منہ سے بے اختیار نالہ وفغاں کی آواز نکل پڑی۔ وہ چیخ مار کر رو پڑا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ میں نے کیسا غضب کیا۔ حیاتِ جاوید کی کوشش کتنی فضول اور باطل تھی۔ ہائے میں کتنا اندھا بیوقوف، کتنا بدمعاش ہوں۔ ہائے جان سے عزیز پدم۔ میں نے جھوٹے اعتقاد کی دُھن میں اپنے ہی ہاتھوں سے انھیں بے درد ہاتھوں سے تمھاری گردن پر تلوار چلائی۔ ہائے میں نے تمھاری جان لی۔ مجھ سا گنہگار اور بدنصیب کون ہوگا؟ اب کون سا منہ لے کر گھر جاؤں؟ اب کون سا منہ دنیا کو دکھاؤں؟ اب جینا بے کار ہے۔ تم مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ اب تمھیں کیسے دیکھوں گا۔ تمھیں کیسے پاؤں گا۔

تیج شنکر کئی منٹ تک انھیں اندوہ ناک خیالات میں ڈوبا ہوا کھڑا روتا رہا۔ ابھی ایک لمحہ قبل اس کے دل میں کیا کیا ارادے تھے۔ کیسی کیسی تمنائیں تھیں۔ وہ سب ارادے خاک میں مل گئے۔ آہ۔ جس بدمعاش مکار نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اسے پاتا تو اسی تلوار سے اس کی گردن کاٹ لیتا۔ اسی کی باتوں میں آکر میں نے اپنے کو تباہ کر دیا۔

ہائے ابھی تک لاش میں جان نہیں آئی۔ اسے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا۔ مایوسی۔ رنج۔ خوفِ انجام۔ جذبۂ محبت۔ پشیمانی ان سبھوں نے اس کے دل کو پامال کردیا۔

اس پر بھی ابھی تک اس کی امید بالکل منقطع نہ ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار ڈرتے ڈرتے کن کنکھیوں سے لاش کو دیکھا مگراب بھی اس میں زندگی کے کوئی آثار نہ نظر آئے۔ اب امیدوں کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ دامنِ صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔

اس نے ایک بار مایوس ہوکر آسمان کی طرف دیکھا۔ بھائی کی لاش پر آخری نگاہ ڈالی۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گیا اور وہی تلوار اپنی گردن پر پھیر لی۔ خون کا فوآرہ نکلا۔ جسم تڑپنے لگا۔ پتلیاں پھیل گئیں۔ قربانی پوری ہوگئی۔ اعتقادِ باطل نے دو خوش نما پھولوں کو بے دردی سے مسل ڈالا۔

آفتاب اپنی خوفناک آنکھوں سے یہ دل دوز نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی زرد ماتمی شعاعیں ان دونوں منتر کے مارے ہوئے نصیبوں پر اس طرح پڑرہی تھیں گویا کوئی شخص رنج وغم سے بیتاب ہوکر ان کے گلے لپٹ کر رو رہا ہو۔

اس سانحۂ روح فرسا نے لالہ پربھاشنکر کو بیہوش سا کر دیا۔ دو ہفتے گزر چکے تھے مگر ابھی تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے تھے۔ دن کے دن چار پائی پر پڑے ہوئے چھت کی طرف دیکھا کرتے۔ راتیں کروٹیں بدلتے کٹ جاتیں۔ انھیں اب اپنا جینا وبال معلوم ہوتا تھا۔ آدمیوں کی صورت سے نفرت تھی۔ اگر کوئی تسکین دہی کے لیے جاتا بھی تو منہ پھیر لیتے۔ صرف پریم شنکر ہی ایک ایسے شخص تھے جن کا آنا ناگوار نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ وہ تشفی کا ایک لفظ بھی نہ نکالتے۔ سچی اور گہری ہمدردی خاموش ہوا کرتی ہے۔

ایک روز پریم شنکر آکر بیٹھے تو لالہ جی کو کپڑے پہنتے ہوئے دیکھا۔ دروازہ پر یکہ بھی کھڑا تھا۔ جیسے کہیں جانے کی تیاری ہو۔ انھوں نے پوچھا کہیں جانے کا ارادہ ہے کیا؟

پربھا شنکر نے دیوار کی طرف منہ پھیر کر کہا۔ ہاں جاتا ہوں۔ اسی بے درد دیا شنکر کے پاس۔ اسی کی منت سماجت کرکے گھر لاؤں گا۔ کوئی یہاں رہنے والا بھی تو چاہیے۔ مجھ سے گرہستی کا بوجھ نہیں سنبھالا جاتا۔ کمر ٹوٹ گئی۔ ناتواں ہوگیا۔ عہد تو یہ کیا تھا کہ اب جیتے جی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔ لیکن پر ماتما کو میرا عہد نباہنا منظور نہ تھا۔ اس کے پیروں پر گرنا پڑا۔ خاندان کا نام ونشان مٹا جاتا ہے۔ کوئی نام لیوا تو رہے۔ مرنے کے بعد چلّو بھر پانی کے لیے تو نہ رونا پڑے۔ میرے بعد چراغ تو نہ گل ہوجائے۔ اب بجز دیا شنکر کے دوسرا کون ہے؟ اسی کی خوشامد کروں گا کہ آکر گھر آباد کر۔ لڑکوں کے بغیر گھر بھوتوں کا ڈیرا ہو رہا ہے۔ دونوں لڑکیاں سسرال ہی چلی گئیں۔ دونوں لڑکے بھیرو جی کے نذر ہوئے۔ اب کس کا منہ دیکھ کر دل کو ڈھارس دوں؟ اور میں تو چاہے سینہ پر سنگِ صبر رکھ کر بیٹھ بھی رہتا مگر تمھاری چچی کو کیا کروں۔ آج دو ہفتے سے زیادہ ہوئے کہ انھوں نے دانہ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ رات دن رویا کرتی ہیں۔ بیٹا۔ سچ پوچھو تو میں ہی دونوں لڑکوں کا قاتل ہوں۔ وہ جیسا چاہتے تھے رہتے تھے۔ جہاں جی چاہتا تھا جاتے تھے۔ میں نے کبھی انھیں نیک راستے پر لگانے کی کوشش نہ کی۔ اولاد کی پرورش و تربیت کس طریقہ پر کرنی چاہیے، اس کی فکر میں نے کبھی نہیں کی۔

پریم شنکر نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ یکہ کا سفر ہے۔ آپ کو تکلیف ہوگی کہیے

تومیں چلا جاؤں۔ کل تک آجاؤں گا۔

پربھا۔ وہ یوں نہ آئے گا۔ اسے کھینچ کر لانا ہوگا۔ وہ بے رحم نہیں ہے مگر صرف غیرت کی وجہ سے نہیں آتا۔ وہاں پڑا روتا ہوگا۔ بھائیوں کو بہت پیار کرتا تھا۔

پریم۔ میں انھیں جبراً کھینچ لاؤں گا۔

پربھا شنکر راضی ہوگئے۔ پریم شنکر اسی وقت روانہ ہوگئے۔ تھانہ یہاں سے بارہ میل پر تھا۔ نو بجتے بجتے پہنچ گئے۔ صرف ایک منشی جی فرش پر بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ پریم شنکر نے ان سے کہا۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر ذرا داروغہ جی سے اطلاع کردیجیے کہ ایک شخص ان سے ملنے آیا ہے۔ منشی جی نے پریم شنکر کو سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر لپک کر اُٹھے۔ ان کے لیے ایک کرسی نکال کر رکھ دی اور پوچھا۔ جناب کا نام پریم شنکر تو نہیں ہے؟

پریم۔ جی ہاں میرا ہی نام ہے۔

منشی۔ آپ خوب آئے۔ داروغہ جی ابھی آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ کا ذکر اکثر کیا کرتے ہیں۔ چلیے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ کانسٹبل سب انھیں کے پاس ہیں۔ وہ کئی روز سے سخت علیل ہیں۔

پریم۔ علیل ہیں؟ کیا شکایت ہے؟

منشی۔ ظاہراً تو بخار ہے مگر باطن کا حال کوئی کیا جانے۔ حالت بہت ابتر ہو رہی ہے۔ جس روز سے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ناوقت وفات کی خبر سُنی اسی روز سے بخار آرہا ہے۔ اس روز سے وہ پھر تھانہ میں نہیں آئے۔ گھر سے باہر نکلنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ پہلے بھی تھانہ میں بہت کم آتے تھے۔ نشہ میں غرق پڑے رہتے تھے۔ زیادہ نہیں تو تین چار بوتل روزانہ ضرور پی جاتے ہوں گے مگر ان پندرہ دنوں میں شراب کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیا۔ کھانے کی طرف تو دیکھتے ہی نہیں۔ یا تو بخار میں بیہوش پڑے رہتے ہیں یا طبیعت ذرا ہلکی ہوتی تو رویا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفلوج ہوگئے ہیں۔ کروٹ تک نہیں بدل سکتے۔ ڈاکٹروں کا تانتا لگا ہوا ہے مگر دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سنا آپ بھی کچھ طبابت کرتے ہیں۔ دیکھیے شاید آپ ہی کا دستِ شفا کارگر ہوجائے۔ بڑا بے مثل آدمی تھا۔ ہم لوگوں کو تو ایسا

صدمہ ہو رہا ہے گویا عزیز اٹھا جاتا ہو۔ پیسے کی محبت تو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ ہزاروں روپئے ماہوار لاتے تھے اور ساری کی ساری رقم تھانہ کے عملوں کو سونپ دیتے تھے۔ روزانہ شراب ملتی جائے۔ بس اس کے سوا اور کوئی ہوس نہ تھی۔ کسی ماتحت سے غلطی ہوجائے مگر کبھی شکایت نہ کرتے بلکہ سارا الزام اپنے ہی سر لے لیتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی حاکم ان کے ماتحتوں کو ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ سکے۔ وہ خود سینہ سپر ہوجاتے تھے۔ ماتحتوں کے خوشی وغم میں اس طرح شریک ہوتے تھے گویا اپنا خاص عزیز ہو۔ کئی کانسٹبلوں کی لڑکیوں کی شادیاں انھوں نے اپنے ہی صرفہ سے کرائیں۔ ان کے لڑکوں کی تعلیم کے لیے اپنے پاس سے فیس دیتے تھے۔ اپنی سخت گیریوں کے لیے سارے علاقہ میں بدنام تھے۔ سارا علاقہ ان کا دشمن تھا مگر تھانہ والے چین کرتے تھے۔ ہم غریبوں کا ایسا غریب پرور اور ہمدرد افسر نہیں ملے گا۔

منشی جی نے ایسے خلوص وعقیدت سے یہ باتیں کہیں کہ پریم شنکر کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ دیا شنکر کو حریص، مکّار اور خودغرض سمجھتے تھے۔ جس کی سختیوں سے سارا علاقہ نالاں تھا۔ جو ننگِ خاندان، ناخلف اور بدچلن تھا۔ جس نے اپنی عیش پسندیوں کی دُھن میں ماں باپ۔ بھائی بہن یہاں تک کہ اپنی بیوی سے بھی منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی نگاہوں میں وہ ایک بے شرم۔ بے درد اور ذلیل شخص تھا۔ منشی جی کی زبانی یہ تعریف سن کر انھیں اپنی تنگ دلی پر افسوس ہوا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے اوپر نفرین کرنے لگے۔ ان کی روحانی تنبیہ پھر آئی۔ آہ مجھ میں کتنا غرور ہے۔ میں کتنی جلد بھول جاتا ہوں کہ یہ ساری کائنات نورِ ابدی سے منور ہو رہی ہے۔ اس کے ایک ایک ذرہ میں وہی روشنی ہے۔ یہاں کسی انسان کو حقیروذلیل سمجھنا ایک ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ منشی جی سے پوچھا۔ ڈاکٹروں نے کچھ تشخیص کی؟ منشی نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ ڈاکٹروں کی کچھ نہ پوچھیے۔ کوئی کچھ بتاتا ہے کوئی کچھ۔ یا تو انھیں خود ہی علم نہیں یا وہ غور سے نہیں دیکھتے۔ انھیں تو اپنی فیس سے مطلب ہے۔ آیئے اندر چلے آیئے۔ یہی مکان ہے۔

پریم شنکر اندر گئے تو کانسٹبلوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کوئی اداس اور مغموم کھڑا تھا۔ کوئی پنکھا جھلتا تھا۔ کمرہ میں سناٹا تھا۔ پریم شنکر کو دیکھتے ہی سبھوں نے سلام کیا اور مغموم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دیاشنکر چارپائی پر پڑے ہوئے

تھے۔ چہرہ زرد اور بدن سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ جیسے کسی ہرے بھرے کھیت کو ٹڈیاں کھا گئی ہوں۔ آنکھیں بند تھیں۔ پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار تھے۔ اور تنفس میں ایک خوفناک تیزی تھی۔ پریم شنکر اس نظارہ کو دیکھ کر تڑپ گئے۔ چارپائی کے قریب جا کر دیا شنکر کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ بھیا!

دیا شنکر نے آنکھیں کھولیں اور پریم شنکر کو غور سے دیکھا گویا کسی بھولی ہوئی شکل کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر نہایت سکون آمیز لہجے میں بولے۔ تم ہو پریم شنکر۔ خوب آئے۔ تمھیں دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ کئی بار تم سے ملنے کا ارادہ کیا مگر شرم سے ہمت نہ پڑی۔ لالہ جی تو نہیں آئے۔ ان سے بھی ایک بار ملاقات ہوجاتی تو خوب ہوتا۔ نہ جانے پھر درشن ہو یا نہ ہو۔

پریم۔ وہ آنے کو تیار تھے مگر میں نے ہی انھیں روک دیا۔ مجھے تمھاری حالت معلوم تھی۔

دیا۔ اچھا کیا۔ اتنی دور یکہ میں آنے میں انھیں تکلیف ہوتی۔ وہ میری صورت نہ دیکھیں یہی بہتر ہے۔ مجھے دیکھ کر انھیں کیا خوشی ہوسکتی ہے۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ ان میں زیادہ بولنے کی طاقت نہ تھی۔ ذرا دم لے کر پھر بولے۔ کیوں پریمو۔ دنیا میں مجھ سے زیادہ بدنصیب اور بھی کوئی ہوگا؟ یہ سب میرے ہی اعمال کا ثمرہ ہے۔ میں ہی خاندان کا دشمن ہوں۔ میں کیا جانتا تھا گناہگار کے گناہوں کی سزا اس قدر سخت ہوتی ہے۔ مجھے اگر کسی سے کچھ محبت تھی تو انھیں دونوں لڑکوں سے۔ میرے گناہوں نے بھیرو بن کر ان......

ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ غشی سی طاری ہوگئی تھی۔ نصف گھنٹہ تک بیہوشی کی حالت میں پڑے رہے۔ تنفس کی تیزی دم بدم بڑھتی جاتی تھی۔ پریم شنکر پچھتا رہے تھے کہ کاش مجھے ان کی حالت کا علم ہوتا تو ڈاکٹر پریاناتھ کو اپنے ساتھ ہی لیتا آتا۔ یہاں تار گھر تو ہے۔ کیوں جی۔ انھیں تار بھیج دوں؟ وہ اسے میرا کام سمجھ کر فیس نہ لیں گے۔ یہی مشکل ہے۔ خیر یہی سہی پر انھیں بلانا ضرور چاہیے۔

یہ سوچ کر انھوں نے تار لکھنا شروع کیا کہ دفعتاً ڈاکٹر پریاناتھ کمرہ میں داخل ہوئے۔ پریم شنکر نے متحیر ہو کر ایک بار ان کی طرف دیکھا اور پھر ان کے گلے سے لپٹ گئے۔ روتے ہوئے بولے۔ آیئے بھائی صاحب۔ اب مجھے پورا یقین ہوگیا کہ ایشور

بیکسوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ آپ کے پاس یہ تار بھیج رہا تھا۔ ان کی جان بچائیے۔

پریاناتھ نے تسکین دیتے ہوئے کہا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں ابھی دیکھتا ہوں کیا کروں۔ مجھے پہلے کسی نے خبر نہیں دی۔ اس علاقہ میں بخار کا زور ہے۔میں کئی گاؤں میں چکر لگاتا ہوا تھانہ کے سامنے سے گزار تو منشی جی نے مجھے یہ حال بتلایا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک آلہ نکال کر دیا شنکر کے سینہ میں لگایا اور خوب غور سے دیکھنے کے بعد بولے۔ پھیپھڑوں پر بلغم آگیا ہے مگر کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے۔ میں دوا دیتا ہوں۔ ایشور نے چاہا تو شام تک ضرور افاقہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوا پلائی اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔ پریم شنکر نے کہا۔ میں شام تک آپ کو نہ چھوڑوں گا۔

پریاناتھ نے مسکرا کر کہا۔ آپ مجھے بھگائیں بھی تو میں نہ جاؤں گا۔ یہ میرے پرانے دوست ہیں۔ ان کی بدولت میں نے ہزاروں روپے کمائے ہیں۔

ایک بوڑھے کانسٹبل نے کہا۔ حجور۔ ان کا اچھا کر دیو تو اور تو نہیں مدا ہم سب جنے آپنا ایک ایک طلب آپ کو نجر کریں۔

پریاناتھ ہنس کر بولے۔ تم لوگوں کو اتنے سستے نہ چھوڑوں گا۔ تمھیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ اب ہم کسی غریب کو نہ ستائیں گے۔ کسی سے زبردستی بیگار نہ لیں گے اور جس کا سودا لیں گے اسے واجبی قیمت دیں گے۔

کانسٹبل۔ بھلا سرکار۔ ہمارا گجر بسر کیسے ہوگا؟ ہمارے تو بال بچّے ہیں۔ دس پندرہ روپیہ میں کیا ہوتا ہے؟

پریا۔ تو اپنے حاکموں سے ترقی کرنے کے لیے کیوں نہیں کہتے؟ سب لوگ مل کر جاؤ اور عرض معروض کرو۔ تم لوگ رعایا کی حفاظت کرنے کے لیے نوکر ہو۔ انھیں ستانے کے لیے نہیں۔ فرصت کے وقت کوئی دوسرا کام بھی کیا کرو جس سے آمدنی میں اضافہ ہو۔ دو تین گھنٹے روزانہ کام کر کے دس بارہ روپے ماہوار کما سکتے ہو۔

کانسٹبل۔ بھلا ایسا کون کام ہے۔ سرکار؟

پریا۔ کام بہت ہے ہاں شرم چھوڑنی پڑے گی۔ اس خیال کو دل سے نکال دینا پڑے گا کہ ہم کانسٹبل ہیں تو اپنے ہاتھوں سے محنت کیسے کریں۔ سچی محنت کی کمائی میں ظلم اور

بے انصافی کی کمائی سے کہیں زیادہ برکت ہوتی ہے۔

منشی جی بولے۔ حضور اس بارے میں قواعد بڑے سخت ہیں۔ پولیس کا ملازم کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتا۔ اگر ہم لوگ کوئی دوسرا کام کرنے لگیں تو برخواست کردیے جائیں۔

پریا۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔ آپ کو فرصت کے وقت کپڑا بننے یا سوت کاتنے یا کپڑے سینے سے روک نہیں سکتا۔ ہاں سرکاری کام میں ہرج نہ ہونا چاہیے۔ آپ لوگوں کو حکام سے عرض معروض کرنا چاہیے۔

منشی۔ حضور۔ کوئی سننے والا بھی تو ہو۔ ہمارا رعایا کا لوٹنا حکاّم کی نگاہوں میں اتنا بڑا جرم نہیں ہے۔ جتنا کچھ عرض معروض کرنا۔ فوراً سازش اور گروہ بندی کا الزام عائد ہوجائے۔

پریا۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہوتا کہ آپ لوگ کوئی ہنر سیکھ کر آزادی سے روزی کماتے۔ معمولی کاریگر بھی آپ لوگوں سے زیادہ کما لیتے ہیں۔

منشی۔ حضور یہ تقدیر کا معاملہ ہے۔ جس کے مقدر میں غلامی لکھی ہے وہ آزاد کیوں کر ہوسکتا ہے؟

دوپہر ہوگئی تھی۔ پریاناتھ نے دوا کی دوسری خوراک دی۔ اتنے ہی میں مہراج نے آکر کہا۔ سرکار۔ رسوئی تیار ہے۔ بھوجن کرلیجیے۔ پریم شنکر وہاں سے اٹھنا نہ چاہتے تھے لیکن پریاناتھ نے انھیں اطمینان دلاکر کہا۔ خواہ ابھی ظاہر نہ ہو مگر پہلی خوراک کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔ شام تک یہ ہوش وحواس کی باتیں کرنے لگیں گے۔

دونوں صاحبان کھانا کھانے گئے۔ مہراج نے خوب مسالادار کھانا تیار کیا تھا۔ دیا شنکر چٹپٹی چیزیں کھانے کے عادی تھے۔ سبھی چیزیں اتنی کڑوی تھیں کہ پریم شنکر دو چار لقمے سے زیادہ نہ کھا سکے۔ آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ پریاناتھ نے ہنس کر کہا۔ آپ کی تو خاصی دعوت ہوگئی۔ مہراج نے تو مدراسیوں کو بھی مات کردیا۔ یہ محرک مسالاجات ہاضمہ کو کمزور بنا دیتے ہیں۔ دیکھو مہراج داروغہ جی جب تک اچھے نہ ہوجائیں، انھیں ایسی چیزیں نہ کھلانا، مسالے بالکل نہ ڈالنا۔

مہراج۔ ہجور۔ میں نے تو آج بہت کم مسالے ڈالے ہیں۔ دروگا جی کے سامنے یہ کھانا جاتا

تو کہتے کہ یہ کیا پھیکی چیز پکائی ہے۔

پریم شنکر نے صرف روکھے چاول کھائے مگر پریاناتھ نے مرچوں کی پراوہ نہ کی۔ دونوں آدمی کھا کر پھر دیاشنکر کے پاس آبیٹھے۔ تین بجے پریاناتھ نے اپنے ہاتھوں سے ان کے سینہ پرایک عرق کی مالش کی اور شام تک دوبار اور دوا دی۔ دیاشنکر ابھی تک خاموش پڑے ہوئے تھے۔ مگر یہ غشی نہیں نیند تھی۔ ان کا تنفس اعتدال پذیر ہو رہا تھا اور چہرے کی زردی مٹی جاتی تھی۔ جب اندھیرا ہوا پریاناتھ نے کہا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ ایشور نے چاہا تو رات بھر میں ان کی حالت بہت بہتر ہوجائے گی۔ اب اندیشہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کل آٹھ بجے تک پھر آجاؤں گا۔ دفعتاً دیاشنکر جاگے۔ ان کی آنکھوں میں اب وہ انتشار نہ تھا۔ پریاناتھ نے پوچھا۔ اب کیسی طبیعت ہے۔

دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے جلتی ریت سے اٹھا کر درختوں کی چھاؤں میں لٹا دیا ہو۔

پریا۔ کچھ بھوک معلوم ہوتی ہے۔

دیا۔ جی نہیں۔ پیاس لگی ہے۔

پریا۔ ۔تو آپ تھوڑا گرم دودھ پی لیں۔ میں اس وقت جاتا ہوں۔ کل آٹھ بجے تک پھر آؤں گا۔

دیاشنکر نے منشی جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرا صندوق کھولیے اور اس میں جو کچھ ہو اسے لا کر ڈاکٹرصاحب کے پیروں پر رکھ دیجیے۔ ڈاکٹرصاحب یہ رقم بہت ناچیز ہے مگر آپ اسے قبول فرمائیں۔

پریا۔ ابھی آپ چنگے تو ہوجائیں۔ میرا حساب ہوجائے گا۔

دیا۔ میں چنگا ہوگیا۔ موت کے منہ سے نکل آیا۔ کل تک مرنے ہی کو جی چاہتا تھا۔ لیکن اب جینے کی خواہش ہے۔ یہ فیس نہیں ہے۔ میں آپ کی فیس دینے کے لائق نہیں ہوں۔ جسمانی شفا کی فیس ہوسکتی ہے۔ مگر معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے مجھے روحانی شفا بخشی ہے۔ اس کی فیس وہ احسان ہے جو مرتے دم تک میرے سر پر رہے گا۔ اور ایشور نے چاہا تو آپ کو اس گناہ آلود کو موت کے چنگل سے بچالینے کا افسوس نہ ہوگا۔

پریا ناتھ نے فیس نہ لی۔ وہ چلے گئے۔ پریم شنکر تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ جب دیاشنکر دودھ پی کر پھر سوگئے تو باہر نکل کر ٹہلنے لگے۔ دفعتاً انھیں لالہ پربھاشنکر یکہ پر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ قریب آتے ہی وہ یکہ سے اتر پڑے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ بیٹا بتاؤ دیاشنکر کی کیا حالت ہے؟ تمھارے چلے آنے کے بعد یہاں سے ایک کانسٹبل میرے پاس پہنچا۔ اس نے کچھ ایسی آواز میں بری خبر سنائی کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ اسی وقت چل کھڑا ہوا۔ گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ سچ سچ بتاؤ بیٹا کیا حال ہے؟

پریم۔ اب تو طبیعت بہت کچھ سنبھل گئی ہے۔ کوئی اندیشہ کا مقام نہیں ہے مگر جب آیا تھا تو واقعی حالت نازک تھی۔ خیریت یہ ہوئی کہ ڈاکٹر پریاناتھ آگئے۔ ان کی دوا نے جادو کا اثر کیا۔ اس وقت سو رہے ہیں۔

پربھا۔ بیٹا چلو۔ ذرا دیکھ لوں۔ دل کو تسکین نہیں ہوتی۔

پریم۔ آپ کو دیکھ کر شاید وہ رونے لگیں۔

پربھاشنکر نے نہایت منت آمیز لہجے میں کہا۔ بیٹا میں ذرا بھی نہ بولوں گا۔ بس ایک نظر دیکھ کر چلا آؤں گا۔ طبیعت بہت گھبرائی ہوئی ہے۔

پریم۔ آیئے مگر دل کو قابو میں رکھیے گا۔ اگر انھیں ذرا بھی آہٹ مل گئی تو دن بھر کی کوشش بیکار ہوجائے گی۔

پربھا۔ بھیا۔ قسم کھاتا ہوں۔ میں ذرا بھی نہ بولوں گا۔ بس دور سے ایک نظر دیکھ کر چلا آؤں گا۔

پریم شنکر مجبور ہوگئے۔ لالہ جی کو لیے ہوئے دیاشنکر کے کمرہ میں گئے۔ پربھاشنکر نے دروازہ ہی سے اس طرح ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا۔ جیسے کوئی بچہّ کالی گھٹا کی طرف دیکھتا ہو کہ کہیں بجلی نہ چمک جائے۔ مگر دیاشنکر کی حالت دیکھتے ہی وہ فرطِ محبت سے بے قرار ہوکر زور سے چیخ اٹھے اور ہائے بیٹا کہہ کر دیاشنکر کے سینے سے لپٹ گئے۔

پریم شنکر نے فوراً کسی قدر بے دردی کے ساتھ ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں کھینچ کر کمرہ کے باہر لائے۔ دیاشنکر نے چونک کر پوچھا۔ کون تھا؟ دادا جی آئے ہیں کیا؟

پریم۔ آپ آرام سے پڑے رہیں۔ اس وقت بات چیت کرنے سے طبیعت بگڑ جائے گی۔

دیا۔ نہیں مجھے ایک لمحہ کے لیے اٹھا کر بٹھادو۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھنا چاہتا ہوں۔

پریم۔ اس وقت نہیں کل اطمینان سے ملاقات کیجیے گا۔
یہ کہہ کر پریم شنکر باہر چلے آئے۔ پربھاشنکر برآمدہ میں کھڑے رو رہے تھے۔
بولے۔ بیٹا ناراض نہ ہو۔ میں نے بہت ضبط کیا مگر دل قابو میں نہ رہا۔ اس وقت میری
حالت اس کشتئ شکستہ پر بیٹھے ہوئے مسافر کی سی ہے جس کے لیے ہوا کا ایک جھونکا بھی
موت کا پیغام ہے۔ سچ سچ بتاؤ ڈاکٹرصاحب کیا کہتے تھے؟
پریم۔ ان کا خیال تھا کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ علامتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔
پربھا۔ ایشور ان کا بھلا کرے۔ مگر مجھے تو اسی وقت اطمینان ہوگا جب یہ اٹھ بیٹھیں گے۔
یہ ان کے گرہ کا سال ہے۔
دونوں آدمی باہر آکر سائبان کے نیچے بیٹھے، دونوں اپنے اپنے خیالات میں محو تھے۔
ذرا دیر کے بعد پربھاشنکر بولے۔ ہم کتنی زیادتی کرتے ہیں کہ اپنی اولاد میں انھیں عیبوں
کو دیکھ کر جو ہم میں خود موجود ہیں اس کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ دیاشنکر میں اور مجھ میں
صرف اس بات پر رنجش تھی کہ وہ گھر کی خبر کیوں نہیں لیتا۔ عیش وعشرت میں کیوں
اپنی ساری کمائی ضائع کر دیتا ہے۔ میری مدد کیوں نہیں کرتا؟ مگر مجھ سے پوچھو کہ تم نے
اپنی زندگی میں کیا کیا؟ میری اتنی عمر عیش وعشرت ہی کے نذر ہوئی ہے۔ اس نے اگر
لٹائی تو اپنی کمائی لٹائی۔ برباد کی تو اپنی کمائی برباد کی۔ میں نے تو بزرگوں کی جائداد کا صفایا
کردیا۔ مجھے اس سے ناخوش ہونے کا کوئی حق نہ تھا۔
تھانہ کے کئی عملے اور کانسٹبل آکر بیٹھ گئے اور دیاشنکر کی ہمدردی اور شرافت کی
تعریف کرنے لگے۔ پربھاشنکر ان کی باتیں سن کر خوشی سے جامہ میں پھولے نہ سماتے
تھے۔
آٹھ بجے تو پریم شنکر نے جاکر پھر دوا پلائی اور وہیں رات بھر ایک آرام کرسی پر
لیٹے رہے۔ ساری رات ان کی پلک بھی نہ جھپکی۔
صبح پریاناتھ آئے اور دیاشنکر کو دیکھا تو بہت خوش ہوکر بولے اب ذرا بھی اندیشہ
کا مقام نہیں ہے۔ ان کی حالت بہت اچھی ہے۔ ایک ہفتہ میں یہ اپنا کام کرنے لگیں
گے۔ دوا سے زیادہ بابوپریم شنکر کی تیمارداری کا اثر ہے۔ شاید آپ رات میں بالکل نہیں
سوئے۔

پربھاشنکر۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ رات بھر ان کی آنکھیں نہیں جھپکیں۔ میں نے کئی بار جھانکا تو یا تو انھیں بیٹھے یا کچھ پڑھتے پایا۔

دیاشنکر نے عقیدت کے لہجے میں کہا۔ جیتا بچا تو بقیہ عمر ان کی خدمت میں گزار دوں گا۔ ان کے ساتھ رہ کر میری زندگی سدھر جائے گی۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ ڈاکٹر پریاناتھ روزانہ آتے اور گھنٹہ بھر تک ٹھہر کر دیہاتیوں کی طرح چلے جاتے، پربھاشنکر تو دوسرے ہی روز گھر چلے گئے۔ لیکن پریم شنکر ایک روز کے لیے بھی وہاں سے نہ ٹلے۔ آٹھویں روز دیاشنکر پالکی میں بیٹھ کر گھر جانے کے قابل ہوگئے۔ ان کی رخصت منظور ہوگئی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ دیاشنکر تھانہ سے چلے۔ اگرچہ وہ صرف تین ماہ کی رخصت پر جا رہے تھے مگر تھانہ کے ملازموں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ان سے ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوٹ رہا ہے۔ سارا تھانہ میل بھر تک پالکی کے ساتھ دوڑتا ہوا ان کے ساتھ آیا۔ لوگ کسی طرح لوٹتے ہی نہ تھے۔ بالآخر پریم شنکر کے بہت دلاسا دینے پر لوگ واپس ہوئے۔ سب کے سب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

پریم شنکر پچھتا رہے تھے کہ ایسے ہردل عزیز اور نیک شخص سے میں اتنے دنوں تک اجتناب کرتا رہا۔ دنیا میں ایسے شریف۔ ایسے دردمند۔ ایسے منکسرمزاج کتنے لوگ ہیں جن کی مٹھی میں اتنے آدمیوں کے دل ہوں اور جن کی جدائی سے سب کو اتنا رنج ہو۔

(٦٠)

ہولی کا دن تھا۔ شہر میں چاروں طرف عبیر اور گلال اُڑ رہا تھا۔ پھاگ اور چوتالے کی دھوم تھی۔ لیکن لالہ پربھاشنکر کے گھر میں سوگ چھایا ہوا تھا۔ شردھا اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی گائتری دیوی کے زیور اور کپڑے سیج رہی تھی کہ اب کے گیان شنکر آئیں تو یہ ساری امانت ان کے سپرد کردوں۔ وِدّیا کے مرنے اور گائتری کے چلے جانے کے بعد سے اس کی طبیعت اکیلے بہت گھبرایا کرتی تھی۔ اکثر دن کے دن بڑی بہو کے پاس بیٹھتی تھی مگر جب سے دونوں لڑکوں کی وفات ہوئی تھی۔ اس وقت سے اس کا دل اور بھی اچاٹ رہتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی شیل منی کے آجانے سے ذرا دیر کے لیے دل بہل جاتا تھا۔ گائتری کے مرنے کی خبر یہاں کل ہی آئی تھی۔ شردھا اسے یاد کرکے ساری رات روتی

رہی۔ اس وقت بھی گائتری کی صورت اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ اس کی سیدھی سادی اور میٹھی میٹھی باتیں یاد آرہی تھیں۔ کتنی فیاض۔ کتنی نیک مزاج۔ کتنی وفا شعار عورت تھی۔ ذرا بھی غرور نہیں۔ مگر ہائے افسوس۔ کتنا حسرتناک انجام ہوا۔ اسی وقت دونوں لڑکوں کا بھی خیال آگیا۔ ہائے دونوں کیسے ہنس مکھ۔ کیسے ہونہار۔ کیسے خوب صورت لڑکے تھے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ آدمی کیسے کیسے ارادے کرتا ہے۔ کیسے کیسے منصوبے باندھتا ہے مگر موت کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ وہ آنِ واحد میں سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ تین مہینے کے اندر ہی پانچ آدمی چل بسے۔ اسی طرح ایک روز میں بھی چل بسوں گی اور دل کی آرزوئیں دل ہی میں رہ جاویں گی۔ آٹھ سال سے ہم دونوں اپنی اپنی ہٹ پر اڑے ہوئے ہیں۔ نہ وہ جھکتے ہیں نہ میں جھکتی ہوں۔ جب اتنے دنوں تک انھوں نے پرائشچت نہیں کیا تو اب ہرگز نہ کریں گے۔ ان کے دل نیک کام کے سبب مطمئن ہے۔ وہ نہ پرائشچت کی ضرورت محسوس کرتا ہے نہ اس کی اہمیت۔ اب مجھ ہی کو دبنا پڑے گا۔ اب میں ہی کسی قابل پنڈت سے پوچھوں کہ میرے کسی انوشٹھان سے ان کا پرائشچت ہوسکتا ہے یا نہیں۔ کیا میری اتنے دنوں کی تپسّیا۔ گنگا اشنان۔ پوجا پاٹ۔ برت نیم سب اکارت جائیں گے؟ مانا کہ انھوں نے پردیس میں کتنے ہی کام اپنے دھرم کے خلاف کیے لیکن جب سے یہاں آئے ہیں اس وقت سے تو برابر اچھے کام کر رہے ہیں۔ غریبوں کی خدمت اور بیکسوں کی دستگیری میں مصروف رہتے ہیں۔ اپنی جان کی بھی پراوہ نہیں کرتے۔ کوئی بڑا سے بڑا دھرماتما بھی دوسروں کی بھلائی میں اتنا نہ لگا رہتا ہوگا۔ انھوں نے اپنے کو بالکل مٹادیا ہے۔ دھرم کے جتنے لچھن کتابوں میں لکھے ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں۔ جس شخص نے اپنے من کو۔ اپنے حواس کو۔ اپنی خواہشات کو گیان کے بل سے جیت لیا ہو کیا اس کے لیے بھی پرائشچت (کفارہ) کی ضرورت ہے؟ کیا کرم یوگ کی قیمت پرائشچت کے برابر بھی نہیں؟ کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جس میں اس مسئلہ پر وضاحت سے بحث کی گئی ہو۔ کوئی ایسا وِدّوان نہیں دکھائی دیتا جو میری شنکاؤں کو دور کردے۔ بھگوان میں کیا کروں؟ انھیں دوبدھوؤں میں پڑی ہوئی ایک دن مرجاؤں گی اور ان کی خدمت کرنے کا ارمان دل ہی میں رہ جائے گا۔ ان کے ساتھ رہ کر میری زندگی سپھل ہوجاتی۔ نہیں تو اس چاردیواری میں پڑے پڑے عمر برباد ہوئی جاتی ہے۔

شردھا انھیں خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دفعتاً اسے دروازہ پر ایک ہلچل سی سنائی دی۔ کھڑکی سے جھانکا تو نیچے صدہا آدمیوں کا ہجوم نظر آیا۔ اتنے میں مہری نے آکر کہا۔ ''بہوجی۔ لکھن پور کے جتنے آدمی کید ہوئے تھے وہ سب چھوٹ آئے ہیں اور دروالجے (دروازہ) پر کھڑے بابوجی کو اسیس رہے ہیں۔ جرا سنو۔ وہ بڈھا داڑھی والا کہہ رہا ہے۔ یااللہ۔ بابوپریم شنکر کو کیامت تک سلامت رکھ۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا سادھو بھی ہے۔ سکھداس نام ہے۔ وہ بجار (بازار) سے یہاں تک روپئے پیسے لٹاتا آیا ہے۔ جان پڑتا ہے کہ کوئی بڑا دھنی آدمی ہے۔

اتنے میں مایاشنکر لپکا ہوا آیا اور بولا۔ بڑی اماں۔ لکھن پور کے سب آدمی چھوٹ آئے ہیں۔ بازار ان کا جلوس نکلا تھا۔ ڈاکٹر عرفان علی۔ بابوجوالاسنگھ۔ ڈاکٹر پریاناتھ۔ چچاصاحب۔ دیا شنکر اور شہر کے سینکڑوں چھوٹے بڑے لوگ جلوس کے ساتھ تھے۔ لاؤ۔ دیوان خانہ کی کنجی دے دو۔ کمرہ کھول کر سب کو بٹھاؤں۔

شردھا نے کنجی نکال کردے دی اور سوچنے لگی ان لوگوں کی کیا خاطر کروں کہ اتنے میں جے جے کا نعرہ سنائی دیا۔ بابوپریم شنکر کی جے۔ لالہ جے شنکر کی جے۔ لالہ پربھاشنکر کی جے!

مایاشنکر پھر دوڑا ہوا آیا اور بولا۔ بڑی اماں۔ ذرا ڈھول مجیرا نکلوا دو۔ بابا سکھ داس بھجن گائیں گے۔ وہ دیکھو وہ داڑھی والا بڈھا۔ وہی قادر خاں ہے۔ وہ لمبا سا نوجوان ہے۔ وہی بلراج ہے۔ اسی کے باپ نے غوث خان کو قتل کیا تھا۔

شردھا کا چہرہ دلی مسرت کے باعث چمک رہا تھا۔ وہ ایسی خوش تھی گویا دروازے پر بارات آئی ہو۔ دل میں طرح طرح کی امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ ان لوگوں کو آج یہیں ٹھہرالوں۔ سب کی دعوت کروں۔ خوب دھوم دھام سے ست نارائن کی کتھا ہو۔ پریم شنکر کے لیے شردھا کے دل میں ایسا جوش پیدا ہو رہا تھا کہ اسی وقت جاکر ان کے پیروں سے لپٹ جاؤں۔ اس نے فوراً ڈھول اور مجیرا نکال کر مایاشنکر کو دیے۔

سکھ داس نے ڈھول گلے میں ڈالا۔ اوروں نے مجیرے لیے۔ حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ اور یہ بھجن گانے لگے۔ پربھو نے موری گئہ کئی بانہہ۔ نہیں رے میں تو جات بھی۔

مایا خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ آکر بولا۔ قادر میاں خوب گاتے ہیں۔

شردھا۔ ان لوگوں کی کچھ آؤ بھگت کرنی چاہیے۔

مایا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ سب کی دعوت ہو۔ تم اپنی طرف سے کہلا بھیجو۔ جو سامان درکار ہو وہ مجھے لکھوا دو کہ میں جاکر آدمیوں کو لانے کے لیے بھیج دوں۔ یہ سب بے چارے اتنے سیدھے غریب ہیں کہ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ انھوں نے غوث خاں کو مارا ہوگا۔ بلراج ہے تو پورا پہلوان پر وہ بھی بہت سیدھا معلوم ہوتا ہے۔

شردھا۔ دعوت میں بڑی دیر لگے گی۔ بازار سے چیزیں آئیں گی۔ بناتے بناتے تیسرا پہر ہوجائے گا۔ اس وقت بیس روپے کی مٹھائی منگوا کر ناشتہ کا انتظام کردو۔ روپے ہیں یا دوں؟

مایا۔ روپے بہت ہیں۔ کیا کہوں۔ مجھے پہلے یہ بات نہ سوجھی۔

دوپہر تک بھجن ہوتے رہے۔ شہر کے ہزاروں آدمی اس جشن میں شریک تھے۔ پریم شنکر نے سب کو خاطر سے بٹھایا۔ اتنے میں بازار سے مٹھائیاں آگئیں۔ لوگوں نے ناشتہ کیا اور پریم شنکر کی تعریف کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ لیکن لکھن پور والوں کو اجازت نہ ملی۔ شردھا نے کہلا بھیجا کہ کھا پی کر شام کو جانا۔ اگرچہ سب کے سب گھر پہنچنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے لیکن اس دعوت کو کیسے نامنظور کرتے۔ لالہ پربھاشنکر کھانا پکوانے لگے۔ اب تک انھوں نے صرف بڑے آدمیوں کو اپنے کمال سے مسرور کیا تھا۔ آج دیہاتیوں کو بھی خوش کرنے کا موقع ملا۔ لالہ جی ایسا لذیذ کھانا دینا چاہتے تھے۔ جو انھیں آسودہ کردے اور جسے وہ ہمیشہ یاد کرتے رہیں۔ طرح طرح کے کھانے بنوانے لگے۔ بہت عجلت کی گئی۔ پھر بھی کھاتے پیتے رات کے آٹھ بج گئے۔ پریاناتھ اور عرفان علی نے اپنی گاڑیاں بھیج دی تھیں۔ انھیں پر سوار ہوکر لوگ لکھن پور چلے۔ سبھوں نے دل سے دعائیں دیں۔ ابھی گھر والے باقی تھے ان کے کھاتے پیتے دس بج گئے۔ پریم شنکر حاجی پور جانے کو تیار ہوئے تو مہری نے آکر آہستہ سے کہا۔ بہو جی کہتی ہیں کہ آج یہیں سو رہیے۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔ شردھا کی اس غیر معمولی دلجوئی نے پریم شنکر کو متحیر کردیا۔ وہ اس کا راز نہ سمجھ سکے۔

جوالاسنگھ نے مہری سے ہنسی میں کہا۔ ہم لوگ بھی رہیں یا چلے جائیں؟

مہری ہوشیار تھی۔ بولی۔ نہیں سرکار آپ بھی رہیں مایا بھیّا بھی رہیں یہاں کس چیز کی کمی ہے۔

جوالا۔ چل باتیں بناتی ہے۔

مہری چلی گئی تو وہ پریم شنکر سے بولے۔ آج معلوم ہوتا ہے آپ کا ستارہ بلند ہے۔ ابھی اور بھی فتح حاصل ہونے والی ہے۔

پریم شنکر نے بے پروائی سے کہا۔ کوئی نیا اپدیش سننا پڑے گا اور کیا۔

جوالا۔ جی نہیں میرا دل کہتا ہے کہ آج دیوی آپ کو بردان (ثمرۂ ریاضت) دیں گی۔ آپ کی تپسّیا پوری ہوگئی۔

پریم۔ میری دیوی جی بھگتوں کے لیے اتنی دل نواز نہیں ہیں۔

جوالا۔ اچھا کل آپ ہی معلوم ہوجائے گا۔ ہمیں اجازت دیجیے۔

پریم۔ کیوں یہیں کیوں نہ سو رہیے؟

جوالا۔ میری دیوی اور بھی جلد روٹھتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ دیاشنکر کے ساتھ چلے گئے۔

مہری نے پریم شنکر کے لیے پلنگ بچھا دیا تھا۔ وہ لیٹے تو قدرتاً دل میں سوال پیدا ہونے لگا کہ شردھا آج کیوں مجھ سے اتنی ملتفت ہوئی ہے؟ کہیں یہ مہری کی شرارت تو نہیں ہے؟ نہیں مہری ایسی شوخ تو نہیں معلوم ہوتی۔ کہیں واقعی اس نے مذاق کیا ہو تو مفت ہی شرمندگی اٹھانی پڑے، شردھا نہ جانے اپنے دل میں کیا خیال کرے۔ آخر کو انھوں نے ان خیالات کو ہٹانے کے لیے گیان شنکر کی الماری سے ایک کتاب نکال لی اور اسے پڑھنے لگے۔

جوالاسنگھ کی پیشن گوئی سچ نکلی۔ آج واقعی ان کی تپسّیا پوری ہوگئی تھی۔ ان کی نیک نامی نے شردھا کے دل کو مسخر کرلیا تھا۔ آج جب سے اس نے صدہا آدمیوں کو دروازہ پر کھڑے ہوئے پریم شنکر کی جے کا نعرہ مارتے دیکھا جبھی سے اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا اتنے دلوں سے نکلی ہوئی دعاؤں کی اہمیت پرائشچت سے کم ہے؟ ہرگز نہیں۔ پراپکار کی اہمیت پرائشچت سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے بلکہ سچا پرائشچت تو پراپکار ہی ہے۔ اتنی دعائیں کسی بڑے گنہگار کی بھی شفاعت کا ذریعہ ہوسکتی ہیں۔ صرف

پرائشچت کی ان کے سامنے کیا حقیقت ہوسکتی ہے؟ اور ان دعاؤں کا آج ہی تھوڑے خاتمہ ہوگیا۔ جب یہ سب لوگ گھر پہنچیں گے تو ان کے سب گھر والے لوگ اور بھی دعائیں دیں گے۔ جب تک دم میں دم رہے گا ان کے دلوں سے روزانہ دعائیں نکلتی رہیں گی۔ ایسے نیک نام اور وفاشعار شخص کو پرائشچت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس دعاؤں کی برکھا نے انھیں پاک کر دیا ہے۔

گیارہ بجے تھے۔ شردھا اوپر سے اتری اور شرماتی ہوئی آکر دیوان خانہ کے دروازہ پر کھڑی ہوگئی۔ لیمپ جل رہا تھا۔ پریم شنکر کتاب دیکھ رہے تھے۔ شردھا کو ان کے چہرہ پر تقدس کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ آج چودہ برس کے بعد اسے اپنے شوہر کی خدمت کرنے کا موقع ملا تھا۔ اب وہ ویراگنی شردھا نہ تھی۔ جس کے دل کی ساری تمنائیں مٹ چکی تھیں۔ اس وقت اس کے دل میں تمناؤں کا ایک طوفان برپا۔ مگر اس کی آنکھوں میں نشہ نہ تھا۔ اس کے نازک ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ اس طرح نہیں آئی تھی۔ جیسے کوئی نئی دلہن اپنے پتی (شوہر) کے پاس آتی ہے۔ وہ اس طرح آئی تھی جیسے کوئی پجارن اپنے دیوتا کے پاس آتی ہے۔ حسنِ عقیدت اور جوشِ پرستش کے خیالات میں ڈوبی ہوئی۔

وہ ایک لمحہ تک دروازہ پر کھڑی رہی۔ پھر جاکر پریم شنکر کے پیروں پر گر پڑی۔

(۶۱)

انسانی فطرت نہ بالکل سیاہ ہوتی ہے نہ بالکل سفید۔ اس میں دونوں رنگوں کا ایک عجیب اتصال ہے۔ اگر حالاتِ گر دو پیش اس کے موافق ہوئے تو وہ فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان۔ وہ حالاتِ مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہے۔ بابوگیان شنکر اگر اب تک خودغرض حریص اور تنگ دل تھے تو یہ انھیں حالات کا اثر تھا۔ گرسنہ شخص اس وقت تک کتے کو لقمے نہیں دیتا جب تک وہ خود آسودہ نہ ہوجائے۔ تنگ خیالی نے ان کی سیاہ باطنی کو اور بھی ظاہر کر دیا تھا۔ وہ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ جس نے خاندانی وقار کو قائم رکھنے کے لیے اپنی فارغ البالی کو فنا کردیا تھا۔ ایسی حالت میں انھیں قناعت ہی سے سکون حاصل ہوسکتا تھا۔ مگر ان کی اعلیٰ تعلیم نے انھیں سکھا دیا تھا کہ زندگی کا نام جنگ ہے۔ جن نامی گرامی لوگوں کا معیار ان کے پیشِ نظر تھا وہ اسی کشمکش کے وسیلہ سے

کامیاب ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تعلیم نے انھیں تحریر وتقریر میں ماہر فن، بحث و مباحثہ میں چالاک اور طرزِ عمل میں ہوشیار بنا دیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انھیں خودغرض اور بندۂ نفس بھی بننا پڑا تھا۔ یہ وہ تعلیم نہ تھی جو اپنے جھونپڑے کا دروازہ کھلا رکھنے پر مائل کرتی ہے جو دوسروں کو کھلا کر کھانے کی ترغیب دیتی ہے۔ گیان شنکر کسی دوسرے کو پناہ دینے کا خیال بھی نہ کرسکتے تھے۔ جب تک وہ خود اپنے مکان کی تعمیر نہ کرلیں۔ وہ کسی کو مشتِ جو بھی دینا گوارا نہ کرسکتے تھے۔ جب تک اپنے انبار خانہ کو بھر نہ لیں۔

خوش قسمتی سے ان کا مکان بن چکا تھا۔ اب وہ دوسروں کو پناہ دینے پر آمادہ تھے۔ ان کا انبار خانہ معمور ہوچکا تھا۔ اب انھیں گداؤں سے نفرت نہ تھی۔ ثروت نے انھیں فیاض، ہمدرد، غریب نواز اور فرض شناس بنادیا۔ لالہ پربھاشنکر کی لڑکیوں کی شادی میں انھوں نے خاصی مدد کی تھی۔ اور لڑکوں کے ماتم میں شریک ہونے کے لیے بھی گورکھپور سے تشریف لائے تھے۔ پریم شنکر سے بھی انھیں برادرانہ محبت پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ لکھن پور والوں کے رہا ہوجانے پر انھیں مبارکباد دی تھی۔ گائتری کی وفات کی خبر ملی تو انھوں نے مراسم تعزیت بڑی دھوم دھام سے ادا کیے اور کئی ہزار روپے خرچ کیے۔ اس کی یاد گار میں ایک پختہ تالاب بنوا دیا۔ جب تک وہ پھوس کے جھونپڑے میں رہتے تھے۔ آگ کی چنگاری سے ڈرا کرتے تھے۔ اب ان کا پختہ محل تھا۔ پھلجھڑیوں کا تماشا اطمینان سے دیکھ سکتے تھے۔

گیان شنکر اب شہرت اور نیک نامی کی فکر میں رہتے تھے۔ لکھنؤ کے معززین انھیں نااہل سمجھ کر ان سے کسی قدر کشیدہ رہتے تھے اور اگرچہ گورکھپور میں انھوں نے پہلے ہی اپنا وقار قائم کرلیا تھا۔ تاہم اس نئی حیثیت میں دیکھ کر اکثر لوگ ان سے خار کھاتے تھے۔ گیان شنکر نے دونوں شہروں کے رؤسا سے میل جول بڑھانا شروع کیا۔ پہلے وہ رائے صاحب کے بے قاعدہ مصارف میں تخفیف کرنا ضروری خیال کرتے۔ کئی گھوڑے کئی گاڑیاں اور ایک موٹر نکال دینا چاہتے تھے۔ لیکن اب انھیں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے اس شان وشوکت کو صرف قائم رکھنا نہیں بلکہ بڑھانا بھی ضروری معلوم ہوتا تھا کہ لوگ ان کا مضحکہ نہ اڑائیں۔ وہ ان لوگوں کی باربار دعوت کرتے۔ ہرکس و ناکس سے باخلاق

پیش آتے اور فلاح کے کاموں میں دل کھول کر چندہ دیتے۔ اخبار نویسوں سے ان کا تعارف پہلے ہی ہوچکا تھا۔ اب ان سے اور بھی زیادہ ربط ضبط ہوگیا۔ اخباروں میں ان کی فیاضی اور شرافت کا تذکرہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ سال ختم ہونے کے قبل ہی وہ تعلقہ دار ایسوسی ایشن، لکھنؤ کے سکریٹری منتخب ہوگئے۔ حکام کے حلقہ میں بھی ان کی عزت ہونے لگی۔ وہ لسان اور چرب زبان تو تھے ہی۔ اکثر قومی مجالس میں بھی پُرزور تقریریں کرتے۔ اخبارات میں ان کی تعریف ہوتی۔ پس اِدھر تو ان کا شمار قومی پیشواؤں میں ہونے لگا۔ اور اُدھر حکام سے بھی کافی رسوخ پیدا ہوگیا۔

مگر اپنی غریب بے زبان رعایا کے ساتھ ان کا برتاؤ اتنا ہمدردانہ نہ تھا۔ ان درختوں میں کانٹے نہ تھے پس ان کے پھلوں کے توڑنے میں کوئی دقت یا رکاوٹ نہ ہوسکتی تھی۔ اسامیوں پر بے دخلی۔ بقایا اور اضافہ کی نالش دھوم سے ہو رہی تھیں۔ ان کے پٹہ جات میں ترمیم ہو رہی تھی اور نذرانے بڑی سختی سے وصول کیے جا رہے تھے۔ رائے صاحب نے ریاست پر پانچ لاکھ کا بار چھوڑا تھا۔ اس پر تقریباً پچیس ہزار سالانہ کا سود چلتا تھا۔ گیان شنکر نے ان تدابیر سے سود کی گنجائش نکال لی۔ اتنا ظلم ہونے پر بھی رعایا شاکی نہ تھی۔ وہ تلخ دواؤں کو میٹھی کرکے پلاتے تھے۔ گائتری کی برسی میں انھوں نے اسامیوں کو ایک ہزار کمبل تقسیم کیے اور سارے علاقہ کے برہمنوں کو بھوج بھی دیا۔ اسی طرح رائے صاحب کے علاقہ میں بھی ہولی کے دن ہر چوپال میں جلسے کرائے اور بھولے بھالے اسامیوں کو خوب بھنگ پلا کر خوش کر دیا۔ کئی جگہ منڈیاں لگوادیں جن سے کاشت کاروں کو اپنی جنس بیچنے میں خاص سہولیت ہوگئی۔ اور ریاست کو بھی معقول نفع ہونے لگا۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ گیان شنکر کا آفتابِ اقبال اب نصف النہار پر تھا۔ رائے صاحب کے قرض سے وہ بڑی حد تک سبکدوش ہوچکے تھے۔ حکام میں رسوخ تھا۔ رؤسا کی نگاہوں میں وقعت تھی۔ علماء ان کی عزت کرتے تھے۔ تحریروتقریر میں کافی مہارت تھی۔ ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ زندگی کی تمنائیں پوری ہوگئی تھیں۔ وہ جب کبھی فرصت کے وقت اپنی گزشتہ حالت کا خیال کرتے تھے تو انھیں اپنی کامیابی پر تعجب ہوتا تھا۔ میں کیا سے کیا ہوگیا۔ ابھی تین ہی سال قبل میں ایک ہزار سالانہ منافع کے لیے سارے گاؤں کو پھانسی دلا دینا چاہتا تھا۔ اس وقت میں کتنا تنگ نظر تھا۔ ایک

معمولی بات کے لیے چچاصاحب سے الگ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اپنے حقیقی بھائی کا بھی بدخواہ تھا۔ انھیں تنگ کرنے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی مگر اب ایسی ایسی کتنی رقمیں خیرات کر دیتا ہوں۔ کہاں ایک تانگہ رکھنے کی توفیق نہ تھی۔ کہاں اب موٹریں منگنی دیا کرتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کامیابی کے لیے مجھے سوانگ بھرنے پڑے۔ ہاتھ رنگنے پڑے۔ مکروفریب سبھی کچھ کرنے پڑے۔ مگر تاریک غار اترے بغیر جواہر کہاں دستیاب ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ محض میری چارہ سازیوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ تائید غیبی نہ ہوتی تو میری چالیں کبھی نہ سیدھی پڑتیں۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانسا پٹ پڑا۔ وار خالی گیا۔ لیکن خوش قسمتی نے انھیں خالی واروں سے انھیں الٹی چالوں سے بازی جتا دی۔

گیان شنکر دوسرے تیسرے مہینے بنارس ضرور جاتے اور پریم شنکر کے ساتھ رہ کر سادہ زندگی کا لطف اٹھاتے۔ انھوں نے پریم شنکر سے بارہا اصرار کیا کہ اب آپ کو اس ویرانہ میں جھونپڑا بنا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ چل کر گھر پر رہیے اور ایشور کی دی ہوئی نعمت سے حظ حاصل کیجیے۔ یہ منظور نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ ہزار دوہزار بگھے کا چک دے دوں۔ وہاں دل کھول کر زراعت کا شوق پورا کیجیے۔ لیکن پریم شنکر کہتے کہ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں گیان شنکر کے اصرار کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ وہ اپنے مزرعہ کی توسیع پر راضی ہوگئے۔ ان کے مزرعہ کے ملحق پچاس بیگہ زمین ایک دوسرے زمیندار کی تھی۔ انھوں نے اس آراضی کا بھی پٹہ لکھا لیا اور پھونس کے جھونپڑے کی جگہ کھپریل کا مکان بنوالیا۔ گیان شنکر ان کے سامنے یہ سب تجویزیں تو پیش کرتے تھے مگر ان کی قانع سادہ اور بے لوث زندگی کی اہمیت سے ناآشنا نہ تھے۔ طرح طرح کی تفکرات اور مشکلات میں رہنے کے بعد وہاں کی پُرسکون استراحت سے ان کا دل مسرور ہوجاتا تھا۔ ان کی طبیعت یہاں سے جانے کو نہ چاہتی تھی۔ یہ مقام اب پیشتر کاسا نہ تھا۔ جہاں صرف ایک شخص سادھو کی طرح اپنی کٹی میں پڑا رہتا ہو۔ اب یہ چھوٹی سی آباد اور خوش نما بستی تھی جہاں سیاسی اور معاشرتی مسائل پر مباحثے ہوتے تھے اور حیات وممات کے پیچیدہ مسئلے حل کیے جاتے تھے۔ یہ علماء کی ایک چھوٹی سی مجلس تھی۔ عملی تعصب اور غرور سے پاک۔ درحقیت یہ سادگی، قناعت اور پاکیزہ خیال کی سرزمین تھی۔ یہاں نہ حسد کا سوز تھا نہ حرص کا جنون نہ ہوس کا زور۔ دولت کی پرستش

نہ ہوتی اور نہ افلاس پیروں تلے کچلا جاتا تھا۔ یہاں ایک مسند لگا کر نہ بیٹھتا تھا اور نہ دوسرا مجرموں کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا تھا۔ یہاں نہ آقا کی سختیاں تھیں۔ نہ ملازم کی تملق سازیاں۔ یہاں سب ایک دوسرے کے خادم۔ ایک دوسرے کے دوست اور غمگسار تھے۔ ایک طرف ڈاکٹر عرفان علی کا خوش نما بنگلہ تھا۔ پھولوں اور بیلوں سے سجا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اب صرف وہی مقدمات لیتے تھے جن کے سچّے ہونے کا انھیں یقین ہوتا تھا۔اور صرف اتنا ہی معاوضہ لیتے تھے جو روزانہ مصارف کے لیے ضروری تھا۔ انھیں دولت کے جمع کرنے کی فکر نہ تھی۔ صبح و شام وہ پریم شنکر کے ساتھ باغبانی کرتے تھے۔ جس کا انھیں پہلے ہی شوق تھا۔ پہلے گملوں میں لگے ہوئے پودوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ جو کام مالی کرتا تھا۔ اب سارا کام اپنے ہی ہاتھوں سے کرتے تھے۔ ان کے بنگلہ سے ملا ہوا ڈاکٹر پریاناتھ کا مکان تھا۔ مکان کے سامنے ایک دوا خانہ تھا۔ اب وہ عموماً دیہاتوں میں دورہ کرکے غربا کا علاج کرتے پھرتے تھے۔ ملازمت ترک کردی تھی۔ گزربسر کے لیے انھوں نے ایک گوشالہ کھول لیا تھا۔ جس میں کئی پچھائیں گائیں بھینسیں تھیں۔ دودھ مکھن فروخت ہونے کے لیے شہر چلاجاتا تھا۔ مریضوں سے کچھ فیس نہ لیتے تھے۔ بابوجوالاسنگھ اور پریم شنکر ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ شردھا اور شیل منی میں خوب بنتی تھی۔ گھر کے کاموں سے فرصت پاتے ہی دونوں ہی چرخے پر بیٹھ جاتی تھیں یا موزے بننے لگتی تھیں۔ پریم شنکر حسبِ معمول کھیت میں کام کرتے تھے۔ اور جوالا سنگھ نئے قسم کے کرگھوں پر خود ہی کپڑے بنتے تھے اور حاجی پور کے کئی نوجوانوں کو بھی بننا سکھاتے تھے۔ سیدایجاد حسین نے بھی یہیں قیام اختیار کیا تھا۔ ان کے گھر والے اب شہر میں رہتے تھے مگر یتیم خانہ یہیں اٹھ آیا تھا۔ اس میں اب فرضی نہیں بلکہ اصلی یتیموں کی پرورش و پرداخت ہوتی تھی۔ سیدصاحب اپنا "اتحاد" اب بھی نکالتے تھے اور اتحاد پر تقریریں بھی کرتے تھے۔ لیکن چندے نہ وصول کرتے تھے۔ اور نہ سوانگ بھرتے تھے۔ وہ اب ہندو مسلم اتحاد کے سچّے حامی تھے اور اس کی اشاعت سچائی سے کرتے تھے۔ یتیم خانہ کے پاس ہی مایاشنکر کا متر بھوَن تھا۔ یہ ایک مختصر سا بورڈنگ ہاؤس تھا۔ اس میں عرفان علی کے دو لڑکے، پریاناتھ کے تین لڑکے، درگا مالی کا ایک لڑکا اور مستا کا ایک چھوٹا بھائی سب ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ان کا سارا خرچ مایاشنکر اپنے وظیفہ سے دیتا تھا۔

کھانا شردھا پکاتی تھی۔ گیان شنکر نے کئی بار چاہا کہ مایا کو لے جاکر لکھنؤ کے تعلقہ دار اسکول میں داخل کرادیں لیکن وہ راضی نہ ہوتا تھا۔ ایک بار گیان شنکر لکھنؤ سے آئے تو مایا کے واسطے ایک بہت عمدہ ریشمی سوٹ سلا لائے۔ لیکن مایا نے اسے اس وقت تک نہ پہنا جب تک متربھون کے سب لڑکوں کے واسطے ویسے ہی سوٹ نہ تیار ہوگئے۔ گیان شنکر بہت خفیف ہوئے اور بہت ضبط کرنے پر بھی ان کے منہ سے اتنا نکل ہی گیا کہ بھائی صاحب۔ میں اس مساوات کے اصول پر آپ سے متفق نہیں ہوں۔ یہ ایک غیر قدرتی اصول ہے۔ اصول کے طریقہ پر خواہ ہم اس کی کتنی ہی تعریف کریں۔ مگر اس پر عمل پیرا ہونا غیر ممکن ہے۔ میں یورپ کے کتنے ہی جمہوریت پسندوں کو جانتا ہوں جو امیروں کی طرح رہتے ہیں۔ موٹروں پر سیر کرتے ہیں۔ اور سال میں چھ ماہ تک اٹلی یا فرانس میں مزے اُڑایا کرتے ہیں۔ جب وہ اپنے کو جمہوریت پسند کہہ سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس غیر قدرتی اصول کے شیدائی بنیں۔

پریم شنکر نے انکسار کے ساتھ کہا۔ یہاں جمہوریت ومساوات کا تو کبھی ذکر نہیں ہوا۔

گیان۔ توپھر یہاں کی آب وہوا میں یہ اثر ہوگا۔ اگرچہ مجھے اس معاملہ میں آپ سے کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ مگر باپ ہونے کے تعلق سے میں اتنا کہنے کے لیے معافی چاہتا ہوں کہ ایسی تعلیم کا نتیجہ مایا کے لیے سودمند نہ ہوگا۔

پریم۔ اگر تم چاہو اور مایا کی خواہش ہو تو اسے لکھنؤ لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہاں کی آب و ہوا تبدیل کرنا میرے امکان میں نہیں ہے۔

گیان۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مایا اور اس کے ساتھیوں کی حیثیت میں کیا فرق ہے۔

پریم شنکر نے متانت سے کہا۔ ہاں خوب معلوم ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ اس فرق کو نمایاں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مایا شنکر چند روز کے بعد ایک بڑا تعلقہ دار ہوگا۔ یہ بات سب لڑکوں کو معلوم ہے۔ کیا صرف یہی بات انھیں اپنی بدقسمتی پر رلانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس فرق کو ظاہر کرکے ان کی اور بھی دل شکنی کی جائے۔ تمھیں معلوم نہ ہوگا مگر یہ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ تیجو اور پدمو کی قربانی مایا کے

گود لیے جانے ہی کے سبب سے ہوئی۔ مایا کو یکایک اس حالت میں دیکھ کر۔ ان کی منتر جگانے کی خواہش ہوئی۔ مایا ڈینگیں مارمار کر ان کی خواہشات کو اور بھی متحرک کرتا رہا اور اس کا یہ خوفناک انجام ہوا ......

اتنے میں مایا آگیا اور پریم شنکر کو اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔ گیان شنکر بھی دل برداشتہ ہو کر وہاں سے اٹھ گئے۔

(۶۲)

گائتری کے کہنے کے مطابق گیان شنکر دوہزار روپۓ ماہوار مایاشنکر کے خرچ کے لیے دیتے جاتے تھے۔ پریم شنکر کی خواہش تھی کہ کئی ماسٹر مقرر کیے جائیں۔ سیر کرنے کے لیے گاڑیاں رکھی جائیں اور خدمت کے لیے کئی نوکر چاکر بھی ہوں۔ مگر مایا شنکر اپنے لیے اتنا صرفہ کرنے پر رضامند نہ ہوا اور پریم شنکر کو مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی۔ صرف دو ماسٹر اسے پڑھانے آتے تھے۔ فارسی پڑھانے کے لیے ایجاد حسین اور سنسکرت پڑھانے کے لیے ایک پنڈت جی۔ سواری کے لیے ایک گھوڑا بھی تھا۔ انگریزی پریم شنکر پڑھاتے تھے۔ ریاضی کی تعلیم جوالاسنگھ کے ذمہ تھی۔ ڈاکٹر پریاناتھ ہفتہ میں دو روز گانا سکھلاتے تھے۔ (جس کے وہ ماہرِ فن تھے) اور دو روزصحت کے متعلق تعلیم دیتے تھے۔ ڈاکٹر عرفان علی علمِ اقتصاد کے ماہر تھے۔ وہ ہفتہ میں دو روز قانون کی اور دو روز علمِ اقتصاد کی تعلیم دیتے تھے۔ کالج کے کئی طلباء بھی شہر سے اِن لکچروں کو سننے آتے تھے۔ اور پریاناتھ کی گان منڈلی تو شہر بھر میں مشہور تھی۔ ادھر کی بچت متر بھون۔ اتحادی یتیم خانہ اور پریاناتھ کے پرائیوٹ شفاخانہ کے کاموں میں صرف ہوتی تھی۔ ودّیا کے نام سے بیس بیس روپے کے دس وظیفے بھی طلباء کو دیے جاتے تھے۔ اتنا سب خرچ کرنے پر بھی مہینہ میں خاصی بچت ہوجاتی تھی۔ ان تین سالوں میں کوئی پچیس ہزار روپے جمع ہوگئے تھے۔ پریم شنکر چاہتے تھے کہ گیان شنکر کی رائے لے کر مایا کو کچھ دنوں کے لیے یورپ، امریکہ وغیرہ ممالک میں سیر کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس رقم کا اس سے بہتر استعمال نہ ہوسکتا۔ مگر مایاشنکر کی کچھ اور ہی خواہش تھی۔ وہ سیاحت کے لیے تو تیار تھا مگر ایک ہزار روپۓ ماہوار سے زیادہ خرچ نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس دولت کے صرف کرنے کے لیے اس نے دوسری ہی تدبیر سوچی تھی مگر پریم شنکر سے کہتے ہوئے شرماتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے اسی

درمیان میں اس کے کہنے کا اچھا موقع مل گیا۔

لالہ پربھاشنکر نے پریم شنکر کو لکھن پور والے مقدمہ سے بچانے کے لیے جو روپے قرض لیے تھے اس کی مدّت تین سال تھی۔ یہ میعاد پوری ہوگئی تھی۔ مگر روپے کا سود تک نہ بیباق ہوا تھا۔ پریم شنکر کو اس معاملہ کی ذرا سی بھی خبر نہ تھی۔ مگر جب مہاجن نے عدالت میں نالش کی تو انھیں معلوم ہوا۔ روپئے کیوں قرض لیے گئے۔ یہ بات بھی جلد ہی معلوم ہوگئی۔ اس وقت سے یہ گہرے سوچ میں پڑے ہوئے تھے کہ یہ روپئے کیسے ادا کیے جائیں۔ اگرچہ مقدمہ میں روپئے کا ایک ہی جز صرف ہوا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ کھانے کھلانے اور شادی بیاہ میں لگا تھا۔ مگر یہ حساب کتاب کرنے کا موقع نہ تھا۔ پریم شنکر قرض کا سارا بار خود اٹھانا چاہتے تھے مگر روپئے کہاں سے آئیں؟ وہ کئی روز تک اسی فکر سے پریشان رہے۔ کبھی سوچتے کہ گیان شنکر سے مانگوں ۔ کبھی پریاناتھ سے مانگنے کا خیال کرتے مگر غیرت کی وجہ سے کسی سے کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک روز اسی اُدھیڑ بُن میں پڑے ہوئے تھے کہ بھولا آکر کھڑا ہوگیا اور انھیں متردّد دیکھ کر بولا۔ بابوجی آج کل آپ بہت اداس رہتے ہیں؟ ہمارے لائق کوئی کام ہو تو بتائیے۔ اُسے بھرسک پورا کریں گے۔

پریم شنکر کو بھولا سے بڑی محبت تھی۔ ان کے فیضانِ صحبت سے اس کی شراب اور جوئے کی عادت چھوٹ گئی تھی۔ وہ ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا تھا اور ان سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ پریم شنکر کو بھی اس پر اعتماد تھا۔ بولے۔ کچھ ایسی بھی فکر ہے مگر تم سن کر کیا کروگے؟

بھولا۔ اور تو کیا کروں گا۔ ہاں جان لڑا دوں گا۔

پریم۔ جان لڑا دینے سے میری فکر دور نہ ہوگی۔ اس کی کوئی اور ہی تدبیر کرنی پڑے گی۔

بھولا۔ جو کہیے وہ کرنے کو تیار ہیں۔ جب تک آپ نہ بتائیں گے۔ گلا نہ چھوڑوں گا۔

آخر میں مجبور ہوکر پریم شنکر نے کہا مجھے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا تدبیر کروں۔

بھولا۔ ہجار دو ہجار سے کام چلے تو میرے پاس ہیں۔ لے لیجیے۔ جیادہ کی جرورت ہو تو کوئی اور اُپائے کروں۔

پریم۔ ہزار دو ہزار کا تم بندوبست کروگے؟ تمھارے پاس تو ہیں نہیں کسی سے لینے ہی پڑیں گے۔

بھولا۔ نہیں بابوجی۔ آپ کے اکبال سے اب اتنے پھٹے حال نہیں ہیں۔ ہجار سے کچھ اوپر تو اپنے ہی ہیں۔ ایک ہجار متانے رکھنے کو دیے ہیں۔ دُرگا اور دمڑی بھی کچھ روپے رکھنے کو دیتے تھے۔ پر میں نے نہیں لیے۔ پرائے روپے گھر میں رکھ کے کون جنجال پالے۔ کہیں کچھ ہوجائے تو لوگ یہی سمجھیں کہ اسی نے کھالیے ہوں گے۔

پریم۔ تم لوگوں کے پاس اتنے روپے کہاں سے آگئے؟

بھولا۔ آپ ہی نے دیے ہیں اور کہاں سے آئے۔ جوانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ادھر تین سال سے جو ایک دن بھی کوڑی ہاتھ سے چھوئی ہو یا کاروبار میں لگائی ہے۔ آپ لوگوں جیسے بھلے مانسوں کی سنگت میں رہ کر ایسے کُکرم کرتا تو کون منہ دیکھاتا؟ متا نے بھی ادھر دو ڈھائی برس سے کسی کے مال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ بھوانی سنگھ کی انٹی سے پانچ گنیاں گرگئی تھیں۔ متا نے کھیت میں پڑی پائیں اور اسی دم جاکر انھیں دیے آیا۔ پہلے اسی پھلواری سے پھل پھلاری توڑ کر بیچ لیا کرتا تھا پر اب یہ سب عادتیں چھوٹ گئیں۔ درگا اور دمڑی گانجا چرس تو پیتے ہیں پر بہت کم اور میں نے انھیں کُچال چلتے نہیں دیکھا۔ ہم سبھی روٹی دال ترکاری کھا کر تین سو روپے سال میں بچالیتے ہیں تو کہیے جتنے روپے میرے پاس ہیں وہ لاؤں؟

پریم شنکر۔ یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم لوگ بھی چار پیسے کے آدمی ہوگئے۔ یہ سب تمھاری نیک نیتی کا نتیجہ ہے۔ میرا کام اتنے روپیوں میں نہ چلے گا مجھے پچیس ہزار کی ضرورت ہے۔

دفعتاً مایاشنکر آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہوئی تھیں۔ چہرہ پر ترحمانہ جوش کی نمود تھی۔ پریم شنکر نے بھولا کو آنکھوں کے اشارے سے ہٹا دیا۔ پھر مایا سے بولے آنکھیں کیوں بھری ہوئی ہیں؟ بیٹھو۔

مایا۔ جی کچھ نہیں۔ ابھی تیجو اور پدمو کی یاد آگئی تھی۔ دونوں اب تک ہوتے تو انھیں بھی بلا کر یہیں رکھتا۔ اس وقت میں بڑا بے رحم تھا۔ بے چاروں کو اپنی شان وشوکت

دکھا کر جلانا چاہتا تھا۔ میری شیخی کی باتیں سن سن کر وہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہم وہ منتر جگائیں گے کہ کوئی مار ہی نہ سکے۔ ایسے ایسے دیوؤں کو اپنے بس میں کرلیں گے کہ گھر بیٹھے دنیا کی جو چیز چاہیں منگالیں۔ اس وقت میری سمجھ میں وہ باتیں نہ آتی تھیں۔ مذاق سمجھتا تھا۔ مگر اب جو ان باتوں کو یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ہی ان کا قاتل ہوں۔ دل بے قرار ہوجاتا ہے اور اپنے اوپر غصہ آتا ہے کہ کیا کہوں۔ ابھی بابا سے ملنے گیا تھا۔ بہت مغموم تھے کسی مہاجن نے ان پر نالش بھی کر دی ہے۔ اس سے اور بھی متردّد تھے۔ اگر یہ مصیبت نہ آتی تو شاید وہ اتنے دکھی نہ ہوتے۔ مصیبت میں غم اور بھی ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ اس رنج کے زخم کا اندمال تو ممکن نہیں مگر یہ نئ مصیبت ہٹائی جاسکتی ہے۔ آپ سے کہتے ہوئے شرماتا ہوں مگر اس وقت مجھے معاف کیجیے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ حتی الامکان ان کی مدد کردیں۔ چچا دیاشنکر تو بابا سے کہہ رہے تھے کہ ہمیں زمین کی پراوہ نہیں ہے۔ نکل جانے دیجیے۔ آپ کو اب کیا کرنا ہے۔ میرے سر پر جو پڑے گی دیکھ لوں گا۔ لیکن بابا کی خواہش یہ تھی کہ مہاجن سے چند روز کی مہلت لی جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں خود جاکر مہاجن سے بات چیت کروں۔ مجھ سے کچھ دبے گا بھی۔

پریم۔ روپیوں کی فکر تو میں کر رہا ہوں مگر معلوم نہیں کہ انھیں کتنے روپیوں کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مجھ سے کبھی یہ ذکر نہیں کیا۔

مایا۔ گفتگو سے تو معلوم ہوتا تھا کہ پندرہ بیس ہزار کا معاملہ ہے۔

پریم۔ یہی قیاس میرا بھی ہے۔ دوچار روز میں کوئی نہ کوئی سبیل پیدا ہو ہی جائے گی۔ یا تو مہاجن کو سمجھا بجھا دوں گا یا دو چار ہزار دے کر چند روز کی مہلت لے لوں گا۔

مایا۔ میں چاہتا ہوں کہ بابا کو معلوم بھی نہ ہونے پائے اور مہاجن کے سب روپے ادا ہوجائیں جس میں آگے کا جھنجٹ باقی ہی نہ رہے۔ جب ہمارے پاس روپے ہیں تو مہاجن کی خوشامد کیوں کی جائے۔

پریم۔ وہ روپے امانت کے ہیں۔ انھیں چھونے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ انھیں میں نے تمھارے سفرِ یورپ کے لیے الگ کر رکھا ہے۔

مایا۔ میرا یورپ کا سفر اتنا ضروری نہیں ہے کہ گھر والوں کو پریشانی میں چھوڑ میں روانہ ہوجاؤں۔

پریم۔ جس کام کے لیے یہ روپے دیے گئے ہیں اسی کام میں صرف ہونے چاہیے۔

مایا آزردہ خاطر ہوکر چلا گیا مگر شردھا سے وہ زیادہ شوخ ہوگیا تھا۔ اس کے پاس جاکر بولا۔ اگر چچا صاحب بابا کو روپئے نہ دیں گے تو میں یورپ ہرگز نہ جاؤں گا۔ تیس ہزار کافی ہیں۔ چچا صاحب سے پچیس ہزار دلادو۔

پریم شنکر نے شردھا سے وہی باتیں کہیں۔ شردھا مایا کی طرف ہوئی۔ بحث ہونے لگی مگر کوئی بات طے نہ ہوسکی۔ دوسرے روز شردھا نے پھر وہی سوال اٹھایا۔ آخر جب اس نے دیکھا کہ یہ دلائل سے لاجواب ہوجانے پر بھی روپے نہیں دینا چاہتے تو ذرا تیز ہوکر بولی۔ اگر تم نے دادا جی کو روپے نہ دیے تو مایا کبھی یورپ نہ جائے گا۔

پریم۔ وہ میری بات کو کبھی نہیں ٹال سکتا۔

شردھا۔ اور باتوں کو نہیں ٹال سکتا پر اس بات کو کبھی نہ مانے گا۔

پریم۔ تم نے یہ تعلیم دی ہوگی۔

شردھا نے کچھ جواب نہ دیا۔ یہ بات اسے بری معلوم ہوئی ایک لمحہ تک خاموش بیٹھی رہی۔ پھر جانے کے لیے اٹھی۔

پریم شنکر کے منہ سے تو بات نکل گئی تھی مگر اپنی سخت کلامی پر نادم تھے۔ بولے۔ اگر گیان شنکر معترض ہوں تو؟

شردھا نے بگڑ کے کہا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ گیان شنکر کے خوف سے روپئے نہیں دیتے۔ استحقاق۔ قرض اور امانت کا بہانہ کیوں ڈھونڈھتے ہو؟

پریم شنکر نے دوبدھا میں پڑھ کر کہا۔ خوف کی بات نہیں ہے۔ روپیوں کے متعلق مجھے کامل استحقاق ہے۔ لیکن گیان شنکر کی رضا مندی کے بغیر میں اسے اس طرح صرف نہیں کرنا چاہتا۔

شردھا۔ تو ایک خط لکھ کر دریافت کرنا لو۔ مجھے تو یقین کامل ہے کہ انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اب وہ گیان شنکر نہیں ہیں جو پیسہ پیسہ پر جان دیتے تھے۔

پریم شنکر باہر آکر گیان شنکر کو خط لکھنے بیٹھے لیکن پھر خیال آیا کہ وہ راضی ہوگئے

تو؟ رضا مندی دینے میں ان کا کیا نقصان ہے۔ تو مجھے مجبور ہوکر روپے دینے پڑیں گے۔ یہ روپئے نہ میرے ہیں نہ مایا کہ ہیں نہ گیان شنکر کے ہیں۔ یہ مایا کا تعلیمی وظیفہ ہے۔ انھوں نے خط نہ لکھا۔ جوالا سنگھ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ انھوں نے بھی کچھ تجویز نہ کیا۔ ڈاکٹر عرفان علی سے مشورہ کرنے کی ٹھہری۔ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ یہ رقم مایا کی تعلیم کہ سوا اور کسی کام میں صرف نہیں کی جاسکتی۔

مایاشنکرنے یہ فیصلہ سنا تو جھنجلا اٹھا۔ دل میں آیا کہ جاکر ڈاکٹر صاحب سے خوب بحث کروں مگر ڈرا کہ کہیں وہ اسے بے ادبی نہ خیال کریں کیوں نہ مہاجن کے پاس جاکر وہ سب روپئے مانگ لوں۔ میں ابھی نابالغ ہوں۔ شاید اسے کچھ اعتراض ہو۔ مگر ایک کے دو دینے پر تیار ہوجاؤں گا تو مان جائے گا۔ لیکن پھر اندیشہ ہوا کہ چچا صاحب کو معلوم ہوگیا تو زبان سے خواہ کچھ نہ کہیں مگر دل میں سخت ناراض ہوں گے۔ بے چارہ انھیں تفکرات میں ڈوبا ہوا کبیدہ خاطری سے جاکر لیٹ رہا۔ شام ہوگئی مگر وہ کمرہ سے نہ نکلا۔ ڈاکٹر عرفان علی نے پڑھنے کے لیے بلایا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ میرے سر میں درد ہے۔ کھانے کا وقت آیا۔ متر بھون کے سب لڑکے کھانا کھائے۔ مایا نے وہاں بھی کہلا بھیجا کہ میرے سر میں درد ہے۔ شردھا بلانے گئی۔ اسے دیکھتے ہی مایا رو پڑا۔

شردھا نے پیار سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ بیٹا چل کر تھوڑا سا کھانا کھالو۔ صبح میں پھر ان سے کہوں گی۔ ڈاکٹر عرفان علی نے بات بگاڑدی ورنہ میں نے تو انھیں راضی کرلیا تھا۔

مایا۔ چچی میرا کھانے کو بالکل جی نہیں چاہتا (روکر) تیجو اور پدمو کی جان میں نے لی اور اب میں بابا کی کچھ مدد نہیں کرسکتا۔ ایسی زندگی پر لعنت ہے۔

شردھا پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ آنچل سے مایا کے آنسو پونچھتی تھی۔ اور خود بھی روتی جاتی تھی۔ مایا نے کہا چچی تم ناحق ہلکان ہوتی ہو۔ میں بدنصیب ہوں مجھے رونے دو۔

شردھا۔ تم چل کر کچھ کھالو۔ میں آج ہی رات کو یہ تذکرہ چھیڑوں گی۔

مایا بہت اداس تھا مگر شردھا کی بات نہ ٹال سکا۔ دو چار لقمے کھائے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لقمہ منہ سے نکلا پڑتا ہے۔ ہاتھ منہ دھو کر اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ رہا۔

ساری رات شردھا یہی سوچتی رہی کہ انھیں کیسے سمجھاؤں۔ شیل منی سے بھی

صلاح لی مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔

علی الصباح بڈھیا کسی کام سے آئی اور باتوں باتوں میں کہنے لگی۔ بہو جی پیسہ سب کوئی دیکھتا ہے۔ پر محنت کوئی نہیں دیکھتا۔ مرد دن بھر میں دو ایک روپۓ کما لاتا ہے تو مجاج ہی نہیں ملتا۔ عورت بے چاری رات دن چولھے چکی میں جُتی رہتی ہے پھر بھی وہ نکمّی ہی سمجھی جاتی ہے۔

شردھا دفعتاً اچھل پڑی جیسے سلگتی ہوئی آگ ہوا سے بھڑک اٹھتی ہے۔ اسی طرح ان باتوں نے اسے ایک تدبیر سمجھا دی۔ بھٹکتے ہوئے مسافر کو راستہ مل گیا۔ کوئی چیز جسے گھنٹوں سے تلاش کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ دفعتاً مل گئی۔ جیوں ہی بدھیا گئی وہ پریم شنکر کے پاس جاکر بولی۔ چاچا جی کو روپے دینے کے بارے میں کیا طے کیا۔

پریم۔ اسی فکر میں ہوں، دوچار روز میں کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

شردھا۔ روپے تو رکھے ہوئے ہیں۔

پریم۔ مجھے خرچ کرنے کا استحقاق نہیں ہے۔

شردھا۔ وہ کس کے روپے ہیں؟

پریم۔ (حیرت سے) مایا کو تعلیمی مصارف کے لیے دیے گئے ہیں۔

شردھا۔ تو کیا مایا کی تعلیم میں دو ہزار ماہوار خرچ نہیں ہوتے؟

پریم۔ کیا تمھیں معلوم نہیں؟ تقریباً آٹھ سو صرف ہوتے ہیں۔ باقی بارہ سو بچ رہتے ہیں۔

شردھا۔ یہ کیوں بچ رہتے ہیں۔ کیا یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتا؟ ڈاکٹر عرفان علی کو پڑھانے کے لیے کتنی تنخواہ ملنی چاہیے؟ ڈاکٹر پریاناتھ اور بابو جوالاسنگھ کو بھی ملازم رکھتے تو انھیں بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا۔ تمھاری اجرت بھی کچھ نہ کچھ ہونے ہی چاہیے۔ تمھارے خیال میں عرفان علی کی تنخواہ کچھ ہوتی ہی نہیں۔ ان کا ایک دن کا محنتانہ پانچ سو روپے نہ دوگے؟ پریاناتھ کی آمدنی بھی سو روپے روزانہ سے کم نہ تھی۔ پہلے تو وہ کسی کے گھر پر پڑھانے کے لیے جانا ہی نامنظور کریں۔ اور کریں بھی تو پانچ سو روپۓ سے کم نہ لیں۔ بابو جوالاسنگھ بھی سو روپے پر مہنگے نہیں ہیں۔ رہے تم۔ سو تمھارا بھتیجا ہے۔ اسے شوق اور محبت سے پڑھاتے ہو۔ پر دوسرے کو کیا پڑی ہے کہ وہ مفت میں اپنا سر ماریں۔ ان روپیوں کو تم بچت سمجھتے ہو۔ یہ بالکل

بے انصافی ہے اسے خواہ اپنی شرافت کا صلہ سمجھو یا ان کے احسان کی قیمت۔ اس روپے کے خرچ کرنے کا انھیں حق ہے۔

پریم شنکر نے شبہ آمیز لہجہ میں کہا۔ مایا اور تم بغیر روپے دلائے نہ مانو گی۔ خیر جیسی تمھاری مرضی۔ تمھاری دلیل درست ہے۔ اسے میں تسلیم کرتا ہوں مگر دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ میں اس وقت روپے دیے دیتا ہوں مگر اسے قرض سمجھ کر ہمیشہ ادا کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

(۶۳)

لالہ پربھا شنکر کو روپے ملے تو وہ رو پڑے۔ گاؤں تو بچ گیا مگر اس سے مستفید کون ہوگا؟ دیا شنکر کا دل پھر گھر سے اچاٹ ہو چلا تھا۔ سادھو مہاتماؤں کی صحبت میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ دن بہ دن تارک الدنیا ہوتے جاتے تھے۔

ادھر مایا شنکر کے یورپ جانے پر گیان شنکر راضی نہ ہوئے۔ ان کے خیال میں ابھی اس سفر سے مایا کو قرار واقعی نفع نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس سے یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ اپنے علاقہ جات میں دورہ کرے۔ اس کے بعد ہندوستان کے خاص خاص مقامات کو دیکھے۔ پس چیت کے مہینہ میں مایا شنکر گورکھپور چلا گیا اور دو مہینے تک اپنے علاقے میں دورہ کرنے کے بعد لکھنؤ جا پہنچا پھر دو ماہ تک وہاں بھی اپنے مواضعات میں گھومتا رہا۔ روزانہ جو کچھ دیکھتا وہ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا۔ کاشت کاروں کی حالت بغور دیکھا۔ ہر دو علاقہ جات کے کسان ان کے اخلاق اور انکسار سے خوش ہوگئے۔ اس نے ان کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ خوف کی جگہ التفات پیدا ہوگیا۔ لوگ اسے اپنا سچا ہمدرد اور خیرخواہ سمجھنے لگے۔ اس کے پاس جاکر اپنی مصیبت کی داستان سناتے۔ اسے ان کی واقعی حالت کا اندازہ کسی اور طریقہ پر نہ ہوسکتا تھا۔ چاروں طرف تباہی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا شاید ہی کوئی گھر تھا جس میں دھات کے برتن موجود ہوں۔ کتنے گھروں میں تو لوہے کے توے تک نہ تھے۔ ظروف گلی کے علاوہ جھونپڑوں میں اور کچھ نہ دکھائی دیتا۔ نہ اوڑھنا نہ بچھونا۔ یہاں تک کہ بہت سے گھروں میں تو چارپائیاں تک نہ تھیں۔ اور وہ گھر ہی کیا تھے؟ ایک ایک دو دو تنگ و تاریک حجرے تھے۔ ایک انسانوں کے لیے ایک مواشی کے لیے۔ اسی ایک کوٹھری میں کھانا۔ سونا، اٹھنا بیٹھنا۔ سب کچھ ہوتا تھا۔ بستیاں اتنی گھنی تھیں کہ گاؤں میں کشادہ جگہ

کہیں نظر نہ آتی تھی۔ کسی کے دروازہ پر صحن نہ تھا۔ ہوا اور روشنی شہروں کی گھنی آبادی میں بھی اس قدر کمیاب نہ ہوں گی۔ جو کسان زیادہ خوش حال سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بدن پر بھی ثابت کپڑے نہ تھے۔ انھیں ایک وقت چبینا پر ہی بسر کرنا پڑتا تھا۔ وہ بھی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔ بڑھیا جانوروں کے دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی تھیں۔ جہاں دیکھو چھوٹے چھوٹے مریل اور کمزور بیل نظر آتے تھے اور کھیتوں میں رینگتے یا چرنیوں پر اونگتے تھے۔ کتنے ہی ایسے گاؤں تھے جہاں دودھ تک نہ میسّر ہوتا تھا۔ اس عام مفلسی اور غریبی کو دیکھ کر مایا کا دردمند دل تڑپ جاتا تھا۔ اس میں فطرتاً احساس کا مادہ تھا۔ وہ فطرتاً فیاض اور ہمدرد واقع ہوا تھا۔ تعلیم اور صحبت نے ان جذبات کو اور بھی ابھار دیا تھا۔ پریم آشرم میں روز ہی عوام کی خدمت اور بہبود کا چرچا ہوتا تھا۔ مایا کا اوصاف اسی رنگ میں رنگ گیا تھا۔ وہ ان نظاروں سے غمگین ہوکر پریم شنکر کو بار بار لکھتا۔ اپنے تجربہ میں آئی ہوئی باتوں کا ذکر کرتا اور کسانوں کا ان تکالیف کے دفعیہ کی تدبیر پوچھتا۔ مگر پریم شنکر اس کے خطوط کا یا تو جواب ہی نہ دیتے تھے یا کسانوں کی جہالت اور سہل انکاری وغیرہ عاداتِ بد کا قصہ لے بیٹھتے تھے۔

مایا تو اپنے علاقہ جات کا دورہ کر رہا تھا۔ ادھر کونسل کے ممبروں کا انتخاب ہونے لگا۔ گیان شنکر تو پیشتر ہی سے اس کے خواہشمند تھے۔ وہ بڑے حوصلہ سے میدان میں اترے۔ اگرچہ انجمنِ تعلقہ داران کے سکریٹری تھے مگر تعلقہ داروں کی مدد پر انھیں بھروسا نہ تھا۔ کئی بڑے بڑے تعلقہ دار اپنے زمرہ کے قائم مقام بننے کے متمنی تھے۔ ان کے مقابلہ میں گیان شنکر کو اپنی کامیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ پس انھوں نے گھورکھپور کے کسانوں کی طرف سے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہاں مقابلہ اتنا زبردست نہ تھا۔ ان کے گویندے دیہاتوں میں گشت کرتے ہوئے ان کی تعریفوں کے آوازے بلند کرنے لگے۔ بابو صاحب کتنے خوش اخلاق کتنے خدا پرست ہیں۔ انھیں منتخب کرکے تم کامیاب ہوجاؤ گے۔ وہ کونسل میں تمھاری بہتری وفلاح کے لیے جان لڑادیں گے۔ لگان میں تخفیف کرائیں گے۔ ہر گاؤں میں چراگاہوں کا بندوبست کریں گے۔ نذرانے بند کرا دیں گے۔ اضافہ لگان کی مخالفت کریں گے اور بے دخلی کو یک قلم موقوف کرا دیں گے۔ سارے صوبہ میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ جیسے سہالگ کے دنوں میں ڈھول اور باجوں کی آوازیں گونجنے لگتی

ہیں۔ اسی طرح اس وقت جدھر دیکھیے قومی ہمدردی و محبت کے چرچے تھے۔ ڈاکٹر عرفان علی بنارس کالج کی طرف سے کھڑے ہوئے۔ بابو پریاناتھ نے بنارس کی میونسپلٹی کا دامن پکڑا۔ جوالا سنگھ اٹاوہ کے رئیس تھے۔ انھوں نے اٹاوہ کے کاشت کاروں کا سہارا لیا۔ سید ایجاد حسین کو بھی جوش آیا۔ وہ مسلم حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پریم شنکر اس میدان میں نہ آنا چاہتے تھے مگر بھوانی سنگھ، بلراج اور قادر خاں نے بنارس کے کسانوں پر ان کا جادو ڈالنا شروع کیا۔ تین چار مہینوں تک یہ بازار گرم رہا۔ مطابع کو ٹریکٹوں کی اشاعت سے سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ کہیں دعوتی جلسے ہوتے تھے کہیں ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ ہر امیدوار اپنی اپنی ڈھول پیٹ رہا تھا گویا دنیا کی بھلائی کا اسی نے بیڑا اٹھایا ہے۔

آخر انتخاب کا دن آپہنچا۔ اس دن لیڈروں کے حوصلے۔ ان کی مستعدی ان کا خیال وانکسار قابلِ دید تھے اور ووٹروں کا تو گویا ستارۂ قسمت طلوع ہوگیا تھا۔ حلوا اور میوے کھاتے تھے اور موٹروں پر سیر کرتے پھرتے تھے۔ صبح سے پہر رات گئے تک ووٹ پڑتے رہے۔

اس کے بعد سات روز بڑے اضطراب کے دن تھے۔ بارے خدا خدا کرکے یہ دن کٹے۔ آٹھویں روز سرکاری گزٹ میں نتیجہ کا اعلان ہوگیا۔ آج کتنے ہی گھروں میں گھی کے چراغ جلے ہوں گے۔ آج کتنے ہی لوگوں نے ماتم منایا۔ گیان شنکر نے بازی جیت لی۔ لیکن پریم آشرم میں رہنے والوں کو جو کامیابی نصیب ہوئی وہ واقعی حیرت انگیز تھی۔ اس میدان کے سبھی سپاہی فتح کی جھنڈیاں اڑاتے ہوئے نکلے۔ سب سے بڑی فتح پریم شنکر کی تھی۔ وہ بلا اپنی خواہش اور کوشش کے اس بلند مرتبہ پر پہنچ گئے تھے۔ گیان شنکر نے یہ خبر سنی تو ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ کونسل میں بیٹھنے کا اتنا شوق نہ رہا۔ اکثر درختوں کے جھنڈ میں شام کے وقت چڑیوں کے چہچہانے سے کان میں پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ لیکن جوں ہی اندھیرا ہوجاتا ہے اور چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھتی ہیں تو وہاں سکوت چھاجاتا ہے۔ اسی طرح قوم کے قائم مقاموں نے کونسل کے آراستہ اور شاندار محل میں پہنچ کر سکوت اختیار کرلیا۔ وہ لمبے چوڑے وعدے وہ بڑی بڑی باتیں سب بھول گئیں۔ کوئی موکلوں کی خاطر و مدارات میں مصروف ہوا کوئی اپنے بہی کھاتے کی دیکھ بھال اور

کوئی اپنے سیر و شکار میں۔ قومی ہمدردی کی وہ امنگ مٹ گئی۔ لوگ تفریحاً کونسل میں جاتے اور وہاں کچھ فضول سوالات پوچھ کر یا اپنی تقریری مہارت کو دکھلا کر رخصت ہو جاتے۔ وہ کون سی رغبت افزا قوتیں تھیں جنھوں نے لوگوں کو اس ممبری پر فریفتہ کر دیا تھا۔ یہ جاننا مشکل ہے۔ مگر ان کی خدمتی طرزِ عمل سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ یہ امر یقینی ہے۔ علت و معلول وسائل اور نتیجے۔ سب اسی اقتدار کی نمود میں غائب ہوگئے تھے۔

مگر پریم آشرم میں یہ جمود نہ تھا۔ یہاں لوگ پہلے ہی سے خلق کی خدمت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ اب انھیں اپنے میدانِ عمل کو اور بھی وسیع بنانے کا زریں موقع ہاتھ آیا تھا۔ یہ لوگ اصلاح کی نئی نئی تجاویز سوچتے۔ سرکاری تجاویز کے حسن وقبح پر رائے زنی کرتے اور سرکاری رپورٹ کو بغور دیکھتے۔ سوالات کے ذریعہ حکام کی زیادتیوں کو آشکارا کرتے۔ جہاں کہیں انصاف کا خون ہوتے دیکھتے۔ فوراً کونسل کی توجہ ادھر مبذول کراتے۔ اور یہ لوگ صرف سوالات ہی سے مطمئن نہ ہوجاتے تھے۔ بلکہ معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ مخالفت کے لیے مخالفت نہ کرتے بلکہ اصلاح کے لیے۔ اس کوشش اور فرض شناسی نے جلد ہی کونسل میں ان لوگوں کا سکہ جما دیا۔ ان کے سوالات ان کی تجاویز۔ ان کی مخالفانہ باتیں سبھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ سرکاری ممبر ان کی باتوں کو چٹکیوں میں نہ اُڑا سکتے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر عرفان علی اس زمرۂ رفقاء کے ترجمان تھے مگر یہ ایک کھلا ہوا راز تھا کہ پریم شنکر ہی اس کے محرک تھے۔

اس طرح دو سال گزر گئے اور اگرچہ اس انجمن احباب نے کونسل کو فریفتہ کرلیا تھا مگر ابھی تک پریم کو اپنی اس تجویز کو وہاں پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی جو عرصہ سے ان کے خیال میں موجود تھی۔ اور جس کا مقصد یہ تھا کہ زمینداروں سے آسامیوں کی بے دخلی کا حق چھین لیا جاوے۔ وہ خود ایک زمینداری پیشہ خاندان کے تھے۔ جس مایا کو وہ اپنے لڑکے کی طرح چاہتے تھے وہ خود ایک بڑا تعلقہ دار ہوگیا تھا۔ جوالاسنگھ بھی زمیندار تھے۔ لالہ پربھاشنکر جنھیں وہ اپنے والد کی جگہ سمجھتے تھے۔ اپنے حقوق میں جو بھر کی کمی بھی نہ برداشت کرسکتے تھے۔ اِن وجوہات سے وہ اس تجویز کو کونسل میں پیش کرتے ہوئے ہچکتے تھے۔ اگرچہ وہاں زمینداروں کی تعداد کافی تھی اور تعداد کے لحاظ سے دباؤ اور بھی زیادہ تھا مگر پریم شنکر کو ان لوگوں کا اتنا خوف نہ تھا جتنا اپنے تعلق والوں کا۔ اس

کے ساتھ اپنے فرض سے انحراف کرتے ہوئے انھیں بے حد رنج ہوتا تھا۔

ایک روز وہ اسی دوبدھا میں اداس بیٹھے ہوئے تھے کہ مایا شنکر ایک خط لیے ہوئے آیا اور بولا۔ دیکھیے باپو دیپک سنگھ کونسل میں کتنی زبردستی کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ اس قسم کی تجویز پیش کرنے والے ہیں کہ زمینداروں کو اسامیوں سے لگان وصول کرنے کے لیے ایسے اختیارات ملنے چاہیں کہ وہ اسامیوں کو اپنی حسبِ مرضی بے دخل کرسکیں۔ ان کے خیال میں زمینداروں کو یہ اختیار ملنے سے روپے وصول کرنے میں بڑی سہولت ہوگی۔ دیکھیے اس خط کو۔

پریم شنکر نے بے پروائی سے کہا۔ میں یہ خط دیکھ چکا ہوں۔

مایا۔ مگر آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔

پریم شنکر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ابھی تو نہیں دیا۔

مایا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ کونسل میں یہ تجویز منظور ہوجائے گی۔

پریم۔ ہاں ممکن ہے۔

مایا۔ اس وقت تو زمیندار لوگ آسامیوں کو کچل ہی ڈالیں گے۔

پریم۔ ہاں۔ اور کیا۔

مایا۔ ابھی سے اس تحریک کی جڑ کاٹ دینی چاہیے۔ آپ اس کا جواب دے دیں تو بابو دیپک سنگھ کو کونسل میں اس تجویز کے پیش کرنے کی ہمت نہ پڑے۔

پریم۔ گیان شنکر کیا کہیں گے؟

مایا۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں وہ اس تجویز کی تائید نہ کریں گے۔

پریم۔ ہاں مجھے بھی ایسی ہی امید ہے۔

مایا شنکر اپنے چچا کی باتوں سے ان کے مطلب کو سمجھ گیا۔ وہ جب سے اپنے علاقہ کا دورہ کرکے لوٹا تھا۔ اکثر کاشت کاروں کے جو دلی تدبیریں سوچا کرتا۔ اس نے مضمون کی کئی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور ڈاکٹر عرفان علی سے بھی پوچھا کرتا تھا۔ پریم شنکر کو پس و پیش کرتے دیکھ کر اُسے بہت افسوس ہوا۔ وہ ان سے تو اور زیادہ نہ کہہ سکا مگر اس خط کی مخالفت کرنے کے لیے وہ بے چین ہوگیا۔ آج تک اس نے کبھی اخبارات میں کوئی مضمون نہ لکھا تھا۔ ڈرتا تھا کہ لکھتے بنے یا نہ بنے۔ اسے اڈیٹر چھاپے یا نہ چھاپے۔ دو تین

روز تک وہ اسی بچار میں رہا۔ آخر کو اس نے جواب لکھا اور کچھ شرماتے کچھ ڈرتے ہوئے اسے عرفان علی کو دکھانے کے لیے لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مضمون پڑھا تو متحیر ہو کر پوچھا۔ یہ سب تمھیں نے لکھا ہے؟

مایا۔ جی ہاں۔ لکھا تو ہے مگر بنا نہیں۔

عرفان۔ واہ اس سے بہتر تو میں نہیں لکھ سکتا۔ یہ بات تمھیں بابو پریم شنکر سے ورثہ سے ملی ہے۔

مایا۔ تو بھیج دوں چھپ جائے گا؟

عرفان۔ چھپے گا کیوں نہیں۔ میں خود بھیجے دیتا ہوں۔

پریم شنکر روزانہ اخباروں کو غور سے دیکھتے کہ دیپک سنگھ کے خط کا کسی نے جواب دیا یا نہیں۔ مگر آٹھ دس روز گزر گئے اور ان کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔ کئی بار ان کی خواہش ہوئی کہ فرضی نام سے اس خط کا جواب دوں۔ لیکن کچھ تو فرصت نہ ملی کچھ دل متردّد رہا۔ پس نہ لکھ سکے۔ بارھویں روز انھوں نے اخبار کھولا تو مایا شنکر کا مضمون نظر پڑا۔ شروع سے آخر تک پڑھ گئے۔ دل میں ایک غرورانگیز جوش پیدا ہوا۔ وہ فوراً شردھا کے پاس گئے اور وہ مضمون پڑھ کر سنایا۔ پھر عرفان علی کے پاس گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر پوچھا ـــ کوئی نئی خبر ہے کیا؟

پریم۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ مایا نے دیپک سنگھ کے خط کا کیسا مدلّل جواب دیا ہے۔

عرفان۔ جی ہاں دیکھا۔ میں تو آپ سے دریافت کرنے آرہا تھا کہ اس مضمون کو مایا ہی نے لکھا ہے یا آپ نے کچھ مدد دی ہے۔

پریم۔ مجھے تو خبر بھی نہیں ہے۔ اسی نے لکھا ہوگا۔

عرفان۔ تو اس کی شاباشی دینی چاہیے۔ بلاؤں؟

پریم۔ جی نہیں۔ اس کے اس جوش کو دبانے کی ضرورت ہے۔ گیان شنکر اس مضمون کو پڑھ کر روئیں گے۔ سارا الزام مجھ پر عاید ہوگا۔ کہیں گے کہ آپ نے لڑکے کو بہکا دیا۔ مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے اسے اس کے لکھنے کے لیے اشارہ تک نہیں کیا۔ اسی بدگمانی کے ڈر سے میں نے خود نہیں لکھا۔

عرفان۔ آپ یہ الزام میرے سر پر رکھ دیجیے گا۔ میں بڑی خوشی سے اسے برداشت

کرلوں گا۔

پریم۔ کل ان کا غصہ سے بھرا خط آجائے گا۔ مایا نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

عرفان۔ بھابی صاحبہ کا کیا خیال ہے۔

پریم۔ ان کی کچھ نہ پوچھیے۔ وہ تو اس خوشی میں دعوت کرنا چاہتی ہیں۔

پریم شنکر کا قیاس لفظ بہ لفظ صحیح نکلا۔ تیسرے روز گیان شنکر کا خط آپہنچا۔ مطلب بھی یہی تھا۔ مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ جمہوریت کا سبق پڑھاکر آپ نے سیدھے سادے لڑکے پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اس کا اٹھارھواں سال پورا ہو رہا ہے۔ اسے جلدی ہی اپنے علاقہ کا انتظامی اختیار ملنے والا ہے۔ میں اس ماہ کے آخر تک انھیں تیاریوں کے لیے آنے والا ہوں۔ ہزایکسلنسی گورنر بہ نفس نفیس اسے راجا بنانے کے لیے تشریف لانے والے ہے۔ اس نغمۂ شیریں کو اس بے سرے راگ نے چوپٹ کر دیا۔ آپ کو اپنی جمہوریت پسندی کا بیج کسی اور کھیت میں بونا چاہیے تھا۔ آپ نے اپنے حفاظتی اختیارات کا ناجائز استعمال کیا ہے۔ اب مجھ پر رحم کر کے مایا کو میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں نہیں چاہتا کہ اب وہ ایک لمحہ بھی وہاں رہے۔ راج تلک ہونے تک میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے خوف ہے کہ وہاں رہ کر وہ کوئی اور فتنہ نہ اٹھائے۔

شام کی گاڑی سے مایا شنکر لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

(٦٤)

بابوگیان شنکر کا مکان آج کسی شاعر کی فکرِ رنگین کی طرح آراستہ ہو رہا ہے۔ آج وہ دن آگیا ہے جس کے انتظار میں ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ ثروت و اقتدار کا دلکش خواب آج پورا ہوگا۔ مایاشنکر کی گدی نشینی کا مبارک وقت آپہنچا ہے۔ بنگلہ کے سامنے ایک بڑا اور شاندار شامیانا تنا ہوا ہے۔ اس کی سجاوٹ کے لیے لکھنؤ کے بہترین فراش طلب کیے گئے ہیں۔ پلیٹ فارم گنگا جمنی کرسیوں سے جگمگا رہا ہے۔ چاروں طرف بڑی رونق ہے۔ گھورکھپور۔ لکھنؤ اور بنارس کے معززین موجود ہیں۔۔ دیوان خانہ۔ مکان۔ بنگلہ۔ مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک طرف فوجی بینڈ ہے اور دوسری طرف بنارس کے مشہور شہنائی والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے شامیانا میں ناٹک کھیلنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس ناٹک کو متر بھون کے لڑکے کریں گے۔ ڈاکٹر پریاناتھ کی منڈلی اپنی نغمہ سنجیوں کا کمال

دکھائے گی۔ لالہ بربھاشنکر مہمانوں کی تواضع و تکریم میں مصروف ہیں۔ دونوں ریاستوں کے دیہاتوں سے سینکڑوں نمبردار اور مکھیا آئے ہوئے ہیں۔ لکھن پور نے بھی اپنا راستہ بھیجا ہے۔ یہ سب دیہاتی لوگ پریم شنکر کے مہمان ہیں۔ قادر خاں۔ دکھرن بھگت۔ ڈپٹ سنگھ۔ یہ سب لوگ آج زعفرانی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ آج اپنے جیل خانہ کے تجربات پر ایک نقل کریں گے۔ سید ایجاد حسین نے ایک بڑھیا قصیدہ لکھا ہے۔ اور اتحادی یتیم خانہ کے لڑکے سبز جھنڈیاں لیے ہوئے مایاشنکر کا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑے ہیں۔ انگریز مہمانوں کے لیے ایک علاحدہ خیمہ ہے۔ وہ بھی ایک ایک کر کے آتے جاتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات ڈاکٹر عرفان علی کے ذمہ ہے۔ ان کی دل بستگی کے لیے پروفیسر رچرڈسن کلکتہ سے بلائے گئے ہیں۔ جو فنِ موسیقی میں بے مثل ہیں۔ بابوگیان شنکر گورنر صاحب کے خیرمقدم کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

شام کا وقت تھا۔ پھاگن کی فرحت انگیز ہوا چل رہی تھی۔ ایک گورنر کا خیرمقدم کرنے کے لیے اسٹیشن کی طرف چلے۔ گیان شنکر کا ہاتھی سب سے آگے تھا۔ پیچھے پیچھے بینڈ بجتا جارہا تھا۔ اسٹیشن پر پہلے ہی سے پھولوں کا انبار لگا دیا گیا تھا۔ جیوں ہی گورنر صاحب کا اسپیشل آیا اور وہ اسٹیشن پر اترے کہ ان پر پھولوں کی بارش کی گئی۔ انھیں ایک بڑھیا فٹن پر سوار کرایا گیا۔ جلوس روانہ ہوا۔ آگے آگے ہاتھیوں کا قطار تھی اس کے بعد راجپوتی فوج کا ایک دستہ۔ فوج کے بعد گورنر صاحب کی فٹن تھی جس پر کارچوبی کا چھتر لگا ہوا تھا۔ فٹن کے بعد شہر کے رؤسا کی سواریاں تھیں۔ اس کے بعد پولیس کے سواروں کی ایک جماعت تھی۔ سب کے پیچھے باجے تھے۔ یہ جلوس شہر کی خاص خاص سڑکوں پر ہوتا ہوا چراغ جلتے جلتے گیان شنکر کے مکان پر آپہنچا۔ ہزایکسلنسی مہاراجا صاحب گورودت رائے چودھری فٹن سے اترے اور پلیٹ فارم پر آکر اپنی مخصوص کرسی پر رونق افروز ہوئے۔ بجلی کی تیز روشنی میں ان کی مسکین اور پُرجلال صورت ایسی معلوم ہوتی تھی۔ گویا جنت سے کوئی فرشتہ اتر آیا ہو۔ زعفرانی صافہ اور سفید کپڑے اس رونق کو اور بھی بڑھا رہے تھے۔ رؤسا کرسیوں پر بیٹھے۔ دیہاتوں کے مہمانوں کے لیے ایک سفید فرش بچھا ہوا تھا۔ پریم شنکر نے انھیں وہاں پیشتر ہی سے بٹھا رکھا تھا۔ سب لوگوں کے بیٹھ جانے پر مایاشنکر ریشمی کپڑوں اور جواہرات سے چمکتا ہوا دیوان خانہ سے نکلا اور متر بھون کے

لڑکوں کے ساتھ پنڈال میں آیا۔ بندوقوں کی سلامی ہوئی۔ برہمن لوگوں نے منگلا چرن گانا شروع کیا۔ سب لوگوں نے کھڑے ہوکر اس کی تعظیم کی۔ مہاراجا گوروودت سنگھ نے نیچے اتر کر اس سے ہاتھ ملایا اور اسے لاکر تخت پر بٹھادیا۔ مایاشنکر کے چہرہ پر اس وقت ذرا بھی مسرّت کا نشان نہ تھا۔ وہ متفکر سا نظر آرہا تھا۔ شادی کے وقت منڈپ کے نیچے دولہے کی جو حالت ہوتی ہے وہی حالت اس وقت اس کی تھی۔ اس کے اوپر کتنی بڑی ذمہّ داری کا بار رکھا جارہا تھا۔ آج سے اسے اپنے لوگوں کی حفاظت اور فلاح کے کاموں کو انجام دینا پڑے گا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے حق وانصاف پر نگاہ رکھنی پڑے گی۔ اس کے ملازم رعایا پر جو جو زیادتیاں کریں گے ان سب کا پاپ اسے لگے گا۔ غریبوں کی آہوں اور مظلوموں کے آنسوؤں سے اسے کتنا خبردار رہنا پڑے گا۔ ان اندرونی جذبات کے علاوہ ایسے زبردست مجمع کے سامنے کھڑے ہونے اور ہزاروں لوگوں کے مرکزِ نگاہ بننے کی شرم کچھ کم اضطراب انگیز نہ تھی۔

کاروائی شروع ہوئی۔ منگلا چرن گانے کے بعد پنڈت شری نواس وید چاریہ نے ایشور پرارتھنا کی۔ پھر سید ایجادحسین نے اپنا زور دار قصیدہ پڑھا جس کی حاضرینِ جلسہ نے خوب داد دی۔ ان کے بیٹھتے ہی یتیم خانہ کے لڑکوں نے گورنر صاحب کی تعریف میں ایک ایک گیت گایا۔ ان کی نغمہ سرائی پر لوگ محو ہو کر رہ گئے۔ ازاں بعد بابو گیان شنکر اٹھے۔ اور انھوں نے اپنا دلکش اور مؤثر ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے الفاظ کی برجستگی اور خیالات کی بلندی قابلِ غور تھی۔ ڈاکٹر عرفان علی نے ہندوستانی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ پھر مہاراجا صاحب اس کا جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے پہلے گیان شنکر اور دیگر رؤسا کا شکریہ ادا کیا۔ دوچار موثر جملوں میں گیان شنکر کی خوش انتظامی اور قابلیت کی تعریف کی۔ رائے کملا نند رانی گائتری کی فیاضی۔ نیک دلی اور رعایا پروری کا بھی ذکر کیا۔ پھر مایا شنکر سے مخاطب ہو کر اس کی خوش قسمتی پر خوشی کا اظہار کیا۔ اپنی تقریر کے بقیہ حصہ میں مایاشنکر کو فرض شناسی اور سلامت روی کی تلقین کی۔ آخر میں یہ امید ظاہر کی کہ وہ اپنے ملک وقوم کا خیراندیش اور سوسائٹی کا رکن ثابت ہوگا۔

اس کے بعد مایاشنکر جواب دینے کے لیے اٹھا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ اور سینہ میں زور کی دھڑکن ہو رہی تھی۔ اسے خوف ہوتا تھا کہ کہیں میں گھبراکر بیٹھ نہ

جاؤں۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ گیان شنکر نے پیشتر ہی سے اسے تیار کر رکھا تھا۔ جواب لکھ کر یاد کرا دیا تھا۔ مگر مایا شنکر کے دل میں کچھ اور ہی خیال تھا۔ اس نے اپنے خیالات کا جو سلسلہ قائم کر رکھا تھا وہ بالکل غائب ہوگیا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ بے حواس سا بن کر اپنے خیالاتِ منتشر کو مجتمع کرتا رہا۔ کیسے شروع کروں؟ کیا کہوں؟ پریم شنکر سامنے بیٹھے ہوئے اس کی اس پریشانی پر مضطرب ہو رہے تھے دفعتاً مایا شنکر کی نگاہ ان پر پڑگئی۔ اس نگاہ نے اس پر وہی کام کیا جو رکی ہوئی گاڑی پر للکار کرتی ہے۔ اس کا ناطقہ بیدار ہوگیا۔ ایشور کی پرارتھنا اور حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولا۔

مہاراجا صاحب میں ان بیش قیمتی صلاحوں کے لیے آپ کا تہِ دل سے ممنوں ہوں جو آپ نے میرے آنے والے فرائض کے متعلق زبان مبارک سے عطا فرمائی ہیں اور میں عالی جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ میں حتی الامکان ان پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ جناب نے فرمایا ہے کہ تعلقہ دار اپنی رعایا کا دوست۔ مددگار۔ اور رہنما ہے۔ میں کمالِ انکسار کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ وہ اپنی رعایا کا خادم بھی ہے یہی اس کے وجود کا مقصد اور سبب ہے ورنہ دنیا میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بغیر سوسائٹی کے انضباط میں کوئی نقص نہ واقع ہوتا۔ وہ اس لیے نہیں ہے کہ رعایا کے پسینہ کی کمائی کو اپنے عیش وعشرت میں اڑائے۔ ان کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کے سامنے اونچا محل کھڑا کرے۔ ان کی برہنگی کو اپنی قیمتی پوشاکوں سے چڑھائے۔ ان کی قناعت آمیز سادگی کو اپنی مادی شان وشوکت سے شرمندہ کرے۔ اپنے حقوق پر جان دیتا ہو مگر اپنے فرائض سے بالکل بے خبر ہو۔ ایسے خود پسند مالکوں سے رعایا کی جتنی جلد نجات ہو، ان کا بار رعایا کے سر سے جتنی ہی جلد دور ہو اتنا ہی اچھا ہے۔
حضرات مجھے یہ زعمِ باطل نہیں ہے کہ میں ان علاقوں کا مالک ہوں۔ خوئ قسمت سے مجھے ایسے پاک نفس اور بلند خیال لوگوں کی صحبت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا ہے کہ اگر یہ وہم یہ گمان ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل میں آتا تو میں اپنے کو کمینہ اور ناقابلِ عفو خیال کرتا۔ زمین یا تو ایشور کی ہے جو اسے وجود میں لایا یا کسان کی جو ایشور کی مرضی کے مطابق اس سے کام لیتا ہے۔ بادشاہ ملک کی حفاظت کرتا ہے پس اسے کسانوں سے زمین کا محصول لینے کا حق ہے۔ خواہ بالواسطہ طریقہ پر لے یا کوئی اس سے کم ناقابلِ

اعتراض تدبیر نکالے۔ اگر دوسری جماعت کو ثروت یا مملکت یا اقتدار کی بناء پر کسانوں کو نشانۂ جور وستم بنانے کی آزادی دی جاتی ہے تو اس رواج کو موجودہ نظامِ تمدن کا ایک داغِ سیاہ سمجھنا چاہیے۔

گیان شنکر کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ گورنر صاحب نے بھی معترضانہ انداز سے پہلو بدلا۔ رؤسا میں اشارے ہونے لگے۔ لوگ متحیر تھے کہ ان باتوں کا مطلب کیا ہے۔ پریم شنکر تو شرم کے مارے گڑے جاتے تھے۔ ہاں ڈاکٹر عرفان علی اور جوالا سنگھ کے چہروں سے حوصلہ افزا مسرت کا اظہار ہورہا تھا۔ مایا شنکر نے ذرا دم لے کر پھر کہا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ میری باتیں بعض حلقوں میں بے سود اور بے موقع اور بعض حلقوں میں باغیانہ اور انقلاب انگیز سمجھی جائیں گی۔ لیکن یہ اندیشہ مجھے ان خیالات کے اظہار سے باز نہیں رکھ سکتا جو میرے ذاتی تجربہ کے نتائج ہیں اور جنھیں عملی جامہ پہنانے کے لیے مجھے یہ نادر موقع ملا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کسانوں کی گردنوں پر اپنا جوا رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میری اخلاقی کمزوری اور بزدلی ہوگی اگر میں اپنے اصول کو عیش پسندی پر قربان کردوں۔ اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو کر زندہ رہنا کون پسند کرے گا؟ میں آپ سب صاحبوں کے سامنے ان حقوق اور اختیارات سے دست بردار ہوتا ہوں۔ جو رواج اور نظام معاشرت نے مجھے دیے ہیں۔ میں اپنی رعایا کو قیدِ اطاعت سے آزاد کرتا ہوں۔ وہ نہ میرے اسامی ہیں اور نہ میں ان کا زمیندار ہوں۔ وہ سب میرے دوست اور میرے بھائی ہیں۔ آج سے وہ سب اپنے مزرعہ کے خود مالک ہیں۔ اب انھیں میرے کارندوں کے مظالم اور میری خودغرضانہ زیادتیوں کو برداشت نہ کرنا پڑے گا۔ وہ اضافہ، بے دخلی اور بیگار کی زحمتوں سے نجات پاگئے۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں نے ایک فوری جوش میں آکر ایسا اعلان کیا ہے۔ نہیں میں نے اسی وقت یہ ارداہ کرلیا تھا جب کہ میں اپنے علاقوں کا دورہ ختم کرچکا تھا۔ آپ کو آزاد کرکے میں خود آزاد ہوگیا۔ اب میں اپنا مالک ہوں اور میری روح آزاد ہے۔ اب مجھے کسی کے سامنے اپنا سرخم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس دلالی کی بدولت مجھے اپنی روح پر کتنے ظلم کرنے پڑتے اس کا مجھے تھوڑا بہت تجربہ ہوچکا ہے۔ میں پرماتما کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس ضمیرکشی سے بچالیا۔ اپنے سبھی کسان بھائیوں سے میری عرض ہے کہ وہ ایک ماہ کے اندر میرے مختار کے پاس آکر اپنے اپنے

حصہ کا سرکاری لگان دریافت کرلیں اور وہ رقم خزانہ میں خود داخل کیا کریں۔ میں اپنے محسن ڈاکٹر عرفان علی سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس کام میں میری مدد کریں۔ اور ضابطہ وقانون کے پیچیدہ مسائل کو حل کرانے کی تدبیر کریں۔ مجھے امید ہے کہ میرے سبھی بھائی آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ اور ذرا ذرا سی باتوں کے لیے عدالت کا سہارا نہ لیں گے۔ ایشور آپ کے دلوں میں ضبط و تحمل۔ محبت و ہمدردی پیدا کرے اور آپ کو اپنے نئے فرائض کی انجام دہی کے لیے توفیق نیک عطا فرمائے۔ ہاں میں یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی آراضی کو اسامیوں کے ہاتھوں نفع پر نہ اٹھا سکیں گے۔ اگر آپ ایسا کریں گے یہ مجھ پر سخت ظلم ہوگا۔ کیوں کہ جن برائیوں کو میں مٹانا چاہتا ہوں آپ انھیں کو پھیلائیں گے۔ آپ کو عہد کرنا پڑے گا کہ آپ کسی حالت میں بھی اس ناجائز طریقہ سے مستفید ہونے کا خیال نہ کریں گے اور اسامیوں سے نفع لینا حرام سمجھیں گے۔

مایاشنکر اپنی تقریر ختم کرکے جیوں ہی اپنی جگہ پر بیٹھا کہ ہزاروں آدمی چاروں طرف سے آکر اس کے گرد جمع ہوگئے۔ کوئی اس کے پیروں پر گرا پڑتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔ کوئی دعائیں دیتا تھا۔ کوئی خوشی کے مارے اُچھلا پڑتا تھا۔ آج انھیں وہ نعمت مل گئی تھی۔ جس کا وہ خواب میں بھی خیال نہ کرسکتے تھے۔ غریب کسانوں کو زمیندار بننے کا حوصلہ کہاں؟ سینکڑوں آدمی گورنر صاحب کے قدموں پر گر پڑے۔ کتنے ہی لوگ بابو گیان شنکر کے پیروں سے لپٹ گئے۔ شامیانا بھر میں ہل چل مچ گئی۔ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے گلے ملتے تھے اور اپنے نصیبوں کو سراہتے تھے۔ پریم شنکر سر جھکائے ہوئے خاموش کھڑے تھے گویا کسی گہرے سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ مگر ان کے دیگر احباب خوشی سے جامہ میں پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کی مغرور نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ یہ ہماری صحبت اور تعلیم کا اثر ہے۔ ہم کو بھی اس کی کچھ داد ملنی چاہیے۔ رؤسا کی جان عذاب میں مبتلا تھی۔ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے گویا انھیں اپنے کانوں اور آنکھوں پر اعتبار نہ تھا۔ کئی علماء اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے بے صبر ہو رہے تھے مگر یہاں اس کا موقع نہ تھا۔

گورنر صاحب بڑی کش مکش میں پڑے ہوئے تھے کہ اس تقریر کا کس پیرایہ میں جواب دوں۔ وہ دل میں مایاشنکر کے ایثار کے ثناخواں تھے۔ لیکن اس کا اظہار کرتے ہوئے

انھیں خوف ہوتا تھا کہ دیگر رؤسا اور تعلقہ داروں کو ناگوار نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی مایاشنکر کی اس ایثار کی تحقیر کرنا تھا۔ انھیں مایاشنکر سے وہ گہری عقیدت ہوگئی تھی جو مقدس لوگوں کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ وہ کھڑے ہو کر دلکش لہجہ میں بولے۔

بابومایاشنکر! اگرچہ ہم میں سے بیشتر حضرات ان اصولوں کے قائل نہ ہوں گے جو آپ کے اس فیاضانہ ایثار کے محرک ہوئے ہیں۔ مگر جن لوگوں کے قلوب انسانی جذبات سے بالکل عاری نہیں ہیں وہ ضرور ہی آپ کو فرشتہ سمجھیں گے۔ ممکن ہے کہ اپنی تمام عمر عیش وعشرت میں بسر کرنے کے بعد کوئی تارک الدنیا ہوجاوے مگر جس نوجوان نے ابھی ثروت و اقتدار کے خوش نما اور دل فریب باغ میں قدم رکھا ہو۔ اس کی یہ علاحدگی واقعی حیرت انگیز ہے لیکن اگر بابوصاحب کو ناگوار نہ ہو تو میں کہوں گا کہ کوئی نظامِ تمدن محض اصولوں کی بنا پر بے عیب نہیں ہوسکتا خواہ وہ اصول کتنے ہی اعلیٰ اور پاک ہوں۔ اس نظام کی ترقی انسانی اخلاق کے تابع ہے۔ مطلق العنان فرماں رواؤں میں فرشتے ہو گزرے ہیں اور جمہور کے پیشواؤں میں خوں‌خوار درندے۔ آپ جیسے فیاض۔ روشن خیال اور خدا ترس مالک کی ذات سے رعایا کو کتنا فیض پہنچ سکتا تھا۔ آپ ان کے رہنما بن سکتے تھے۔ اب وہ رعایا آپ کی مربیانہ نوازش سے محروم ہوجائے گی۔ لیکن میں ان واعظانہ موشگافیوں سے آپ کو تشویش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ نیک کام ہمیشہ من جانب خدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی مشیتِ ایزدی ہے اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اس سے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں گے۔ میں خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ ان نئے زمینداروں کو سرسبز کرے اور آپ کو ثوابِ دارین عطا فرمائے۔

اِدھر تو مِتر بھون کے لڑکے ڈراما کر رہے تھے متا کی دلکش تانیں اور ڈاکٹر پریاناتھ کے نغمے خیمے میں گونج رہے تھے اُدھر بابوگیان شنکر مجنونانہ یاس کے جوش میں گنگا کی طرف لپکے ہوئے چلے جارہے تھے جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی کشتی لہروں میں بہتی چلی جاتی ہو۔ آج قسمت نے انھیں شکست دے دی ہے۔ اب تک انھوں نے ہمیشہ قسمت پر فتح پائی تھی۔ آج پانسا پلٹ گیا اور ایسا پلٹا کہ اب سنبھلنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ابھی ایک لمحہ قبل ان کا نشانۂ قسمت جگمگاتے ہوئے چراغوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہوا کے ایک تند جھونکے نے ان چراغوں کو غل کر دیا۔ اب ان کے چاروں طرف گہری اور خوفناک تاریکی

تھی۔ جہاں انھیں کچھ سوجھتا نہ تھا۔

وہ سوچتے ہوئے چلے جاتے تھے کہ کیا میں نے اسی انجام کے لیے اپنی زندگی برباد کی؟ کیا میں نے اپنی کشتی کو اسی لیے گراں بار کیا تھا کہ وہ غرقِ دریا ہوجاوے؟ آہ ثروت پسندی! میں نے تیری قربان گاہ پر کیا کیا نذریں نہیں گزاریں۔ اپنا دین و ایمان تک نذر کر دیا۔ ہائے تیرے بھاڑ میں میں نے کیا کیا نہیں جھونکا۔ اپنا دل۔ اپنا قول اپنا عمل سبھی کی اس میں آہوتی دے دی۔ کیا اسی لیے کہ داغِ ناکامی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ لگے؟

مایا شنکر کا قصور نہیں۔ پریم شنکر کا قصور نہیں۔ یہ سب میری تقدیر کے کرشمے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میں خود اپنی قسمت کا مالک ہوں۔ علماء کی بھی یہی رائے ہے۔ مگر آج معلوم ہوا کہ میں قسمت کے ہاتھوں کا کھلونا تھا۔ اس کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی تھا۔ جیسے بلی چوہے کو کھلاتی ہے جیسے مچھوا مچھلی کو کھلاتا ہے۔ اسی طرح اس نے مجھے اب تک کھلایا۔ کبھی پنجہ میں آہستہ سے پکڑ لیتا تھا اور کبھی چھوڑ دیتا تھا۔ ذرا دیر کے لیے اس کے پنجہ سے چھوٹ کر میں سوچتا تھا کہ میں نے اس پر فتح پائی۔ مگر آج اس کھیل کا خاتمہ ہوگیا۔ بلی نے گردن دبادی۔ مچھوا نے بنسی کھینچ لی۔ انسان کتنا عاجز کتنا مجبور ہے۔ قسمت کتنی قوی کتنی سخت!

جس سہ منزلہ محل کو میں نے اپنی لگاتار محنت سے برسوں میں کھڑا کیا وہ دم زدن میں اس طرح زمیں دوز ہوگیا گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اس کا نشان تک نہیں نظر آتا۔ کیا وہ عالی شان عمارت اس نیرنگ کا صرف ایک کرشمہ تھی؟

آہ زندگی کتنی ناکام ثابت ہوئی! آہ ہوس پرستی۔ تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں آنکھ بند کرکے تیرے پیچھے پیچھے چلا اور تو نے مجھے اس گردابِ فنا میں ڈال دیا۔

میں اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ثروت۔عزت۔ اقتدار کسی کا شوق نہیں۔ ان کے بغیر بھی انسان آرام سے رہ سکتا ہے بلکہ سچ پوچھو تو ان سے الگ ہی رہنے میں آرام وراحت ہے۔ افسوس کہ میں کسی حد تک بھی اس نیک نامی کا حقدار نہیں بن سکتا۔ لوگ اسے میری ہوس پرستیوں کی سزا سمجھیں گے۔ کہیں گے بیٹے نے باپ کا گھمنڈ کیسا توڑا۔ کیسی ڈانٹ بتلائی۔ یہ طنزیہ ذلت کون برداشت کرے گا؟ ہائے مجھے پہلے سے اس انجام کا علم ہوجاتا تو آج میں قابلِ عزت سمجھا جاتا۔ بے نفس بیٹے کا دھرماتما باپ ہونے

کا وقار حاصل کرسکتا۔ قسمت نے کیسا چھپا ہوا وار کیا۔ اب کیوں زندہ رہوں۔ اس لیے کہ تو میری تباہی اور تضحیک پر خوش ہو۔ میری روحانی اذیتوں پر تالیاں بجائے۔ نہیں ابھی اتنا بے حیا اتنا بے غیرت نہیں ہوگیا ہوں۔

آہ وِدّیا میں نے تجھ پر کتنا ظلم کیا۔ تو ستی تھی۔ میں نے تجھے پیروں تلے روندا۔ میری عقل کتنی برباد ہوگئی تھی۔ دیوی اس گنہگار پر رحم کر!

انھیں غمگین خیالات میں ڈوبے ہوئے گیان شنکر دریا کے کنارہ پر جاپہنچے۔ گھاٹوں پر جابجا سانڈ بیٹھے ہوئے تھے۔ دریا کی دبی ہوئی دردناک آواز اس سکوت کو اور بھی زیادہ سکوت افزا بنا رہی تھی۔

گیان شنکر نے دریا کو یاس آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ان کا بدن کانپ اٹھا وہ رونے لگے۔ ان کا غم دریا سے بھی زیادہ کثیر تھا۔

زندگی کے واقعات سنیما کی تصویروں کی طرح ان کی آنکھوں میں پھر گئے۔ ان کی مکّاریاں آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ روشن تھیں۔ ان کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ کیا مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

یاس نے کہا نہیں۔ کوئی چارہ نہیں۔ وہ گھاٹ کے ایک برج پر جاکر کھڑے ہوگئے۔ دونوں ہاتھوں کو تولا جیسے چڑیا اپنے پروں کو تولتی ہے مگر پر نہ اٹھے۔

دل نے کہا۔ تم بھی پریم آشرم میں کیوں نہیں چلے جاتے؟ ندامت نے جواب دیا۔ کس منہ سے جاؤں۔ مرنا تو نہیں چاہتا پر زندہ کیوں کر رہوں۔ ہائے میں جبراً مارا جا رہا ہوں۔ یہ سوچ کر گیان شنکر زور سے رو پڑے۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ رنج اور بھی زیادہ ہوگیا۔ دل کے سبھی احساسات اس رنج کی افزونی میں غائب ہوگئے۔ زمین و آسمان۔ خشکی اور تری سب اسی دکھ کے اتھاہ ساگر میں سما گئے۔

وہ ایک بے حسی کی حالت میں اٹھے اور گنگا میں کود پڑے۔ ٹھنڈے پانی سے دل کی جلن کو مٹا دیا۔

خاتمہ

دوسال ہوگئے ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ بابومایاشنکر گھوڑے پر سوار لکھن پور میں داخل ہوئے۔ انھیں وہاں بڑی رونق اور صفائی نظر آئی۔ تقریباً سبھی دروازوں پر سائبان

تھے۔ ان میں تخت بچھے ہوئے تھے۔ بیشتر گھروں پر سفیدی ہوگئی تھی۔ پھوس کے جھونپڑے غائب ہوگئے تھے۔ اب سبھی مکانوں پر کھپریل تھا۔ دروازوں پر بیلوں کے لیے پختہ چرنیاں بنی ہوئی تھیں۔ کئی دروازوں پر گھوڑے بندھے ہوئے نظر آتے تھے۔ پرانے چوپال میں اسکول تھا اور اس کے سامنے ایک پختہ کنواں اور ایک دھرم شالا تھا۔ مایاشنکر کو دیکھتے ہی لوگ اپنا اپنا کام چھوڑکر دوڑے اور ایک لمحہ میں صدہا لوگ جمع ہوگئے۔ مایاشنکر سکھوچودھری کے مندر پر ٹھہرے وہاں اس وقت بڑی بہار تھی۔ مندر کے سامنے صحن میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چبوترہ پر چودھری بیٹھے ہوئے رامائن پڑھ رہے تھے اور کئی عورتیں بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں۔ مایاشنکر گھوڑے پر سے اتر کر چبوترے پر جا بیٹھے۔

سکھوؔ داس جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پوچھا...... سب کشل منگل ہے نا؟ کیا ابھی چلے ہی آرہے ہو؟

مایا۔ ہاں۔ میں نے کہا چلوں تم لوگوں سے ملاقات کرآؤں۔

سکھوؔ داس۔ بڑی کرپا کی۔ ہمارے دھنیہ بھاگ کہ گھر بیٹھے ہوئے مالک کے درشن ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دوڑے ہوئے گھر میں گئے ایک ادنیٰ قالین لاکر بچھا دیا۔ کلیسے میں پانی کھینچا اور شربت بنانے لگے۔ مایاشنکر نے منہ ہاتھ دھویا۔ شربت پیا اور گھوڑے کی لگام اتار رہے تھے کہ قادرخان نے آکر سلام کیا۔ مایا نے کہا۔ کہیے خاں صاحب۔ مزاج تو اچھا ہے؟

قادر۔ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ سرکار کے جان ومال کی منایا کرتے ہیں۔ آج تو رہنا ہوگا۔

مایا۔ یہی ارادہ کرکے تو چلا ہوں۔

ذرا دیر میں وہاں گاؤں کے سبھی چھوٹے بڑے لوگ جمع ہوگئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ قادر نے پوچھا...... بیٹا۔ آج کل کونسل میں کیا ہو رہا ہے۔ اسامیوں پرکچھ نگاہ ہونے کی امید ہے یا نہیں؟

مایا۔ ہاں ہے چچاصاحب اور ان کے ساتھی بڑا زور لگا رہے ہیں۔ امید ہے کہ جلد ہی کچھ نہ کچھ نتیجہ ہوگا۔

قادر۔ اللہ ان کی محنت ٹھکانے لگائے اور کیا دعا دیں۔ روئیں روئیں سے تو دعا نکل رہی ہے۔ کاشت کاروں کی حالت بہت کھراب ہے بیٹا مجھ ہی کو دیکھو پہلے بیس بیگھے کا کاشت کار تھا۔ سو روپے کا لگان دینا پڑتا تھا۔ دس بیس روپے سال نجرانے میں نکل جاتے تھے۔ اب سب بیس روپیہ لگان ہے اور نجرانہ نہیں لگتا۔ پہلے اناج کھلیان سے گھر تک نہ آتا تھا۔ آپ کے کارندے اور چپراسی وہیں گلا دبا کر تُلوا لیتے تھے۔ اب اناج گھر میں بھرتے ہیں اور سیتے سے بیچتے ہیں۔ دو سال میں کچھ نہیں تو تین چار سو روپے بچے ہوں گے۔ ڈیڑھ سو کی ایک جوڑی بیل لائے۔ گھر کی مرمت کرائی۔ سائبان ڈالا۔ ہانڈیوں کی جگہ تانبے اور پیتل کے برتن لیے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب کسی کی دھونس نہیں ہے۔ مال گجاری داکھل کر کے چپکے گھر چلے آتے ہیں۔ نہیں تو ہردم جان سولی پر چڑھی رہتی تھی۔ اب اللہ کی عبادت میں جی لگتا ہے۔ نہیں تو نماج بھی بوجھ معلوم ہوتی تھی۔

مایا۔ تمھارا کیا حال ہے۔ دکھرن بھگت؟

دکھرن۔ بھیا تمھارے اکبال سے سب طرح کسل ہے۔ اب جان پڑتا ہے کہ ہم بھی آدمی ہیں نہیں تو پہلے بیلوں سے بھی گئے بیتے تھے۔ بیل تو ہر سے چھٹی پاکر آتا ہے تو اپنا بھوجن کر کے آرام سے سوجاتا ہے۔ یہاں ہر سے لوٹ کر بیلوں کی پھکر کرنی پڑتی تھی۔ اس سے چھٹی ملتی تو کارندہ صاحب کی کھوسامد کرنے جاتے۔ وہاں سے دس گیارہ بجے لوٹتے تب بھوجن ملتا۔ پندرہ بیگھے کا کاسکار تھا۔ دس بیگھے موروثی تھے۔ ان کے پچاس لگان دیتا تھا۔ پانچ بیگھے سکمی تھے۔ ان کے ساٹھ دینے پڑتے تھے۔ اب پندرہ بیگھے کے کل تیس دینے پڑتے ہیں۔ہری۔ بیگاری۔ نجر۔ نیاج۔ سب سے گلہ چھوٹا۔ دو سال میں تین چار سو ہاتھ ہوگئے۔ سو روپیہ کی ایک پچھائیں بھینس لایا ہوں۔ کچھ کرجا (قرض) تھا وہ چکا دیا۔

سکھوداس۔ اور طبلہ ہارمونیم لیا ہے۔ وہ کیوں نہیں کہتے۔ ایک پکّا کنواں بنوایا ہے۔ اسے کیوں چھپاتے ہو؟ بھیا یہ پہلے ٹھاکر بھگت تھے۔ ایک بار بیگار میں پکڑے گئے تو آکر ٹھاکر جی پر گسّا اتارا۔ ان کی مورت کو توڑ تاڑ کر پھینک دیا۔ اب پھر ٹھاکر جی میں ان کی شردھا (اعتقاد) ہوئی ہے بھجن کیرتن کا سب سامان انھیں نے منگایا ہے۔

دکھرن۔ کیوں چھپاؤں؟ مالک سے کون پردہ؟ یہ سب انھیں کی بدولت تو ہے۔

مایا۔ یہ باتیں چچاصاحب سنتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

کلو۔ بھیا۔ جو سچ پوچھو تو چاندی میری ہے۔ پہلے چھ بیگھے کا اسامی تھا۔ سب سکمی۔ بہتر لگان کے دینے پڑتے تھے۔ اس پر ہر دم گوشت میاں کی بردری کیا کرتا تھا کہ کھیت چھین نہ لیں۔ پچاس روپیہ کھالی نجرانہ لگتا تھا۔ پیادوں کی پوجا الگ کرنی پڑتی تھی۔ اب کل نو روپیہ لگان دیتا ہوں۔ دو سال میں آدمی بن گیا۔ پھوس کے جھونپڑے میں رہتا تھا۔ اب مکان بنوا لیا ہے۔ پہلے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کہ کوئی کارندے سے میری چغلی نہ کر آیا ہو۔ اب آنند سے میٹی نیند سوتا ہوں اور سرکار کا جس گاتا ہوں۔

مایا۔ (سکھو چودھری سے) تمھاری کھیتی تو سب مجوروں ہی سے ہوتی ہوگی؟ تمھیں بھجن بھاؤ سے کہاں چھٹی؟

سکھو۔ (ہنس کر) بھیا۔ مجھے اب کھیتی باری کرکے کیا کرنا ہے۔ اب تو یہی اچھا ہے کہ بھگوت بجھن کرتے کرتے یہاں سے سدھار جاؤں۔ میں نے اپنے چالیسوں بیگھے ان بچاریوں کو دے دیے ہیں جن کے حصے میں کچھ نہ پڑا تھا۔ اس طرح سات آٹھ گھر جو پہلے مجوری کرتے تھے اور بیگار کے مارے مجوری بھی نہ کرنے پاتے تھے۔ اب بھلے آدمی ہوگئے ہیں۔ میرا اپنا نباہ بھیک مانگ کر ہوجاتا ہے اور پوری بھیک یہیں مل جاتی ہے۔ کسی دوسرے گاؤں میں پیٹ کے لیے نہیں جانا پڑتا۔ دو چار سادھو سنت روج ہی آتے رہتے ہیں۔ اسی بھیک میں ان کی آؤ بھگت بھی ہوجاتی ہے۔

مایا۔ آج بشیشر شاہ نہیں دکھائی دیتے۔

سکھو۔ کسی کام سے گئے ہوں گے۔ وہ بھی اب پہلے سے مجے میں ہیں۔ دُکان بہت بڑھا دی ہے۔ لین دین کم کرتے ہیں۔ پہلے روپیہ میں آنہ سے کم بیاج نہ لیتے تھے اور کرتے کیا۔ کتنے ہی اسامیوں سے کوڑی نہ وصول ہوتی تھی۔ روپۓ مارنے پڑتے تھے۔ اس کی کسر بیاج سے نکالتے تھے۔ اب روپیہ سینکڑہ بیاج لیتے ہیں۔ کسی کے یہاں روپۓ ڈوبنے کا ڈر نہیں ہے۔ دُکان بھی اچھی چلتی ہے سکروں میں پہلے دوالہ نکل جاتا تھا۔ اب ایک تو گاؤں کا بَل ہے۔ کوئی رعب نہیں جماسکتا اور جو تھوڑا بہت گھاٹا ہوا بھی

تو گاؤں والے پورا کردیتے ہیں۔

اسی اثناء میں بلراج ایک ریشمی صافہ باندھے، مرضائی پہنے، گھوڑے پر سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ مایاشنکر کو دیکھتے ہی فوراً گھوڑے سے اتر پڑا۔ ان کے پیروں کو چھوا۔ وہ اب ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر تھا۔ بورڈ ہی کے جلسہ سے واپس آ رہا تھا۔

مایا۔ نے مسکرا کر دریافت کیا۔ کہیے ممبر صاحب کیا خبر ہے؟

بلراج۔ ہجور کی دعا سے اچھی طرح ہوں۔ آپ تو مجے میں ہیں؟ بورڈ کے جلسہ میں گیا تھا۔ بحث چھڑ گئی۔ وہیں چراغ جل گیا۔

مایا۔ آج بورڈ میں کیا تھا؟

بلراج۔ وہی بیگار کی بات چھڑی ہوئی تھی۔ بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ میں کہتا تھا کہ ضلع کا کوئی حاکم دیہات میں جا کر گاؤں والوں سے کسی طرح کا کام نہ لے۔ جیسے پانی بھرنا۔ گھاس چھیلنا۔ جھاڑو لگانا۔ جو رسد چاہیے وہ گاؤں کے مکھیا سے کہہ دی جائے اور بازار سے اس کا دام چکا دیا جائے۔ اس پر دونوں تحصیلدار اور کئی حاکم بہت بھنائے۔ کہنے لگے کہ اس سے سرکاری کام میں بڑا ہرج ہوگا۔ میں نے بھی جی کھول کر جو کچھ کہتے بنا۔ کہا۔ سرکار ہی رعایا کو تکلیف دے کر اور ان کی بے عزتی کرے یہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہرج ہوتا ہے تو ہو۔ دل لگی یہ تھی کئی زمیندار صاحبان بھی حاکموں کے طرفدار تھے۔ میں نے ان لوگوں کی بھی خوب خبر لی۔ اخیر میں میری تجویز منظور ہوگئی۔ دیکھیں صاحب کلکٹر کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ میری ایک تجویز یہ بھی تھی کہ نرخ نامہ لکھنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جاوے ۔

جس میں زیادہ تر بیوپاری لوگ ہوں۔ یہ نہیں کہ تحصیلدار نے قلم اٹھایا اور من مانا بھاؤ لکھ کر چلتا کر دیا۔ میری یہ تجویز بھی منظور ہوئی۔

مایا۔ میں اس کامیابی پر تمھیں مبارک باد دیتا ہوں۔

بلراج۔ یہ سب آپ کا اقبال ہے۔ پہلے یہاں کوئی اخبار کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ اب کئی اچھے اچھے اخبار آتے ہیں۔ صبح آپ کو اپنی لائبریری دکھلاؤں گا۔ گاؤں والے اپنی حیثیت کے موافق ایک یا دو روپیہ ماہوار چندہ دیتے ہیں۔ ورنہ پہلے ہم لوگ مل کر ایک اخبار منگاتے تھے تو سارا گاؤں بھڑکتا تھا۔ جب کوئی افسر دورہ پر آتا تھا تو

کارندہ صاحب فوراً اس سے میری شکایت کرتے۔ اب آپ کی بدولت اس گاؤں میں رام راج ہے۔ آپ کو کسی دوسرے موضع میں پوسا اور مظفر کا گیہوں نہ دکھائی دے گا۔ ہم لوگوں نے اب کی مل کر دو جگہوں سے بیج منگوائے ہیں اور ڈیوڑھی پیداوار ہونے کی پوری امید ہے۔ پہلے یہاں ڈر کے مارے کوئی کپاس بوتا ہی نہ تھا۔ میں نے اب کی مالوہ اور ناگ پور سے بیج منگوائے اور گاؤں میں بانٹ دیے خوب کپاس ہوئی۔ یہ سب کام ان غریب اسامیوں کے لیے نہیں ہوسکتے جن کو پیٹ بھر کھانا تک نہیں ملتا۔ ساری پیداوار زمیندار اورمہاجن کی بھینٹ ہوجاتی ہے۔

یہی باتیں کرتے کرتے کھانے کا وقت آگیا۔ لوگ کھانا کھانے گئے۔ مایاشنکر نے پوریاں دودھ میں ملا کر کھائیں۔ دودھ پیا اور وہیں لیٹے۔ ذرا دیر میں لوگ کھاپی کر آگئے۔ گانے بجانے کی ٹھہری۔ کلو نے گایا۔ قادر خان نے بھی کچھ پد سنائے۔ رامائن کا پاٹھ ہوا۔ سکھ داس نے کبیر پنتھی بھجن سنائے۔ کلو نے ایک نقل کی۔ دو تین گھنٹے تک خوب چہل پہل رہی۔ مایا کو بڑا آنند آیا۔ کئی اچھی چیزیں سنائیں۔ لوگ ان کی نغمہ سرائی پر محو ہوگئے۔

دفعتاً بلراج نے کہا۔ بابوجی آپ نے سنا نہیں۔ میاں فیض اللہ پر جو مقدمہ چل رہا تھا اس کا آج فیصلہ سنا دیا۔ اپنی پڑوسن بڑھیا کے گھر میں گھس کر چوری کی تھی۔ تین سال کی سزا ہوگئی۔

ڈپٹ سنگھ نے کہا۔ بہت اچھا۔ سو بینت پڑجاتے تو اور بھی اچھا ہوتا یہ ہم لوگوں کی آہ پڑی ہے۔

مایا۔ بندامہاراج اور کرتار سنگھ کا بھی کہیں پتہ ہے؟

بلراج۔ جی ہاں۔ بندا مہاراج تو یہیں رہتے ہیں۔ ان کے گزارہ کے لیے ہم لوگوں نے انھیں یہاں کا بیا بنا دیا ہے۔ کرتار پولیس میں بھرتی ہوگئے۔

دس بجتے بجتے لوگ رخصت ہوئے۔ مایاشنکر ایسے خوش تھے گویا بہشت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ خود غرض اورحرص و ہوا کے دام میں پھنسے ہوئے لوگوں کو یہ سکون یہ راحت یہ دلی مسرّت کہاں نصیب!

تمّت

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں
مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے
بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ
عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی
وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا
ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ
شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔
اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں
مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔
1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام
زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی
میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی
حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے
ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین
اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن
ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس
کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڑھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے
1982 میں سبکدوش ہوئے۔